بلیدان
اے حمید
1

آج میں آپ کو اپنی خانہ بدوشی کے زمانے کی ایک سنسنی خیز کہانی سناتا ہوں۔ کہانی میں نے اس لئے کہا ہے کہ اس میں جو واقعات آپ پڑھیں گے وہ آپ کو بالکل افسانوی داستانوں جیسے لگیں گے۔ لیکن اصل میں وہ سچے واقعات ہیں جو میرے ساتھ گزرے۔ آج اتنے برس گزر جانے کے بعد جب ان واقعات پر غور کرتا ہوں تو مجھے بھی یقین نہیں آتا کہ یہ سب کچھ حقیقت میں میرے ساتھ پیش آ چکا ہے۔

مجھے بچپن ہی سے آوارہ گردی کا شوق تھا۔ اور یہ شوق مجھے ہواؤں کی طرح اُڑائے اُڑائے لئے پھرتا تھا۔ مجھے کچھ فکر نہیں ہوتی تھی کہ کھاؤں گا کہاں سے؟ سوؤں گا کہاں؟ پیسے ختم ہو گئے تو کہاں سے آئیں گے؟ دن کہاں نکلے گا؟ رات کہاں آئے گی؟ بس! سفر کرنے، نئے نئے شہر دیکھنے، گھنے پُراسرار جنگلوں میں پھرنے اور جنگلوں کی بارشیں دیکھنے کا شوق تھا جو مجھے بار بار امرتسر سے نکال کر کبھی بمبئی، کبھی رنگون، کبھی کلکتے اور کبھی لنکا کی طرف لے جاتا تھا۔ ہر بار میں تین کپڑوں میں گھر سے نکلتا تھا۔ یہ بڑے لمبے اور طویل فاصلوں کے سفر ہوتے تھے۔ تین تین چار چار دن ریل گاڑی چلتی رہتی تھی۔ آب و ہوا بدل جاتی تھی۔ لوگوں کی زبان بدل جاتی تھی، لباس بدل جاتے تھے۔ عجیب عجیب ہیبت ناک جنگل اور ڈرا دینے والے سمندر کی طرح پھیلے ہوئے دریا راستے میں آتے تھے۔ مجھے نہ آگے کی فکر ہوتی تھی نہ پیچھے کا خیال ہوتا تھا۔ بارشوں، جنگلوں، دریاؤں، سمندروں کا عشق مجھے دربدر لئے لئے پھرتا تھا۔ اس دربدری نے مجھے بہت کچھ دیا، بہت کچھ سکھایا۔ جہاں کہیں جو کچھ میسر آتا زندہ رہنے کے لئے کھا لیتا۔ رات کو جہاں کوئی سی جگہ ملتی سو جاتا۔ کبھی خالی زمین پر، کبھی کسی عظیم الشان شہر کے فٹ پاتھ پر اور کبھی جنگل میں کسی چٹان پر اور کبھی کسی سٹیشن کے پلیٹ فارم پر۔

جب بھی امرتسر سے بھاگ کر جاتا تو میرے پاس اتنے پیسے تو ہوتے نہیں تھے۔ کبھی

[illegible] کبھی [illegible] والد صاحب کے کسی واقف کار سے [illegible] سٹیشن [illegible] [illegible]
جاتا۔ امرتسر سے نکلنے کے لئے مجھے ریل کے ٹکٹ کی ضرورت ہوتی تھی۔ امرتسر سے ایک بار نکل جانے کے بعد مجھے کوئی پرواہ نہیں ہوتی تھی۔ میں بغیر ٹکٹ بھی ریل میں بیٹھ جاتا تھا۔ میرے امرتسر سے بھاگنے کی خبر والد صاحب کو فوراً ان کا کوئی نہ کوئی پہلوان دوست پہنچا دیتا تھا اور والد صاحب سٹیشن کی طرف آدمی دوڑا دیتے تھے کہ مجھے پکڑ کر لے آئیں۔ پھر میری خوب ٹھکائی ہوتی تھی۔ میں پہلے بھی کہیں لکھ چکا ہوں کہ والد صاحب نے مجھے اس قسم کی آوارہ گردیوں کی سزا دینے کے لئے کوچوانوں والا ایک سانٹا خاص طور پر بنوایا ہوا تھا۔ اس سانٹے سے مجھے وہ بڑی بے دردی سے مارتے۔ یہ بھی حیرت کی بات ہے کہ میرے دل میں اُن کے خلاف کبھی نفرت کا ہلکا سا خیال بھی پیدا نہیں ہوا تھا۔ میں تب بھی اُن کے آگے اُونچا نہیں بولتا تھا اور پاکستان آنے کے بعد جب وہ کافی بوڑھے ہو گئے تھے تب بھی میں نے کبھی اُن کے سامنے اُونچی آواز میں بات نہیں کی تھی۔

ایک بار تو میں گھر سے بھاگ کر کلکتہ جانے والی گاڑی میں بیٹھ چکا تھا اور گارڈ نے سیٹی بھی بجا دی تھی کہ والد صاحب کا ایک جاسوس پہلوان ڈبوں میں جھانکتا ہوا میرے ڈبے تک بھی پہنچ گیا اور اس نے مجھے کان سے پکڑ کر نیچے اُتار لیا۔ اس کے بعد میں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ امرتسر سے بھاگ کر پہلے لاہور اپنی بڑی ہمشیرہ صاحبہ کے ہاں جاتا۔ پھر لاہور سے فرنٹیئر میل یا ہوڑہ ایکسپریس میں سوار ہو کر بمبئی کلکتے کی طرف نکل جاتا۔ اتنا ضرور کرتا تھا کہ لاہور کے بعد جب ٹرین امرتسر کے سٹیشن پر ٹھہرتی تو میں پہلے ہی سے لیٹرین میں چھپ جاتا تھا۔

میں آپ کو اپنی خانہ بدوشی کے جس سفر کی داستان سنانے چلا ہوں اس کا آغاز امرتسر سے یا لاہور سے نہیں بلکہ بمبئی سے آگے کھنڈوا کے ریلوے سٹیشن سے ہوا تھا۔ اگر آپ برصغیر کا نقشہ کھول کر دیکھیں تو آپ کو بھوپال شہر کے نیچے مغرب کی طرف شہر کھنڈوا کا نام لکھا ہوا نظر آئے گا۔ یہ اس زمانے میں بھی ہندوستان کا اہم شہر تھا۔ یہ بمبئی سے ریل آتے ہوئے رتلام کے بعد اور ہوشنگ آباد سے پہلے آتا تھا اور اس کا سٹیشن کافی

تھا۔ ایک بار [illegible] میں گھر سے بھاگ کر بمبئی آیا ہوا تھا۔ اس بار بمبئی اس خیال سے
[illegible] تھا کہ فلم [illegible] ہوں گا۔ فلموں میں ہیرو آؤں گا اور سب گھر والوں اور رشتے داروں
کو حیران کر دوں گا۔

بمبئی کو اس زمانے میں فلمی مرکز کی حیثیت حاصل تھی اور پنجاب اور صوبہ سرحد کے
خوبصورت ورزشی جسم والے نوجوان ہیرو بننے کے شوق میں بمبئی کا ہی رخ کیا کرتے
تھے۔ میں بمبئی میں ایسے بہت سے نوجوانوں سے ملا تھا جو ہیرو بننے کی آرزو لے کر بمبئی
آئے تھے اور یوں تقریباً فاقہ کشی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مشہور
اداکار امجد خان کے والد جن کا فلمی نام جے انت تھا پرکاش موو ی ٹون کی سٹنٹ فلموں
میں ہیرو کا کردار ادا کیا کرتے تھے۔ اسی قسم کے فلمی عاشقوں میں سے ایک نوجوان کو
میں نے بمبئی کی چرنی روڈ کے ایک ورکشاپ میں ٹائروں کو پنکچر لگاتے دیکھا تھا۔ وہ
جہلم کا اونچا لمبا خوش شکل نوجوان تھا۔ فلم میں ہیرو بننے بمبئی آیا تھا اور دو سال سے چرنی
روڈ کے آٹو ورکشاپ میں پنکچر لگا رہا تھا۔

چنانچہ میں بھی اس دفعہ فلموں میں ایکٹر بننے کا شوق لے کر بمبئی آیا تھا۔ بمبئی میں
میری طرح کے فلمی عاشق بہت مل جاتے تھے اور یہ تقریباً سبھی پنجابی ہوتے تھے اور
لاہوریے زیادہ ہوتے تھے۔ اس وقت میری عمر اٹھارہ انیس سال کے درمیان رہی ہو
گی۔ میں بھی گورا چٹا صحت مند اور خوش شکل امرتسری کشمیری لڑکا تھا۔ اگرچہ فلمی ہیرو بننے
کے لائق نہیں تھا کیونکہ اس زمانے میں فلمی ہیرو بننے کے لئے گھوڑ سواری، تھوڑا بہت گانا
بجانا اور لڑائی مار کٹائی کرنا اور درختوں اور اونچی دیواروں سے نیچے چھلانگیں لگانے کا فن
جاننا ضروری ہوتا تھا۔ مجھے صرف پانی میں تیرنا آتا تھا جو مجھے والد صاحب نے بچپن ہی
میں سکھا دیا تھا۔ اور بندر کی طرح ایک درخت سے دوسرے درخت پر چھلانگ لگانے
میں ماہر تھا۔ اس فن کے لئے میں کمپنی باغ کے درختوں کا مرہونِ منت تھا۔

بہرحال! میں بمبئی پہنچ گیا۔ اس سے پہلے تین چار مرتبہ بمبئی آ چکا تھا۔ بمبئی میرے
لئے نیا شہر نہیں تھا۔ اگرچہ میں ابھی تک سارا بمبئی نہیں دیکھ سکا تھا۔ امرتسر کے ایک میر
صاحب کی [illegible] روڈ پہ لانڈری کی دکان تھی۔ ان کی عمر ساٹھ پینسٹھ سال کی ہو گی۔
نوجوانی میں فلموں میں ہیرو بننے کا شوق لے کر بمبئی آئے تھے، دربدری کی بڑی ٹھوکریں

[illegible] بھی [illegible] فلمی ہیرو نہ بن سکے۔ چھ سات فلموں میں چھوٹا موٹا کام ملا
[illegible] رشتے داروں اور
[illegible] بلیموریا بن کر دکھاؤں گا۔ ڈی بلیموریا اس
زمانے کی سٹنٹ فلموں کا مشہور ہیرو ہوا کرتا تھا۔ بمبئی کے ہو کر رہ گئے۔ درزیوں کا کام
جانتے تھے۔ پہلے درزیوں کا کام شروع کیا، دکان نہ چلی تو لانڈری کی دکان کھول لی۔
ایک مدت سے لانڈری چلا رہے تھے۔ شادی نہیں کی تھی۔ لانڈری کے پیچھے ایک بڑا
کمرہ ڈال لیا تھا۔ رات وہیں سوتے تھے۔ جو کوئی بھولا بھٹکا پنجاب سے ہیرو بننے کا
شوق لے کر آیا ہوا نوجوان فاقہ کشی کرتا مل جاتا تو اسے اپنی لانڈری میں لے آتے،
بڑے کمرے میں اس کے لئے چارپائی ڈال دیتے، اس کے کھانے پینے کا بھی
بندوبست کرتے اور اپنی واقفیت سے کسی نہ کسی فلم کمپنی میں اس کو چھوٹا موٹا کام بھی دلا
دیتے۔ اس دفعہ بمبئی میں میری ان میر صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ میں بھی دربدری کی
حالت میں تھا۔ نوبت فاقہ کشی تک آ گئی تھی۔ ایک مسلمان وکٹوریہ والا یعنی کوچوان مجھے
میر صاحب کے پاس لے آیا۔

میر صاحب نے پہلے تو مجھے سمجھایا کہ میں ایکٹر بننے کا خیال دل سے نکال دوں اور
واپس اپنے ماں باپ کے پاس امرتسر چلا جاؤں۔ میں نے کہا کہ میں ہیرو بننے آیا ہوں
اور گھر والوں کو ہیرو بن کر دکھاؤں گا تو انہوں نے کہا۔

"ٹھیک ہے برخوردار! تم میرے ہاں تھوڑا بہت کام کر دیا کرو، میں کسی فلم کمپنی میں
تمہارے لئے کوشش کروں گا۔"

میں میر صاحب کی لانڈری میں کام کرنے لگا۔ میلے کپڑوں کو الگ الگ گٹھڑیوں
میں باندھتا، ان پر کالے نشان لگاتا، شام کے وقت کسی نہ کسی فلم سٹوڈیو کے چکر لگانے
نکل پڑتا۔ اندھیری کے علاقے میں پرکاش سٹوڈیو تھا جہاں سٹنٹ فلمیں بنتی تھیں۔ میر
صاحب کی واقفیت سے مجھے سٹوڈیو کے اندر جانے کی اجازت مل جاتی۔ وہاں میں نے
اس زمانے کی مشہور ہیروئن پرمیلا دیوی کو دیکھا۔ جے انت کو برجیس پہنے ہاتھ میں ہنٹر
پکڑے دیکھا تو دل میں عہد کر لیا کہ ایک دن میں بھی اسی طرح برجیس پہن کر ہاتھ میں
ہنٹر لئے کھڑا ہوں گا۔ منروا سٹوڈیو بھی جاتا، وہاں امیرچ تارا پوری اور چھایا دیوی

دیکھے۔ شوٹنگ سٹوڈیو میں کمال امروہوی کو دیکھا۔ کاردار سٹوڈیو کے بھی چکر لگاتا۔ رنجیت سٹوڈیو بھی گیا۔ میں تیرہ چودہ سال کا لڑکا تھا۔ ہیرو بننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میر صاحب کی سفارش سے کسی فلم میں چھوٹا موٹا رول بھی نہ ملا۔

میرا دل اُکھڑ گیا۔ امرتسر یاد آنے لگا، گھر کا آرام یاد آنے لگا۔ ایک دن میر صاحب سے کہا کہ میں گھر واپس جانا چاہتا ہوں۔ وہ بڑے خوش ہوئے، مجھے ایک مہینے کی چھٹی تنخواہ دے کر کہا۔

”فوراً آج رات بوری بندر سٹیشن سے پنجاب میل پکڑو اور گھر پہنچ جاؤ! تمہارے ماں باپ تمہیں دیکھ کر بڑے خوش ہوں گے۔“

میر صاحب کو کیا پتہ تھا کہ میرے والد صاحب کا کوچوانوں والا سانٹا میرا انتظار کر رہا ہے۔“

بمبئی کے بوری بندر سٹیشن سے پنجاب میل رات کے نو ساڑھے نو بجے روانہ ہوتی تھی۔ ٹکٹ جہاں تک مجھے یاد رہ گیا ہے پندرہ یا اٹھارہ اُنیس روپے ہوتا تھا۔ میرے پاس سو کے قریب روپے تھے۔ میں نے تھرڈ کلاس کا ٹکٹ لیا۔ پلیئرز سگریٹ کا ایک چپٹا سیاہ رنگ کا پیکٹ خریدا۔ یہ اُس زمانے کے اعلیٰ ترین سگریٹوں میں سے تھا۔ میں نے ٹھنڈی پتلون اور بش شرٹ پہن رکھی تھی۔ سامان نام کی کوئی چیز میرے پاس نہ تھی۔ یہ برسات کا موسم تھا اور بمبئی میں ساون کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ تین چار دن سے رُک رُک کر بوندا باندی ہو رہی تھی۔ فضا گیلی گیلی تھی، مگر حبس بالکل نہیں تھا۔ سٹیشن پر بڑی رونق تھی۔ جب تک ٹرین نہ آئی میں چائے کے سٹال پر کھڑے ہو کر چائے پیتا رہا۔ کھانا وغیرہ مجھے چلتے وقت میر صاحب نے کھلا دیا تھا۔ اب امرتسر اور اپنا گھر شدت سے یاد آنے لگا اور بمبئی مجھے زہر لگنے لگا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ اُڑ کر اپنے گھر پہنچ جاؤں۔

بمبئی سے دو ریلوے ٹریک رتی تک جاتے تھے۔ ایک ریلوے ٹریک کا نام جی آئی پی تھا اور دوسرے ریلوے ٹریک کا نام بی بی اینڈ سی آئی تھا۔ اتنا مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ بوری بندر سے جی آئی پی ریلوے ٹریک والی ٹرینیں چلتی تھیں۔ جبکہ بی بی اینڈ سی آئی ریلوے ٹریک والی گاڑیاں بمبئی سنٹرل سٹیشن سے چلتی تھیں اور وہیں آتی تھیں۔ دونوں روٹوں پر بڑے بڑے شہر آتے تھے۔ جس وقت ٹرین بوری بندر سے چلی، بوندا

باندی ہو رہی تھی۔ تھانہ سٹیشن تک بوندا باندی ہوتی رہی۔ کلیان سے گاڑی چلی تو بارش شروع ہو گئی۔ کھڑکیوں میں سے ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں کے ساتھ بارش کی پھواریں بھی ڈبے میں آنے لگیں۔ کچھ کھڑکیاں مسافروں نے بند کر دیں۔ میں جس کھڑکی کے پاس بیٹھا تھا، یہاں پھوار نہیں آ رہی تھی چنانچہ کسی نے کھڑکی بند کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ میں نے دل میں خدا کا شکر ادا کیا کیونکہ اگر رات کے وقت ڈبے کی کھڑکی بند کر دی جاتی تو میرے لئے اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ مسافروں کی شکلیں دیکھتا رہوں۔ اگرچہ رات کے اندھیرے میں کھڑکی سے باہر بھی کوئی شے واضح طور پر نظر نہیں آ رہی تھی، لیکن بارش کی آواز تو آ رہی تھی۔ ذرا تھوڑی سی پھوار اندر آتی تو میں ساتھ بیٹھے ہوئے مسافر کی طرف دیکھنے لگتا کہ ابھی کہے گا۔

”ابے! کھڑکی بند کیوں نہیں کرتا؟“

لوگ نیچر کے حسن کو کیوں نہیں دیکھنا چاہتے؟ شاید اس میں ان کا بھی کوئی قصور نہیں۔ شاید اُن کی وہ آنکھ بند تھی جو قدرت کے حسن کو بے نقاب دیکھتی ہے۔ ٹرین کے دو قسم کے شور تھے۔ ایک شور ٹرین کے پہیوں کا پٹڑی سے ٹکرا کر دوڑنے کا تھا، دوسرا شور بارش کے ڈبے کی چھت سے ٹکرانے کا۔ دونوں شور مجھے اچھے لگتے تھے۔ دونوں شوروں میں موسیقی تھی۔ نیچر کی موسیقی کے یہ وہ شور تھے جس میں دنیا کی بے ہنگم بے سُری آوازیں گم ہو گئی تھیں۔ اس شور نے مجھے بھی اپنے اندر گم کر لیا تھا۔ اور میں ذرا کان لگا کر غور سے سنتا تو مجھے محسوس ہوتا کہ میرے اردگرد کوئی شور نہیں ہے، کوئی آواز نہیں ہے۔ اور میں جنگلوں کے سناٹوں میں تحلیل ہو گیا ہوں۔

موسلا دھار بارش ساری رات ہوتی رہی۔ ساری رات ٹرین گیلی پٹڑیوں اور بھیگے جنگلوں میں سے گزرتی رہی۔ رات کے پچھلے پہر برہان پور کا سٹیشن آیا۔ بارش اسی طرح ہو رہی تھی۔ یہاں ٹرین اُس زمانے میں تین چار منٹ سے زیادہ نہیں رُکتی تھی۔ اب برہان پور کافی آبادی والا شہر ہو گیا ہے۔ کہتے ہیں اب یہاں ٹرین زیادہ دیر تک ٹھہرتی ہے۔ ٹرین کوئی دس منٹ تک کھڑی رہی، معلوم ہوا کہ آگے بارش کی وجہ سے ریلوے ٹریک کی مرمت کا کام ہو رہا تھا۔ ٹرین آدھ گھنٹے تک برہان پور سٹیشن پر رُکی رہی۔ اُس وقت بادلوں میں سے صبح کا نور جھلکنے لگا تھا۔ بارش کا زور ٹوٹ گیا تھا۔ بادل بڑ

رہے تھے۔ کالی اور مٹی رنگ کی گھٹاؤں نے آسمان کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا تھا۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ ٹرین اب کھنڈوا کی طرف جا رہی تھی۔ بوساول اور جل گاؤں ہم پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ گاڑی کی رفتار زیادہ نہیں تھی۔ معمولی رفتار کے ساتھ چل رہی تھی۔ لوگ کہہ رہے تھے کہ آگے بڑی بارشیں ہو رہی ہیں۔ دریا میں سیلاب آیا ہوا ہے۔ کوئی تین گھنٹوں کے بعد ہم کھنڈوا پہنچے۔ یہاں سے میرے سنسنی خیز ایڈونچر کا آغاز ہونے والا تھا۔

کھنڈوا پہنچنے کے بعد بارش پھر تیز ہو گئی ...

یہاں ٹرین دیر تک کھڑی رہی۔ مسافر ڈبوں سے باہر نکل آئے۔ گارڈ نے بتایا کہ آگے ریلوے لائن سیلاب کی وجہ سے پانی میں ڈوب گئی ہے۔ کسی نے پوچھا کہ اب کیا ہوگا؟ گارڈ نے کہا کہ شام تک انتظار کرنا ہوگا، شاید پانی اُتر جائے۔ مگر بارش پھر شروع ہو گئی ہے، اگر شام تک پانی نہ اُترا تو ہمیں اجین کی طرف سے ہو کر ہوشنگ آباد بھوپال ریلوے ٹریک کو پکڑنا پڑے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ سارا دن ہم پلیٹ فارم پر پڑے رہے۔ میں تو خوش تھا کہ چلو اسی بہانے اجین کی بھی سیر ہو جائے گی۔ بارش رُکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ میں چاہتا تھا بارش اسی طرح ہوتی رہے اور میں ٹرین میں بیٹھا جنگلوں میں سے گزرتا رہوں یا سٹیشنوں کے بھیگتے پلیٹ فارموں پر چائے کے سٹالوں پر کھڑے ہو کر چائے پیتا رہوں۔ اُس زمانے میں لپٹن کی چائے کی خوشبو دُور تک جاتی تھی۔ جن علاقوں میں، میں پھر رہا تھا وہاں بھی چائے بہت زیادہ پی جاتی تھی۔ برسات کے موسم میں تو چائے کا بڑا زور ہوتا تھا۔ چائے کے سٹالوں پر بڑی بڑی تام چینی کی چینکوں سے پیالوں میں چائے اُنڈیلی جاتی تو بارش میں بھیگتے سارے پلیٹ فارم پر اُس کی خوشبو پھیل جاتی۔ اس خوشبو میں بیڑی، قینچی اور پیلا ہاتھی مارکہ سگریٹوں کی مہک بھی شامل ہو جاتی۔ مہاراشٹر اور سوراشٹر کی دُبلی پتلی سانولی عورتیں نیلی پیلی ساڑھیاں پہنے بالوں میں باسی پھولوں کے گجرے لگائے اِدھر سے اُدھر ہرنیوں کی طرح پھرتی نظر آتیں۔ یہ منظر بارش کے حسن میں اور زیادہ اضافہ کر دیتا۔

کھنڈوا اسٹیشن پر ہی شام ہو گئی۔

نئی خبر آئی کہ ٹرین اب اندور کی طرف سے ہو کر ہوشنگ آباد بھوپال جائے گی۔ آخر

رات ہی ہی۔ مسافر ڈبوں میں بیٹھے تھے۔ ٹرین نے پیچھے کی طرف کھسکنا شروع کر دیا اور تھوڑا پیچھے جانے کے بعد ٹرین رک گئی۔ پھر اس نے پٹڑی بدلی اور اندور کی طرف چل پڑی۔ پو پھٹنے کے وقت اندور کا شہر آیا۔ یہاں پھر ٹرین دیر تک رکی رہی۔ بارش کا سلسلہ جاری تھا۔ کوئی ایک گھنٹہ رُکنے کے بعد ٹرین ہوشنگ آباد کی طرف چلنے لگی۔ ٹرین کی رفتار بہت ہلکی تھی۔ دن نکل آیا تھا، آسمان پر اسی طرح گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ بارش موسلا دھار تو نہیں ہو رہی تھی، بوندا باندی جاری تھی۔ ٹرین ایک نیم پہاڑی علاقے کی ندی پر سے گزری، ندی بھی چڑھی ہوئی تھی، بالکل دریا لگ رہی تھی۔ دُور کناروں کے درخت آدھے پانی میں ڈوبے ہوئے تھے۔

کافی دیر تک ٹرین بہت آہستہ آہستہ چلتی رہی، پھر ایک چھوٹے سٹیشن پر آ کر رُک گئی۔ یہاں تھوڑی دیر رُکنے کے بعد ایک بار پھر پیچھے کی طرف کھسکنے لگی۔ معلوم ہوا کہ گاڑی کی پچھلی طرف نیا انجن لگ گیا ہے۔ آگے کا انجن الگ ہو گیا ہے۔ اور اب ٹرین واپس اندور جا رہی ہے کیونکہ ہوشنگ آباد کا ریلوے ٹریک پانی میں ڈوبا ہوا ہے۔ اب واقعی میں بھی بور ہو گیا۔ مجھے ہوشنگ آباد، اندور اور یہ سارا علاقہ زہر لگنے لگا۔ اس علاقے نے مجھے اپنے اندر قید کر کے رکھ لیا تھا۔ مسافر بھی تنگ آ گئے تھے۔ کسی کو کہیں جانا تھا، کسی کو کہیں۔ مگر سب مجبور تھے۔ موسلا دھار بارشوں نے بندھیا چل کے سارے علاقے میں جل تھل کر دیا تھا۔ بڑی مشکل کے بعد اندور کا سٹیشن آیا۔ یہاں سے گاڑی واپس کھنڈوے کی طرف روانہ ہو گئی۔ دوسرے دن کھنڈوا پہنچے۔ جہاں سے چلے تھے ایک بار پھر وہیں آ گئے۔ میرا جی چاہا کہ سٹیشن سے نکل کر پیدل ہی ہوشنگ آباد کی طرف چل پڑوں۔ آخر کہیں نہ کہیں سے کوئی بس یا لاری مل ہی جائے گی۔ پیسے میرے پاس موجود تھے۔ میں نے ایک مسافر سے بات کی تو وہ کہنے لگا کہ خبردار لڑکے! یہ حرکت نہ کرنا۔ راستے میں بڑے گھنے جنگل آتے ہیں۔ دریا چڑھے ہوئے ہیں، ندی نالوں میں طغیانی آئی ہوئی ہے۔ ٹرین میں ہی بیٹھے رہو! کل تک پانی اُتر جائے گا۔

مگر میں اس قدر بور ہو چکا تھا کہ میں نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ اگر آج رات تک گاڑی آگے روانہ نہ ہوئی تو میں کھنڈوے سٹیشن سے نکل کر شہر کی طرف چلا جاؤں گا وہاں سے ہوشنگ آباد کی طرف جانے کی کوشش کروں گا۔ حقیقت یہ ہے کہ میں ابھی

جانے کے خطرناک جنگلوں سے واقف نہیں تھا۔ گو وسط پردیش اور روہیل کھنڈ کے جنگل خود دیکھے تھے مگر وسطی ہند کے یہ جنگل میرے لئے اجنبی تھے اور ٹرین یا بس یا لاری جن سڑکوں پر سفر کرتی تھیں وہ ان جنگلوں میں سے ہو کر گزرتی تھیں۔ گاڑی میں ایک لڑکا میرا دوست بن گیا تھا۔ وہ ہوشنگ آباد سے ناگ پور جانے والی ریلوے لائن پر واقع ایک قصبے دھارا دھری کا رہنے والا تھا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ کھنڈوا سے آگے بڑے خطرناک جنگلوں کا علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔ یہ جنگل چھوٹی بڑی پہاڑیوں میں گھرے ہوئے ہیں اور ان میں شیر، ہاتھی، چیتے اور سانپ غرض کہ ہر قسم کے خطرناک جانور رہتے ہیں۔ اور ان جنگلوں میں شکاری بھی پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہیں۔

ان پُراسرار جنگلوں کا حال سن کر میرے دل میں وہاں جانے کی بے پناہ خواہش بھی بیدار ہو رہی تھی۔ لیکن میرا شوق کہ جنگل دیکھوں، ان جنگلوں میں گھومتے پھرتے شیروں کو درختوں پر چڑھ کر دیکھوں، کہتے ہیں ان جنگلوں میں عجیب عجیب رنگ والے پھول ہوتے ہیں۔ میں وہ پھول بھی دیکھنا چاہتا تھا۔ میرے دوست نے مجھے بتایا کہ ہوشنگ آباد کے جنگلوں میں آسیب بھی بہت ہوتا ہے۔ ان میں اُن دیہاتیوں کی بدروحیں بھی ہوتی ہیں جنہیں شیروں نے چیر پھاڑ کر رکھ لیا ہوتا ہے۔ میرا یہ ٹرین کا دوست مسلمان تھا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ ہوشنگ آباد کے ایک جنگل میں ایک بزرگ کا مزار بھی ہے جس کے پاس مغلوں کے زمانے کی ایک پرانی باولی ہے۔ کہتے ہیں ایک مغل کنیز اس باولی میں ڈوب کر مر گئی تھی۔ اُس کی رُوح بھی اکثر راتوں کو باولی کے پاس پھرتی رہتی ہے۔ ان باتوں نے میرے شوق کو اور تیز کر دیا کیونکہ مجھے روحوں سے ملنے کا شروع ہی سے بڑا شوق تھا۔ اگرچہ اُس وقت تک میں کسی نیک رُوح یا بری رُوح سے کبھی نہیں ملا تھا۔ میں نے اپنے دوست سے پوچھا۔

"تم مجھے یہ بتاؤ! کہ اگر میں کھنڈوا سے ہوشنگ آباد جانا چاہوں تو مجھے ریل گاڑی کے سوا یہاں سے اور کون سی سواری مل سکتی ہے؟"

میرے دوست نے مجھے سختی سے منع کیا اور کہا کہ بارش اور سیلاب کی وجہ سے سارے راستے بند ہیں۔ مجھے ٹرین میں ہی بیٹھے رہنا چاہئے۔ مگر میں ماننے والی جنس نہیں تھا۔ ہمیشہ اپنی مرضی کی تھی اور کبھی کسی کی نصیحت پر عمل نہیں کیا تھا۔ اپنی اس عادت کی

[illegible] بڑی بڑی تھیں مگر زندگی کے حیرت انگیز پوشیدہ گوشے [illegible] تھے۔

ساری رات ریل گاڑی کھنڈوا سٹیشن پر رکی رہی، دوسرے دن اعلان ہوا کہ ٹرین اب واپس جل گاؤں جائے گی جہاں سے رُوٹ بدل کر راجستھان سے ہوتی ہوئی رتی متھرا جائے گی۔ یہ بڑا لمبا، خشک اور اُکتا دینے والا سفر تھا۔ ہوشنگ آباد کے جنگلوں کے اتنے قریب آ کر میں انہیں دیکھے بغیر واپس نہیں جانا چاہتا تھا۔

دوسرے دن جب ٹرین جل گاؤں کی طرف واپس روانہ ہوئی تو میں اُس ٹرین میں سوار نہیں تھا بلکہ سٹیشن سے باہر چائے کے ہوٹل کے بنچ پر بیٹھا بند مکھن کا ناشتہ کر رہا تھا۔ ناشتہ کر کے میں نے چائے منگوائی اور سوچنے لگا کہ یہاں سے مجھے کون سی سواری مل سکتی ہے؟ میرے قریب ہی ایک مزدور بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ میں نے اُس سے کہا کہ بھائی! مجھے ہوشنگ آباد جانا ہے، یہاں سے کون سی لاری یا بس مل سکتی ہے؟ وہ کہنے لگا۔

"آگے چوک میں ایک لاری اڈہ ہے۔ وہاں جا کر پتہ کر لو! شاید اُس طرف کوئی لاری جاتی ہو۔ آگے بہت پانی ہے، کل تک تو کوئی لاری اُس طرف نہیں گئی تھی۔"

میں نے ہوٹل والے کو بل ادا کیا اور کھنڈوا کے چھوٹے سے بازار میں سے گزرتا، چھوٹی بڑی ہر قسم کی دکانوں اور لوگوں کو دیکھتا اگلے چوک میں آ گیا۔ یہاں ایک لاری اڈہ موجود تھا۔ معوم ہوا کہ دوپہر کے بعد ایک لاری ڈھیمر والی کو جائے گی۔ وہاں سے مجھے ہوشنگ آباد کی لاری مل سکتی ہے۔ میں نے اسے غنیمت جانا اور ڈھیمر جانے والی لاری کا ٹکٹ لے لیا۔ دوپہر تک شہر کے بازاروں اور گلیوں میں گھومتا پھرتا رہا، دوپہر کے بعد ڈھیمر والی لاری میں بیٹھ گیا۔ لاری میں کافی مسافر بیٹھے تھے۔ اُن میں دیہاتی عورتیں بھی تھیں۔ اُس وقت تو بارش رُکی ہوئی تھی، لاری شہر سے باہر نکلی تو ایک بار پھر بوندا باندی شروع ہو گئی۔ یہ علاقہ ہی بارشوں کا تھا۔ برسات کے موسم میں کئی کئی دنوں کی جھڑی لگتی تھی۔ شہر اور ریاست کے ننانوے فیصد مکانوں کی چھتیں ڈھلوان اور کھپریل کی بنی ہوئی تھیں۔ شہر سے نکلنے کے کچھ دیر بعد جنگلی پہاڑی علاقہ شروع ہو گیا۔ جہاں جہاں کھیت تھے وہاں پانی کھڑا تھا۔ کوئی ایک ڈیڑھ گھنٹے کے سفر کے بعد ڈھیمر والی آیا۔ پہاڑی کے دامن میں چھوٹا سا قصبہ تھا۔ یہاں سے ایک ریلوے لائن بھی دواسو

ڑھ سے ہوتی ہوئی ہوشنگ آباد کو جاتی تھی۔ مگر اُس طرف کی ریلوے لائن پر بھی کوئی
گاڑی نہیں آ جا رہی تھی۔ رات میں نے ڈھیر والی کے لاری اڈے پر ہی گزاری، اگلے
روز کافی دن چڑھے ایک لاری دواسو گڑھ کے لئے روانہ ہوئی تو میں اُس میں سوار ہو
گیا۔

○

شوق آوارگی مجھے لئے جا رہا تھا اور میں غلطی پر غلطی کرتا جا رہا تھا۔ لاری کی ساری
سواریاں سوائے میرے ڈھیر والی کی تھیں۔ لاری کو آگے نہیں جانا تھا، وہیں سے واپس
چلے جانا تھا کیونکہ ایک تو آگے کی کوئی سواری نہیں تھی، دوسرے آگے دریا چڑھا ہوا تھا۔
دریا کا سن کر میرے شوق کو تازیانہ لگا۔ یہ میں نے محاورے کے طور پر تازیانہ استعمال کیا
ہے۔ ویسے جو تازیانے یعنی سانٹے مجھے والد صاحب امرتسر والی دُکان کے پیچھے لے جا
کر مارا کرتے تھے اُن کی لذت ہی کچھ اور تھی۔

میں آگے جو دریا چڑھا ہوا تھا اُسے دیکھنا چاہتا تھا۔ یہ پہاڑی علاقہ تھا۔ بھورے اور
سبز رنگ کی چھوٹی بڑی پہاڑیوں کا سلسلہ دُور تک چلا گیا تھا۔ بارش رُکی ہوئی تھی، ڈھیر
والی سے ایک بیل گاڑی اگلے کسی قصبے یا گاؤں کو جا رہی تھی۔ اس میں کچھ دیہاتی پہلے
سے بیٹھے ہوئے تھے۔ گاڑی بان نے مجھ سے دو آنے کرایہ لیا۔ میں بھی بیل گاڑی کی
ایک طرف بیٹھ گیا، بیل گاڑی چل پڑی۔ سڑک کہیں کچی تھی اور کہیں اینٹیں اور پتھر جوڑ
کر پکی کی ہوئی تھی۔ دُور دُور درخت تھے۔ دونوں جانب جھاڑیاں اور سرکنڈے اُگے
ہوئے تھے۔ گاڑی کے آگے دو مریل سے بیل جتے ہوئے تھے جو اپنی دُھن میں نپی تلی
چال سے چلے جا رہے تھے۔ ابھی دن کی روشنی پھیلی ہوئی تھی، بیل گاڑی کسی ٹیلے کے
قریب سے گزرتی تو مجھے ڈھلان پر اُگی ہوئی جنگلی جھاڑیاں صاف نظر آتیں۔ یہاں
میں نے ایک صحت مند موٹے تازے جنگلی بلے کو پہاڑی پر چڑھتے دیکھا۔ پہلے تو میں
نے چیتا سمجھا، مگر بیل گاڑی میں بیٹھے ہوئے ایک دیہاتی نے کہا کہ بلا ہے بلا!

علاقہ پہاڑی تھا۔ کبھی ہموار زمین آ جاتی، کبھی چڑھائی اُترائی آ جاتی۔ کھڈیں اور
برساتی نالے بھی تھے جن میں گہرے رنگ کا برساتی پانی بہہ رہا تھا۔ سڑک پر کہیں پانی
میں کھڑا تھا۔ چیتل ورگ پہنچ کر ہم لوگ بیل گاڑی سے اُتر پڑے۔ چھوٹا سا جنگلی قصبہ

تھا، جھونپڑیاں ہی جھونپڑیاں تھیں۔ ان جھونپڑیوں کی دیواریں پتھریلی تھیں مگر ڈھلوا
چھتیں کھپریل یا گھاس پھونس کی تھیں۔ کالے کالے دبلے پتلے جنگلی لوگ جگہ جگہ نظر
رہے تھے۔ ایک جھونپڑے میں آٹا، چاول، نمک، تیل کی معمولی سی دُکان تھی۔ کھا
پینے کو وہاں سوائے ناریلوں کے اور کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے دُکاندار
کہا کہ یہاں کہیں کھانے کو کچھ مل جائے گا؟ میں پانچ روپے کا نوٹ نکال کر اسے د
لگا تو وہ بولا۔

''ساتھ والی جھونپڑی میں جا کر بیٹھ جاؤ! میں تمہارے لئے کچھ کھانے پینے کو لا
ہوں۔''

ساتھ والی جھونپڑی میں گھاس پھونس کا فرش بچھا تھا۔ میں وہاں بیٹھ گیا۔ تھوڑی
دیر بعد وہی دُکاندار المونیم کی چھوٹی دیگچی لے کر آ گیا۔ اُس نے گھاس پر میرے آ
کیلے کا چوڑا پتہ بچھا دیا، دیگچی میں سے کھچڑی نما چاول نکال کر اُس پر ڈالے اور بولا۔

''تم کھاؤ! میں تمہارے لئے پانی لے کر آتا ہوں۔''

وہ جو کچھ بھی تھا، اس سے میری بھوک ختم ہو گئی۔ میں نے اُس آدمی کو پانچ رو
دینے چاہے جو اُس نے نہ لئے۔ کہنے لگا۔ ''میری گھر والی نے سب کچھ پکایا تھا۔
کسی ہوٹل یا ڈھابے سے نہیں لایا۔''

اُس نے مجھے بیڑی پینے کو دی، خود بھی بیڑی سلگا لی۔ میری طرف غور سے د
ہوئے بولا۔ ''تم اتنی چھوٹی عمر میں کہاں مارے مارے پھر رہے ہو؟ تمہارا رنگ ر
بتاتا ہے کہ تم پنجاب کے ہو۔''

''میں نے کہا۔ ''ہاں...... میں امرتسر کا رہنے والا ہوں۔ اس علاقے کے ج
دیکھنے کا شوق مجھے یہاں کھینچ لایا ہے۔''

وہ آدمی جس زبان میں مجھ سے بات کر رہا تھا وہ اُردو، ہندی اور مقامی بولی
ملی زبان تھی۔ اُس کا لہجہ ایسا تھا کہ کئی لفظ میری سمجھ میں نہیں آتے تھے۔ میں اُس
کے مکالمے سلیس اُردو میں لکھ رہا ہوں۔ اُس نے بھی مجھے ہوشنگ آباد کے جنگلوں
جانے سے منع کیا۔ میں نے کہا۔

''بھیا جی! اب اُن جنگلوں کو دیکھے بغیر واپس نہیں جاؤں گا۔''

وہ جنگلی دیہاتی کہنے لگا۔ ''یہ جنگل صرف شیر، چیتوں، ہاتھیوں اور سانپوں کے رہنے
کی جگہ ہے۔ وہاں تو شکاری لوگ بھی جاتے ہوئے سوچتے ہیں کہ جائیں یا نہ جائیں۔
اُس طرف جانے کا خیال دل سے نکال دو!''

مگر میں اپنی ضد پر اڑا رہا اور اُس سے بار بار یہی پوچھتا کہ مجھے بتاؤ یہاں سے میں
ان جنگلوں میں کس طرف سے اور کیسے جا سکتا ہوں؟

جب اُس شخص کو یقین ہو گیا کہ میں باز آنے والا نہیں ہوں تو بولا۔ ''اب تو شام
ہونے والی ہے۔ صبح تمہارا کوئی سربند کر دوں گا۔''

رات میں نے اُس جھونپڑے میں مچھروں سے لڑتے ہوئے گزاری۔ دوسرے روز
یہ آدمی ایک جنگلی کو پکڑ کر لے آیا۔ اُس جنگلی آدمی نے صرف لنگوٹی پہن رکھی تھی، ہاتھ میں
نیزہ تھا۔ مجھے ریڈ انڈین اور امیزون کے جنگلوں کے جنگلی لوگ یاد آ گئے۔ وہ کہنے لگا۔

''یہ آدمی اُسی جنگل سے نمک، تیل لینے آیا تھا۔ یہ آج واپس جا رہا ہے۔ اگر ابھی
تک تمہارا بھوت نہیں اُترا تو اس آدمی کے ساتھ چلے جاؤ! یہ تمہیں چیتل ورگ تک لے
جائے گا۔ وہاں سے ہوشنگ آباد کے گھنے جنگل شروع ہو جاتے ہیں۔''

جنگلی آدمی اپنے ساتھ دو خچر لایا تھا۔ ایک پر وہ خود بیٹھ گیا، دوسرے خچر پر اُس نے
تیل، نمک اور دوسرا سامان لاد دیا اور مجھے بھی اُسی خچر پر بٹھا دیا اور ہم چیتل ورگ کی
طرف روانہ ہو گئے۔ بادل اُسی طرح چھائے ہوئے تھے، ہوا بند تھی، حبس کی کیفیت تھی۔
بارش کل سے رُکی ہوئی تھی۔ ہمارے خچر ہری بھری جھاڑیوں والے ٹیلوں کے درمیان
آہستہ آہستہ سفر کر رہے تھے۔ ٹیلوں سے باہر نکلے تو سامنے بڑا دریا نظر آیا۔ جنگلی آدمی
ایسی زبان بولتا تھا کہ جس کا کوئی کوئی لفظ ہی میری سمجھ میں آتا تھا۔ وہ خچر سے اُتر پڑا اور
اشارے سے مجھے بھی اُترنے کو کہا۔

دریا پر ریل کا بہت بڑا پل بنا ہوا تھا جس کی آہنی گارڈروں والی قینچیاں بنی ہوئی
تھیں۔ ہم خچروں کو لے کر چڑھائی چڑھ کر پل پر آ گئے۔ ریلوے لائن دُور تک خالی
پڑی تھی، ایک طرف پیدل چلنے والوں کے لئے چھوٹا سا راستہ بنا ہوا تھا۔ ہم اُس ٹریک
پر چل رہے تھے۔ پل کی آہنی قینچیوں میں سے نیچے بہتا ہوا زبردست دریا نظر آ رہا تھا
جس کو دیکھ کر دل پر دہشت طاری ہو رہی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ اگر ٹرین آ گئی تو خچر

بدک کر ریلوے ٹریک پر چڑھ جائیں گے اور ہماری جان کو بھی خطرہ ہو سکتا ہے۔ م
نے جنگلی آدمی کو بڑی مشکل سے جب ریل گاڑی کے بارے میں بتایا تو اُس نے مجھ
بتایا کہ ریل گاڑیاں بند ہیں۔ تب مجھے خیال آیا کہ واقعی ٹرینوں کی آمد و رفت تو معطل
ہو چکی ہے۔

دریا کا پاٹ بہت بڑا تھا۔ ہمیں پل کی دوسری طرف پہنچنے میں کافی وقت لگا۔ اُ
سے آگے ایسا علاقہ شروع ہو گیا جہاں ٹیلے دُور دُور تھے۔ کھیت بھی تھے، کہیں کہیں بانس
کے درختوں کے جھنڈ بھی تھے۔ اُن کے درمیان ایک پگڈنڈی تھی جس پر ہم چل ر
تھے۔ ہم خچروں پر بیٹھ گئے تھے۔ کھیتوں کے بعد ایک اُونچے ٹیلے کے دامن میں د
بارہ جھونپڑیاں نظر آئیں۔ یہ جنگلی آدمی یہیں رہتا تھا۔ جھونپڑیوں کے پاس پہنچ کر
خچروں سے اُترے تو مجھے دیکھنے کالے کالے ننگ دھڑنگ بچے، کچھ جنگلی آدمی اور کا
کالی جنگلی عورتیں آ گئیں۔ میرے جنگلی گائیڈ نے اُنہیں اپنی بولی میں میرے بارے م
بتایا۔ وہ سب حیرت سے میری طرف دیکھنے لگے۔ وہ رات میں نے وہیں ایک جھونپڑ
میں گزاری۔ اگلے روز میں نے دیکھا کہ دُور کچھ فاصلے پر ایک سیاہ دیوار سی کھڑی تھی
میں نے اُس دیوار کے بارے میں جنگلی گائیڈ سے پوچھا تو اُس نے مجھے سمجھایا کہ
دیوار نہیں ہے بلکہ ہوشنگ آباد کے جنگل کے درختوں کی لمبی قطار ہے۔ یہاں سے جنگل
شروع ہوتا ہے۔

میں نے جنگلی گائیڈ سے کہا۔ ''کیا تم مجھے اُس جنگل میں لے چلو گے؟''

جنگلی گائیڈ نے مجھے ایک بار پھر سمجھایا کہ میں دن کے وقت بھی کسی تجربہ کار شکار
کے بغیر اُس جنگل میں جانے کا خیال دل سے نکال دُوں۔ ساتھ ہی اُس نے میر
ساتھ جانے سے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ یہاں سے دوپہر کے وقت ایک بیل گاڑ
دریا کے پل تک جائے گی، تم پل پر سے گزر کر آگے چیتل ورگ چلے جانا۔ دوبارہ ا
اِدھر کا خیال آئے تو کسی شکاری کے ساتھ آنا۔

مجھ پر اُس کی باتوں کا کوئی اثر نہ ہوا۔ میں نے یہی کہا کہ ٹھیک ہے۔ میں واپس
جاؤں گا۔ جنگلی اپنے اپنے کام کاج میں لگ گئے، میں یونہی ٹہلتا ہوا بائیں جانب وا
پہاڑی کے پاس آ گیا۔ یہاں کیلے کے درختوں کے جھنڈ تھے۔ زرد کیلوں کے گچھے

ے تھے۔ میں نے ایک کیلا توڑ کر کھایا، بڑا میٹھا تھا۔ مگر اُس میں ہری چھال والے
کیلے کی خوشبو نہیں تھی۔ میں اُن درختوں کے پیچھے سے ہو کر دھان کے کھیتوں میں آ کر
ور ہوشنگ آباد کے جنگل کے درختوں کو دیکھنے لگا جو دن کی ابر آلود روشنی میں لمبی سیاہ
یوار کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔

میں نے اللہ کا نام لیا اور اُس طرف چل پڑا۔

دھان کے کھیتوں میں پانی ہی پانی تھا۔ درمیان میں پگڈنڈیاں بنی ہوئی تھیں۔ یہ
کھیتوں کی مینڈھیں تھیں۔ میں اُن پر چل رہا تھا۔ جیسے جیسے میں آگے بڑھ رہا تھا جنگل
کے درختوں کی سیاہ دیوار قریب آتی جا رہی تھی۔ دھان کے کھیت ختم ہو گئے تھے۔
امنے درختوں کے جھنڈ قطار کی شکل میں مغرب سے مشرق کی طرف چلے گئے تھے۔ اُن
رختوں کے آگے اندر کی جانب اور بھی گنجان گنجان درخت تھے۔ اُن کے درمیان جنگلی
جھاڑ جھنکاڑ اُگا ہوا تھا۔ کئی درختوں کو جنگلی بیلوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ کسی پرندے کے
لنے کی مسلسل آواز آ رہی تھی۔ یہ ہوشنگ آباد رینج کے مشہور جنگلوں کا سلسلہ تھا۔ میں
نگل کے کنارے کھڑے ہو کر درختوں کو دیکھ رہا تھا۔ وہاں ہلکا ہلکا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔
یک عجیب قسم کا دہشت ناک سناٹا تھا۔ مجھے جنگل سے ڈر لگنے لگا۔ مجھے ایسے لگا کہ ابھی
وئی شیر یا چیتا ان درختوں میں سے نکل کر مجھ پر حملہ کر دے گا۔ مجھ پر خوف طاری ہو
گیا۔ مگر یہ خوف تھوڑی دیر کے بعد دُور ہو گیا۔ دل نے کہا اتنی دُور سے یہاں آئے ہو تو
ب جنگل کی تھوڑی سیر بھی کر لو! اللہ مالک ہے، جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ ایسی بھی کوئی
یامت نہیں آ جائے گی۔

میں جنگل میں داخل ہو گیا۔

جنگل زیادہ گھنا ہوتا جا رہا تھا اور اُس کی پُراسرار خاموشی زیادہ ڈراؤنی ہوتی جا رہی
تھی۔ وہاں کوئی پگڈنڈی نہیں تھی۔ میں جھاڑیوں کے درمیان آہستہ آہستہ چاروں طرف
ظر رکھے آگے بڑھ رہا تھا۔ خدا جانے یہ درخت کس قسم کے تھے، اور اُن کا نام کیا تھا؟
ے گھنے تھے، تنے سینکڑوں برس پرانے لگتے تھے۔ اُن درختوں کی شاخیں ایک
وسرے میں اُلجھی ہوئی تھیں۔ جس پرندے کی آواز پہلے آ رہی تھی، وہ بھی اب نہیں آتی
تھی۔ خاموشی گہرے سکوت میں بدل گئی تھی۔ میں ایک جگہ آ کر رُک گیا۔ یہاں بانس

کے درخت ساتھ ساتھ اُگے ہوئے تھے اور اُن کی کانٹے دار ٹہنیوں نے سائبان کی طر سایہ ڈال رکھا تھا۔ زمین گیلی تھی، گیلی گھاس کچلی ہوئی تھی جیسے اُن پر سے جنگلی جا گزرتے رہے ہوں۔ ایک پگڈنڈی سی بنی ہوئی تھی۔ میں اُس پگڈنڈی پر چلنے لگا جہاں پگڈنڈی ختم ہوتی تھی وہاں آگے ایک کھلی جگہ آ گئی۔ نیم دائرے کی شکل اُونچے اُونچے سرسبز درختوں کے جھنڈ ایک دوسرے میں گھل مل گئے تھے، اُن میں سے درختوں پر جنگلی بیلیں نیچے سے لے کر اُوپر تک چڑھی ہوئی تھیں۔ یہ پھولدار بیلیں تھیں ساری بیلیں سرخ، گلابی، نیلے، زرد اور سفید پھولوں سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ ایسے لگ تھا جیسے درختوں کے اُوپر سے ہیرے موتیوں، زمرد اور جواہرات کی آبشاریں گر ر ہیں۔ میں جنگل کی دہشت سے خوفزدہ بھی تھا، لیکن یہاں آ کر جنگل کے حسن میں محو ہو گیا۔ میں بے اختیار اُن درختوں کے پاس آ گیا۔ مرطوب فضا میں جنگلی بیلوں پھولوں کی طلسمی خوشبو رچی ہوئی تھی۔ یہ قدرت کے بنائے ہوئے سینکڑوں بلکہ ہزار سال پرانے جنگل کی خوشبو تھی۔

میں اُس بچے کی طرح اُن پھولوں کو دیکھ رہا تھا جو گھر کا راستہ بھول کر دن بھر رہا ہو، اور پھر اچانک اپنے گھر کے سامنے آ گیا ہو۔ نہ بارش تھی، نہ ہوا چل رہی تھی کوئی پرندہ بول رہا تھا۔ ایک عجیب سناٹا تھا جس کی سنسناہٹ سنائی دیتی تھی۔ زمین بھی زرد، گلابی، سرخ، نیلے چھوٹے چھوٹے پھول بکھرے ہوئے تھے۔ ایک چھوٹا جنگلی راستہ آگے کو جاتا تھا۔ اُس کو بانس کی سرسبز اور گنجان شاخوں نے ڈھانپ تھا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ اس سرنگ نما راستے کے آگے کیا ہے؟ آگے کوئی شیر اچانک سامنے آ سکتا تھا۔ لیکن میرا دیوانہ شوق مجھے آگے لئے جا رہا تھا۔ میں اپنی طر سے بڑا چوکس ہو کر آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا آگے بڑھا۔ پندرہ بیس قدم چلنے کے سرنگ ختم ہو گئی۔ سامنے گھاس کا ایک غیر ہموار قطعہ تھا جس کے ایک جانب کسی پھوٹی پرانے زمانے کی عمارت کا کھنڈر دکھائی دیا۔

مجھے یاد آ گیا...... میرے ٹرین کے دوست نے مجھے بتایا تھا کہ اس جنگل میں زمانے کی ایک باؤلی ہے اور کسی بزرگ کی قبر بھی ہے۔ میں کھنڈر کے پاس آ گیا۔ کے محرابی دروازے کا پلستر اُکھڑ چکا تھا۔ دہلیز جنگلی گھاس میں چھپی ہوئی تھی۔ ڈ

ے اوپر چھت آدھی ڈھے گئی تھی جس میں سے آسمان کی ہلکی ہلکی روشنی نیچے آتی تھی۔ ں نے ڈیوڑھی میں جھانک کر دیکھا۔ یہ ڈیوڑھی نہیں تھی بلکہ سیڑھیاں تھیں جو دُور نیچے وَلی تک چلی گئی تھیں۔ باؤلی ایک کشادہ چوبچے کی طرح تھی جس میں معلوم نہیں پانی تھا نہیں تھا؟ دُھندلے اندھیرے میں مجھے باؤلی کی سطح پر سبز کائی اور گرے پڑے پتے ہی ظر آ رہے تھے۔ نیچے اُترتے ہوئے مجھے ڈر لگ رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ بزرگ کا مزار ی یہیں کہیں ہوگا۔ میں کھنڈر کے دوسری جانب آ گیا۔ یہاں تھوڑا نشیب تھا، ایک جگہ نگلی بیلوں نے چھت سی ڈال رکھی تھی۔ میں نشیب سے اُتر کر وہاں گیا تو دیکھا کہ جنگلی یلوں کی چھت کے نیچے ایک قبر بنی ہوئی ہے۔ قبر پر پتھر لگے ہیں۔ پیچھے ایک طاق میں ٹی کا دیا پڑا ہے جو بجھا ہوا ہے۔ دیئے میں تیل بھی موجود تھا، لگتا تھا کہ رات کے وقت سے جلایا جاتا ہے۔ مگر اس خطرناک جنگل میں رات کو کون دیا جلانے آتا ہوگا؟ مزار پر کوئی کتبہ وغیرہ نہیں لگا تھا۔ قبر پر باسی پھولوں کے دو تین ہار پڑے تھے۔ خدا جانے یہ کس کا مزار تھا؟

میں نے فاتحہ پڑھ کر مرحوم کی بخشش کی دُعا مانگی اور ادھر اُدھر جنگل میں دیکھنے لگا۔ بھی تک اس جنگل میں مجھے کوئی جنگلی درندہ نظر نہیں آیا تھا، کسی سانپ کو بھی نہیں دیکھا تھا۔ راستے میں کوئی دلدلی میدان بھی نہیں آیا تھا۔ ہو سکتا ہے یہ ساری چیزیں جنگل میں آگے جا کر پائی جاتی ہوں۔ میں ابھی جنگل کے شروع کے علاقے میں ہی تھا۔ میں قبر کے پاس بیٹھ گیا، سوچنے لگا کہ کیا مجھے جنگل میں آگے جانا چاہئے یا یہیں سے واپس چلے جانا چاہئے؟ چونکہ ابھی تک میں کسی خطرے سے دوچار نہیں ہوا تھا اس لئے میرا حوصلہ بلند تھا۔ میں نے یہی فیصلہ کیا کہ کچھ دیر یہاں بیٹھتا ہوں، پھر جنگل میں تھوڑا آگے جا کر اُس کنارے والے جنگل کے وسطی حصے کی سیر کروں گا۔

جنگل پر گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی، دو ایک پرندوں کے بولنے کی آواز کبھی کبھی آ جاتی تھی، اب وہ بھی غائب ہو گئی تھی۔ تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد میں اُٹھا ہی تھا کہ گھنے جنگل کی طرف سے کوک کوک کی آواز آئی، پھر میرے قریب ہی ایک درخت پر بندر گھبراہٹ میں خوخو کی آوازیں نکالتے ٹہنیوں پر ادھر اُدھر بھاگنے لگے۔

میں نے جنگل کی کہانیوں میں پڑھا ہوا تھا کہ جنگل میں جب شیر شکار کی تلاش میں

اپنی کچھار سے نکلتا ہے تو جنگلی جانور شور مچا کر ایک دوسرے کو خبردار کرتے ہیں کہ ا
اپنی جان بچاؤ! جنگل کا بادشاہ آ رہا ہے۔ اس خیال کے آتے ہی میرے جسم میں خو
کی سرد لہر دوڑ گئی۔ جنگل کی ساری خوبصورتی اور اس کا پُراسرار حسن غائب ہو گ
اچانک شیر کی دھاڑ سے جنگل کی خاموش فضا گونج اُٹھی۔ درختوں پر سے پرند
پھڑ پھڑا کر اُڑ گئے۔ بندروں کا شور ختم ہو گیا۔ میری ایک لمحے کے لئے ایسی حالت ہ
کہ جیسے زمین نے مجھے جکڑ لیا ہو۔ میرے قدم ایک ایک من بھاری ہو گئے، سارا
دہشت کے مارے سرد پڑ گیا۔ یہ حالت ایک دو سیکنڈ تک ہی رہی۔ شیر کی دوسری د
پر میں بے اختیار ایک درخت کی طرف دوڑا۔ گھبراہٹ میں جو درخت سامنے آیا اُس
چڑھنے کی کوشش کرنے لگا مگر اُس درخت کی ٹہنیاں کافی اُونچی تھیں۔ میں گھبرا
دوسرے درخت کی طرف بھاگا۔ کسی نہ کسی طرح اُس درخت پر چڑھنے میں کامیاب
گیا۔ میں دیوانہ وار درختوں کی ٹہنیوں کو اِدھر اُدھر کرتا چڑھ رہا تھا۔ نیچے کی دو شاخو
چھوڑ کر میں تیسری موٹی ٹہنی کی دوہری شاخ پر بیٹھ گیا۔ میرا دل اس طرح دھڑک ر
کہ پہلے کبھی اس طرح نہیں دھڑکا تھا۔ خوف سے میرے ہونٹ خشک ہو گئے تھے
سوکھ گیا تھا۔ میں درخت کی ٹہنی سے چمٹ کر بیٹھا تھا اور پتوں میں سے نیچے دیکھ رہا
مجھے یقین تھا شیر انسان کی بو پر اس طرف ضرور آئے گا۔ میں وہیں درخت میں دبک
بیٹھا رہا۔ جنگل میں ایک بار پھر گہری خاموشی چھا گئی۔ نہ کسی درخت پر کوئی پرندہ بول
تھا نہ کسی بندر کی خوخو کی آواز دوبارہ سنائی دی تھی۔ یہ خاموشی بڑی خوفناک تھی۔ لگ
کہ ابھی کسی طرف سے شیر نکل آئے گا۔ جس درخت پر میں بیٹھا تھا اُس کا تنا کافی
تھا، کوئی چھ سات فٹ اُوپر جا کر درخت کی شاخیں شروع ہوتی تھیں۔ میں نے سن
تھا کہ ریچھ تو اُلٹے پاؤں درخت پر چڑھ جاتا ہے مگر شیر درخت پر نہیں چڑھ سکتا۔
خیال آیا کہ وہ درخت پر چھلانگ تو لگا سکتا ہے۔ میں نیچے سے اُس شاخ کے فا
اندازہ لگانے لگا جس پر میں بیٹھا ہوا تھا۔ میرا خیال تھا کہ شیر اتنی اُونچی چھلانگ نہیں
سکے گا۔ لیکن کیا خبر یہ بہت بڑا شیر ہو اور چھلانگ لگا کر مجھے پنجہ مار کر نیچے گرا دے
پھر مجھے چیر پھاڑ ڈالے۔

اس وقت مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا کہ مجھے واقعی اس جنگل میں نہیں آنا چا

تھا۔ مگر اب میں حماقت کر بیٹھا تھا۔ درخت پر بیٹھے بیٹھے کافی دیر ہو گئی، شیر کسی طرف
سے نمودار نہ ہوا۔ جب میرے اندازے کے مطابق پون گھنٹہ گزر گیا تو مجھے یقین ہونے
لگا کہ شیر جنگل میں کسی دوسری طرف نکل گیا ہے، اب وہ اِدھر نہیں آئے گا۔ اگر شیر آدم
خور نہ ہو تو وہ انسان کی بو پر اُس کی طرف بالکل نہیں جاتا۔ اگر وہ کسی وجہ سے آدم خور
بن جائے تو انسان کی بو پا کر وہ اُس کی طرف آتا ہے اور اُسے دبوچ لیتا ہے۔

OOO

یہ ساری تفصیلات میں نے جنگل میں شیر کا شکار کرنے والے شکاریوں کی کہانیو
میں پڑھی تھیں۔ یہ ساری باتیں یاد کر کے مجھے کچھ حوصلہ ہوا اور یقین بھی ہو گیا کہ ش
اب اس طرف نہیں آئے گا۔ اُسے آنا ہوتا تو اب تک آ چکا ہوتا۔ اُس کی دھاڑ بڑ
قریب سے سنائی دی تھی۔ یقینی بات ہے کہ وہ کسی دوسری طرف چلا گیا ہے۔ درخت
مجھے چیونٹیوں نے بھی بڑا تنگ کیا ہوا تھا۔ جسم پر جگہ جگہ کاٹ رہی تھیں۔ میں نے آخ
بار درخت کی ٹہنیوں میں سے جھانک کر نیچے دیکھا پھر شاخوں میں سے دائیں بائیں ج
دُور تک دیکھ سکتا تھا جنگل میں دیکھا، کچھ بھی نہیں تھا۔ شیر کی آمد کے کوئی آثار نہیں تھ
میں اُوپر والے ٹہن سے اُتر کر نیچے والی ٹہنی پر آ گیا۔ یہاں سے ایک بار پھر نیچے کا جا
لیا، تب تسلی ہو گئی کہ میدان خالی ہے تو نیچے کود گیا۔ مجھے درختوں پر دوڑ کر چڑھنے ا
نیچے کودنے کی ٹریننگ کمپنی باغ کے درختوں نے دی تھی۔ زمین پر آتے ہی میں
دونوں ہاتھ زمین پر جما دیئے اور چند سیکنڈ کے لئے وہیں بیٹھے بیٹھے چالاک بندر کی ط
چاروں طرف دیکھا، شیر کہیں بھی نہیں تھا۔

میں دوڑ کر بزرگ کی قبر پر آ گیا۔ وہاں آ کر خدا کا شکر ادا کیا اور جھاڑیوں میں
اُس چھوٹے سے راستے کی طرف دیکھا جو باؤلی والے کھنڈر کو جاتا تھا۔ مجھے اُسی را
سے واپس جانا تھا۔ وہاں بھی کوئی شیر نظر نہ آیا، راستہ خالی پڑا تھا۔ میں اُٹھا اور تی
چلنا شروع کر دیا۔ زمین ذرا سی اُونچی تھی، ابھی کھنڈر کے پاس نہیں پہنچا تھا کہ اچا
جنگل کی خاموش فضا دوبارہ شیر کی دھاڑ سے گونج اُٹھی۔ یقین کریں! میرے حلق
بے اختیار چیخ نکل گئی اور میں کھنڈر کی طرف بھاگا۔ مجھے ایسے لگا کہ شیر میرے
دوڑتا آ رہا ہے۔ مجھے اُس کے ہانپنے کی آواز تک سنائی دے رہی تھی۔ میں گولی کی
دوڑتا رہا۔ اور تو کوئی جگہ چھپنے کی نظر نہ آئی، بس! باؤلی کے کھنڈر میں گھس گیا۔

واز پھر گونجی۔ یہ دھاڑ پیچھے سے آئی تھی۔ شیر کہیں چھپ کر بیٹھا میرے نیچے اُترنے کا
ظار کر رہا تھا۔ جیسے ہی میں درخت سے اُترا وہ میری طرف جھپٹ پڑا۔ کھنڈر کی
یوڑھی میں پتھر کی ٹوٹی پھوٹی سیڑھیاں نیچے باؤلی کے زنگ آلود پانی تک جاتی تھیں۔
یرے دماغ نے کہا اُدھر مت جانا...... شیر کھا جائے گا۔
ڈیوڑھی میں ایک پرچھتی کا شگاف نظر پڑا۔ میں نے اُچھل کر پرچھتی کا کنارہ پکڑا
ور اپنے آپ کو اُچھال کر پرچھتی کے شگاف میں ڈال دیا۔ میں بری طرح ہانپ رہا تھا۔
انس خوف کے مارے دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ میں وہیں اندھیرے شگاف میں
ٹ کر پڑا رہا، پھر ذرا سامنہ آگے کر کے نیچے ڈیوڑھی میں دیکھا، سیڑھیاں خالی پڑی
تھیں۔

میں دیر تک اسی حالت میں پڑا رہا، خدا جانے چھت اور دیوار کے درمیان یہ شگاف
کس لئے بنایا گیا تھا؟ اُس شگاف نے میری جان بچالی تھی۔ یہ شگاف یا پرچھتی ڈیوڑھی
کی دہلیز سے کوئی سات آٹھ فٹ اُونچی تھی۔ یہ صرف شیر کا خوف اور جان بچانے کی فکر
تھی کہ میں کود کر اتنی بلندی پر پہنچ گیا تھا۔ اب واقعی میں پریشان ہو گیا تھا۔ ایسا لگنے لگا
تھا کہ میں اس جنگل سے زندہ بچ کر نہ جا سکوں گا۔ شیر تو میرے پیچھے لگ گیا تھا۔ مگر وہ
میرا پیچھا کرتا ہوا باؤلی کی ڈیوڑھی تک نہیں آیا تھا۔ میں برابر نیچے دیکھ رہا تھا، شیر کا کوئی
نام و نشان نہیں تھا۔ درخت پر بیٹھا تو میں چاروں طرف جائزہ لے سکتا تھا مگر اس پرچھتی
میں گھٹنے سینے سے لگائے بیٹھے بیٹھے میں نیچے صرف ڈیوڑھی کی دہلیز، پتھر کی سیڑھیوں اور
دُور نیچے باؤلی کے کائی زدہ گہرے سبز پانی کی سطح کو ہی دیکھ سکتا تھا جو پتھر کی سبز سِل کی
طرح ساکت تھی۔ اور جس پر گلے سڑے پتے بکھرے ہوئے تھے۔ اچانک بادلوں کی
گرج سنائی دی اور اس کے ساتھ ہی بارش شروع ہو گئی۔ بارش بھی ایسی کہ جیسے بادل
پھٹ پڑے ہوں۔ موسلا دھار مینہ برسنے لگا تھا، بادل بار بار گرج رہے تھے۔ بارش کی
آواز نے جنگل کی فضا میں ایک شور مچا دیا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور میری
آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

کیا میں اس جنگل سے زندہ نکل سکوں گا؟

بارش ایک بار شروع ہوئی تو رُکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ میں باؤلی کی ڈیوڑھی

وہاں پرچھتی میں چھپ کر بیٹھا تھا۔ میرا سر چھت سے لگ رہا تھا، صرف جھک کر بیٹھ
تھا۔ پاؤں پھیلانے کی بھی جگہ نہیں تھی۔ بیٹھا بیٹھا تھک گیا۔ شیر تو بارش میں نہیں آیا
اب بارش میرے سر پر سوار ہوگئی تھی۔ پانی باؤلی کی سیڑھیوں پر سے شور مچاتا آبشا
طرح باؤلی کے چوبچے میں گر رہا تھا۔ جنگل میں بارش کا ایسا شور میں نے پہلے کبھی نہ
سنا تھا۔ اس شور سے مجھے دہشت آنے لگی تھی۔ لگتا تھا سارا جنگل بارش میں غرق
جائے گا۔

نہ جانے کتنی دیر تک موسلا دھار بارش کا سلسلہ جاری رہا۔ خدا خدا کر کے بارش
زور ٹوٹا۔ میں نے سوچا کہ نیچے اُتر کر وہاں سے بھاگ جاؤں۔ ابھی یہ خیال میرے
میں آیا ہی تھا کہ مجھے کسی جانور کے ہانپنے کی آواز آئی ...... میں نے کان لگا کر سنا، ہا
کے ساتھ پاؤں کی آواز بھی آ رہی تھی ...... خوف سے میرے رونگٹے کھڑے
گئے۔ یہ سوائے شیر کے اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ میں سمٹ کر پیچھے ہوگیا۔ پرچھتی ا
گہری نہیں تھی کہ میں اپنے آپ کو پوری طرح چھپا سکتا۔ نیچے سے نظر آ سکتا تھا۔ صر
بوندا باندی ہو رہی تھی، بارش کا شور غائب ہوگیا تھا۔ دن کی روشنی بھی کم ہونا شروع
گئی تھی۔ کچھ بادلوں نے بھی اندھیرا کیا ہوا تھا۔ میری نگاہیں باؤلی کے محرابی درواز
پر جمی ہوئی تھیں۔ اتنے میں ایک شیر نمودار ہوا......

اُس کو دیکھتے ہی میرا جسم سن ہوگیا۔ اُوپر کا سانس اُوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ ز
کھال اور سیاہ دھاریوں والا بہت بڑا شیر تھا...... وہ ڈیوڑھی کی دہلیز پر آ کر رُک گیا۔
بار بار اپنی دُم دائیں بائیں ہلا رہا تھا۔ پھر سر کو آگے جھکا کر نیچے باؤلی کی سیڑھیو
دیکھنے لگا۔ حیرانی کی بات تھی کہ اُس نے میری طرف نگاہ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھ
حالانکہ اُسے انسان کی بو ضرور آ رہی ہوگی۔ تھوڑی دیر تک وہ بت بنا نیچے باؤلی
چوبچے کو دیکھتا رہا جہاں اب کافی پانی بھر گیا تھا اور ایک دو سیڑھیاں اُوپر تک آ گیا تھ
پھر میرے دیکھتے دیکھتے وہ سیڑھیاں اُترنے لگا۔ میں پرچھتی سے اُسے برابر دیکھ رہا تھ
شیر پتھر کی سیڑھیاں اُترتا جا رہا تھا۔ نیچے کافی گہرائی تھی اور بہت نیچے جا کر پانی کا چو
یا چھوٹا سا تالاب تھا۔ وہاں دن کی روشنی کم ہونے اور بادلوں کے گہرا ہونے کی و
سے ڈھندلا ڈھندلا اندھیرا سا چھا رہا تھا۔ شیر دُور تک نیچے اُتر گیا، اور پھر ڈھندل

ندھیرے میں جیسے غائب ہوگیا۔ میں یہی سمجھا کہ وہ پانی پینے آیا ہے اور پانی پی کر ابھی
اپس آ جائے گا۔ میں پرچھتی سے نیچے اُترنے کی حماقت نہیں کر سکتا تھا۔ اُس وقت نیچے
ترنا اپنے آپ کو شیر کے آگے ڈالنے کے برابر تھا کیونکہ شیر ایک سیکنڈ میں اُوپر کو آ سکتا
ھا اور میں جنگل میں کہاں تک بھاگ سکتا تھا؟

اب میں شیر کے واپس آنے کا انتظار کرنے لگا۔ اس وقت مجھے بھوک بھی لگ رہی
ھی اور پیاس بھی محسوس ہو رہی تھی۔ باؤلی کی سیڑھیوں سے میری نظر نہیں ہٹتی تھی۔ میں
نہیں برابر دیکھ رہا تھا۔ کافی دیر گزر گئی مگر شیر واپس نہ آیا۔ مجھے خیال آیا کہ شاید باؤلی
ین نیچے جا کر دوسری طرف جانے کا کوئی راستہ ہو اور شیر اُس طرف سے نکل گیا ہو۔ میں
نے جھانک کر غور سے نیچے دیکھا، سیڑھیاں باؤلی کے کنوئیں میں نیچے تک چلی گئی تھیں۔
ندھیرا ہو جانے کی وجہ سے آخری سیڑھیاں دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔ ممکن ہے شیر
نی پی کر وہیں سیڑھیوں میں بیٹھ گیا ہو۔ میں نے سوچا کہ اگر ایسی بات ہے تو مجھے چپکے
ے وہاں سے کھسک جانا چاہئے۔ صرف ایک خیال مجھے نیچے نہیں اُترنے دیتا تھا کہ شیر
و میری بو آ رہی ہے۔ میں وہاں سے بھاگا تو میری بو کو دُور ہوتے محسوس کر کے کہیں
ہر بھی میرے پیچھے نہ دوڑ پڑے۔

عقل جواب دینے لگی تھی، اپنے شوق کی حماقت کے باعث میں سخت مصیبت میں
پھنس گیا تھا۔ سورج بادلوں کے نیچے غروب ہوگیا تھا۔ شام کا دھندلکا پھیلنے لگا تھا، میں
ٹکٹکی باندھے نیچے باؤلی کی سیڑھیوں کو دیکھ رہا تھا جدھر شیر گیا تھا۔ مجھے بھوک بھی لگ
ہی تھی اور پیاس بھی تنگ کر رہی تھی۔ جب کافی دیر انتظار کرنے کے بعد بھی شیر واپس
نہ آیا تو میں نے یہی سمجھا کہ باؤلی میں نیچے باہر جانے کا کوئی زیر زمین راستہ ہوگا۔ شیر
س طرف سے نکل گیا ہوگا۔ میں پرچھتی سے نیچے اُترنے والا تھا کہ مجھے سیڑھیوں پر
یک انسان دکھائی دیا...... کوئی نیچے باؤلی کے چوبچے سے آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھتا
اوپر آ رہا تھا...... میں غور سے دیکھنے لگا کہ یہ کون ہو سکتا ہے؟ شام کے دھندلکے میں دُور
سے اُس کی شکل پوری نظر نہیں آ رہی تھی۔

جب وہ انسان ذرا قریب آیا تو میں نے دیکھا کہ یہ ایک عورت تھی جس نے ساڑھی
پہن رکھی تھی۔ اُس کے بال اُس کے شانوں پر کھلے تھے اور وہ بڑے سکون کے ساتھ

سیڑھیاں چڑھتی ڈیوڑھی کی طرف آ رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ خدا جانے یہ کون ہے
یہاں سے گزر جائے تو نیچے اُتروں گا۔ عورت ڈیوڑھی کی دہلیز کے پاس آ کر رُک گ
مجھے ایسی بو آئی جیسے کہیں قریب ہی کسی نے سیندور لگایا ہو۔ اس قسم کی بو ہندوؤں
مندروں میں خاص طور پر ہنومان کے مندروں سے آیا کرتی تھی۔ دیوار میں بنی
ہنومان کی مورتی پر پجاری لال سیندور مل دیتے ہیں۔ میں عورت کو غور سے دیکھ ر
کہ یہاں رُک کیوں گئی ہے، آگے کیوں نہیں جاتی؟

عورت کا رنگ گہرا سانولا تھا، درمیانی عمر کی عورت تھی۔ وہ ڈیوڑھی کے
دروازے کی دہلیز پر کھڑی کچھ دیر باہر شام کے اندھیرے میں گم ہوتے جنگل کو
باندھے دیکھتی رہی، پھر اچانک اُس نے سر اُوپر اُٹھا کر میری طرف دیکھا اور بولی۔

"اُوپر کیوں بیٹھے ہو...... نیچے آ جاؤ! شیر چلا گیا ہے۔"

میں چونک سا گیا۔ اُس عورت کو کیسے پتہ چل گیا کہ میں اُوپر برچھتی میں چھپ
بیٹھا ہوں؟ اُسے یہ کیسے معلوم ہو گیا کہ میں شیر کے خوف کی وجہ سے وہاں چھ
ہوں؟ مجھے وہ عورت کوئی بھوت پریت لگی۔ میں نے اُسے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ
طرف مسلسل تک رہی تھی، کہنے لگی۔

"مجھ سے ڈرو نہیں۔ میں تمہاری دوست ہوں۔ نیچے اُتر آؤ! رات کو اِدھر ایک
خور شیرنی پھرا کرتی ہے۔ وہ آ گئی تو تمہیں نہیں چھوڑے گی۔"

یہ عورت بڑی صاف اُردو زبان میں بات کر رہی تھی۔ میں نے نیچے چھلانگ لگا
عورت نے گردن ایک طرف جھکا کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"تمہاری عمر ابھی چھوٹی ہے، تم اس جنگل میں کیسے آ گئے؟"

وہ آگے چل پڑی۔ میں اُس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ میں نے اُسے ایک فرضی
سنا دی کہ کس طرح میں اپنے چچا کے ساتھ جنگل میں شکار کھیلنے آیا تھا۔ اچانک ایک
نکل کر سامنے آیا تو ہم لوگ بھاگ گئے۔ جس کا منہ جس طرف اُٹھا، دوڑ پڑا۔ میں
آ کر چھپ گیا۔ عورت چل بھی رہی تھی اور میری فرضی کہانی سن بھی رہی تھی، کہنے لگی
"تمہیں بھوک لگی ہو گی اور پیاس بھی لگی ہو گی، فکر نہ کرو! ابھی دونوں چیز
بندوبست ہو جاتا ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "تم کون ہو اور اس باؤلی پر کیا کرنے آئی تھیں؟"

عورت مسکرا رہی تھی۔ وہ چلتے چلتے رُک گئی، پلٹ کر میری طرف دیکھا اور بولی۔

"اپنا ہاتھ آگے کرو!"

میں نے ڈرتے ڈرتے اپنا ہاتھ آگے کر دیا۔ اُس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور
لی۔ "میرا نام وندنا ہے۔ یہاں قریب ہی میرا ڈیرہ ہے۔ میں وہاں رہتی ہوں۔
رے ڈیرے پر چل کر پہلے کچھ کھا پی لو! پھر باتیں کریں گے۔"

اُس نے میرا ہاتھ پکڑے رکھا۔ اُس کا ہاتھ گرم تھا۔ وہ مجھے لے کر جنگل کے ایک
ں سے راستے پر چل پڑی۔ میں یہی سمجھا کہ یہ کوئی سنیاسن ہو گی یا جوگن ٹائپ کی
رت ہے۔ قریب ہی اُس کا جھونپڑا ہو گا، وہاں کھانے پینے کو کچھ نہ کچھ ضرور ہو گا۔
ں کے بعد اس عورت سے کہوں گا کہ مجھے کسی طرح اس خطرناک جنگل سے باہر نکال
ے۔ شام گہری ہو گئی تھی، اندھیرا تیزی سے درختوں پر چھا رہا تھا۔ چلتے چلتے سامنے
ک پہاڑی آ گئی۔ پہاڑی میں سے ایک چٹان باہر کو نکلی ہوئی تھی جس نے ایک چھت
ال دی تھی۔ عورت مجھے چٹان کے نیچے لے آئی، یہاں ایک قدرتی غار کا دہانہ تھا۔
کہنے لگی۔

"ڈرو نہیں...... میں اسی غار میں رہتی ہوں۔ آ جاؤ!" اُس نے میرے ہاتھ پر اپنی
رفت مضبوط کر لی اور میری طرف دیکھ کر بڑی شفقت سے مسکرائی۔ "آ جاؤ!"

غار کے اندر ایک کھلی جگہ تھی جہاں شیر کی کھال زمین پر بچھی ہوئی تھی۔ شیر کی کھال پر
کڑی کی ایک چوکی پڑی تھی۔ عورت جس نے اپنا نام وندنا بتایا تھا چوکی پر بیٹھ گئی۔ میں
نے دیکھا کہ وہاں کھانے پینے کی کوئی چیز نہیں تھی۔ میں نے وندنا سے کہا۔

"دیوی جی! مجھے بڑی پیاس لگی ہے۔"

وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اُس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور مجھے ساتھ لے کر غار میں آگے چل
پڑی۔ یہ قدرتی غار تھا۔ چھت کے پتھر کافی اُونچے تھے۔ دیوار پر دو تین جگہوں پر طاقوں
میں موم بتیاں روشن تھیں۔ جہاں موم بتی روشن تھی وہاں دیوار پر مورتیاں بنی ہوئی تھیں۔
وہ مجھے غار کے ایک دالان میں لے آئی۔ یہاں زمین پر ہرن کی تین چار کھالوں کا فرش
بچھا تھا۔ درمیان میں کیلے کے پتوں پر پکی ہوئی سبزیاں اور چاول پڑے تھے۔ پانی کے

پیتل کے دو کٹورے اور گلاس بھی تھے۔ خدا جانے یہ کھانا وہاں کس نے پکایا تھا؟ عو
نے کہا۔ ''پہلے کھانا کھالو!''
میں بیٹھ کر چاولوں پر سبزی ڈال کر کھانے لگا۔ پانی بھی پیا۔ جان میں جان آ گ
جب میں خوب سیر ہو کر کھانا کھا چکا تو وہ بولی۔
''آؤ! میں تمہیں اپنے محل کی سیر کراتی ہوں۔''
میں نے کہا۔ ''کیا تمہارا کوئی محل بھی ہے؟''
وہ بولی۔ ''کیوں نہیں؟ میں اِس سارے علاقے کی مہارانی ہوں۔ میں روز شا
تخت پر دربار لگاتی ہوں۔ میرا دربار لگانے کا وقت بھی ہو گیا ہے۔''
غار کے جس دالان میں، میں نے کھانا کھایا تھا وہیں ایک کونے میں سیڑھیاں
جاتی تھیں۔ وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر سیڑھیاں اُترنے لگی۔ جیسے جیسے میں نیچے اُتر ر
ایسی آوازیں آنے لگی تھیں جیسے نیچے کوئی ہال کمرہ ہے جہاں بہت سے مرد اور عو
ایک دوسرے سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہے ہیں۔ سیڑھیاں اُترنے کے بعد ایک
بڑا ہال کمرہ آ گیا جس کی ایک جانب واقعی ایک تخت بچھا تھا۔ عجیب عجیب کپڑوں
چہروں والے مرد اور عورتیں تخت کے سامنے دو رویہ قطاروں میں شیر اور ہرن کی کھا
کے فرش پر بیٹھے ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے۔ وندنا یعنی وہ پُراسرار عورت
مجھے یہاں لائی تھی، جیسے ہی ہال میں آئی ہر طرف خاموشی چھا گئی۔ عورتیں اور
سیدھے ہو کر بڑے ادب سے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے۔ وندنا اُن کے درمیان سے
تخت پر جا کر بیٹھ گئی۔ اُس نے مجھے بھی اپنے ساتھ تخت پر بٹھا لیا۔ مجھے اُس عور
شک پڑ چکا تھا کہ یہ اگر کوئی بھوت پریت نہیں تو کوئی ہوائی عورت ہے۔ ہو سکتا
چڑیل ہی ہو۔ لیکن اُس کے پاؤں چڑیلوں کی طرح اُلٹے نہیں تھے سیدھے تھے۔ یہ
کر مجھے یقین ہو گیا کہ یہ عورت انسان نہیں، کوئی آسیب ہے۔ میں وہاں سے بھاگ
سوچنے لگا۔ جب وہ تخت پر بیٹھ گئی تو سب عورتوں اور مردوں نے نعرہ لگایا۔
''مہارانی کی جے ہو۔''
اُن عورتوں اور مردوں کے زرق برق لباس عجیب و غریب تھے۔ سب نے سر
درختوں کی شاخیں باندھ رکھی تھیں۔ اس ہال کمرے میں بھی سیندور کی بڑی تیز بو

تھی جس کی وجہ سے میرا دل گھبرانے لگا تھا۔ مگر میں وہاں سے بھاگتے ہوئے ڈر رہا
۔ یہ لوگ مجھے پکڑ لیں گے۔ پُراسرار عورت میرے ہاتھ کو اس مضبوطی سے پکڑتی تھی
ے ڈر ہو کہ میں بھاگ نہ جاؤں۔ اس وقت اُس عورت نے میرا ہاتھ نہیں پکڑا
تھا، مگر میں اُس عورت کے قبیلے کے لوگوں میں بیٹھا تھا۔ وہ بڑی آسانی سے مجھے پکڑ
تھے۔
پُراسرار عورت نے اُٹھ کر ایک تقریر شروع کر دی۔ وہ کسی دشمن قبیلے کے خلاف بول
تھی کہ وہ لوگ ہمارے دشمن ہیں، ہمیں اُن سے خبردار رہنا چاہئے۔ ایک کالے
آدمی نے اُٹھ کر بڑے جوش کے ساتھ کہا کہ ہمیں دشمن کے قبیلے کے خلاف یدھ
چاہئے۔ سب عورتوں مردوں نے چیخ چیخ کر اس کی تجویز کی تائید کی۔ پُراسرار
ت نے ہاتھ اُٹھا کر کہا۔
''خاموش رہو۔ ایسا ہی ہوگا۔ ہم جنگ کریں گے۔ دشمن قبیلے کو ہمیشہ کے لئے جلا
راکھ کر دیں گے۔''
اس کے بعد مردوں عورتوں کی ایک ٹولی آ گئی۔ اُنہوں نے ڈھولک، کھڑتالیں اور
ے اُٹھا رکھے تھے۔ اُنہوں نے گانا بجانا اور ناچنا شروع کر دیا۔ دیر تک یہ
ڑی مچی رہی، پھر پُراسرار عورت یعنی اُن لوگوں کی مہارانی میرا ہاتھ پکڑ کر اُٹھی
لی۔ ''جہاں سے آئے ہو، وہیں چلے جاؤ! کل رات کو پھر بات چیت ہوگی۔''
ب عورتیں مرد ایک ایک کر کے مہارانی کے آگے آ کر اُس کے پاؤں چھوتے اور
طرف چلے جاتے۔ غار کے ہال نما کمرے کے کونے میں تنگ راہداری تھی، سب
میں سے گزر کر نظروں سے غائب ہو گئے۔ میں سمجھ گیا کہ یہ عورت کوئی بھوت
نہیں ہے بلکہ ایک جنگلی قبیلے کی سردار ہے جو دشمن قبیلے کے خلاف جنگ کرنے کی
کر رہا ہے۔ اب مجھے اُس عورت سے کوئی خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ وہ میرا
پکڑ کر مجھے واپس اُسی دالان میں لے آئی جہاں میں نے کھانا وغیرہ کھایا تھا۔
ں نے اُس سے کہا۔ ''دیوی جی! رات ہو گئی ہے۔ میرے گھر والے پریشان ہوں
رے ساتھ اپنا کوئی آدمی کر دیں جو مجھے جنگل سے باہر نکال دے۔''
ورت مسکرائی، کہنے لگی۔ ''اور اگر تم دونوں کو کوئی شیر کھا گیا تو کون ذمہ دار ہوگا؟

رات کو یہ جنگل زیادہ خطرناک ہو جاتا ہے۔ تم آج کی رات یہیں سو جاؤ! کل صبح خود تمہیں لے جاؤں گی۔''

میں نے کچھ اور کہنا چاہا تو اس نے مجھے تھوڑی سختی سے کہا۔ ''نہیں نہیں سو جاؤ! صبح دیکھ لیں گے۔''

یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔ میں غار کے اُس پہاڑی کھوہ میں اکیلا رہ گیا۔ طاق میں موم بتی جل رہی تھی، سیندور کی تیز بو سے دم گھٹا جاتا تھا، جس لہجے میں اُس عورت مجھے جانے سے روکا تھا میں نے اس سے اندازہ لگایا کہ یہ عورت آسانی سے میر نہیں چھوڑے گی۔ شاید یہ مجھے کسی وجہ سے اپنے ساتھ ہی رکھنا چاہتی تھی۔ میر وہاں سے فرار ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ مجھے معلوم تھا کہ رات کے اندھیرے میں مجھے خطرناک جنگل سے اکیلے گزرنا ہوگا، لیکن جنگل میں کسی درخت پر چڑھ کر شیر، چیتے جان بچا سکتا تھا۔ مگر اس عورت سے بچ کر نکل جانا مجھے مشکل نظر آ رہا تھا۔ اب انتظار کرنے لگا کہ عورت سو جائے تو میں وہاں سے نکل جاؤں۔ عورت غار میں موجود تھی جہاں وہ مجھے سب سے پہلے لے کر آئی تھی۔ وہ میرے راستے میں تھی ہوتے ہوئے مجھے اُس کے قریب سے ہو کر گزرنا تھا۔ وہ مجھ سے زیادہ دُور نہیں مجھے اُس کے کچھ پڑھنے اور اپنے آپ سے باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ نہ جانے کتنی گزر چکی تھی۔ میں اس انتظار میں تھا کہ وہ سو جائے تو میں وہاں سے جاؤں۔ وہ خدا جانے کیا بولے جا رہی تھی؟ کبھی لگتا کہ بھجن گا رہی ہے، کبھی لگتا جا کے منتروں کا جاپ کر رہی ہے۔ میں بھی جاگتا رہا۔ جب بہت دیر ہو گئی تو اُس آنا بند ہو گئی۔ میں کچھ دیر خاموش لیٹا رہا، پھر آہستہ سے اُٹھ کر غار کی دیوار کے ساتھ دبے پاؤں چلتا ذرا آگے گیا تو دیکھا کہ پُراسرار عورت وندنا شیر کی کھال بستر پر سو رہی ہے۔

میں نے سانس روک لیا اور پھونک پھونک کر قدم اُٹھاتا اُس کے قریب گیا۔ جہاں وہ سو رہی تھی، وہاں دیوار کے طاق میں موم بتی جل رہی تھی۔ مو روشنی غار کے دہانے کے قریب تک آ رہی تھی۔ اس کے آگے جنگل کا گھنا اند غار کے دہانے سے نکل کر میں نے ایک طرف درختوں میں دوڑنا شروع کر دیا

راستے کا مجھے تھوڑا سا اندازہ تھا مگر جنگل رات کی تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ غار سے نکلنے کے بعد پہلے تو مجھے کچھ نظر نہ آیا۔ بس میں نے دوڑنا شروع کر دیا تھا۔ کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد جنگل نے رات کی تاریکی میں سے اپنے خدوخال نمایاں کرنے شروع کر دیئے۔ جھاڑیاں اور گھاس صبح کی بارش سے گیلی ہو رہی تھیں۔ درخت، جھاڑیاں، ٹیلوں کے خاکے دُھندلے اور سرمئی رنگ کے نظر آ رہے تھے۔ اتنا مجھے معلوم تھا کہ میں ہوشنگ رینج کے اس جنگل میں درختوں کی پہلی قطار سے زیادہ آگے نہیں گیا تھا۔ جنگل پر گہرا سناٹا طاری تھا۔ میں دوڑنے کی بجائے چلنے لگا۔ دوڑنے سے کوئی درندہ میرے قدموں کی آواز سن کر میری طرف متوجہ ہو سکتا تھا۔ سب سے زیادہ مجھے اس بات کا خوف تھا کہ کہیں سے کوئی سانپ نہ نکل آئے۔

میں ایک جگہ رُک کر جائزہ لینے لگا۔ جائزہ کیا لینا تھا، درخت اتنے گھنے تھے کہ رات کی تاریکی میں وہ اور زیادہ تاریک ہو رہے تھے۔ میں آنکھیں کھول کھول کر دیکھنے لگا تھا۔ ایک جگہ کیلے کے درختوں کے جھنڈ نظر آئے، مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ میں اُسی راستے پر جا رہا تھا جس راستے سے جنگل میں داخل ہوا تھا۔ کیلے کے درختوں کے جھنڈ میرے جنگل میں داخل ہونے کے تھوڑی ہی دیر بعد آئے تھے۔ مجھے رات کی تاریکی میں اُس سنسان جنگل سے بے حد خوف محسوس ہو رہا تھا۔ کسی طرف سے بھی کوئی درندہ نکل کر مجھ پر جھپٹ سکتا تھا، یہ خوف مجھے بھگائے لئے جا رہا تھا۔ آخر مجھے سامنے کافی اُونچی کالی سیاہ دیوار سی نظر آئی۔ پہلے تو میں سمجھا کہ کالی گھٹا ہے جو اُمڈ اُمڈ کر چلی آ رہی ہے۔ غور سے دیکھا تو یہ ہوشنگ آباد رینج کے جنگلوں کے درختوں کی قطار تھی۔ اس دیوار کو دیکھ کر میری جان میں جان آ گئی۔ میں دیوانہ وار اُن درختوں کی طرف بڑھنے لگا۔ اُن درختوں کے پار دھان کے کھیت تھے، اور پھر میرے جنگلی گائیڈ دوست کا جھونپڑیوں والا گاؤں آ جاتا تھا۔

میں ہی جانتا ہوں کہ میں کس طرح جنگل سے باہر نکلا۔ کھلی فضا میں آ کر خدا کا شکر ادا کیا۔ کچھ فاصلے پر دھان کے کھیت شروع ہو گئے۔ میں اُن کھیتوں کو پہچانتا تھا۔ کسی نہ کسی طرح اپنے جنگلی گائیڈ کے جھونپڑوں کے پاس پہنچ گیا۔ میری بو پا کر کتے بھونکنے تو میرا جنگلی گائیڈ جھونپڑی سے باہر نکل آیا۔ وہ آنکھیں ملتے ہوئے اندھیرے میں مجھے

دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا، پھر اُس نے مجھے پہچان لیا اور بولا۔

''تم زندہ کیسے آ گئے؟ تم نے بڑی بے وقوفی کی تھی۔''

اگلے روز وہ مجھے خچر پر بٹھا کر دریا پار چیتل ورگ تک چھوڑنے آیا۔ وہاں سے مجھے بیل گاڑی نے ڈھیبر والی پہنچایا، وہاں سے میں کبھی یکے پر اور کبھی کسی بیل گاڑی پر سفر کرتا آخر کھنڈوا شہر پہنچ گیا۔ ریلوے ٹریک ٹھیک ہو گئے تھے، گاڑیوں کی آمد و رفت شروع ہو گئی تھی۔ یہاں سے مجھے دِلّی جانے والی گاڑی مل گئی۔ یہ گاڑی رات کے دس بجے کھنڈوا اسٹیشن سے روانہ ہوتی تھی۔ میں نے تھرڈ کلاس کا ٹکٹ لیا اور ڈبے میں دوسرے مسافروں کے ساتھ بیٹھ گیا۔ آسمان کئی روز سے ابر آلود تھا، گاڑی چلنے میں ابھی آدھا گھنٹہ باقی تھا۔ مسافروں نے اپنے اپنے بستر لگا لئے تھے۔ میں کھڑکی کے پاس بیٹھا پلیٹ فارم کی روشنیاں دیکھ رہا تھا اور جنگل کی مہارانی پُراسرار عورت کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ کیا واقعی وہ کسی جنگلی قبیلے کی سردارنی تھی؟ مگر وہ مجھے اپنے پاس کیوں رکھنا چاہتی تھی؟ میرے پاس اِس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔

ٹرین چل پڑی۔ آدھی رات کے بعد ٹرین ہوشنگ آباد کے سٹیشن پر پہنچی تو مجھے جنگل کے سارے ہوشربا واقعات ایک ایک کر کے یاد آنے لگے، میرے بدن میں خوف کی ہلکی سی سنسناہٹ دوڑ گئی۔ مگر اب میں ہوشنگ آباد کے خطرناک اور تاریک جنگل میں نہیں تھا بلکہ ہوشنگ آباد کے روشنیوں میں جگمگاتے ریلوے سٹیشن پر تھا۔ ہوشنگ آباد سے ٹرین کو بھوپال کی طرف رُخ بدلنا تھا۔ ٹرین کچھ دُور گئی تو ایک بار پھر بارش شروع ہو گئی۔ بارش کی ہلکی سی بوچھاڑ کھلی کھڑکی میں سے میرے ایک ہاتھ اور چہرے پر پڑی میں نے ہاتھ باہر نکال دیا۔ میرا ہاتھ بارش میں بھیگ گیا۔ بارش باقاعدہ ہو رہی تھی میں نے آنکھیں بند کر لیں اور ان علاقوں کے جنگلوں کے تصور میں کھو گیا۔ جنگل خواہ کتنا ہی دہشت ناک کیوں نہ ہو، اس میں جب بارش ہو رہی ہو تو ایک خاص حسن پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ دہشت ناک حسن ہوتا ہے۔ یہ حسن آدمی پر شیر بن کر حملہ کرتا ہے۔

''کہاں جا رہے ہو......؟''

میرے کانوں میں عورت کی آواز پڑی تو میں نے جلدی سے آنکھیں کھول دیں اور گردن موڑ کر پیچھے دیکھا۔

''میں اِدھر ہوں......!''

میں نے کھڑکی کے باہر دیکھا تو دہشت زدہ ہو کر رہ گیا۔ وہی جنگل والی پُراسرار عورت جنگل کی مہارانی وندنا ٹرین سے باہر کھڑکی کے سامنے بارش میں کھڑی تھی اور ٹرین کے ساتھ ساتھ اس طرح چلی جا رہی تھی جس طرح آدمی کا سایہ چلتی ٹرین کے ساتھ ساتھ جاتا ہے۔ میں کچھ نہ بول سکا، اُس عورت نے اپنی خاص مسکراہٹ کے ساتھ مجھے دیکھا اور بولی۔

''تم جہاں بھی جاؤ گے میں تمہارے ساتھ رہوں گی۔'' اتنا کہہ کر وہ غائب ہو گئی۔

مجھے یقین تھا کہ یہ محض میرا وہم اور میرے ذہن کی شعبدہ بازی ہے۔ میں نے اس شعبدہ بازی کو کوئی اہمیت نہ دی اور قدرت کے اس حسین ترین منظر میں کھو گیا کہ ٹرین بارش میں بھیگتی جنگل میں دوڑتی چلی جا رہی تھی۔

○○○

کالی سیاہ اندھیری رات تھی۔

ٹرین تیز بارش میں جنگل میں پوری رفتار سے دوڑتی چلی جا رہی تھی۔ کھڑکی کی طرف میری نگاہیں بار بار اُٹھ جاتی تھیں، مگر کھڑکی کے باہر اُس پُراسرار عورت کا ہیولہ پھر دکھائی نہیں دیا تھا، تب مجھے یقین ہو گیا کہ یہ محض میرا وہم تھا۔ پھر بھی میرے دل میں ایک ڈر سا ضرور بیٹھ گیا تھا۔ اُس عورت نے جس نے اپنا نام مہارانی وندنا بتایا تھا باتوں سے مجھے اشارہ دیا تھا کہ وہ مجھے اتنی آسانی سے چھوڑنے والی نہیں ہے، اور یہ وہ مجھے اپنے ساتھ رکھنا چاہتی ہے۔ خدا ہی بہتر جانتا تھا کہ وہ ایسا کیوں کرنا چاہتی تھی اور میرا اُس کے ساتھ رہنا کیوں ضروری تھا؟ اِس بھیانک حقیقت کا انکشاف مجھ پر میں جا کر ہوا۔ لیکن میں آپ کو ابھی نہیں بتاؤں گا۔ جیسے جیسے کہانی آگے چلے گی آپ کو خود بخود علم ہو جائے گا۔

میں دِلّی پہنچ گیا۔ دِلّی سے دوسری گاڑی پکڑی اور اپنے شہر امرتسر آ گیا۔ اس دوران مجھے اُس عورت وندنا مہارانی کا ہیولہ یا شکل کہیں دکھائی نہ دی۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا کہ وہ جو کوئی بھی تھی، اُس سے پیچھا چھوٹا۔ کیونکہ جس طرح میرے بازو کو اپنی سخت گرفت میں لے کر مجھے غار میں لے کر گئی تھی اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ وہ مجھے اپنے قابو میں رکھنا چاہتی ہے، مجھے اپنا غلام بنانا چاہتی ہے۔

اپنے شہر میں آتے ہی میں نے اپنی پڑھائی کا سلسلہ دوبارہ شروع کر دیا۔ کالج میں وہ میرا پہلا سال تھا۔ میں باقاعدگی کے ساتھ کالج جاتا، آوارگی بند کر دی۔ گھر والے مجھ پر بڑے خوش تھے۔ دو مہینے گزر گئے، آہستہ آہستہ میرے ذہن سے مہارانی وندنا کا خیال محو ہوتا چلا گیا۔ ہمارے شہر میں ایک ریالٹو سینما ہوتا تھا۔ یہ سینما گھر شہر کے مشہور باغ کے پہلو میں واقع تھا۔ ایک روز میں وہاں میٹنی یعنی دوپہر کا شو دیکھنے چلا گیا۔

اکیلا ہی تھا، کوئی دوست میرے ساتھ نہیں تھا۔ فلم دیکھ کر سینما ہاؤس سے نکلا تو سورج ڈھل رہا تھا، موسم بڑا خوشگوار تھا۔ میں اُس سڑک پر سے ہو کر گھر کی طرف چل پڑا جو کمپنی باغ میں سے ہو کر جاتی تھی۔

یوکلپٹس کے اُونچے اُونچے درختوں میں گھری ہوئی یہ چھوٹی سی سڑک تھی۔ یہ پاکستان کے قیام سے دو تین سال پہلے کا زمانہ تھا۔ شہروں میں ٹریفک کا شور شرابا بالکل نہیں ہوا کرتا تھا۔ سڑک دُور تک خالی تھی۔ جب میں کرسٹل ریستوران کے قریب پہنچا تو کسی عورت نے پیچھے سے مجھے ''ہیلو'' کہہ کر پکارا...... میں نے رُک کر پیچھے دیکھا، ایک سنسناہٹ سی میرے جسم میں دوڑ گئی...... پیچھے وہی پُراسرار عورت مہارانی وندنا کھڑی میری طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ وہ مسکراتی ہوئی میرے قریب آ گئی، کہنے لگی۔

''تم نے مجھے پہچانا نہیں؟ میں وندنا ہوں۔ مہارانی وندنا۔''

میں نے زبردستی مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''ارے ہاں! تم وندنا ہو۔ میں نے تمہیں پہچان لیا۔ یہاں کیسے آ گئیں؟''

''کیوں...... میں یہاں نہیں آ سکتی؟'' اُس نے مسکراتے ہوئے اپنے بالوں کی ایک لٹ کو ہاتھ سے پیچھے کرتے ہوئے کہا۔

میں نے کہا۔ ''میرا مطلب یہ نہیں تھا۔ میرا مطلب ہے مجھے بالکل اُمید نہیں تھی کہ میری تمہاری ملاقات یہاں بھی ہو سکتی ہے۔''

مہارانی میرے ساتھ چلنے لگی۔ اُس کا نام وندنا ہی تھا، مگر وہ اپنے نام کے ساتھ مہارانی ضرور لگاتی تھی، اس لئے میں آئندہ اُسے مہارانی ہی لکھوں گا۔ ویسے بھی وندنا مشکل سا نام ہے۔ مہارانی نے ہلکے بادامی کلر کی ریشمی ساڑھی پہنی ہوئی تھی۔ وہ کوئی حسین عورت نہیں تھی، لیکن اُس کے چہرے اور خاص طور پر سیاہ آنکھوں میں ایک ایسی چمک اور کشش تھی کہ زیادہ دیر تک اُس کی آنکھوں پر نگاہیں نہیں ٹھہرتی تھیں۔ میں نے مہارانی سے پوچھا۔

''تم یہاں کہاں ٹھہری ہوئی ہو؟''

باغ میں ہوا چل رہی تھی۔ اُس کے بالوں کی ایک لٹ بار بار اُس کے ماتھے پر آ جاتی تھی، بڑی نزاکت کے ساتھ وہ بالوں کی لٹ کو ہاتھ سے پیچھے ہٹاتے ہوئے بولی۔

''میں اپنی موسی کے ساتھ آئی ہوں۔ یہاں ہمارے رشتے داروں میں ایک شا
ہے، اُس میں شریک ہونے آئی ہوں۔''

ہم کرسٹل ریستوران کے دروازے کے سامنے سے گزرنے لگے تو اُس نے کہ
''مجھے پیاس محسوس ہو رہی ہے۔ اس ریستوران میں بیٹھ کر کچھ پیتے ہیں اور باتیں
کریں گے۔''

میں انکار نہ کر سکا۔ ہم ریستوران میں آ کر بیٹھ گئے۔ میں نے دو گلاس لیمن ج
کے منگوائے، اُس زمانے میں ابھی کوکا کولا وغیرہ نہیں آئے تھے۔ سوڈا لیمن اور ومٹو
مشروبات ہی عام تھے۔ ہم ادھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ اُس لمحے مہارانی کی باتو
اور اُس کی شخصیت میں کوئی پُراسراریت وغیرہ نہیں تھی، بالکل نارمل اور عام شکل
صورت کی عورت لگ رہی تھی۔ عمر میں مجھ سے چھ سات سال بڑی تھی۔ آخر میں
اُس سے پوچھ ہی لیا۔

''کھنڈوہ کے جنگل میں تو تم ایک غار میں رہتی تھیں۔ اور وہاں دوسری عورتیں
مرد بھی تھے جو ایک مہارانی کی طرح تمہارا احترام کرتے تھے۔ یہ بات میری سمجھ
نہیں آئی۔''

وہ ہنسنے لگی۔ بولی۔ ''اس میں حیرانی کی کیا بات ہے؟'' پھر ٹھنڈے مشروب کا ا
گھونٹ پی کر کہنے لگی۔ ''میں نے تمہیں بتایا نہیں تھا، ہمارے باپ دادا کا راج
مہاراجوں کے خاندان سے تعلق تھا۔ جہاں تم نے مجھے دیکھا تھا اور مجھ سے ملے تھ
جگہ کسی زمانے میں میرے پڑدادا کی ریاست میں شامل تھی۔ پھر ہماری ریاست
رہی اور صرف وہ پرانے محل کا کھنڈر ہی باقی رہ گیا۔ وہاں کے باسی لوگ ہمارے خاند
کے آدمیوں اور عورتوں کو راجہ اور مہارانی کہہ کر ہی بلاتے ہیں اور اسی طرح ادب
احترام کرتے ہیں جیسے وہ ہماری رعایا ہوں۔ اور پھر میں وہاں رہتی تھوڑے تھی؟ ہما
کھنڈوہ شہر میں اپنا مکان ہے جہاں میں اپنی موسی کے پاس رہتی ہوں۔ کبھی کبھی پرا
محل کو دیکھنے چلی جاتی ہوں۔ اُس روز بھی میں اپنے پرانے محل کی سیر کرنے گئی تھی
سے ملاقات ہو گئی۔''

میں بڑے غور سے اُس کی باتیں سن رہا تھا، کہنے لگی۔ ''اور تم مجھے سوتا چھوڑ کر

سے بھاگ آئے۔

میں نے شرمساری سے کہا۔ ''دراصل بات یہ ہے مہارانی! کہ مجھے گھر کی یاد بہت
ستانے لگی تھی اس لئے تمہیں سوتا چھوڑ کر وہاں سے چلا آیا، اور کوئی بات نہیں تھی۔''

اُس نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ کر اسے ذرا دباتے ہوئے کہا۔ ''چلو اچھا ہوا،
ہماری پھر سے ملاقات ہو گئی۔'' پھر مسکراتے ہوئے بولی۔ ''اب تمہیں مجھے سوتا چھوڑ کر
بھاگنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں خود دو ایک دن میں یہاں سے واپس جا رہی ہوں۔''

اس قسم کی باتوں سے میرے دل میں اُس کے بارے میں جو خیال بیٹھ گیا تھا کہ یہ
کوئی رُوح یا ہوائی مخلوق ہے وہ بالکل دُور ہو گیا۔ وہ مجھے ایک نارمل عورت لگنے لگی۔
جب ہم ریستوران سے نکلنے لگے تو میں نے تکلفاً پوچھ لیا۔ ''تم کس طرف جاؤ گی؟''

وہ بولی۔ ''یہاں شہر کے اندر ایک درشنی ڈیوڑھی والی گلی ہے۔ میں وہیں ٹھہری ہوئی
ہوں۔''

''میں تمہیں چھوڑ آؤں......؟'' میں نے پوچھ لیا۔

اُس نے کہا۔ ''کوئی بات نہیں...... میں چلی جاؤں گی۔ مجھے راستہ یاد ہے۔ اور پھر
تانگہ مجھے وہاں پہنچا دے گا۔''

آپ اسے میری حماقت سمجھ لیجئے یا رومان پسندی کہہ لیں کہ وہ مجھے ایک نارمل عورت
کے رُوپ میں اچھی لگنے لگی تھی۔ میرے منہ سے نکل گیا۔ ''اب تو شاید ملاقات نہ ہو۔''

اُس نے اپنی چمکیلی آنکھوں سے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''تم مجھ سے ملنا چاہتے ہو؟''

میں نے ہنستے ہوئے کہہ دیا۔ ''شاید۔''

وہ بولی۔ ''تم نے سیتلا مندر ضرور دیکھا ہو گا۔''

میں نے کہا۔ ''ہاں...... میں نے دیکھا ہوا ہے۔''

اُس نے کہا۔ ''میں کل صبح وہاں پوجا کرنے آؤں گی۔ تم بھی آ جانا! ضرور آنا۔ پھر
نہ جانے کب ملنا ہو؟''

''ضرور آؤں گا۔'' میں نے جواب دیا۔

وہ تانگے میں بیٹھ کر چلی گئی۔ اُس کے جانے کے بعد میں اُس کے بارے میں

سوچنے لگا۔ مجھے یہ سب کچھ رسالے میں پڑھی ہوئی کسی محبت بھری کہانی کی طرح لگ
رہا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو یقین دلا دیا کہ مہارانی ایک اچھے خاندان کی بالکل نا
عورت ہے اور وہ مجھے پسند کرتی ہے۔ نوجوانی کی عمر میں یہی سب سے خوبصورت ا
ہیجان خیز بات ہوتی ہے کہ کوئی عورت آپ کو پسند کرنے لگے۔ میں نے دوسرے
مہارانی سے ملنے کا فیصلہ کرلیا۔

مجھے معلوم تھا کہ سیتلا مندر میں ہندو مرد عورتیں صبح کس وقت پوجا پاٹھ کرنے آ
ہیں؟ میں ٹھیک اُسی وقت مندر کے باہر ایک طرف ہو کر کھڑا ہو گیا۔ ہندو عورتیں ہاتھو
میں پوجا کی سامگری رکھے مندر میں جا رہی تھیں۔ میری نگاہیں مہارانی کو ڈھونڈ ر
تھیں۔ آخر وہ مجھے نظر آ گئی۔ اُس نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا۔ وہ میرے پاس آ گئی۔ اُ
نے سفید ساڑھی پہن رکھی تھی، ہاتھ میں پوجا کی تھالی تھی جس میں کچھ پھول اور کچ
پڑے تھے۔ کہنے لگی۔

''میں ابھی پوجا کر کے آتی ہوں۔ تم یہیں رہنا!''

میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔''

وہ میری طرف محبت بھری نظروں سے تکتی ہوئی مندر کی طرف چلی گئی۔ اُس کی محب
بھری نظروں نے مجھے مزید اُس کا گرویدہ بنا دیا۔ میں بے تابی کے ساتھ اُس کی واپ
انتظار کرنے لگا۔

مجھے زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا اور وہ مجھے مندر سے باہر آتی نظر آئی۔ اُس کے ہاتھ
پوجا کی تھالی کی بجائے پتوں میں لپٹا ہوا گیندے کے پھولوں کا ہار تھا۔ میرے پاس آ
اُس نے پتوں کو کھولا تو اُس میں گیندے کے ہاروں میں دو پیڑے رکھے ہوئے
کہنے لگی۔ ''یہ وشنو بھگوان کا پرشاد ہے۔ ایک پیڑا تمہارے لئے ہے، ایک میر
لئے۔ انکار نہ کرنا! بدشگونی ہو گی۔''

میں وہ پرشاد نہیں کھانا چاہتا تھا، میں انکار ہی کرتا رہ گیا لیکن مہارانی نے ہنسی
میں ایک پیڑا زبردستی میرے منہ میں ڈال دیا۔ پیڑے میں سے کیوڑے کی خوشبو آ
تھی، ایک پیڑا وہ خود کھانے لگی۔

اُس نے کہا۔ ''ہمارے شاستروں میں لکھا ہے کہ جو کوئی بھگوان کا پرشاد کھاتا

س کو کوئی بیماری نہیں لگتی۔''

ایک طرف مندر کے باہر کچھ خالی تانگے کھڑے تھے، کہنے لگی۔ ''چلو! اُسی
ریستوران میں چل کر سوڈا واٹر پیتے ہیں۔''

ہم تانگے میں بیٹھ کر کرسٹل ریستوران میں آ گئے۔

ہندوؤں کے مندر کا پرشاد وغیرہ میں نے کبھی نہیں کھایا تھا۔ اگر مہارانی زبردستی نہ
رتی تو میں پرشاد کے پیڑے کو ہاتھ بھی نہ لگاتا۔ مگر میں نے پرشاد کھا لیا تھا۔ کچھ دیر
ک مجھے ایسا لگا جیسے سر چکرا رہا ہو، لیکن پھر یہ احساس ختم ہو گیا اور میں تقریباً بھول گیا
ہ میں نے مندر کا پرشاد کھایا ہے۔ مہارانی مجھ سے بڑی پیار محبت کی باتیں کرنے لگی۔
بڑی کھل کر باتیں کر رہی تھی۔ کہنے لگی

''کتنی عجیب بات ہے کہ مجھے اب تک تمہارا نام نہیں معلوم ہے۔''

میں نے کہا۔ ''نام پوچھ کر کیا کرو گی؟''

وہ بولی۔ ''اُسے اپنے دل پر لکھ لوں گی۔''

میں نے اُسے اپنا نام شیراز بتایا جو میرا اصلی نام نہیں تھا۔ اُس نے میرا نام دو تین بار
ہستہ آہستہ دہرایا اور بڑی پُراسرار مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''مجھے تمہارا نام بڑا اچھا لگا ہے۔ اور...... اور تم بھی مجھے بڑے اچھے لگے ہو۔''

مہارانی کے اس جملے پر میرے دل کی دھڑکن ایک لمحے کے لئے تھوڑی سی تیز ہو
ئی۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ بھی مجھے بڑی اچھی لگنے لگی تھی۔ میں اپنی عمر کے اُس حصے میں
ے گزر رہا تھا جب ہر خوبصورت عورت سے محبت کرنے کو جی چاہتا ہے اور اگر کوئی
ورت یہ کہہ دے کہ مجھے تم سے محبت ہے یا تم مجھے اچھے لگتے ہو تو آتشِ محبت اور زیادہ
ڑک اُٹھتی ہے۔ اُس روز کرسٹل ریستوران میں بیٹھے مہارانی نے کھلے دل سے مجھ
ے محبت کا اظہار کر دیا اور کہنے لگی۔

''مجھے تم سے اسی لمحے محبت ہو گئی تھی جب میں نے تمہیں پہلی بار دیکھا تھا۔ مگر اپنی
بت کا اظہار کرتے ہوئے شرماتی تھی۔ میں تمہیں اسی لئے اپنے آباؤ اجداد کے پرانے
ل کے تہہ خانے میں لے گئی تھی، کیونکہ میں نہیں چاہتی تھی کہ تم مجھ سے الگ ہو جاؤ۔
یکن میری بدقسمتی کہ مجھے نیند آ گئی اور تم مجھے چھوڑ کر چلے آئے۔ مگر میری محبت، میرا پریم

سچا تھا جس نے مجھے ایک بار پھر تم سے ملا دیا۔''

اُس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا اور کہنے لگی۔ ''شیراز! مجھ سے وعدہ
اب تم مجھے چھوڑ کر نہیں جاؤ گے۔ وعدہ کرو!''

مجھ پر بھی اُس کی محبت اور اُس کی شخصیت نے جیسے جادو سا کر دیا تھا۔ میں
اختیار ہو کر کہا۔ ''مہارانی! میں وعدہ کرتا ہوں کہ اب تم سے کبھی جدا نہیں ہوں گا

''تو پھر میرے ساتھ چلو!'' اُس نے کہا۔

''کہاں.....؟'' میں نے پوچھا۔

''جہاں میں رہتی ہوں وہاں۔ میرے شہر میں..... میں اب کھنڈوہ میں نہیں
اب میں کالی گھاٹ میں اپنے گورو جی کے مٹھ میں رہتی ہوں۔ یہ بڑی خوبصور
ہے۔ پاس ہی ایک ندی بہتی ہے، ہر طرف درخت، پھول اور چشمے ہیں۔''

''تم جنگل میں کیوں رہتی ہو؟ جنگلوں میں تو جوگنیں رہا کرتی ہیں۔ کیا تم جوگ
ہو؟''

میرے سوال پر مہارانی ہنس پڑی۔ کہنے لگی۔ ''نہیں، میں۔ جوگن نہیں ہوئی،
دھرم شاستروں میں لکھا ہے کہ اگر ایک عورت اپنی عمر کے دو سال اپنے کسی گ
ساتھ جنگل میں تپسیا کر کے گزارے تو اُسے جنم جنم کے بندھن سے مکتی مل جاتی
مسلمان ہو۔ شاید تمہیں معلوم نہیں کہ ہم ہندو آواگون پر یقین رکھتے ہیں۔ آواگ
مطابق ہر ہندو کی آتما مرنے کے بعد اپنے کرموں کے مطابق دوسرا جنم لیتی ہے
یہ دوسرا جنم کسی جانور، کسی پرندے، کسی پتھر، کسی پھل پھول اور کسی درندے مثلاً
بچھو، بندر یا گدھے کے جسم میں بھی ہو سکتا ہے۔ جب تک آتما کے سارے
ڈھل جاتے اُس کی آتما جنم جنم کے بندھن میں جکڑی رہتی ہے۔ لیکن اگر کوئ
اپنے سچے گورو کے چرنوں میں بیٹھ کر دو برس تک تپسیا کرے اور دنیا والوں سے
نہ رکھے تو اُس کی آتما کو آواگون سے نجات مل جاتی ہے۔ اب تم سمجھ گئے ہو گے

مگر میں کچھ بھی نہیں سمجھا تھا۔ مجھے آواگون کا چکر ایک عجیب گورکھ دھ
مہارانی نے ایک بار پھر میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے مجھ سے بڑی محبت
پوچھا۔ ''کیا تم میرے ساتھ چلو گے.....؟''

میں اُس کی محبت میں سرشار ہو چکا تھا۔ اُس نے واقعی مجھ پر جیسے کوئی جادو کر دیا ہوا
ا۔ اس کے باوجود جب اُس نے مجھے اپنے ساتھ چلنے کو کہا تو نہ جانے کیوں میرا دل
ں کے ساتھ جانے کو تیار نہ ہوا۔ میں نے اُسے جواب دیا۔

''مہارانی.....!''

اُس نے میرے ہونٹوں پر آہستہ سے اپنا ہاتھ رکھ دیا اور بولی۔ ''تم مجھے صرف رانی
ہا کرو، رانی۔''

میں نے کہا۔ ''رانی! میں ابھی تمہارے ساتھ نہیں جا سکتا۔ میرا امتحان سر پر ہے۔
ں امتحان ہو جائے تو پھر میں تمہارے پاس ضرور آؤں گا۔''

اب میں بھی مہارانی کو رانی ہی لکھوں گا۔ رانی اپنی مقناطیسی آنکھوں سے بڑے
اسرار انداز میں میری طرف دیکھ رہی تھی۔

''سچ کہہ رہے ہو.....؟'' اُس نے ہلکے سے تبسم کے ساتھ پوچھا۔

''بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔'' میں نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔ اُس
ے سامنے واقعی محبت کی باتیں کرتے ہوئے میرے ہونٹ بار بار خشک ہو رہے تھے۔
نی نے میرے ہاتھ کو بڑی محبت سے دبایا اور کہا۔

''مجھے تم پر بھروسہ ہے۔ میں جانتی ہوں تم مجھ سے ملنے ضرور آؤ گے۔ میں تمہیں
پنے کالی گھاٹ والے مٹھ کا پورا ایڈریس لکھے دیتی ہوں۔''

اُس نے بیرے کو کہہ کر ایک کاغذ منگوایا اور اُس پر پوری تفصیل کے ساتھ لکھ دیا کہ
ہاں سے گاڑی پکڑنی ہے، کہاں ٹرین بدلنی ہے اور کالی گھاٹ کے سٹیشن سے اُتر کر کس
رف جانا ہے؟ میں نے کاغذ کو بڑے غور سے پڑھا اور اُسے تہہ کر کے سنبھال کر اپنے
س رکھ لیا۔

''تمہارے امتحان کب ختم ہوں گے؟'' رانی نے پوچھا۔

میں نے کہا۔ ''پندرہ بیس دن تو لگ ہی جائیں گے۔''

اُس نے میرا ہاتھ تھام کر کہا۔ ''یہ پندرہ بیس دن میں تمہارے بغیر کیسے گزاروں
ل؟''

میرے دل کی دھڑکن ایک بار پھر تیز ہو گئی۔ میری خود سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب

جبکہ اُس نے کھل کر مجھ سے اور میں نے اُس سے اپنی محبت کا اظہار کر دیا ہے تو
پندرہ بیس دن اُس کو دیکھے بغیر کیسے گزاروں گا؟ میرا دل تو یہی چاہتا تھا کہ میں اُ
ساتھ ہی چلا جاؤں، لیکن میرے اندر کہیں سے یہ آواز ایک بار پھر آئی کہ خبردا
کے ساتھ مت جانا۔ میں حیران تھا کہ یہ آواز بار بار مجھے رانی کے ساتھ جانے سے
منع کر رہی ہے؟ جبکہ رانی مجھ سے اور میں رانی سے محبت کرتا ہوں اور محبت میں
ہمیشہ ایک ساتھ رہنے کے خواہشمند ہوتے ہیں اور انہیں ایسا ہی کرنا چاہئے۔

رانی چلی گئی، مگر دوسرے روز وعدے کے مطابق پھر اُسی وقت کرسٹل ہوٹل
سے ملنے آ گئی۔ ہم دونوں دیر تک ایک دوسرے کے پاس بیٹھے محبت کی باتیں
رہے۔ میں اُس کی محبت کی گہرائیوں میں اور زیادہ اُترتا جا رہا تھا۔ یہ سب
آپ ہو رہا تھا۔ کوئی ان دیکھی انجانی طاقت مجھے لحہ بہ لحہ اُس کا دیوانہ بنا رہی تھی
رانی سے محبت کے معاملے میں اپنے آپ پر اختیار نہیں رہا تھا۔

تیسرے روز رانی واپس چلی گئی۔ میں اُسے چھوڑنے ریلوے سٹیشن پر گیا۔
تھی۔ میں نے اُس سے پوچھا۔ ''کیا تمہاری موسی تمہارے ساتھ نہیں جا رہی؟''

وہ بولی۔ ''نہیں...... وہ بعد میں آئے گی۔ میں اکیلی ہی جا رہی ہوں۔''

ٹرین کے چلنے تک میں اُس کے ڈبے کے باہر کھڑا اُس سے باتیں کرتا ر
ٹرین چل پڑی۔ جب تک رانی مجھے نظر آتی رہی اور میں اُسے دکھائی دیتا رہا،
دوسرے کو ہاتھ ہلا کر الوداع کہتے رہے۔ پھر ٹرین آگے نکل گئی اور رانی میری
سے اوجھل ہو گئی۔

میرے کالج کے امتحان شروع ہو گئے۔ رانی کی شکل ہر وقت میری آنکھ
سامنے رہتی تھی۔ اُس کی محبت بھری باتیں یاد آتی تھیں۔ کسی نہ کسی طرح میں نے
کے پرچے دے دیئے اور اب گھر سے فرار ہو کر رانی کے پاس جانے کا پروگرا
میں لگ گیا۔ سفر کے لئے پیسے ضروری تھے۔ میں نے کچھ پیسے بچا کر رکھے ہو
کچھ پیسے اپنی بڑی بہن سے لاہور جا کر لئے اور ایک روز کسی کو بتائے بغیر ٹرین
کر دِلّی کی طرف روانہ ہو گیا۔ رانی نے مجھے کاغذ پر جو تفصیل لکھ کر دی تھی
مطابق مجھے سب سے پہلے دِلّی جانا تھا۔ دِلّی سے جھانسی بھوپال سیکشن کی طرف

ن پکڑنی تھی اور نرسنگ پور کے سٹیشن سے باندہ اور فتح گڑھ کو جانے والی گاڑی میں
ر ہو کر کالی گھاٹ پہنچنا تھا۔ یہ کافی اُلجھا ہوا سفر تھا مگر میں اس قسم کے سفر کا عادی تھا۔
اس کے علاوہ رانی نے جہاں وہ رہتی تھی اُس کا پورا نقشہ کاغذ پر بنا دیا تھا۔ جس
ے سٹیشن پر مجھے سفر کرنا تھا میں اس سے واقف تھا۔ چنانچہ دِلّی سے ایک ٹرین میں
ر ہو گیا جو جھانسی بھوپال کی طرف جاتی تھی اور نرسنگ پور ٹھہرتی تھی۔ میں صبح کے
ن دِلّی پہنچا تھا۔ دوپہر ہو چکی تھی۔ جب نرسنگ پور کا سٹیشن آ گیا۔ میں وہاں اُتر گیا۔
ں سے مجھے فتح گڑھ کی طرف جانے والی گاڑی پکڑنی تھی۔ مجھے ایک گھنٹہ انتظار کرنا
۔ فتح گڑھ کو جانے والی ایک پسنجر ٹرین آئی، میں اُس میں بیٹھ گیا اور کچھ دیر کے بعد
لی گھاٹ کے سٹیشن پر ٹرین رُکی تو میں اُتر گیا۔ سٹیشن سے باہر آ کر ایک ہوٹل میں کھانا
ایا، چائے پی اور ایک آدمی سے گورو جی کے مٹھ کا پوچھا تو اُس نے لاعلمی کا اظہار کیا،
نے لگا۔ ''اُس طرف ایک ندی جنگل میں سے نکلتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ جنگل میں
ے جاؤ، آگے جا کر ایک مڑھی ہے، شاید وہاں گورو جی کا مٹھ ہو۔''

ندی کی نشانی مجھے رانی نے ہی بتائی تھی۔ میں ندی کے کنارے کنارے چل پڑا۔ یہ
ں گھنے جنگل میں سے نکلتی تھی۔ جیسے جیسے میں آگے بڑھ رہا تھا جنگل زیادہ گھنا اور
وش ہوتا جا رہا تھا۔ ندی کئی جگہوں سے گھومی، میں بھی اس کے ساتھ مُڑتا گیا۔ پھر
شکستہ سے چبوترے کو دیکھا جس پر کسی کی مڑھی کی چھوٹی بُرجی بنی ہوئی تھی۔ مجھے
سے آگے جانا تھا۔ ایک جگہ ندی دائیں طرف مُڑی تو مجھے بائیں جانب اُونچے اُونچے
ڑی نما درختوں کے نیچے دو تین جھونپڑے نظر آئے۔ یہی گورو جی کا مٹھ ہو سکتا تھا۔
نپڑوں کے پاس آ کر دیکھا، وہاں کوئی نہیں تھا۔ ایک جھونپڑا ذرا بڑا تھا اُس پر بانس
چھپر پڑا ہوا تھا۔ باہر پانی سے بھرا ہوا ایک مٹکا پڑا تھا، مٹکے کے اُوپر مٹی کا پیالہ اُلٹا
ہوا تھا، جھونپڑے کا دروازہ درختوں کی شاخوں کو جوڑ کر بنایا گیا تھا جو آدھا کھلا تھا۔

میں نے اندر جھانک کر دیکھا، ایک طرف زمین پر گھاس پھونس کا بستر بچھا ہوا تھا۔
پڑا خالی تھا، دوسری دونوں چھوٹی جھونپڑیاں بھی خالی تھیں۔ میں بڑے جھونپڑے کے
درخت کے ایک مُڈھ پر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا اگر گورو جی کا مٹھ یہی ہے تو رانی یہاں
ں نہیں ہے؟ پھر سوچا شاید وہ جنگل میں پھل پھول لانے گئی ہو۔ جنگل میں خاموشی

طاری تھی، کسی وقت ایک پرندے کے بولنے کی آواز آ جاتی تھی۔ میں چاروں طرف
رہا تھا، آخر ایک طرف درختوں کے نیچے ایک عورت آتی نظر آئی۔ میں اُٹھ کھڑا ہو
رانی ہی تھی۔ اُس نے گیروے رنگ کی جوگنوں والی ساڑھی پہنی ہوئی تھی، ایک ہاتھ
تھالی تھام رکھی تھی جس میں کچھ جنگلی پھول پڑے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی اُس کے
چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔ میرے قریب آ کر اُس نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور بولی۔

''میرا دل کہہ رہا تھا کہ آج تم ضرور آؤ گے۔ دیکھو! میں تمہارے لئے جنگلی گینا
کے پھول چن کر لائی ہوں۔''

ہم جھونپڑے کے اندر گھاس کے بستر پر بیٹھ گئے۔ میں نے اُس سے پوچھا۔''
جی کہاں ہیں؟''

وہ بولی۔ ''گورو جی کل ہی رشی کیش یاترا کرنے گئے ہیں۔''

''میں نے کہا۔ ''تو تم یہاں اکیلی رہتی ہو؟''

''کیوں......؟'' اُس نے حیرت سے پوچھا۔ ''کیا میں اکیلی نہیں رہ سکتی؟ او
یہاں میرے ساتھ جنگل کے پرندے اور ہاتھی، شیر، چیتے بھی رہتے ہیں۔ یہ
میرے دوست ہیں۔ وہ میری حفاظت کرتے ہیں۔''

اُس کی یہ بات میری سمجھ سے باہر تھی۔ مجھے ایک عجیب قسم کی اجنبیت سی محسو
رہی تھی۔ میں نے کہا۔ ''یہاں تم کھاتی پیتی کہاں سے ہو؟ کیا خود کھانا بناتی ہو؟''

وہ ہنسنے لگی۔ ''پہلی بات تو یہ ہے کہ ہم سنیاسی لوگ ہیں۔ ہمیں کھانے پینے کی ا
نہیں ہوتی۔ جنگل میں جو ملتا ہے کھا لیتے ہیں۔ لیکن یہاں ایک عورت میرے لئے
پکا کر لے آتی ہے۔ وہ یہاں قریب ہی ایک گاؤں میں رہتی ہے۔ وہ مجھے دیوی
سمجھتی ہے۔ دوپہر کو آتی ہے۔ تمہیں ضرور بھوک لگ رہی ہوگی۔''

یہ کہہ کر اُس نے کونے میں سے ایک ٹوکری میں رکھی ہوئی پتیلی باہر نکالی۔ اُس
اُبلے ہوئے نمکین چاول اور اچار تھا۔ رانی نے کیلے کے پتے میرے سامنے بچھا
اور اُن پر چاول اور اچار ڈال دیا۔

''شاید تمہیں یہ پسند نہ آئے مگر تپسیا کے دوران ہم لوگ دن میں ایک بار صرف
کھاتے ہیں۔ ہمیں گیہوں کھانے کی اجازت نہیں ہے۔''

یں چاول کھانے لگا۔ کافی دُور تک جنگل میں پیدل چل کر آیا تھا، مجھے بھوک لگ
ہی۔ رانی پیالے میں پانی ڈال کر لے آئی۔ چاول مزے دار تھے۔ رانی کہنے لگی۔
'تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں جانتی ہوں تم شہروں کے عادی ہو،
اس جنگل میں تمہارا جی نہ لگے۔ لیکن میری تپسیا کے صرف تین دن باقی رہ گئے
اس کے بعد میں اور تم...... ہم دونوں شہر چلے جائیں گے۔''

'کون سے شہر......؟'' میں نے پوچھا۔

انی نے کہا۔ ''ابھی ہم باندہ شہر جائیں گے۔ وہاں کملیش پوری کا مندر ہے۔ تپسیا
عد میرا اُس مندر میں جا کر سات دن رہنا ضروری ہے۔ اس کے بعد ہم بمبئی چلے
گے، وہاں میری ایک سہیلی رہتی ہے۔ وہ بیوہ ہے اور اُس کا سمندر کے کنارے اپنا
ہے۔ ہم وہاں رہیں گے اور بمبئی کی خوب سیر کریں گے۔ تم بمبئی ضرور گئے ہو
''

'ہاں...... ایک بار گیا تھا۔'' میں نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔ اصل میں، میں
کے ساتھ کسی مندر وغیرہ میں نہیں جانا چاہتا تھا۔ مندروں کی گھٹی گھٹی سی فضا مجھے
یں تھی۔ جب میں نے مندر کے بارے میں رانی سے اپنی رائے کا اظہار کیا تو وہ
لگی۔

''ہم مندر میں نہیں رہیں گے۔ مندر کے پچھواڑے ایک کوارٹر ہے، ہم وہاں رہیں
صرف میں رات کے وقت مندر جایا کروں گی۔ اور پھر ایک ہفتے کی بات ہے، اس
بعد ہم بمبئی چلے جائیں گے۔''

میں مطمئن ہو گیا۔ وہ تین دن میں نے رانی کے ساتھ اُسی جنگل کے جھونپڑے میں
رے۔ وہ جھونپڑے کے باہر بیٹھ کر ساری ساری رات تپسیا کرتی۔ دن کو ندی پر جا
شنان کرتی اور پھر جھونپڑے میں آ کر سو جاتی۔ اس دوران میں ندی کے کنارے
ے جنگل کی سیر وغیرہ کرتا۔ رانی نے مجھے ندی سے ہٹ کر جنگل کے اندر جانے
نع کر رکھا تھا۔ رات کو جنگل کی طرف سے کسی جنگلی درندے کے بولنے کی آواز آ
تی۔ اس کے سوائے وہ جنگل کافی پُرسکون اور محفوظ تھا۔

تین دن بعد ہم جنگل چھوڑ کر کالی گھاٹ کے سٹیشن کی طرف چل پڑے۔ وہاں سے

هم باندہ جانے والی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ رانی نے اب گیروی ساڑھی کی بجائے
رنگ کی عام سی ساڑھی پہنی ہوئی تھی۔ اُس کے پاس پیسے بھی تھے۔ باندہ تک
دونوں ٹکٹ اُسی نے خریدے تھے، اُس نے مجھے ٹکٹ خریدنے نہیں دیئے تھے۔

هم باندہ پہنچ گئے۔ وسطی ہند کا یہ کافی بارونق اور آباد شہر تھا۔ شہر سے باہر ایک
کے دامن میں کملیش پوری کا مندر تھا۔ مندر کے پچھواڑے ایک چھوٹا سا کوارٹر تھا۔
کی ایک دیوداسی جس کا نام شوالی تھا رانی کی سہیلی تھی۔ رانی نے میرا اُس سے تع
کروایا۔ شوالی مندر کی پجارن تھی۔ گیروے کپڑوں میں تھی۔ مجھے یاد ہے شوالی نے
ایک لمحے کے لئے گھور کر دیکھا تھا اور پھر مسکراتے ہوئے مجھ سے ہاتھ ملایا اور بولی

''شیراز جی! تم سے مل کر بڑی خوشی ہوئی ہے۔''

میں نے کوئی جواب نہ دیا، مسکراتا رہا۔ کوارٹر کے ایک چھوٹے سے کمرے میں
کی چارپائی پر میرا بستر لگا دیا گیا، ساتھ والے چھوٹے کمرے میں رانی کا بستر
گیا۔ صبح و شام دو ٹائم کھانا مندر سے آتا تھا۔ وہاں میرا جی بالکل نہیں لگتا تھا، مگر
نہ کسی طرح رانی کے ساتھ وہاں سات دن گزارنے تھے، اس کے بعد ہمیں بمبئی
مزے سے کچھ وقت محبت کے ماحول میں رہنا تھا۔ رانی میری محبت تھی، میں
گرویدہ ہو چکا تھا۔ اور زندگی کا زیادہ سے زیادہ وقت اُس کے ساتھ بمبئی کے
میں گزارنا چاہتا تھا۔ یہ میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی تھی جسے میں ہر
حاصل کرنا چاہتا تھا۔

رانی ہر روز صبح صبح مندر پوجا کے لئے جاتی۔ جانے سے پہلے وہ میرا ماتھا
جاتی۔ واپس آتی تو مندر کا پرشاد لاتی۔ پہلے میں پرشاد کھاتے ہوئے ہچکچاتا تھا، لیکن
اتنے پیار سے اور اپنے ہاتھ سے مجھے کھلاتی کہ مجھ سے انکار نہ ہوتا۔ اس کے
میرے لئے خود ناشتہ تیار کرتی۔ اتنے میں مندر کی پجارن لڑکی اور رانی کی سہیلی ش
آ جاتی۔ ہم تینوں ایک ساتھ ناشتہ کرتے۔ شوالی کا مجھ سے برتاؤ بھی بڑا محبت
وہ کہتی۔

''رانی! تم میری پیاری سہیلی ضرور ہو، لیکن شیراز میرا بہترین دوست ہے۔
تمہارا پریمی نہ ہوتا تو میں ضرور اس سے شادی کر لیتی۔''

رانی سچ مچ مجھ پر جان چھڑکتی تھی۔ وہ میری ذرا ذرا سی چیز کا خیال رکھتی۔ وہ جانتی
ی کہ میں مسلمان ہوں۔ اُس نے ایک بار بھی مجھے مندر چلنے کے لئے نہیں کہا تھا، نہ
ں نے میرے آگے اپنے دھرم کا کبھی پرچار کیا تھا۔ ایک روز دن کے وقت وہ مندر
ے واپس آئی تو اُس کی سہیلی شوالی اُس کے ساتھ تھی۔ ہم تینوں ناشتے پر پیار محبت کی
تیں کر رہے تھے کہ شوالی نے اچانک رانی سے کہا۔

''رانی! تم ایک دوسرے سے شادی کیوں نہیں کر لیتے؟''

رانی نے میری طرف شرما کر دیکھا۔ شوالی بولی۔

''جب تم ایک دوسرے سے اتنا پیار کرتے ہو تو پھر شادی کرنے میں کیا حرج ہے؟
سلمان اکثر ہندو عورتوں سے شادیاں کر لیتے ہیں۔ شادی کے بعد دونوں اپنے اپنے
رم پر قائم بھی رہتے ہیں۔''

شوالی نے میری طرف متوجہ ہو کر مجھ سے پوچھا۔ ''شیراز! کیا تم رانی سے شادی نہیں
رنا چاہتے؟''

میرے منہ سے نکل گیا۔ ''کیوں نہیں..... ؟ اگر رانی چاہے اور اس کی مرضی ہو تو میں
ادی کرنے پر تیار ہوں۔''

خدا جانے رانی نے مجھ پر کیا جادو کر دیا تھا کہ میں اُس کے بغیر زندگی کا تصور بھی
یں کر سکتا تھا۔ رانی ہندو تھی، مجھ سے عمر میں آٹھ دس برس بڑی تھی، پھر بھی میں اُس کا
یوانہ ہو رہا تھا اور اُس کو ہمیشہ کے لئے اپنا بنانا چاہتا تھا۔ رانی نے میرا جواب سنا تو
رمانے کی بجائے بڑی خوش ہوئی اور اُس نے بے اختیار میرا ماتھا چوم لیا اور بولی۔

''شیراز! میں بھی تم سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔ ہم بمبئی جا کر شادی کر لیں گے۔ مجھ
وشواش رکھو! میں تمہیں بہت خوش رکھوں گی۔''

رانی کی زبان سے شادی کا اقرار سن کر میری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اب میں
لدی سے جلدی بمبئی پہنچنا چاہتا تھا، لیکن رانی نے کملیش پوری کے مندر میں مزید ایک
فتہ لگا دیا۔ یہ ہفتہ میں ہی جانتا ہوں کہ میں نے کس طرح گزارا۔ آخر ایک دن ہم نے
والی کو الوداع کہا اور میں اور رانی ریل گاڑی میں بیٹھ کر بمبئی کی طرف روانہ ہو گئے۔
بمبئی میں رانی کی بیوہ سہیلی کا چھوٹا سا بنگلہ سمندر کے کنارے واقع تھا۔ یہ بنگلہ اُسے

اپنے خاوند کی موت کے بعد حاصل ہوا تھا۔ اُس کا خاوند کافی امیر آدمی تھا۔ رانی کی
سہیلی کا نام ساوتری تھا۔ ساوتری کی عمر پینتیس سال سے زیادہ ہی ہو گی۔ وہ ہر و
منہ ہی منہ میں رامائن کے اشلوک پڑھتی رہتی تھی۔ پوجا پاٹھ کی بڑی پابند تھی۔ بنگلے
ایک کمرے میں اُس نے شیو جی کی مورتی رکھی ہوئی تھی جس کی وہ صبح و شام پوجا
تھی۔

رانی نے اُسے مجھ سے ملایا تو ساوتری نے مجھے اپنے ساتھ لگا کر پیار کیا۔ اُس
جسم سے مجھے لوبان کی بو آتی محسوس ہوئی جو مجھے سخت بری لگی۔ مجھے ساوتری کی شکل
اچھی نہیں لگی تھی۔ اُس کی ایک آنکھ میں کچھ نقص تھا جس کی وجہ سے وہ آنکھ ٹیڑھی ہ
تھی جس سے مجھے خوف سا محسوس ہوتا تھا۔

رانی نے ساوتری کو بتا دیا تھا کہ ہم شادی کرنے والے ہیں۔ یہ سن کر ساوتری
شوالی کی طرح بہت خوش ہوئی۔ تین چار دن تک میں اور رانی بمبئی شہر کی سیر کر
رہے، ساوتری کے پاس ایک چھوٹی کار تھی۔ رانی خود کار چلاتی اور ہم بمبئی کی مشہور
گاہوں میں سارا دن سیر سپاٹے میں مصروف رہتے۔ رات کو اکثر سمندر کے کنار
بمبئی کے کسی مشہور ریستوران میں کھانا کھاتے اور ریستوران کے لان میں ساحل
کے رومانٹک ماحول میں دیر تک بیٹھے محبت بھری راز و نیاز کی باتیں کرتے رہتے۔
کی محبت مجھے ایک سیلاب کی طرح بہائے لئے جا رہی تھی۔ زندگی میں اتنی محبت مجھ
کبھی کسی نے نہیں کی تھی۔ میں اپنے آپ کو دنیا کا خوش قسمت ترین انسان سمجھنے لگا
جس کو رانی جیسی عورت کا بھرپور پیار نصیب ہوا تھا۔

ساوتری کے بنگلے میں ہمارے بیڈ رُوم الگ الگ تھے۔ رات کو رانی میرے بیڈ
میں آ جاتی اور مجھے اپنی محبت بھری باتوں سے سرشار کر دیتی۔ کچھ پتہ ہی نہیں چلا
ایک ہفتہ گزر گیا۔ ایک ہفتے کے بعد ہمیں شادی کے بندھن میں بندھ جانا تھا۔
دوران ایک رات میں ساوتری کے بیڈ رُوم کے قریب سے گزر رہا تھا۔ ساوتری کے
رُوم کا دروازہ ذرا سا کھلا تھا، میں نے دیکھا کہ ساوتری اور رانی دونوں سر جوڑے
اہم موضوع پر سرگوشیاں کر رہی ہیں۔ مجھے چھپ کر دوسروں کی باتیں سننے کی عادت
تھی۔ میں اس کو سخت ناپسند کرتا تھا۔ اور پھر مجھے اُن دونوں کی باتیں چھپ کر

ضرورت بھی نہیں تھی۔ دونوں میری خیر خواہ تھیں۔ دونوں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ
کر مجھ سے پیار کرتی تھیں۔ اور کچھ ہی دنوں بعد میں رانی سے شادی کرنے والا تھا۔
میں خاموشی سے آگے گزر گیا۔

جب ایک ہفتہ سیر و تفریح اور محبت کے بھرپور حسین ایام کی لذت انگیز مہک، سحر انگیز
سرگرمیوں میں گزر گیا تو رات کے وقت رانی میرے بیڈ رُوم میں آئی۔ اُس نے سلک کی
گلابی رنگ کی ساڑھی پہن رکھی تھی اور اُس کے ملبوس سے فرانس کے اعلیٰ ترین پرفیوم کی
مہک آ رہی تھی۔ وہ میرے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ اُس کے بالوں کی لٹ اُس کی پیشانی پر
لٹک رہی تھی۔

وہ بے حد خوبصورت لگ رہی تھی۔ اُس نے اپنے ہاتھ سے بالوں کی لٹ پیچھے کی
اور پراسرار مسکراہٹ والی آنکھوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

''شیراز...... میری جان! میں جانتی ہوں تم مسلمان ہو۔ میں ہندو ہوں۔ شادی کا
بندھن ساری زندگی بلکہ ہمارے دھرم میں جنم جنم کا بندھن ہوتا ہے۔ میں چاہتی ہوں تم
ایک بار پھر سوچ لو! کیا واقعی تم میرے ساتھ شادی کرنے پر تیار ہو؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ
شادی کے بعد تم پچھتانے لگو کہ تم یہ کیا کر بیٹھے۔''

میں نے کہا۔ ''رانی! انسان زندگی میں صرف ایک ہی بار اور ایک ہی عورت سے
محبت کرتا ہے۔ تم میری زندگی کی پہلی اور آخری عورت ہو جس سے میں نے محبت کی
ہے۔ میں تم سے شادی اس لئے کرنا چاہتا ہوں کہ تمہارے بغیر میرا جسم، میری رُوح
ادھوری اور نامکمل ہے۔ میں تمہیں پا کر اپنے آپ کی تکمیل کرنا چاہتا ہوں۔ ایسا کبھی نہیں
ہو گا کہ مجھے تم سے بیاہ کرنے کے بعد کسی قسم کا پچھتاوا ہو۔''

رانی نے بے اختیار مجھے اپنے ساتھ لگا لیا، دیر تک مجھے پیار کرتی رہی، پھر اپنے
بالوں کو چہرے سے پیچھے ہٹاتے ہوئے بولی۔

''ہمارے دھرم میں عورت شادی کے بعد اپنے پتی کو اپنے خاوند کو بھگوان کے بعد کا
درجہ دیتی ہے۔ بلکہ بھگوان سمان سمجھتی ہے۔ تم بھی شادی کے بعد میرے لئے بھگوان
سمان ہو گے۔ وہ اپنے خاوند کے واسطے ستی ساوتری ہوتی ہے۔ وہ خاوند کی ارتھی پر اپنے
آپ کو ستی کر دیتی ہے۔ میں بھی تمہارے لئے ستی ساوتری ثابت ہوں گی۔ تمہارے

دھرم میں آواگون پر یقین نہیں کیا جاتا، مگر ہمارے دھرم کی بنیاد ہی اسی یقین پر ہے
انسان مرنے کے بعد اپنے کرموں کے مطابق دوسرا جنم لیتا ہے۔ اور یہ کہ محبت کر
والے اگر اُن کی محبت سچی ہو تو مرنے کے بعد دوسرے جنم میں بھی ایک دوسرے
پریمی بن کر جنم لیتے ہیں اور اُن کا جنم جنم کا ساتھ رہتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہم پچھلے
میں بھی ایک دوسرے کے پریمی تھے، ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے اور پتی
تھے۔''

میں نے فلموں میں ہندو شادی بیاہ کی رسمیں ہوتی دیکھی تھیں۔ میں نے رانی
پوچھا۔''کیا ہماری شادی بھی اسی طرح ہو گی جس طرح کہ فلموں میں ہوتی ہے؟ پنڈ
آئے گا، درمیان میں آگ روشن کی جائے گی اور سات پھیرے ہوں گے؟''

رانی ہنس پڑی۔ اُس کے دانت واقعی بڑے خوبصورت، ہموار اور موتیوں کی ط
تھے۔ کہنے لگی۔

''نہیں...... ہماری شادی بڑے سادہ طریقے سے اسی بنگلے میں ہو گی صرف اُ
پنڈت ہو گا جو اشلوک پڑھ کر ہمیں ایک دوسرے سے شادی کے بندھن میں باندھ د
گا اور ہماری شادی ہو جائے گی۔''

مجھے اُس کی یہ بات اچھی لگی۔ میں خود بھی یہی چاہتا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ہما
شادی ہندو رسموں کے مطابق بڑی دُھوم دھام سے ہو اور یہ خبر میرے گھر والوں تک
جائے۔ میں یہ شادی اپنے ماں باپ، بہن بھائیوں سے چھپ کر کر رہا تھا اور اس کو
میں ہی رکھنا چاہتا تھا۔ جب میں نے رانی سے پوچھا کہ ہماری شادی کس روز ہو
والی ہے تو اُس نے کہا۔

''ہمارے دھرم میں شادی کے لئے لڑکی کی جنم کنڈلی دیکھ کر کوئی شبھ دن نکالا
ہے۔ میری جنم کنڈلی کے مطابق پنڈت جی نے آج سے پندرہ دن بعد اسی ماہ کی
تاریخ نکالی ہے۔ اس ماہ کی بیس تاریخ کو ہم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے
جائیں گے۔ لیکن چونکہ میں ایک دوسرے دھرم کے مرد کو اپنا جیون ساتھی بنا رہی
اس لئے مجھے اور تمہیں ہم دونوں کو الگ الگ ایک خاص رسم ادا کرنی ہو گی۔''

میں نے پوچھا۔''کس قسم کی رسم؟''

وہ بولی۔''مجھے ساوتری کے بنگلے میں رہ کر پورے سات دن ہر رات گنیش مہاراج
کی پوجا کرنی ہو گی۔''

''اور مجھے کیا کرنا ہو گا؟''

میرے سوال پر وہ بولی۔''تمہیں تھوڑی زحمت اُٹھانی پڑے گی۔ مگر یہ ہماری مجبوری
ہے۔ اس کے بغیر ہم ایک دوسرے کے جیون ساتھی نہیں بن سکتے۔''

میں نے کہا۔''میں تمہاری محبت حاصل کرنے کی خاطر ہر قسم کی تکلیف اُٹھانے کو تیار
ہوں۔ بتاؤ! مجھے کیا کرنا ہو گا؟''

رانی کہنے لگی۔''تم کسی مندر میں گنیش جی کی مورتی کے آگے نہیں بیٹھو گے۔ تمہیں
گنیش جی کے پرانے مندر سے تھوڑے فاصلے پر ایک جھونپڑے میں رات کے وقت
سورج ڈوبنے کے بعد صرف دو گھنٹے آلتی پالتی مار کر بیٹھے رہنا ہو گا۔ تمہیں کوئی اشلوک
نہیں پڑھنے ہوں گے، صرف خاموش بیٹھے رہنا ہو گا۔ تمہارے سامنے ایک دیا روشن ہو گا
اور تھالی میں لوبان سلگا دیا جائے گا۔ تمہیں سات دن تک یہ عمل کرنا پڑے گا۔''

میں نے پوچھا۔''میرے ساتھ اور کون ہو گا؟''

رانی نے کہا۔''ساوتری تمہارے ساتھ ہو گی۔ وہ تمہارا ہر طرح سے خیال رکھے گی۔
تمہیں صبح شام کھانا تیار کر کے دے گی۔''

''یہ مندر کس جگہ پر ہے؟'' میں نے پوچھا۔

رانی نے جواب میں کہا۔''یہ ایک خاص مندر ہے اور دو سو سال پرانا ہے۔ اس رسم
کے واسطے اسی مندر کی ضرورت تھی۔ یہ بمبئی سے دو ڈھائی سو میل دُور ہے۔ ساوتری
تمہیں اپنے ساتھ لے جائے گی۔''

میں رانی کے عشق میں ایسا دیوانہ ہو چکا تھا کہ کچھ سوچے سمجھے بغیر ساوتری کے ساتھ
ایک کافرانہ ہندو رسم ادا کرنے چل پڑا جس کی ایسی سزا مجھے بھگتنی پڑی کہ جو مجھے ساری
زندگی یاد رہے گی اور میرے لئے درسِ عبرت بنی رہے گی۔

ساوتری نے اپنی ایک نوکرانی کو ایک دن پہلے وہاں روانہ کر دیا تھا تا کہ جھونپڑے
میں میرے رہنے سہنے اور دوسری ضروریات کا انتظام کر دے۔ ہم بمبئی سے صبح منہ
اندھیرے ٹرین میں بیٹھ کر روانہ ہوئے اور دن ڈھلے ایک جگہ ٹرین سے اُتر گئے۔ وہاں

سے دو میل ایک بیل گاڑی میں بیٹھ کر جنگل کے اندرونی علاقے میں آ گئے۔ ساو
نے مجھے دُور سے ایک پرانے مندر کا کھنڈر سا دکھا کر کہا۔
''یہ گنیش جی کا دو سو سال پرانا مندر ہے۔''
مندر جنگل کے وسط میں تھا۔ اِرد گرد اُونچے اُونچے درخت تھے۔ چٹانی پتھر ز
سے باہر نکلے ہوئے تھے۔ مندر کے پچھواڑے کچھ فاصلے پر ایک جھونپڑا بنا ہوا
ساوتری کی نوکرانی پہلے سے وہاں موجود تھی۔ جھونپڑے میں ایک طرف گھاس بچھ
میرا بستر لگا دیا گیا تھا، پانی سے بھرا ہوا مٹکا بھی رکھا تھا۔ ساوتری نے کہا۔
''میرا بستر دوسری سامنے والی جھونپڑی میں ہو گا۔ مگر میں تمہاری خیر خبر لیتی ر
گی۔ کھانا وغیرہ ہمیں نوکرانی بنا کر دے گی۔ صرف سات دن کی بات ہے۔''
مجھ پر رانی سے بیاہ رچانے کا نشہ سوار تھا۔ یہ سات دن مجھے معمولی لگ رہے ت
میں رانی کی خاطر صحرا کی تپتی دُھوپ میں سارا دن کھڑے رہنے کو تیار تھا۔ ساوتری
مجھے جھونپڑے کے اندر ایک دائرہ بنا دیا اور کہنے لگی۔
''تمہیں سورج کے ڈوب جانے کے بعد اس دائرے کے اندر دو گھنٹے تک بیٹھے
ہو گا۔ تم بیٹھے بیٹھے پہلو بدل سکتے ہو، آسن بدل سکتے ہو، مگر دائرے سے باہر نہیں
گے۔ میں تھوڑی تھوڑی دیر بعد جھونپڑے کے دروازے پر آ کر تمہیں دیکھ جایا کر
گی۔ یہ صرف دو گھنٹے کا چلہ ہو گا۔ تمہیں کوئی پریشانی تو نہیں ہو گی نا؟''
میں نے کہا۔ ''بالکل نہیں۔''
جب سورج غروب ہوا تو میں جھونپڑے میں دائرے کے اندر بیٹھ گیا۔ ساوتری نے
میرے سامنے ایک تھالی میں دیا روشن کر کے لوبان سلگا دیا۔ لوبان کی بو مجھے سخت نا
لگی۔ مگر مجبوری تھی۔ میں بیٹھا رہا۔ ساوتری نے کہا۔
''اب تم خاموش ہو کر بیٹھے رہو گے۔ کسی کو آواز نہیں دو گے، منہ سے کوئی آواز
نکالو گے۔ تمہاری تپسیا کا وقت شروع ہو گیا ہے۔ میں جا رہی ہوں۔''
ساوتری چلی گئی، میں آلتی پالتی مارے دائرے کے اندر بیٹھا سوچتا رہا کہ میں
حماقت کر رہا ہوں؟ کبھی خدا سے اپنے اس کافرانہ عمل کی معافی مانگتا، کبھی جی چاہتا
اُٹھ کر بھاگ جاؤں۔ کبھی خیال آتا کہ میری نیت تو صحیح ہے۔ میں دل سے مسل

ہوں۔ یہ جو کچھ میں کر رہا ہوں رانی سے بیاہ کرنے کی خاطر کر رہا ہوں۔
لوبان کے دُھوئیں اور بو کا ایک فائدہ ضرور ہوا کہ جھونپڑے میں جو مچھر تھے وہ
بھاگ گئے۔ جھونپڑے کے دروازے میں سے کسی کسی وقت تازہ ہوا کا جھونکا اندر آ کر
لوبان کی ناخوشگوار بو کو کم کر دیتا تھا۔ گھڑی میرے پاس نہیں تھی۔ البتہ ساوتری کی کلائی
پر گھڑی ضرور بندھی ہوئی تھی۔ آلتی پالتی کے آسن سے تھک جاتا تو پہلو بدل لیتا۔ میں
نے دیکھا کہ ساوتری تھوڑی تھوڑی دیر بعد دروازے میں آ کر مجھے دیکھ جاتی تھی۔
آخر دو گھنٹے ختم ہو گئے۔ ساوتری نے اندر آ کر کہا۔ ''اب تم اُٹھ کر باہر آ سکتے ہو۔''
میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور جلدی سے اُٹھ کر جھونپڑے سے باہر تازہ اور کھلی ہوا
میں آ گیا۔ تازہ ہوا میں آتے ہی میری طبیعت کی بوریت دُور ہو گئی۔ دوسرے جھونپڑے
کے باہر ساوتری کی نوکرانی رات کا کھانا تیار کر رہی تھی۔ ساوتری میرے لئے چائے بنا
کر لے آئی۔ ہم جھونپڑے کے باہر بیٹھ کر چائے پینے لگے۔ میں ساوتری کی طرف دیکھ
کر بات نہیں کرتا تھا۔ مجھے اُس کی ٹیڑھی آنکھ سے خوف سا محسوس ہوتا تھا۔ بہت مجبوری
کی حالت میں نظر اُس کی طرف اُٹھاتا اور پھر نظریں جھکا لیتا۔
ایک دن اور ایک رات گزر گئی۔ دوسرا دن اور دوسری رات بھی گزر گئی۔ دن کے
قت میں بیکار ہوتا تھا۔ ساوتری کے پاس زیادہ دیر بیٹھنے سے ویسے ہی میں گھبراتا تھا
بنانچہ اُٹھ کر جنگل میں اِدھر اُدھر سیر کرنے نکل جاتا۔ ساوتری نے مجھے خبردار کیا تھا کہ
بں جنگل میں زیادہ دُور نہ جاؤں، جنگلی جانوروں کا خطرہ ہے۔ لیکن یہ جنگل اتنا
وبصورت تھا کہ خوامخواہ دُور تک سیر کرنے کو جی چاہتا۔ میری احمقانہ تپسیا کا چوتھا دن
فا۔ میں ساوتری کے پاس اُس کی جھونپڑی کے باہر چوکی پر بیٹھا رانی کی باتیں کر رہا
فا۔ جب ساوتری کی ٹیڑھی آنکھ میری برداشت سے باہر ہو گئی تو یہ کہہ کر اُٹھا کہ ذرا
نگل کی سیر کر آؤں۔
ساوتری نے کہا۔ ''آسمان پر بادل چھا رہے ہیں۔ لگتا ہے بارش ہو گی۔ اس جنگل
کی بارش بڑی طوفانی ہوتی ہے۔ نہ ہی جاؤ تو بہتر ہے۔''
لیکن میں اس سے زیادہ ساوتری کے پاس نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ میں نے کہا۔
''میں زیادہ دُور نہیں جاؤں گا۔''

میرے جھونپڑے کے پیچھے ایک پتلی پگڈنڈی اُونچے درختوں کے درمیان دُور
کے اندر ہی اندر چلی گئی تھی۔ میں عام طور پر اسی پگڈنڈی پر سے ہو کر جنگل کی سیر کو
تھا۔ اُس روز واقعی موسم بڑا رومانٹک تھا، آسمان پر بادل چھا رہے تھے، ٹھنڈی ہوا
رہی تھی، درختوں پر لٹکتی ہوئی جنگلی پھولوں کی بیلیں ہوا میں جھول رہی تھیں، درختو
پرندے چہچہا رہے تھے۔ بے خبری میں، میں کافی دُور تک نکل آیا، مگر میں نے سوچا
کی کوئی بات نہیں ہے، واپسی کا راستہ مجھے معلوم ہے، جس وقت اور جہاں سے چاہو
واپس چلا جاؤں گا۔

میرا دماغ اس وقت اپنی محبوبہ رانی کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا۔ اُس کی
اور دلکش صورت آنکھوں کے سامنے تھی۔ اُسی کی دھن میں سرشار میں چلتا ہی چلا
مجھے خیال ہی نہ رہا کہ میں جنگل میں کافی آگے نکل آیا ہوں۔ اس وقت ہوا بھی تیز
لگی تھی اور بادل بھی گرجنے لگے تھے۔ جنگل کا نقشہ بدل گیا تھا۔ درخت زیادہ گ
گئے تھے اور جھاڑیاں اور گھاس اتنی اُونچی ہو گئی تھی کہ اس کے اندر سے گزرتے
کچھ پتہ نہیں چلتا تھا کہ میں کس سمت کو جا رہا ہوں؟ میں کچھ گھبرا سا گیا۔ دل نے
تم بھٹک گئے ہو۔ اس وقت میں گھاس کے ایک تختے میں سے گزر رہا تھا۔ میرے
جانب جنگلی گھاس میرے سر سے بھی ایک فٹ اُونچی تھی۔ میرے سر پر پانی کی
بوندیں گریں تو میں نے اپنی رفتار تیز کر دی۔ میں جلدی سے جلدی گھاس کے سمند
نکل جانا چاہتا تھا، مگر گھاس کا سمندر ختم ہونے میں ہی نہیں آتا تھا۔ دونوں جانب
کی اُونچی دیوار تھی جس کے درمیان تنگ سا راستہ بنا ہوا تھا۔ یہ راستہ کبھی دائیں ا
بائیں جانب گھوم جاتا۔ مجھے بھی مجبوراً اُس کے ساتھ مڑنا پڑتا تھا۔ ہوا کی تیز
شدت آ گئی اور بونداباندی بھی شروع ہو گئی۔

میں نے گھبرا کر دوڑنا شروع کر دیا۔ دوڑتے دوڑتے میں ہانپنے لگا، لیکن ق
سے بھی اُونچی جنگلی گھاس کا سمندر ختم ہونے میں نہیں آتا تھا۔ میں تھک گیا تو قد
چلنے لگا۔ ہوا آندھی کی شکل اختیار کر گئی اور بارش بھی تیز ہو گئی تھی۔ گھاس کا سمندر ا
ختم ہو گیا۔ لیکن یہ اس طرح ختم ہوا کہ اچانک میرے آگے زمین جیسے ختم ہو گئی ا
نیچے ایک گہری کھائی میں گر پڑا...... کھائی میں لڑھکتا ہوا میں دُور تک نکل گیا۔

ڈھلان ختم ہوئی تو میں جلدی سے اُٹھا۔ میرا سارا جسم درد کرنے لگا تھا۔ جسم کے کسی حصے
میں کوئی چوٹ تو نہیں لگی تھی مگر ڈھلان کے پتھروں کی رگڑ سے میری قمیض پھٹ گئی تھی
اور بازو بھی چھل گئے تھے۔ تیز ہوا کے شور میں کھائی کی جھاڑیاں دائیں بائیں اپنی
شاخوں کو پیٹ رہی تھیں۔ میں بارش میں شرابور ہو گیا۔ تیز طوفانی آندھی میں آنکھیں پوری
نہیں کھلتی تھیں۔ کھائی میں سے نکلنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں کھائی کی دیوار کا
سہارا لے کر ایک طرف کو چل پڑا۔ جھاڑ جھنکاڑ اور سخت جنگلی گھاس میرا راستہ روک رہی
تھیں، مگر میں رُکے بغیر چلتا گیا۔

کچھ دُور جانے کے بعد کھائی کی دیوار ختم ہو گئی۔ تھوڑی سی چڑھائی طے کر کے میں
کھائی سے باہر نکل آیا، لیکن مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ میں جنگل میں اپنے جھونپڑے سے
کتنی دُور آ گیا ہوں اور کس سمت کو آ گیا ہوں؟ سمت کا کچھ اندازہ نہیں رہا تھا۔ اگر
سورج نکلا ہوا ہوتا تو اس کی مدد سے میں سمت کا اندازہ لگا سکتا تھا مگر آسمان پر گھنے سیاہ
بادل چھا رہے تھے، گرج رہے تھے۔ بجلی رہ رہ کر چمک رہی تھی اور موسلا دھار بارش ہو
رہی تھی۔ ہوا آندھی کی طرح شور مچا رہی تھی۔ بارش اور تیز ہوا میں مجھے راستہ سجھائی نہیں
دیتا تھا۔ بس جس سمت قدم اُٹھتا تھا اُدھر کو ہی چلنے لگتا۔ مجھے محسوس ہوا کہ میں ایک
ڈھلان اُتر رہا ہوں۔ ڈھلان ختم ہوئی تو میں نے غور سے دیکھا کہ میں دو ڈھلانی
دیواروں کے درمیان ایک برساتی نالے میں ہوں۔ پانی نالے میں بارش کا ہی تھا اور
اُس کے پتھر دکھائی دیتے تھے۔ میں نالے میں ایک طرف کو چلنے لگا کہ آگے جا کر نالے
سے باہر نکلنے کی کوشش کروں گا۔ شاید آگے کوئی ایسی جگہ مل جائے جہاں مجھے کچھ دیر کے
لئے بارش اور آندھی کے طوفان سے نجات مل جائے۔ ہوا اتنی تیز تھی کہ اُس کے تھپیڑے
مجھے آگے کو دھکیل رہے تھے۔ میں ایک قدم چلتا تو ہوا کا زور مجھے دو قدم آگے لے
جاتا۔ اچانک مجھے گڑگڑاہٹ کی ایک عجیب سی آواز سنائی دینے لگی۔ یہ آواز آندھی اور
بارش کے شور میں سب سے بلند تھی۔

میں سمجھا کہ شاید زلزلہ آ گیا ہے۔ مگر میرے پاؤں کے نیچے زمین بالکل نہیں ہل رہی
تھی۔ یہ زلزلے کی آواز نہیں تھی۔ پھر یہ آواز کیسی تھی جو لحظہ بہ لحظہ تیز ہو کر قریب آتی جا
رہی تھی؟ میں رُک کر بیٹھ گیا۔ ابھی میں بیٹھا ہی تھا کہ پانی کا ایک تیز ریلہ پیچھے سے مجھ

سے ٹکرایا اور مجھے ،خشک لکڑی کی طرح بہا کر آگے لے گیا...... تب مجھے احساس ہ
نالے میں اچانک سیلاب کا پانی آ گیا ہے۔ یہ ایک طوفانی ریلا تھا جو مجھے بہائے
رہا تھا اور میں تنکے کی طرح آگے ہی آگے بہتا چلا جا رہا تھا...... میں کچھ نہیں کہہ سکا
یہ طوفانی ریلا مجھے کہاں تک بہاتا لئے چلا گیا؟ ریلے کی رفتار بڑی تیز تھی۔ ایک
برساتی نالہ بائیں جانب گھوما تو میرا جسم ایک بہت بڑے پتھر سے اتنے زور سے ٹکرا
میری آنکھوں کے سامنے تارے ناچنے لگے۔ اس کے ساتھ ہی برساتی نالہ جو
ریلے سے منہ تک بھر چکا تھا ایک دم سے ایک آبشار کی طرح نشیب میں گرا اور میر
کے تیز رفتار ریلے کے ساتھ ہی نیچے گرا اور پھر پانی کی ایک لہر نے مجھے اُٹھا کر
کنارے پر پھینک دیا۔

اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہ رہا......

جب ہوش آیا تو میں نے دیکھا کہ میں ایک چھوٹے سے خیمے میں پڑا ہوں اور
خاکی بش شرٹ والا بھاری بھر کم آدمی میرے سینے پر کسی تیل کی مالش کر رہا
سانولے رنگ کے اُس آدمی کی آنکھیں سرخ تھیں۔ مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر وہ بولا

''تم اِدھر جنگل میں کیا کر رہا تھا؟''

میں نے بولنے کی کوشش کی مگر مجھ پر کمزوری طاری تھی۔ وہ بولا۔

''ٹھیک ہے...... تم مت بولو۔ ابھی یہ پی لو!''

اُس نے ایک طرف اشارہ کیا۔ وہاں اُس کا ایک جنگلی ملازم کھڑا تھا۔ اشارہ
ہی وہ گلاس میں قہوہ لے کر میرے پاس آ گیا۔

''یہ کافی ہے۔ اس میں ہم نے تھوڑا برانڈی ملایا ہے۔ تم کو اس سے طاقت
تھوڑا پی لو!''

میں نے کافی کے دو تین گھونٹ پیے، اس سے واقعی میرے جسم میں توانائی آ
میں نے کہا۔'' مجھے بڑی جلدی مالا پور کے گنیش مندر میں پہنچنا ہے۔ مجھے کسی طرح
پہنچا دو!''

وہ بولا۔'' میرا نام کانٹیکر ہے۔ میں شکاری ہوں۔ ہاتھی اور شیر کا شکار کھیلتا ہ
میرے نوکر نے تمہیں نالے کے پاس بے ہوش پڑے دیکھا تو اُٹھا کر میرے پاس

یا۔ کیا تم مالا پور گنیش مندر کے پجاری ہو؟ تم شکل سے پجاری نہیں لگتے۔''
میں نے کہا۔'' وہاں میرا ایک دوست میرا انتظار کر رہا ہے۔ میں نے اُس کے ساتھ
ی جلدی بمبئی پہنچنا ہے۔''

شکاری بولا۔'' ارے بابا! کیوں دماغ خراب کرتا ہے...... جانتے ہو مالا پور کا سٹیشن
ں سے کتنی دُور ہے؟ اُدھر کوئی ریل گاڑی بھی نہیں ملے گی۔ گھوڑے خچر پر بیٹھ کر بھی
ؤ گے تو پورے دو دن لگ جائیں گے۔ اور برسات کے سیلاب نے سارے راستے بند
ر کھے ہیں۔ ابھی تم ہمارے ساتھ شکار کھیلو! ہم واپس بمبئی جائے گا تو تمہیں مالا پور
ڑ جائے گا۔''

مجبوری تھی۔ قسمت نے مجھے رانی سے دُور کر دیا تھا۔ اب سوائے صبر اور انتظار کرنے
، اور کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ اُس وقت شام ہو گئی تھی۔ رات بھر آرام کرنے کے بعد میری
بت بحال ہو گئی۔ دوسرے روز موسم بھی ٹھیک ہو گیا۔ دُھوپ نکل آئی۔ میں نے ایک
پھر شکاری کانٹیکر سے اصرار کیا کہ مجھے کسی طریقے سے مالا پور سٹیشن کی طرف روانہ
دو! مجھے راستہ بتا دو، میں پیدل ہی چلا جاؤں گا۔

شکاری ہنس پڑا۔ بولا۔'' تم ایک دم احمق ہے۔ ادھر کے حالات سے واقف نہیں
ہے۔ یہ باندھ فاریسٹ ڈویژن کے جنگل ہیں۔ اگر تم اکیلا جنگل میں نکلا تو جنگلی جانور
ہیں چیر پھاڑ ڈالیں گے ابھی کچھ دن صبر کرو، پھر ہمارے ساتھ چلے چلنا۔''

تیسرے دن شکاری کانٹیکر نے مجھے ساتھ لیا اور شکار کھیلنے جنگل کی طرف چل پڑا۔
ں کا جنگلی ملازم اور گائیڈ بھی اُس کے ہمراہ تھا۔ ایک دو نالی بندوق گائیڈ کے پاس تھی،
ب بھری ہوئی دو نالی بندوق شکاری کانٹیکر نے مجھے دے دی تھی اور ساتھ ہی ہدایت
ر دی تھی کہ جب میں کہوں تب فائر کرنا۔ خود اُس کے پاس ایک رائفل تھی۔ ایک فالتو
نفل اور کارتوسوں کا جھولا جنگلی گائیڈ کے کندھے سے لٹک رہا تھا۔

میں نے کبھی جنگل میں شکار نہیں کھیلا تھا اور ہاتھی، شیر، چیتے کے شکار کا تو میں نے
ور بھی نہیں کیا تھا۔ میں اس لئے شکاری کے ساتھ لگا ہوا تھا کہ وہ مجھے اپنے ساتھ
پور تک لے جائے گا۔ جہاں سے میں گنیش کے مندر میں پہنچ کر ساوتری سے مل سکوں
جو یقیناً میری راہ دیکھ رہی ہو گی۔ اور یہی سمجھ رہی ہو گی کہ میں بارش کے طوفان میں

جنگل میں بھٹک گیا ہوں۔ میری تپسیا کا صرف ایک دن باقی تھا، اگر اُس روز تک
بھی پہنچا تو ساوتری ضرور مندر کے جھونپڑے میں میرا انتظار کرے گی۔ وہ میر
بمبئ رانی کے پاس نہیں جائے گی۔ مجھے تلاش کرنے کی کوشش بھی کرے گی۔ پ
آتا کہ ہوسکتا ہے ساوتری نے یہ سمجھ لیا ہو کہ میں جنگل میں کسی درندے کا شکا
ہوں۔

ہرقسم کے پریشان کردینے والے خیال دل میں آرہے تھے اور میں شکاری
کے پیچھے پیچھے بندوق لئے چلا جارہا تھا۔ جنگل زیادہ گھنا نہیں تھا۔ مگر ہر طرف
ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ لگتا تھا کہ ابھی کسی طرف سے کوئی شیر یا ہاتھی نکل کر حملہ
گا۔ میں چاروں طرف دیکھتا ہوا جارہا تھا۔ جنگلی گائیڈ شکاری کے ساتھ ساتھ
تھا۔ ایک جگہ وہ رُک کر زمین پر کسی درندے کے پاؤں کے نشان دیکھنے لگا۔
قریب چلا گیا۔ جنگلی گائیڈ نے زمین پر وہ جگہ دکھاتے ہوئے جہاں گھاس بیٹھی
شکاری سے کہا۔ ''ہاتھی یہاں سے گزرا ہے۔ پاؤں کے نشان تازہ ہیں۔ وہ ز
نہیں گیا ہوگا۔''

ہاتھی کا نام سن کر میرے کان کھڑے ہوگئے۔ سوچنے لگا کہ اگر ہاتھی نے
اور یہ لوگ اُسے ہلاک کرنے میں ناکام رہے تو اُن کے ساتھ میں بھی مارا جا
بندوق کی گولیوں کا اتنے بڑے پہاڑ جیسے ہاتھی پر کیا اثر ہوگا؟ شکاری نے رائفل
اور ہاتھی کے پاؤں کے نشان کا کھرا لیتا ہوا آگے چل پڑا۔ دُھوپ نکلی ہوئی تھ
حبس ہو رہا تھا۔ بار بار پسینے آرہے تھے، ہوا بند تھی۔ میرا گرمی اور حبس کے ما
حال ہو رہا تھا۔ شکاری کانٹیکر تھوڑی تھوڑی دیر بعد اپنے خاکی رنگ کے تھیلے
برانڈی کی چھوٹی بوتل نکال کر اُس کے ایک دو گھونٹ پیتا اور ہاتھی کا کھرا لیتا آ
پڑتا۔

ہم کافی دیر اور کافی دُور تک چلتے گئے مگر ہاتھی کہیں دکھائی نہ دیا۔ ایک جگہ
پر بیٹھ گئے۔ تھرماس میں سے میں نے پانی پیا۔ شکاری نے مجھے دو سینڈوچ
دیئے۔ اُس نے جنگلی گائیڈ سے پوچھا۔

''تم کو کیا لگتا ہے؟ میرا تو خیال ہے کہ ہاتھی راستہ کاٹ کر دوسرے جنگل

گیا ہے۔''

جنگلی گائیڈ بولا۔ ''نہیں صاحب! ہاتھی ایک بار چلتا ہے تو میلوں چلتا رہتا ہے۔ وہ
تک اسی جنگل میں ہے۔ آگے بانس کا چھوٹا جنگل ہے۔ ہاتھی بانس کی ڈالیاں
شوق سے کھاتا ہے۔ وہ ضرور بانس کے ذخیرے کی طرف گیا ہے۔''

کچھ دیر آرام کرنے کے بعد ہم جنگلی گائیڈ کی رہنمائی میں بانس کے ذخیرے کی
چل پڑے۔ راستے میں ایک پہاڑی چشمہ آگیا۔ وہاں ہم نے منہ ہاتھ دھوئے،
پیا، تھرماسوں میں تازہ پانی بھرا اور آگے چل پڑے۔ ایک جنگل سے نکل کر دوسرے
میں داخل ہوگئے۔ دوسرے جنگل میں سے نکلے تو دُور کچھ فاصلے پر اُونچی اُونچی قد
گھاس کا سمندر سا لہراتا نظر آیا۔ جنگلی گائیڈ نے اُس طرف اشارہ کرکے کہا۔

''صاحب! وہ گھانسوں کا پاٹ ہے۔ اُس کے آگے بانس کا ذخیرہ ہے۔''

میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ منزل پر تو پہنچے۔ شکاری کانٹیکر بار بار برانڈی کے
نٹ پیتا رہا تھا جس کی وجہ سے اُس کو نشہ ہوگیا تھا اور بات کرتے ہوئے اُس کی
ن لڑکھڑا جاتی تھی۔ چلتے چلتے ہم ہاتھی چھپواں گھاس کے پاٹ کے قریب پہنچ گئے۔
پہنچ کر شکاری کانٹیکر بیٹھ گیا۔ جنگلی گائیڈ کو کہا۔ ''ابھی تم آگے جاکر ہاتھی کا کھرا
اور ہمیں آکر خبر کرو۔ ہم تب تک یہاں کافی پئے گا۔''

جنگلی گائیڈ گھاس کے سمندر کی طرف چل دیا۔ شکاری نے کافی کے تھرماس میں سے
ڑی سی کافی اپنے مگ میں اُنڈیلی اور تھوڑی کافی دوسرے مگ میں ڈال کر مجھے دی اور
''اس میں برانڈی نہیں ہے۔''

وہ کافی کی چسکیاں لینے اور تولئے سے بار بار اپنے چہرے اور گردن پر آیا ہوا پسینہ
پونچھنے لگا۔ اپنی رائفل اور کارتوسوں کا جھولا اُس نے پاس ہی زمین پر رکھ دیا تھا۔ میں
ن پر چوکڑی مار کر بیٹھا تھا۔ دونالی بندوق میں نے کندھے کے ساتھ لگا رکھی تھی اور
ی کڑوی کافی کے گھونٹ بمشکل نگل رہا تھا۔ میرا رُخ گھاس کے سمندر کی طرف تھا۔
انس کا پاٹ ہم سے زیادہ دُور نہیں تھا۔ یہی کوئی ستر، اسّی گز کا فاصلہ ہوگا۔ دُھوپ
ب چمک رہی تھی۔ میں اُونچی گھاس کے دُور تک لہراتے تختے کی طرف دیکھ رہا تھا۔
چ رہا تھا کہ اگر ہم اُس گھاس کے سمندر میں داخل ہوگئے تو پھر ہمارا بچنا مشکل ہے۔

ہاتھی کسی بھی طرف سے آ کر ہم میں سے ایک کو تو ضرور ہلاک کر دے گا۔ میں
میں طے کر لیا تھا کہ اگر ہاتھی آیا تو میں شکاری کی طرف نہیں دیکھوں گا۔ میری
میں دو کارتوس بھرے ہوئے تھے، دھڑ ادھڑ دونوں فائر ہاتھی پر جھونک دُوں گا او
سے فرار ہونے کی کوشش کروں گا۔

یہی سوچتے ہوئے میں گھاس کے تختے کی طرف دیکھ رہا تھا کہ اچانک میری آ
کھلی کی کھلی رہ گئیں...... میں نے ایک پہاڑ جیسے ہاتھی کو گھاس کے تختے میں سے
دیکھا۔ شکاری کانٹیکر کا رُخ ہاتھی کی طرف نہیں تھا۔ ہاتھی اپنی اژدھا جیسی سو
اُٹھائے دوڑتا ہوا سیدھا شکاری کی طرف آ رہا تھا...... ایک لمحے کے لئے میرا جسم
سن ہو گیا، پھر میں ایک جھٹکے کے ساتھ اُٹھا اور چلا کر کہا۔

''صاحب...... ہاتھی!''

اور میرا جدھر منہ اُٹھا میں نے بھاگنا شروع کر دیا۔ کچھ دُور دوڑتے کے بعد میں
گردن موڑ کر دیکھا، اُس وقت ہاتھی نے شکاری کو اپنی سونڈ میں لپیٹ کر اُوپر اُٹھا
تھا اور اُسے گھما کر نیچے پٹخ رہا تھا۔ میرا دل اُس منظر کو دیکھ کر لرز اُٹھا۔ میں دیوا
بھاگتا چلا جا رہا تھا۔ کافی کا مگ وہیں اُٹھتے ہوئے میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔
پتہ نہیں کیوں میں نے دو نالی بندوق کو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ میں بندوق کو ساتھ
بھاگ رہا تھا۔ میں جس طرف بھاگ رہا تھا اُدھر زمین پتھریلی تھی۔ کہیں کہیں د
کے جھنڈ بھی نظر آ رہے تھے۔ دوڑتے دوڑتے تھک گیا تو ایک جگہ دم لینے کے لئے
گیا۔ میں کافی دُور نکل آیا تھا۔ شکاری کانٹیکر کی موت کا منظر بار بار میری آنکھو
سامنے آ جاتا تھا۔ اُس کی عبرت ناک موت کا مجھے افسوس ہوا تھا۔ اُسے رائفل
کی بھی ہاتھی نے مہلت نہیں دی تھی۔ جنگلی گائیڈ جو آگے گیا تھا، اُس کے بندوق
کی بھی آواز نہیں آئی تھی۔ شاید ہاتھی نے سب سے پہلے اُسے بے خبری میں د
تھا۔

میں نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی، عجیب ویران جنگل تھا۔ مجھے پیاس محسوس
میں اُٹھ کر چل پڑا کہ شاید آگے کسی جگہ کوئی پہاڑی چشمہ یا ندی مل جائے۔ بند
میں نے کندھے پر لٹکا لیا تھا، کسی وقت میں پیچھے گردن موڑ کر دیکھ لیتا تھا کہ کہیں

ا پیچھا نہ کر رہا ہو۔ لیکن اب ہاتھی کا خطرہ نہیں رہا تھا۔ ویسے بھی میرے پیچھے دُور تک
ن میدانی تھی۔ ہاتھی دُور سے آتا نظر آ سکتا تھا۔ درختوں کا ایک جھنڈ دُور سے نظر آ رہا
میں اُسی طرف جا رہا تھا کہ شاید وہاں کوئی قدرتی چشمہ وغیرہ بہہ رہا ہو۔ درختوں کا
ڈ چھوٹا سا ٹاپو لگتا تھا۔ میں درختوں میں پانی کا چشمہ تلاش کر رہا تھا کہ کسی جانور کے
نے کی آواز کانوں میں پڑی۔ میں وہیں رُک گیا اور دو نالی بندوق خود بخود میرے
ں ہاتھوں میں اُوپر کو اُٹھ گئی۔ میں دبے پاؤں اُس طرف چلا جس طرف سے غرانے
آواز آئی تھی۔ میں جھاڑیوں کی آڑ لے کر چلا جا رہا تھا۔ ایک جھاڑی کی اوٹ سے
تو اچانک سامنے ایک ایسا منظر نظر پڑا جس کو دیکھ کر میرے پاؤں وہیں رُک گئے......
سے پندرہ گز کے فاصلے پر ایک جنگلی بھورا ریچھ اپنے دونوں پچھلے پاؤں پر کھڑا اپنے
ں اگلے پنجے اپنی چھاتی پر پیٹ رہا تھا۔ اُس کے سامنے پانچ قدموں کے فاصلے پر
دُبلی پتلی سانولی نوجوان لڑکی بُت بنی کھڑی تھی۔

ریچھ دیو قامت تھا۔ لڑکی کی آنکھیں خوف سے پھیلی ہوئی تھیں موت اُسے اپنے
منے نظر آ رہی تھی۔ دہشت کے مارے وہ جیسے پتھر بن گئی تھی۔ جنگل کا بھورا ریچھ اپنے
ر کو دیکھ لے تو پھر اُس کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ خود مر جاتا ہے یا اپنے شکار کو مار ڈالتا
۔ وہ خود کم ہی مرتا ہے۔ وہ انسان کو اپنے نوکیلے پنجوں سے بھنبھوڑ ڈالتا ہے اور اُس
جسم کے چیتھڑے اُڑا دیتا ہے۔ دو نالی بندوق میرے ہاتھوں میں تھی۔ بندوق کی
ں نالیوں میں کارتوس بھرے ہوئے تھے۔ یہ ہاتھی کو شکار کرنے والے کارتوس
۔ میں جھاڑی کی اوٹ میں اس طرح کھڑا تھا کہ ریچھ کا ایک پہلو میری طرف تھا۔
نے مجھے نہیں دیکھا تھا۔ اپنے آپ بندوق کا بٹ میرے کندھے کے ساتھ لگ گیا
میں ریچھ کو اپنے نشانے پر لینے لگا۔ ریچھ غیر محسوس انداز میں لڑکی کی طرف جا رہا
اُس نے حلق میں سے بڑی خوفناک آواز نکالی۔ ریچھ کی کنپٹی میرے نشانے کی زد
تھی۔ میں نے اُوپر تلے دونوں فائر کر دیئے۔ دو دھماکوں کے دھکے سے مجھے پیچھے کو
کا لگا۔ میں نے بندوق ہٹا کر دیکھا، ریچھ وہاں نہیں تھا۔ میں سمجھا کہ ریچھ بھاگنے میں
میاب ہو گیا ہے۔ میں دوڑ کر لڑکی کے پاس پہنچا تو دیکھا کہ زمین پر ریچھ کی لاش پڑی
ہاتھی کو مارنے والے کارتوسوں نے ریچھ کا آدھا سر اُڑا دیا تھا۔ لڑکی کھڑے

کھڑے خوف سے کانپ رہی تھی۔ میں نے لڑکی سے کہا۔

''ڈرو نہیں...... میں نے ریچھ کو مار دیا ہے۔''

لڑکی کو کچھ حوصلہ ہوا۔ وہ وہیں بیٹھ گئی۔ میں بھی اُس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔

''تم کہاں رہتی ہو؟ چلو میں تمہیں گھر چھوڑ آؤں۔''

لڑکی کے کندھے سے ایک تھیلا لٹک رہا تھا۔ اُس نے میلی سی ساڑھی پہنی ہوئی ابھی تک اُس کا خوف پوری طرح سے دُور نہیں ہوا تھا۔ وہ ریچھ کی لاش کو دہشت نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

میں نے اُس سے کہا۔ ''یہ مر چکا ہے۔ اب یہ تمہیں کچھ نہیں کہے گا۔ آؤ! میں تمہارے گھر چھوڑ آتا ہوں۔''

میں نے لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر اُسے اُٹھایا۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتی میرے سا پڑی۔ میں نے پوچھا۔ ''تمہارا گھر کہاں ہے؟''

لڑکی نے ایک طرف اشارہ کر کے کہا۔ ''اُدھر گاؤں میں ہے۔''

ہم درختوں کے گھنے جھنڈ سے باہر نکل آئے۔ سامنے اِدھر اُدھر دس بارہ جھو تھیں۔ پیچھے کھیت نظر آ رہے تھے۔ یہ جھونپڑیاں اصل میں مکان تھے جو پتھروں دیواری اُٹھا کر اُوپر گھاس پھونس کے چھپر ڈال کر بنائے گئے تھے۔ ایک دوسرے جھونپڑوں کے مقابلے میں ذرا بڑا تھا۔ اُس کے احاطے میں ایک گا بندھی ہوئی تھی۔ لڑکی نے کہا۔

''یہ ہمارا مکان ہے۔''

احاطے میں ایک ادھیڑ عمر دُبلا پتلا آدمی تخت پوش پر بیٹھا تھا۔ اُس کے ہاتھو کوئی پرانی پوتھی تھی جسے وہ پڑھ رہا تھا۔ گلے میں مالا تھی، ماتھے پر سیندور کی لکیر ہوئی تھیں۔ اُس نے لڑکی کو اور مجھے آتے دیکھا تو پوتھی تخت پر رکھ دی اور بولا۔

''رامی! کیا بات ہے...... یہ کون ہے؟'' یہ اُس لڑکی کا باپ تھا اور رامی اُس نام تھا۔ رامی باپ کے پاس جا کر تخت پر بیٹھ گئی۔

''کیا بات ہے بیٹی؟ تم کچھ گھبرائی ہوئی لگتی ہو۔''

میں نے اُس آدمی کو ساری کہانی سنا ڈالی جس پر رامی نے کہا۔ ''ہاں باپو! ا

نے میری جان بچائی ہے۔ اگر یہ بندوق کا فائر کر کے بھالو کو نہ مارتا تو بھالو نے مجھے مار ڈالنا تھا۔''

اُس ادھیڑ عمر آدمی نے میری طرف احسان مند نگاہوں سے دیکھا اور بولا۔

''تم نے میری بیٹی کی جان بچا کر مجھ پر بڑا اُپکار (احسان) کیا ہے بیٹے۔ تم کون ہو؟''

میں تخت پر رامی کے باپ کے پاس بیٹھ گیا۔ اُس نے بیٹی سے کہا۔

''بیٹی! اس کے لئے اندر سے دودھ لاؤ!''

رامی جھونپڑے کے اندر چلی گئی۔ اُس کا باپ پوچھنے لگا۔ ''تم کون ہو بیٹا...... کہاں سے آئے ہو؟ اس علاقے کے نہیں لگتے۔ کیا تم شکاری ہو؟''

میں نے کہا۔ ''میرا دوست شکاری ہے۔ میں اُس کے ساتھ شکار کھیلنے آ گیا تھا۔ ایک جگہ اچانک ہاتھی نے ہم پر حملہ کر دیا۔ ہم بھاگ اُٹھے اور ایک دوسرے سے بچھڑ گئے۔''

رامی دودھ لے کر آ گئی۔ میں نے دودھ پی کر اپنی پیاس بجھائی۔ میں نے رامی کے باپ سے پوچھا کہ مالا پور کا سٹیشن وہاں سے کتنی دُور ہو گا؟ وہ کہنے لگا۔

''مالا پور تو بہت دُور ہے۔''

میں نے کہا۔ ''لیکن مجھے وہاں ضرور پہنچنا ہے۔ یہاں سے اگر کوئی راستہ جاتا ہو تو مجھے بتا دیں۔ میں خود ہی چلا جاؤں گا۔''

رامی بھی پاس ہی بیٹھی ہوئی تھی۔ اُس کا باپ کہنے لگا۔ ''کل ایک آدمی کا بندوبست کر دُوں گا جو تمہیں اپنے ساتھ مالا پور تک لے جائے گا۔ آج تم ہمارے پاس ہی آرام کرو۔''

میں اُس پوتھی کو دیکھنے لگا جو رامی کے باپ نے سامنے رکھی ہوئی تھی اور جس پر وہ نیل سے کوئی نشان لگا رہا تھا۔ میں نے اُس سے پوچھا۔

''یہ کون سی کتاب ہے؟''

وہ کہنے لگا۔ ''میں جوتشی سنیاسی ہوں۔ اس پوتھی پر ستاروں کا حال لکھا ہوا ہے۔ میں اسے دیکھ کر لوگوں کے زائچے بناتا ہوں اور انہیں اُن کی قسمت کا حال بتاتا ہوں۔''

میرے دل میں اشتیاق سا پیدا ہوا۔ میں نے کہا۔ ''کیا آپ میرا زائچہ بنا سکتے

ہیں؟''

''کیوں نہیں......؟'' بوڑھے جوتشی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''کیا تمہیں معلوم
تمہارا جنم کون سے سن اور کون سے مہینے میں ہوا تھا؟''

مجھے اپنی تاریخ پیدائش اچھی طرح سے یاد تھی۔ میں نے اُسے بتا دی۔ اُس نے
وقت ایک الگ کاپی پر حساب لگا کر میرا زائچہ بنایا اور اُسے بڑے غور سے دیکھنے
کچھ دیر وہ بالکل خاموش رہا۔

میں نے پوچھا۔ ''میری قسمت میں کیا لکھا ہے؟''

بوڑھے جوتشی نے چہرہ اُٹھا کر مجھے دیکھا اور بولا۔ ''تمہارا زائچہ بتا رہا ہے کہ تم
بہت بڑی مصیبت کا شکار ہونے والے ہو۔''

میں اُس کا منہ تکنے لگا۔ ''کون سی مصیبت؟ کیا میرا کوئی ایکسیڈنٹ ہو جائے گا؟''

بوڑھا جوتشی بولا۔ ''بیٹا! میں دیکھ رہا ہوں کہ مصیبت تم پر آ چکی ہے۔ یہ مصیبت
عورت کے رُوپ میں آئے گی۔ یہ بتاؤ! کیا تمہیں پچھلے دنوں میں کوئی عورت ملی ہے

میں نے کہا۔ ''ہاں...... ایک عورت سے میری ملاقات ضرور ہوئی ہے۔ مگر
عورت سے تو مجھے اپنی زندگی کا سب سے قیمتی پیار ملا ہے۔ وہ میرے لئے مصیبت
ہو سکتی ہے؟''

بوڑھا جوتشی میرے زائچے کو بڑے غور سے پڑھ رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ زائچے
اُسے بہت کچھ بتا دیا ہے۔ اُس نے اپنی بیٹی رامی سے کہا۔

''بیٹی! تم جا کر مہمان کے لئے کھانا تیار کرو۔''

جب رامی اُٹھ کر چلی گئی تو بوڑھے جوتشی نے بڑی شفقت کے ساتھ کہا۔ ''بیٹا! م
ساری عمر جوتش کا گیان حاصل کرنے میں گزر گئی ہے۔ زائچہ میرے سامنے جھوٹ
بولتا۔ زائچہ مجھے سب کچھ بتا دیتا ہے۔ لیکن میں لوگوں کو زیادہ نہیں بتاتا۔ جتنی ا
ضرورت ہوتی ہے بتا دیتا ہوں۔ مگر تم سے میں کوئی چیز نہیں چھپاؤں گا۔ تم نے میری
کی جان بچائی ہے میں تمہارا ابھاری ہوں۔ تم نے کہا ہے کہ وہ عورت تم سے بہت
کرتی ہے۔ اچھا! یہ بتاؤ اُس عورت کا رنگ سانولا ہے نا؟ اُس کے بالوں کی ایک
اکثر اُس کے ماتھے پر آ جاتی ہے اور وہ تمہیں ایک ویران محل کے کھنڈر میں ملی تھی؟''

یہ بوڑھا جوتشی رانی کے بارے میں بالکل سچ بتا رہا تھا۔ اُس نے رانی کی ساری
نشانیاں صحیح بتائی تھیں۔ میں دل میں بڑا حیران ہوا۔ میں نے جواب دیا۔

''آپ نے جو جو نشانیاں بتائی ہیں وہ ساری درست ہیں۔''

بوڑھے جوتشی نے ایک لمحے کے لئے آنکھیں بند کر لیں، پھر آنکھیں کھول کر میری
رف نگاہیں اُٹھائیں تو مجھے ایسے لگا جیسے اُس بوڑھے دیہاتی جوتشی کی آنکھیں سب کچھ
یکھ رہی ہیں۔ کہنے لگا۔

''میرے بچے! تیرے حق میں یہ عورت وِش (زہر) ہے۔ اس سے خبردار رہنا۔ یہ
ورت ایک ناگن ہے جو کسی بھی وقت تمہیں ڈس سکتی ہے۔''

میں دل ہی دل میں ہنسنے لگا کہ پہلے نہ سہی لیکن آج اس بوڑھے جوتشی کا زائچہ ضرور
ھوٹ بول رہا ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ رانی میرے حق میں ناگن ہو جائے؟ اس شخص
وا اور اس کے زائچے کو معلوم ہی نہیں کہ رانی مجھ سے کس قدر پیار کرتی ہے اور ہندو
رم کی پابند ہونے کے باوجود مجھ سے شادی کر رہی ہے۔

میں نے کہا۔ ''بابا! رانی تو مجھ پر جان چھڑکتی ہے۔ وہ مجھ سے اتنا پیار کرتی ہے کہ تم
س کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔''

بوڑھے نے میرے زائچے پر ایک نظر ڈال کر کہا۔

''میرے بچے! میں جانتا ہوں تم میری باتوں پر اعتبار نہیں کرو گے۔ تمہارا زائچہ
اف صاف بتا رہا ہے کہ تم میری باتوں کو دل میں جھٹلا رہے ہو۔ اس کی ایک خاص وجہ
ی ہے۔''

''کیا وجہ ہے......؟'' میں نے مسکراتے ہوئے سوال کیا۔

بوڑھے نے کہا۔ ''وجہ یہ ہے کہ اُس نے پہلے ہی سے تمہیں گنیش جی کا پرشاد کھلا کر
ہیں اپنے قابو میں کر لیا ہوا ہے۔''

مجھے یاد آ گیا کہ رانی نے سیتلا مندر کے باہر جب وہ پوجا کر کے واپس آئی تھی تو
ے پرشاد کا ایک پیڑا کھلایا تھا جسے کھانے کے بعد مجھے تھوڑی دیر کے لئے اپنا آپ ہوا
ں اُڑتا ہوا محسوس ہوا تھا۔

OOO

اور یہ اُس کے کھلائے ہوئے پرشاد ہی کا اثر تھا کہ میں نے بوڑھے جوتشی کی
بات بلکہ اس خفیہ راز کے انکشاف کو بھی جھٹلا دیا۔ میں نے کہا۔
''میں اِن باتوں پر یقین نہیں رکھتا۔''
بوڑھا بولا۔ ''بیٹا! میری بیٹی کی جان بچانے کے بعد مجھ پر یہ فرض بن گیا ہے کہ
تمہاری جان کی حفاظت کروں۔ میں نے جو کچھ دیکھ لیا ہے اس میں تمہاری جان کو
ہے۔ میں تمہیں ایک دردناک انجام سے بچانا اپنا کرتوے (فرض) سمجھتا ہوں۔ لیکن
تم میری بات ماننے کو تیار نہیں ہو تو پھر میں یہی کر سکتا ہوں کہ بھگوان سے پرارتھنا
کہ وہ تمہاری رکھشا کرے۔ لیکن مجھے اجازت دو کہ تم نے میرے اور میری بیٹی
ساتھ جو بھلائی کی ہے اس کے بدلے میں تمہیں ایک چھوٹا سا انعام پیش کروں۔''
میں نے پوچھا۔ ''کون سا انعام؟ ویسے میں نے کسی انعام کے لالچ میں را
جان نہیں بچائی تھی۔''
بوڑھا بولا۔ ''یہ میں جانتا ہوں، مگر پھر بھی میں ایک چھوٹا سا انعام تمہاری بھینٹ
چاہتا ہوں۔''
میں نے ہنس کر کہا۔ ''ٹھیک ہے بابا! لاؤ، وہ کون سا انعام ہے؟''
بوڑھے نے رامی کو آواز دے کر کہا۔ ''رامی! دوسری جھونپڑی میں میری گدڑی
سے نیلی بوتل اُٹھا کر لانا۔''
رامی دوسری جھونپڑی میں گئی اور وہاں سے واپس آئی تو اُس کے ہاتھ میں ایک
بوتل تھی۔ اُس نے بوتل بابا کو دے دی۔ بوڑھے جوتشی نے کہا۔
''اب تم اپنی قمیض اُتار کر آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاؤ!''
مجھے کچھ عجیب سا لگا۔ میں نے کہا۔ ''اس بوتل میں کیا ہے؟''

بوڑھا بولا۔ ''یہ میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔ لیکن اتنا ضرور بتا دینا چاہوں گا کہ اس
بوتل میں میری ساری زندگی کی تپسیا کا عرق ہے۔''
میں نے قمیض اُتار دی اور تخت پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ بوڑھے جوتشی نے بوتل
میں سے تیل نکالا اور اپنی ہتھیلی پر ڈال کر میرے جسم پر لگا کر اس کی مالش کرنے لگا۔ تیل
کی نہ خوشبو تھی نہ کوئی بو تھی۔ اتنا ضرور ہوا کہ مجھے جسم ٹھنڈا ٹھنڈا سا لگنے لگا۔ بوڑھا
تھوڑی تھوڑی دیر بعد بوتل میں سے تیل نکال کر میرے جسم پر لگاتا اور آہستہ آہستہ مالش
کرنے لگ جاتا۔ اُس نے میری کمر، میرے سینے، بازوؤں اور کندھوں پر خوب اچھی
طرح سے تیل کی مالش کر دی۔ کچھ ہی دیر بعد میرے جسم نے سارے تیل کو جذب کر
لیا۔ بوڑھے نے کہا۔
''اب کرتہ پہن لو!''
میں نے قمیض پہن لی اور پوچھا۔ ''اب یہ بتائیں! کہ یہ کس قسم کا تیل تھا اور اس میں
کون سی ایسی خاص شے ہے کہ آپ نے اپنی ساری زندگی اس کے لئے تپسیا کی؟''
بوڑھے نے کہا۔ ''بیٹا! اِس تیل کا تمہیں ایک ہی فائدہ ہو گا۔ اور وہ یہ ہے کہ تم پر
خطرناک سے خطرناک زہر کا کوئی اثر نہیں ہو گا۔ چاہے کوئی تمہیں دھوکے سے کسی شے
میں زہر ملا کر پلا دے یا تمہیں زہریلے سے زہریلا سانپ ڈس لے۔ تم پر اِس کا کوئی اثر
نہیں ہو گا۔ میں تمہارے لئے یہی کچھ کر سکتا تھا۔''
میں نے اُس کا یہ ٹوٹکا بھی ہنسی میں ٹال دیا۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آدمی کو زہریلا
سانپ کاٹ لے اور اس پر زہر کا اثر نہ ہو۔ یہ بات عقل کے بالکل خلاف تھی۔ ڈاکٹر
بھی جو سانپ کے زہر سے بچنے کے لئے انجکشن لگاتے ہیں، اُس کا اثر بھی دو تین دن
کے بعد ختم ہو جاتا ہے۔ میں نے کہا۔ ''بابا! میں تمہارا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ لیکن میری تم
سے ایک ہی گزارش ہے کہ کسی طرح مجھے مالاپور کے ریلوے سٹیشن تک پہنچا دو! یہ مجھ پر
تمہارا بہت بڑا احسان ہو گا۔''
بوڑھے جوتشی نے میرا زائچہ تہہ کر کے پوتھ میں رکھا اور پوتھی کو تھیلی میں بند کرتے
ہوئے بولا۔ ''بیٹا! اس کی تم چنتا نہ کرو! صبح ہوتے ہی میں ایک آدمی تمہارے ساتھ روانہ
کر دوں گا۔ وہ تمہیں مالاپور ریلوے سٹیشن پہنچا دے گا۔''

رات میں نے جھونپڑے میں ہی بسر کی۔ دن نکلا تو رامی میرے لئے کڑوی چا
بنا کر لے آئی۔ چائے کے ساتھ اُس نے ایک روٹی بھی پکا کر تھالی میں رکھی ہوئی
میں چائے کے ساتھ روٹی کھانے لگا۔ اُس نے بتایا کہ بابا آدمی کو لینے گیا ہوا ہے۔
مجھ سے کہنے لگی۔

''میرا باپو جنم کنڈلی دیکھ کر جو کچھ بتاتا ہے وہ جھوٹ نہیں ہوتا۔ تم بھی اسے جھو
مت سمجھنا۔ اور باپو نے جو کچھ کہا ہے اس کا پالن کرنا۔''

میں نے اُس لڑکی کو یہ بتانے کی ضرورت محسوس نہ کی کہ اُس کے باپ نے
زائچہ دیکھ کر کیا کچھ بتایا تھا۔ میں نے کہا۔

''یہ بتاؤ! کہ تمہارے بابا نے جس تیل کی میرے جسم پر مالش کی ہے کیا سچ مچ
کے بعد سانپ کے زہر کا اثر نہیں ہوتا؟''

وہ بولی۔ ''ہاں...... یہ سچ ہے۔ بھگوان نہ کرے کہ تمہیں کوئی زہر دیدے یا تم
کوئی سانپ کاٹ جائے۔ لیکن اگر ایسا ہوا تو بابا کے تیل کے اثر سے تم پر بالکل اثر نہ
ہوگا۔''

میں نے کہا۔ ''اچھا! یہ بتاؤ کہ اس تیل کا اثر کتنے دن تک رہے گا؟''

رامی نے بتایا کہ تیل میرے جسم کے اندر جذب ہوگیا ہے اور اس کا اثر اب کم از
دس پندرہ برس تک ضرور رہے گا۔ یہ میرے لئے ایک فائدہ مند بات تھی۔ جنگل میں ا
کوئی سانپ، بچھو مجھے کاٹ لے گا تو میری زندگی تو بچ جائے گی۔ کچھ دیر گزری تو را
کا باپ ایک آدمی کو لے کر آگیا۔ کہنے لگا۔

''یہ برجو ہے۔ یہ تمہیں اپنے ساتھ مالا پور کے ریلوے سٹیشن تک لے جائے گا۔''

برجو درمیانی عمر کا دُبلا پتلا جنگلی ٹائپ کا آدمی تھا۔ میں نے رامی کے باپ سے کہا

''کیا ہم اتنا لمبا سفر پیدل طے کریں گے؟''

''نہیں......'' رامی کا باپ بولا۔ ''یہاں سے دو کوس دُور برجو کا جھونپڑا ہے۔ وہا
اس کی بیل گاڑی ہے۔ تم لوگ بیل گاڑی میں سفر کرو گے۔''

میں نے رامی کے باپ کا شکریہ ادا کیا اور برجو کے ساتھ چل پڑا۔ وہ میرے آ
آگے چل رہا تھا۔ ہم دو کوس کا سفر طے کرنے کے بعد برجو کے جھونپڑے پر پہنچ گئے

یہاں اُس کی ایک بیل گاڑی کھڑی تھی۔ بیل گاڑی کے آگے ایک بیل جتا ہوا تھا۔ میں
برجو کے ساتھ بیل گاڑی میں بیٹھ گیا اور بیل گاڑی جنگل میں ایک طرف چل پڑی۔ یہ
کافی لمبا سفر تھا۔ ایک تو راستہ لمبا تھا دوسرے بیل گاڑی سست رفتاری سے چل رہی تھی۔
ہمیں راستے میں ہی شام ہوگئی۔ رات ہم نے ایک محفوظ جگہ پر آگ کا الاؤ روشن کر کے
گزاری۔ اگلے دن منہ اندھیرے پھر سفر پر روانہ ہوگئے۔ دوپہر کے قریب کہیں مالا پور
کا سٹیشن نظر آیا۔

یہاں میں نے برجو کو واپس بھیج دیا اور خود سٹیشن پر آکر بمبئی کا ٹکٹ خریدا اور بمبئی
جانے والی گاڑی کا انتظار کرنے لگا۔ مجھے معلوم تھا کہ گنیش جی کے مندر میں ساوتری
نہیں ہوگی۔ وہ میرے اچانک بارش کے طوفان میں گم ہو جانے کے بعد رانی کے پاس
بمبئی چلی گئی ہوگی۔ میرا اندازہ درست نکلا۔ جب میں بمبئی پہنچا تو ساوتری پہلے سے
رانی کے پاس موجود تھی۔ دونوں کے چہرے مجھے دیکھتے ہی خوشی سے کھل اُٹھے۔

''تم کہاں چلے گئے تھے شیراز......؟ تم نے تو میری جان ہی نکال دی تھی۔'' رانی
نے یہ کہتے ہوئے مجھے گلے لگا لیا۔ میں نے اُسے اپنی ساری داستان سنا دی۔ مگر برہمن
جوتشی نے میری جنم کنڈلی دیکھ کر رانی کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا اُس کا رانی کے آگے
ذکر کرنا میں نے مناسب نہ سمجھا۔ کیونکہ اس سے رانی کی دل آزاری کا پہلو نکلتا تھا۔ اور
پھر برہمن جوتشی نے رانی کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا اس پر مجھے یقین بھی نہیں تھا۔

ساوتری کہنے لگی۔ ''اب تم لوگوں کو جتنی جلدی ہو سکے شادی کر لینی چاہئے۔''

رانی نے کہا۔ ''ہم کل صبح شادی کر لیں گے۔''

پھر اُس نے ساوتری سے کہا کہ وہ برہمن پجاری کو فون کر کے کل بلا لے۔ ساوتری
نے اُسی وقت کسی جگہ فون کر دیا اور بتایا کہ پجاری جی کل دن کے دس بجے آرہے ہیں۔
میں بہت خوش تھا۔ رات کو دیر تک جاگتا رہا۔ دوسرے روز سوا دس بجے برہمن پجاری
جی آگئے۔ میرا خیال تھا کہ وہ کوئی لمبی داڑھی اور لمبے لمبے بالوں والا سادھو ہوگا۔ مگر وہ
عام شکل وصورت کا آدمی تھا جس نے ہندوؤں والا کرتہ پاجامہ پہن رکھا تھا۔ صرف سر کو
زعفرانی رنگ کے چوڑے کپڑے سے ڈھانپا ہوا تھا۔ اُس کپڑے پر سنسکرت رسم الخط
میں خدا جانے کیا کیا لکھا ہوا تھا۔ اُس نے مجھے اور رانی کو ایک جگہ طشت میں آگ جلا کر

اُس کے سامنے بٹھا دیا۔ رانی نے بھی کوئی خاص دُلہنوں والا جوڑا نہیں پہنا تھا۔ ریلا
ساڑھی میں تھی۔ میرے کندھوں پر زرد رنگ کی چادر ضرور ڈال دی گئی تھی۔ ساوتر
پجاری کے پاس ذرا پیچھے ہو کر بیٹھ گئی۔ ایک طرف تھالی میں مٹھائی رکھی ہوئی تھ
پجاری نے شادی کے اشلوک بولنے شروع کر دیئے۔ اشلوک بولتے ہوئے وہ آگ
ایک سفوف پھینکتا جاتا تھا۔ اشلوک ختم ہوئے تو پجاری بولا۔

''اب گٹھ بندھن ہوگا۔''

یہ سن کر ساوتری اُٹھی اور اُس نے رانی کی ساڑھی کا پلو میرے کندھے پر پڑی چا
کے کونے سے باندھ دیا۔ پجاری دوبارہ اشلوک بولنے لگا۔ پھر اُس نے کہا۔

''اب پھیرے ہوں گے۔''

میں نے اور رانی نے آگ کے گرد سات پھیرے پورے کئے تو پجاری نے ہا
بلند کرتے ہوئے ہمیں شادی کی خوشخبری سنائی۔

''بدھائی ہو...... تم دونوں اب ایک دوسرے کے پتی پتنی ہو۔''

ساوتری نے اُٹھ کر رانی کا منہ چوم لیا، پھر میرے گال پر بوسہ دیا اور ہمیں شادی
مبارکباد دی۔ میں نے اور رانی نے ایک دوسرے کو مٹھائی کھلائی۔ ہماری شادی ہو گئ
شادی کی پہلی رات ہم نے ساوتری کے بنگلے پر ہی بسر کی، دوسرے روز رانی کہنے لگی۔

''اب تم میرے دھرم پتی ہو۔ تم مسلمان ہو، میں ہندو ہوں۔ ہم دونوں اپنے ا
دھرم کو مانتے ہیں۔ ہمارے دھرم کے مطابق اگر کوئی ہندو عورت کسی مسلمان سے بیا
رچاتی ہے تو اُسے شو پوری کے مندر کی یاترا کر کے ایک خاص رسم ضرور پوری کرنی پڑ
ہے۔ اگر یہ رسم پوری نہ کی جائے تو پتی پتنی پر دیوتاؤں کی طرف سے کوئی بھاری مصیب
نازل ہو سکتی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''ہم یہ رسم ضرور پوری کریں گے۔ بتاؤ! مجھے کیا کرنا ہوگا اور یہ
پوری کہاں ہے؟''

رانی نے کہا۔ ''میں تمہیں اپنے ساتھ وہاں لے جاؤں گی اور وہاں جا کر سمجھا دُوں
گی کہ تمہیں کیا کرنا ہوگا۔ فکر نہ کرو! اِس رسم میں تمہیں کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں
گی۔''

میں نے رانی سے کہا۔ ''رانی! میں تمہارے لئے ہر قسم کی آزمائش میں سے گزرنے
تیار ہوں۔''

رانی نے ساوتری کی طرف مسکرا کر دیکھا اور کہا۔ ''دیکھو ساوتری! میرا پتی دیو مجھ
ے کتنا پریم کرتا ہے۔''

ساوتری بولی۔ ''تم دونوں خوش قسمت ہو۔ کاش ایسا پتی مجھے بھی مل جاتا۔''

رانی نے ہنس کر کہا۔ ''تم چاہو تو میرے پتی سے شادی کر سکتی ہو۔''

ساوتری نے کانوں کو ہاتھ لگایا اور بولی۔ ''میں ایسا کبھی سوچ بھی نہیں سکتی۔''

مزید تین چار دن بمبئی والے مکان پر گزارنے کے بعد میں اور رانی شو پوری کی
ف روانہ ہو گئے۔ اُس نے مجھے ہندوؤں والا لباس پہنا دیا تھا۔ یعنی بغیر کالر کے سفید
در کا کرتہ، تنگ موری والا پاجامہ جو چوڑی دار پاجامے کے مقابلے میں تھوڑا کھلا کھلا
۔ اُس نے میرے ماتھے پر تلک بھی لگا دیا تھا۔ میں نے اس پر اعتراض کیا اور کہا کہ
مسلمان ہوں، تلک نہیں لگاؤں گا۔

اُس نے بڑے پیار سے مجھے اپنے ساتھ لگا کر کہا۔ ''تم مجھ سے محبت کرتے ہو تو
ری محبت کی خاطر ایسا کر لو گے تو کیا ہوگا؟ تلک لگانے سے تم ہندو تھوڑے ہو جاؤ
ے؟ اور پھر ہم شادی کے بعد ایک ضروری رسم پوری کرنے شو پوری جا رہے ہیں۔ رسم
ی کرنے کے بعد بمبئی واپس آ کر تم بے شک کوٹ پتلون پہن لینا!''

رانی نے یہ سب کچھ اتنے پیار اور محبت بھرے لہجے میں کہا کہ میں نے تلک لگا لیا۔
ں نے بھی سوچا کہ یہ تو ایک ڈرامہ ہے۔ ڈرامہ، ڈرامہ ہی ہوتا ہے۔ اور پھر ایک ہندو
رت سے شادی کی ہے تو اس قسم کی رسمی باتیں تو پوری کرنی ہی ہوں گی۔ اس کے بعد
ں ایک مسلمان اور وہ ایک ہندو عورت کی حیثیت سے میاں بیوی کی طرح زندگی
ریں گے۔ میں نے دل ہی دل میں یہ بھی سوچ رکھا تھا کہ رانی کو آہستہ آہستہ دین
لام کے دائرے میں لے آؤں گا اور اسے مسلمان کر لوں گا۔

بڑا لمبا سفر تھا۔ تین دن ہم ریل گاڑی میں سفر کرتے رہے۔ پہلے مدھیہ پردیش سے
زرے، پھر دکن یعنی آندھرا پردیش کے علاقے میں سفر کرتے ہوئے ہندوستان کے
وبی حصے تامل ناڈو میں آ گئے۔ یہاں سے بھی آگے اُس جگہ گئے جہاں ہندوستان کے

دونوں جنوبی ساحل ایک دوسرے سے آ کر مل جاتے ہیں اور ایک تکون بن جاتی ہے
ہندوستان یعنی بھارت کے جنوبی علاقے میں دراوڑی زبانیں بولی جاتی ہیں
لوگ بھی دراوڑی نسل کے ہیں۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ جب آریا قوم کے لشکر
ایشیا سے نکل کر ہندوستان پر حملہ آور ہوئے تو اُس وقت ہندوستان میں دراوڑوں کا
تھا اور ہڑپہ اور موہنجوداڑو اُن کے بڑے اہم شہر تھے۔ آریاؤں نے اُنہیں شکست دی
لوگ ہندوستان کے جنوب کی طرف فرار ہو گئے۔ تب سے لے کر آج تک یہ در
لوگ بھارت کے جنوب میں ہی آباد ہیں۔ ان کی زبانیں ہندوستان کی دوسری ز
سے جو آریا قوم کی زبان سے نکلی ہیں بالکل نہیں ملتیں۔

جنوب کے لوگوں کے رنگ عام طور پر گہرے سانولے اور کہیں کہیں بالکل
ہوتے ہیں۔ اُن کی عورتیں بھی اسی رنگ کی گہری سانولی ہوتی ہیں۔ اب د
صوبوں کے لوگوں سے شادی بیاہ کرنے کی وجہ سے مدراس وغیرہ کے شہروں کی
عورتوں کے رنگ صاف اور کھلے نظر آ جاتے ہیں۔

بہرحال رانی اُن سارے علاقوں کو جانتی تھی۔ صبح ہو رہی تھی جب ہم کلوٹر نا
ایک چھوٹے سے ریلوے سٹیشن پر ٹرین سے اُتر پڑے۔ یہاں سے ہم ایک بیل
میں بیٹھ گئے۔ بیل گاڑی سارا دن جنگلی علاقے میں آہستہ آہستہ سفر کرتی رہی۔
غروب ہو رہا تھا کہ ہم شوپوری کے گاؤں میں پہنچ گئے۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔
اور بیل گاڑی کے سفر نے مجھے تھکا دیا تھا مگر رانی بڑی تازہ دم تھی۔ شوپوری پہنچ
ایسے خوش تھی جیسے اپنے میکے آ گئی ہو۔ یہاں دھان کی چھوٹی چھوٹی کھیتیاں تھیں
کے درخت تھے، کہیں کہیں ناریلوں کے جھنڈ بھی تھے۔ ایک طرف ٹیلے کی ڈھلان
اُس کے دامن میں بانس کے بنے ہوئے کچھ جھونپڑا نما مکان بھی نظر آ رہے تھے
میرا ہاتھ تھامے مجھے اپنے ساتھ لے کر چل رہی تھی۔

ہم ناریل کے درختوں کے ایک جھنڈ کے پیچھے گئے تو سامنے ایک چھوٹے
ایک بہت بڑے پرانے مندر کی عمارت نظر آئی۔ رانی کہنے لگی۔
'' یہ ماتا جی کا مندر ہے۔ یہاں ہمیں ایک چھوٹی سی رسم ادا کرنی ہوگی، اس
ہم یہیں سے واپس بمبئی چلے جائیں گے۔''

ماتا جی کا مندر ایک ویران کھنڈر سا لگتا تھا۔ وہاں کوئی آدمی بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔
در پر ایک طرح کی نحوست سی چھائی ہوئی تھی۔ مندر کا تنگ دروازہ پتھروں کو جوڑ کر
ایا گیا تھا جس کے پٹ غائب تھے۔ ڈیوڑھی میں اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ مجھے ایک
سا خوف محسوس ہوا، دل نے کہا اس مندر میں داخل نہ ہونا! جان پیاری ہے تو
ں سے واپس بھاگ جاؤ! مگر یہ خیال دل میں آیا اور نکل گیا۔ رانی میرے بالکل
ھ لگی ہوئی تھی، مجھے اُس کے جسم کی گرمائش محسوس ہو رہی تھی۔
میں اُس کے ساتھ مندر کی ڈیوڑھی میں داخل ہو گیا۔

ایک ناگوار سی بو کا احساس ہوا جیسے چمگادڑوں کے کسی غار میں آ گیا تھا۔ ابھی تک
ا مہنت، کسی پروہت، کسی پجاری کی صورت نظر نہیں آئی تھی۔ میں نے رانی سے
ا۔ '' کیا یہاں کوئی نہیں رہتا؟''

اُس نے کہا۔ '' ماتا کو پوجا پاٹ کا شور پسند نہیں۔ یہاں شردھالو صرف خاص خاص
دن پر کوئی رسم ادا کرنے یا تپسیا کرنے آتے ہیں۔ وہ الگ الگ کوٹھڑیوں میں رسم
رتے ہیں اور خاموشی سے واپس چلے جاتے ہیں۔''

میں مطمئن ہو گیا۔ لیکن ایک خوف کا احساس برابر میرے ساتھ ساتھ تھا۔ ڈیوڑھی
آگے ایک تنگ سی راہ داری تھی۔ راہ داری میں سے گزرنے کے بعد رانی مجھے ایک
شادہ دالان میں لے آئی جہاں ستونوں کے ساتھ کہیں کہیں مشعلیں روشن تھیں۔
منے تین چار کوٹھڑیاں تھیں جن کے دروازے بند تھے۔ رانی نے ایک کوٹھڑی کا دروازہ
ولا تو میں نے دیکھا کہ کوٹھڑی کے اندر ایک پلنگ پر بستر لگا ہوا ہے اور سرہانے کے
ا گیندے کے پھولوں کے ہار پڑے ہیں۔ دیوار پر مشعل روشن ہے۔

رانی نے کہا۔ '' یہ تمہارا کمرہ ہے۔ جتنے دن مجھے رسم ادا کرنی ہے تم اسی کمرے میں
گے۔ یہاں تمہیں کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ ماتا کی ایک داسی تمہارے آرام
یال رکھے گی۔ تین دن تک میں تمہیں دن میں صرف ایک بار ہی مل سکوں گی۔ میں
ے جدا نہیں ہونا چاہتی لیکن مجبور ہوں۔ ہماری زندگی بھر کی بلکہ جنم جنم کی خوشیوں اور
ساتھ رہنے کے لئے یہ چھوٹی سی قربانی ہمیں دینی ہی پڑے گی۔ تم سفر کی وجہ سے
گئے ہو گے، اب تم آرام کرو! مجھے رسم کی تیاریاں بھی کرنی ہیں۔''

میں نے پوچھا۔ ''تمہاری اس رسم میں مجھے کیا کرنا ہوگا؟''

رانی نے مسکرا کر کہا۔ '' کچھ نہیں...... صرف رات کے وقت تمہیں ماتا جی کے
پجاری آ کر لے جائیں گے۔ وہ تمہیں بتا دیں گے کہ تمہیں کیا کرنا ہے؟''

رانی نے بڑی محبت کے ساتھ میرا منہ چوما اور چلی گئی۔ اُس کے جانے کے بعد
نے کوٹھڑی کا جائزہ لیا۔ مجھے محسوس ہوا جیسے میں چار سو سال پرانے کسی ویران محل کے
خانے میں آ گیا ہوں۔ کوٹھڑی کے کونے میں ایک چھوٹا سا دروازہ تھا۔ میں نے ا
کھولا تو معلوم ہوا کہ وہ غسل خانہ ہے۔ نلکا لگا ہوا تھا، نیچے پلاسٹک کا ایک ٹب پانی
لبالب بھرا ہوا تھا۔ دیوار کے ساتھ گیروے رنگ کا کھدر کا تولیہ لٹک رہا تھا۔ ٹب
آگے لکڑی کی چوکی رکھی تھی۔ چوکی کے پاس پتھر پر صابن دانی پڑی تھی۔ میں درواز
کر کے پلنگ پر آ کر بیٹھ گیا۔ پلنگ پر بھی گیروے رنگ کی چادر بچھی ہوئی تھی ج
سنسکرت میں کچھ حروف لکھے ہوئے تھے۔ میں نے گیندے کے ایک ہار کو اُٹھا کر
پھول تر و تازہ تھے۔

اتنے میں کوٹھڑی کا دروازہ کھلا اور ایک لڑکی اندر داخل ہوئی۔ اُس کے ہاتھ
پیتل کی بڑی تھالی تھی جس میں پانی کا جگ اور کچھ کھانے پینے کی چیزیں رکھی
تھیں۔ لڑکی نے پیتل کی تھالی میرے آگے پلنگ پر رکھ دی۔ اُس لڑکی کی عمر اُنیس
برس کی ہوگی۔ رنگ جنوب کی عورتوں کی طرح گہرا سانولا تھا۔ بال سیاہ اور چمکیلے
سیاہ آنکھوں میں کالے موتیوں کی چمک اور ایک قسم کی اُداسی تھی۔ کھانے کی تھالی
وہ خاموشی سے واپس جانے کے لئے مُڑی تو میں نے کہا۔

''ذرا سنو......!''

لڑکی وہیں رُک گئی۔ ''کیا بات ہے؟''

''کیا نام ہے تمہارا؟'' میں نے پوچھا۔

''کانچی۔'' اُس نے پلٹ کر میری طرف دیکھے بغیر کہا۔

مجھے اُس کا نام بڑا میوزیکل لگا۔ کانچی...... کانچی۔ میں نے دو بار نام دہرایا

''بڑا خوبصورت نام ہے تمہارا کانچی!''

اُس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ اپنے نام کی تعریف

خوش ہوگی اور مسکرائے گی۔ مگر اُس کے چہرے پر گہرا سکوت تھا اور وہ مجھے ایسی نگاہوں
سے دیکھ رہی تھی جیسے مجھے کسی آنے والے بھیانک خطرے سے آگاہ کر رہی ہو۔ ایک دو
لمحے میرے چہرے کو دیکھتے رہنے کے بعد اُس نے منہ پھیرا اور خاموشی سے قدم اُٹھاتی
کوٹھڑی سے نکل گئی۔ مجھے کسی بھیانک خطرے کا خیال بھی نہیں آ سکتا تھا۔ مجھ سے بے
پناہ پیار کرنے والی میری بیوی، میری پتنی رانی میرے ساتھ تھی۔ ہم وہاں ایک ضروری
رسم ادا کرنے آئے تھے اور اس کے بعد ہمیں بمبئی واپس جا کر کسی پہاڑی مقام پر ہنی
مون منانے جانا تھا۔

میں نے پلنگ پر رکھی تھالی کو دیکھا۔ اُس میں دو پلیٹیں پڑی ہوئی تھیں۔ ایک پلیٹ
میں چاول تھے، دوسری میں کوئی سبزی اور اچار تھا۔ سب کچھ مزے دار بنا ہوا تھا۔ میں
نے سیر ہو کر کھایا، پانی پیا اور گیندے کے پھولوں کا ہار اپنے سینے پر رکھ کر پلنگ پر لیٹ
گیا۔ کسی کسی وقت میں ہار کے پھولوں کو سونگھ لیتا تھا۔ مجھے ان پھولوں میں رانی کی محبت
کی خوشبو آتی محسوس ہوتی تھی۔ سفر کی تھکان تھی، سیر ہو کر کھانا کھایا تھا، مجھے نیند آ گئی۔ سو
کر اُٹھا تو محسوس ہو رہا تھا کہ کافی دیر تک سوتا رہا ہوں۔ گھڑی میرے پاس نہیں تھی۔
وقت کا پتہ نہیں تھا کہ کیا بجا ہوگا؟ کوٹھڑی میں مشعل روشن تھی۔ اُٹھ کر دروازے کے
پاس آ گیا کہ اگر باہر کوئی ہو تو اُس سے وقت معلوم کروں۔ مگر کوٹھڑی کا دروازہ باہر سے
بند تھا۔ میں نے سوچا کہ شاید یہ بھی رانی کی خاص رسم کا حصہ ہو کہ میں باہر نکل کر کسی
سے نہ ملوں۔

میں واپس پلنگ پر آ کر لیٹ گیا۔

میرے لئے بند کوٹھڑی میں وقت گزارنا مشکل ہو رہا تھا۔ اُٹھ کر ٹہلنے لگا۔ پھر باتھ
رُوم میں جا کر منہ ہاتھ دھویا۔ باتھ رُوم کی دیوار میں ذرا بلندی پر ایک روشندان تھا
جس پر سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ اُس روشندان میں سے تازہ ہوا اندر آ رہی تھی مگر دن کی
روشنی وہاں پر نہیں تھی۔ میں سمجھ گیا کہ باہر رات ہوگئی ہے۔ میں نے تھوڑا سا پانی پیا،
کھدر کے تولیے سے ہونٹوں کو خشک کر رہا تھا کہ اچانک مجھے ایسی آواز سنائی دی جیسے کوئی
مریض درد سے ہولے ہولے کراہ رہا ہو۔ میرے کان کھڑے ہو گئے۔ پہلے میں اسے
اپنا وہم سمجھا اور تولیہ کیل سے لٹکا کر دروازے کی طرف بڑھا تو وہی کراہنے کی آواز پھر

آئی۔ میں نے وہیں رُک کر کان لگا دیئے۔ آواز تھوڑے وقفے کے بعد
تھی۔ یہ کراہنے کی ایسی آواز تھی جیسے آدمی درد کے آگے بے بس ہو گیا ہو اور اب م
کا انتظار کر رہا ہو۔ میں نے اُوپر روشندان کی طرف دیکھا، آواز روشندان میں سے
محسوس ہوتی تھی۔ روشندان فرش سے کوئی سات آٹھ فٹ اُونچا تھا۔ میں دیکھنا چاہ
کہ یہ کون درد سے بے بس ہو کر کراہ رہا تھا؟ میں نے نہانے والی چوکی تلکے کے قر
کی اور ایک پاؤں اُس پر رکھا، دوسرا پاؤں تلکے پر رکھا، دیوار میں ذرا سے باہر
ہوئے پتھر کو پکڑا اور اُچھل کر روشندان کے جنگلے پر اپنی گرفت مضبوط کر کے د
پاؤں تلکے کی ٹونٹی پر جمائے اور روشندان کی سلاخوں میں سے جھانک کر دوسری ط
دیکھا۔

کراہنے کی آواز اب ڈوبنے لگی تھی۔ مگر دوسری طرف اتنا گھپ اندھیرا تھا
آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کے باوجود مجھے کچھ نظر نہ آ سکا۔ میں نے دھیمی آواز میں ک

''کون ہے......؟''

میں نے دو تین بار یہ جملہ دہرایا۔ تیسری بار میرے ''کون ہے؟'' کہنے پر کراہ
آواز بند ہو گئی۔ میں نے روشندان کی سلاخوں کے ساتھ کان لگائے ہوئے تھے۔
پندرہ سیکنڈ کی خاموشی کے بعد کراہنے کی ایسی آواز آئی جیسے کسی نے کراہنے والے
منہ پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔ آواز کسی بند صندوق کے اندر سے نکلتی محسوس ہوتی تھی۔ میں
ایک بار پھر کہا۔

''کون ہو بھائی......؟''

اس کے بعد تو بالکل موت کی خاموشی چھا گئی۔ میں چار پانچ منٹ تک روشندان
سلاخوں کے ساتھ لگ کر دیوار سے چمٹا رہا مگر کراہنے کی آواز پھر سنائی نہ دی۔ میں
تر آیا۔ پلنگ پر بیٹھا دیر تک سوچتا رہا کہ یہ آواز کس کی ہو سکتی تھی؟ دوسری طرف
کوئی کوٹھڑی تھی جہاں کوئی تکلیف کی حالت میں تھا۔ میں کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔

اتنے میں مجھے وہ اشلوک پڑھنے کی آواز سنائی دی جو پجاری مندر میں پوجا کے وقت
ھا کرتے ہیں۔ آواز کوٹھڑی کے باہر سے آ رہی تھی۔ پھر کوٹھڑی کا دروازہ کھلا اور ا
دمی جس کے ہاتھ میں جلتی ہوئی مشعل تھی اندر داخل ہو کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ ا

پیچھے چار پروہت ٹائپ کے آدمی تھے جنہوں نے گیروے رنگ کے لمبے چولے پہنے
ئے تھے۔ اُن کے ہاتھوں میں مٹی کے پیالے تھے جن میں پانی بھرا ہوا تھا۔ وہ اُونچی
واز میں اشلوک گا رہے تھے۔ میرے پلنگ کے پاس آ کر رُک گئے۔ اُن میں سے تین
اشلوک پڑھتے رہے، ایک نے میرے سر پر ہاتھ رکھا اور بڑی شفقت سے کہا۔

''بالکے! تمہیں ماتا جی بلا رہی ہیں۔ ہمارے ساتھ چلو۔''

میں نے تعجب سے پوچھا۔ ''کہاں......؟''

پجاری بولا۔ ''ندی پر بالک! ماتا جی ندی پر ہیں۔''

میں سمجھ گیا کہ رانی کی خصوصی رسومات کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ میں اُن کے ساتھ
ل پڑا۔ اُنہوں نے مجھے اپنے درمیان لے لیا تھا۔ مشعل والا آدمی آگے آگے تھا۔ اسی
ح اشلوک یا بھجن گاتے یہ لوگ مجھے کوٹھڑی اور راہداری سے گزار کر مندر کے باہر
ئے تو میں نے دیکھا کہ سورج غروب ہو رہا تھا۔ ایک جانب رانی کیسری رنگ کی
ڑھی میں ملبوس چار پجاریوں کے درمیان کھڑی تھی۔ وہ خوب بنی سنوری تھی۔ ایک
عل بردار آدمی اُس کے آگے دو قدم کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ رانی کے پہلو میں وہی
برے سانولے رنگ کی لڑکی کھڑی تھی جو میرے لئے کوٹھڑی میں رات کو کھانا لائی تھی
جس نے مجھے اپنا نام کانچی بتایا تھا۔ کانچی نے ہاتھوں میں پیتل کی تھالی تھام رکھی تھی
ں میں گیندے کے دو تین پھول پڑے تھے اور لوبان سلگ رہا تھا۔

رانی میری طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ اُسے دیکھ کر میرے اندر ایک نیا حوصلہ پیدا
گیا۔ ہم دونوں مشعل برداروں اور دوسرے پجاریوں کے جلو میں ندی کی طرف چلے۔
نے رانی سے بات کرنی چاہی تو اُس نے مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ ندی زیادہ
نہیں تھی۔ ندی کے کنارے ایک چھوٹا اُونچا چبوترہ بنا ہوا تھا۔ مجھے لا کر اُس چبوترے
ٹھا دیا گیا۔ رانی بھی میرے پاس بیٹھ گئی۔ کانچی پیتل کی تھالی لے کر ہمارے پیچھے
ڑی ہو گئی۔ ایک پجاری نے ہمارے سامنے کھڑے ہو کر اشلوک پڑھنے شروع کر
یئے۔ ساتھ ساتھ وہ لوبان میں سے اُٹھتے دُھوئیں کو اپنے ہاتھوں کی مٹھیوں میں لے کر
رے چہروں پر پھینکتا جاتا تھا۔

یہ سلسلہ دس منٹ تک چلتا رہا، اس کے بعد ایک مہنت کانسی کے پیالے میں پانی

لے کر ہمارے سامنے آ گیا۔ وہ بھی بھجن گا گا کر پیالے میں سے پانی کے چھینٹے ہ
چہروں پر پھینکتا جاتا تھا۔ یہ رسم بھی تین چار منٹ تک جاری رہی۔ اس کے بع
پجاری نے ہمارے ماتھوں پر کیسر کا تلک لگایا اور ہمیں اُٹھنے کا اشارہ کیا۔ ہم اُٹھ کھ
ہوئے اور ایک جلوس کی شکل میں واپس چل پڑے۔ مندر کے دروازے پر آ کر را
سے الگ ہو گئی۔ میں نے اُس کی طرف دیکھا۔ اُس نے مجھے ایک بار پھر خاموش
کا اشارہ کیا اور پجاری مجھے جس طرح کوٹھڑی سے لائے تھے اُسی طرح کوٹھڑ
واپس چھوڑ گئے۔

میں ایک بار پھر کوٹھڑی میں اکیلا رہ گیا۔

یہ قید تنہائی میری برداشت سے باہر تھی۔ مگر رانی کی خاطر مجھے یہ سب کچھ بردا
کرنا پڑ رہا تھا۔ رات کا پہلا پہر ہو گا کہ مجھے ایک بار پھر وہی کراہنے کی آواز سنائی
میرے کان کھڑے ہو گئے۔ آواز باتھ رُوم کے روشندان میں سے ہی آ رہی تھی
جلدی سے اُٹھ کر باتھ رُوم میں گیا اور ہمہ تن گوش ہو کر آواز کو سننے لگا۔ کراہنے کی
دھیمی دھیمی تھی۔ مگر اُس آواز میں اور پہلے والی آواز میں فرق لگ رہا تھا۔ میں نے
غور کیا تو محسوس ہوا کہ یہ کسی عورت کی آواز ہے۔ میں نلکے پر پاؤں رکھ کر دیوا
چمٹ گیا اور روشندان کی سلاخوں کو پکڑ کر دوسری طرف جھانک کر دیکھنے کی کوشش کی
اس بار بھی دوسری طرف مجھے کچھ دکھائی نہ دیا۔ مگر کراہنے کی آواز رُک رُک کر آ
رہی تھی اور یہ کسی عورت ہی کی آواز تھی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ دوسری طرف کیا
ہے؟ یہ کیا راز ہے؟ پہلے ایک مرد اذیت کی حالت میں کراہ رہا تھا اب ایک عورت
رہی ہے۔ عورت کی آواز بھی آہستہ آہستہ مدھم ہوتے ہوئے بند ہو گئی اور گہری خا
چھا گئی۔

میں پلنگ پر آ کر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ یہ سب کچھ کیا ہے؟ میرا ذہن اس
معمے کو حل کرنے میں ناکام رہا۔ اتنے میں کوٹھڑی کے دروازے کے باہر والی کنڈ
کی آواز آئی، پھر کانچی میرے لئے کھانا لے کر اندر آ گئی۔ اُس نے خاموشی
میرے سامنے رکھ دیا اور بغیر کوئی بات کئے واپس جانے لگی تو میں نے کہا۔

''کانچی! ذرا ٹھہرو۔''

وہ رُک گئی اور اُس نے پلٹ کر مجھے دیکھا۔ میں نے کہا۔

''ساتھ والی کوٹھڑی میں کیا کوئی بیمار ہے؟ کسی کے درد سے کراہنے کی آواز کل رات
بھی آئی تھی، آج بھی آئی ہے۔''

کانچی پر جیسے میری بات کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ اُس کا چہرہ خاموش تھا۔ وہ ٹکٹکی
باندھے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ مجھے بڑی حیرانی ہوئی بلکہ غصہ بھی آیا کہ یہ میری کسی
بات کا جواب تک نہیں دے رہی۔ میں نے کہا۔ ''کانچی! کیا تم بول نہیں سکتیں؟''

اُس نے اس بار بھی کوئی جواب نہ دیا اور خاموشی کے ساتھ کوٹھڑی سے نکل گئی۔

میرے دل میں شک کا ایک کانٹا سا پڑ گیا۔ آخر دیوار کی دوسری طرف کیا ہو رہا تھا؟
میں اکیلا اس معمے کو حل نہیں کر سکتا تھا۔ رانی ہی مجھے یہ راز بتا سکتی تھی۔ مگر وہ مجھ سے کوئی
بات ہی نہیں کرتی تھی۔ رسم کی پرم پرا کے مطابق شاید ہمیں ایک دوسرے سے بولنے کی
اجازت نہیں تھی۔ آخر میں نے فیصلہ کر لیا کہ کل صبح مجھے ندی پر لے جایا جائے گا تو
چاہے کچھ ہو جائے میں رانی سے اس راز کے بارے میں ضرور پوچھوں گا۔

رات سوتے جاگتے گزر گئی۔ اگلے دن مجھے پھر اُسی طرح جلوس کی شکل میں مندر
کے باہر لے جایا گیا۔ مندر کے باہر رانی بھی خوب بنی سنوری پجاریوں کے درمیان
کھڑی تھی۔ ہم دونوں کو ندی کے کنارے لا کر چبوترے پر بٹھایا گیا اور پجاری اشلوک
پڑھنے لگا۔

میں نے گردن موڑ کر رانی کی طرف دیکھا۔ وہ میرے پاس ہی آلتی پالتی مارے
بیٹھی تھی۔ دو تین بار کوشش کرنے کے بعد آخر میں نے سرگوشی میں اُس سے پوچھ ہی لیا۔

''میری کوٹھڑی میں رات کو کسی کے کراہنے کی آوازیں آتی ہیں۔''

رانی نے اپنی اُنگلی سے میرے گھٹنے کو زور سے دبایا اور سرگوشی میں کہا۔

''چپ رہو!''

میں چپ ہو گیا۔ میں رانی کی مذہبی اور ضروری رسومات کو خراب نہیں کرنا چاہتا تھا
اس لئے خاموش رہا۔

پوجا پاٹھ وغیرہ جو کچھ بھی اُن پجاریوں نے کرنا تھا ختم ہوا تو مجھے میری کوٹھڑی میں
لے جا کر بند کر دیا گیا۔ رانی نے مجھے اشارہ دیا تھا کہ یہ رسومات چار دن تک چلیں گی۔

میں ایک ایک لمحہ گن رہا تھا۔ جب تیسری رات آئی تو میں نے سوچا آج رات اگر دیوار
کی دوسری طرف سے کسی کے کراہنے کی آواز آئی تو میں آواز دے کر ضرور پوچھوں
کہ تم کون ہو اور اس طرح درد سے کیوں کراہ رہے ہو؟

دوپہر کے وقت بھی کانچی ہی میرے لئے کھانا لائی تھی مگر وہ مجھ سے کوئی بات نہ
کرتی تھی۔ رات کو جب ابھی کانچی کھانا لے کر نہیں آئی تھی، میں باتھ رُوم میں چلا
اور روشندان کی طرف دیکھنے لگا۔ دیوار کی دوسری جانب خاموشی چھائی ہوئی تھی، کوئی
آواز نہیں آ رہی تھی۔ میں کچھ دیر انتظار کرتا رہا، پھر مایوس ہو کر باتھ رُوم سے باہر جانے
لگا تو وہی کراہنے کی آواز سنائی دی۔ میرے قدم وہیں رُک گئے۔ میں جلدی
روشندان کے نیچے دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ کراہنے کی آواز اس دفعہ بھی کسی
عورت کی محسوس ہو رہی تھی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد اُس کے حلق سے دبی دبی ''ہائے''
آواز نکل جاتی تھی۔ صاف لگ رہا تھا کہ اُسے کوئی اذیت دی جا رہی ہے۔ میں پہلے
طرح نلکے پر پاؤں رکھ کر اُوپر چڑھ گیا اور روشندان کی سلاخوں میں سے دوسری طرف
دیکھنے کی کوشش کی، مگر روشندان کی دوسری طرف گھپ اندھیرا تھا۔ پھر مجھے روشندان
میں سے ایک نامانوس سی بو آتی محسوس ہوئی۔ دو تین بار سانس کھینچ کر بو کو سونگھا تو مجھے
کہ یہ لوبان یا ہرمل وغیرہ کی بو نہیں ہے۔ اچانک میرے جسم میں ایک سرد لہر سی دوڑ گئی

یہ خون کی بو تھی......

میں نے بار بار بو کو سونگھا۔ یہ خون ہی کی بو تھی...... عورت کے کراہنے کی آواز
زیادہ مدھم ہو گئی تھی۔ مجھ سے نہ رہ گیا، میں نے آہستہ سے آواز دی۔

''ہیلو! تم کون ہو؟ ہیلو......!''

عورت کے کراہنے کی آواز اچانک بند ہو گئی جیسے کسی نے اُس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا
ہو۔ اس کے بعد موت کی خاموشی چھا گئی۔ میں نے کان لگا رکھے تھے۔ کچھ دیر تک جب
خاموشی کا طلسم نہ ٹوٹا تو میں نیچے اُتر آیا۔ وہ رات بھی گزر گئی۔

چوتھا دن طلوع ہوا تو مجھے اور رانی کو ندی کے کنارے چبوترے پر بٹھا کر پھر وہی
کہانی شروع ہو گئی۔ پوجا پاٹھ کی رسمیں ختم ہو جانے کے بعد جب میں رانی کے ساتھ
ساتھ لگا واپس اپنی کوٹھڑی کی طرف جا رہا تھا بلکہ مجھے لے جایا جا رہا تھا تو میں

سرگوشی میں رانی سے پوچھا۔

''اب تو چار دن پورے ہو گئے ہیں۔ میں تم سے بات کر سکتا ہوں نا؟''

رانی نے آہستہ سے میرا ہاتھ دبا دیا اور منہ سے کچھ نہ کہا۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا
ابھی میں تم سے بات نہیں کر سکتی۔

مجھے حسبِ معمول میری کوٹھڑی میں پہنچا دیا گیا۔ دو پجاری میرے ساتھ آئے تھے۔
جاتے ہوئے وہ باہر سے کوٹھڑی کا کنڈا لگا گئے۔ یہ بات بھی میرے لئے تشویش کا
باعث تھی کہ آخر یہ لوگ باہر سے کنڈی کیوں لگا جاتے ہیں؟ روشندان کی دوسری طرف
سے آنے والی خون کی بو اور کسی عورت کے کراہنے کی آواز بھی میرے لئے ایک معمہ بنی
ہوئی تھی۔ دوپہر کو کانچی میرے لئے کھانا لے کر آئی تو مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں نے اُس
سے پوچھا۔

''ساتھ والی کوٹھڑی میں کیا ہو رہا ہے؟ اُدھر سے مجھے انسانی خون کی بو آئی تھی۔''

کانچی نے کوئی جواب نہ دیا، بت بنی عجیب نظروں سے مجھے تکنے لگی، پھر وہ چلی گئی۔
مجھے اُس پر سخت غصہ آیا کہ یہ میری بات کا جواب کیوں نہیں دیتی؟ مجھے خیال آیا شاید وہ
گونگی ہو۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ اگر آج بھی رانی نے مجھے کوٹھڑی سے باہر نہ نکالا تو
رات کو جب کانچی میرے لئے کھانا لے کر آئے گی تو میں اُس سے اپنے سوالوں کا
جواب پوچھ کر رہوں گا۔

دن گزر گیا۔ اس کا احساس مجھے کانچی جب کھانا لے کر آئی تو ہوا۔ کھانا وہی اُبلے
ہوئے چاول تھے جن پر تھوڑی سی دال ڈال دی گئی تھی۔ جب وہ جانے کے لئے واپس
مڑی تو میں نے اُس کو بازو سے پکڑ لیا۔ کانچی چونک کر پلٹی اور ایک دو سیکنڈ میری طرف
دیکھتے رہنے کے بعد بولی۔

''میرا بازو چھوڑ دو!''

میں نے اُس کا بازو چھوڑ دیا۔ وہ جانے لگی تو میں نے کہا۔ ''کانچی! میں تمہارے
سب سے بڑے دیوتا کے نام پر تم سے پوچھتا ہوں کہ یہ سب کچھ کیا ہے؟''

وہ رُک گئی، پلٹ کر مجھے ایک نظر دیکھا، ایک قدم چل کر میرے بالکل سامنے آ گئی
اور میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بولی۔

''یہاں سے بھاگ جاؤ!''

میں اُس کا منہ تکنے لگا کہ یہ کیا کہہ رہی ہے؟ جس لہجے میں اُس نے یہ جملہ
اُس میں میرے لئے بے حد ہمدردی اور محبت کا جذبہ تھا۔ میں نے پوچھا۔

''کیوں بھاگ جاؤں؟ یہاں میری پتنی میرے ساتھ ہے۔ وہ مجھ سے محبت
ہے۔ ہم بمبئی واپس جا کر ہنی مون منانے والے ہیں۔ تم نے ایسا کیوں کہا؟''

کانچی نے آہستہ سے سرد آہ بھری اور کہا۔

''اس لئے کہ میں تمہیں زندہ دیکھنا چاہتی ہوں۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' میں نے تعجب کے ساتھ پوچھا۔

کانچی نے کوئی جواب نہ دیا، ایک نگاہ مجھ پر ڈالی، میرا ہاتھ چھوڑا اور کوٹھڑی سے
گئی۔ اُس کے جانے کے بعد میں سوچ میں پڑ گیا کہ اُس لڑکی نے مجھے وہاں
بھاگ جانے کا مشورہ کیوں دیا ہے؟ ظاہر ہے اُسے جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں
مجھے وہاں سے بھگا کر اُسے کیا حاصل ہو سکتا تھا؟ جبکہ میں نے اُس کی آنکھوں میں
لئے ہمدردی سے ایک قدم آگے پیار کا ہلکا سا جذبہ دیکھ لیا تھا۔ میں کسی نتیجے پر نہ پہنچ
اور رات گزر گئی۔

دوسرے دن شام کے وقت رانی لمبے سیندھوری رنگ کے چولوں والے دو پجا
کے ساتھ میری کوٹھڑی میں آئی۔ پجاریوں نے اشلوک گاتے ہوئے میرے ما
باری باری تلک لگائے، رانی مجھے دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ پجاری جب اپنی رسومات
کر چکے تو رانی نے آگے بڑھ کر مجھے اپنے ساتھ لگا لیا اور کہنے لگی۔

''تم نے مجھے آواگون کے بندھنوں سے بچا لیا ہے۔ اب تم میرے دھرم پتی
میں تمہاری دھرم پتنی ہوں۔''

میں نے پوچھ لیا۔ ''ہم بمبئی کس وقت روانہ ہو رہے ہیں؟''

اُس نے ایک نظر پجاریوں کی طرف دیکھا، پجاریوں کے چہروں پر بڑی
پراسراری مسکراہٹ تھی۔ پھر میرا ہاتھ چوم کر بولی۔

''کل اسی وقت ہم بمبئی جا رہے ہیں۔ چلو! اپنی کٹیا میں چلتے ہیں۔''

جس کو رانی نے کٹیا کہا تھا وہ ایک جھونپڑی تھی جس کو بڑے سلیقے اور خوبصورتی

جایا گیا تھا۔ پلنگ پر ریشمی بستر لگا تھا جس پر گلاب کے سرخ پھول بکھرے ہوئے تھے۔
یک تپائی پر چاندی کے دو چھوٹے پیالوں کے پاس ایک بوتل رکھی ہوئی تھی۔ میں یہی
مجھا کہ اس میں گنگا جل یا کوئی شربت ہو گا۔ رانی مجھے ساتھ لے کر قریبی ندی پر آ گئی۔
س وقت جنگل میں شام کا اندھیرا گہرا ہو چکا تھا۔ اُس اندھیرے میں جنگل کی فضا بڑی
اسرار اور اُداس اُداس سی لگ رہی تھی۔ رانی پتلی ساڑھی سمیت ندی میں اُتر گئی۔ اُس
نے مجھے بھی ندی میں آنے کا اشارہ کیا۔ میں نے صرف ایک دھوتی پہن رکھی تھی۔ میں
ی طرح ندی میں اُتر گیا اور ہم ندی کے بہتے پانی میں نہانے لگے۔ نہانے کے بعد رانی
ہلے ندی میں سے باہر نکلی۔ رات کے بڑھتے ہوئے اندھیرے میں اُس کی پتلی ساڑھی
یلی ہو کر اُس کے بدن سے چپکی ہوئی صاف نظر آ رہی تھی۔ ہم جھونپڑی میں واپس آ
گئے۔ رانی پلنگ پر بیٹھ گئی۔ اُس نے دوسری ساڑھی باندھ لی تھی۔

میں اُس سے پوچھے بغیر نہ رہ سکا کہ اُس نے جھونپڑی کو اس قدر سجایا کیوں ہے؟
کہنے لگی۔ ''آج ہماری اصلی سہاگ رات ہے۔ آج ہم ایک دوسرے کے دھرم پتی پتنی
ہیں۔''

میں نے تپائی پر رکھی بوتل کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔ ''اُس بوتل میں کیا ہے؟''
اُس نے کہا۔ ''اس میں گنگا کا پوتر جل ہے۔ سہاگ رات کو دھرم پتنی گنگا کا پوتر جل
خود بھی پیتی ہے اور اپنے پتی دیو کو بھی پلاتی ہے۔ پھر گنگا میّا دونوں کو جنم جنم کے لئے
ایک دوسرے کے ساتھ کر دیتے ہیں۔''

مجھے رانی کی اس قسم کی باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں اُس سے محبت کرتا تھا اور
صرف اُس کے ساتھ رہنا چاہتا تھا۔ اُس کے ساتھ شادی بھی میں نے اسی لئے کی تھی کہ
ہم ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ رہیں گے۔

ہم پلنگ پر دیر تک بیٹھے ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہے۔ اس دوران رانی
نے دو بار گنگا جل گلاس میں ڈال کر مجھے بھی پلایا اور اُسی گلاس کو منہ لگا کر خود بھی پیا۔
تیسری بار اُس نے مجھے گنگا جل پلایا تو مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ میں نے اُس سے
کہا۔ ''مجھے نیند آ رہی ہے۔''

وہ بولی۔ ''لیٹ جاؤ! پوجا پاٹھ کی رسموں نے تمہیں کافی تھکا دیا ہے۔''

میں پلنگ پر لیٹ گیا۔ رانی میرے بالوں کو سہلانے لگی۔ کچھ دیر تک مجھے اس کے
سہلانے کا احساس رہا، پھر مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔

جس وقت ہوش آیا اور میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو میں ایک نیم روشن
کوٹھڑی میں لکڑی کے تخت پر پڑا تھا۔ میرے دائیں جانب دیوار کے طاق میں مٹی کا
روشن تھا۔ میرا سر بوجھل ہو رہا تھا۔ میں اُٹھ کر بیٹھ گیا اور حیرت زدہ نظروں سے
کوٹھڑی کے در و دیوار کو دیکھنے لگا کہ یہ میں کہاں آ گیا ہوں اور مجھے یہاں کون لایا
اور کیوں لایا ہے؟ بیک وقت کئی سوال میرے ذہن میں اُبھرے تھے جن کا میرے
کوئی جواب نہیں تھا۔ تب مجھے کانچی کا خیال آ گیا جس نے مجھے کہا تھا کہ یہاں
بھاگ جاؤ!

ضرور میرے ساتھ کوئی دھوکا ہوا ہے...... میں نے سوچا۔ لیکن میرا دل ماننے کو
نہیں تھا کہ رانی بھی میرے ساتھ اِس قسم کا سلوک کر سکتی ہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے
سے محبت کرتے تھے، پھر اُس نے مجھے سہاگ رات کو حجلہ عروسی سے نکال کر اس
کوٹھڑی میں کیوں پھینک دیا؟ کہیں یہ سب کچھ کسی سازش کے تحت تو نہیں ہو رہا؟

اُس وقت بھی میں عقل سے کام نہیں لے رہا تھا۔ میرا دل یہ تسلیم کرنے کو تیار
نہیں تھا کہ رانی بھی میرے خلاف کوئی سنگین سازش کر سکتی ہے۔ محبت میں آدمی ا
ضرور ہو جاتا ہے مگر اُسے کچھ نہ کچھ ہوش اور عقل سے ضرور کام لینا چاہئے۔ اتنا
اندھا نہیں ہو جانا چاہئے کہ چلتے چلتے ایسے اندھے کنوئیں میں گر پڑے جہاں سے
پھر باہر نہ نکل سکے۔ اب میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ وہاں مجھے کس لئے بند کیا گیا تھا اور
نے بند کیا تھا؟

یہ معمہ بھی بہت جلد حل ہو گیا جب کچھ ہی دیر بعد چار ہٹے کٹے سر منڈے چا
کوٹھڑی میں آئے اور آتے ہی اُنہوں نے مجھے دبوچ لیا اور میرے دونوں ہاتھ
رسّی سے پیچھے باندھ کر مجھے گھسیٹتے ہوئے کوٹھڑی سے لے گئے۔ اُن سے کچھ پوچھنا
انصاف طلب کرنا بے کار تھا۔ میں نے ایک دو بار چیخ کر پوچھا بھی کہ تم لوگ مجھے کہاں
لئے جا رہے ہو...... تم کون ہو؟ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ میری دھرم پتنی رانی کہاں
مگر لگتا تھا کہ وہ چاروں بہرے ہیں اور اُنہوں نے میرا ایک لفظ بھی نہیں سنا۔ وہ

یک تاریک راہداری میں گھسیٹتے لئے جا رہے تھے۔ ایک جگہ ہلکی ہلکی روشنی تھی۔ یہ روشنی
چھت کے کسی سوراخ میں سے آ رہی تھی۔ وہاں سیڑھیاں نیچے جاتی تھیں۔ وہ وہاں آ کر
رک گئے اور مجھے سیڑھیوں میں دھکیل دیا۔ جیسے ہی میں گرا اُنہوں نے پیچھے سے میری
رسّی کھینچ لی۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو میں منہ کے بل پتھریلی سیڑھیوں پر گرتا اور شدید زخمی
ہو جاتا۔ شاید وہ مجھے زخمی نہیں کرنا چاہتے تھے۔

نیچے ایک کشادہ تہہ خانہ تھا جس کی دیوار کے طاقوں میں تین دیئے جل رہے تھے۔
میری رسّی کھول کر اُنہوں نے مجھے آگے کو دھکا دے کر گرا دیا۔ میں فرش پر گرتے ہوئے
سنبھل گیا اور دونوں ہتھیلیوں سے اپنے منہ سر کو زخمی ہونے سے بچا لیا۔ وہ چاروں
شخص پجاری سیڑھیوں کا دروازہ بند کر کے اور باہر سے تالا لگا کر چلے گئے۔ میں
چند لمحے حیرت زدہ سا ہو کر ٹھنڈے فرش پر بیٹھا رہا، پھر چاروں طرف غور سے دیکھا۔
تین جلتے چراغوں کی روشنی میں مجھے دیواروں پر بنے ہوئے کچھ نقش و نگار سے دکھائی
دیئے۔ میں اُٹھ کر سامنے والی دیوار کے پاس گیا اور غور سے دیکھنے لگا۔ یہ ہندو دیو مالا
کی تصویریں تھیں جو پتھر کی دیوار کو کھود کر اور اُن میں رنگ بھر کر بنائی گئی تھیں۔ اُن میں
ساری کی ساری تصویریں ایسی تھیں کہ جن میں کہیں ایک مرد کو اور کہیں ایک عورت کو پتھر
کی لمبی سل پر بندھا ہوا دکھایا گیا تھا اور کالے کالے جسموں والی عورتیں کہیں اُن رسیوں
میں جکڑے ہوئے مردوں اور عورتوں کے پیٹ چھریوں سے چاک کر رہی تھیں اور کہیں
اُن کی خون آلود گردنوں پر منہ رکھے خون پی رہی تھیں۔ ان ہولناک تصویروں کو دیکھ کر
میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں جلدی سے پیچھے ہٹ کر فرش پر بیٹھ گیا۔

کچھ پتہ نہیں تھا کہ وہ دن کا وقت تھا کہ رات کا وقت تھا......

مجھے بھوک اور پیاس ضرور لگ رہی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد دو کالی کالی عورتیں اپنے
ہاتھوں میں تھالیاں پکڑے سیڑھیاں اُتر کر میرے پاس آئیں اور تھالیاں میرے آگے
رکھ دیں۔ اُن کو دیکھتے ہی مجھے دیواروں پر بنی ہوئی خون پیتی اور پیٹ چاک کرتی
عورتیں یاد آ گئیں۔ عجیب بات تھی کہ دونوں کالی عورتوں کے اُوپر والے دھڑ بالکل
ننگے تھے۔ کمر کے ساتھ اُنہوں نے ایک لہنگا پہنا ہوا تھا۔ اُن کے بال کھلے تھے اور
کندھوں پر پھیلے ہوئے تھے۔ آنکھیں لال لال تھیں اور وہ مجھے اس طرح دیکھ رہی تھیں

جیسے ابھی میرا خون پی جائیں گی۔ میں نے اُن سے پوچھا۔
''رانی کہاں ہے ... مجھے یہاں کیوں لایا گیا ہے؟''
دونوں بت بنی میری طرف دیکھتی رہیں۔ پھر ایک دوسری کی طرف دیکھا اور واپس چلی گئیں اور جاتے ہوئے سیڑھیوں کے دروازے پر دوسری طرف سے تالا لگا گئیں تھالیوں میں کھانے پینے کی چیزیں تھیں۔ کچھ مٹھائیاں تھیں، پھل اور پوریاں تھیں ایک کٹوری میں حلوہ تھا۔ مجھے سخت بھوک لگی ہوئی تھی۔ میں نے پیٹ بھر کر کھانا کھا[یا] پانی کا گلاس اُٹھا کر پینے لگا تو اُس میں سے مجھے صندل کی خوشبو آئی۔ میں نے ایک گھونٹ پیا، یہ کوئی خوشبودار شربت تھا۔ اس خاطر تواضع پر میں حیران ضرور ہوا۔ ایک طرف تو مجھے زدوکوب کیا جارہا تھا، میرے ساتھ پھانسی کے مجرموں والا سلوک کیا جا[رہا] تھا اور دوسری طرف مہمانوں جیسا سلوک کیا جارہا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ مر[غن] غذا کھانے کے بعد مجھے نیند آنے لگی اور میں سو گیا۔

سو کر اُٹھا تو ذہن کی قوتیں تازہ دم تھیں۔

سوچنے لگا یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے؟ کہیں یہ مجھے کسی دیوی دیوتا پر قربان کرنے کے لئے تو نہیں مرغن غذائیں کھلا رہے؟ میں نے کتابوں اور رسالوں میں پڑھا تھا کہ بھارت کے بعض مندروں میں خفیہ طور پر پاروتی دیوی کے آگے انسانوں کی قربانی دی جاتی ہے اگرچہ ہندوستان کے قانون کے مطابق ایسا کرنا جرم تھا مگر درپردہ ان خفیہ مندروں میں آج بھی اِکا دُکا یا نچلی ذات کے مردوں، عورتوں اور بچوں کو اغواء کر کے پاروتی دیوی [پر] قربان کیا جاتا ہے۔ مگر میرے ساتھ ایسا نہیں ہو سکتا تھا۔ میں کوئی اجنبی مسافر نہیں تھا میں تو رانی کا پتی تھا اور اس مندر کے سارے پجاری اُس کی عزت کرتے تھے۔ رانی [یہ] گوارہ کر سکتی تھی کہ اُس کے خاوند کے ساتھ کوئی اِس قسم کا درندوں والا سلوک کر[ے] میری آنکھوں پر ابھی تک رانی کے عشق کی پٹی بندھی ہوئی تھی۔

میرا خیال ہے مزید پانچ چھ گھنٹے گزرے ہوں گے کہ وہی کالی عورتیں ایک بار [پھر] میرے لئے مرغن غذاؤں کی تھالیاں لے کر کوٹھڑی میں آ گئیں۔

اچانک میں نے فیصلہ کیا کہ سیڑھیوں کا دروازہ کھلا ہے۔ میں ان عورتوں کو دھکا [دے] کر گرا دوں گا اور وہاں سے فرار ہونے کی کوشش کروں گا۔ میری حالت اُس وقت اُس

قیدی کی طرح تھی جس نے جیل کا دروازہ کھلا ہوا دیکھ لیا ہو۔ اچانک میری نگاہیں سیڑھیوں کی طرف اُٹھ گئیں۔ جلتے دیوں کی روشنی میں مجھے سیڑھیوں کے دروازے کے دونوں جانب دو ہٹے کٹے کالے بھجنگ آدمی ہاتھ میں تلواریں لئے کھڑے دکھائی دیئے۔ میں نے فرار ہونے کا خیال کسی دوسرے وقت تک ملتوی کر دیا۔

کالی عورتیں کھانا رکھ کر اور دوپہر والی خالی تھالیاں اُٹھا کر واپس چلی گئیں اور سیڑھیوں کا دروازہ مقفل کر دیا گیا۔ مجھے تاریک افریقہ کے آدم خور وحشی لوگ یاد آ گئے۔ شاید میرے ساتھ بھی یہی سلوک ہونے والا تھا۔ ایک بار پھر میری بھوک چمک اُٹھی تھی۔ میں نے کھانا کھایا اور دیوار سے ٹیک لگا کر وہاں سے فرار ہونے کی ترکیبیں سوچنے لگا۔ سیڑھیوں والے راستے کے سوا وہاں سے باہر نکلنے کا دوسرا کوئی راستہ نہیں تھا۔ میں اُٹھ کر سیڑھیوں کے دروازے کے پاس گیا، دروازے کو دھکیلا۔ دروازہ لوہے کی طرح سخت اور مضبوط لکڑی کا تھا اور اپنی جگہ پر پتھر کی طرح جما ہوا اور سخت تھا۔

میں واپس دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ مجھے بار بار اپنی پتنی اور محبوبہ رانی کا خیال آ رہا تھا کہ وہ کہاں ہے؟ کیا اُسے میرے حال کی کوئی خبر نہیں ہے؟ اچانک خیال آیا کہ ہو سکتا ہے اس مندر کے پجاریوں نے ہم دونوں کے خلاف سازش کی ہو اور میرے علاوہ رانی کو بھی پکڑ کر بند کر دیا ہو۔ کیونکہ اُن کے دھرم کے مطابق رانی نے ایک مسلمان سے شادی کر کے اُن کے دھرم کے قانون کا مذاق اُڑایا تھا۔ اب میں سوچنے لگا کہ میں اکیلا فرار نہیں ہوں گا بلکہ رانی کا سراغ لگانے کے بعد اُسے بھی نکال کر اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ آخر وہ میری پتنی تھی اور اُس کی حفاظت میرا فرض تھا۔ یہ خیال میرے دل میں راسخ ہو گیا کہ رانی میرے ساتھ مخلص ہے۔ وہ اسی طرح مجھ سے محبت کرتی ہے اور ان مندر کے پجاریوں نے ہماری شادی کا ہم سے انتقام لیا ہے۔

میرا خیال تھا کہ باہر رات ہو گئی ہو گی۔ کیونکہ مجھے شام کا کھانا دیا گیا تھا اور مجھے نیند بھی آنے لگی تھی۔ مرغن کھانے کی وجہ سے مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی تھی۔ میں ایک طرف لیٹ کر سو گیا۔ خدا جانے تین گھنٹے یا چار گھنٹے سویا ہوں گا کہ چار کالے بھجنگ ہٹے کٹے آدمی کوٹھڑی میں داخل ہوئے۔ اُن میں سے ایک کے ہاتھ میں کلاشنکوف ٹائپ کی گن تھی جو ظاہر ہے بھری ہوئی ہو گی۔ گن کا رُخ میری طرف کئے وہ ایک طرف کھڑا ہو

گیا۔ باقی کے تین پجاریوں نے دوبارہ میرے ہاتھ میرے پیچھے باندھے اور مجھے
ہوئے سیڑھیوں میں سے اوپر لے گئے۔ ایک بار پھر وہ مجھے نیم تاریک راہ داری
سے گزار کر ایک ایسے کمرے میں لے گئے جہاں دیوار کے ساتھ کسی دیوی کی بہت
مورتی لگی تھی۔ مورتی کا رنگ بھی کالا تھا۔ اُس کا سارا جسم ننگا دکھایا گیا تھا، آنکھیں
سرخ تھیں۔ اُس کے چھ بازو تھے۔ کسی ہاتھ میں تلوار تھی، کسی میں خنجر تھا، کسی ہاتھ
کلہاڑی تھی اور کسی میں نوکیلا نیزہ تھا۔ مورتی کے آگے پتھر کی ایک لمبی سل بنا دی گئی
جس کے چاروں کونوں میں لوہے کے کنڈے لگے ہوئے تھے۔ دیواروں کے
ساتھ پتھر کے چھوٹے چھوٹے چبوترے تھے۔

یہ کمرہ مجھے قتل گاہ لگ رہا تھا......

اس قتل گاہ میں سے مجھے ایک اور چھوٹے سے کمرے میں لے جایا گیا جہاں پا
بہت بڑا ٹب تھا۔ مجھے ایک چوکی پر بٹھا کر وہ لوگ چلے گئے۔ صرف گن والا کالا پ
دروازے کے پاس میری طرف گن تانے کھڑا رہا۔ اتنے میں دو کالی عورتیں ا
گئیں۔ ایک عورت کے ہاتھوں میں تھالی تھی جس میں گیروے رنگ کا تہہ کیا ہوا
رکھا تھا، دوسری کے ہاتھ میں جو تھالی تھی اُس میں تین پیالیاں پڑی تھیں۔ اُنہوں
تھالیاں ایک طرف رکھ دیں اور میرے کپڑے اُتار کر ایک کونے میں پھینک دیے
پیالیوں میں سے خوشبودار تیل لے لے کر میرے جسم کی مالش کرنے لگیں۔ مالش کر
کے بعد اُنہوں نے میرے جسم پر پانی ڈالا اور دوسری پیالی میں سے صابن نکا
میرے جسم پر ملنے لگیں۔ اُنہوں نے مجھے اچھی طرح سے نہلایا، پھر تھالی میں رکھا
گیروے رنگ کا کپڑا اُٹھا کر اُسے کھولا۔ یہ ایک لمبا سادھوؤں والا چولا تھا۔ اُنہوں
مجھے چولا پہنا دیا۔ میرے ہاتھ غسل خانے میں لاتے وقت ہی کھول دیئے گئے
مجھے نہلانے دھلانے کے بعد دونوں کالی عورتیں چلی گئیں۔ اُن کے جاتے ہی کا
بھجنگ پجاری دوبارہ اندر آئے اور مجھے اپنے ساتھ لے کر مورتی والے کمرے میں
گئے۔ یہاں دیوار کے ساتھ ایک لکڑی کا تخت بچھایا گیا تھا۔ مجھے اُس تخت پر بٹھا
گیا۔ ایک پجاری تلوار لے کر اور دوسرا پجاری گن لے کر میرے دائیں بائیں کھڑ
گئے۔ میرا رُخ دیوار والی مورتی کی طرف تھا۔ میں تو یہی سمجھ رہا تھا کہ میرا آخری و

گیا ہے اور مجھے اس منحوس مورتی پر قربان کیا جا رہا ہے۔

مجھے بار بار رانی کا خیال آ رہا تھا۔ یقیناً اُس کے ساتھ بھی کسی دوسری جگہ ایسا ہی
سلوک کیا جا رہا ہوگا اور اُسے بھی کسی دوسرے دیوتا یا دیوی کی مورتی کے آگے قربان کیا
جا رہا ہوگا۔ تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ ڈھولک اور تاشے بجنے کی آوازیں آنے لگیں۔ یہ
آوازیں باہر راہداری سے آ رہی تھیں اور لحہ بہ لحہ قریب ہوتی جا رہی تھیں۔ لگتا تھا کہ کوئی
جلوس آ رہا ہے۔ پھر چھ سات پجاری ایک عورت کو لئے اندر داخل ہوئے۔ آگے آگے
دو پجاری ڈھول تاشے بجا رہے تھے اور اُونچی آواز میں بھجن گا رہے تھے۔ عورت کے
بال کھلے تھے اور اُس کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ ایک پجاری رسی تھامے اُسے چلاتا لا
رہا تھا۔ خدا جانے یہ کون بدنصیب عورت تھی؟ اُس کا رنگ گہرا سانولا تھا اور بال مٹی
کے رنگ کے تھے۔ شیڈول کاسٹ ذات کی عورت لگتی تھی۔ اُس جلوس کے پیچھے پیچھے
چار کالی عورتیں بھی آ رہی تھیں۔ وہ اس طرح جھومتی ہوئی آ رہی تھیں جیسے اُنہوں نے
کوئی نشہ کیا ہو۔ ہر کالی عورت کے ہاتھ میں ایک ایک چھری تھی۔ میں سمجھ گیا کہ دیوی کی
مورتی کے آگے اس عورت کو قربان کیا جا رہا ہے۔ اور شاید اس کے بعد یا اس کے ساتھ
ہی مجھے بھی منحوس دیوی کی بھینٹ چڑھا دیا جائے۔ میں اپنے خوفناک انجام سے لرز
اُٹھا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے مظلوم اور بدنصیب عورت کو دیوی پاروتی کی مورتی کے
آگے پتھر کی سل پر پیٹھ کے بل لٹا دیا گیا، اُس کے دونوں پاؤں اور دونوں ہاتھ سل کے
کونوں میں لگے ہوئے لوہے کے کنڈوں کے ساتھ جکڑ دیئے گئے۔ عورت کی یہ حالت
تھی کہ دہشت کے مارے اُس کے حلق سے سوائے کراہنے کے اور کوئی آواز نہیں نکل
رہی تھی۔ شاید اُس نے اپنے آپ کو دردناک موت کے حوالے کر دیا تھا۔

کالی عورتیں جو کمر تک عریاں تھیں دیوی پاروتی کی مورتی کے نیچے سر جھکائے کھڑی
ہو گئیں۔ پجاری بھی ایک طرف ادب سے کھڑے ہو گئے۔ ڈھول تاشے بجنے بند ہو
گئے۔ پھر اچانک ایک چیخ کی آواز سنائی دی اور اس کے ساتھ ہی ایک اُونچی لمبی بھاری
بھرکم کالی کلوٹی عورت جس کا چہرہ لال رنگ سے سرخ ہو رہا تھا ایک ہاتھ میں تلوار لئے
ناچتی ہوئی داخل ہوئی۔ اُس نے قربان کی جانے والی عورت کے گرد تین چکر لگائے اور
پاروتی کی مورتی کے آگے فرش پر اوندھے منہ لیٹ کر ڈنڈوت کیا۔ پھر اُٹھی اور مورتی

کے پاؤں میں رکھا ہوا ایک چھوٹا مٹکا اٹھایا۔ اُس میں کوئی تیل یا شاید گھی تھا۔ م
عورت مٹکے میں سے تیل نکال نکال کر پتھر کی سل پر جکڑی ہوئی عورت پر ڈالنے لگی۔
دوسری دو کالی عورتیں آگے بڑھیں اور قربان کی جانے والی بدنصیب عورت کے
پر چھڑکا ہوا تیل ملنے لگیں۔ عورت ہولے ہولے کراہ رہی تھی۔ وہ جان گئی تھی کہ
کے ساتھ کیا ہونے والا ہے؟ میں دہشت زدہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ ہولناک منظر
رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد میرا بھی یہی انجام ہونے والا تھا۔ جب عورت کے سارے جسم
تیل کی مالش کر دی گئی تو موٹی کالی عورت نے پاروتی کی مورتی کو سر جھکا کر نمسکار
اور تلوار والا ہاتھ اُوپر اُٹھا کر سل پر جکڑی ہوئی عورت کے پاس کھڑی ہو گئی۔ بدنصیب
عورت کے جسم پر اس وقت کوئی کپڑا نہیں تھا۔

موٹی عورت نے جے پاروتی ماتا کا نعرہ لگایا اور تلوار عورت کے پیٹ میں گھو
دی...... عورت کے حلق سے ایک دردناک چیخ بلند ہوئی اور یہ چیخ دوسری کالی عورتوں
کے جے پاروتی ماتا کے نعروں کے شور میں گم ہو گئی۔ دوسری کالی عورتیں پاروتی ماتا
بھینٹ چڑھائی جانے والی عورت پر ٹوٹ پڑیں اور دیکھتے ہی دیکھتے بدنصیب عورت
جسم خون کا لوتھڑا بن کر رہ گیا۔ میں نے خوف کے مارے آنکھیں بند کر لیں۔ تھوڑی
بعد آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ عورت کے جسم کے ٹکڑوں کو ایک ٹوکرے میں ڈال کر
جایا جا رہا تھا اور موٹی کالی عورت کے ساتھ دوسری کالی عورتیں پتھر کی سل پر گر
ہوئے خون کو اپنے جسموں پر مل رہی تھیں۔

یہ بھیانک منظر اُس وقت اپنے اختتام کو پہنچا جب قربان گاہ کی سل کو پانی سے دھو
صاف کر دیا گیا۔

اب میری باری تھی......

میرے سارے جسم پر اس اذیت ناک موت کے خیال سے چیونٹیاں سی رینگ
تھیں۔ دو پجاریوں نے مجھے پکڑ کر پتھر کی سل پر لٹا دیا۔ دوسرے دو پجاریوں
میرے دونوں پاؤں اور ہاتھ لوہے کے کنڈوں میں جکڑ دیئے۔ اس لمحے میرے دل
سوائے اللہ پاک کے دوسرا کوئی خیال نہیں تھا۔ میں اُس سے زندگی کی دُعائیں مانگ
تھا۔ اُسی کے آگے التجائیں کر رہا تھا کہ یا اللہ! مجھے ان کافروں کے ہاتھوں مرنے

ے۔ موٹی کالی عورت تلوار لے کر میرے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کی سرخ
آنکھوں میں خون اُترا ہوا تھا۔ سارے پجاری اور دوسری عورتیں ایک طرف خاموش
تھ سینوں پر رکھے کھڑی تھیں۔

موٹی عورت نے ایک جھٹکے کے ساتھ سر کو اُوپر اُٹھایا اور چیخ نما آواز میں جے پاروتی
تا کی جے کا نعرہ لگانے کے بعد کہا۔

''مہارانی ونتی کو لاؤ!''

مہارانی ونتی کا نام سن کر میں چونک پڑا۔ رانی نے مجھے ایک بار بتایا تھا کہ بچپن میں
س کا نام ونتی تھی۔ پتھر کی سل پر لیٹے لیٹے مجھے سامنے والا دروازہ دکھائی دے رہا تھا۔
ب میں نے اُس دروازے سے اپنی پتنی رانی عرف ونتی کو نکلتے دیکھا تو میرے دل
یں اُمید کی کرن جاگ اُٹھی۔ رانی ضرور مجھے اُن لوگوں سے بچانے آئی تھی۔ وہ مجھے
ن درندوں کے ہاتھوں مرنے نہیں دے گی۔ میں نے بلند آواز میں کہا۔

''رانی! یہ لوگ مجھے دیوی کی بھینٹ چڑھا رہے ہیں۔ مجھے ان سے بچا لو!''

رانی میرے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ میں نے بڑے مان کے ساتھ اُسے کہا۔

''رانی! میں شیراز ہوں...... تمہارا پتی دیو۔ یہ لوگ مجھے قتل کرنا چاہتے ہیں۔ مجھے
ان سے بچاؤ!''

رانی مجھے گھور کر دیکھ رہی تھی۔ اُس نے کہا۔

''شیراز! میں بھی وہی چاہتی ہوں جو یہ چاہتے ہیں۔ میں تمہیں یہاں لائی ہی اسی
لئے ہوں کہ تمہیں پاروتی ماتا کی بھینٹ چڑھا کر اپنے پاپ کا پرائسچت کر سکوں۔''

یہ سن کر میں جیسے سکتے میں آ گیا۔ مجھے یہ توقع ہی نہیں تھی کہ رانی مجھے ایسا جواب
دے گی، اور وہ خود میرے قتل کے منصوبے میں شریک ہو گی۔ میں نے اپنے خشک
ہونٹوں پر زبان پھیری اور کہا۔

''رانی! یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ میں تمہارا پتی دیو ہوں۔ تمہارا خاوند...... کیا تم بھی ان
کے ساتھ مل گئی ہو؟''

رانی بولی۔ ''میں تمہارے کسی سوال کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھتی۔ صرف اتنا بتا
دینا چاہتی ہوں کہ تم میرے پتی نہیں ہو۔ ہمارا بیاہ نہیں ہوا تھا۔''

میں نے کہا۔'' بمبئی میں پجاری نے اگنی منڈل کے سامنے بیٹھ کر ہمارا گٹھ بندھن
تھا، وہ کیا تھا؟''

رانی نے طنزیہ انداز میں کہا۔'' وہ سب جھوٹ تھا۔ بیاہ کی نقل تھی۔ اشلوک نقلی
پجاری نقلی تھا۔''

''لیکن تم نے ایسا کیوں کیا؟'' میں نے بے بسی کے عالم میں پوچھا۔

وہ بولی۔''اس لئے کہ مجھے ایک ایسے مسلمان نوجوان کی تلاش تھی جس کی جنم کنڈ
میں راہو اس استھان پر بیٹھا ہو جس استھان پر وہ میری جنم کنڈلی میں بیٹھا ہے۔ مجھے
پجاری جی نے بتایا تھا کہ اگر کسی طرح میں ایسے مسلمان نوجوان کو تلاش کر کے لے آؤ
اور اُس کے ساتھ نقلی بیاہ رچا کر اُسے ماتا پاروتی کی بھینٹ چڑھا دوں تو مجھے میر
ماتا پتا کے برے کرموں کا پھل نہیں بھگتنا پڑے گا۔ نہیں تو میرے اگلے ایک لاکھ چورا
ہزار جنم لومڑی کے ہوں گے۔ میں نے پاروتی ماتا کے آگے پرارتھنا کی کہ ماتا میری
کر اور مجھے وہ مسلمان نوجوان ملا دے جس کی جنم کنڈلی میری جنم کنڈلی سے ملتی ہو۔
خود اُسے تیرے چرنوں میں لا کر تیری بھینٹ چڑھا دوں گی۔ ماتا نے میری پرا
سوئیکار کر لی۔ قبول کر لی اور مجھے تم مل گئے۔ تمہیں دیکھتے ہی میں سمجھ گئی تھی کہ ج
مسلمان نوجوان کی مجھے تلاش تھی وہ تم ہی ہو۔ کسی بہانے میں نے تم سے تمہارا جنم
پوچھا تو وہ وہی تھا جو میرا جنم دن تھا۔ اور جب میرے گورو نے تمہاری جنم کنڈلی نکا
میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ تمہاری جنم کنڈلی ہو بہو میری جنم کنڈلی سے ملتی تھی۔
میں نے تم پر اپنی محبت کا جال پھینکا۔ تمہیں حرص و ہوس کے وہ نرت دکھائے کہ تم میر
جال میں پھنس گئے اور مجھ سے شادی کرنے پر رضا مند ہو گئے۔ اب جبکہ میں
سے شادی کر لی ہے، چاہے وہ جھوٹی شادی ہی سہی، اور مجھے، میرے ماتا پتا کی اور
اپنی مکتی اور لومڑی کے ایک لاکھ چوراسی ہزار جنموں سے نجات مل رہی ہے تو میں تم
کیسے چھوڑ سکتی ہوں؟ اچھی طرح سمجھ لو! کہ تمہارا میرے آگے اپنی محبت کا واسطہ دینا
گڑگڑانا کسی کام نہیں آئے گا۔ پرسوں اماوس کی اندھیری رات ہے۔ آج ماتا پا
کے آگے تمہاری آخری رسم ادا کی جا رہی ہے، کل تمہیں پوتر سرودر میں آخری اشنان
جائے گا اور پرسوں آدھی رات کے وقت میں خود ماتا پاروتی کے چرنوں میں تمہیں

ے ذبح کر کے تمہارے خون کا نذرانہ ماتا کو ارپن کروں گی۔''

اس کے بعد رانی نے مورتی کی طرف منہ اٹھا کر دیکھا اور دونوں بازو کھول کر چیخ
'' جے ہو پاروتی کی ... جے ہو درگا میا کی ...!''

میں پتھر کی سل پر لیٹا پتھر کی طرح ساکت و جامد ہو گیا تھا۔ میں کبھی سوچ بھی نہیں
تھا کہ رانی میرے ساتھ محبت نہیں بلکہ فریب کر رہی ہے اور محبت کا ناٹک کھیل رہی
ہے اور اب خود اپنے ہاتھوں مجھے ہلاک کرنے والی ہے۔ مجھے میری زندگی کا سب سے
صدمہ پہنچا تھا۔ لیکن میرا دل ایک دم بدل بھی گیا تھا۔ میں نے اپنے آپ سے کہا کہ
راز! تم نے ایک بت پرست عورت سے بیاہ کیا تھا۔ تم دین اسلام کے راستے سے
ٹ گئے تھے، تمہیں اسی کی سزا مل رہی ہے۔ یہ عورت کافر تھی اور اس نے تمہارے
اتھ وہی کیا جو کافر کیا کرتے ہیں۔

میں نے آنکھیں بند کر لیں اور خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگنے لگا۔ مگر لگتا تھا
شاید اب معافی کا وقت گزر چکا ہے اور میرے لئے توبہ کا درواز بند ہو گیا ہے۔ میں
ت کے اُس کنویں میں گر چکا تھا جہاں سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔

میری دردناک اور کفر کی موت کی آخری رسومات شروع ہو گئیں۔ رانی کی زبان
ے یہ سن کر کہ مجھے اس روز مورتی کے آگے قربان نہیں کیا جا رہا۔ میری تھوڑی سی تسلی
ور ہو گئی تھی۔ میری زندگی کے صرف دو دن باقی تھے۔ کوئی معجزہ ہی مجھے اُن درندہ
ت کافروں اور مورتی کی پوجا کرنے والے پجاریوں سے بچا سکتا تھا۔ میں پتھر کی
ل پر پڑا رہا۔ میرے ارد گرد ڈھول تاشے بجتے رہے، کالی عورتیں میرے جسم پر تیل کی
ش کرتی رہیں۔ رانی اس دوران تلوار ہاتھ میں لے کر میری طرف اس طرح بڑھتی
ے ابھی میری گردن تن سے جدا کر دے گی۔ لیکن قریب آ کر وہ تلوار کی نوک میری
ردن کے ساتھ لگاتی اور ایک چیخ مار کر واپس چلی جاتی۔ یہ ناٹک نہ جانے کتنی دیر تک
ئی رہا۔

پھر مجھے لے جا کر ایک تہہ خانے میں بند کر دیا گیا۔ دن اور رات کا فرق بالکل مٹ
تھا۔ کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ دن کا وقت ہے یا رات کا وقت ہے؟ پہاڑی ٹیلے
کے اس ویران منحوس مندر کے نیچے مجھے نیم روشن سرنگوں اور راہ داریوں میں اندر ہی

اندر گھمایا پھرایا جا رہا تھا۔ جب کافی وقت گزر جانے کے بعد مجھے ایک جانب سے نکالا گیا تو سفید روشنی دیکھ کر مجھے پتہ چلا کہ یہ دن کا وقت ہے۔ مجھے ایک ویران پہاڑیوں کے درمیان ایک تالاب پر لایا گیا۔ میرے دونوں پیروں میں زنجیریں تھیں۔ گردن میں بھی رسّی بندھی تھی جس کا سرا ایک ہٹے کٹے پجاری نے پکڑا ہوا ایک گن بردار پجاری پیچھے پیچھے تھا۔ رانی میرے بائیں جانب چل رہی تھی۔ اُس ہاتھ میں پوجا پاٹھ کی تھالی تھی جس میں کچھ پھول رکھے تھے اور لوبان سلگ رہا تھا کو اپنے اتنا قریب دیکھ کر میرے دل میں محبت کے جذبات کی بجائے نفرت کے بلند ہونے لگے تھے۔ جی چاہتا تھا کہ ایک دم اُسے دبوچ کر اُس کا گلا گھونٹ ڈالوں میری گردن بندھی ہوئی تھی، پاؤں میں زنجیر تھی اور گن بردار پجاری میرے پیچھے تھا۔

آدھ گھنٹے سے بھی زیادہ مجھے تالاب میں اشنان کرایا جاتا رہا، اس کے بعد جکڑی ہوئی حالت میں مجھے مندر کے زمین دوز تہہ خانے میں لا کر بند کر دیا گیا۔

OOO

موت مجھ سے صرف ایک دن دُور تھی۔

وہ رات اور دوسرا دن...... دوسرے دن کی رات اماوس کی رات تھی۔ اُس رات کو مجھے منحوس مورتی کے آگے لٹا کر انتہائی سفاکی سے میرے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کئے جانے والے تھے۔ میں خدا کے حضور سوائے گڑگڑا کر اپنے گناہوں کی معافی مانگنے اور زندگی کی دُعا مانگنے کے اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ میں تہہ خانے کے فرش پر سر جھکا کر بیٹھ گیا اور خدا سے دُعائیں مانگنے لگا۔ نوجوانی بلکہ نوخیزی کی عمر تھی۔ کبھی خدا کو یاد نہیں کیا تھا۔ اب موت کو سامنے دیکھا تو خدا یاد آ گیا۔ دُعا مانگتے مانگتے میرے آنسو بہنے لگے۔ میں سسکیاں بھر بھر کر رونے لگا۔ دیر تک میری یہی حالت رہی۔ تہہ خانے کے طاق میں صرف تیل کا ایک دیا جل رہا تھا جس کی روشنی پھیکی اور مدھم تھی۔ تہہ خانے میں کوئی روشندان نہیں تھا، صرف ایک تنگ سا دروازہ تھا جہاں سے مجھے اندر لایا گیا تھا۔ اس کے بعد دروازے کو بند کر کے باہر سے قفل لگا دیا گیا تھا، باہر ضرور پہرہ بھی لگا ہوا تھا۔

رونے سے میرے دل کا کافی غبار نکل گیا۔ موت تو مجھے آنی ہی تھی۔ اتنا ضرور ہوا کہ میں نے اپنے آپ کو مرنے کے لئے تیار کر لیا۔ پھر بھی جس وقت وہ منظر سامنے آتا کہ کس طرح میرے جسم پر خنجر اور تلواریں چلیں گی اور میرے خون کے چھینٹے اُڑیں گے تو خوف سے جسم سرد پڑ جاتا۔

وقت گزرتا جا رہا تھا، میں زندگی سے دُور اور موت کے قریب ہوتا جا رہا تھا۔ کسی وقت لگتا کہ رات گزر گئی ہے، کسی وقت لگتا کہ دن بھی گزر گیا ہے اور اماوس کی رات آ گئی ہے اور اب کسی وقت پجاری آئیں گے اور مجھے موت گھاٹ کی طرف لے جائیں گے۔ تہہ خانے میں موت کی خاموشی چھائی ہوئی تھی، مجھے میرے سانس کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ مجھے ایسے لگا جیسے کوئی آہٹ سی ہوئی ہے۔ میں نے چونک کر تہہ

خانے کے بند دروازے کی طرف دیکھا، یہ سوچ کر روح لرز اُٹھی کہ جلاد بیچاری
موت کے حوالے کرنے آ گئے ہیں۔ میں دیر تک بند دروازے کی طرف دیکھتا رہا
دروازہ نہ کھلا۔ شاید وہ میرا وہم تھا۔ یہ سوچ کر میں سر جھکا کر بیٹھا خدا کو یاد کرتا
وہی آواز پھر سنائی دی۔

میں کان لگا کر سننے لگا۔ یہ ایسی آواز تھی جیسے کوئی شے کھرچی جا رہی ہے۔
دیئے کی دھیمی روشنی میں آنکھیں پھاڑ کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ ذرا غور کیا تو ایسا
محسوس ہوا جیسے دیوار کی دوسری جانب کوئی دیوار کو کھرچ رہا ہے۔ میں سوچ ہی رہا
کہ دیواروں کے ساتھ کان لگا کر پتہ کروں کہ اچانک میرے ایک پاؤں کے نیچے
کچے فرش کی مٹی سرسرانے لگی۔

میں ڈر کر اُٹھا اور دیوار کے ساتھ لگ کر اُس جگہ کو دیکھنے لگا۔ شاید یہ کوئی سانپ
جس کا میرے پاؤں کے نیچے بل تھا اور وہ باہر نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میری نظر
فرش پر اُس جگہ جمی ہوئی تھیں جہاں میں تھوڑی دیر پہلے بیٹھا تھا۔ میں یہ دیکھ کر حیران
گیا کہ وہاں سے فرش ایک چوکھٹے کی شکل میں اُوپر کو اُٹھ رہا تھا......

خوف سے میری زبان خشک ہو گئی۔ ضرور یہ کوئی جن بھوت یا چڑیل ہو گی جو زمین
کے اندر سے نکل رہی ہے...... میرے دیکھتے دیکھتے فرش کا چھوٹا سا چوکھٹا اُوپر سے ہٹ
گیا اور ایک عورت کا سر زمین کے اندر سے نمودار ہوا...... میرا دل زور زور سے دھڑک
رہا تھا۔ دیئے کی روشنی میں، میں نے دیکھا کہ عورت کا آدھا دھڑ باہر آ گیا اور اُس نے
ایک ہاتھ میری طرف بڑھا کر سرگوشی میں کہا۔

''مجھے باہر نکالو!''

یہ دیکھ کر میں حیران رہ گیا کہ وہ کانچی تھی۔ وہی گہرے سانولے چہرے اور
آنکھوں والی کانچی جو میرے لئے دوسرے تہہ خانے میں کھانا لایا کرتی تھی اور جس نے
مجھے کہا تھا کہ یہاں سے جان بچا کر بھاگ جاؤ۔ اور مجھے اُس کی بات کا یقین نہیں
تھا۔ میں نے جلدی سے کانچی کا ہاتھ پکڑ کر اُسے باہر نکالا۔ باہر نکلتے ہی اُس نے
آواز میں کہا۔

''آواز مت نکالنا...... یہاں بیٹھ جاؤ!''

میں وہیں بیٹھ گیا۔ کانچی دبے پاؤں تہہ خانے کے دروازے پر گئی۔ کان لگا کر کچھ
سننے کی کوشش کرتی رہی۔ پھر دبے پاؤں میرے پاس آ کر میرے کان کے پاس منہ لا کر
بولی۔ ''میرے پیچھے پیچھے آ جاؤ......!''

یہ کہہ کر وہ فرش کے چوکور سوراخ میں سے نیچے اُتر گئی۔ میرے لئے اُس وقت وہ
رحمت کا فرشتہ بن کر آئی تھی۔ میں جلدی سے سوراخ میں اُتر گیا۔ میرے پاؤں زمین پر
لگے تو مجھے محسوس ہوا کہ یہ کوئی سرنگ ہے اور زمین مجھ سے تین چار فٹ نیچے تھی۔ کانچی
نے میرا بازو پکڑ کر کہا۔

''ڈرنا نہیں...... آ جاؤ!''

سرنگ تاریک تھی۔ کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ فضا میں گرمی اور حبس تھا۔ میں نے کانچی
کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور اُس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ وہ کبھی تیز ہو جاتی اور کبھی
رُک رُک کر احتیاط سے چلنے لگتی۔ میں بھی ایسے ہی کرتا۔ سرنگ میں اس قدر حبس تھا کہ
میرا دم گھٹنے لگا تھا۔ مگر میں موت کے منہ سے نکل رہا تھا۔ موت کے آگے سرنگ کے حبس
کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ سرنگ کبھی نیچے اُترنے لگتی، کبھی اُوپر کو چڑھتی جاتی، کبھی ہموار ہو
جاتی۔ سرنگ میں کئی موڑ آئے۔ آخر ایک جگہ پہنچ کر مجھے تازہ ہوا کا جھونکا محسوس ہوا۔
میری جان میں جان آ گئی۔

کانچی رُک گئی اور میری طرف منہ کر کے بولی۔

''ہم باہر نکلنے والے ہیں۔ تمہیں میں جیسے کہوں ویسے ہی کرنا۔''

میں نے کہا۔ ''ویسے ہی کروں گا۔''

مجھے سرنگ کا دہانہ نظر آ رہا تھا جہاں ستاروں کی پھیکی پھیکی روشنی تھی۔ کانچی سرنگ کے
دہانے کے پاس جا کر رُکی، سر باہر نکال کر دائیں بائیں دیکھا اور اُلٹے پاؤں واپس آ کر
کہنے لگی۔

''آ جاؤ...... خبردار! باہر نکل کر کوئی بات نہ کرنا! اور جتنی تیز چل سکتے ہو میرے
ساتھ چلنا۔''

وہ سرنگ کے دہانے کی طرف چلی تو میں بھی اُس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ یہ سرنگ
ایک بہت بڑے کھنڈر کی دیوار کے قریب نکلتی تھی۔ آگے اُونچی جھاڑیاں اور درخت

تھے۔ سرنگ سے نکلتے ہی کانچی ایک طرف دوڑ پڑی۔ میں بھی اُس کے پیچھے دوڑا۔ جھاڑیوں کے درمیان ہم جھک کر دوڑ رہے تھے۔ گھاس اور جھاڑیوں کا میدان ختم ہوا زمین کی ڈھلان آ گئی۔ ستاروں کی روشنی میں جھاڑیاں، درخت وغیرہ دھندلے دھندلے نظر آ رہے تھے۔ ڈھلان اُترنے کے بعد کانچی بائیں جانب مُڑ گئی۔ اب ہم دوڑ نہیں رہے تھے، تیز تیز چل رہے تھے۔ بائیں جانب ایک اُونچے ٹیلے کی ڈھلان جہاں جھاڑیاں ہی جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔ کانچی مجھے لے کر ایک گھنی اور پھیلی ہوئی جھاڑی کے اندر گھس گئی۔ یہاں ٹیلے کی ڈھلان میں پتھروں کے درمیان ایک راستہ ٹیلے کے اندر جاتا تھا۔ اُس کا منہ تنگ تھا۔ کانچی اور اُس کے بعد میں ٹیڑھے ہو کر پتھروں میں سے گزر گئے۔ آگے گھپ اندھیرا تھا۔ کانچی نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور بولی۔

"گھبرانا نہیں...... آگے سرنگ تنگ نہیں ہے۔"

کوئی پچاس ساٹھ قدم چلتے رہنے کے بعد اندھیرے میں مجھے کشادگی کا احساس ہوا اور تھوڑی تازہ ہوا بھی آئی۔ چند قدم مزید چلے تو ایک تھوڑی سی کھلی جگہ تھی۔ اندھیرے میں ہم ایک دوسرے کو دیکھ سکتے تھے۔ کانچی نے مجھے ایک جگہ بٹھا دیا اور کہنے لگی۔

"اس سے زیادہ میں تمہارے پاس نہیں ٹھہر سکتی۔ تم یہاں سے ہرگز باہر مت نکلنا میں صبح آؤں گی۔"

اور وہ میرے جواب کا انتظار کئے بغیر جدھر سے آئی تھی اُدھر کو چل دی۔ پہلے اندھیرے میں مجھے کچھ بھی نظر نہ آیا، پھر جیسے جیسے میری آنکھیں اندھیرے کی عادی ہو گئیں مجھے دیواروں کے پتھر اور اُونچی چھت دکھائی دینے لگی۔

میں ساری رات اُس اندھیری گپھاہ میں بیٹھا رہا۔ میں خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے نہیں تھکتا تھا کہ اُس نے میری دُعائیں قبول فرما لیں اور مجھے موت کے منہ سے نکال دیا۔ لیکن خطرہ اب بھی میرے سر پر منڈلا رہا تھا۔ میں رانی اور اُس کے جلاد پجاریوں سے زیادہ دُور نہیں ہوا تھا۔ رانی کو جب پتہ چلے گا کہ اُس کے ہاتھ آیا ہوا شکار ہاتھ سے نکل گیا ہے تو وہ میری تلاش میں زمین آسمان ایک کر ڈالے گی، جنگل کا کونہ کونہ چھان مارے گی، میری موت میں اُس کی زندگی اور موت کے بعد کی نجات تھی۔ کم از کم اُس کا عقیدہ یہی تھا اور وہ ایسا ہی سمجھتی تھی۔

ٹیلے کی تاریک گپھاہ میں وقت کا تو کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا۔ اندازے سے میں وقت گزار رہا تھا۔ مجھے نیند بھی نہیں آ رہی تھی۔ موت ابھی تک میرے سر پر کھڑی تھی، مجھے کیسے نیند آ سکتی تھی؟ اگرچہ کانچی مجھے موت کے پھندے میں سے چھڑا کر لے آئی تھی لیکن مجھے معلوم تھا کہ رانی اور اُس کے پجاری جلاد مجھے تلاش کرتے کرتے اس گپھاہ میں پہنچ سکتے ہیں۔ وہ اس علاقے کی ساری خفیہ جگہوں سے واقف ہوں گے۔ مجھ پر ایک اضطراب اور بے چینی کی کیفیت طاری تھی۔ کبھی اُٹھ کر بے چینی سے ٹہلنے لگتا، کبھی بیٹھ جاتا۔ ہر لمحے ایسا لگتا کہ لوگ مجھے تلاش کرتے کرتے ٹیلے تک پہنچ گئے ہیں۔ اسی عالم میں کافی وقت گزر گیا۔

کانچی ابھی تک نہیں آئی تھی۔ شاید باہر ابھی دن نہیں نکلا تھا۔ اُس نے صبح آنے کو کہا تھا۔ گپھاہ سے باہر جا کر دیکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں دیوار سے لگ کر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ ایک بار موت کے اس مندر کی حدود سے خیریت کے ساتھ نکل گیا تو جو بھی ریلوے سٹیشن دکھائی دیا وہاں سے ٹرین میں بیٹھ کر سیدھا دِلّی اور وہاں سے اپنے شہر امرتسر پہنچ جاؤں گا اور دوبارہ اس طرف آنے کا کبھی نام بھی نہیں لوں گا۔ میں انہی خیالوں میں گم سر جھکائے بیٹھا تھا کہ اچانک مجھے ایک چکر سا آیا اور میری آنکھوں کے آگے ایک لمحے کے لئے ستارے سے چمکے اور غائب ہو گئے۔

میں گھبرا کر اُٹھ کھڑا ہوا اور ٹہلنے لگا۔ چکر دوبارہ نہیں آیا۔ میں یہی سمجھا کہ یہ میری ذہنی پریشانی اور جن حالات میں سے میں گزر رہا ہوں اس کے دباؤ کی وجہ سے ہوا ہے۔ میں بیٹھ گیا اور فرار کے بعد اپنے اگلے پروگرام پر غور و فکر کرنے لگا۔ میرے پاس ٹرین کا ٹکٹ خریدنے کے لئے کوئی پیسہ نہیں تھا...... کوئی بات نہیں...... میں نے سوچا۔ میں بغیر ٹکٹ سفر کر لوں گا۔

اچانک مجھے اپنے کندھوں پر بوجھ سا محسوس ہوا...... اس کے بعد مجھے نہیں پتہ مجھے کیا ہوا کہ میں اُٹھا اور گپھاہ کے دروازے میں سے گزر کر سرنگ میں آیا اور اُس طرف چل پڑا جس طرف سرنگ کا دہانہ تھا۔ جیسے جیسے میں دہانے کے قریب ہو رہا تھا سرنگ میں مدھم مدھم نیلی روشنی کا غبار سا اُڑنا شروع ہو گیا تھا۔ مجھے اتنا ضرور پتہ تھا کہ میں چل رہا ہوں۔ کہاں جا رہا ہوں؟ کیوں جا رہا ہوں؟ اس کی کچھ خبر نہیں تھی۔ ایسے لگ رہا تھا کہ

کوئی مجھے چلا رہا ہے اور میں چلتا جا رہا ہوں۔

یقیناً میں شعور کی حس سے محروم ہو چکا تھا۔ ورنہ ان حالات میں جبکہ چاروں طرف میری موت کے شکاری میری تلاش میں تھے میں سرنگ سے باہر نکلنے کی کبھی جرأت نہ کرتا۔ سرنگ سے باہر صبح کی ہلکی ہلکی سفیدی پھیلنا شروع ہو گئی تھی۔ سرنگ سے نکلنے کے بعد میرا رُخ اپنے آپ اُس مندر کی طرف ہو گیا جہاں مجھے آج قربان کیا جانا تھا۔ میں غیر شعوری طور پر ایک ایسی سنگین غلطی کا ارتکاب کر رہا تھا کہ اگر اپنی شعوری حالت میں ہوتا تو اس کے تصور ہی سے کانپ اُٹھتا۔ یہ بالکل ایسی ہی بات تھی جیسے کوئی بکرا قصائی کی چھری کے نیچے سے نکل بھاگنے کے بعد واپس قصائی کے پاس جا رہا ہو۔ مگر مجھے تو اس کا شعور ہی نہیں تھا کہ میں کیا کر رہا ہوں؟ کس طرف جا رہا ہوں اور کیوں جا رہا ہوں؟ بس کوئی احساس تھا تو صرف اتنا کہ کوئی مجھے لئے جا رہا ہے اور میں چلا جا رہا ہوں۔

اچانک کوئی انسان جھاڑیوں میں سے اُچھل کر میرے اُوپر گرا اور اُس نے مجھے اپنے ساتھ گرا لیا۔ میں نے ہڑبڑا کر دیکھا کہ وہ کانچی تھی۔

''یہ تم کیا کر رہے ہو...... کس طرف جا رہے ہو؟''

اُس نے میرا بازو مضبوطی سے پکڑ لیا اور خود دوڑتی اور اپنے ساتھ مجھے بھی دوڑاتی ہوئی ٹیلے کے غار کے اندر لے آئی۔ اُس کا سانس پھول رہا تھا۔ میرا سانس بھی تیز چل رہا تھا۔ اُس وقت میرا شعور پوری طرح جاگ چکا تھا۔ اور جب اُس نے غار گپھاہ میں لا کر مجھے بتایا کہ میں درندہ صفت جلاد پجاریوں کے مندر کی طرف جا رہا تھا تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں ایک ایسے حواس باختہ آدمی کی طرح کانچی کو دیکھ رہا تھا جس کے اُوپر کیا ہوا جادو ٹونہ اچانک ختم ہو گیا ہو۔

میں نے کہا۔ ''کانچی! مجھے کچھ معلوم نہیں کہ میں یہاں سے نکل کر خونی مندر کی طرف کیوں چل پڑا تھا؟ ہاں، اتنا یاد ہے کہ یہاں اندھیری گپھاہ میں بیٹھے بیٹھے ایک چکر ضرور آیا تھا، میری آنکھوں کے آگے تارے ناچنے لگے تھے اور پھر مجھے کچھ نہیں کہ میں کیوں گپھاہ سے باہر نکل کر مندر کی طرف روانہ ہو گیا تھا......''

کانچی اپنی گلابی آنکھوں سے خاموش میرے پاس بیٹھی میری طرف دیکھ رہی تھی۔ گپھاہ میں اب اتنی تاریکی نہیں رہی تھی۔ باہر دن نکل آنے کے بعد چھت کی کسی دراڑ

سے سورج کی روشنی اندر آنے لگی تھی۔ کانچی نے ایک سانس بھرا اور بولی۔

''مگر میں جانتی ہوں کہ تمہارے ساتھ ایسا کیوں ہوا؟ مجھے معلوم تھا کہ تم رانی کے پھندے سے فرار ہو چکے ہو اور اب تمہارے ساتھ ایسا ضرور ہو گا۔ اسی لئے میں نے تمہیں کہا تھا کہ میں صبح صبح آ جاؤں گی۔ جبکہ میرا دن کے وقت مندر کے تہہ خانوں سے نکلنا ناممکن تھا۔ خاص طور پر ان حالات میں کہ جب رانی اور ماتا پاروتی کا شکار، اُس کی بھینٹ، پنجرے سے نکل کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اور آخر وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ بھگوان کا شکر ہے کہ میں عین وقت پر پہنچ گئی۔ ورنہ تمہارے موت کے اندھے کنوئیں میں گرنے میں کوئی کسر باقی نہیں رہ گئی تھی۔''

میں نے تعجب سے پوچھا۔ ''میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا...... آخر تمہیں کیسے معلوم تھا کہ میرے ساتھ ایسا ہونے والا ہے؟''

کانچی کی کمر کے ساتھ ایک تھیلی بندھی ہوئی تھی۔ اُس نے میرے سوال کا جواب دینے کی بجائے تھیلی کمر سے کھولی اور اُس کے اندر سے تھوڑی سی مٹھائی اور بھنے ہوئے چنے نکال کر مجھے کھانے کو دیئے۔ کہنے لگی۔

''تم یہ کھاؤ! میں تمہارے لئے پانی لے کر آتی ہوں۔ اور خبردار! میرے واپس آنے تک یہاں سے ہرگز مت ہلنا۔ ویسے میں زیادہ دُور نہیں جاؤں گی۔ ندی پاس ہی بہتی ہے، میری نظر غار کے دہانے پر لگی رہے گی۔''

وہ چلی گئی تو میں چنے کھانے لگا۔ بھوک کافی لگ رہی تھی۔ مجھے یہ ایک الگ پریشانی لگ گئی تھی کہ آخر میرے ساتھ ایسا کیوں ہوا کہ ایک چکر آیا اور میں بغیر سوچے سمجھے پھانسی کے پھندے کی طرف چل پڑا؟ ایسا پہلے میرے ساتھ کبھی نہیں ہوا تھا۔

کانچی مٹی کے ایک پیالے میں پانی لے کر آ گئی۔ میرے سامنے بیٹھ کر اُس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور بولی۔

''اب میں تمہیں بتاتی ہوں کہ تمہارے ساتھ ایسا کیوں ہوا۔ مجھے یاد کر کے بتاؤ! کہ جب سے رانی تمہارے ساتھ ہے اُس نے اپنے ہاتھ سے کبھی تمہیں کوئی میٹھی شے کھلائی ہے؟ اچھی طرح سے یاد کر کے بتاؤ!''

مجھے فوراً یاد آ گیا کہ رانی جب مجھ سے ملنے امرتسر میرے شہر آئی تھی تو مجھے اپنے

ساتھ امرتسر کے سیتلا مندر میں لے گئی تھی۔ میں باہر رہا تھا اور وہ اندر پوجا کرنے
گئی تھی۔ جب واپس آئی تھی تو اُس کے ہاتھ میں ایک تھالی تھی جس میں گیندے کے
پھول اور ایک پیڑا تھا۔ اُس نے مجھے یہ کہہ کر وہ پیڑا زبردستی کھلا دیا تھا کہ یہ شرادھ
پیڑا ہے۔ انکار نہ کرنا! اس سے تمہارے جسم کی ساری کمزوریاں دُور ہو جائیں گی۔
میں نے وہ پیڑا کھا لیا تھا اور اُس کے کھانے کے تھوڑی ہی دیر بعد مجھے اسی قسم کا
چکر آیا تھا۔ جب میں نے یہ سارا واقعہ کانچی کو بتایا تو وہ بولی۔

''اب میرے دل میں کوئی شک نہیں رہا کہ یہ سب کچھ رانی کے ہاتھوں شرادھ
پیڑا کھانے کی وجہ سے ہوا ہے۔ اور رانی نے اس پر جادو ٹونہ کیا ہوا تھا۔''

میرے منہ سے اپنے آپ نکل گیا۔

''لیکن اُس نے ایسا کیوں کیا؟''

کانچی کہنے لگی۔ ''تا کہ اگر تم اُس کے پھندے سے نکل کر بھاگ جاؤ تو پھر ا
آپ اُس کے پاس واپس بھی آ جاؤ۔''

''میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔'' میں نے کانچی سے کہا۔ ''یہ بات تو میری سمجھ م
گئی ہے کہ رانی نے مجھے اپنی جھوٹی محبت کے جال میں کیوں پھنسایا ہے؟ یہ بات ا
نے خود کھول کر مجھے اُس وقت بتا دی تھی جب میں رسیوں میں جکڑا مورتی کے آ
قربان گاہ کی سل پر بے بسی کی حالت میں پڑا موت کا انتظار کر رہا تھا۔ لیکن وہاں
بھاگنے کے بعد میں اپنے آپ کیوں اپنی قتل گاہ کی طرف چل پڑا اور کیسے چل پڑا!
بات میری سمجھ میں نہیں آ سکی۔ کیا یہ اُس پیڑے کا اثر تھا جو مجھے رانی نے کھلایا تھا؟''

''ہاں......!'' کانچی بولی۔ ''اُس پر رانی نے ایک خاص گپت جادو کیا ہوا تھا۔''

میں نے کہا۔ ''لیکن جب میں رانی کے پاس تھا اُس وقت اُس جادو کا مجھ پ
کیوں نہیں ہوا؟''

کانچی نے کہا۔ ''اس لئے کہ اُس وقت تم رانی کے قبضے میں تھے۔ اس جادو کا
اُس وقت شروع ہونا تھا جب تم رانی کے قبضے سے نکل کر فرار ہو جاتے۔''

''اس کا مطلب ہے میں اب بھی رانی کے کھلائے ہوئے شرادھ کے جادو کے
میں ہوں اور کسی بھی وقت مجھے چکر آ سکتا ہے اور میں اپنا آپ بھول کر جہاں رانی؟

اس طرف چل پڑوں گا۔''

اس کے جواب میں کانچی کہنے لگی۔ ''ہاں...... بالکل ایسا ہی ہے۔ اس ٹونے کا ایک
خاص چکر ہے۔ جب وہ چکر پورا ہو جائے گا تو تم جہاں کہیں بھی ہو گے اچانک تمہارا سر
چکرائے گا اور تم اپنا آپ بھول جاؤ گے اور جس طرح آدمی نیند میں چلتا ہے، اُسی طرح
چلتے ہوئے جہاں رانی ہو گی وہاں پہنچ جاؤ گے اور یوں بھاگے ہوئے شکار کی طرح اپنے
آپ پنجرے میں واپس چلے جاؤ گے۔''

مجھے پسینہ آ گیا۔ ''کانچی! یہ تو بہت برا ہوا۔ میں نے تو سوچا تھا کہ تم مجھے موت کے
پھندے سے بچا کر لے آئی ہو تو اب میں اپنے شہر چلا جاؤں گا اور اپنے گھر والوں کے
ساتھ چین سکون کی زندگی بسر کروں گا اور کبھی بھول کر بھی ان جنگلوں اور خونی مندروں
کا رُخ نہیں کروں گا۔ لیکن مجھے تو لگ رہا ہے کہ موت میرے پیچھے لگ گئی ہے اور کسی
بھی وقت خونی رانی مجھے قابو کر سکتی ہے۔''

''ابھی تک تو ایسا ہی ہے۔'' کانچی بولی۔

میں نے کہا۔ ''کانچی! تم میری ہمدرد ہو، دوست ہو اور اس قسم کے جادو ٹونوں سے
واقف ہو۔ کیا رانی کے ٹونے کا کوئی توڑ نہیں ہے؟''

کانچی کہنے لگی۔ ''کوئی نہ کوئی توڑ ضرور نکل آئے گا۔ لیکن ابھی یہ سوچنے کا وقت نہیں
ہے۔ پہلے تمہیں یہاں سے نکال کر کسی محفوظ جگہ پر پہنچا دوں، پھر اس جادو ٹونے کا کوئی
توڑ بھی سوچ لیں گے۔''

میں نے فکر مند ہو کر کہا۔ ''لیکن تم ہر وقت تو میرے پاس نہیں رہو گی۔ جب تم
میرے پاس نہ ہوئیں اور مجھ پر شرادھ کے ٹونے کا اثر شروع ہو گیا تو میں تو بے موت
مارا جاؤں گا۔''

کانچی نے کہا۔ ''جب تک میں تمہیں یہاں سے نکال نہیں لیتی اور رانی کے ٹونے کا
کوئی توڑ نہیں سوچ لیتی، میں تمہیں نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دوں گی، تمہارے
ساتھ رہوں گی۔''

میں نے احسان مند نظروں سے اُسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''کانچی! تم نے مجھ پر اتنا بڑا احسان کیا ہے کہ سوچتا ہوں شاید میں زندگی میں اس کا

بدلہ نہ اُتار سکوں گا۔''

کانچی نے میرا ہاتھ چوم لیا اور بولی۔ ''ایسی بات پھر کبھی نہ کہنا۔ میں نے تم
احسان نہیں کیا۔ جو کچھ کیا ہے اور کر رہی ہوں، اپنی خوشی اور تمہاری محبت کی خاطر
ہوں۔''

محبت کا لفظ کانچی نے پہلی بار اپنی زبان سے نکالا تھا۔ اُس کی محبت کا احسا
اُسی رات ہو گیا تھا جب اُس نے میرا ہاتھ تھام کر بڑی دردمندی سے کہا تھا۔

''یہاں سے جان بچا کر بھاگ جاؤ!''

لیکن یہ توقع نہیں تھی کہ وہ مجھ سے اپنی محبت کا اظہار اتنی جلدی اور اتنی بے با
کر دے گی۔ میں اُس کی محبت کا جواب محبت سے دے کر اُس کی حوصلہ افزائی نہ
چاہتا تھا کیونکہ مجھے اُس سے ویسی محبت نہیں تھی جیسی وہ مجھ سے کرنے لگی تھی۔ م
کی ہمدردی اور دوستی کا بے حد احترام کرتا تھا، اُس کی محبت کی دل سے قدر کرتا
ہمیشہ اُس کا دوست بن کر اُسے یاد رکھنا چاہتا تھا لیکن محبوب بن کر نہیں۔ ویسے بھ
سے محبت کر کے میں گہری چوٹ کھا چکا تھا اور اب محبت کرتے ہوئے ڈرتا تھا۔

میں نے جواب دیا۔ ''میں تمہاری محبت کی دل سے قدر کرتا ہوں کانچی!''

اُس نے بڑی بے نیازی سے کہا۔ ''مجھے اِس کی پرواہ نہیں ہے کہ تم میری مح
قدر کرتے ہو یا نہیں۔ اور یہ وقت محبت کی باتیں کرنے کا نہیں ہے۔ موت تمہار
میرے، ہم دونوں کے سامنے کھڑی ہے۔ ابھی تمہیں یہاں سے نکال کر کسی محفوظ
پہنچانا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''لیکن میں تو چاہتا ہوں کہ یہاں سے نکلتے ہی واپس اپ
جاؤں۔''

کانچی کہنے لگی۔ ''تم بھول گئے ہو کہ تم پر رانی کے شرادھ کے جادوٹونے کا اثر
ہے۔ تم جہاں بھی جاؤ گے اس جادو کے اثر سے اپنے آپ رانی کے پاس واپ
گے۔ پہلے مجھے تمہارے سر پر سے اس جادوٹونے کا اثر زائل کرنا ہے تاکہ تم اُ
رانی کے ہتھکنڈوں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے آزاد ہو جاؤ۔''

''رانی کے جادو کا توڑ ہو جائے گا ناں؟'' میں نے تشویش کے ساتھ پوچھا۔

کانچی بولی۔ ''اس کا ایک توڑ ہے۔ مگر سب سے پہلے تمہیں یہاں سے نکلنا ہے۔ یہ
باتیں بعد میں سوچنے کی ہیں۔ اب میں جاتی ہوں۔ رات کو کسی وقت آنے کی کوشش
کروں گی۔''

میں نے پوچھا۔ ''مجھے کب تک یہاں رہنا ہو گا کانچی؟ اس اندھیری کوٹھڑی سے
مجھے خوف آنے لگا ہے۔ اور پھر کچھ پتہ نہیں رانی کے جادوٹونے کے اثر سے کب مجھے
اچانک چکر آ جائے اور میں یہاں سے نکل کر مندر کی طرف چل پڑوں۔''

کانچی نے جواب دیا۔ ''میرا خیال ہے ٹونے کا چکر بارہ گھنٹے کے بعد پورا ہوتا ہے۔
اُس وقت رات ہو گی اور میں تمہارے پاس موجود ہوں گی۔ تم گھبراؤ مت...... تمہیں
معلوم نہیں تمہارے بھاگ جانے سے پیچھے ایک طوفان مچا ہوا ہے۔ اگرچہ رانی کو یقین
ہے کہ اُس نے تم پر جوٹونا کیا ہوا ہے اس کا اثر تمہیں اُس کے پاس واپس لے آئے گا،
لیکن بارہ گھنٹے گزر جانے کے بعد تم اُس کے پاس نہیں آئے اس لئے وہ تمہیں پکڑنے
کے لئے کوئی اور اُپائے کرے گی۔ اُس کے سارے پجاری اور جلاد تمہاری تلاش میں
آس پاس کے جنگل میں چاروں طرف پھیل گئے ہیں۔ خطرہ ہے کہ کہیں وہ تمہیں تلاش
کرتے کرتے اس گپھا میں بھی نہ آ جائیں۔''

''پھر میں کیا کروں؟'' میں نے بے چین ہو کر پوچھا۔

کانچی نے کہا۔ ''میں اسی کوشش میں ہوں کہ تمہیں آج رات کو ہی یہاں سے نکال کر
لے جاؤں۔ اچھا! اب میں جاتی ہوں۔''

کانچی کے جانے کے بعد میں ایک بار پھر اکیلا رہ گیا اور سوچنے لگا کہ ایک ویران
مندر کی پراسرار عورت کی اداؤں کے جال میں پھنس کر میں کتنی بڑی مصیبت میں پھنس
گیا ہوں۔ نہ اُس سے بھاگ سکتا ہوں اور نہ اُس کے پاس رہ سکتا ہوں۔ وہ میرے
خون کی پیاسی ہے اور اپنی اور اپنے ماتا پتا کی نجات کے واسطے مجھے پاروتی کی مورتی پر
قربان کرنا چاہتی ہے۔ زندگی کی سب سے بڑی غلطی یہ کی کہ ایک اجنبی عورت کے
فریب میں آ گیا، دوسری حماقت یہ کی کہ اُس عورت یعنی رانی کے ہاتھوں سے ایک مندر
کا شرادھ کھا لیا۔ مندر میں بتوں کی پوجا ہوتی تھی۔ مجھے اُس مندر کے شرادھ کا پیڑا نہیں
کھانا چاہئے تھا۔ رانی کے اُس پیڑے پر ٹونا کیا تھا جس کے کھانے سے مجھ پر اُس

کی محبت کا نشہ اور تیز ہو گیا اور میں اُس کے پھندے میں اُلجھتا چلا گیا یہاں تک
مکار عورت اپنا مطلب نکالنے کے لئے میری قربانی دینے کے لئے مجھے پاروتی کے
میں لے آئی۔ میری قسمت اچھی تھی کہ کانچی کو مجھ سے ہمدردی ہو گئی اور وہ مجھے
کے خونخوار جبڑوں سے نکال کر لے آئی۔

لیکن رانی کی قید سے آزاد ہوتے ہی، اُس کے پنجے سے آزاد ہوتے ہی مجھ پر
جادو ٹونے کا اثر ہونا شروع ہو گیا تھا جو رانی نے مندر کے شرادھ کا پیڑا کھلا کر مجھ پر
رکھا تھا۔ مجھے اِس کا تجربہ ہو چکا تھا۔ میں دیکھ چکا تھا کہ کس طرح مجھے اچانک ایک
آیا اور میں اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا اور خود بخود ٹیلے کی گپھاہ سے نکل کر اُس مند
طرف چلنے لگا جہاں رانی، اُس کے پجاری اور کالی کلوٹی جلاد عورتیں تلواریں، خنجر
چھریاں لئے مجھے دیوی کے آگے قربان کرنے کو تیار بیٹھی تھیں۔ اگر کانچی مجھے
واپس نہ لاتی تو میرا زندہ بچنا ناممکن تھا۔ کانچی نے کہا تھا کہ ہر بارہ گھنٹے کے بعد
رانی کے ٹونے کا حملہ ہو گا۔ مجھے ایک بار پھر ویسے ہی چکر آئے گا اور میں اپنے
حواس کھو کر جہاں میری قاتل اور خونی رانی ہو گی، اُس کی طرف چل پڑوں گا۔

یہ بڑی خوفناک بات تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ اگر میں اس جنگل سے بھاگ کر
گھر واپس بھی چلا جاتا ہوں تو بارہ گھنٹے کے بعد میں اپنے آپ اُٹھ کر کسی نہ کسی
خونی رانی کو تلاش کر کے اُس کے پاس پہنچ جاؤں گا اور یوں اپنے آپ کو موت
حوالے کر دوں گا۔ اِس عذاب سے بچنے کی صرف ایک ہی صورت باقی رہ گئی تھی کہ
مجھ پر کئے گئے جادو ٹونے کا کوئی توڑ کر دے اور اُس کے توڑ کا اثر بھی ظاہر ہو جائے

جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا میرے خوف میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ ہر گھڑی مجھے
لگ رہا تھا جیسے پہلے چکر کو آئے بارہ گھنٹے گزر گئے ہیں اور مجھے کسی بھی وقت ایک
چکر آئے گا اور میں اپنے ہوش و حواس کھو کر نیند میں چلنے والے آدمی کی طرح اپنی
موت کے منہ کی طرف چلنا شروع کر دوں گا۔ یہ بڑا رونگٹے کھڑے کر دینے
احساس تھا۔ کیونکہ مجھے تو پتہ ہی نہیں ہو گا کہ میں اپنی اذیت ناک موت کو گلے لگا
رہا ہوں۔

اچانک گپھاہ کے گھپ اندھیرے میں دھیمی روشنی کا پھیکا غبار سا اُڑنے لگا۔

چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ یہ روشنی گپھاہ کے تنگ و تاریک راستے میں سے
رہی تھی۔ روشنی آہستہ آہستہ صاف ہو رہی تھی۔ یہ کانچی تھی جو ایک ہاتھ میں موم بتی
لئے چلی آ رہی تھی۔ اُس کے آتے ہی میں نے بے تابی سے پوچھا۔

"ابھی بارہ گھنٹے تو نہیں گزرے نا؟"

کانچی نے موم بتی ایک طرف لگاتے ہوئے کہا۔

"نہیں...... ابھی نہیں گزرے۔ مگر تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں
تمہارے پاس ہوں۔ میں تمہیں ہوش میں واپس لے آؤں گی۔"

میں نے کہا۔ "مگر تم تو واپس چلی جاؤ گی۔"

وہ بولی۔ "میں تمہیں ساتھ لے کر جاؤں گی۔"

میں حیرانی کے ساتھ اُس کی طرف دیکھنے لگا۔ میں نے پوچھا۔

"ہم کہاں جائیں گے؟"

وہ اپنے ساتھ ایک چھوٹی سی گٹھڑی لائی تھی۔ اُسے کھولتے ہوئے بولی۔ "چلو گے تو
دوں گی۔ اس وقت یہاں سے جتنی دُور نکل سکیں گے نکل جائیں گے۔"

گٹھڑی میں سے ایک کرتہ اور ایک پاجامہ نکال کر اُس نے مجھے دیا اور کہا۔

"یہ گیروا چولا اُتار کر یہ کپڑے پہن لو!"

میں نے کرتہ اور پاجامہ پہن لیا۔ وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ "میرے ساتھ آ جاؤ!"

اُس نے موم بتی ہاتھ میں لی۔ اُس کی روشنی میں ہم نے گپھاہ والی غار کو جلدی طے
کر لیا۔ غار کے منہ کے پاس آ کر اُس نے موم بتی بجھا کر پھینک دی اور بولی۔

"میرے پیچھے پیچھے رہنا...... اور جب تک میں نہ بولوں تم نہ بولنا۔"

ہم ٹیلے کی ڈھلان کے ساتھ ساتھ چلتے دوسری طرف ایک اور ٹیلے کی چڑھائی
چڑھنے لگے۔ دوسرے ٹیلے کی چڑھائی چڑھنے کے بعد ہم دوسری طرف اُتر گئے۔ وہاں
ایک ندی بہہ رہی تھی۔ رات اگرچہ تاریک تھی مگر ستاروں کی دُھندلی دُھندلی روشنی پھیلی
ہوئی تھی۔ ہمیں جھاڑیاں اور درختوں کے درمیان سے جاتے راستے نظر آ رہے تھے۔

ایک پلیا پر سے گزر کر ہم نے ندی کو پار کیا۔ دوسری جانب ایک جنگل شروع ہو گیا۔
جنگل بڑا گھنا اور تاریک تھا۔ ہم کافی دیر تک جنگل میں چلتے رہے۔ جہاں جنگل ختم ہوا،

وہاں ایک بہت بڑا دریا بہہ رہا تھا۔

ایک جگہ دریا کے کنارے ایک کشتی پہلے سے کھڑی تھی۔ ہم کشتی کے پاس گئے تو
آدمی جھاڑیوں کے اندھیرے میں سے نکل کر سامنے آ گیا۔ اُس سے کانچی نے پوچھ

''ڈھڈیال...... سب ٹھیک ہے نا؟''

''ٹھیک ہے۔'' اُس نے جواب دیا۔

ہم کشتی میں بیٹھ گئے۔ وہ آدمی جس کو کانچی نے ڈھڈیال کے نام سے پکارا تھ
چلانے لگا اور کشتی کو کنارے سے نکال کر دریا کے دوسرے کنارے کی طرف لے جا
لگا۔ میں خاموش بیٹھا تھا۔ کانچی میرے پاس ہی بیٹھی تھی۔ گھنٹہ پون گھنٹہ دریا پار کر
لگ گیا۔ ہمیں پار اُتار کر ڈھڈیال کشتی لے کر واپس چلا گیا۔ دریا کے دوسرے کنا
جنگل کا سلسلہ دوبارہ شروع ہو گیا۔ کانچی نے مجھے اپنے ساتھ رکھا ہوا تھا۔ جنگل
کے اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ دُور درختوں میں ایک جگہ روشنی ٹمٹماتی نظر آئی۔

کانچی نے کہا۔ ''جہاں ہمیں پہنچنا تھا، ہم پہنچ گئے ہیں۔''

یہ روشنی ایک لالٹین کی تھی جو ایک بڑی جھونپڑی کے باہر بانس کے ساتھ لٹکی
تھی۔ یہاں درختوں کے درمیان تھوڑی سی کھلی جگہ تھی جہاں دو تین جھونپڑیاں
ساتھ بنی ہوئی تھیں۔ جس جھونپڑی کے باہر لالٹین جل رہی تھی کانچی نے مجھے اُس
باہر کھڑے ہونے کو کہا اور خود جھونپڑی کے اندر چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ باہر آئی
مجھے بھی اندر لے گئی۔ اندر جھونپڑی میں بھی ایک لالٹین روشن تھی۔ میں نے دیکھا
ایک جٹا دھاری گھنی داڑھی والا سادھو چٹائی پر آلتی پالتی مارے جیسے سادھی میں بیٹھا
تھا۔ اُس کی ایک جانب لکڑی کے تختے پر کچھ پوتھیاں (پرانی کتابیں) رکھی ہوئی تھیں
سادھو مجھے گھور کر دیکھنے لگا۔ اُس کی عمر یہی کوئی چالیس کے قریب ہو گی۔ کانچی مجھ
کر سادھو کے سامنے ادب سے بیٹھ گئی اور بولی۔

''شاستری جی! یہی وہ لڑکا ہے۔ اس پر رانی نے شرادھ کا پیڑا کھلا کر جادو کر دیا
ہے۔ باقی آپ انتریامی ہیں، سب کچھ جانتے ہیں۔''

سادھو میری طرف مسلسل گھور رہا تھا۔ اُس نے مجھ سے پوچھا۔

''تمہارا نام کیا ہے؟''

''شیراز۔'' میں نے جواب دیا۔

سادھو بولا۔ ''مسلمان ہو۔ مگر تمہارا ایمان مضبوط نہیں ہے اسی لئے تم پر رانی کے
نے کا اثر ہو گیا۔

پھر سادھو نے کانچی سے مخاطب ہو کر کہا۔

''تم لوگ جا کر آرام کرو! کل بات کریں گے۔''

''جو حکم مہاراج!'' کانچی نے سادھو کو ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا اور ہم جھونپڑی سے نکل
آئے۔

باہر آ کر میں نے کانچی سے کہا۔ ''مجھے تو نہیں لگتا کہ یہ سادھو رانی کے جادو کا توڑ کر
سکے گا۔''

کانچی بولی۔ ''تم شاستری جی کی شکتی کو نہیں جانتے۔ انہوں نے اتھروید کے سارے
منتروں کا گیان حاصل کیا ہوا ہے۔ یہ رانی کے جادو کو ختم کر دیں گے۔ تم آزما کر دیکھ
لینا۔''

کانچی مجھے ایک جھونپڑی میں لے آئی جہاں ایک چارپائی بچھی ہوئی تھی۔ کہنے لگی۔
''اب تم بے فکر ہو کر سو جاؤ! میں ساتھ والی جھونپڑی میں ہوں گی۔'' پھر اُس نے مجھ
سے کہا۔ ''تمہیں چکر تو نہیں آ رہے؟''

میں نے کہا۔ ''ابھی تک تو کوئی چکر نہیں آیا۔ مجھے تو لگتا ہے کہ رانی کے شرادھ کا
جادو ٹوٹ چکا ہے۔ اب مجھے صبح صبح یہاں سے نکل جانا چاہئے تاکہ کسی جگہ سے کوئی
سواری لے کر دلّی اور پھر دلّی سے اپنے شہر امرتسر پہنچ جاؤں۔''

''جب تک شاستری جی تم پر کئے گئے جادو کا توڑ نہیں کرتے تمہیں یہاں سے کہیں
نہیں جانا چاہئے۔ ویسے بھی تم اور تمہارے ساتھ میں بھی ابھی خطرے سے باہر نہیں
ہیں۔ رانی کے جلاد پجاری تمہاری اور میری تلاش میں یہاں بھی آ سکتے ہیں۔ اب تک
انہیں پتہ چل گیا ہو گا کہ میں تمہیں بھگا کر لے گئی ہوں۔ اگر ہم پکڑے گئے تو رانی
تمہیں تو پاروتی جی کے آگے قربان کرے گی ہی مگر مجھے بھی زندہ نہیں چھوڑے گی۔ اس
لئے ابھی یہاں سے کہیں جانے کا خیال دل سے نکال دو!''

کانچی دوسری جھونپڑی میں چلی گئی۔

میں بانس کی خالی چارپائی پر لیٹ گیا۔ بے حد تھکا ہوا تھا مگر ذہن پریشان
موت کا کھٹکا لگا ہوا تھا۔ آنکھیں نیند سے جل رہی تھیں مگر نیند نہیں آ رہی تھی۔ دماغ
ہر قسم کے پریشان کر دینے والے خیال آ رہے تھے۔

اچانک مجھے چکر آ گیا...... میں فوراً سمجھ گیا کہ یہ وہی رانی کے جادو والا چکر
میں جلدی سے اُٹھ بیٹھا۔ میں نے دل مضبوط رکھا۔ فیصلہ کر لیا کہ میں اپنی قوت ارا
سے جادو کا مقابلہ کروں گا۔ میری آنکھوں کے سامنے بے شمار ستارے گردش کر
لگے۔ مجھے ایک بار چکر آیا اور میں سب کچھ بھول گیا۔ صرف اتنا یاد رہا کہ مجھے رانی
پاس جانا ہے۔ اس بار ایسا ہوا کہ مجھے رانی کی آوازیں بھی آنے لگیں۔ یہ آوازیں
دُور سے آ رہی تھیں...... وہ مجھے میرا نام لے کر بلا رہی تھی۔

''شیراز! میرے پاس آؤ...... میں تم سے محبت کرتی ہوں...... میرے پاس آ جاؤ!''

میرا یہ شعور کہ میں کون ہوں اور کہاں سے آیا ہوں، بالکل ختم ہو گیا تھا۔ مجھے
بھی یاد نہیں آ رہی تھی۔ اُس کا وجود بھی میرے ذہن سے ختم ہو گیا تھا۔ میں رانی کے
کے اثر سے بے اختیار ہو کر چارپائی سے اُٹھا اور جھونپڑی سے باہر آ گیا۔

باہر اندھیری رات کا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ مجھے کچھ یاد نہیں تھا کہ دوسری جھونپڑی
کانچی موجود ہے۔ مجھے ایک بار پھر رانی کی آواز سنائی دی۔

''میرے پریتم پیارے! میرے پاس آ جاؤ...... میں کب سے تمہاری راہ دیکھ
ہوں۔''

اُس کی آواز نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

''رانی...... میری جان! میں آ رہا ہوں۔''

اور میں سامنے درختوں کے درمیان جو راستہ دریا کی طرف جاتا تھا اُس طرف
پڑا۔ کانچی نے میری آواز سن لی تھی۔ وہ اپنی جھونپڑی میں جاگ رہی تھی۔ وہ
آواز سنتے ہی تیزی سے باہر نکل آئی۔ مجھے اُس وقت پتہ چلا جب اُس نے پیچھے
کر مجھے اپنے بازوؤں میں جکڑ کر زور سے ہلایا اور کوئی اشلوک بولا اور کہا۔

''ہوش میں آؤ...... کیا کر رہے ہو؟''

اچانک مجھے جیسے ہوش آ گیا۔ میں نے گردن موڑ کر کانچی کو دیکھا اور کہا۔

''کانچی! مجھے پھر وہی چکر آ گیا تھا۔''

کانچی مجھ سے الگ ہو گئی اور مجھے بازو سے تھام کر بولی۔ ''بھگوان کا شکر ہے کہ تم
بول پڑے تھے۔ ورنہ جانے کیا ہو جاتا؟ چلو...... واپس چلو!''

وہ مجھے میری جھونپڑی میں لے آئی۔ اُس نے مجھے چارپائی پر بٹھا دیا، خود بھی
میرے پہلو میں بیٹھ گئی اور بولی۔ ''تم نے رانی کو آواز کیوں دی تھی؟''

میں نے کہا۔ ''اس دفعہ عجیب بات ہوئی ہے کانچی! اس دفعہ مجھے چکر آنے کے فوراً
بعد رانی کی آوازیں بھی آئی ہیں۔''

جھونپڑی میں دھیمی لو والی لالٹین جل رہی تھی۔ کانچی کی گلابی آنکھوں میں تشویش کی
جھلک تھی، کہنے لگی۔

''یہ بہت برا ہوا۔ ایسا نہیں ہونا چاہئے تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ رانی نے تم پر
پاتال منتر کا ٹونہ کیا ہوا ہے۔''

''وہ کیا ہوتا ہے...... اس سے کیا ہو گا؟'' میں نے گھبراہٹ میں پوچھا۔

کانچی بولی۔ ''تم اس کی فکر کیوں کرتے ہو؟ میں جو ہوں تمہارے ساتھ...... میں
تمہیں رانی کے ٹونے سے مکتی دلا کر ہی رہوں گی۔ تم آرام سے سو جاؤ! صبح شاستری جی
کو یہ بھی بتا دیں گے۔ وہ بڑے گیانی دھیانی گورو ہیں۔ اُن کے پاس سب جادو ٹونے کا
توڑ ہے۔''

کانچی نے مجھے چارپائی پر لٹا دیا اور مجھ پر جھکی تھوڑی دیر تک مجھے مسکراتے ہوئے
چہرے اور چمکیلی آنکھوں سے دیکھتی رہی۔ معلوم نہیں کیوں مجھے رانی کے مندر کی کالی جلاد
عورتیں یاد آ گئیں۔ پھر اُس نے میری پیشانی کو چوما اور بولی۔

''سو جاؤ!''

اور پھر وہ عجیب نگاہوں سے مجھے دیکھتی جھونپڑے سے نکل گئی۔ میں دل میں سوچنے
لگا کہ اگر خدا اس عورت کو میری مدد کے لئے نہ بھیجتا تو اس وقت تک میرے جسم کے
ٹکڑے اور ہڈیاں مٹی میں مل کر مٹی ہو چکی ہوتیں۔ میرا دل کانچی کے احسان کے
جذبات سے لبریز ہو گیا۔ میری نیند غائب ہو چکی تھی۔ دیر تک چارپائی پر لیٹا، لالٹین کی
دھیمی روشنی میں جھونپڑی کی چھت کے بانسوں کو تکتا اور خدا سے دل ہی دل میں دُعائیں

مانگتا رہا کہ یا اللہ پاک! مجھے اِس مصیبت سے نکال دے...... آئندہ میں ایسی غلطی نہ کروں گا۔

جھونپڑی کے باہر جنگل کی گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ کسی کسی وقت دُور سے کسی عجیب و غریب جانور کے بولنے کی آواز آ جاتی تھی۔ یہ ایسی المناک آواز تھی جیسے کوئی زخمی جانور درد سے گھبرا کر بلبلا رہا ہو۔ میرے دل پر خوف سا طاری ہو گیا۔ میں لیٹے لیٹے سمٹ کر اکٹھا ہو گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ پھر نہ جانے کس وقت میں سو گیا۔

مجھے کانچی نے آ کر اُٹھایا۔ کہنے لگی۔ ''اُٹھو! سویرا ہو گیا ہے۔ اُٹھ کر اشنان کر لو! شاستری جی کے پاس جانا ہے۔''

کانچی مجھ پر جھکی ہوئی تھی اور اُس کے بالوں کی ایک لٹ میرے ماتھے کو چھو رہی تھی۔ وہ پیچھے ہٹ گئی۔ جھونپڑیوں کے پیچھے درختوں میں گھرا ہوا ایک تالاب تھا۔ کانچی مجھے اُس تالاب پر لے گئی۔ کہنے لگی۔

''تم خود نہاؤ گے یا میں تمہیں اشنان کراؤں؟''

میں نے کہا۔ ''نہیں نہیں کانچی! میں خود ہی نہا لوں گا۔''

''ٹھیک ہے۔ پھر میں درختوں کے پیچھے چلی جاتی ہوں۔ اب میں اُس وقت تک تمہیں اپنی نظروں سے اوجھل نہیں کرنا چاہتی جب تک کہ شاستری جی تم پر کئے ہوئے رانی کے ٹونے کا توڑ نہیں کر لیتے۔''

وہ درختوں کے پیچھے چلی گئی اور میں تالاب کی سیڑھیوں میں کمر کمر تک پانی میں بیٹھ کر نہانے لگا۔ مجھے ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے کانچی کسی درخت کی اوٹ سے مجھے دیکھ رہی ہے۔ میں نے جلدی جلدی نہا کر کرتہ پاجامہ پہنا تو کانچی درختوں کے پیچھے سے نکل کر آ گئی۔ اُس کی جھونپڑی میں جا کر ہم نے بھنے ہوئے چنوں اور کچھ جنگلی پھلوں سے ناشتہ کیا۔ ناشتے سے فارغ ہوئے تو کانچی مجھے سادھو یعنی اپنے گورو شاستری کے پاس لے آئی۔

سادھو مہاراج اسی طرح اپنی جھونپڑی میں آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے۔ ہم ایک طرف ہو کر خاموشی سے بیٹھ گئے۔ کانچی نے مجھے ہدایت کر دی تھی کہ میں خاموش رہوں۔ سادھو آنکھیں بند کئے کل کی طرح گیان دھیان میں مشغول لگتے تھے۔ کچھ

دیر بعد انہوں نے آنکھیں کھول کر ہمیں دیکھا اور کہا۔

''کانچی! تمہارے اس مسلمان ساتھی پر پاتال منتر کا ٹونہ کیا گیا ہے۔''

کانچی ہاتھ جوڑ کر بولی۔ ''مہاراج! آپ انتریامی ہیں۔ دلوں کے بھید جانتے ہیں۔''

سادھو بولے۔ ''تم ہماری بالکی ہو۔ ہم تمہیں نراش نہیں کریں گے۔ ہم اس مسلمان لڑکے کا علاج ضرور کریں گے۔ ہمارے پاس رانی کے پاتال منتر کا توڑ موجود ہے۔''

کانچی کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ میں بھی دل میں خوش ہوا۔ کانچی بولی۔

''مہاراج! آپ مہاپُرش بھی ہیں اور دیوتاؤں کے اوتار بھی ہیں۔ آپ جو کہیں گے ہم ویسا ہی کریں گے۔''

سادھو میری طرف متوجہ ہو کر بولے۔

''تم مسلمان ہو۔ مسلمان پر کسی جادو ٹونے کا اثر نہیں ہوتا۔ تم پر بھی اثر نہیں ہونا چاہئے تھا۔ تم پر اس لئے اثر ہو گیا کہ تمہارا ایمان کمزور تھا۔ اگر تمہارا ایمان مضبوط ہوتا تو رانی کا باپ بھی تم پر جادو ٹونہ نہیں کر سکتا تھا۔''

کانچی نے کہا۔ ''شاستری جی! یہ بالک نادان ہے۔ اس سے غلطی ہو گئی۔ غلطی انسان سے ہو ہی جاتی ہے۔ اس کو شما (معاف) کر دیجئے۔''

سادھو مہاراج کے چہرے پر ہلکا سا تبسم آ گیا۔ کہنے لگے۔

''کانچی! ہم مسلمانوں کا علاج نہیں کیا کرتے۔ ہم مسلمانوں کو اچھا نہیں سمجھتے کیونکہ یہ ہماری مورتی پوجا کے خلاف ہیں۔ پرنتو (لیکن) یہ مسلمان بالک تمہارے ساتھ آیا ہے ہم اس کے ساتھ وہی سلوک کریں گے جو تمہارے ساتھ کیا کرتے ہیں۔''

اس کے بعد سادھو مہاراج چٹائی سے اُٹھ کر لکڑی کے تخت پر بیٹھ گئے اور پرانی پوتھیوں میں سے ایک پوتھی (پرانی کتاب) نکال کر اُس کے ورق اُلٹنے شروع کر دیئے۔ ہم چٹائی پر خاموش بیٹھے تھے۔ کانچی نے اپنا بازو میرے بازو کے ساتھ لگا کر میری طرف گوشہ چشم سے دیکھا اور مسکرا دی جیسے کہہ رہی ہو فکر نہ کرو! سب ٹھیک ہو جائے گا۔

اس دوران سادھو مہاراج نے پوتھی کے ایک ورق پر اپنی نظریں جمائی ہوئی تھیں اور بڑے غور سے دیکھ رہے تھے۔ اس کے بعد میری طرف دیکھ کر کہا۔

''مورکھ لڑکے! تم خوش قسمت ہو۔ تمہارے مسلمان ہونے نے تمہیں بچا لیا۔
رانی نے تم پر جو ٹونہ کیا ہے اس کے اثر سے کوئی دیوی دیوتا بھی نہیں بچ سکے۔ اگر
مسلمان نہ ہوتے تو اب تک رانی تمہیں پاروتی دیوی کے آگے قربان کر چکی ہوتی۔ لیکن
یاد رکھو! رانی تمہیں اتنی آسانی سے چھوڑے گی نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تم سارے
سنسار میں ایک ہی آدمی ہو جس کی جنم کنڈلی کے گرہ اپنے استھانوں کے اعتبار سے
کی جنم کنڈلی سے ملتے ہیں۔ اور صرف تمہاری قربانی دے کر ہی رانی خود موت کے
اپنے ایک لاکھ چوراسی ہزار لومڑی کے جنموں سے بچ سکتی ہے اور اپنے ماتا پتا
آتماؤں کو اُن کے پاپوں کی سزا سے نجات دلا سکتی ہے۔''

کانچی نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

''مہاراج! کسی طرح میرے اِس نادان دوست کو رانی کے پاتال منتر سے مکت کر
دیں۔ ہم ساری زندگی آپ کی سیوا کریں گے۔''

سادھو مہاراج نے کانچی سے کہا۔ ''کونے میں گنگا جل کی مٹکی پڑی ہے۔ اُس
سے پیالے میں دو گھونٹ پانی نکال کر لے آؤ!''

کانچی نے مٹکی میں سے گنگا جل پیالے میں ڈالا اور سادھو کے آگے لا کر رکھ دیا۔
سادھو نے ایک تھیلی کھولی، اُس میں سے ایک سفید موتی نکال کر پیالے میں ڈال دیا۔
کچھ اشلوک پڑھ کر پیالی کے منہ پر پھونکے۔ پھر کانچی سے کہا۔

''کانچی! اپنے دوست کو اِس پیالی میں سے گنگا جل کا ایک گھونٹ پلا دو!''

کانچی نے پیالہ اُٹھایا اور مجھ سے کہا۔ ''اس کا ایک گھونٹ پی لو!''

میرا جی تو نہیں مانتا تھا مگر رانی نے مجھ پر جادو ٹونہ کر کے مجھے جس مصیبت میں ڈال
دیا تھا اور جس کا تجربہ مجھے ہو چکا تھا، میں اس سے بھی چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا تھا۔ میں
نے آنکھیں بند کر کے پیالہ ہونٹوں کے ساتھ لگایا اور ایک گھونٹ پی لیا۔ پانی کا ذائقہ
تھوڑا سا کڑوا تھا مگر میں ہمت کر کے پی گیا۔

سادھو بولا۔ ''اس کا ایک گھونٹ آدھی رات کو اور ایک گھونٹ کل سویرے سورج نکلنے
کے ساتھ پی جانا۔ اس کے بعد تمہیں رانی کے جادو ٹونے سے ہمیشہ کے لئے مکتی مل
جائے گی۔ اب جاؤ! مجھے گیان دھیان کرنا ہے۔''

کانچی نے پیالہ مجھ سے لے لیا اور باہر نکلنے کا اشارہ کیا۔
جھونپڑے سے باہر آ کر کہنے لگی۔ ''تم خوش قسمت ہو کہ شاستری جی نے تمہیں رانی
کے خطرناک جادو ٹونے سے مکت کر دیا۔ کل صبح گنگا جل کا تیسرا گھونٹ پینے کے بعد تم
رانی کے ٹونے سے آزاد ہو جاؤ گے۔''

''کیا واقعی ایسا ہو جائے گا کانچی......؟'' میں نے پوچھا۔

''شاستری جی کا اُپائے کبھی خالی نہیں جاتا۔ تم خود دیکھ لو گے۔'' کانچی نے بڑے
اعتماد کے ساتھ کہا۔

وہ سارا دن میرے ساتھ رہی۔ رات کو بھی میری جھونپڑی میں ہی اپنی چارپائی لے
آئی۔ وہ مجھ سے پیار محبت کی باتیں کرنے لگی۔ میں اُس کی بالکل حوصلہ افزائی نہیں کر
رہا تھا کیونکہ مجھے اُس سے وہ محبت نہیں تھی جو وہ مجھ سے کر رہی تھی۔ وہ آسمان پر چمکتے
ستاروں کو دیکھ کر وقت کا اندازہ کر لیتی تھی۔ ایک بار ستاروں کو دیکھنے جھونپڑی سے باہر
گئی، واپس آ کر بولی۔

''آدھی رات گزر گئی ہے۔ تمہارے گنگا جل پینے کا وقت ہو گیا ہے۔''

اُس نے اپنے ہاتھ سے پیالے میں سے گنگا جل کا ایک گھونٹ پلایا۔ میں جی کڑا کر
کے پی گیا۔ باقی آدھی رات جاگتے اور کانچی کی پیار بھری باتیں سنتے گزر گئی۔

جب سورج نکلا تو کانچی نے مجھے گنگا جل کا تیسرا اور آخری گھونٹ بھی پلا دیا، پھر
مجھے اپنے ساتھ لگا لیا اور بولی۔

''اب رانی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی۔''

میں نے کہا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ اب میں اپنے گھر واپس جا سکتا ہوں۔''

کانچی کا منہ لٹک گیا۔ فوراً ہی سنبھل کر بولی۔ ''کیوں نہیں...... تم جب چاہو جا سکتے
ہو۔ پھر بھی میں چاہتی ہوں کہ کچھ دن تم میری نگرانی میں رہو تا کہ میری تسلی ہو جائے کہ
تم پر رانی کے ٹونے کا اثر ہمیشہ کے لئے ختم ہو چکا ہے۔''

اب میرا منہ لٹک گیا۔ میں اب وہاں رہنے کے لئے بالکل تیار نہیں تھا۔ جلدی سے
جلدی واپس اپنے گھر چلے جانا چاہتا تھا۔ پھر خیال آیا کہ ایک دو دن کانچی کے پاس رہ
کر دیکھ لینا چاہئے کہ رانی کا جادو ٹوٹا ہے یا نہیں؟

میں نے کانچی سے کہا۔ ''تم ٹھیک کہتی ہو...... مگر میں دو دن سے زیادہ نہیں ٹھہروں
گا۔ مجھے گھر کی بہت یاد آتی ہے۔''

کانچی بولی۔ ''جیسے تمہاری مرضی۔''

اُسی روز دوپہر کے بعد وہ مجھے ساتھ لے کر سادھو مہاراج کے مٹھ سے کسی دو
جگہ کے لئے روانہ ہوگئی۔ میں نے اُس سے کہا۔

''بہتر یہی تھا کہ ہم دو دن سادھو مہاراج کے پاس ہی گزار دیتے۔''

کانچی نے جواب دیا۔ ''تم نہیں جانتے، شاستری جی نے یہ کہہ کر کہ مجھے ا
دھیان کرنا ہے، یہ اشارہ دے دیا تھا کہ گنگا جل کا تیسرا گھونٹ پینے کے بعد ہم لوگ
یہاں سے کسی دوسری جگہ چلے جانا چاہئے۔''

میں نے پوچھا۔ ''اب ہم کہاں جا رہے ہیں؟ میرا مطلب ہے ہم یہ دو دن کہاں
کریں گے؟''

کانچی بولی۔ ''میں تمہیں ایک ایسی جگہ لے جا رہی ہوں جہاں خونی مندر کے
پجاری اور رانی کے جاسوس کبھی نہیں پہنچ سکیں گے۔''

ہم جس علاقے میں سے گزر رہے تھے وہاں بڑے بڑے پہاڑ نہیں تھے۔ چھو
چھوٹے ٹیلے تھے جن پر جنگلی جھاڑیاں اور سوکھی گھاس اُگی ہوئی تھی۔ ٹیلوں کے در
کہیں تنگ اور کہیں کھلا راستہ تھا۔ کانچی کہنے لگی۔

''میں تمہیں چھوٹے راستے سے لے جا رہی ہوں۔ ہم شام ہونے سے پہلے بھی
جی کے استھان پر پہنچ جائیں گے۔''

میں نے پوچھا۔ ''کیا یہ بھی کوئی مندر ہے؟''

کانچی نے کہا۔ ''نہیں...... یہ مندر نہیں ہے۔ یہ بھیروں جی کا استھان ہے۔
شاستروں میں لکھا ہے کہ جب بھیروں دیوتا آکاش سے دھرتی پر اُتر آتے تھے تو ا
نے اسی جگہ بسرام کیا تھا۔''

''وہاں کون کون رہتا ہے؟ پجاری لوگ تو ضرور ہوں گے۔'' میں نے پوچھا۔

میرے سوال پر کانچی بولی۔ ''وہاں کوئی پجاری نہیں رہتا، میری ایک بچپن کی
رہتی ہے۔ اُس کا نام سندھیا ہے۔ وہ جوگن بن چکی ہے اور اکیلی رہ کر تپسیا کرتی

وہ میری رازدار بھی ہے۔ تم بڑے سکون کے ساتھ دو دن گزارنا۔ اگر تم پر رانی کے ٹونے
کا اثر نہ ہوا تو پھر میں تمہیں خود قریبی ریلوے سٹیشن پر چھوڑ آؤں گی۔ وہاں سے دِلّی،
متھرا کو گاڑیاں جاتی ہیں۔''

مجھے اطمینان ہو گیا۔ چھوٹے چھوٹے پہاڑی ٹیلے پیچھے رہ گئے تھے۔ ہم ایک ایسے
علاقے میں آ گئے تھے جہاں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر ناریل اور سنبل کے درختوں کے
جھنڈ تھے۔ ایک برساتی نالہ ہم نے پار کیا۔ نالے کے دوسرے کنارے پر آئے تو مجھے سو
دو سو گز کے فاصلے پر ایک عمارت نظر آئی۔ سورج ڈھلنے لگا تھا۔ کانچی نے عمارت کی
طرف دیکھ کر کہا۔

''یہی بھیروں جی کا استھان ہے۔''

یہ عمارت بڑی پرانی لگ رہی تھی۔ دوسری منزل کی چھت کی منڈیر پر ایک جگہ دو
گدھ بیٹھے تھے۔ اُنہیں دیکھ کر مجھے خوف سا محسوس ہوا۔ میں نے کانچی سے کہا۔

''یہ گدھ یہاں کیوں بیٹھے ہیں......؟''

کانچی مسکرا دی۔ کہنے لگی۔ ''اصل میں بھیروں دیوتا کو جانوروں سے بڑا پریم تھا۔
ہر طرح کے جنگلی جانور اور پرندے بھیروں جی کے درشن کرنے آتے تھے۔ بھیروں جی
ان سے مل کر خوش ہوتے تھے۔ تب سے یہ گدھ بھی یہاں آ کر بیٹھ جاتے ہیں۔''

عمارت کی طرزِ تعمیر ایسی تھی کہ نہ وہ مندر لگتی تھی اور نہ کوئی قلعہ لگتی تھی، کسی قدیم
سرائے یا حویلی سے ملتی جلتی تھی۔ ایک عجیب ویرانی سی عمارت پر برس رہی تھی۔ ڈیوڑھی
کے کواڑ غائب تھے، اندر اندھیرا تھا۔ ڈیوڑھی میں سے گزرتے ہوئے ناگوار سی بو کا
احساس ہوا۔ ڈیوڑھی کے آگے ایک چھوٹی سی کھلی جگہ تھی۔ یہ عمارت کے اندر کا صحن تھا۔
صحن کے وسط میں ایک گھنا پیڑ تھا جس کے نیچے ایک چھوٹے سے چبوترے پر ایک مورتی
رکھی تھی۔ صحن کی ایک جانب اُونچی پرانی اینٹوں سے بنی ہوئی دیوار تھی۔ دوسری طرف دو
تین کوٹھڑیاں تھیں، تیسری جانب ایک راستہ اندر کو جاتا تھا۔

کانچی اُس راستے کی طرف بڑھی۔ میں اُس کے پیچھے پیچھے تھا۔ یہ ایک تنگ گلی سی
تھی۔ گلی ایک دیوار کے پاس جا کر ختم ہوتی تھی۔ یہاں دائیں اور بائیں جانب کوٹھڑیوں
کے دروازے تھے جو بند پڑے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس ویران جگہ پر

کانچی کی سہیلی کیسے رہتی ہے؟ پھر خیال آیا کہ وہ جوگن ٹائپ کی عورت ہے۔ اور
عورتیں ویران جگہوں پر رہ لیتی ہیں۔ بائیں جانب والی کوٹھڑی کے دروازے کو کانچی
آہستہ سے کھول دیا اور میری طرف دیکھ کر بولی۔

''اندر آ جاؤ......!''

میں اُس کے پیچھے کوٹھڑی میں داخل ہو گیا۔ کوٹھڑی میں اندھیرا تھا۔ کانچی نے
کھڑکی کھول دی۔ کھڑکی میں سے سورج کی مدھم سی روشنی اندر آنے لگی۔ میں
کوٹھڑی کا جائزہ لیا، فرش پر سرخ رنگ کی پرانی اور میلی سی چٹائی بچھی ہوئی تھی۔ آ
سامنے دیوار کے ساتھ بانس کی دو چارپائیاں بچھی تھیں۔ دیواروں میں چھ سات طا
تھے جن میں عجیب و غریب اور ڈراؤنی شکل والی دیویوں اور دیوتاؤں کی مورتیاں تھیں
اُن سب مورتیوں کے اگلے نوکیلے دانت باہر کو نکلے ہوئے تھے۔

کانچی نے اُن مورتیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''یہ بھیروں جی کے داسی اور داسیاں ہیں۔ بھیروں جی نے جب آکاش سے اُ
یہاں ایک ماہ بسرام کیا تھا تو یہ دیوی دیوتا اُن کی خدمت کیا کرتے تھے۔''

میرا اُس فضا میں دم گھٹنے لگا تھا۔ میں سوچنے لگا یہاں دو دن میں کیسے گزاروں
میں نے کانچی سے پوچھا۔ ''کیا مجھے اِس کوٹھڑی میں رہنا ہو گا؟''

کانچی بولی۔ ''تم مسلمان ہو۔ شاید ہماری دیوی دیوتاؤں کی مورتیوں کے پاس
تمہیں اچھا نہ لگے اس لئے تم دوسری کوٹھڑی میں رہو گے۔ وہاں مورتیاں نہیں ہیں۔''

وہ مجھے دوسری کوٹھڑی میں لے آئی۔ یہاں بھی فرش پر سرخ چٹائی بچھی تھی اور ا
چارپائی پر بستر لگا تھا۔ یہاں بھی ایک کھڑکی تھی جس پر سلاخیں لگی تھیں۔ مگر دیوارو
کوئی مورتی نظر نہیں آ رہی تھی۔ کانچی میرے ساتھ چارپائی پر بیٹھ گئی۔ کہنے لگی۔

''غسل خانہ باہر صحن میں ہے۔ تمہیں یہاں کسی طرح کی تکلیف نہیں ہو گی۔ اور
میں تمہارے آرام کا خیال رکھوں گی۔''

میں نے پوچھا۔ ''تمہاری سہیلی کہاں ہے؟''

اُس نے دروازے کی طرف دیکھا اور بولی۔ ''میرا خیال ہے وہ اپنی کوٹھڑی میں ما
کر رہی ہے۔''

پھر میری طرف متوجہ ہو کر کہا۔ ''تم سندھیا سے مل کر ضرور خوش ہو گے۔''

میں نے اس خیال سے کانچی کی سہیلی کا پوچھ لیا تھا کہ اِس ویران بھون میں اور بھی
کوئی انسان رہتا ہے کہ نہیں؟ ورنہ مجھے اُس کی سہیلی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں تو وہاں
دو دن رہنے پر مجبور تھا کیونکہ سادھو نے رانی کے جادو ٹونے کا جو توڑ کیا تھا مجھے اُسے
آزمانا تھا۔ دو دن کے دوران اگر واقعی رانی کا جادو ٹوٹ چکا ہو گا اور مجھے چکر نہیں آئے
گا تو پھر میں کانچی کو بتائے بغیر ہی وہاں سے فرار ہونے کا ارادہ کر چکا تھا۔

''تم بیٹھو! میں تمہارے واسطے کچھ کھانے پینے کو بھیجتی ہوں۔''

یہ کہہ کر کانچی چلی گئی۔ میں نے اُٹھ کر کھڑکی کی سلاخوں میں سے باہر نگاہ ڈالی۔
دوسری طرف ایک کھائی تھی جس میں جھاڑیاں اور گھاس اُگی ہوئی تھی۔ کھائی کے سامنے
والا کنارہ کافی اُونچا تھا جس کی وجہ سے اُس کے پیچھے کیا ہے؟ مجھے نظر نہیں آ رہا تھا۔
میں واپس چارپائی پر آ کر بیٹھ گیا۔ کانچی جاتے ہوئے دروازے کو بند کر گئی تھی۔

کچھ دیر بعد کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی، پھر دروازہ کھلا اور کالے رنگ کی
سفید بالوں والی ایک عورت ہاتھ میں تھال لئے داخل ہوئی۔ اُس کی ناک طوطے کی
چونچ کی طرح آگے سے مُڑی ہوئی تھی۔ آنکھیں پیلی تھیں۔ اُس نے تھال چارپائی پر
میرے پاس رکھ دیا۔ میری طرف گھور کر دیکھا اور خاموشی سے واپس چل دی۔

کانچی نے میرے لئے چاول اور سبزی کی بھاجی بھیجی تھی۔ ایک تھالی میں جلیبیاں
بھی تھیں۔ میں نے جلیبیوں کو تو ہاتھ تک نہ لگایا، چاول وغیرہ کھا لئے، پانی پیا اور تھال
نیچے رکھ کر چارپائی پر لیٹ گیا۔ مندروں کی ان بت پرست ہندو عورتوں کے ہاتھوں
سے مٹھائی کھاتے ہوئے اب مجھے خوف آتا تھا۔

اچانک دروازہ کھلا...... میں ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ وہی طوطے کی ناک والی پراسرار
خاموش عورت اندر داخل ہوئی۔ اُس نے تھال اُٹھایا، تھالی میں اُسی طرح پڑی ہوئی
مٹھائی کو اپنی کرنجی آنکھوں سے گھور کر دیکھا، پھر مجھے گھور کر دیکھا اور واپس چلی گئی۔
اب مجھے معلوم ہوا کہ وہ ذرا ذرا لنگڑا کر چلتی تھی۔

یہ جگہ بھی مجھے رانی کے پراسرار خونی مندر کی طرح دہشت ناک سی لگنے لگی تھی۔ لیکن
پتا نہ مجھے بڑا حوصلہ تھا۔ کانچی ابھی تک واپس نہیں آئی تھی۔ کھڑکی کے باہر دن کی

روشنی شام کے اندھیرے میں تبدیل ہو رہی تھی۔ کوٹھڑی میں اندھیرے کے سائے رینگنے لگے تھے۔ طوطے کی ناک والی پراسرار عورت ایک بار پھر آ گئی۔ اس دفعہ اُس کے ہاتھ میں ایک جلتی ہوئی لالٹین تھی جس کی آدھی چمنی دھوئیں سے کالی ہو رہی تھی۔ لالٹین اُس نے دیوار میں ٹھکی ہوئی کیل کے ساتھ لٹکا دی، گردن موڑ کر ایک نگاہ مجھ پر ڈالی اور لنگڑا کر چلتی کوٹھڑی سے نکل گئی۔ اُس کا گردن موڑ کر مجھے دیکھنا بڑا عجیب سا لگا۔ میں چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔ مجھ پر نیند کی غنودگی سی طاری ہونے لگی تھی کہ کوٹھڑی کا دروازہ اپنی خاص کراہ نما آواز کے ساتھ ایک بار پھر کھل گیا۔ میں نے چونک کر دیکھا۔

کانچی آئی تھی۔ کہنے لگی۔ ''میرے ساتھ آؤ! تمہیں اپنی سہیلی سندھیا سے ملاتی ہوں۔'' میں سونا چاہتا تھا اور اُس کی سہیلی سے ملنے کو میرا ذرا جی نہیں چاہتا تھا۔ مگر میں انکار نہ کر سکا اور کانچی کے ساتھ چل پڑا۔

وہ کونے والی کوٹھڑی کے پاس آ کر رُک گئی۔ کہنے لگی۔ ''سندھیا یہاں تپسیا اور گیان دھیان کرتی ہے۔''

اُس نے آواز دی۔ ''سندھیا! ہم آ جائیں؟''

کوٹھڑی کے اندر سے ایک عورت کی مترنم سی آواز آئی۔ ''آ جاؤ......!''

کانچی نے دروازے کا ایک کواڑ کھول دیا۔ لوبان کی تیز بو کی لہر میرے نتھنوں کو چھو کر گزر گئی۔ یہ کشادہ کوٹھڑی تھی اور کسی پرانی حویلی کا کمرہ لگتا تھا۔ کمرے کی دیواروں کا رنگ نسواری تھا جو مجھے بڑا برا لگا۔ یہاں دیوار پر آمنے سامنے لالٹینیں روشن تھیں جن کی روشنی میں ایک گہرے سانولے رنگ کی سڈول بدن والی جوان عورت پرانے پلنگ پر بیٹھی سینے کے ساتھ کالی بلی کو چمٹائے اُسے پیار کر رہی تھی۔ کانچی نے سندھیا سے میرا تعارف کروایا۔ سندھیا جوگیا رنگ کی ساڑھی میں تھی۔

''سندھیا...... یہ میرا دوست شیراز ہے۔'' کانچی نے کہا۔

سندھیا نے عجیب قسم کی للچائی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھا، مسکراتے ہوئے میرے بالوں میں اپنی لمبی اُنگلیاں چلاتے ہوئے بولی۔

''یہ تو بالکل نوجوان ہے۔ اور سوشیل بھی ہے۔''

کانچی نے کہا۔ ''میں نے تمہیں کہا تھا نا کہ میرا دوست خوبصورت اور نوجوان ہے۔''

پھر کانچی میری طرف دیکھ کر بولی۔ ''اور شیراز! یہ میری بچپن کی سہیلی سندھیا ہے۔ جھانسی میں ان کی اپنی حویلی ہے۔ مگر یہ بھیروں جی کی جوگن ہو گئی ہے۔''

سندھیا کے چہرے پر ابھی تک وہی للچائی ہوئی مسکراہٹ تھی۔ اور مجھے دیکھے جا رہی تھی۔ کہنے لگی۔ ''آؤ...... میرے پاس آؤ! جس طرح کانچی میری سہیلی ہے اب تم بھی اسی طرح سے میرے دوست ہو۔''

میرا دل تو نہیں چاہتا تھا مگر مجبوراً مجھے پلنگ پر اُس کے پاس بیٹھنا پڑا۔ کمرے میں لوبان کہیں نہیں سلگ رہا تھا۔ اب مجھے محسوس ہوا کہ لوبان کی بو سندھیا کے جسم یا اُس کی جوگیا رنگ کی ساڑھی میں سے آ رہی تھی۔ جیسے ہی میں اُس کے پاس ہو کر بیٹھا سندھیا کی گود میں بیٹھی بلی زور سے غرائی اور جیسے مجھے پنجہ مارنے کی کوشش کی۔

سندھیا نے بلی کو گود سے اُتار کر پلنگ سے نیچے ڈال دیا اور کہا۔

''جا...... بھاگ جا!''

بلی اس طرح دوڑ کر کمرے میں سے نکل گئی جیسے قید سے آزاد ہو گئی ہو۔ سندھیا اب میرے بالوں میں اُنگلیاں پھیرنے لگی اور بولی۔

''مجھے تمہارے بارے میں کانچی نے سب کچھ بتا دیا ہے۔ تمہیں فکر کرنے اب کوئی ضرورت نہیں۔ شاستری جی کے منتروں سے رانی کا جادو ٹونہ تم پر ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا ہے۔ اب تم اُس کے قبضے سے آزاد ہو چکے ہو۔ کیوں کانچی...... میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا؟''

کانچی بولی۔ ''یہی تو میں بھی شیراز سے کہہ رہی تھی۔''

میں نے کہا۔ ''کانچی اگر میری مدد نہ کرتی تو خدا جانے میرا کیا حال ہوتا؟''

سندھیا کی اُنگلیاں میرے بالوں میں چل رہی تھیں اور خدا جانے کیوں میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ وہ بڑے پیار سے بولی۔

''اور اب تم اس کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر جا رہے ہو۔ جانتے ہو یہ تمہیں اپنا پیارا دوست سمجھتی ہے۔ بلکہ یہ تو تم سے پریم بھی کرتی ہے۔ کیوں کانچی! میں نے غلط تو نہیں کہا نا؟''

کانچی نے اُداس لہجے میں کہا۔ ''مگر میرے پریم کرنے کا کیا فائدہ؟ شیراز کو اپنے

گھر والوں کے پاس جانا ہی ہوگا۔"

سندھیا مجھ سے کہنے لگی۔

"کیا تم کانچی کی خاطر دو تین مہینے یہاں نہیں رُک جاتے؟ یہاں تمہیں ہر طرح
آرام ملے گا۔"

میں نے جلدی سے کہا۔

"نہیں...... میں نہیں رُک سکتا۔ میرے گھر والے پریشان ہوں گے۔ میں
مدت سے اُن سے جدا ہوں۔ اب مجھے جانا ہی ہوگا۔"

"کانچی! اب میں کیا کر سکتی ہوں؟ تمہاری قسمت میں یہی لکھا تھا۔" سندھیا نے
کانچی ہنس پڑی۔ "کوئی بات نہیں سندھیا! مجھے شیراز کی خوشی چاہیے۔ اگر یہ
والوں کے پاس جانے میں خوش ہے تو میں بھی خوش ہوں۔"

سندھیا اب میرے بازو پر آہستہ آہستہ اُنگلیاں پھیرنے لگی تھی۔ اُس کی اُنگلیوں
چلنے سے مجھے ایسے لگ رہا تھا جیسے وہ میرے بازو کی کسی خاص رگ کو تلاش کر رہی
یہ مجھے عجیب سا لگا۔

وہ کانچی سے مخاطب ہو کر کہنے لگی۔ "اب یہ ہم دونوں کا دوست ہے۔ ہمارے
صرف دو دن کا مہمان ہے۔ ہمیں اس کی اچھی طرح سے خاطر تواضع کرنی ہوگی۔"

"کیوں نہیں......؟" کانچی نے مسکرا کر کہا۔ "اچھا شیراز! اب تم اپنے کمرے
جا کر آرام کرو! میں تھوڑی دیر کے بعد آ کر تمہیں دیکھ جاؤں گی۔"

میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ مجھے سندھیا کی لوبان کی بو اور اُس کی کھردری اُنگلیوں
سے نجات ملی۔ میں واپس چلا آیا۔ کانچی وہیں سندھیا کے پاس بیٹھی رہی۔ یہ عورت
سندھیا بھی مجھے اُس پرانی حویلی نما استھان کی کوئی پُراسرار مخلوق ہی لگی۔ خوشی مجھے
بات کی تھی کہ مجھے اُن عورتوں کے پاس صرف دو دن ہی رہنا تھا۔

میں چارپائی پر لیٹ گیا۔ کھڑکی میں سے باہر کی تازہ ہوا آ رہی تھی۔ میں
آنکھیں بند کر لیں اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ کچھ ہی دیر بعد کوٹھڑی کا دروازہ
کراہ نما آواز کے ساتھ چرچرایا اور کانچی اندر آ گئی۔

"تم سو رہے تھے......؟" اُس نے پوچھا۔

"نہیں...... سونے کی کوشش کر رہا تھا۔" میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

کانچی میرے پاس ہی چارپائی پر بیٹھ گئی۔

"تمہیں میری سہیلی پسند آئی؟" اُس نے پوچھا۔

"ہاں......" میں نے دل پر جبر کر کے جواب دیا۔

"جھانسی میں اُس کے ماتا پتا بڑے امیر لوگ تھے۔ اُن کے مرنے کے بعد اُس نے
سنیاس لے لیا اور بھیروں جی کی جوگن ہو گئی۔" کانچی مجھے سندھیا کی کہانی سنانے لگی۔
میں بور ہو کر کبھی کھڑکی کے باہر دیکھتا اور کبھی ہوں ہاں کر دیتا۔ پھر ایسا ہوا کہ
اچانک مجھے کوٹھڑی کی دیواریں ہلتی ہوئی نظر آئیں۔ میں گھبرا گیا۔ کانچی کی نگاہیں مجھ پر
لگی تھیں۔ اُس نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"کیا بات ہے......؟"

"کچھ نہیں......" میں نے کہا۔ "ایسے لگا تھا جیسے دیواریں ہل رہی ہیں۔"

کانچی کا چہرہ ایک دم اُتر سا گیا۔ کہنے لگی۔ "ایسا ہونا نہیں چاہیے۔"

اس کے ساتھ ہی مجھے وہی چکر آیا اور میرے ہوش و حواس جیسے ایک دم غائب ہو
گئے۔ میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

"رانی......! میں آ رہا ہوں۔"

اور میں چارپائی سے اُترا اور کوٹھڑی کے دروازے کی طرف چل پڑا۔ کانچی نے
پیچھے سے آ کر مجھے اپنے بازوؤں میں لے لیا اور زور زور سے دو تین جھٹکے دیئے اور ایک
خاص اشلوک پڑھا اور بولی۔

"ہوش میں آؤ...... ہوش میں آؤ شیراز!"

میں ایک دم سے ہوش میں آ گیا۔ میرا حلق خشک ہو گیا تھا۔ سانس تیز تیز چلنے لگا۔
کانچی نے مجھے سنبھال کر چارپائی پر لٹا دیا۔

"لیٹ جاؤ......!"

پھر بڑی فکر مند ہو کر کہنے لگی۔ "اس کا مطلب ہے کہ شاستری جی کے منتروں میں
کوئی کسر رہ گئی ہے۔ ورنہ تمہیں یہ دورہ دوبارہ نہیں پڑنا چاہیے تھا۔"

میں خود پریشان ہو گیا تھا کہ یہ بلا ابھی تک میرے پیچھے لگی ہوئی ہے۔ میں نے

گھبراہٹ کے ساتھ کہا۔
''کانچی......! اب کیا ہوگا؟''
''تم فکر کیوں کرتے ہو؟'' کانچی نے میرا ماتھا چوما۔ ''میں جو ہوں تمہارے پا
سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

OOO

میری پریشانی اور گھبراہٹ قدرتی تھی۔ میں نے کانچی کا ہاتھ تھام لیا۔
''کانچی! تمہارے شاستری جی کا منتر بھی رانی کے ٹونے کو میرے سر سے نہیں ٹال
کا۔ میں بڑی مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔''
کانچی نے میرا ہاتھ چوما اور میرے بالوں پر ہاتھ پھیر کر کہنے لگی۔
''میں سندھیا سے بات کرتی ہوں۔ سندھیا کوئی نہ کوئی اُپائے ضرور بتائے گی۔ آؤ!
ں کے پاس چلتے ہیں۔''
ہم سندھیا کے کمرے میں آ گئے۔ اُس وقت وہ ایک ڈراؤنی شکل والی مورتی کو
نے سامنے رکھے دونوں ہاتھ جوڑے اُس کی پوجا کر رہی تھی۔ کانچی نے مجھے خاموش
نے کا اشارہ کیا اور اپنے ساتھ ایک طرف بٹھا لیا۔ سندھیا پوجا سے فارغ ہوئی تو
اری طرف دیکھ کر بولی۔
''لگتا ہے کوئی خاص بات ہوئی ہے۔''
جب کانچی نے اُسے ساری بات بتائی تو ایک لمحے کے لئے سندھیا نے آنکھیں بند
رلیں، پھر آنکھیں کھولیں اور کانچی سے کہا۔
''رانی کے ٹونے میں بڑی شکتی ہے۔''
کانچی نے کہا۔ ''مگر اس کا کوئی نہ کوئی توڑ تمہیں ضرور کرنا ہوگا۔ میں شیراز کو اس
حالت میں اکیلا نہیں چھوڑ سکتی۔''
سندھیا کہنے لگی۔ ''اس کے لئے مجھے یجر وید کے ایک منتر کا ھون کرنا ہوگا۔''
کانچی نے کہا۔ ''تم جو کچھ کر سکتی ہو کرو! میں شیراز کو اس مشکل سے مکت کرنا چاہتی
ہوں۔''
''میں بھی یہی چاہتی ہوں۔'' سندھیا بولی۔

سندھیا اُس وقت چٹائی پر بیٹھی تھی۔ اُس نے مجھے اپنے سامنے بٹھا لیا اور کہنے لگی۔

''پانچ منٹ تک اسی طرح بیٹھے رہو!''

اُس نے کانچی سے کونے میں رکھے مٹکے میں سے پانی سے بھرا ہوا پیالہ منگوا کر پاس رکھ لیا اور خدا جانے کس جناتی زبان میں اشلوک پڑھنے شروع کر دیئے۔ میں کی مورت بنا اُس کے سامنے بیٹھا تھا۔ پانچ منٹ ختم ہونے میں نہیں آتے تھے۔ بڑی مشکل سے سندھیا کا اشلوک کیرتن ختم ہوا۔ اُس نے پیالی میں سے پانی لے کر چھینٹے میرے چہرے پر پھینکے اور کہا۔

''پہلا ھون ختم ہو گیا ہے۔ ابھی دوسرا ھون باقی ہے۔''

اُس نے کانچی سے کہا۔ ''کانچی! تم بھی میرے سامنے آ کر بیٹھ جاؤ۔''

وہ بھی میرے ساتھ بیٹھ گئی۔ سندھیا ایک بار پھر منتر پڑھنے لگی۔ وہ منتر پڑھتی تھی اور ہم دونوں پر تھوڑی تھوڑی دیر بعد پانی کے چھینٹے مارتی جاتی تھی۔ پانچ منٹ تک یہ عمل جاری رہا۔ جب یہ عمل بھی ختم ہو گیا تو سندھیا ہم دونوں کو مخاطب کر ہوئے بولی۔

''اب رَت سانکھیا کی رسم ہو گی۔ یہ رسم تم دونوں کو ادا کرنی پڑے گی۔ اس کے رانی کا ٹونہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ٹوٹ جائے گا۔''

میں یہی سمجھا کہ یہ بھی دوسری بے ضرر رسموں کی طرح ایک رسم ہو گی۔ مگر سندھیا نے تیز دھار والا چاقو نکال کر ہم دونوں سے کہا کہ اپنی اپنی کلائیاں آگے قدرتی طور پر مجھے گھبراہٹ ہونے لگی۔ کانچی نے میری حالت کا اندازہ کر لیا تھا۔ نے اپنی کلائی سندھیا کے آگے کی اور مجھ سے کہا۔

''گھبراؤ نہیں شیراز...... رانی کے خطرناک ٹونے سے ہمیشہ کے لئے مکتی پا لئے یہ چھوٹی سی رسم بہت ضروری ہے۔''

سندھیا کہنے لگی۔ ''مجھے صرف تم دونوں کا تھوڑا تھوڑا خون نکالنا ہو گا۔ بس اتنی تکلیف ہو گی جتنی ایک کانٹا چبھنے کی ہوتی ہے۔''

میں کیا کر سکتا تھا؟ اپنی کلائی آگے کر دی۔ سندھیا نے چاقو کی نوک پہلے کا کلائی پر ایک جگہ ذرا سی چبھوئی، کانچی کی کلائی میں سے تھوڑا تھوڑا خون نکلنے لگا۔ اس

فوراً بعد اُس نے میری کلائی کو سیدھا کر کے چاقو کی نوک چبھوئی، مجھے معمولی سا درد ہوا اور میری کلائی سے بھی خون کے قطرے نکل پڑے۔ سندھیا نے چاقو ایک طرف رکھ دیا اور اپنا ہاتھ اُوپر اُٹھا کر کہا۔

''اب تم دونوں ایک دوسرے کے خون کے قطرے پی جاؤ گے۔''

مجھے بڑی گھن آئی۔ مگر میں بری طرح پھنس چکا تھا۔ انکار کرنے کی گنجائش نہیں تھی۔ اتنے میں کانچی نے میری کلائی پر اُس جگہ اپنے ہونٹ لگا دیئے جہاں سے خون کے قطرے نکل رہے تھے۔ وہ زور زور سے میری کلائی کا خون چوس رہی تھی۔ سندھیا نے کہا۔

''بس کانچی! اتنا ہی کافی ہے۔''

پھر مجھ سے مخاطب ہوئی۔ ''اب تم کانچی کے خون کے قطرے پیو گے۔''

میرا جی خراب ہونے لگا۔ میں ایک سیکنڈ کے لئے جھجکا تو سندھیا بولی۔

''اگر تم خونی رانی کے ٹونے سے ہمیشہ کے لئے نجات حاصل کرنا چاہتے ہو تو جیسا میں کہتی ہوں ویسے کرو۔''

کانچی نے اپنی خون آلود کلائی میرے آگے کی ہوئی تھی۔ میں نے ایک نظر کانچی پر ڈالی۔ اُس کے ہونٹوں پر میری کلائی کا خون لگا ہوا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر کے اپنے ہونٹ کانچی کی کلائی سے نکلتے ہوئے خون پر رکھ دیئے۔ مجھے اُس کے خون کا نمکین ذائقہ محسوس ہوا جو مجھے سخت ناگوار لگا۔ سندھیا کی آواز آئی۔

''کانچی کا خون چوسنا شروع کرو! نہیں تو میرا سارا ھون یگ ادھورا رہ جائے گا اور رانی کا جادو ٹونہ نہیں ٹوٹے گا۔''

یہ سنتے ہی میں کانچی کا خون چوسنے لگا...... میرا دل ہی جانتا ہے کہ اُس وقت مجھ پر کیا گزری تھی؟ دس بارہ دفعہ جب میں خون پی چکا تو سندھیا نے کہا۔

''بس! رَت سانکھیا کا ھون پورا ہو گیا۔''

میں نے اپنا چہرہ اُوپر اُٹھا لیا۔ اس وقت میرے ہونٹوں پر کانچی کا خون تھا اور زبان پر اُسی کے خون کا نمکین ذائقہ تھا۔ سندھیا نے رُومال سے میرے اور کانچی کے ہونٹوں پر لگا ہوا خون صاف کیا اور بولی۔

''کانچی! تمہارے دوست کی بلا جنم جنم کے واسطے ٹل گئی ہے۔ رانی اب اسے کوئی

گز نہیں پہنچا سکے گی۔"

کانچی کہنے لگی۔"سندھیا! میں جانتی تھی رانی کے ٹونے کا توڑ تم ہی کر سکتی ہو۔"

میں نے فوراً کہا۔"اب میں کل ہی اپنے گھر روانہ ہو جاؤں گا۔"

اس پر کانچی نے سندھیا کی طرف دیکھا۔ سندھیا نے کہا۔

"اگر چہ مجھے پورا یقین ہے کہ رانی کا طلسم ختم ہو چکا ہے۔ پھر بھی میں چاہوں گی تم دو تین دن ہماری آنکھوں کے سامنے رہو! تاکہ اگر کوئی گڑبڑ ہو جائے تو ہم اس کا علاج کر سکیں۔"

ایک اعتبار سے سندھیا صحیح کہہ رہی تھی۔ پہلے دو بار ایسا ہو چکا تھا۔ میرا دل وہاں ایک پل کے لئے رُکنا نہیں چاہتا تھا۔ مگر مجھے مجبوراً رُکنا پڑ رہا تھا۔ کانچی نے سندھیا کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

"سندھیا نے ٹھیک کہا ہے شیراز! تمہیں کم از کم آزمائش کے طور پر ایک ہفتہ ہماری نگرانی میں ضرور رہنا چاہئے۔"

میں نے اثبات میں سر ہلا کر کہا۔"ٹھیک ہے...... جیسے تم لوگوں کی مرضی۔"

میرے لئے ایک الگ کوٹھڑی میں چٹائی اور چارپائی بچھا دی گئی۔ یہ کوٹھڑی سندھیا اور کانچی کی کوٹھڑیوں کے درمیان تھی۔ سندھیا اور کانچی نے آپس میں طے کیا تھا کہ ایک رات سندھیا جاگ کر میری نگرانی کرے گی اور دوسری رات کانچی جاگ کر میری نگرانی کرے گی تاکہ اگر کسی وجہ سے سندھیا کے منتروں کا اثر نہ ہوا ہو، کوئی کسر باقی رہ گئی ہو اور مجھے پھر دورہ پڑ جائے اور میں اپنا شعور کھو کر رانی کے خونی مندر کی طرف چل پڑوں تو مجھے واپس ہوش و حواس میں لایا جا سکے۔ میں نے جب کانچی سے کہا کہ میں اپنے شہر چلا گیا تو میں تو رانی سے سینکڑوں میل دُور ہوں گا۔ راستے میں جنگل، کھڈ، نالے کھائیاں اور دریا ہوں گے۔ اگر مجھے چکر آ گیا اور رانی کے ٹونے کے زیر اثر میں اُس کے خونی مندر کی طرف چل بھی پڑا تو سینکڑوں میل کا فاصلہ کر کے اُس کے پاس پہنچنا ایک غیر ممکن بات ہے۔ اس پر کانچی نے جواب دیا تھا۔

"ایسی بات نہیں ہے کہ جب تمہیں چکر آئے گا اور رانی کے جادو کے زیر اثر تم اپنے آپ رانی کے پاس پہنچ جاؤ گے، چاہے وہ تم سے ہزاروں میل دُور کیوں نہ ہو۔ اور پھر

سمجھتے ہو کہ جب تم پر کیا گیا رانی کا طلسم حرکت کرے گا تو اُسے خبر نہیں ہو گی؟ اُسے فوراً پتہ چل جائے گا۔ اور وہ اسی سمت کو چل پڑے گی جس راستے سے تم اُس کی طرف آ رہے ہو گے اور تمہیں آدھے راستے میں قابو کر لے گی۔"

میں نے اُس سے کہا۔"اگر میرے چکر آنے کے بعد رانی کو فوراً پتہ چل جاتا ہے تو پھر وہ میری تلاش میں یہاں کیوں نہیں پہنچ جاتی؟"

کانچی نے جواب دیا۔

"جس وقت میں تمہیں اپنے بازوؤں میں لے کر ایک خاص اشلوک دُہرا کر دو تین جھٹکے دیتی ہوں اور رانی کا طلسم ختم ہو جاتا ہے تو رانی کو بالکل یاد نہیں رہتا کہ تم کس سمت سے اُس کی طرف چلے تھے؟ یاد رکھو! جادو ٹونہ کتنا ہی طاقتور کیوں نہ ہو وہ بھگوان کی شکتی کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اس میں کوئی نہ کوئی کمزوری ضرور رہ جاتی ہے۔ طلسم کا توڑ کرنے والے اُس کی اس کمزوری سے فائدہ اُٹھا کر اس کا اُپائے کرتے ہیں۔"

چنانچہ جب سندھیا نے مجھے دو تین روز ان دونوں کی نگرانی میں رہنے کا مشورہ دیا تو میں نے بھی مصلحت اسی میں سمجھی کہ مجھے کچھ روز کی تکلیف مزید برداشت کر لینی چاہئے تاکہ اس مرض سے ہمیشہ کے لئے چھٹکارا مل جائے۔

دن کے وقت تو میں سندھیا اور کانچی کے پاس ہی رہتا تھا۔ رات کو جب میں اپنی کوٹھڑی میں سو جاتا تو باری باری سندھیا اور کانچی میری کوٹھڑی میں آ کر مجھے دیکھ جاتیں۔ میں اگر جاگ رہا ہوتا تو وہ میری خیر خیریت دریافت کر کے واپس چلی جاتیں۔

دو راتیں اور دو دن بغیر کسی واقعے کے گزر گئے۔ تیسرا دن اور تیسری رات بھی گزر گئی۔ چوتھے روز جب میں نے اپنے گھر جانے کے لئے کانچی سے کہا تو وہ کہنے لگی۔

"میں چاہتی ہوں کہ تم دو دن اور ٹھہر جاؤ! جہاں تین دن رہے ہو، وہاں دو دن اور رُکنے میں کوئی حرج نہیں۔ اس طرح میری اور تمہاری ہم دونوں کی تسلی ہو جائے گی۔ پھر میں تمہیں خود سٹیشن پر چھوڑ آؤں گی۔"

میں بھی اس بک بک سے پوری طرح نجات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں رُک گیا۔ چوتھے روز شام کے وقت میں چارپائی پر لیٹا اپنے اُوپر گزرے ہوئے حالات اور واقعات پر غور کر رہا تھا کہ کوٹھڑی کا دروازہ کھول کر طوطے کی ناک والی کالی بوڑھی

عورت اندر آ گئی۔ وہ میرے لیئے چائے لائی تھی۔ اُس نے چائے کا گلاس
چارپائی کے پاس تپائی پر رکھا اور میری طرف حسبِ معمول گھور کر دیکھا۔

مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں نے پوچھ لیا۔

''مائی! تم مجھے اس طرح کیوں دیکھتی رہتی ہو؟ اگر تمہارے دل میں کوئی بات
مجھے بتاؤ!''

اُس عورت نے کوئی جواب نہ دیا اور خاموشی کے ساتھ کوٹھڑی سے نکل گئی۔ مجھے
عورت سے خوف محسوس ہونے لگا تھا۔ رات کو میں نے اور کانچی نے اکٹھے کھانا
میں نے کانچی سے پوچھ ہی لیا کہ یہ بوڑھی نوکرانی کون ہے اور یہ بولتی کیوں نہیں؟
نے جواب دیا۔

''یہ سندھیا کی پرانی نوکرانی ہے۔ وہ اسے ساتھ لے کر بھیروں جی کے استھان
آئی تھی۔''

''مگر وہ بولتی کیوں نہیں؟'' میں نے پوچھا۔

کانچی نے کہا۔ ''اس لئے کہ وہ گونگی ہے۔ وہ سن تو لیتی ہے مگر بول نہیں سکتی۔
اُسے گھور کر دیکھنے کی عادت ہے۔ میں اُسے منع کر دوں گی کہ تمہیں گھور کر نہ
کرے۔''

''نہیں نہیں......'' میں نے کہا۔ ''اُسے کچھ نہ کہنا! اگر یہ اُس کی عادت ہے تو
ٹھیک ہے۔''

میرا تجسس دُور ہو گیا۔ بعد میں جا کر مجھ پر یہ راز کھلا کہ وہ بوڑھی عورت یونہی میری
طرف گھور کر نہیں دیکھتی تھی۔ وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی تھی مگر بول نہیں سکتی تھی۔

چوتھی رات میری نگرانی اور دیکھ بھال کرنے کی باری کانچی کی تھی۔ کھانا کھانے
بعد کانچی بولی۔ ''اب تم آرام کرو! میں جاگ رہی ہوں۔ وقفے وقفے سے آ کر
دیکھ جایا کروں گی۔''

اُس وقت میرے دل میں ایک عجیب سی خواہش پیدا ہوئی۔ میرا جی چاہا کہ
جائے اور میرے پاس ہی بیٹھی رہے۔ ایسی خواہش پہلے کبھی میرے دل میں پیدا
ہوئی تھی۔ اُس رات پہلی بار کانچی کے جسم سے مجھے ایسی خوشبو آنے لگی تھی جس

میرے دل و دماغ کو ایک سرور سا محسوس ہو رہا تھا۔ شاید کانچی کو بھی میری اس کیفیت کا
احساس ہو گیا تھا۔ جانے سے پہلے وہ مجھے بڑی پیار بھری نظروں سے دیکھتی رہی اور اُس
نے جاتے ہوئے میرا ماتھا چوم لیا تھا۔ جب وہ میرا ماتھا چوم رہی تھی تو اُس خوشبو نے جو
کانچی کے جسم سے اُٹھ رہی تھی مجھے اپنی آغوش میں لے لیا تھا۔ میرا بے اختیار جی چاہا
کہ کانچی کو اپنے بازوؤں میں لے لوں۔ مگر میں نے ضبط سے کام لیتے ہوئے ایسا نہ
کیا۔ کانچی میری طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ لالٹین کی دھیمی روشنی میں اُس کا گہرا سانولا
چہرہ چمک رہا تھا۔ یہ چمک اُس کی آنکھوں میں بھی تھی جیسے کہہ رہی ہو آج نہیں تو کل تم
مجھے اپنے بازوؤں میں لے لو گے......

وہ چلی گئی، مگر اُس کے جسم کی عجیب سی خوشبو کچھ دیر تک کوٹھڑی میں موجود رہی۔ میں
اپنی انسانی کمزوری پر دل میں شرمندہ ہونے لگا اور میں نے اس قسم کے خیالات کو دل
سے نکال دیا۔

مگر مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ گزر گیا۔ اُس کے جسم سے نکلنے والی
خوشبو یا بو اگرچہ مدھم ہو گئی تھی مگر کوٹھڑی میں برابر موجود تھی۔ رات کا پہلا پہر گزر چکا تھا،
میں جاگ رہا تھا۔ کوٹھڑی میں دھیمی لو والی لالٹین جل رہی تھی۔ مجھے کوٹھڑی کے باہر
قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میں نے دروازے کی طرف دیکھا، دروازے کا پٹ کھلا اور
کانچی اندر آ گئی۔ میری دیکھ بھال کرنے کی اُس رات اُسی کی باری تھی۔ میں نے یہ
ظاہر کیا کہ سو رہا ہوں، اس خیال سے کہ مجھے جاگتا دیکھ کر وہ میرے پاس بیٹھ جائے گی
اور باتیں شروع کر دے گی۔

کانچی جیسے ہی کوٹھڑی میں داخل ہوئی، اُس کے جسم سے اُٹھنے والی خوشبو ایک دم تیز
ہو گئی۔ میں دل میں بڑا حیران ہو رہا تھا کہ یہ خوشبو مجھے کانچی کے جسم سے پہلے کیوں نہیں
آئی تھی؟ شاید اب وہ کوئی خاص دیسی عطر لگانے لگی ہے۔ میں نے سوچا کہ صبح اُس سے
پوچھوں گا۔ کانچی آہستہ آہستہ چلتی چارپائی کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ پہلے وہ اپنی باری
پر رات کو آتی تھی تو مجھے سوتا دیکھ کر واپس چلی جاتی تھی۔ لیکن آج وہ میری چارپائی کے
پاس آ کر کھڑی ہو گئی تھی اور لمبے لمبے سانس لینے لگی تھی...... یہ ظاہر کرنے کے واسطے کہ
میں گہری نیند میں ہوں، میں ہلکے ہلکے خراٹے لینے لگا۔ لیکن نیم وا آنکھوں سے میں اُسے

دیکھ رہا تھا۔

دوسری طرف میرے جذبات میں بھی ایک خلجان سا مچ گیا تھا۔ اُس کے
خاص بو نے میرے خیالات کو درہم برہم کر دیا تھا۔ خوامخواہ دل میں خواہش پیدا ہو
تھی کہ کانچی کی کلائی پکڑ لوں۔ بڑی مشکل سے میں نے اپنے آپ کو قابو میں رکھا
تھا۔ اس دوران کانچی مجھ پر جھک گئی۔ اُس نے اچانک میری کلائی کو بڑی نرمی سے
اور اپنے ہونٹ میری کلائی پر اُس جگہ رکھ دیئے جہاں سندھیا نے چاقو کی نوک سے
سا زخم کر دیا تھا۔ اُس زخم پر کھرنڈ آ چکا تھا۔ مجھے زخم پر سوئی کی ہلکی سی چبھن محسوس
میں نے جان بوجھ کر پہلو بدلا تو کانچی جلدی سے پیچھے ہٹ گئی۔ میں نے پہلو اُس
بدلا تھا جس طرف رانی کھڑی تھی تاکہ میں نیم وا آنکھوں سے اُس کو دیکھ سکوں۔
چند سیکنڈ میرے سر پر کھڑی مجھے گھور کر دیکھتی رہی، مجھے اُس کے سانس لینے کی
رہی تھی۔ پھر اُس نے سر پیچھے کر کے اپنے بالوں کو جھٹکا اور دروازے کی طرف مڑی
کوٹھڑی سے چلی گئی۔

میں نے پوری آنکھیں کھول دیں۔ پہلا خیال جو میرے دل میں پیدا ہوا وہ یہ تھا
کاش! کانچی نہ جاتی۔ میرے پاس ہی رہتی۔ اُس کے جانے کے بعد اُس کے جسم
خاص خوشبو اتنی تیز نہیں رہی تھی، مگر کوٹھڑی میں موجود تھی۔ میں نے اپنی کلائی کے زخم
لالٹین کی روشنی میں دیکھا، زخم کا کھرنڈ اُتر گیا تھا اور وہاں تازہ خون کا دھبہ لگا ہوا تھا
حیرت کی بات تھی کہ مجھے نہ تو برا لگا اور نہ کسی قسم کا خوف محسوس ہوا۔ بس! یہی جی
تھا کہ کانچی ایک بار پھر باہر آئے اور میری کلائی کے زخم پر اپنے ہونٹ رکھ دے۔

میری نیند اُڑ چکی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ کانچی ایک آدھ گھنٹے بعد حسب معمول
دیکھنے ایک بار پھر آئے گی۔ تعجب کی بات یہ تھی کہ پہلے دو تین راتوں کو جب اُس کی
باری ہوتی تھی تو وہ کوٹھڑی میں آ کر مجھے سوتا دیکھ کر چلی جاتی تھی۔ حقیقت یہ تھی کہ
اُس وقت بھی جاگ رہا ہوتا تھا مگر ظاہر یہی کرتا تھا کہ میں سو رہا ہوں۔ آج چوتھی
تھی اور پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ کانچی نے میری کلائی کے زخم پر اپنا منہ لگایا تھا۔ نیند تو
بھی مجھے وہاں بہت ہی کم آتی تھی۔ لیکن کانچی کے جسم سے نکلتی خوشبو کو محسوس کرنے کے
بعد اور خاص طور پر اس خیال سے میری نیند اُچاٹ ہوگئی تھی کہ کانچی ایک بار پھر

گی۔

ایک گھنٹہ بھی نہیں گزرا تھا کہ کانچی پھر کوٹھڑی میں آ گئی۔ اُس کے جسم کی خوشبو یا بو
ایک دم تیز ہوگئی۔ میں اُسی طرح ہلکے ہلکے خراٹے لینے لگا۔ کانچی گہرے سانس لے رہی
تھی۔ میں نیم وا آنکھوں سے اُسے تھوڑا تھوڑا دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک بار پھر مجھ پر جھک
گئی۔ اُس نے بڑی آہستگی اور نرمی کے ساتھ میری کلائی سیدھی کی۔ وہ نہیں چاہتی تھی
کہ میں جاگ پڑوں۔ میں تو جاگ ہی رہا تھا۔ اُس نے اور جھک کر میری کلائی کے زخم
پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔ مجھے سوئی کی ہلکی سی چبھن محسوس ہوئی مگر اس چبھن میں ایک
سرور اور لذت کی کیفیت تھی۔ میں چاہتا تھا کہ وہ اسی طرح میری کلائی پر اپنے ہونٹ
لگائے رکھے۔ مگر پھر نہ جانے کیا خیال آیا کہ میں نے ایسے حرکت کی جیسے کروٹ بدلنے
لگا ہوں۔ کانچی جلدی سے اُٹھ کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ میں تھوڑی تھوڑی آنکھیں کھولے
اُسے دیکھ رہا تھا۔ کانچی نے پہلے کی طرح اپنے بالوں کو ہلکا سا جھٹکا دیا اور دبے پاؤں
چلتی کوٹھڑی سے چلی گئی۔

میں آنکھیں کھول کر خالی کوٹھڑی کو تکنے لگا۔ کاش! کانچی نہ جاتی...... جیسے ہی میرے
دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی میں اُٹھ کر بیٹھ گیا اور اپنے آپ کو ملامت کرنے لگا کہ یہ
مجھے کیا ہو گیا ہے؟ یہ میں کیا سوچنے لگا ہوں؟ مجھے ایسا نہیں سوچنا چاہیئے۔ مجھے اپنے گھر
واپس جانا چاہیئے۔ میری کالج کی پڑھائی باقی ہے۔ ایک بہتر مستقبل میرے سامنے
ہے...... میں نے سر کو جھٹکا اور اس قسم کے بیمار خیالات کو اپنے ذہن سے نکال دیا۔ یہ
محسوس کر کے مجھے خوشی ہوئی کہ میرے ذہن سے وہ تمام خیالات غائب ہو گئے تھے جو
تھوڑی دیر پہلے میرے دل و دماغ پر چھائے ہوئے تھے۔ انسان کے پاس ارادے کی
بہت بڑی طاقت ہوتی ہے۔ شاید یہ طاقت دنیا کی مخلوقات میں سب سے زیادہ انسان کو
ہی عطا ہوئی ہے۔ منفی خیالات انسان پر حملہ کرتے ہیں۔ لیکن اگر انسان کا ارادہ طاقتور
ہو تو کسی منفی خیال میں اتنی طاقت نہیں ہوتی کہ وہ انسان کے ذہن میں ٹھہر سکے۔

ان چار دنوں میں رانی کے جادو ٹونے نے مجھ پر حملہ نہیں کیا تھا۔ اُس کا طلسم ٹوٹ
گیا تھا مگر یہ ایک نئی مصیبت مجھ پر نازل ہو رہی تھی کہ میرا دل اپنے آپ کانچی کی طرف
کھنچنے لگا تھا۔ اُس سے جدا ہونے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ ایک زبردست طاقتور خواہش دل

میں پیدا ہو جاتی تھی کہ کانچی میرے پاس ہی بیٹھی رہے۔ صبح میں نے دن کی روشنی میں
اپنی کلائی کا وہ زخم دیکھا جو سندھیا کے چاقو لگانے سے بنا تھا اور جسے رات کو کانچی
اپنے ہونٹ لگا کر پھر سے کھول دیا تھا۔ یہ زخم فالسے کے دانے جتنا تھا اور اُس کا کم
غائب ہو گیا تھا۔ رات کو نکلا ہوا خون پھر سے جم گیا تھا اور لال موتی سا بنا ہوا تھا۔

جیسے ہی میں کوٹھڑی سے باہر نکلا، دوسری کوٹھڑی میں سے کانچی بھی نکل آئی۔
کے جسم سے نکلنے والی پراسرار خوشبو پہلے ہی سے مجھے آ رہی تھی اور میرا دل اپنے آپ
اُس کی طرف کھنچتا چلا جا رہا تھا، مگر میں نے اپنی قوت ارادی سے خود کو روکا ہوا تھا۔
مجھے دیکھ کر میرے قریب آ گئی۔ اُس کی گلابی آنکھیں کسی گہرے خمار سے بوجھل ہو رہی
تھیں۔ مجھے اُس کی تیز خوشبو محسوس ہونے لگی۔ اس لمحے میرے اندر جیسے ایک آگ
بھڑک اُٹھی مگر میں نے اپنے آپ پر بہت جلد قابو پا لیا۔

اُس نے کہا۔ ''بھگوان کا شکر ہے کہ تم پر رانی کا جادو ٹل گیا۔ یہ سندھیا کے ہون کی
وجہ سے ہوا ہے۔''

میں نے پوچھا۔ ''مگر اُس نے ہماری کلائیوں میں سے خون کیوں نکالا اور پھر ہم
ایک دوسرے کا تھوڑا تھوڑا خون چوسنے کے لئے کیوں کہا؟''

کانچی نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا اور بولی۔ ''پہلے بھیروں جی کے تالاب
چل کر اشنان کر لو! پھر سب کچھ بتا دوں گی۔''

ہم اُس ویران مندر نما کھنڈر کی عمارت کے عقب میں آ گئے۔ وہاں ایک چھوٹا
تالاب بنا ہوا تھا جس پر درختوں نے جھک کر سایہ کر رکھا تھا۔ ہم تالاب میں اُتر گئے۔
تالاب کے ٹھنڈے پانی نے میرے اندر کی لگی آگ کو جیسے ٹھنڈا کر دیا۔

میں نے کہا۔ ''کانچی! اب میں بالکل ٹھیک ہو گیا ہوں۔ تم دیکھ رہی ہو کہ آج
دن ہے اور مجھے رانی کے جادو کا دورہ نہیں پڑا۔ میرا خیال ہے میں کل یہاں سے
جاؤں۔''

کانچی نے ایسی نگاہوں سے مجھے دیکھا کہ جیسے کہہ رہی ہو کیا تمہیں یقین ہے کہ
تم میرے بغیر رہ سکو گے؟

ہم تالاب کی سیڑھیوں پر بیٹھے تھے اور ہماری پنڈلیاں تالاب کے پانی میں تھیں۔

کانچی کہنے لگی۔

''میں سندھیا سے بات کرتی ہوں۔ اگر اُس نے اجازت دے دی تو تم بے شک
چلے جانا۔''

میں نے کہا۔ ''اُس کی اجازت لینے کی کیا ضرورت ہے؟ میں تو بالکل تندرست ہو
گیا ہوں۔''

وہ بولی۔ ''ٹھیک ہے...... تم بے شک کل چلے جانا۔''

نہانے کے بعد ہم کوٹھڑی میں بیٹھ گئے۔ سفید بالوں والی پراسرار گونگی نوکرانی
ہمارے لئے روٹیاں اور چائے بنا کر لے آئی۔ ہم ناشتہ کرنے لگے۔ میرا خیال تھا کہ
کانچی میرے جانے کا سن کر پریشان ہو جائے گی اور مجھے روک لے گی، مگر اُس نے
ایسی کوئی بات نہ کی، صرف اتنا کہا کہ سندھیا سے بات کر لیتے ہیں۔

ناشتہ کرنے کے بعد ہم سندھیا کی کوٹھڑی میں چلے آئے۔ سندھیا حسب معمول
مورتی کی پوجا میں مصروف تھی۔ ہمیں دیکھ کر اُس نے مورتی کو ماتھا ٹیکا اور ہماری طرف
متوجہ ہو کر بولی۔

''کانچی! تمہارا دوست تو مجھے پہلے سے بہتر لگ رہا ہے۔''

کانچی نے کہا۔ ''شاید اسی لئے یہ کل واپس اپنے وطن جانا چاہتا ہے۔ تمہارا کیا خیال
ہے سندھیا؟''

سندھیا نے گیتا کی پستک رُومال میں لپیٹتے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ اسے کل کا
دن دیکھ لینا چاہئے۔''

میں بول پڑا۔ ''مگر تمہارے علاج سے رانی کا جادو ٹوٹ چکا ہے۔ اب میرا یہاں
پڑے رہنا بیکار ہے۔ میرے گھر والے میری راہ دیکھ رہے ہوں گے۔ اور پھر میری کالج
کی پڑھائی پر بھی اثر پڑ رہا ہے۔''

سندھیا مسکرا دی۔ کہنے لگی۔

''کل کا دن دیکھ لو! اگر کل کے دن بھی رانی کے طلسم نے تمہارے اندر حرکت نہ کی
تو پھر تم بے شک چلے جانا۔ تمہیں کوئی نہیں روکے گا۔ یہ ہم تمہاری بھلائی کے لئے ہی
کہہ رہے ہیں۔''

میں نے سوچا کہ چلو! کل کا دن بھی دیکھ لیتے ہیں۔ میں نے حامی بھر لی۔ کانچی
چہرے پر ہلکا ہلکا پراسرار تبسم تھا۔ اُس نے میرا ہاتھ پکڑا اور سندھیا سے کہا۔

''ہم ذرا باہر ٹہلنے جا رہے ہیں۔''

ویران مندر کے حویلی نما کھنڈر کے پیچھے تالاب ہی ایک ایسی جگہ تھی جہاں آدمی
سکتا تھا۔ ہم تالاب کے کنارے پتھر کی سلوں پر بیٹھ گئے۔ میں نے اُس سے پوچھا۔

''کانچی! تم کون سا عطر لگانے لگی ہو؟''

''کیوں......؟'' اُس نے ابروؤں کو اُوپر اُٹھاتے ہوئے کہا۔

میں نے کہا۔ ''جب بھی تم میرے قریب ہوتی ہو مجھے تمہارے جسم سے ایک عجیب
خوشبو آتی ہے۔ یہ خوشبو پہلے مجھے کبھی نہیں محسوس ہوئی تھی۔ یہ کون سا عطر ہے؟''

کانچی نے کہا۔ ''یہاں ایک جڑی بوٹی اُگتی ہے۔ میں اُس کو اپنے جسم پر لگاتی ہوں
یہ اُسی جڑی بوٹی کی خوشبو ہے۔ تمہیں پسند ہے؟''

میں نے کہا۔ ''ہاں...... اچھی لگتی ہے۔''

پھر میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

''تم نے مجھے یہ نہیں بتایا کہ سندھیا نے منتروں کا عمل کرتے ہوئے ہماری کلائیوں کا
خون کس لئے ایک دوسرے کو پلایا تھا؟''

کانچی نے ہلکا سا قہقہہ لگا کر کہا۔

''یہ تو سندھیا کے سنسکاروں کا ایک حصہ تھا۔ ایسا کرنے سے میرے اندر شاستروں
اور ویدوں کے گیان کی جو طاقت تھی، وہ میرے خون کے ساتھ تمہارے جسم میں
ہو گئی تھی۔ اُسی طاقت نے تمہیں بچا لیا اور رانی کا جادو ٹونا بے اثر ہو گیا۔''

میں یہی سمجھا کہ ایسا ہی ہو گا۔ نہ میں ویدوں شاستروں کو جانتا تھا اور نہ مجھے
جاننے کی ضرورت تھی۔ رانی کے جادو ٹونے نے ضرور مجھ پر اثر کر دیا تھا اور میں
شکر ادا کر رہا تھا کہ ان عورتوں کے ذریعے مجھے رانی کے خونی ٹونے سے نجات مل گئی
میں نے کانچی سے یہ بالکل نہ پوچھا کہ وہ رات کو جب میری کوٹھڑی میں آئی
اُس نے میری کلائی کے زخم پر اپنے ہونٹ کیوں رکھ دیئے تھے؟ میں اُس کے
خوامخواہ کی ایک نئی بحث نہیں چھیڑنا چاہتا تھا۔ مجھے کسی طرح وہ دن اور رات

گزارنی تھی، دوسرے دن صبح مجھے وہاں سے چلے جانا تھا۔ میں کانچی سے قریبی ریلوے
سٹیشن کے بارے میں پوچھنے لگا کہ وہ یہاں سے کتنی دُور ہو گا اور کیا وہ کوئی جنکشن ہے؟
اور اُس کا نام کیا ہے؟

وہ بولی۔ ''سٹیشن یہاں سے زیادہ دُور نہیں ہے۔ ہم دن کو چلیں گے تو دوپہر تک
وہاں پہنچ جائیں گے۔ سٹیشن چھوٹا سا ہے۔ اُس کا نام مجھے یاد نہیں رہا۔''

پھر میری طرف محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''کیا سچ مچ تم کل مجھے
چھوڑ کر چلے جاؤ گے؟''

میں عقل مندی سے کام لے رہا تھا۔ کانچی کے دل میں میرے لئے جو محبت پیدا ہو
چکی تھی اُس کو میں ہاتھ بھی نہیں لگانا چاہتا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ اگر یہ چنگاری بھڑک اُٹھی تو
کانچی اور سندھیا مجھے وہاں سے نکلنے نہیں دیں گی اور مجھ پر کوئی نہ کوئی جادو ٹونہ کر دیں
گی۔ میں نے کانچی کو سمجھانے والے لہجے میں کہا۔

''مجھے جانا ہی ہو گا کانچی! میرے بوڑھے ماں باپ میری جدائی میں پریشان ہو
رہے ہوں گے۔ اور میری پڑھائی کا بھی بڑا حرج ہو رہا ہے۔ تم فکر نہ کرو! میں کالج کی
چھٹیوں میں تمہیں ملنے ضرور آؤں گا۔''

میں کانچی کی دلجوئی بلکہ خوشامد کر رہا تھا تا کہ میرے وہاں سے نکل جانے تک وہ
میرے خلاف کوئی کارروائی نہ کرے۔ کانچی نے میری بات بڑی توجہ سے سنی اور گہری
سانس لے کر بولی۔

''ٹھیک ہے شیراز...... جیسے تمہاری مرضی۔ مگر آج میں پہلی بار تمہارے آگے اپنی
محبت کا اقرار کرتی ہوں۔ تم مجھے بہت یاد آؤ گے۔ کاش! ہم دونوں ایک دوسرے کے
ساتھ ساری زندگی اکٹھے رہ سکتے۔''

میں نے جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔

''ایسی کوئی بات نہیں ہے کانچی! میں چھٹیوں میں آ کر تمہارے ساتھ پورے دو مہینے
گزاروں گا۔''

کانچی خاموش رہی، اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے محسوس کیا کہ اُس کے
چہرے پر وہ اُداسی نہیں تھی جو اُس وقت ہونی چاہئے تھی۔ وہ جو کچھ کہہ رہی تھی اُس کے

چہرے سے ظاہر نہیں ہو رہا تھا۔ اُس کا چہرہ ایسے مطمئن تھا جیسے اُسے یقین ہو گیا
اُسے چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا۔ اُس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اپنے ہ
کے ساتھ لگا لیا۔ مجھے اُس کے ہونٹوں کا گیلا لمس محسوس ہونے لگا۔ عجیب بات ہ
لمس سے مجھے ذرا سی بھی کراہت محسوس نہیں ہوئی۔ وہ میری ہتھیلی کو سونگھ کر مسکرائی۔
کہنے لگی۔ ''تم کون سی خوشبو لگاتے ہو...... میرا مطلب ہے کیا تم نے بھی کوئی ع
ہوا ہے؟''

''بالکل نہیں......'' میں نے کہا۔ ''یہاں عطر کہاں سے آ گیا؟''

وہ بولی۔ ''مگر مجھے بھی تمہارے جسم سے خوشبو آ رہی ہے۔ بڑی عجیب بات
نہیں...... میں نہیں مانتی۔ تم نے بھی ضرور کوئی جنگلی بوٹی اپنے جسم پر رگڑی ہو گی۔''

میں نے کہا۔ ''بالکل نہیں کانچی! مجھے ایسا کرنے کی بھلا کیا ضرورت پڑی ہے؟
میں تو جنگلی بوٹیوں کے بارے میں کچھ جانتا بھی نہیں۔''

میں نے آہستہ سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا، پھر اُس نے میری کلائی کا زخم دیکھا اور بولا
''یہ زخم تو پھر کھل گیا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''پتہ نہیں کیوں کھل گیا ہے...... میں اس پر پٹی باندھتا ہوں۔''

اُس نے میری کلائی کے زخم پر اپنی اُنگلی آہستہ سے رکھ کر پیچھے ہٹا لی اور بولی۔
''نہیں نہیں...... ایسا نہ کرنا! یہ اپنے آپ ہی ٹھیک ہو جائے گا۔ دیکھو! میری کلا
زخم بالکل ٹھیک ہو گیا ہے۔''

اُس نے مجھے اپنی کلائی دکھائی۔ میں نے دیکھا کہ اُس کی کلائی پر جہاں سندھ
چاقو سے کھرچا تھا، وہاں تازہ سرخ خون کی ایک بوند سرخ انار کے دانے کی طرح
رہی تھی۔

میں نے کہا۔ ''تمہارا زخم بھی ٹھیک نہیں ہوا۔''

اُس نے اپنی کلائی میرے منہ کے پاس لا کر کہا۔

''تم اس پر اپنی زبان لگا دو! بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔''

میں نے منہ پیچھے کر لیا۔ ''نہیں نہیں......''

وہ ہنس پڑی، اور کہا۔ ''جیسے تمہاری مرضی۔''

وہ دن بھی گزر گیا اور رانی کے جادو ٹونے نے مجھ پر حملہ نہ کیا۔ اُس کی طرف سے
مجھے اطمینان ہو گیا کہ میں رانی کے پھندے سے پوری طرح آزاد ہو چکا ہوں۔ ان
بوٹیوں نے واقعی مجھے بالکل اچھا کر دیا تھا۔ میں دل ہی دل میں اُن کا شکر گزار تھا۔

رات کو کھانا کھانے کے بعد میں اپنی کوٹھڑی میں جانے لگا تو کانچی بولی۔

''آج رات کو تمہاری دیکھ بھال کرنے کی سندھیا کی باری ہے۔ لیکن اُس نے کہا
ہے کہ اب تمہاری دیکھ بھال کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ رانی کا طلسم ٹوٹ چکا ہے۔
اس لئے تم آرام سے سو جانا! ویسے میں رات کو کسی وقت آ کر تمہیں دیکھ جاؤں گی۔''

میں نے اُسے منع نہ کیا۔ میں جانتا تھا کہ میرے منع کرنے پر بھی اگر اُسے آنا ہو گا تو
وہ ضرور آئے گی۔ میں نے بھی سوچ لیا تھا کہ میں یہی ظاہر کروں گا کہ میں سو رہا ہوں،
وہ اپنے آپ واپس چلی جائے گی۔ مجھے وہاں صرف وہی ایک رات گزارنی تھی، صبح تو
مجھے وہاں سے چلے ہی جانا تھا۔

میں کوٹھڑی میں آ کر چارپائی پر لیٹ گیا۔ نیند نہیں آ رہی تھی۔ یہی بے چینی لگی تھی کہ
کسی طرح صبح ہو جائے اور میں وہاں سے نکل جاؤں۔ میں دیر تک آنکھیں کھول کر لیٹا
رہا۔ لالٹین کی لو دھیمی تھی۔ پھر میری آنکھیں کوٹھڑی کے در و دیوار کو دیکھتے دیکھتے تھک
گئیں اور میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ رات گزرتی چلی جا رہی تھی، نیند غائب تھی۔
کانچی کے جسم کی خوشبو یا بو وہاں پہلے سے ہی پھیلی ہوئی تھی مگر دھیمی دھیمی تھی۔ اچانک یہ
خوشبو جیسے میرے دل و دماغ پر چھا گئی...... میری وہی حالت ہو گئی جیسی پہلی بار کانچی
کے جسم کی بو کو محسوس کرنے سے ہوئی تھی۔ میں بے اختیار ہو کر اُٹھ بیٹھا۔ میرے وجود کا
ذرہ ذرہ کانچی کو اپنے قریب دیکھنے کے لئے بے تاب ہو گیا...... میں چارپائی سے اُتر
آیا۔ کوٹھڑی کا دروازہ بند تھا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ میں کہاں جا رہا ہوں؟ کانچی کے
جسم کی خوشبو مجھے لئے جا رہی تھی۔

میں دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ سامنے والی کوٹھڑی کانچی کی تھی۔ اُس کی خوشبو اسی
کوٹھڑی سے آ رہی تھی۔ مجھے ذرا بھی خیال نہیں تھا کہ اگر میں کانچی کی کوٹھڑی میں داخل
ہو گیا تو وہ کیا محسوس کرے گی؟ کیا سوچے گی؟ کوئی انجانی طاقت مجھے چلا رہی تھی اور
میں چل رہا تھا۔ میں نے کانچی کی کوٹھڑی کے دروازے کو ذرا سا دھکیلا، دروازہ کھل گیا۔

مجھے کانچی کے جسم کی خوشبو کے بھرپور جھونکے نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ دھیمی لو
لالٹین کوٹھڑی میں جل رہی تھی۔ کانچی چارپائی پر گہری نیند سو رہی تھی۔ میں آہستہ آہ
چلتا چارپائی کے پاس آ گیا۔ کانچی نے ایک بازو اپنے سر کے نیچے اور دوسرا بازو
سینے کے ساتھ لگا رکھا تھا۔ میرا سانس اپنے آپ تیز تیز چلنے لگا تھا۔ میں نے جھک
کانچی کی اُس کلائی کو دیکھا جو اُس کے سینے کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ کچھ پتہ نہیں مجھے
ہو گیا تھا؟

میں نے ہاتھ آگے بڑھا کر کانچی کی کلائی اُس کے سینے سے اُٹھا کر اپنے ہاتھ
لے لی۔ لالٹین کی مدھم روشنی میں کانچی کی کلائی پر زخم کا نشان سیاہی مائل ہو رہا تھا۔
نے کانچی کی کلائی کو اُس کے سینے پر آہستہ سے رکھ دیا، جھک کر فرش پر بیٹھ گیا اور اپ
ہونٹ کانچی کی کلائی کے زخم کے ساتھ لگا دیئے۔ جیسے ہی میں نے ایسا کیا، کانچی نے
دوسرا بازو میری گردن میں ڈال کر مجھے دبوچ لیا۔ اُس پر دیوانگی کی کیفیت طاری
گئی۔ مجھے ایسے لگا جیسے کسی خونخوار شیرنی نے مجھے دبوچ لیا ہے اُس نے اپنے دانت
سے میرے بدن کو کاٹنا شروع کر دیا...... میری چیخ نکل گئی اور میں نے ایک زبردس
جھٹکے سے کانچی کو پرے گرایا اور دروازے کی طرف دوڑا۔ مجھے اپنے پیچھے ایک بھیا
چیخ سنائی دی۔ میں دیوانہ وار کوٹھڑی سے نکلا، تاریک راہداری سے بھاگتے بھاگتے
منحوس ویران عمارت کے دروازے میں سے باہر چھلانگ لگا دی اور جھاڑیوں میں گرا
گرتے ہی اُٹھا اور جس طرف میرا منہ اُٹھا اُسی طرف دوڑنا شروع کر دیا......

اندھیری رات تھی۔ تاروں کی پھیکی روشنی میں جھاڑیاں، درخت اور چھوٹے چھو
پہاڑی ٹیلوں کی ڈھلانیں دُھندلی دُھندلی سی نظر آ رہی تھیں۔ میں رُکے بغیر دوڑتا
گیا اور کافی دُور نکل آیا۔ چپل اُتار کر میں نے ہاتھ میں پکڑ لی تھی اس خیال سے
پھٹ گئی تو ننگے پاؤں آبادی میں داخل ہونے پر لوگ مجھے عجیب نظروں سے دیک
گے۔ دوڑتے دوڑتے تھک گیا تو ایک جگہ سانس لینے کو بیٹھ گیا اور غور سے دیکھنے
ٹیلے پیچھے رہ گئے تھے، سامنے میدان تھا۔ اُونچی نیچی گھاس تھی۔ دُور درختوں کے
بڑے دھبے دکھائی دے رہے تھے۔ یہ علاقہ میرا جانا پہچانا نہیں تھا۔ پتھریلی زمین
پاؤں دوڑنے سے میرے پاؤں درد کرنے لگے تھے۔ ذرا سانس ٹھیک ہوا تو

پہن لی اور تیز تیز چلنے لگا۔
ایک دو بار پیچھے مڑ کر بھی دیکھا کہ کہیں کانچی میرا پیچھا تو نہیں کر رہی؟ مگر وہ کہیں نظر
نہ آئی۔ اُس نے کہا تھا کہ ریلوے سٹیشن وہاں سے دُور نہیں ہے۔ مگر مجھے یہ علم نہیں تھا کہ
ریلوے سٹیشن کی طرف جا رہا ہوں یا کسی اور طرف جا رہا ہوں؟ بس! اللہ توکل چلا جا
کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی آبادی تو ضرور آئے گی۔ دل میں یہ خیال ضرور تھا کہ میں
سے بہت دُور ہوں اور یہ ہندوستان کے جنوب کا علاقہ ہے۔ میرے پاس ٹکٹ
دینے کے لئے پیسے بھی نہیں تھے۔ میں بہت دیر تک رات کے اندھیرے میں چلتا رہا۔
آخر دُور سے مجھے ایک روشنی ٹمٹماتی دکھائی دی......
میرے دل کو حوصلہ ہو گیا کہ یہ کوئی آبادی ہے۔ میں اُسی طرف چل پڑا۔ یہ روشنی
چھوٹی سی سڑک پر بجلی کے کھمبے پر لگے بلب کی روشنی تھی۔ میں سڑک پر چلنے لگا۔ یہ
اکلا علاقہ تھا، ناریل اور تاڑ کے درخت دُور دُور اُگے ہوئے تھے۔ ایک جگہ سڑک
کنارے سنگ میل لگا تھا۔ وہ ٹیڑھا ہو گیا تھا۔ اُس پر تامل زبان میں کسی شہر کا نام لکھا
جو میری سمجھ میں نہ آیا۔ اس کے ساتھ ایک اور دو کے ہندسے پڑے تھے۔ وہ شہر یا
وہاں سے بارہ میل کے فاصلے پر تھا۔ میں رُک نہیں سکتا تھا۔ چلتا گیا۔ ایک جگہ دُور
ختوں کے پیچھے دو تین روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ میں نے اُسی طرف کا رُخ کر لیا۔ یہ
ک چھوٹا سا ریلوے سٹیشن تھا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ وہاں ایک ہی پلیٹ فارم
میں ایک خالی بنچ پر بیٹھ گیا۔
اتنے میں ایک آدمی میرے پاس آ گیا۔ اُس نے دھوتی اور بنیان پہن رکھی تھی۔
نے تامل زبان میں مجھ سے کچھ پوچھا۔ میں نے ہندوستانی یعنی ٹوٹی پھوٹی اُردو میں
میں تامل نہیں جانتا۔ اُس آدمی نے ہندوستانی میں پوچھا۔
"کدھر جائے گا؟"
میں نے کہا۔ "دِلی۔"
وہ بولا۔ "یہاں سے دِلی کوئی ٹرین نہیں جاتی۔"
میں نے کہا۔ "پھر کس طرف کو جاتی ہے؟"
وہ بولا۔ "یہاں سے اورنگ آباد کو گاڑیاں جاتی ہیں۔ تم اورنگ آباد والی گاڑی میں

بیٹھ جانا!''

''گاڑی کس وقت آئے گی؟'' میں نے پوچھا۔

اُس آدمی نے اپنے پیچھے کی جانب دیکھ کر کہا۔ ''اُس کا ٹائم تو ہو گیا ہے۔ مگر ہو
ہے لیٹ ہو۔''

جاتے ہوئے کہنے لگا۔ ''جلدی سے ٹرین میں بیٹھ جانا! یہاں گاڑیاں زیادہ دیر
ٹھہرتیں۔''

پھر وہ چلا گیا۔ خدا جانے وہ آدمی رات کے وقت وہاں کس طرف سے آ گیا تھا۔
وہ مجھے بڑی مفید معلومات دے گیا تھا۔ دس پندرہ منٹ کے بعد ٹرین آ گئی۔ مسافر
سے بھری ہوئی تھی۔ میں جلدی سے ایک ڈبے میں گھس کر بیٹھ گیا۔

ٹرین نے اورنگ آباد پہنچتے پہنچتے دو دن لگا دیئے۔ ایک بزرگ مسافر سے راس
میں تھوڑی بہت شناسائی ہو گئی تھی۔ یہ بزرگ مسلمان تھے اور دکن میں اُن کا جوتو
کاروبار تھا۔ جب اُنہیں پتہ چلا کہ میرے پاس ٹکٹ کے پیسے نہیں ہیں اور میں نے
دن سے کچھ نہیں کھایا تو اُنہوں نے کمال مروّت سے مجھے اپنے ساتھ کھانا کھلایا او
کے آگے امرتسر تک کے ٹکٹ کے پیسے بھی دیئے۔ میں اُن نیک دل بزرگ کا آج
ممنون ہوں۔

مزید تین دنوں تک ریل گاڑی میں سفر کرنے کے بعد میں اپنے شہر پہنچ گیا۔ میرا
طرح کسی کو بتائے بغیر گھر سے بھاگ جانا اور پھر کسی وقت اچانک واپس گھر آ جانا
نئی بات نہیں تھی۔ والد صاحب معمول کے مطابق ڈانٹ ڈپٹ کرتے اور میں آئندہ
طرح نہ بھاگنے کا وعدہ کرتا اور زندگی معمول کے مطابق چل پڑتی۔ اس دفعہ
صاحب نے کافی سرزنش کی اور میں سر جھکائے سنتا رہا۔ اور پھر سب کچھ بھول گیا
ایک بار پھر کالج کے پہلے سال میں داخلہ لیا اور پڑھائی شروع کر دی۔

اپنے شہر میں آئے مجھے ایک ہفتہ گزر گیا تھا۔

اس دوران رانی کے جادوٹونے کا خطرناک دورہ مجھے بالکل نہیں پڑا تھا۔ میں
خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ اُس نے میرے گناہ معاف کر دیئے ہیں اور مجھے رانی
خوفناک جلاد عورت کے خونی پنجے سے نجات دلا دی ہے۔ مزید ایک ہفتہ گزر گیا۔

دوسرا ہفتہ بھی گزر گیا اور مجھ پر رانی کے جادوٹونے کا اثر ظاہر نہ ہوا تو میں نے رانی کا
خیال دل سے نکال دیا اور اپنی ساری توجہ پڑھائی کی طرف لگا دی۔ کانچی کی طرف سے
مجھے اس لئے کوئی پریشانی نہیں تھی کہ اُس نے مجھ پر کوئی جادوٹونہ نہیں کیا تھا بلکہ میرے
سر سے رانی کا جادو اُتارنے میں میری مدد ہی کی تھی۔ باقی اُس رات مجھے اپنے قریب پا
کر اُس پر جو وحشت سوار ہو گئی تھی وہ میں یہی سمجھتا تھا کہ جن ہندو عورتوں کا جنگلوں میں
بسیرا ہوتا ہے اور جو دیوی دیوتاؤں کی داسیاں رہ چکی ہوتی ہیں اور جن پر مخالف جنس کے
جذبات کا شدید غلبہ ہوتا ہے اُن سے اِس قسم کی باتیں ضرور سرزد ہوتی ہیں۔ ہندو دیومالا
میں ایسی عورتوں کو پدمنی عورتیں کہا گیا ہے۔ ایسی عورتیں دوسری عورتوں کے مقابلے میں
جذباتی اعتبار سے زیادہ شدت پسند اور وحشی ہوتی ہیں۔

ایک مہینہ گزر گیا...... موسم میں خنکی آنا شروع ہو گئی۔ شاید یہ ماہ ستمبر کا آخر تھا۔ ایک
روز میں ایک مقامی سینما ہاؤس میں لگی فلم کا آخری شو دیکھنے چلا گیا۔ اُس روز میں تقریباً
سارا دن پڑھائی کرتا رہا تھا اور ذہن کافی تھک گیا تھا، محض تفریح کی خاطر دوسرا شو
دیکھنے چل دیا۔ فلم رات کے تقریباً بارہ بجے کے قریب ختم ہوئی۔ یہ میں سن 1946ء
کے ستمبر کے مہینے کی بات کر رہا ہوں۔ اُن دنوں ہندوستان میں پاکستان کی تحریک بڑی
زور پکڑ چکی تھی۔ بڑے جلسے ہوتے تھے، جلوس نکلتے تھے۔ مگر فسادات وغیرہ ابھی شروع
نہیں ہوئے تھے۔ سیاست سے مجھے کبھی دلچسپی نہیں رہی تھی، صرف اتنا معلوم تھا کہ
ہندوستان کے مسلمان اپنا علیحدہ وطن چاہتے ہیں جہاں وہ آزادی سے زندگی بسر کر
سکیں۔ یہ بات مجھے اچھی لگتی تھی کیونکہ ہندوستان کے شہروں اور جنگلوں کی آوارہ
گردیوں کے زمانے میں ہی مجھے اِس حقیقت کا علم ہو گیا تھا کہ ہندوؤں کا مذہب
ہمارے دین اسلام کے بالکل اُلٹ ہے۔ اور ہندو قوم مسلمانوں کو پسند نہیں کرتی۔ اور
اُن کا بس چلے تو وہ ایک ایک مسلمان کو پکڑ کر اپنی ڈراؤنی چہروں والی مورتیوں کے
آگے قربان کر دیں۔

خود میرے ساتھ یہی ہونے والا تھا۔ اگر عین وقت پر کانچی میری مدد نہ کرتی تو رانی
اور اُس کے جلاد ہندو پجاری ساتھیوں نے تو مجھے پاروتی دیوی کے آگے ذبح کر ڈالنا
تھا۔ میں پاکستان کے حق میں تھا مگر میں نے اس کی تحریک میں کبھی حصہ نہیں لیا تھا۔

جب میں فلم دیکھ کر سینما ہاؤس سے باہر نکلا تو سینما ہاؤس کے پیچھے جو گراؤنڈ
وہاں کوئی جلسہ ہو رہا تھا اور لوگ تھوڑی تھوڑی دیر بعد پاکستان زندہ باد اور قائداعظم
زندہ باد کے نعرے لگاتے تھے۔ میں گراؤنڈ کے کنارے کنارے چلتا دوسری طرف
شہر کا سب سے بڑا باغ تھا اُس میں سے گزرنے لگا۔ ابھی شہروں میں اتنا شور نہیں
کرتا تھا۔ ایک تو آبادی زیادہ نہیں تھی دوسرے نہ کوئی رکشہ تھا نہ سکوٹر، نہ ویگنیں
تھیں۔ شہروں میں بھی زیادہ تر تانگے اور سائیکل ہی چلتے تھے۔ کہیں کہیں کوئی کار نظر
جاتی تھی۔ رات کو تو بڑے بڑے شہروں میں بھی سناٹا چھا جاتا تھا۔ ہمارا شہر کوئی اتنا بڑا نہیں
تھا۔ اور وہاں تو رات کے وقت سڑکیں بازار سنسان ہو جاتے تھے۔ اُس رات بھی بڑی
خاموشی تھی۔ ہم لوگ اس خاموشی کے عادی تھے اور ہمیں بڑی اچھی لگتی تھی۔

جلسے کے نعروں کی آوازیں کچھ دُور تک مجھے سنائی دیں، پھر وہ غائب ہو گئیں۔ میں
کمیٹی کے بڑے باغ کے کنارے کنارے اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا۔ یہ میرے گھر
شارٹ کٹ راستہ ہی تھا۔ باغ میں سے رات کی رانی کی بڑی میٹھی خوشبو آ رہی تھی۔ مجھے
یہ خوشبو بڑی اچھی لگی اور میں ایک جگہ سے باغ کے اندر داخل ہو گیا۔ سوچا باغ کے
درمیان سے گزرنے والی چھوٹی نہر کے پاس سے ہو کر اپنے محلے کی طرف نکل جاؤں گا۔

باغ کچھ زیادہ ہی سنسان تھا۔ گارڈینیا کی جھاڑیوں میں جگنو چمک رہے تھے۔
ٹھنڈی کھوئی کی طرف سے ایک جھینگر کے بولنے کی مسلسل آواز آ رہی تھی۔ رات کی رانی
کی خوشبو سارے باغ میں پھیلی ہوئی تھی۔ اُس زمانے میں فضا میں کوئی آلودگی نہیں ہوتی
تھی۔ رات کو آسمان پر ستارے خوب چمکا کرتے تھے۔ اُس رات بھی آسمان پر ستارے
چمک رہے تھے۔ اُن کی ٹھنڈی ٹھنڈی مدھم روشنی سارے باغ میں پھیلی ہوئی تھی۔ میرا
دل چاہا کہ معلوم کرنا چاہئے یہ رات کی رانی کے پودوں کی جھاڑیاں کہاں ہیں؟ جس
طرف سے رات کی رانی کی بڑی گہری خوشبو آ رہی تھی، میں اُس طرف گیا۔ یہ باغ
میرے لئے اجنبی نہیں تھا۔ میں اسی باغ میں کھیل کود کر بڑا ہوا تھا۔ ایک جگہ رات
رانی کا بہت بڑا جھاڑ تھا۔ اُس جھاڑ میں سے بڑی تیز اور گہری خوشبو نکل رہی تھی۔ میں
نے اُس کے قریب کھڑے ہو کر دو تین لمبے لمبے سانس لئے، میرے دل و دماغ میں
رات کی رانی کی ٹھنڈی خوشبو پھیل گئی۔

میں نے سوچا کہ رات کی رانی کی ایک پھولوں بھری ٹہنی توڑ کر ساتھ لے جانی
ہے۔ میں اسے اپنے سرہانے کے پاس رکھ کر سوؤں گا۔ مجھے بچپن میں بتایا گیا تھا کہ
ات کو پھول نہیں توڑنے چاہئیں۔ رات کو پھولوں میں پریاں سو رہی ہوتی ہیں۔ مگر یہ
بچپن کی باتیں تھیں۔ بڑی عمر میں آ کر کون ان باتوں پر غور کرتا ہے؟ میں نے جھک کر
دیکھا، رات کی رانی کے پھول بڑے چھوٹے چھوٹے اور سبزی مائل سفید ہوتے ہیں۔
ایک جگہ ٹہنی پر ان پھولوں کا گچھا سا بنا ہوا تھا۔ میں نے بڑی احتیاط سے ہاتھ ڈال کر
ایک گچھا توڑ لیا، اُسے ناک کے پاس لا کر سونگھا۔ میری رُوح معطر ہو گئی۔ میں بڑا خوش
ہوا اور رات کی رانی کے پھولوں والی ٹہنی ہاتھ میں پکڑ کر گھر کی طرف چل پڑا۔ میں باغ
والی نہر کی طرف جا رہا تھا۔

باغ میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد میں رات کی رانی کی ٹہنی چہرے
کے پاس لا کر پھولوں کی خوشبو سونگھ لیتا تھا۔ باغ میں سے جو نہر گزرتی تھی وہ پانچ چھ
فٹ ہی چوڑی تھی۔ ایک جگہ اُس نہر پر چھوٹی سی پُلیا بنی ہوئی تھی جہاں سے نہر کے پار
جاتے تھے۔ نہر کے پار امرودوں کا باغ تھا جس کی دوسری جانب کرکٹ کی گراؤنڈ تھی۔
اُس گراؤنڈ کے پاس ہی ہمارے محلے کی آبادی شروع ہو جاتی تھی۔

میں نہر کی پُلیا کے قریب پہنچا تو اندھیرے میں مجھے ایسے لگا جیسے پُل کی اینٹوں سے
بنی ہوئی منڈیر پر کوئی بیٹھا ہوا ہے۔ دُور سے اندھیرے میں مجھے انسان کا سایہ سا ہی نظر
آ رہا تھا۔ میں یہی سمجھا کہ امرودوں کے باغ میں رات کو غلیل سے مٹی کے غلیلے پھینک کر
امرود کے درختوں پر بیٹھے طوطوں کو اُڑاتے تھے، یہ کوئی رکھا ہی ہو گا جو تھک کر پُل پر
بیٹھ گیا ہو گیا۔ آم کے درختوں کے قریب سے گزر کر جب میں نہر کی پُلیا کے اور قریب
آیا تو یہ دیکھ کر بڑا حیران ہوا کہ اب وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ پُل کی منڈیر خالی تھی۔ نہر کا
میلا پانی خاموشی سے بہہ رہا تھا۔ میں نے اسے محض اپنا وہم سمجھا اور پُل پر سے گزر گیا۔
تین چار قدم آگے امرودوں کا باغ شروع ہو جاتا تھا۔

امرودوں کے باغ میں داخل ہونے سے پہلے یونہی پلٹ کر میں نے نہر کے پُل کی
طرف دیکھا تو میں ڈر گیا۔ وہ انسانی سایہ پُل پر سر جھکائے اُسی طرح بیٹھا ہوا تھا۔
خوف کی ایک لہر میرے جسم میں دوڑ گئی۔ ضرور یہ کوئی غیر انسانی مخلوق تھی۔ میں جتنی تیز

چل سکتا تھا چلتا ہوا باغ سے نکل گیا۔ رات کی رانی کی پھولوں والی ٹہنی میرے ہاتھ میں تھی۔ سامنے ہمارے محلے کا دروازہ تھا۔ ہماری گلی سنسان پڑی تھی۔ ہمارے مکان کی پہلی منزل میں ایک چھوٹی سی بیٹھک تھی جسے میں نے اپنا کمرہ بنا لیا ہوا تھا۔ وہیں میں کالج کی پڑھائی وغیرہ کرتا تھا اور وہیں رات کو سوتا تھا۔

فلم دیکھنے جاتے وقت میں بیٹھک کو باہر سے تالا لگا گیا تھا۔ میں نے تالا کھولا۔ بیٹھک میں آ کر بتی جلائی اور پلنگ پر بیٹھ کر سوچنے لگا کہ جو کچھ میں نے دیکھا ہے کیا اس میں کوئی حقیقت تھی کہ محض میرا وہم تھا؟ دوسری دفعہ نہر کے پُل پر انسانی سائے کو دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا تھا کہ یہ میرا وہم نہیں تھا۔ میں نے کپڑے بھی نہ بدلے اور اسی طرح بوٹ اُتار کر پلنگ پر لیٹ گیا۔ رات کی رانی کی ٹہنی میں نے اپنے سرہانے کے پاس رکھ لی تھی۔ اُس میں سے بڑی تیز خوشبو نکل رہی تھی۔ میں نے ہاتھ لمبا کر کے سوئچ آف کر کے بتی بجھا دی۔ بیٹھک میں اندھیرا چھا گیا۔ پھر روشندان کے شیشوں میں سے باہر گلی کے کھمبوں پر جلتی کمیٹی کی بتی کی ہلکی ہلکی روشنی اندر آنے لگی۔ پُل پر بیٹھے ہوئے انسانی سائے کا منظر بار بار میری آنکھوں کے سامنے آ جاتا تھا۔ اچانک مجھے محسوس ہوا کہ رات کی رانی کی خوشبو نہیں آ رہی۔ میں نے سرہانے کے پاس ہی رکھی رات کی رانی کی ٹہنی اُٹھا کر اُس کے پھولوں کو سونگھا، بڑا حیران ہوا۔ پھولوں میں ذرا سی بھی خوشبو نہیں آ رہی تھی۔ میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ ایک بار پھر پھولوں کو ناک کے قریب لا کر سونگھا۔ اب اُن پھولوں میں سے رات کی رانی کی بجائے کوئی دوسری خوشبو نکلنے لگی تھی...... میں سر سے پاؤں تک کانپ اُٹھا۔ یہ کانچی کے جسم کی خوشبو تھی...... میرے خدا! یہ خوشبو اتنی دُور سے یہاں کیسے آ گئی؟ میں ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ مجھے ایک دم سے چکر سا آیا اور میرا سر آگے کو ڈول گیا۔ میں عالمِ اضطراب میں پلنگ سے اُتر کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ ایک بار پھر وہی چکر آیا اور ایک لمحے کے لئے بیٹھک کی چیزیں گھومنے لگیں...... میں نے گھبراہٹ میں آنکھیں بند کر لیں۔ میرا سر چکرانا بند ہو گیا......

میں نے آنکھیں کھول دیں۔ اب میرے دل میں کوئی خوف، کوئی ڈر نہیں تھا۔ اس کی جگہ ایک سرور انگیز کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ کانچی کے جسم کی وحشت خیز خوشبو سارے بیٹھک میں بھر گئی تھی۔ میری آنکھیں خمار سے ایسے بوجھل ہو رہی تھیں جیسے میں نے

نشہ کیا ہوا ہو۔ مجھے کانچی کی آواز آئی۔ اُس آواز میں محبت کا بلاوا تھا۔

"شیراز! شیراز! میرے پاس آ جاؤ...... تم مجھے چھوڑ کر کیوں گئے تھے...... میں تمہارے بغیر اکیلی ہوں...... اُداس ہوں...... میرے پاس آ جاؤ...... آ جاؤ...... آ جاؤ!"

کانچی کی محبت بھری آواز کبھی قریب آ جاتی اور کبھی دُور ہو جاتی۔ مجھ پر وہی غیر شعوری حالت طاری ہو گئی۔ کچھ یاد نہیں رہا تھا کہ میں کون ہوں؟ کہاں بیٹھا ہوں؟ ایک ہی اُمنگ، ایک ہی آرزو نے دل میں پیدا ہو کر میرے سارے وجود کو اپنی آغوش میں لے لیا تھا۔ یہ آرزو، یہ اُمنگ کانچی سے ملنے، اُس کے پاس پہنچنے کی تھی۔ میری سوچ کانچی کے جسم کی خوشبو نے سلب کر لی تھی۔ اس کے بعد میں نے جو کچھ بھی کیا غیر شعوری حالت میں کیا۔ لیکن میں اپنے آپ کو دیکھ رہا تھا کہ میں کیا کر رہا ہوں؟ میں جو کچھ کر رہا تھا اُس کا مجھے شعور تھا۔ کیوں کر رہا تھا؟ اس کا شعور نہیں تھا۔ دل میں ایک ہی تڑپ تھی جس نے طوفان سا مچایا ہوا تھا۔ یہ تڑپ کانچی سے ملنے، اُس کے قریب ہو جانے کی تھی۔ سوچنے سمجھنے اور اپنے عمل کا تجزیہ کرنے کی صلاحیت معدوم ہو چکی تھی۔ میں اُٹھ کر اپنے صندوق کے پاس گیا۔

اُس میں، میں نے روپے رکھے ہوئے تھے۔ میں نے سارے نوٹ نکال کر اپنی قمیض کی جیب میں ٹھونسے، بوٹ پہنے اور بیٹھک کا دروازہ کھلا چھوڑ کر گلی میں نکل آیا۔ اُس وقت رات کا ایک یا ڈیڑھ بج رہا تھا۔ گلی خالی پڑی تھی۔ میں سٹیشن کی طرف چل پڑا۔ کانچی کے جسم کی خوشبو میرے ساتھ ساتھ تھی۔ میرے ہونٹوں پر ایک غیر محسوس سا تبسم تھا۔ جیسے جیسے آگے بڑھ رہا تھا دل میں مسرت اور انجانی لذت کی لہریں اُٹھ رہی تھیں۔ سٹیشن پر ایک تانگے میں سے کچھ سواریاں اُتر کر اندر جا رہی تھیں۔ میں بکنگ آفس پر آ گیا۔ ایک سردار جی رات کی ڈیوٹی پر کھڑکی کے جنگلے کے پیچھے بیٹھے تھے۔ میں نے جاتے ہی جیب سے پچاس روپے کا نوٹ نکال کر اُن کی طرف بڑھایا اور کہا۔

"ایک ٹکٹ اورنگ آباد کا دیں۔"

سردار جی نے جنگلے کے پیچھے سے میری طرف گھور کر دیکھا اور بولے۔

"اورنگ آباد کی کوئی گاڑی یہاں سے نہیں جاتی۔"

میں نے کہا۔ "دِلّی کا ٹکٹ دے دیں۔"

سردار جی نے دِلّی کا ایک ٹکٹ ایک خانے میں سے نکال کر چھوٹی سی مشین میں
کر اُس پر کوئی نشان لگایا اور بولے۔

''دِلّی کی گاڑی صبح چھ بجے جاتی ہے۔''

میں نے کہا۔''کیا اس وقت دِلّی کی طرف کوئی گاڑی نہیں جاتی ؟''

سردار جی نے بتایا کہ ایک پسنجر ٹرین انبالے تک جاتی ہے۔ میں انبالے تک
میں چلا جاؤں اور آگے دِلّی جانے والی کوئی گاڑی پکڑ لوں۔ میں نے باقی ریزگاری
کر جیب میں ڈالی اور پلیٹ فارم پر آ گیا۔ یہ انگریزوں کا زمانہ تھا۔ اُس زمانے
ریل کے کرائے زیادہ نہیں ہوتے تھے۔ روپے کی بڑی قیمت تھی۔ تھرڈ کلاس کا کرایہ
زیادہ کم ہوتا تھا۔ امرتسر یا لاہور سے بمبئی جانے کا تھرڈ کلاس کا کرایہ اُنیس بیس رو
لگتا تھا۔ ایک پسنجر ٹرین پلیٹ فارم پر کھڑی تھی۔ شاید وہ فیروز پور سے آئی تھی اور
انبالے جا رہی تھی۔

میں ایک ڈبے میں بیٹھ گیا۔ کچھ پتہ نہیں تھا کہ میرے آس پاس کون سے مسافر بیٹھے
ہیں یا سو رہے ہیں۔ میرے کان کانچی کی آواز دوبارہ سننے کو بے تاب ہو رہے تھے۔
نے آہستہ سے کہا۔

''کانچی! میں تمہارے پاس آ رہا ہوں۔''

اس کے جواب میں کانچی کی آواز نہ آئی۔ ٹرین چل پڑی۔ ڈبے کے تقریباً
مسافر لمبے لمبے پڑے سو رہے تھے مگر میں جاگ رہا تھا، دروازے والی سیٹ کے پاس
بیٹھا کھڑکی میں سے باہر دیکھ رہا تھا۔ نیند غائب تھی۔ باہر رات کی تاریکی چھائی ہوئی
تھی۔ میں اُڑ کر کانچی کے پاس پہنچ جانا چاہتا تھا۔ ٹرین کی رفتار میرے جذبہ عشق
مقابلہ میں کچھ نہیں تھی۔

انبالے پہنچتے پہنچتے دن نکل آیا۔

میں نشے کی کیفیت میں ٹرین سے اُتر کر چائے کی کینٹین پر گیا، ناشتہ کیا اور
جانے والی کسی ٹرین کے بارے میں پوچھا۔ معلوم ہوا کہ ایک گھنٹے بعد ایک ٹرین آ
گی، وہی دِلّی جائے گی۔ میں پلیٹ فارم کے ایک بنچ پر بیٹھ گیا۔ میرے ہونٹ آ
آہستہ ہل رہے تھے۔ میری زبان پر کانچی کا نام بار بار آ جاتا تھا۔ اُس کے جسم کی خو

میرے چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ میں اُس کے جسم کی خوشبو میں سرشار کسی وقت اپنے
آپ مسکرانے لگتا۔ ایک ٹرین پلیٹ فارم پر آ کر رُک گئی۔ کسی نے کہا یہ ٹرین دِلّی جائے
گی۔ میں ٹرین کی طرف بڑھا۔ دن کی روشنی میں بھی ٹرین سے اُترتے اور ٹرین میں
سوار ہوتے مسافر مجھے دُھندلے دُھندلے سے دکھائی دے رہے تھے۔ میں ایک ڈبے
میں بیٹھ گیا۔ میرے کان کانچی کی آواز سننے کو بے چین ہو رہے تھے۔

میری زبان سے اپنے آپ نکل گیا۔''کانچی! مجھے آواز دو۔''

میرے ساتھ بیٹھے ہوئے ایک مسافر نے میری طرف غور سے دیکھا اور بولا۔

''آپ نے مجھ سے کچھ کہا بھائی صاحب؟''

''نہیں......'' میں نے مسکراتے ہوئے نیم وا آنکھوں سے جواب دیا اور بھول گیا کہ
میرے پاس کون بیٹھا ہوا ہے؟ اسی کیفیت اور اسی حالت میں گم، عالم مدہوشی میں، کانچی
کی خوشبو سے ایک سرور، ایک لذت حاصل کرتا دِلّی پہنچ گیا۔ مجھے بالکل یاد نہیں کہ دِلّی
پہنچنے کے بعد میں نے کھانا کھایا، کیا کھایا؟ اتنا یاد ہے کہ میں سٹیشن سے باہر گیا تھا اور
میں نے اورنگ آباد کا تھرڈ کلاس کا ایک ٹکٹ خریدا تھا اور واپس پلیٹ فارم پر آ گیا تھا۔
دِلّی سے گاڑیاں جنوبی ہندوستان کی طرف جاتی تھیں۔ ایک گاڑی حیدر آباد (دکن) جا
رہی تھی۔ وہ اورنگ آباد سے ہو کر حیدر آباد جاتی تھی۔ یہ گاڑی ساری رات اور اگلا سارا
دن چلتی رہی۔

میں نے اگر کوئی اور نشہ کیا ہوتا تو وہ اُتر بھی جاتا۔ لیکن یہ کانچی کے جسم کی خوشبو کا
نشہ تھا۔ خدا جانے اس میں کیا جادو تھا جس نے مجھے مسحور کر رکھا تھا؟ کانچی کے جسم کی
خوشبو میرے ساتھ ساتھ سفر کر رہی تھی۔ اُس خوشبو نے سرشاری کی کیفیت کو برقرار رکھا
ہوا تھا۔ اورنگ آباد پہنچ کر میں پلیٹ فارم پر ایک بنچ پر بیٹھ گیا۔ اتنا مجھے ہوش تھا کہ
یہاں سے ایک ڈیڑھ گھنٹے کے ٹرین کے سفر کے بعد وہ چھوٹا سا سٹیشن آتا ہے جہاں سے
کانچی کے بھیروں جی کے استھان کو راستہ جاتا ہے۔ میں اُس سٹیشن کا نام بھول گیا تھا۔
میں اُسے یاد کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ سٹیشن کا نام یاد نہیں آ رہا تھا۔ عین اُس وقت
میرے کانوں میں کانچی کی خمار آلود آواز بلند ہوئی۔

''منگل پت کا ٹکٹ لے کر میرے پاس آ جاؤ! میں تمہاری راہ دیکھ رہی ہوں۔''

یہی اُس سٹیشن کا نام تھا۔ میں نے بے اختیار ہو کر کہا۔
''کانچی! میں آ رہا ہوں۔''
کانچی کے گہرا سانس لینے کی آواز آئی اور پھر خاموشی چھا گئی۔ میں نے منگل پت سٹیشن کا ٹکٹ لیا اور ٹرین کے انتظار میں بیٹھ گیا۔ انتظار کی مجھے ذرا سی بھی کوفت محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے کانچی میرے سامنے، میرے پاس بیٹھی ہوئی ہے۔ کانچی کی آواز نے میرے سرور کی کیفیت کو اور بھڑکا دیا تھا۔ مجھے کچھ یاد نہیں کب ٹرین آئی، کب میں اُس میں سوار ہوا اور کب منگل پت کے سٹیشن پر اُترا؟ اُس وقت شام ہو گئی تھی۔ اورنگ آباد سے روانہ ہونے سے پہلے ہی آسمان پر سیاہ بادل جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔
منگل پت کے سٹیشن پر پہنچنے کے بعد ہلکی ہلکی بونداباندی شروع ہو گئی۔ کانچی کی خوشبو بڑی تیز تیز محسوس ہونے لگی تھی۔ میں سٹیشن سے باہر نکلا تو سامنے کانچی کھڑی تھی۔ اُس کو دیکھ کر میرا دل خوشی سے نہال ہو گیا۔ میں دیوانہ وار اُس کی طرف بڑھا۔ اُس نے مسکراتے ہوئے مجھے اپنے ساتھ لگا لیا۔ کہنے لگی۔
''تم مجھے چھوڑ کر کیوں چلے گئے تھے؟ کیا تمہیں نہیں معلوم تھا کہ میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکوں گی؟''
میرے کانوں میں موسیقی کی لہریں اُبھر رہی تھیں۔ میری آنکھوں میں خمار کا غبار سا اُڑ رہا تھا۔ میں نے نیم وا آنکھوں سے کانچی کو دیکھتے ہوئے کہا۔
''مجھے کیا پتہ تھا کہ میں بھی تمہارے بغیر نہیں رہ سکوں گا۔ میں تمہیں چھوڑ کر چلا گیا۔ مجھے معاف کر دو!''
کانچی نے میرا ماتھا چوم لیا اور بولی۔
''تم میرے پاس واپس آ گئے ہو۔ اب تم سے کوئی گلہ شکوہ نہیں کروں گی۔ مگر وعدہ کرو! کہ اب تم مجھے چھوڑ کر نہیں جاؤ گے۔''
میں نے کہا۔ ''کبھی نہیں کانچی! میں تمہیں چھوڑ کر کبھی نہیں جاؤں گا۔''
وہ ایک گھوڑے پر بیٹھ کر آئی تھی۔ اُس نے مجھے گھوڑے پر اپنے پیچھے بٹھا لیا اور اُس ویران کھنڈر نما حویلی کی طرف چل پڑی جس کا نام اُس نے بھیروں جی کا استھان بتایا

تھا اور نارمل اور تندرست حالت میں جہاں سے فرار ہونے کے بعد مجھے ایسے لگا تھا جیسے میں پھانسی کی کوٹھڑی سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ اور اب میں خود واپس پھانسی کی کوٹھڑی کی طرف جا رہا تھا۔ لیکن اس وقت تندرست ذہنی حالت میں نہیں تھا۔ اُس وقت میں شیطانی طاقتوں کے قبضے میں تھا اور مجھ پر شیطان دوست دیوی دیوتاؤں کا غلبہ تھا۔ ہم جھاڑیوں اور درختوں کے جنگل میں جا رہے تھے۔ ہمیں بھیروں جی کے منحوس استھان پر پہنچتے پہنچتے رات ہو گئی۔ کانچی کی سہیلی سندھیا بھی مجھے دیکھ کر خوش ہوئی۔ اُس نے مجھے اپنے ساتھ لگا لیا۔ اُس کے جسم میں سے تازہ خون کی بو آ رہی تھی۔ میں جلدی سے الگ ہو گیا۔
کانچی مجھے تالاب پر لے گئی۔ اُس نے مجھے بھی اشنان کرایا اور خود بھی اشنان کیا۔
بری کوٹھڑی میں چارپائی پر نئی دری اور چادر بچھا دی گئی تھی۔ ہم نے وہیں بیٹھ کر کھانا کھایا، اس کے بعد وہ مجھے اپنی کوٹھڑی میں لے گئی۔ اُس نے خود بھی نئی گیروی ساڑھی پہنی اور مجھے بھی گیروے رنگ کا سادھوؤں والا چولا پہننے کو دیا۔ کہنے لگی۔
''آج رات سندھیا نے ہماری دعوت کی ہوئی ہے۔ وہ تمہارے آنے کی خوشی میں جشن منانا چاہتی ہے۔''
میں نے کہا۔ ''لیکن ہم نے کھانا تو کھا لیا ہے کانچی!''
کانچی مسکرائی۔ ''اُس نے کھانے کی نہیں، سوم رس کی دعوت کی ہے۔ سوم رس دیوی دیوتاؤں کا مشروب ہے۔ اس کا ایک گھونٹ تمہیں سورگ میں پہنچا دے گا۔''
میری عقل پر تو پردہ پڑا ہوا تھا۔ میں نے کہا۔ ''میں سورگ کی سیر ضرور کروں گا۔''
کانچی ہنس کر بولی۔
''بس! تمہیں تھوڑا سا صبر کرنا پڑے گا۔ تم بیٹھو! میں ابھی آتی ہوں۔''
وہ چلی گئی۔ میں اُس کی چارپائی پر لیٹ گیا۔ اُس وقت میں سرور و انبساط کی انتہائی کیفیت میں تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ مجھے آگے پیچھے کا ذرا بھی احساس نہیں تھا کہ میں کون ہوں؟ کس خاندان کا چشم و چراغ ہوں؟ سب سے بڑی بات یہ کہ میں مسلمان ہوں اور کفر کی دلدل میں اُترتا چلا جا رہا ہوں۔ میں اپنے آپ میں نہیں تھا۔ میں ایک بے خودی کی حالت میں تھا۔

کوٹھڑی کا دروازہ کھلنے کی آواز سے میں نے آنکھیں کھول دیں۔ دیکھا، ایک
طوطے کی ناک اور سفید بالوں والی سیاہ فام عورت تھالی میں چائے کا گلاس رکھے اندر
میں داخل ہوئی۔ اُس نے چائے کا گلاس سٹول پر رکھ دیا اور خاموشی سے سر جھکا
واپس مُڑ گئی۔ دروازے کے پاس جا کر رُک گئی، پلٹ کر تیز نظروں سے میری طرف
کر دیکھا جیسے کچھ کہنا چاہتی ہو مگر کہہ نہ سکتی ہو۔ لالٹین کی روشنی میں مجھے اُس کے چہرے
پر ایسا ہی تاثر نظر آیا۔ وہ دروازہ بند کر کے چلی گئی۔ میں آہستہ آہستہ چائے پینے لگا۔
باہر بادلوں کی ہلکی سی گرج سنائی دے رہی تھی، پھر گرتی بارش کی آواز آنے لگی۔

کچھ دیر نہیں گزری تھی کہ کانچی واپس آ گئی۔ کہنے لگی۔

''دعوت کا وقت ہو گیا ہے۔ آؤ! سندھیا ہماری راہ دیکھ رہی ہے۔''

میں اُس کے ساتھ اُس کی سہیلی سندھیا کے کمرے میں آ گیا۔ سندھیا نے مورتی کے
سامنے ایک دیا تھالی میں رکھ کر جلایا ہوا تھا۔ طاق میں ایک لالٹین بھی جل رہی تھی۔
مورتی کے پاس ہی تین بڑے تکیے پڑے تھے۔ اُن کے درمیان ایک چوکی پر
پیالیاں اور ایک مٹی کی صراحی رکھی ہوئی تھی۔ صراحی کی گردن میں گیندے کا ہار لپٹا
تھا، کمرے کی فضا کسی بڑی تیز خوشبو سے بوجھل ہو رہی تھی۔ ایک تھالی میں کچھ پھل
مٹھائیاں رکھی تھیں۔ میں اور کانچی مورتی کے پاس گاؤ تکیوں کو ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔
سندھیا نے مجھ سے پوچھا۔

''رانی کے جادو ٹونے کا اثر دوبارہ تو نہیں ہوا؟''

میں نے کہا۔ ''بالکل نہیں...... تم نے اور کانچی نے، تم دونوں نے مل کر مجھے رانی کے
خونی جادو سے مکتی دلا دی ہے۔ میں تمہارا شکر گزار ہوں۔''

سندھیا نے ہنس کر کہا۔

''اس میں شکریہ ادا کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ تم میری گہری سہیلی کانچی کے
دوست ہو تو میرے بھی دوست ہو۔ مجھے خوشی ہے کہ تم واپس آ گئے ہو۔''

وہ صراحی میں سے پیالیوں میں نسواری رنگ کا مشروب اُنڈیلنے لگی۔ بولی۔

''کانچی نے تمہیں بتا دیا ہو گا، میں نے تمہارے آنے کی خوشی میں سوم رس کی دعوت
کی ہے۔ یہ سوم رس ہے۔ دیوی دیوتا اسے سورگ میں آکاش کے بادلوں کے بیچ

بیٹھ کر پیتے ہیں اور ایک دوسرے سے پیار محبت کی باتیں کرتے ہیں۔ میں بھی چاہتی
ہوں کہ اسے پی کر ہم بھی ایک دوسرے سے پیار محبت کی باتیں کریں۔''

اس کے بعد سندھیا نے مورتی کے آگے تھالی میں لوبان سلگایا اور تھالی اُٹھا کر کسی
منتر کا جاپ کرتے ہوئے مورتی کے اُوپر تھالی کو سات مرتبہ گھمایا پھر تھالی مورتی کے
سامنے رکھ دی اور میری طرف دیکھ کر بولی۔

''تم ہمارے دوست ہی نہیں پریمی بھی ہو۔ تم پر میں نے اور کانچی نے رانی کے
ٹونے کو توڑنے کے لئے جو ہون کیا تھا اُس کی ایک رسم پوری کرنی باقی رہ گئی ہے۔
بہت اچھا ہوا کہ تم اپنے آپ آ گئے۔ ورنہ یہ رسم ادھوری رہ جاتی اور تم پر پانچ سال کے
بعد رانی کے ٹونے کا دوبارہ حملہ ہو سکتا تھا۔

میں نے فوراً کہا۔ ''وہ رسم بھی ضرور پوری کرو سندھیا! میں تیار ہوں۔''

میں اپنے ہوش و حواس میں تو تھا نہیں۔ یونہی اُن کی ہاں میں ہاں ملائے جا رہا تھا۔
یہ کانچی کے جسم کی طلسمی خوشبو کا اثر تھا جس نے مجھے عقل و خرد سے عاری کر دیا ہوا تھا۔
کانچی نے سندھیا کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

''یہ آخری رسم ہو گی۔ اس کو پورا کرنے کے بعد رانی سے جنم جنم کے واسطے تمہیں
چھٹکارہ مل جائے گا۔''

میں نے کانچی سے کہا۔ ''تم جیسے کہو گی میں ویسے ہی کروں گا۔''

کانچی مسکرا دی۔ سندھیا نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''اپنی سیدھے ہاتھ کی کلائی آگے کر دو!''

میں نے کلائی اُس کے آگے کر دی۔ اُس نے بڑے غور سے میری کلائی پر اُس زخم
کے نشان کو دیکھا جو اُس نے میرے خون کو کانچی کے خون میں ملاتے ہوئے چاقو کی
نوک سے کیا تھا۔ کہنے لگی۔

''بالکل ٹھیک ہے۔ رشی بھگوان تمہاری رکھشا کر رہے ہیں۔ پہلے تھوڑا سا سوم رس
پئیں گے۔''

اُس نے ایک پیالی مجھے، ایک پیالی کانچی کو دی اور ایک پیالی خود لے لی۔ پھر
بولی۔ ''جے ہو کام دیوتا کی جے ہو۔''

کانچی نے بھی اُس کے ساتھ کہا۔ ''کام دیوتا کی جے ہو۔''

اور وہ دونوں ایک ہی لمبے گھونٹ میں پیالی کا سارا سوم رس پی گئیں۔ میرے ہاتھ میں پیالی اُسی طرح تھی۔ کانچی نے کہا۔

''اسے پی جاؤ! نہیں تو دیوی دیوتا تم سے ناراض ہو جائیں گے۔''

میں نے پیالی اپنے ہونٹوں کے ساتھ لگا کر ایک گھونٹ پیا، سوم رس کا ذائقہ تیز کڑوا کڑوا تھا۔ مگر مجھے کانچی کی خوشی منظور تھی۔ ایک تو میں اُس کے جسم کی خوشبو کے اثر میں تھا، دوسرے مجھے یہ خیال بھی تھا کہ تیسری رسم پوری نہ ہوئی تو خونی رانی کا جادو مجھ پر دوبارہ حملہ کر دے گا۔ میں ناک بند کر کے سارا سوم رس پی گیا۔

سندھیا خوش ہو کر بولی۔ ''جے ہو کام دیوتا کی۔''

اُس نے دوسری بار بھی تینوں پیالیوں میں سوم رس ڈالا اور ایک پیالی مجھے دے کر کہا۔ ''دیوی دیوتاؤں کی خوشی کے لئے اور ھون کی آخری رسم پوری کرنے کے واسطے سوم رس کے تین پیالے پینے بہت ضروری ہیں۔''

میں جی کڑا کر کے دوسری پیالی بھی پی گیا۔ اسی طرح میں نے اُن کے ساتھ تیسرا پیالی بھی پی لی۔ میں پہلے ہی کانچی کے نشے میں ڈوبا ہوا تھا، سوم رس کی تین پیالیوں نے اس سرور میں مزید اضافہ کر دیا۔

سندھیا نے کانچی کو اشارہ کیا، دونوں اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ اُس وقت باہر بادلوں کی گرج سنائی دی۔ کانچی نے سندھیا کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال دیا۔ دونوں مورتی کے اردگرد منتروں کا جاپ کرتے ہوئے چکر لگانے لگیں۔ میں تکیے سے ٹیک لگائے نیم وا آنکھوں سے اُنہیں دیکھ رہا تھا۔ میں انتہائی سرور کی حالت میں تھا۔ مورتی کے گرد دس بارہ چکر لگانے کے بعد اُنہوں نے مجھے بھی اُٹھا لیا اور میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر مجھے بھی مورتی کے گرد گھمانے لگیں۔ میں نے اُن کے ساتھ چھ سات چکر لگائے، پھر وہ پہلے والی پوزیشن میں بیٹھ گئیں۔ سندھیا نے میری کلائی اپنے ہاتھ میں لے لی اور بولی۔

''اب میں ھون کی تیسری اور آخری رسم پوری کرتی ہوں۔ رشی بھگوان اور آکاش کے دیوی دیوتاؤں کی جے ہو۔''

اُس نے پھلوں والی پلیٹ میں سے چاقو اُٹھایا اور اُس کی نوک میری کلائی پر ایک

جگہ چبھو دی۔ میں سوم رس کے نشے میں تھا، مجھے بالکل درد محسوس نہ ہوا۔ بس ایک سیکنڈ کے بھی کم وقفے کے لئے ایسا لگا جیسے کسی نے میرے جسم میں سوئی کی نوک چبھو دی ہو۔ میری کلائی میں سے خون نکلنے لگا۔ سندھیا نے کہا۔

''اپنی کلائی اسی طرح رکھنا! ہلنا جلنا نہیں۔ ورنہ آخری رسم نشٹ ہو جائے گی۔''

میں نے اپنی کلائی ویسے ہی رکھی۔ سندھیا نے اس کے بعد چاقو کی نوک اپنی کلائی میں چبھو کر وہاں سے خون نکالا اور میری کلائی پکڑ کر ایک بار پھر ''جے کام دیوتا'' کا نعرہ لگایا اور اپنا منہ میری کلائی کے زخم پر رکھ کر زور سے میرے خون کو اُوپر کو کھینچا۔ مجھے ایسے لگا جیسے میں جھولے میں جھول رہا ہوں۔ پھر اُس نے منہ ہٹا لیا اور اپنی کلائی میرے منہ کے پاس لے جا کر کہا۔

''اب تم بھی ایسے ہی کرو! تاکہ تم رانی کے جادو سے جنم جنم کے واسطے آزاد ہو جاؤ۔''

میں نے بے خودی کے عالم میں اپنا منہ سندھیا کی کلائی پر اُس جگہ رکھ دیا جہاں سے خون کے قطرے نکل رہے تھے۔ پھر میں نے بھی وہی کیا جو سندھیا نے کیا تھا۔

○○○

اس کے بعد اُن دونوں پر وحشت سوار ہوگئی۔

میں تو پہلے ہی ہوش میں نہیں تھا۔ مجھے صرف اتنا ہی یاد ہے کہ دونوں نے مجھے دبوچ لیا تھا اور مجھے ایک لمحے کے لئے بھی برا نہیں لگ رہا تھا۔ میری بدقسمتی یہی تھی کہ مجھے اپنی بربادی میں لطف آنے لگا تھا۔ یہ تباہی کا وہ مقام ہوتا ہے جہاں سے آدمی کا واپس آنا ممکن نہیں ہوتا۔

اب یہ گھناؤنا ڈرامہ ہر رات ہونے لگا...... سارا دن میں نشے کی سی حالت میں کوٹھڑی میں پڑا رہتا اور رات کو وہی کھیل پھر سے شروع ہو جاتا...... اس کھیل میں، میں برابر کا شریک تھا۔ میں دن کے وقت اپنی کوٹھڑی میں پڑا اس انتظار میں رہتا کہ کب رات ہو اور کب کانچی اور سندھیا آکر مجھے اپنے ساتھ لے جائیں۔

اس طرح نہ جانے ایک مہینہ، دو مہینے یا تین مہینے گزر گئے۔ میرے دل و دماغ پر نقاہت سی طاری ہونا شروع ہوگئی۔ قدرتی طور پر میرا دل اس کھیل سے نفرت کرنے لگا۔ ایک دو بار میں نے کانچی سے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار بھی کیا اور اُسے کہا۔

''کانچی! مجھے لگ رہا ہے کہ میں بیمار ہوگیا ہوں۔ میرا سر درد کرتا رہتا ہے۔ کبھی کبھی آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھا جاتا ہے۔''

اُس نے بڑی محبت کے ساتھ میرا ہاتھ چوم لیا اور بولی۔

''یہ تمہارا وہم ہے میری جان! اور اگر تم کسی قسم کی کمزوری محسوس کرتے ہو تو میں سندھیا سے کہہ کر تمہیں ایک خاص جڑی بوٹی کا رس پلا دوں گی۔ پھر تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔''

دوسرے دن وہ مجھے سندھیا کے کمرے میں لے گئی۔ سندھیا نے کسی جڑی بوٹی کا رس پہلے سے ایک پیالی میں ڈال رکھا تھا۔ اُس نے مجھے دیکھ کر کہا۔

''اسے پی جاؤ! تم ہمیشہ کے لئے تندرست ہو جاؤ گے۔''

میں اُسے دوائی سمجھ کر پی گیا۔ اُس وقت تو میرے اندر ایک نئی توانائی کی لہر سی دوڑ گئی مگر چند روز بعد پھر نقاہت نے مجھ پر غلبہ پا لیا۔ کسی کسی روز شام ہونے سے پہلے میں دو چار قدم چلنے پھرنے کے لئے بھیروں جی کے منحوس استھان سے نکل جاتا تھا۔

ایک دن ٹہلنے باہر گیا تو ٹہلتے ٹہلتے ذرا دُور نکل گیا۔ حیرت کی بات ہے کہ میں ابھی تک اپنی شعوری حالت میں واپس نہیں آسکا تھا بلکہ کانچی کے ساتھ اب سندھیا کا جادو بھی میرے سر پر سوار ہو گیا تھا۔ لیکن میرے اندر سے میرے ضمیر نے ملامت کرنی شروع کر دی تھی اور مجھے احساس ہونے لگا تھا کہ جو کچھ میں کر رہا ہوں یا میرے ساتھ ہو رہا ہے وہ بڑا گھناؤنا گناہ ہے۔ دن ڈھل رہا تھا۔ فضا میں گرمی اور ہلکی ہلکی خنکی کی ملی جلی کیفیت تھی۔ کانچی کے ساتھ اب سندھیا کی خوشبو بھی میرے ساتھ ساتھ رہتی تھی۔ مگر اب مجھے اِن خوشبوؤں سے گناہ کی بو آنے لگی تھی۔ میں اس گناہ سے توبہ کر کے نارمل زندگی کی طرف واپس آنا چاہتا تھا۔ پہلے میرے ذہن میں ایسا خیال کبھی نہیں آیا تھا۔ کانچی کی خوشبو مجھ پر ایک سرور انگیز کیفیت طاری کر دیتی تھی اور میں اُس کے پاس جانے کو بے تاب ہو جاتا تھا۔ مگر اب ایسی بات نہیں تھی۔ اب کانچی کا خیال آتا یا اُس کی خوشبو محسوس کرتا تو دل اُس سے دُور بھاگ جانے کو چاہتا تھا۔ یہ ایک صحت مند علامت تھی۔

ٹہلتے ٹہلتے میں کافی آگے نکل آیا تھا۔ میں نے جھاڑیوں کے بیچ میں سے جاتا ایک کچا راستہ دیکھا تو اچانک ذہن میں وہاں سے بھاگ جانے کا خیال آ گیا۔ میں بڑی آسانی سے ایسا کر سکتا تھا۔ گھر سے جو میں پیسے لایا تھا اُن میں سے کافی پیسے اب بھی میری جیب میں تھے۔ دن کا وقت تھا۔ سٹیشن کا راستہ مجھے آتا تھا۔ کانچی اور سندھیا مجھ سے کافی فاصلے پر پیچھے رہ گئی تھیں۔ اُنہیں پتہ بھی نہیں چل سکتا تھا کہ میں فرار ہو گیا ہوں۔ اور اگر پتہ چل بھی گیا تو وہ میرا کیا بگاڑ سکتی تھیں؟ کیونکہ اب میں ذہنی طور پر کافی نارمل ہو گیا تھا اور کانچی کی خوشبو مجھ پر جادو کا اثر نہیں کرتی تھی۔

میں کچے راستہ پر ہو گیا اور اندازے کے مطابق میں نے اپنا رُخ منگل پت ریلوے سٹیشن کی طرف کر لیا۔

مجھے لگا کہ میں کسی جیل سے رہا ہو گیا تھا۔ میں تیز تیز چلنے لگا۔ میں بمشکل سو قدم چلا ہوں گا کہ اچانک مجھے چکر آیا اور میں گر پڑا۔ اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہ جب ہوش آیا تو میں اپنی کوٹھڑی میں چارپائی پر پڑا تھا اور کانچی میرے پاس بیٹھی مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر کہنے لگی۔

"تم مجھے چھوڑ کر کیوں جا رہے تھے؟ کیا میں اب تمہیں اچھی نہیں لگتی؟ میں تو تم محبت کرتی ہوں۔"

میں نے کہا۔ "ایسی بات نہیں ہے کانچی! میں تو ٹہلتے ٹہلتے ذرا دور نکل گیا تھا کہ چکر سا آ گیا۔"

کانچی کی تیز نظریں مجھ پر جمی تھیں۔ وہ اس طرح مسکرا رہی تھی جیسے میرے دل حال اُسے معلوم ہو گیا ہو۔ کہنے لگی۔

"میں جانتی ہوں، تم مجھے چھوڑ کر اپنے گھر جا رہے تھے۔ مگر یہ تمہاری غلطی تھی۔ کا جس سے محبت کرتی ہے وہ مر کر ہی اُس سے جدا ہوتا ہے۔ میں تم سے محبت کرتی اور اب صرف موت ہی تمہیں مجھ سے الگ کر سکتی ہے۔"

میرا دل بیٹھ سا گیا۔ یہ عورت رانی سے بھی دو قدم آگے لگ رہی تھی۔ نہ صرف یہ اُس کو میرے دل کا حال معلوم ہو گیا تھا بلکہ اُس کے منتروں کی جادوئی طاقت نے فرار ہوتے ہی قابو کر لیا تھا۔ رانی کے خونی جادو ٹونے کا علاج تو میں نے کانچی کی سے کر لیا تھا مگر مجھے یوں لگا کہ اب کانچی سے نجات ممکن نہیں ہے۔ رانی نے مجھے جھوٹی محبت کے دام میں پھنسا کر اپنی مکتی کے لئے مجھے خونی دیوی کی مورتی کے آ ذبح کرنے کی ضرور کوشش کی تھی، مگر جب میں اُس کے پھندے سے نکل کر فرار ہو تھا تو وہ میرا پیچھا نہیں کر سکی تھی۔ اُس کو میرے دل کا حال بھی معلوم نہیں ہو سکا تھا۔ لیکن کانچی تو ایک بلا بن کر مجھ سے چمٹ گئی تھی۔ اب خدا ہی مجھے اس کے پھندے نجات دے سکتا تھا۔ میں نے لیٹے لیٹے اُسے رام کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"کانچی! میں بھی تم سے محبت کرتا ہوں۔ اگر تم سے محبت نہ ہوتی تو اتنی دور گھر چھوڑ کر تمہارے پاس نہ آتا۔"

کانچی بولی۔ "وہ تو میں تمہیں کھینچ کر لائی تھی۔ تم کہاں آئے تھے؟"

میں اچھی طرح سے سمجھ گیا تھا کہ جب تک مجھے اس عورت کی طاقت کا راز معلوم نہیں ہو جاتا مجھے اس کی ہر طرح سے دل جوئی کرتے رہنا ہو گا۔ اُس کا مقابلہ نہیں کر سکتا میں نے کہا۔

"اس میں میری مرضی بھی شامل تھی کانچی! میں خود بھی تمہارے بغیر اُداس ہو گیا تھا۔ میں اس بات کو مانتا ہوں کہ میرے دل میں اپنے گھر واپس جانے کی خواہش ضرور پیدا ہوئی تھی مگر یہ اس لئے نہیں تھی کہ میں تم سے جدا ہونا چاہتا تھا، بلکہ اس لئے کہ میں اپنے ماں باپ کی یاد میں اُداس ہو گیا تھا۔ مجھے وہ بہت یاد آنے لگے تھے۔ ورنہ مجھے تم سے محبت تھی اور محبت اب بھی ہے۔"

پھر میں نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر چوم لیا۔ اگرچہ میرا دل اُس کو چھونے کو بھی نہیں چاہتا تھا۔ عورت خواہ چڑیل ہو یا جادوگرنی ہو، میرا تجربہ ہے کہ محبت اُس کی سب سے بڑی کمزوری ہوتی ہے۔ مرد اگر اُس کے آگے جھوٹا اظہارِ محبت بھی کرے تو اُس پر اس کا اثر ہو جاتا ہے۔ وہ اس کا اثر فوراً قبول کر لیتی ہے۔ اگر اُسے معلوم بھی ہو کہ اُس کے آگے جھوٹا اظہارِ محبت کیا جا رہا ہے، اس کے باوجود وہ اسے سچ مان لیتی ہے۔ وہ محبت میں دھوکہ کھانا ہی پسند کرتی ہے۔"

جب میں نے کانچی کے ساتھ جھوٹی محبت کا دل سے اور پورے جذبوں سے اظہار شروع کیا تو اُس پر اثر ہو گیا۔ اُس کی گلابی آنکھوں میں محبت کا خمار سا نمودار ہونے لگا۔ اُس نے میرے ہاتھ کو چوم کر کہا۔

"اگر تم سچ مچ مجھ سے اتنی محبت کرتے ہو تو وعدہ کرو! کہ اب کبھی مجھے چھوڑنے کا خیال دل میں نہیں لاؤ گے۔"

میں نے فوراً کہا۔ "میں وعدہ کرتا ہوں کہ اب کبھی تمہیں چھوڑنے کا خیال تک بھی اپنے دل میں نہیں لاؤں گا۔"

اُس نے خوش ہو کر میرا ماتھا چوم لیا اور بولی۔

"سندھیا کو بھی گیان ہو گیا تھا کہ تم ہمیں چھوڑ کر جا رہے ہو۔ ہم یہ کیسے برداشت کر سکتی تھیں کہ تم اس طرح ہمیں چھوڑ کر چلے جاؤ؟ پس! ہم دونوں نے ایک منتر پڑھ کر ہوا میں پھونکا اور تم سٹیشن کے راستے میں ہی گر کر بے ہوش ہو گئے۔ ذرا سوچو! جب ہمیں

تمہارے دل کا حال معلوم ہو جاتا ہے اور ہمارے پاس تمہیں روکنے کی شکتی بھی ہے تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ تم یہاں سے بھاگ سکو؟''

کانچی نے میرے بالوں میں اُنگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

''میری جان! یہ مت سمجھنا کہ میں نے تمہیں قید میں ڈال رکھا ہے۔ نہیں.....ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ تو میری محبت ہے جو ہمیشہ تمہیں اپنی نظروں کے سامنے دیکھنا چاہتی ہے۔''

میں نے اُس کا ہاتھ تھام لیا۔ اُسے دبایا اور کہا۔ ''میں نے یہاں کبھی محسوس ہی نہیں کیا کہ میں قید میں ہوں۔ وہ تو صرف اپنا گھر یاد آنے لگا تھا۔ ماں باپ یاد آنے لگے تھے جس کی وجہ سے میں نے سٹیشن کا رُخ کر لیا۔

کانچی نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔ ''اب تو ایسا نہیں کرو گے نا؟''

میں نے سفید جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔

''کبھی نہیں کانچی! کبھی نہیں کروں گا۔ کیونکہ میں بھی تم سے اُتنا ہی پیار کرتا ہوں جتنا تم مجھ سے کرتی ہو۔''

اُس نے مجھے گلے لگا لیا۔ بات ختم ہو گئی۔

لیکن بات ختم نہیں ہوئی تھی۔ بلکہ اصل بات اب شروع ہوئی تھی۔ جہاں میں یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ کانچی اور سندھیا نے مجھے جن منتروں کی شکتی میں باندھ رکھا ہے، اُس کا راز معلوم کر کے اُن سے چھٹکارا حاصل کروں گا، وہاں کانچی کو بھی یہ علم ہو گیا تھا کہ میرا دل اُس سے اُکھڑ چکا ہے اور میں اس کی قید سے نکل بھاگنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ اُس نے میرے اِردگرد کھینچا ہوا دائرہ تنگ کرنا شروع کر دیا۔ اس جوابی کارروائی میں سندھیا اُس کے ساتھ تھی۔ لیکن اُنہوں نے مجھ پر ظاہر نہیں ہونے دیا۔ کم از کم اُن کی کوشش یہی تھی۔ اُوپر سے دونوں پہلے سے زیادہ میرا خیال رکھنے اور مجھ سے محبت کا اظہار کرنے لگی تھیں۔ لیکن اب وہ مجھے بھیروں جی کے استھان کی چار دیواری سے باہر نہیں جانے دیتی تھیں۔ مجھے ٹہلنے جانا ہوتا تو دونوں میں سے ایک میرے ساتھ جاتی تھی۔ ایک بار جب میں نے کانچی سے کہا کہ وہ مجھے پہلے کی طرح اکیلا باہر کیوں نہیں جانے دیتی تو اُس نے جواب دیا۔

''میری جان! تمہیں معلوم نہیں ہے۔ بھیروں جی کے استھان کے آس پاس بھیروں کے دُشمن دیوتاؤں کے اوتار اُتر آئے ہیں۔ اگر تم اکیلے باہر گئے تو وہ تمہیں ختم کر دیں گے۔ اس لئے میں تمہارے ساتھ جاتی ہوں۔ مجھے یا سندھیا کو دیکھ کر وہ تمہارے قریب بھی نہیں پھٹک سکتے۔''

میں جانتا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے۔ مگر میں نے کہا۔

''اچھا! یہ بات ہے۔ پھر تو واقعی مجھے اکیلے باہر نہیں جانا چاہئے۔''

اب اُنہوں نے ایک اور کام کرنا شروع کر دیا۔ پتہ نہیں کھانے کے ساتھ یا سوم رس میں کسی جڑی بوٹی کا عرق ملا کر مجھے کھلا پلا دیتیں جس کا اثر یہ ہوتا کہ رات کو تو میں شیر کی طرح طاقت ور بن جاتا لیکن سارا دن مجھ پر اتنی نقاہت طاری رہتی کہ میں دو قدم چلتا تو میرا سر چکرانے لگ جاتا۔ میں اُن سے پوچھ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ میرے ساتھ یہ کیا کر رہی ہیں؟ اسی دوران وہ میرے خون سے اپنی پیاس بھی بجھاتی رہیں۔ جسمانی طور پر تو میں نیم مُردہ ہو ہی چکا تھا، اب ذہنی طور پر بھی میری قوتیں اور صلاحیتیں جواب دینے لگیں۔ گھر والوں کی یاد بہت کم آتی۔ آتی بھی تو ماں باپ اور کالج کے دوستوں کے چہرے دُھندلے دُھندلے سے دکھائی دیتے۔

طوطے کی ناک والی بوڑھی عورت بھی اب وہاں نظر نہیں آتی تھی۔ خدا جانے وہ کہاں چلی گئی تھی؟ صرف وہی ایک عورت تھی جس کی آنکھوں میں مجھے اپنے واسطے ہمدردی کی جھلک نظر آ جایا کرتی تھی۔ اب میرا سوائے خدا کی ذات کے اور کوئی پرسانِ حال نہیں تھا۔ اور لگتا تھا کہ خدا نے بھی مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا ہے۔

دن رات اسی عالم مدہوشی بلکہ بے ہوشی میں گزرتے جا رہے تھے۔ کوئی اندازہ نہیں تھا کہ دو ماہ، چار ماہ گزر چکے ہیں یا ایک سال بیت گیا ہے؟

ایک دن کی بات ہے، رات کے پچھلے پہر کانچی اور سندھیا اپنی خون آشامی کی پیاس بجھانے کے بعد مجھے نیم بے ہوشی کی حالت میں میری کوٹھڑی میں ڈال کر چلی گئیں تو میں نے تھوڑی دیر بعد آنکھیں کھول دیں۔ مجھ پر نا طاقتی اور کمزوری چھانا شروع ہو گئی تھی۔ ہلکی روشنی والی لالٹین جل رہی تھی، کوٹھڑی کے دروازے پر وہ باہر سے تالا نہیں لگاتی تھیں۔ صرف ویران عمارت کی ڈیوڑھی والے دروازے پر رات کے وقت تالا ڈال دیا

جاتا تھا۔ میری آنکھوں پر کمزوری کا خمار سا چھا رہا تھا۔ بڑی ڈرا دینے والی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اگر دونوں عورتیں رات کو ڈیوڑھی کا دروازہ کھلا بھی رکھتیں تو بھی مجھے معلوم تھا کہ میرے لئے وہاں سے فرار ہونا ناممکن ہے۔ اس سے پہلے فرار کی کوشش کر کے میں نے دیکھ لیا تھا۔ اور اب تو میرے اندر دوڑنے کی طاقت بھی نہیں رہی تھی۔ بھاگ بھی جاتا تو کانچی اور سندھیا کے منتروں کا طلسم مجھے وہیں زمین پر گرا کر بے ہوش کر دیتا۔

میں ایک نیم جان بت کی طرح چارپائی پر پڑا چھت کو گھور رہا تھا کہ مجھے سندھیا اور کانچی کی مدھم آوازیں سنائی دیں۔ میں اُن آوازوں کو سننے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ دونوں باری باری کوئی منتر پڑھ رہی تھیں۔ ایک منتر پڑھ کر چپ ہو جاتی تو دوسری منتروں کا جاپ شروع کر دیتی۔ پھر وہ بھی خاموش ہو جاتی۔ اس کے بعد ایسی آواز آتی جیسے وہ کسی شے کو توڑ رہی ہیں یا کاٹ رہی ہیں۔ میں نے سوچا معلوم کرنا چاہئے یہ کیا کر رہی ہیں؟

میں آہستہ سے چارپائی سے اُتر آیا اور کوٹھڑی کا ایک پٹ کھول کر سننے لگا۔ یہ آوازیں سندھیا کے کمرے سے آ رہی تھیں جو ایک کوٹھڑی چھوڑ کر تھا۔

میں دبے پاؤں سندھیا کے کمرے کی طرف بڑھا۔ گلی نما تنگ راہ داری میں اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ سندھیا کے کمرے کے چھوٹے سے روشندان میں روشنی ہو رہی تھی۔ میں بڑی احتیاط سے قدم اُٹھاتا سندھیا کے کمرے کے دروازے کے پاس آ کر رُک گیا۔ دروازہ بند تھا۔ میں نے جھک کر دروازے کی ایک جھری میں سے جھانک کر اندر دیکھا تو اندر کا منظر حیرت انگیز اور ڈراؤنا بھی تھا۔ دونوں عورتیں بے لباس تھیں...... اُن کے بدن لال سرخ ہو رہے تھے۔ اُنہوں نے اپنے جسموں پر کوئی رنگ ملا ہوا تھا۔ دونوں مورتی کے آگے ایک دوسری کے آمنے سامنے چوکیوں پر بیٹھی تھیں۔ اُن کے ہاتھوں میں چھریاں تھیں۔ درمیان میں لکڑی کی چوکی پر کسی جانور کی کالی سری پڑی تھی جس کی آدھی کھال اُتر چکی تھی۔ دونوں باری باری منتروں کا جاپ کرتیں، پھر باری باری چھری جانور کے سر پر زور زور سے مار کر اُس کی کھال الگ کرنے لگتیں۔ تھوڑی سی کھال الگ کر کے وہ چھری والا ہاتھ پیچھے کر لیتیں۔ مورتی کے آگے سر جھکاتیں اور دوبارہ منتروں کا

جاپ کرنے لگتیں۔

مجھ پر یہ منظر دیکھ کر ایک دہشت سی طاری ہو گئی۔ مگر میں پیچھے نہ ہٹا۔ میں معلوم کرنا چاہتا تھا کہ اس کے بعد یہ کیا کرتی ہیں؟ اور یہ ایسا کس لئے کر رہی ہیں؟ جب جانور کی سری کی ساری کھال اُدھڑ گئی اور لال لال گوشت دکھائی دینے لگا تو سندھیا نے جانور کی خون آلود سری اُٹھا کر مورتی کے پاؤں میں رکھ دی اور ہاتھ باندھ کر سر کو جھکا دیا۔ کانچی نے بھی ایسا ہی کیا۔ دوسرے لمحے اُنہوں نے جانور کی سری کے ساتھ لگا ہوا خون اپنے جسموں پر لگایا اور چوکیوں پر سے اُٹھ کر کھڑی ہو گئیں اور تین بار ایک دوسری کو گلے لگایا، پھر چٹائی پر سے اپنی اپنی گیروے رنگ کی چادریں اُٹھا کر اپنی کمر کے گرد لپیٹیں اور چوکیوں پر دوبارہ بیٹھ گئیں۔ سندھیا نے سوم رس کی صراحی کے ساتھ منہ لگا کر سوم رس کے دو تین گھونٹ پیئے اور صراحی کانچی کی طرف بڑھا دی۔ کانچی نے بھی صراحی کو منہ لگا کر دو تین گھونٹ پیئے اور صراحی نیچے رکھ دی۔ اب اُنہوں نے آپس میں گفتگو شروع کر دی۔ کانچی نے کہا۔

''راکھشسی سنکار کا آخری یگیہ بھی پورا ہو گیا ہے۔ اب ہمیں اس کی بلی چڑھا دینی چاہئے۔''

بلی چڑھانے کا مطلب تھا دیوی دیوتا کے بت کے آگے قربانی دے دی جائے۔

میرے کان کھڑے ہو گئے۔ میں معلوم کرنا چاہتا تھا کہ یہ کس کو قربان کرنے کی بات کر رہی ہیں؟

سندھیا کہنے لگی۔ ''میں نے کل رات سمادھی لگا کر کام دیوتا اور یم دیوتا کے اوتاروں سے بات کی تھی۔''

''پھر کیا جواب ملا؟'' کانچی نے پوچھا۔

سندھیا بولی۔ ''کام دیوتا کی لذتوں اور یم دوت کی خون کی پیاس ابھی پوری طرح سے نہیں بجھی۔ ابھی کچھ وقت اور لگے گا۔''

کانچی نے کہا۔ ''کیا یہ مسلمان اُس وقت تک زندہ رہ سکے گا؟''

یہ سن کر میرے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے...... یہ دونوں ڈائنیں میری بلی چڑھانے کی بات کر رہی تھیں۔ خوف کے مارے میرا حلق خشک ہو گیا۔ لیکن میں دروازے کی

جھری کے ساتھ آنکھیں لگائے ویسے ہی کھڑا رہا۔ اب یہ میری زندگی اور موت کا سوال تھا۔

سندھیا نے جواب میں کہا۔ ''ہم آئیور بوٹی کا جو رس اُسے پلا رہے ہیں وہ اُسے آخری ہون تک زندہ رکھے گا۔ مرنے نہیں دے گا۔ ہمیں صرف اُس کا خیال رکھنا پڑے گا، کہیں وہ پہلے کی طرح دوبارہ یہاں سے فرار ہونے کی کوشش نہ کرے۔''

کانچی بولی۔ ''اب اُس کے خون میں ہم دونوں کا خون شامل ہے۔ ہم دونوں کے منتروں کا اثر ہے۔ وہ چاہے بھی تو یہاں سے بھاگ نہیں سکتا۔ تم نے بھی دیکھا ہے کہ پچھلی بار جب اُس کے دل میں یہاں سے نکل جانے کا خیال آیا تھا تو اس کے ساتھ ہی ہمارے منتروں کی شکتی نے اُسے بے ہوش کر کے گرا دیا تھا۔''

''پھر بھی.....'' سندھیا بولی۔ ''ہمیں اُس کی نگرانی ضرور کرنی ہو گی۔ کیونکہ وہ مسلمان ہے۔ اور یہ اس کی سب سے بڑی شکتی ہے۔ ابھی تک اُسے اپنی شکتی کا احساس نہیں ہے۔ اگر اُسے اس کا احساس ہو گیا تو نہ صرف یہ کہ وہ یہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہو سکتا ہے بلکہ اگر چاہے تو ہمیں بھی ہلاک کر سکے گا۔''

کانچی نے ہنس کر کہا۔

''فکر نہ کرو سندھیا! شیراز اگرچہ مسلمان کی اولاد ہے، مگر اپنے برے کرموں اور گناہوں کی وجہ سے اُس کا ایمان کمزور پڑ چکا ہے۔ اُس کی طاقت کمزور ہو چکی ہے۔ وہ ہمارے پنجرے میں بند رہنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا۔''

سندھیا چٹائی پر لیٹ گئی اور بولی۔

''اب تم بھی جا کر سو جاؤ! مگر ہاں، سونے سے پہلے ایک نظر اپنے عاشق پر ضرور ڈال لینا۔''

کانچی مسکرا کر بولی۔ ''میں جانتی ہوں۔''

میں فوراً دروازے سے ہٹ گیا اور پاؤں دبا کر جتنا تیز چل سکتا تھا چل کر اپنی کوٹھڑی میں واپس آ گیا۔ دروازہ میں نے آہستہ سے بند کر دیا اور اپنی چارپائی پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔ تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ کانچی میری کوٹھڑی میں داخل ہوئی۔ میں تھوڑی تھوڑی کھلی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ میرے پاس آ کر دو منٹ کھڑی

رہی۔ میں ہلکے ہلکے خراٹے لینے لگا۔ وہ میرے چہرے پر جھکی تو میں نے آہستہ سے پلکیں بند کر لیں۔ پھر مجھے اُس کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میں نے پلکیں ذرا سی کھول کر دیکھا، کانچی کوٹھڑی سے باہر نکل رہی تھی۔

اُس نے جاتے ہوئے دروازہ بند کر دیا تھا۔

میں پوری آنکھیں کھول کر چھت کو تکنے لگا۔ ایک بار پھر ایک اذیت ناک موت میرے سامنے تھی۔ یہ خونخوار عورتیں بھی مجھے اپنے کسی دیوتا پر بھینٹ چڑھانے کی تیاریاں کر رہی تھیں۔ کس قدر وحشی اور خونخوار تھا ان بت پرستوں کا ہندو دھرم...... ہم مسلمان کیسے اُن لوگوں کے ساتھ رہ سکتے تھے؟ قائداعظم نے بالکل ٹھیک کہا ہے کہ ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں۔ ان دونوں کے رسم و رواج میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اس لئے انگریزوں کے جانے کے بعد ہم مسلمانوں کو ایک علیحدہ وطن پاکستان چاہئے جہاں ہم اپنی اسلامی تہذیب اور اسلامی تعلیمات کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔

اب میں ہر حالت میں وہاں سے جان بچا کر بھاگ جانا چاہتا تھا۔ لیکن کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ میرے فرار کی کوشش کے بعد کانچی اور سندھیا دونوں نے میری نگرانی کرنا شروع کر دی تھی۔ مجھے اکیلا باہر نہیں جانے دیتی تھیں۔ دن کے وقت مجھ پر نقاہت طاری رہتی تھی۔ صرف رات کو فرار ہونے کی دوبارہ کوشش کر سکتا تھا۔ کیونکہ رات کو میرے جسم میں سوم رس پینے کی وجہ سے طاقت آ جاتی تھی۔ رات کو فرار ہونے میں یہ قباحت تھی کہ کانچی کا جادو مجھ پر حملہ کر دیتا تھا اور اُسے علم ہو جاتا تھا کہ میں اُس سے جان بچا کر بھاگ رہا ہوں۔ پہلے رانی کے جادو ٹونے سے میرا سر چکر کھاتا تھا اور میں اپنے ہوش و حواس اور عقل کھو دیتا تھا۔ اور اب یہی عمل کانچی کے جادو ٹونے کی وجہ سے ایک بار پھر دُہرایا جا رہا تھا۔ میرا سر چکر کھاتا تھا اور میں بے ہوش ہو کر گر پڑتا تھا۔ ان حالات میں میرا وہاں سے جان بچا کر نکلنا مجھے ناممکن نظر آ رہا تھا۔

دو راتیں اور گزر گئیں......

تیسری رات کو ایسا ہوا کہ میں چٹائی پر پڑا تھا۔ کانچی اور سندھیا مورتی کے آگے عُریاں حالت میں پوجا پاٹھ کر رہی تھیں۔ کانچی نے مجھے آواز دی۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ مجھے اُس عورت سے نفرت ہو گئی تھی۔ وہ میری جان کی دشمن تھی۔ میرا دل ہی نہیں

چاہا کہ میں اُسے کوئی جواب دُوں۔

سندھیا نے کہا۔ ''شاید سو گیا ہے۔ کل شوجی کی پوجا کی رات ہے۔ میرا خیال ہے ہمیں کل رات کو اس مسلمان کو شوجی کی پتنی پاروتی کے آگے قربان کر دینا چاہیئے۔''

کانچی نے پوچھا۔ ''کیا تمہیں کام دیوتا کی اجازت مل گئی ہے؟''

سندھیا نے جواب دیا۔

''مجھے کام دیوتا کی طرف سے اشارہ مل گیا ہے۔ وہ خوش ہیں۔ ہم نے دیوی پاروتی اور شیو جی کے سارے سنسکاروں کو پورا کر دیا ہے۔ صرف ایک سنسکار اس مسلمان لڑکے کو شیو جی کی پتنی کے آگے بھینٹ چڑھانا باقی رہ گیا ہے۔ اس کے بعد ہمیں پاروتی مایا کی شکتی پراپت ہو جائے گی اور ہم جب چاہے غائب ہو سکیں گی۔ ہم دیوی پاروتی کی داسیاں بن جائیں گی اور جس نوجوان مسلمان عورت اور مسلمان بچے کا چاہیں گی گلا کاٹ کر اُس کے خون کا نذرانہ دیوی کے چرنوں میں ارپن کر دیا کریں گی۔ ایک برس تک دیوی کے چرنوں میں مسلمان عورتوں اور بچوں کے خون کا نذرانہ ارپن کرنے کے بعد ہم دونوں اس سنسار کے موہ مایا کے بندھنوں سے آزاد ہو کر گندھرو دیوی دیوتاؤں کے پاس چلی جائیں گی۔ اس کے ساتھ ہی ہمیں مکتی مل جائے گی اور جنم جنم کے چکروں سے آزاد ہو جائیں گی۔''

وہ مجھے سویا ہوا سمجھ رہی تھیں اور میں اُن کی ساری باتیں سن رہا تھا۔ اُن شیطان صفت عورتوں نے مسلمان عورتوں اور بچوں کو بے دردی سے قتل کرنے کا خونی پروگرام بنایا ہوا تھا۔ میں آگے بھی سننا چاہتا تھا کہ اُن کے دل میں اور کیا کچھ ہے؟ میں نے جان بوجھ کر دو تین ہلکے ہلکے خراٹے لئے تا کہ اُنہیں پکا یقین ہو جائے کہ میں سو رہا ہوں۔

کانچی کہنے لگی۔

''پھر ہمیں یہ جگہ بدل کر رامیشورم کے شو مندر کے آس پاس جنگل میں کوئی خفیہ ٹھکانہ بنانا ہوگا جہاں ہم مسلمان عورتوں اور بچوں کو لا کر ذبح کر کے اُن کے خون سے منگل کی رات کے وقت شوجی کو بھینٹ کریں گی۔''

''ہمیں ایسا ہی کرنا پڑے گا۔'' سندھیا بولی۔ ''یہاں تو ہم صرف اُس مسلمان لڑکے کو شوجی کی پہلی بھینٹ کے لئے تیار کرنے کے واسطے آئی ہیں۔ آخری سنسکار پورا

ہونے اور شیراز کے خون کا نذرانہ ارپن کرنے کے بعد ہمیں یہاں رہنے کی کوئی ضرورت نہیں ہو گی۔''

''تو پھر کیا خیال ہے؟'' کانچی نے پوچھا۔ ''کل رات کو اسے ذبح کر ڈالیں؟''

''کیوں نہیں......؟'' سندھیا نے کہا۔ ''کل شوراتری بھی ہے۔ شوجی کی قربانی کے لئے بڑا شبھ دن ہے۔''

کانچی بولی۔ ''تو پھر کل آدھی رات کے بعد اسی جگہ جب یہ سوم رس کے نشے میں بے ہوش ہو جائے گا تو اس کی گردن کاٹ دیں گی اور اس کا سارا خون پیالوں میں بھر کر خود بھی پئیں گی اور شوجی کے نام پر پاروتی دیوی کے چرنوں میں بھی پیش کریں گی۔''

سندھیا نے کہا۔ ''میں نے اس مقصد کے لئے دو چھریاں تیز کر کے پہلے ہی رکھ لی ہیں۔''

خوف سے میرا جسم برف کی طرح سرد پڑ گیا۔ مگر میں اُن کے رحم و کرم پر پڑا رہنے پر مجبور تھا۔ اُن خونی عورتوں نے مجھے نظر نہ آنے والی زنجیروں میں جکڑ رکھا تھا۔ میں پنجرے میں بند پرندے کی طرح پھڑ پھڑا رہا تھا اور پنجرے کی سلاخوں سے ٹکرا رہا تھا، باہر نکلنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا تھا۔

حسبِ معمول دونوں عورتوں نے مجھے اُٹھایا اور میری کوٹھڑی میں لا کر چارپائی پر ڈال دیا اور خود باہر چلی گئیں۔ دروازے کے باہر وہ کنڈی چڑھا گئی تھیں۔

میرے سامنے صرف آج کی رات، بلکہ اُس رات کا پچھلا پہر ہی تھا۔ کیونکہ رات پہلے ہی آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ اگر اُن چند لمحوں کے اندر میں نے کچھ نہ کیا تو پھر میری موت یقینی تھی۔ اور موت بھی وہ کہ جس کے تصور ہی سے میری رُوح کانپ جاتی تھی۔ یہی چند لمحے تھے جب میرے جسم میں اتنی طاقت ابھی باقی تھی کہ میں تھوڑا بہت زور بھی لگا سکتا تھا۔ کیونکہ جلاد عورتوں کے پلائے ہوئے سوم رس کا اثر ابھی میرے جسم کو توانا رکھے ہوئے تھا۔ صبح ہوتے ہی اس توانائی نے نا طاقتی اور نقاہت میں بدل جانا تھا۔ پہلے کبھی میں اس طرح اپنے ہوش و حواس میں واپس نہیں آیا تھا۔ جب دونوں خونخوار عورتیں میری خون آشامی کر چکی ہوتی تھیں تو میں بے سدھ ہو کر پڑ جاتا تھا اور مجھے ہوش نہیں رہتا تھا۔ لیکن آج شاید خدا کو میری جان بچانی منظور تھی کہ میں اپنے ہوش

میں رہا اور میں نے اُن دونوں کی باتیں بھی سن لی تھیں۔

میرا ذہن تیزی سے فرار کے منصوبے سوچنے لگا۔ سب سے پہلے مجھے کوٹھ
باہر والی کنڈی کسی طریقے سے کھولنی تھی، اس کے بعد ڈیوڑھی والے درواز
تالے کو کھولنا یا توڑنا تھا۔ کیونکہ اس قتل گاہ سے باہر نکلنے کا دوسرا کوئی راستہ نہیں تھا۔
ہیں جب آدمی کو موت سامنے نظر آ رہی ہو تو چند لمحوں کے لئے ہی سہی، اُس
بڑی طاقت آ جاتی ہے۔

لالٹین کی مدھم روشنی کوٹھڑی میں پھیلی ہوئی تھی۔ یہ مجھے اچھی طرح علم تھا کہ رات
کی دھما چوکڑی کے بعد سندھیا اور کانچی بھی بے سدھ ہو کر سو جاتی ہیں اور آدھے
تک سوئی رہتی ہیں۔ اُن کی طرف سے میں مطمئن تھا کہ اتنی جلدی یا میرے ذرا سے
پر اُن کی نیند نہیں کھلے گی۔

میں اُٹھ کر چارپائی سے اُتر آیا اور گیروے رنگ کا چولا اُتار کر اپنا کرتہ پاجامہ
لیا۔ چپل پہن رہا تھا کہ راہداری میں کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی...... کوئی آ رہا

میں جلدی سے چارپائی پر لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ مگر تھوڑی تھوڑی آنکھیں
کھولے دیکھ رہا تھا۔ میری نظریں دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔ دروازے کے باہر
کنڈی کھلنے کی آواز آئی۔ یہ کانچی یا سندھیا ہی ہو سکتی تھیں۔ دروازہ کھلا اور میں نے
لالٹین کی مدھم روشنی میں سفید بالوں والی بوڑھی عورت کو دیکھا۔ وہ دبے پاؤں میری
طرف بڑھ رہی تھی۔

میں سوچنے لگا یہ کس لئے آئی ہے؟ میں نے آنکھیں کھول دیں اور اُٹھ کر بیٹھ
ہوئے کچھ پوچھنے ہی لگا تھا کہ اُس نے اُنگلی اپنے ہونٹوں پر رکھ کر مجھے چپ رہنے
اشارہ کیا۔ اس کے بعد ہاتھ سے اشارہ کیا کہ میں اُس کے پیچھے پیچھے آؤں۔ اُسے خدا
نے میری مدد کے لئے ہی بھیجا تھا۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ وہ میری خیر خواہ ہے۔ اُس
ہمیشہ میری طرف ہمدردانہ نگاہوں سے دیکھا تھا۔ اور ایک بار مجھے وہاں سے بھاگ
جانے کا بھی اشارہ کیا تھا۔

میں نے چپل پہنی اور اُس کے پیچھے کوٹھڑی میں سے نکل کر تاریک راہداری میں
گیا۔ گلی نما راہداری میں تیل کے دیئے کی بہت پھیکی سی روشنی ایک طرف سے آ رہی

تھی۔ وہ مجھے لے کر ڈیوڑھی میں آ گئی۔ اُس نے چابی لگا کر دروازے پر لگے ہوئے
تالے کو کھولا اور ہم اُس منحوس استھان سے باہر نکل آئے۔

ستاروں بھری ٹھنڈی رات کی شبنمی فضا میں سانس لیتے ہی میری جان میں جان آ
گئی۔ تاروں کی پھیکی سی روشنی میں بوڑھی عورت نے مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔
وہ تیز تیز چل رہی تھی۔ ہم ویران عمارت کے پچھواڑے والے تالاب کو پیچھے چھوڑ
کر آگے درختوں کی طرف نکل گئے۔ ابھی صبح ہونے میں گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ ضرور باقی ہوگا۔
کیونکہ مشرق کی جانب ستاروں کا رنگ ابھی پھیکا نہیں پڑا تھا۔ میرے پاس صرف یہی
گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ تھا۔ سورج کی پہلی کرن کے نکلتے ہی مجھ پر نقاہت کا غلبہ شروع ہو جانا
تھا۔ میری محسن بوڑھی عورت بول نہیں سکتی تھی مگر بڑی غنیمت تھی کہ وہ سن سکتی تھی اور میں
اسے صورتحال سے آگاہ کر سکتا تھا۔ مگر ابھی ہم تیز تیز چلے جا رہے تھے۔ درختوں کے دو
تین جھنڈوں میں سے گزر گئے۔ اس کے بعد جھاڑیوں اور سوکھی گھاس کا میدان آ گیا۔
گھاس زیادہ اُونچی نہیں تھی۔ ہم اُس کے بیچ میں چل رہے تھے۔

اس بات کا بھی خطرہ تھا کہ کہیں کسی جگہ اچانک کوئی شیر یا دوسرا درندہ ہم پر حملہ نہ کر
دے۔ سفید بالوں والی بوڑھی عورت کو شاید یہ خطرہ نہیں تھا کیونکہ وہ ایک ہی رفتار سے
چلی جا رہی تھی۔ گھاس کا میدان جہاں ختم ہوا وہاں تاروں کی روشنی میں مجھے بہت بڑی
جھیل دکھائی دی۔ یہ دریا نہیں تھا، جھیل ہی تھی۔ کیونکہ اُس کے تینوں جانب دُور کافی
فاصلے پر درختوں کی سیاہ دیوار دکھائی دے رہی تھی۔ جھیل کے کنارے جھاڑیوں کے
پیچھے ایک چھوٹی کشتی بندھی ہوئی تھی۔ یہ عورت میرے فرار کا پورا انتظام کر کے آئی تھی۔
اُس نے مجھے کشتی میں بیٹھ جانے کا اشارہ کیا اور کشتی کی رسی کھول کر خود بھی بیٹھ گئی۔ اُس
نے چپو تھام لیا اور کشتی کو کنارے سے نکال کر لے گئی۔ کشتی دوسرے کنارے کی طرف جا
رہی تھی۔ میری نگاہیں بار بار آسمان کی طرف اُٹھ جاتی تھیں۔ آسمان کے مشرقی کناروں
کی طرف پو پھٹنا شروع ہو گئی تھی اور ہلکی ہلکی نیلاہٹ اُبھرنے لگی تھی۔ صبح کے قریب
ہونے کا احساس مجھے اس طرح بھی ہو گیا تھا کہ مجھ پر کمزوری چھانے لگی تھی مگر میں نے
اپنے آپ کو اس خیال سے سنبھالا ہوا تھا کہ مجھے ہمت نہیں ہارنی اور زندہ رہنا ہے۔

یہ خوف ضرور تھا کہ جیسے ہی کانچی بیدار ہوئی اور اُس نے مجھے غائب پایا تو اُس کے

منتروں کا جادو حرکت میں آ جائے گا۔ پھر مجھے چکر آئے گا اور میں بے ہوش ہو
پڑوں گا۔ دونوں عورتیں جان لڑا دیں گی مگر مجھے بھاگنے نہیں دیں گی کیونکہ مجھ پر
نے اپنے سارے سنسکاروں کی رسمیں پوری کر دی تھیں اور کل رات مجھے دیوی پر
کرنے کے بعد اُنہیں بہت بڑی شکتی ملنے والی تھی۔ وہ کیسے برداشت کر سکتی تھیں
اُن کے ہاتھ سے نکل جاؤں؟ میں انہی پریشان کر دینے والی سوچوں میں گم تھا
بوڑھی عورت تیزی سے چپو چلاتی کشتی کو دوسرے کنارے کی طرف لئے جا رہی تھی
دوسرے کنارے ایک جنگل شروع ہو گیا۔ یہ اُونچی اُونچی جھاڑیوں اور گھنی
شاخوں والے درختوں کا جنگل تھا۔ اس وقت سحر سے پہلے کی ہلکی نیلی اُجالے کی
روشنی رات کی تاریکی میں سے نمودار ہونے لگی تھی۔ درختوں کے نیچے ابھی تک اندھیرا
تھا۔ اس اندھیرے میں بھی درختوں کے خاکے نمایاں ہو رہے تھے۔ مجھے کمزوری محسوس
ہونے لگی تھی۔ لیکن میں اپنی قوت ارادی اور خدا کے بھروسے پر چل رہا تھا۔ مجھے ابھی
تک کچھ معلوم نہیں تھا کہ میری ہمدرد بوڑھی عورت مجھے کہاں لئے جا رہی ہے؟ وہ
نہیں سکتی تھی اس لئے بتا بھی نہیں سکتی تھی۔ ایک بار میں نے اُس سے پوچھنے کی کوشش
بھی کی مگر اُس نے سوائے آگے کی طرف اشارہ کرنے کے اور کوئی اشارہ نہ کیا۔ شاید
اشاروں سے سمجھانے کا وقت بھی نہیں تھا۔ میں اس خیال سے مطمئن تھا کہ کانچی اور
سندھیا میں سے کوئی بھی اتنی جلدی بیدار نہیں ہو گی۔ مگر اُن کا کچھ پتہ بھی نہیں تھا
بھی وقت کانچی یا سندھیا اُٹھ کر مجھے دیکھنے اور تسلی کرنے میری کوٹھڑی میں آ سکتی تھیں
بس اسی خیال سے مجھے ڈر سا لگنے لگا تھا۔ ابھی تک مجھے کوئی چکر بھی نہیں آیا تھا مگر
اپنے اندر کمزوری محسوس کرنے لگا تھا۔ یہ کمزوری آہستہ آہستہ میرے جسم پر چھا رہی
اور میری ٹانگیں چلتے چلتے کسی وقت لڑکھڑا سی جاتی تھیں۔ شاید بوڑھی عورت کو اس
کا علم تھا۔ چنانچہ اُس نے ایک بار رُک کر مجھے اشاروں سے کچھ سمجھانے کی کوشش کی
وہ اپنے سر پر ہاتھ رکھتی، ہاتھ کو اپنے سر کے گرد گھماتی، پھر اپنی ٹانگوں کی طرف اشارہ
کیا، جیسے مجھے کہہ رہی ہو کہ تمہیں چکر آیا یا کمزوری محسوس ہوئی تو رُکنا بالکل نہیں
جانا۔ میں اُس کے ساتھ چلتا جا رہا تھا۔ ذرا سا بھی کمزوری کا غلبہ ہوتا تو میں اپنے
کو پوری قوتِ ارادی سے سنبھال لیتا۔

جنگل ختم ہوا تو خدا کا شکر ادا کیا۔ اب دن نکل آیا تھا۔ صبح کی سفیدی پھیل گئی تھی اور
ٹانگیں جواب دینے لگی تھیں۔ یہ بہت بڑی غنیمت تھی کہ ابھی تک مجھے کوئی چکر نہیں
تھا جس کا مطلب تھا کہ کانچی ابھی جاگی نہیں ہے اور اُسے میرے فرار کا علم نہیں ہوا۔
مگر اب وہ کسی وقت بھی جاگ سکتی تھی اور اُس کے جاگنے کے ساتھ ہی اُس کے
کے طلسم نے بھی حرکت میں آ جانا تھا۔ اس کے بعد میرے ساتھ وہی ہونا تھا کہ
چکر آتا، ہر شے میری آنکھوں کے آگے ایک بار گھومتی اور میں بے ہوش ہو کر گر
پھر مجھے، سفید بالوں والی میری محسن عورت بھی مجھے کانچی اور سندھیا سے نہیں بچا
تھی۔ بہت ممکن تھا کہ غصے میں دیوانی ہو کر یہ عورتیں بوڑھی عورت کو بھی ہلاک کر
تیں۔ بے چاری بوڑھی عورت اُن خونی عورتوں کی شکتی کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔
کچھ فاصلے پر اُونچے اُونچے درختوں کے درمیان ایک پرانے ٹائپ کی عمارت دکھائی
دی۔ بوڑھی عورت نے اُس عمارت کی طرف ہاتھ کا اشارہ کر کے مجھے اشاروں سے کچھ
سمجھانے کی کوشش کی جسے میں نہ سمجھ سکا۔ ضرور وہ عمارت میری جائے پناہ تھی۔ میں
جلدی وہاں پہنچنا چاہتا تھا کیونکہ اب مجھ سے چلنا بہت مشکل ہو رہا تھا۔ یہ عمارت کسی
پرانے محل کا کھنڈر لگتا تھا۔ نیم شکستہ دروازے پر جنگلی بیل جھکی ہوئی تھی۔ بڑی پراسرار
خاموشی چاروں طرف چھائی ہوئی تھی۔ بوڑھی عورت مجھے عمارت کے اندر لے گئی اور
ایک نیم روشن ویران سے کمرے میں بٹھا دیا۔ وہ تھوڑی دیر میں واپس آنے کا اشارہ کر
کے کمرے کے کونے والے چھوٹے سے دروازے میں سے دوسری طرف چلی گئی۔
اُس ویران کمرے کا فرش گرد آلود قالین سے ڈھکا ہوا تھا۔ دیوار کے ساتھ پرانی
ٹائپ کے بھاری بھرکم صوفے لگے تھے جن کا رنگ مٹیالا پڑ چکا تھا۔ ایک طرف کی دیوار
انی رنگ کے چنٹ والے پردے سے ساری کی ساری ڈھکی ہوئی تھی۔ یہ سب کچھ
عجیب لگ رہا تھا۔ یہ کسی ہندو راجہ یا دیوان کا پرانا محل نہیں لگتا تھا۔ کمرے کی
ٹ، صوفے اور دیواروں کے پردے اٹھارویں صدی کے یورپ کے قدیم قلعوں
یاد تازہ کرتے تھے۔ مجھے خیال آیا کہ انگریزوں نے ہندوستان پر برسوں حکومت کی
ہو سکتا ہے یہ کسی انگریز جرنیل یا کاؤنٹ کا محل رہ چکا ہو۔
اتنے میں بوڑھی عورت کونے والے چھوٹے دروازے میں نمودار ہوئی۔ مگر وہ اکیلی

نہیں تھی۔ اُس کے ساتھ ایک دراز قد سڈول بدن کی عورت بھی تھی۔ وہ کاسنی رنگ
ساڑھی میں تھی۔ سیاہ بالوں کے جوڑے میں سفید پھول سجے ہوئے تھے، گلے میں
ہیروں کی مالا تھی اور کانوں میں سرخ پتھروں کے نگینے چمک رہے تھے۔ جب وہ میرے
قریب آئی تو میں اُس کے حسن سے مسحور سا ہو کر رہ گیا۔ وہ واقعی بڑی خوبصورت تھی
سیاہ آنکھوں میں ایک مقناطیسی چمک تھی۔ سفید بالوں والی بوڑھی نے اشاروں میں اُ
کچھ کہا تو حسین عورت نے اُسے نرم اور دلکش لہجے میں کہا۔

''بائی! اب تم جاؤ۔''

بوڑھی عورت نے ہاتھ جوڑ کر حسین عورت کو پرنام کیا۔ ایک نظر میری طرف دیکھا
بڑی شفقت سے مسکرائی اور چلی گئی۔ اُس نے مجھے شکریہ ادا کرنے کا موقع بھی نہیں دیا
میں حسین عورت کے احترام میں صوفے سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ مگر اب کمزوری پوری
طرح سے مجھ پر غالب آ چکی تھی اور میرے لئے اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں ہوا جاتا تھا
میں ذرا سا لڑکھڑایا تو حسین عورت نے مجھے سہارا دے کر صوفے پر لٹا دیا۔ وہ میرے
پاس ہی بیٹھ گئی اور میرے ماتھے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ اُس کے نرم ہاتھ کی دھیمی دھیمی
گرمائش نے مجھے بڑا سکون دیا۔ حسین عورت کے چہرے پر ہلکا تبسم تھا۔ سامنے والی
دیوار کے پرانی وضع کے روشندان میں سے دن کی روشنی اُس کے چہرے پر پڑ رہی تھی
جس میں اُس کا حسین چہرہ کنول کے پھول کی طرح دمک رہا تھا۔ وہ ایسی نظروں سے
مجھے دیکھ رہی تھی جیسے برسوں سے مجھے جانتی ہو۔ اُس کے لباس میں سے بڑی خواب
آلود خوشبو آ رہی تھی۔ اُس نے اپنی شیریں آواز میں کہا۔

''میں جانتی ہوں تمہارے ساتھ کیا ہوا ہے۔ مگر جو کچھ تمہارے ساتھ ہوا ہے اُسے
بھول جاؤ! یہاں تم میری حفاظت میں ہو۔ تمہیں کچھ نہیں ہو گا۔''

میں نے کہا۔ ''کیا میں اپنے گھر واپس جا سکوں گا؟''

اُس نے میرے ماتھے پر سے اپنا ہاتھ اُٹھا لیا اور خفیف سے تبسم کے ساتھ کہا۔

''تم بہت جلد واپس چلے جاؤ گے۔''

اُس کی آواز میں کچھ اس قسم کی رحم دلی اور ملائمت تھی کہ میرے اندر خود اعتمادی اور
توانائی کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ اُس کی پیشانی پر سرخ بندیا لگی تھی مگر اس علاقے کی

عورتوں کی طرح اُس کا رنگ گہرا سانولا اور کالا نہیں تھا بلکہ اس کے اُلٹ اُس کا
زردی مائل تھا۔ میں نے کہا۔

''مجھ پر دو عورتوں نے جادو کیا ہوا ہے۔ وہ مجھے کسی دیوی دیوتا کی بھینٹ چڑھانا
چاہتی ہیں اس لئے کہ میں مسلمان ہوں۔''

اُس نے کہا۔ ''مجھے معلوم ہے۔''

میں حیران ہو کر اُسے تکنے لگا۔

''کیا تم مجھے اُن کے جادو سے نجات دلا سکتی ہو؟ مگر تم تو خود ہندو ہو۔ تم بھی دیوی
دیوتاؤں کو مانتی ہو۔ میں تم پر کیسے بھروسہ کر لوں؟''

اُس کے ہونٹوں پر مسلسل ایک تبسم کھلا ہوا تھا۔ کہنے لگی۔

''میں ہندو نہیں ہوں۔ میرا نام سرسوتی آئزک ہے۔ میں اینگلو انڈین ہوں۔ تم مجھ
پر بھروسہ کر سکتے ہو۔''

وہ اُٹھ کر دیوار کے ساتھ لگی بڑی الماری کی طرف گئی اور اُس میں سے ایک گلاس
میں سبز رنگ کی کوئی دوائی ڈال کر لے آئی۔ گلاس میری طرف بڑھا کر اُس نے
دوسرے ہاتھ سے مجھے سہارا دیا اور بولی۔

''یہ پی لو!''

میں ذرا جھجکا تو اُس نے کہا۔ ''بے فکر رہو! اس سے تمہیں فائدہ پہنچے گا۔''

میں دوائی پی گیا۔ اس کا ذائقہ مجھے ناگوار لگا۔ اُس نے مجھے صوفے پر لٹا دیا اور کہنے
لگی۔ ''اب تم سو جاؤ! تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔''

کمزوری اور نقاہت کے باعث پہلے ہی سے میری آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔ دوائی
پینے کے بعد مجھ پر غنودگی طاری ہو گئی اور دوسرے لمحے مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔ جب آنکھ
کھلی تو میری کمزوری اور ناطاقتی جیسے ختم ہو چکی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ رات ہو گئی ہو گی۔
...ن کے گزر جانے پر میں اپنی اصلی توانا حالت پر واپس آ جاتا تھا۔ میری نگاہیں
... جانب روشندان کی طرف اُٹھ گئیں۔ یہ دیکھ کر مجھے بڑی خوشگوار حیرت ہوئی
...شندان میں سے دھوپ کی ایک کرن کمرے میں آ رہی تھی۔

میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ جب سے میں کانچی اور سندھیا کے پھندے میں پھنسا تھا یہ پہلا

موقع تھا کہ دن کے وقت بھی میں اپنے آپ کو طاقتور اور صحت مند محسوس کر رہا تھا۔ اب
تک نہ تو میرا سر ایک لمحے کے لئے بھی چکرایا تھا اور نہ مجھے کانچی کی خوف طاری کرنے
والی آواز سنائی دی تھی۔ اُس کمرے میں ایک قد آدم پردے کے پیچھے سے اُوپر کو زینہ
جاتا تھا۔ زینے کے دروازے کا پردہ ہٹا اور سرسوتی نمودار ہوئی۔

وہ میرے پاس آکر بولی۔ ''کیسا محسوس ہو رہا ہے؟''

میں نے کہا۔ ''میری کمزوری ختم ہوگئی ہے۔ لیکن کانچی نے مجھ پر جو جادو کیا ہے مجھے
اس کا ڈر لگا ہے۔ وہ کسی وقت بھی حملہ کر سکتا ہے۔''

سرسوتی بولی۔ ''اُس کا جادو میرے محل کی چار دیواری میں تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ تم
میرے ساتھ اُوپر آ جاؤ!''

وہ مجھے اُوپر لے گئی۔

اُوپر ایک قدیم طرز کا کمرہ تھا جس کے وسط میں لمبی میز پر چائے کا سامان لگا تھا۔
ایک ادھیڑ عمر کی عورت پھولوں سے بھرا ہوا گلدان رکھ رہی تھی۔ ہم چائے کی میز پر آ
گئے۔ ادھیڑ عمر کی عورت جو خادمہ تھی پیالیوں میں چائے اُنڈیلنے لگی۔ ساتھ کھانے کو ایک
پلیٹ میں کچھ مٹھائی پڑی تھی۔ ایک عرصے کے بعد چائے ملی تھی۔ میں بڑے شوق سے
چائے پینے لگا۔ کبھی اُس حسین عورت سرسوتی کی طرف احسان مند نظروں سے دیکھتا
تھا۔ اُس کی عمر تیس پینتیس کی تھی، مگر چہرے سے وہ بیس پچیس برس کی لگتی تھی۔ میں سوچ
رہا تھا کہ یہ عورت جنگل میں اس پرانے شکستہ محل نما مکان میں اکیلی کیسے رہ رہی ہے؟ یہ
ہندو بھی نہیں ہے۔ پھر یہ کون ہو سکتی ہے؟ مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں نے پوچھ ہی لیا کہ وہ
کون ہے اور اس جنگل والے قدیم محل میں وہ اکیلی کیسے رہ رہی ہے؟ سرسوتی نے چائے
کا ایک گھونٹ پینے کے بعد پیالی بڑے سکون کے ساتھ میز پر رکھی اور میری طرف نگاہیں
اُٹھا کر کہا۔

''میرے پڑدادا کا نام سر رچرڈ آنزک تھا۔ وہ پرتگال سے انڈیا میں تجارت کرنے
آئے تھے اور کبھی یہ جنگل اُن کی جاگیر میں شامل تھا۔ یہ محل میرے پڑدادا نے اپنی شادی
کے موقع پر بنوایا تھا۔ انہوں نے انڈیا میں ہی یہاں کے ایک برہمن خاندان کی لڑکی
سے شادی کی تھی۔ میری پڑدادی کو ہندی دیو مالا اور خاص طور پر ویدوں کے جادو

منتروں پر بڑا عبور حاصل تھا۔ میرے والد کہا کرتے تھے کہ تمہاری پڑدادی کے بارے
میں ہمارے خاندان میں مشہور تھا کہ وہ ایک کمرے میں غائب ہو کر دوسرے کمرے میں
ظاہر ہو جاتی تھی۔ ہمارے اس محل میں میری پڑدادی کی پرانی پستکیں (کتابیں) ایک
صندوق میں بھری ہوئی ہیں۔ یہ کتابیں سنسکرت زبان میں لکھی ہوئی تھیں اور ان میں
مختلف جادو ٹونے کے ٹوٹکے تھے۔ میں نے سنسکرت اپنی والدہ سے سیکھی اور پڑدادی کی
جادو ٹونے کی کتابوں کو محض شوق کی خاطر پڑھا۔ جادو ٹونے سے تو مجھے کوئی دلچسپی نہیں
تھی لیکن میں نے کئی خطرناک قسم کے جادو ٹونوں کا توڑ ضرور معلوم کر لیا تا کہ ضرورت
کے وقت وہ میرے یا کسی دوسرے کے کام آسکیں۔ یہ میری پڑدادی کی کتابوں کو پڑھنے
کا اثر ہے کہ میں تمہیں دیکھتے ہی جان گئی تھی کہ کانچی اور سندھیا نے تم پر کون سا جادو ٹونہ
کیا ہوا ہے؟''

میں نے بے تاب سا ہو کر پوچھا۔ ''تم نے کانچی کے جادو کو میرے سر سے اُتار دیا
ہے نا؟''

سرسوتی نے مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''میں نے اتنا ضرور کر دیا ہے کہ سندھیا اور
کانچی کا جادو تم پر اُس وقت تک نہیں چل سکے گا جب تک تم اس محل کی چار دیواری کے
اندر ہو۔''

میں نے مایوسی کے ساتھ کہا۔ ''اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ میں یہاں قید ہو کر رہ
جاؤں گا۔ میں ایسا کیسے کر سکتا ہوں؟ مجھے اپنے گھر بھی واپس جانا ہے۔''

سرسوتی کہنے لگی۔ ''اس کا بھی کوئی نہ کوئی حل نکل آئے گا۔ ابھی تم چائے پیو!''

میں چائے پینے لگا۔ میں نے سرسوتی سے پوچھا۔ ''کیا تم یہاں اکیلی رہتی ہو؟''

اُس نے گہرا سانس لیا، سامنے والی لمبی کھڑکی کی طرف دیکھا جس پر کوئی جنگلی بیل
باہر کی طرف جھکی ہوئی تھی اور اس بیل میں سے ڈھلتے سورج کی گلابی کرنیں اندر آ رہی
تھیں۔ پھر اُس نے چائے کا ایک ہلکا سا گھونٹ پیا اور بولی۔

''ہاں...... میں یہاں اکیلی رہتی ہوں۔''

اس کے بعد مجھے اُس کی ذاتی زندگی کے بارے میں کچھ پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی۔
میں نے موضوع بدل کر سوال کیا۔

''کیا تم سندھیا اور کانچی سے واقف ہو...... تم اُنہیں جانتی ہو؟''

''میں اُنہیں بڑی اچھی طرح سے جانتی ہوں۔'' یہ کہہ کر سرسوتی نے پیالی پلیٹ میں رکھ دی اور ایک لمحہ خاموش رہنے کے بعد بولی۔ ''پُرانوں اور شاستروں میں ویدوں کے حوالے سے لکھا ہے کہ بدکردار ہندو عورتیں مرنے کے بعد لومڑی کے رُوپ میں جنم لیتی ہیں اور اسی رُوپ میں ایک لاکھ چوراسی ہزار جنم بھگتنے کے بعد بدی اور گناہ کے دیوتا کی پجارنوں کے رُوپ میں جنم لیتی ہیں۔ سندھیا اور کانچی دونوں ایسی ہی عورتیں ہیں۔ وہ بدی اور گناہ کے دیوتا کی پوجا کرتی ہیں جو ہر برائی کی سب سے بری طاقت شیطان کا اوتار ہے۔ سندھیا اور کانچی بدی کے دیوتا اور اُس کی دیوی کے آگے تمہاری قربانی دے کر شیطان کی خوشنودی حاصل کر کے شیطانی قوتوں کی شکتی حاصل کرنا چاہتی ہیں تا کہ اس دنیا پر اپنی شیطانی طاقت سے حکومت کر سکیں۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اُنہوں نے تمہیں منتخب کیا۔ کیونکہ تم اس وقت رانی کے قبضے میں تھے جو تمہاری بھینٹ دے کر اپنی اور اپنے ماتا پتا کی مکتی کی تلاش میں تھی۔ جب اُسے معلوم ہوا کہ تم مسلمان ہو اور اس وقت مصیبت میں بھی مبتلا ہو تو اُس نے تمہیں اپنی جھوٹی ہمدردی جتا کر وہاں سے نکالا اور سندھیا کے استھان پر لا کر تمہیں اپنے قبضے میں کر لیا۔ یہ ہے اُن دونوں بری اور شیطان صفت عورتوں کی اصل کہانی۔''

مجھ پر اُداسی اور مایوسی چھا گئی۔ کیونکہ مجھے لگ رہا تھا کہ میں سندھیا اور کانچی کے پھندے سے شاید کبھی نہیں نکل سکوں گا۔ اور ایک لمحے کے لئے بھی اگر سرسوتی کے پرانے محل سے باہر قدم رکھا تو دونوں چڑیل عورتیں مجھے اُٹھا کر لے جائیں گی۔ سرسوتی نے میری ذہنی کیفیت کو بھانپ لیا تھا۔ کہنے لگی۔

''تمہیں مایوس نہیں ہونا چاہئے۔ میں نے تمہیں کہا نا کہ جس پستک میں سے کانچی نے جادو کے منتر نکال کر تم پر ٹونہ کیا ہے اسی پستک سے میں اس کے جادو کا کوئی نہ کوئی حل ضرور نکال لوں گی۔ مجھے تھوڑا سا موقع دو! تھوڑا سا وقت دے دو۔ اتنی دیر تم یہاں اطمینان سے رہو۔ یہاں کانچی اور سندھیا تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گی۔''

مجھے پورا تو نہیں لیکن تھوڑا سا اطمینان ہو گیا کہ سرسوتی میری مصیبت کا کوئی نہ کوئی حل ضرور نکال لے گی۔

رات کو میں نے اور سرسوتی نے اکٹھے کھانا کھایا۔ میرے لئے اُس نے ایک الگ کمرے میں بستر لگوا دیا تھا۔ اُس کا بیڈروم میرے کمرے کے بالکل ساتھ ہی تھا۔ وہ کچھ دیر میرے پاس بیٹھی مجھ سے باتیں کرتی اور مجھے تسلیاں دیتی رہی۔ جانے لگی تو بولی۔

''رات کو اگر کسی قسم کا خوف محسوس کرو تو مجھے آ کر جگا دینا۔''

وہ چلی گئی۔ چھوٹا سا اُونچی چھت والا پرانا کمرہ تھا جس میں ایک تپائی پر گلدان پڑا تھا۔ دیوار کے ساتھ میرا پرانا پلنگ تھا۔ لمبی محراب دار کھڑکی کھلی تھی جس میں سے باہر جنگل کی تازہ اور خنک ہوا آ رہی تھی۔ چاروں طرف ایسی خاموشی تھی جیسے صدیوں سے وہاں کوئی نہ بولا ہو۔

میں بستر پر لیٹا آنکھیں بند کر کے اپنے خیالوں میں اُلجھ گیا۔ ہر قسم کے خیال آ رہے تھے۔ کبھی لگتا کہ میں ٹھیک ہو کر اپنے گھر واپس چلا جاؤں گا۔ کبھی لگتا کہ میری موت اسی علاقے کے کسی خونی مندر میں کانچی اور سندھیا کے ہاتھوں واقع ہو گی۔ کارنس پر رکھا ہوا مٹی کے تیل والا بڑا لیمپ جل رہا تھا۔ یہ سفید گلوب والا پرانی وضع کا لیمپ تھا۔

اچانک مجھے تیز ہوا کی شوکر کی آواز سنائی دی۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ کھڑکی کا پڑا ہوا پردہ تیز ہوا میں پھڑ پھڑانے لگا تھا۔ ساتھ ہی لیمپ کی بتی بھی کبھی دھیمی اور کبھی تیز ہونے لگی تھی۔ میں یہی سمجھا کہ باہر آندھی چلنے لگی ہے۔ میں نے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں اور اپنی سوچوں میں گم ہو گیا۔ پھر ایک ایسی منحوس آواز میرے کانوں میں پڑی جسے میں کبھی نہیں سننا چاہتا تھا۔ یہ کانچی کی آواز تھی...... وہ کہہ رہی تھی۔

''میں جانتی ہوں تم کہاں ہو؟ مگر تم کب تک یہاں رہو گے؟ ایک نہ ایک دن تو ضرور باہر نکلو گے۔ اور پھر میں تمہیں بڑے پیار سے گود میں اُٹھا کر اپنے پاس لے آؤں گی۔ میرے پاس آؤ گے نا؟''

وہ ہنسنے لگی۔ اور اُس کے ہنسنے کی آواز غائب ہو گئی۔

میری آنکھیں کھلی تھیں اور خوف کے مارے میرا جسم پسینے میں شرابور ہو گیا تھا۔ میں اس وقت سرسوتی کے کمرے میں جا کر اُسے بتانا چاہتا تھا کہ کانچی نے مجھے آواز دی ہے۔ میں نے کانچی کی آواز سنی ہے۔ مگر میں نے آدھی رات کے وقت سرسوتی کو بے آرام کرنا مناسب خیال نہ کیا۔ جبکہ کانچی کی آواز غائب ہو چکی تھی اور اس بات کی بھی

تصدیق ہوگئی تھی کہ جب تک میں اس محل میں رہوں گا، کانچی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔

صبح میں نے ناشتہ کرتے ہوئے سرسوتی کو رات والا واقعہ سنایا تو وہ بولی۔

''میں جانتی ہوں اُس نے تمہارا پیچھا نہیں چھوڑا۔ وہ تمہارا اس وقت تک پیچھا چھوڑے گی بھی نہیں جب تک کہ میں تمہیں ہمیشہ کے لئے اُس کی بدی کی طاقت سے محفوظ نہیں کر دیتی۔''

میں نے بڑی عاجزی سے کہا۔

''خدا کے لئے جو کچھ کرنا ہے جلدی کرو! رات اُس کی آواز سننے کے بعد میں پریشان ہوگیا ہوں۔ مجھے خطرہ ہے کہ وہ کسی نہ کسی طریقے سے اس محل کی چار دیواری کے اندر بھی مجھ پر حملہ کرے گی۔''

''اس کی تم فکر نہ کرو!'' سرسوتی نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ''اُس میں اتنی شکتی نہیں ہے۔ اگر اُس نے ایسا کرنا ہوتا تو وہ تمہیں یہاں سے اُٹھا کر لے جا چکی ہوتی۔''

یہ سرسوتی نے بالکل صحیح کہا تھا۔ مگر آخر میں کب تک سرسوتی کے محل کی چار دیواری کے اندر رہ سکتا تھا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد سرسوتی کہنے لگی۔

''میں جا رہی ہوں۔''

''کہاں......؟'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

کہنے لگی۔ ''تمہارا کام کرنے جا رہی ہوں۔ جو کام میں نہیں کر سکتی وہ مجھے ایک بزرگ کی مدد سے کروانا ہوگا۔ آخر تمہیں کانچی کے جادو سے آزاد بھی تو کرانا ہے۔''

''واپس کب آؤ گی؟'' میں نے پوچھا۔

وہ بولی۔ ''دو تین دن لگ جائیں گے۔ تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہاں خادمہ تمہارا ہر طرح سے خیال رکھے گی۔''

وہ چلی گئی۔ اُس رات آدھی رات کو میں بستر پر لیٹا پہلو بدل رہا تھا۔ مجھے نیند نہیں رہی تھی۔ دل کو یہی دھڑکا لگا تھا کہ مجھے تنہا پا کر کانچی اور سندھیا مجھ پر اپنا جادو نہ چلا دیں۔ میں بالکل اکیلا تھا۔ ہوسکتا ہے اُنہوں نے کوئی ایسا منتر معلوم کر لیا ہو جس کی وجہ سے اُن کے جادو ٹونے کا اثر سرسوتی کے محل کی چار دیواری کے اندر بھی مجھ پر ہو جائے۔ ہر قسم کے پریشان خیال سوچتے سوچتے جب میرا ذہن تھک گیا تو میں آنکھیں بند کر

کے سونے کی کوشش کرنے لگا۔ ابھی نیند میری آنکھوں میں ہی سلگ رہی تھی کہ مجھے کانچی کی آواز سنائی دی۔ میں چونک پڑا اور خوفزدہ ہوگیا۔

''تم یہ مت سمجھنا کہ اس چار دیواری کے اندر میرا جادو نہیں چل سکے گا۔ تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ چپ چاپ میرے پاس چلے آؤ! میں تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ تمہیں کچھ نہیں کہوں گی۔ تمہاری جگہ کسی جانور کی قربانی دے دُوں گی۔''

میں نے جواب دیا۔ ''تم جھوٹ بول رہی ہو۔ مجھے سب پتہ چل گیا ہے کہ تم مجھے دیوی کے بت کے آگے کس لئے بھینٹ چڑھانا چاہتی ہو؟ یہ تمہاری زندگی اور موت کا سوال ہے۔''

کانچی ہنس پڑی، کہنے لگی۔

''سرسوتی میری دشمن ہے۔ اُسی نے تمہیں میرے خلاف ورغلایا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''یہ بھی تمہارا سفید جھوٹ ہے۔''

کانچی طیش میں آ گئی۔ اُس نے چیخ کر کہا۔

''ہاں! میں نے جھوٹ بولا ہے۔ مجھے اور سندھیا کو تمہارا خون چاہئے۔ ہم تمہیں پاروتی ماتا کی مورتی پر قربان کرنا چاہتی ہیں اور ہم تمہیں قربان کر کے رہیں گی۔''

اُس نے ایک مکروہ قہقہہ لگایا اور اُس کے قہقہے کی آواز دُور ہوتے ہوتے گم ہوگئی۔

اس کے بعد میں بالکل نہ سو سکا۔ دوسرا دن بھی اسی خوف میں گزر گیا کہ کہیں کانچی کا جادو اچانک مجھ پر حملہ نہ کر دے۔ دوسری رات کانچی کی آواز نہ آئی اور میں کچھ دیر کے لئے سو گیا۔ اگلے دن شام کے وقت سرسوتی واپس آ گئی۔ جب میں نے اُسے بتایا کہ مجھے کانچی کی آواز آئی تھی اور اُس نے کہا تھا کہ وہ بہت جلد اس چار دیواری کے اندر آ جائے گی اور مجھے یہاں سے اُٹھا کر لے جائے گی تو سرسوتی ایک لمحے کے لئے خاموش ہوگئی۔ کہنے لگی۔

''اُس نے غلط نہیں کہا۔ دونوں عورتوں کے پاس اتھر وید کے منتروں کی شکتی ہے۔ وہ ایسا کر سکتی ہیں۔''

میں نے ڈری ہوئی آواز میں سرسوتی سے کہا۔

''اس کا مطلب ہے کہ تمہاری چار دیواری میں بھی میری زندگی محفوظ نہیں ہے۔''

سرسوتی کہنے لگی۔ ''تمہیں ان خونی عورتوں کے پنجے سے بچانے کے لئے ہی میں
تھی اور میں اس کا انتظام کر کے آئی ہوں۔''
میں سرسوتی کو تکنے لگا۔ اُس نے کہا۔
''میں نے تمہیں پہلے بھی بتایا تھا کہ میں کانچی اور سندھیا کی بدی کی شکتی کا مقابلہ نہیں
کر سکتی۔ لیکن میرا خیال تھا کہ میرے محل کے اندر وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گی۔ لیکن
پھر مجھے احساس ہو گیا تھا کہ کانچی اور سندھیا شیطان کی پجارنیں ہیں اور انہوں نے
بعض خفیہ منتروں کی مدد سے ایسا کر سکتی ہیں۔''
سرسوتی نے میرے چہرے پر پریشانی اور خوف کے اثرات دیکھ لئے تھے۔
کہنے لگی۔ ''لیکن اس سے پہلے کہ ان کے خونی منتر حرکت میں آئیں، تم یہاں سے
دُور جا چکے ہو گے۔''
''لیکن میں اس چار دیواری سے باہر کیسے نکلوں گا؟'' میں نے کہا۔ ''تم نے خود کہا
ہے کہ اگر میں اس چار دیواری کے باہر نکلا تو کانچی کا جادو مجھ پر چل جائے گا۔''
سرسوتی نے کہا۔ ''تم میرے ساتھ جاؤ گے۔ میں نے تمہارا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے
رکھا ہو گا۔ جب تک تمہارا ہاتھ میرے ہاتھ میں رہے گا، کانچی اور سندھیا کے خونی
منتروں کا جادو تم پر نہیں چل سکے گا۔''
''ہمیں کہاں جانا ہو گا؟'' میں نے بے دِلی سے پوچھا۔
سرسوتی بولی۔ ''یہاں سے دو کوس کے فاصلے پر فادر فرانسس کی خانقاہ ہے۔ فادر
فرانسس سات برس سے اُس خانقاہ میں خداوند کی عبادت میں مشغول ہیں۔ میں نے
تمہارے بارے میں اُن سے بات کی تو اُنہوں نے کہا کہ اسے میرے پاس لے آؤ۔
تمہیں آج رات کو ہی میرے ساتھ چلنا ہو گا۔''
میں تیار ہو گیا۔ لیکن مجھے اس بات کا سخت ڈر لگ رہا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس محل
کی چار دیواری سے نکلتے ہی سرسوتی کا اندازہ غلط ثابت ہو اور کانچی کا جادو حرکت میں آ
جائے اور میں دوبارہ ان خونخوار عورتوں کے قبضے میں چلا جاؤں۔ میں نے اس خدشے کا
اظہار سرسوتی کے آگے کیا تو اُس نے مجھے تسلی دی کہ ایسا نہیں ہو گا۔
''بس! تم میرا ہاتھ بالکل نہ چھوڑنا۔''

میں نے کہا۔ ''وہ میں نہیں چھوڑوں گا۔''
رات جب گہری ہو گئی تو سرسوتی مجھے ساتھ لے کر پرانے محل کے ایک خفیہ دروازے
سے باہر آ گئی۔ میں نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ جنگل کی گھنی
جھاڑیاں اور اُونچے اُونچے درخت رات کے اندھیرے میں ساکت کھڑے تھے۔ ہوا
بند تھی۔ پرانے محل سے نکلتے ہی مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ میں گھبرا کر رُک گیا۔
''کیا ہوا؟'' سرسوتی نے پوچھا۔
میں نے کہا۔ ''مجھے ایسے لگا ہے جیسے کسی نے مجھے پیچھے سے دھکا دیا ہے۔''
سرسوتی بولی۔ ''یہ کانچی کی کارستانی ہے۔ وہ ضرور کوشش کرے گی کہ کسی طرح تمہارا
ہاتھ میرے ہاتھ سے چھوٹ جائے۔ مگر تم گھبرانا بالکل نہیں۔ اور کسی حالت میں بھی اپنا
ہاتھ میرے ہاتھ سے الگ نہ کرنا۔''
میں نے سرسوتی کے ہاتھ پر اپنے ہاتھ کی گرفت اور مضبوط کر لی۔
''بالکل نہیں چھوڑوں گا۔''
ہم اندھیرے میں درختوں، جھاڑیوں کے درمیان چلتے گئے۔ بڑا دُشوار گزار جنگل
تھا۔ راستے میں کئی گھاٹیاں آئیں۔ ہم ایک خشک نالے میں سے گزر رہے تھے کہ مجھے
ایک بار پھر پیچھے سے کسی نے دھکا دیا۔ یہ اتنا زوردار دھکا تھا کہ اگر میں نے سرسوتی کا
ہاتھ مضبوطی سے نہ تھاما ہوتا تو میں منہ کے بل گر پڑتا۔ میرا ہاتھ چھوٹ جاتا اور اس کے
بعد میرے ساتھ جو گزرتی، اُس کے تصور ہی سے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ سرسوتی
نے مجھے اپنے اور قریب کر لیا۔ دو کوس کا فاصلہ طے ہوا تو ستاروں کی پھیکی روشنی میں
مجھے کچھ دُور ایک چھوٹا سا ٹیلہ دکھائی دیا۔
سرسوتی نے آہستہ سے کہا۔ ''یہی فادر فرانسس کی خانقاہ ہے۔''
جسے میں ٹیلہ سمجھ رہا تھا وہ کسی پرانی حویلی کی شکستہ سی عمارت تھی جس کے ایک جانب
والی کھڑکی کے اُوپر والے روشندان میں دھیمی روشنی ہو رہی تھی۔ سرسوتی کہنے لگی۔
''فادر جاگ رہے ہیں۔''
ہم شکستہ خانقاہ کی ڈیوڑھی میں داخل ہوئے تو سرسوتی نے کہا۔
''اب بے شک میرا ہاتھ چھوڑ دو۔ یہاں تم میرے محل کی چار دیواری سے بھی زیادہ

محفوظ ہو۔''

میں نے ڈرتے ڈرتے سرسوتی کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

خانقاہ کی ڈیوڑھی کے آگے فادر فرانسس کی کوٹھڑی کا دروازہ تھا جو بند تھا۔ دروازے کے باہر ڈیوڑھی کے طاق میں تیل کا ایک چراغ جل رہا تھا۔ سرسوتی نے بند دروازے پر آہستہ سے دستک دی اور کہا۔ ''فادر! میں ہوں سرسوتی۔''

اندر سے ایک نرم لہجے والی آواز نے جواب دیا۔

''اندر آجاؤ بیٹی!''

میں سرسوتی کے ساتھ خانقاہ کی کوٹھڑی کا دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ ایک کشادہ کوٹھڑی تھی جس کی دیوار کے ایک طاق میں چراغ جل رہا تھا۔ ایک سفید داڑھی اور شفیق چہرے والا بوڑھا آدمی چٹائی پر ہاتھ سینے پر باندھے دو زانو بیٹھا تھا۔ سامنے کارنس پر مسیح علیہ السلام کی شبیہ والی صلیب دیوار کے ساتھ لگی تھی۔ یہی فادر فرانسس تھا۔ وہ عبادت میں مصروف تھا۔ اُس کا سر جھکا ہوا تھا اور ہاتھ میں تسبیح تھی۔ میں سرسوتی کے ساتھ ہی چٹائی پر ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا۔

کوٹھڑی کی دھیمی روشنی والی فضا میں ایک گہرے سکون کی کیفیت تھی۔ مجھے اندر داخل ہوتے ہی ایک سکون کا احساس ہوا تھا۔ فادر فرانسس نے اپنی تسبیح کو چوم کر ماتھے سے لگایا، سینے پر صلیب کا نشان بنایا اور ہماری طرف دیکھا۔ فادر فرانسس کی آنکھوں میں مجھے رحم و محبت کی لہریں موجزن نظر آئیں۔ وہ میری طرف دیکھ رہے تھے۔ اُن کے چہرے پر دل میں نقش ہو جانے والا تبسم اُبھرا اور بولے۔

''بیٹی سرسوتی! کیا یہی وہ مسلمان نوجوان ہے؟''

سرسوتی نے بڑے ادب سے کہا۔ ''ہاں فادر! یہی وہ نوجوان ہے۔''

فادر فرانسس شفقت بھری نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ کہنے لگے۔ ''بیٹے! میں جانتا ہوں تجھ پر شیطانی عورتوں کے منتروں کا سایہ ہے۔ میں تیرے عذاب سے واقف ہوں۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ تیری مصیبت کا علاج میرے پاس نہیں ہے۔''

فادر فرانسس کے اس جملے سے مجھے سخت مایوسی ہوئی۔ میں سرسوتی کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ بھی چپ سی ہو گئی تھی۔ اُس نے کہا۔

''فادر! ہم بڑی اُمید لے کر آپ کے پاس آئے تھے۔''

فادر فرانسس تسبیح والا ہاتھ اُوپر اُٹھا کر بولے۔

''بیٹی! میں نے یہ کہا ہے کہ اس نوجوان کی مصیبت کا علاج میرے پاس نہیں ہے۔ میں نے یہ نہیں کہا کہ اس کی مصیبت کا کوئی علاج نہیں ہے۔''

مجھے کچھ حوصلہ ہوا۔ سرسوتی نے کہا۔

''خداوند آپ کو سلامت رکھے۔ ہمیں وہ علاج بتائیے!''

فادر فرانسس کہنے لگے۔ ''علاج اتنا آسان نہیں ہے۔ اس کی راہ میں سخت دُشواریاں ہیں، مشکلیں ہیں، بڑے صبر اور ثابت قدمی کی ضرورت پڑے گی۔''

میں نے کہا۔ ''فادر! میں اس عذاب سے نجات حاصل کرنے کے لئے ہر طرح کی مشکلیں، ہر طرح کی تکلیفیں برداشت کرنے کو تیار ہوں۔ آپ فرمائیے! مجھے کیا کرنا ہو گا؟''

فادر فرانسس ایک لمحے کے لئے کسی گہری سوچ میں کھو گئے، پھر چہرہ اُٹھا کر ہماری طرف دیکھا اور کہنے لگے۔

''یہاں سے شمال کی جانب دو جنگل چھوڑ کر سرسبز پہاڑی ٹیلے ہیں۔ اُن ٹیلوں کے درمیان ایک چھوٹی سی جھیل ہے۔ اُس جھیل کے کنارے سنبل اور صنوبر کے درختوں میں گھرا ہوا ایک چھوٹا سا بنگلہ ہے۔ اُس بنگلے میں ایک خاتون رہتی ہے۔ اُس خاتون کو آج تک سوائے میرے اور کسی نے نہیں دیکھا۔ وہ دن کے وقت بنگلے میں بند رہتی ہے۔ صرف رات کو کسی وقت بنگلے سے باہر نکل کر جھیل کنارے کچھ دیر ٹہلتی ہے، اور پھر بنگلے میں واپس چلی جاتی ہے۔ اُس کے بارے میں عجیب عجیب باتیں مشہور ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ وہ کوئی بھٹکی ہوئی رُوح ہے، کوئی کہتا ہے کہ وہ چڑیل ہے اور جو کوئی اُس کے بنگلے کے پاس جاتا ہے اُس کو اُٹھا کر لے جاتی ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ وہ جادوگرنی ہے اور بھولے بھٹکے مسافروں کو جادو کے زور سے غائب کر دیتی ہے۔ لوگ اُس سے خوف کھاتے ہیں اور کوئی اُس طرف نہیں جاتا۔''

سرسوتی نے سوال کیا۔ ''مگر یہ خاتون کون ہے فادر؟''

فادر فرانسس بولے۔

''اس سے تم لوگوں کو کوئی غرض نہیں ہونی چاہئے۔ میں نے یہ تفصیل اس لئے بتائی ہے کہ اس نوجوان کے روگ کا علاج صرف اُسی خاتون کے پاس ہے۔''

''میں ہر حالت میں اُس کے پاس جاؤں گا فادر!'' میں نے کہا۔ ''اور اُس سے مدد کی بھیک مانگوں گا۔ مجھے پورا یقین ہے کہ وہ ضرور میری مدد کرے گی۔''

سرسوتی نے فادر فرانسس سے پوچھا۔ ''فادر! اگر ہم اُس خاتون سے آپ کا نام لیں تو کیا آپ ہمیں اس کی اجازت دیں گے؟''

فادر فرانسس بولے۔ ''تم اُس خاتون سے ملو گی تو میرا نام لو گی نا! مگر وہ تو کسی سے ملتی ہی نہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ وہ مجھے نہیں جانتی۔ صرف میں اُسے جانتا ہوں اور اُس کی خفیہ طاقت سے واقف ہوں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اُس کی خفیہ طاقت کو بیدار کرنا اور اُس کو اپنی مدد پر آمادہ کرنا ایک ناممکن سی بات ہے۔''

ایک بار پھر وہاں مایوسی کی فضا چھا گئی۔ سرسوتی نے کہا۔

''فادر! مجھے اپنے آپ پر بھروسہ ہے کہ اگر میں اُس کے پاس جا کر اِس نوجوان کا حال بیان کروں گی تو وہ ضرور راضی ہو جائے گی۔''

فادر فرانسس بولے۔ ''پہلی بات تو یہ ہے کہ تم اس نوجوان کے ساتھ نہیں جاؤ گی۔ وہاں صرف یہ نوجوان ہی جائے گا۔ کیونکہ تمہیں نہیں، اس نوجوان کو مدد کی ضرورت ہے۔ اور اگر یہ نوجوان بھی وہاں گیا تو چار شکاری کتے جو پرانے بنگلے کے گرد پہرہ دیتے ہیں، وہ اس نوجوان کی بو سونگھتے ہی اس پر ٹوٹ پڑیں گے۔''

میں نے کہا۔ ''آپ نے فرمایا تھا کہ یہ خاتون رات کو کسی وقت پرانے بنگلے سے نکلتی ہے اور جھیل کنارے ٹہلتی ہے۔ میں اُس وقت اُس سے مل کر اپنا حال زار بیان کر سکتا ہوں۔''

فادر فرانسس بولے۔ ''اس میں بھی کامیابی کی بہت کم اُمید ہے۔''

سرسوتی کہنے لگی۔ ''لیکن شیراز! تم اکیلے وہاں کیسے جا سکو گے؟ تم اکیلے میرے گھر کی چار دیواری سے نکلے تو کانچی اور سندھیا کے منتروں کا جادو تمہیں وہیں دبوچ لے گا اور دونوں شیطانی عورتیں تمہیں اپنے قبضے میں کر لیں گی۔''

فادر فرانسس بولے۔ ''یہ کوئی مشکل بات نہیں ہے۔ اس نوجوان کا اکیلے جانا اس کے

کے حق میں بہتر ثابت ہو سکتا ہے۔ میں اس پر ایک دُعا پڑھ کر پھونکوں گا جس کے اثر سے یہ میری خانقاہ سے نکلنے کے بعد اُس وقت تک کے لئے شیطانی عورتوں کے منتروں کے طلسم سے محفوظ رہے گا جب تک یہ میرے پاس یا تمہارے پاس واپس نہیں آ جاتا، یا وہ خاتون اسے اپنی مرضی سے اپنے بنگلے میں نہیں لے جاتی۔ اگر ایک بار وہ خاتون اپنی مرضی سے اس کو اپنے بنگلے میں لے گئی تو پھر یہ وہاں بھی شیطانی عورتوں کے دوزخی طلسم سے محفوظ ہو گا۔''

میں نے فیصلہ کن انداز میں فادر سے کہا۔

''فادر! میں اکیلا جانے کے لئے تیار ہوں۔''

فادر فرانسس نے میری طرف دیکھا اور بولے۔

''میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ تم ضرور جاؤ! کیونکہ تمہاری مشکل کا علاج صرف اُسی خاتون کے پاس ہے۔ اگر تم نے تحمل اور صبر سے کام لیا تو ہو سکتا ہے اُس خاتون کی توجہ تمہاری طرف ہو جائے۔''

سرسوتی نے فادر فرانسس سے کہا۔

''لیکن فادر! اُس اُجاڑ بیابان جنگل میں رات کے وقت جنگلی درندوں کا خطرہ ہو گا۔''

فادر فرانسس بولے۔ ''یہ خطرہ تو اسے مول لینا ہی پڑے گا۔''

میں نے فوراً کہا۔

''فادر! میں جس مصیبت میں مبتلا ہوں اس سے نجات پانے کے لئے میں اپنی جان کی بازی بھی لگا سکتا ہوں۔ آپ مجھ پر دُعا پڑھ کر پھونکیں۔ میں ابھی اپنی نجات کی منزل کی طرف روانہ ہو جانا چاہتا ہوں۔''

اُنہوں نے تسبیح والا ہاتھ اُوپر اُٹھا کر کہا۔

''خداوند تمہاری حفاظت کریں گے۔ اب میں تمہیں بتاتا ہوں یہاں سے جھیل کنارے پُراسرار خاتون والے پرانے بنگلے کو کون سا راستہ جاتا ہے اور کن راستوں پر چل کر تم محفوظ رہو گے۔''

اس کے بعد فادر فرانسس نے مجھے تفصیل سے بتایا کہ مجھے اپنے سفر کا آغاز کہاں

سے کرنا ہوگا اور جنگل کی وہ نشانیاں بھی بتائیں جو اس خطرناک اور پُراسرار سفر میں میری
راہ نمائی کریں گی۔ سرسوتی میرے پاس ہی بیٹھی رہی۔ اُس وقت دن کا دوسرا پہر گزر رہا
تھا۔ ہم نے دوپہر کا مختصر اور سادہ سا کھانا فادر فرانسس کے ساتھ ہی کھایا۔
جب میں اپنے عجیب و غریب سفر کے لئے تیار ہو گیا تو فادر فرانسس نے مجھے رومال
میں لپیٹ کر خشک نمکین روٹیاں دیں اور مجھ پر دُعا پڑھ کر پھونکی۔

OOO

میرے دل میں شک ضرور تھا کہ خدا جانے فادر فرانسس کی دُعا کا اثر ہوتا بھی ہے کہ
نہیں؟ اگر اثر نہ ہوا تو میں تو بے موت مارا جاؤں گا۔ جیسے ہی وہاں سے نکل کر کچھ دُور
گیا، کانچی اور سندھیا کے منتروں کا جادو مجھے چکرا کر بے ہوش کر دے گا اور پھر دونوں
ڈائنیں کہیں نہ کہیں سے نکل کر مجھے اُٹھا کر لے جائیں گی۔ میں نے فادر کے آگے اپنے
شک کا اظہار مناسب نہ سمجھا اور خاموش رہا۔
فادر فرانسس میرے دل کا حال جان گئے تھے۔ کہنے لگے۔
''بیٹے! اپنے دل کو شک سے پاک کر دو! شک انسان کو بے راہ بھی کر دیتا ہے۔''
میں شرمندہ ہو گیا۔ میں نے کہا۔
''فادر! مجھے معاف کر دیجئے گا۔ مجھ سے غلطی ہو گئی کہ میں نے شک کیا۔''
فادر نے شفیق مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔
''کوئی بات نہیں بیٹے! جس ذہنی پریشانی سے تم گزر رہے ہو اس میں اس قسم کے
شک شبے کا پیدا ہو جانا ایک قدرتی بات ہے۔ جاؤ! خداوند تمہیں کامیاب کرے۔''
میں نے جھک کر فادر کے قدم چھوئے، پھر سرسوتی سے ہاتھ ملایا۔ سرسوتی نے بھی
مجھے دُعا دی اور نیک تمناؤں کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔
''میری دُعائیں بھی تمہارے ساتھ ہوں گی۔''
میں نے خشک روٹیوں والا رُومال چھوٹے سے تھیلے میں ڈالا، تھیلے کو کندھے سے
لٹکایا اور خانقاہ کے دروازے کی طرف قدم بڑھائے۔ سرسوتی میرے ساتھ آئی۔ اُس
نے خانقاہ کے دروازے سے باہر نکلتے ہی میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔
میں نے کہا۔ ''کیا تمہیں فادر فرانسس کی دُعا پر بھروسہ نہیں ہے؟ مجھے تو پورا بھروسہ
ہو گیا ہے۔''

سرسوتی کہنے لگی۔ ''کیا کروں...... تمہیں اکیلا چھوڑتے ہوئے ڈر لگ رہا ہے۔''
میں نے اپنا ہاتھ اُس کے ہاتھ سے چھڑاتے ہوئے کہا۔

''مجھے فادر فرانس کی دُعا پر پورا یقین ہے۔ تم دیکھ لینا! مجھے کچھ نہیں ہوگا۔ نہ بُخ آئے گا اور نہ میں بے ہوش ہوں گا۔''

اُس لمحے نہ جانے میرے اندر کہاں سے اتنی طاقت آ گئی تھی؟ میرے دل کو یقین کامل تھا کہ سرسوتی سے ہاتھ چھڑانے کے بعد میں کانچی اور سندھیا کے منتروں کے جادو سے محفوظ رہوں گا۔ اور ایسا ہی ہوا۔

لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ سرسوتی میرے بالکل ساتھ لگ کر چل رہی تھی۔ شاید وہ سوچ رہی تھی کہ اگر مجھ پر شیطانی عورتوں کے منتروں کا اثر ہوا تو وہ فوراً میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے بچا لے گی۔ مگر ایسی کوئی بات نہ ہوئی۔ ہم اُس راستے پر چلتے رہے جس راستے پر چلنے کے لئے فادر فرانس نے مجھے کہا تھا۔ جب خانقاہ کافی پیچھے رہ گئی اور سامنے پہلے جنگل کے گھنے درختوں کا سلسلہ شروع ہوا تو میں نے سرسوتی سے کہا۔

''سرسوتی! اب تم واپس جاؤ۔ میری فکر نہ کرو۔ اب مجھے کچھ نہیں ہوگا۔ فادر کی دُعا کا اثر میرے ساتھ ہے۔ اگر کچھ ہونا ہوتا تو اب تک ہو گیا ہوتا۔''

سرسوتی مجھے اکیلا چھوڑ کر نہیں جانا چاہتی تھی، مگر وہ میرے ساتھ بھی نہیں جا سکتی تھی۔ فادر فرانس نے مجھے پراسرار خاتون کے پرانے بنگلے پر اکیلا جانے کو کہا تھا۔ لیکن اُسے فکر بھی تھی کہ کہیں راستے میں کسی جگہ شیطانی عورتیں مجھ پر حملہ نہ کر دیں۔ میرے پُرزور اصرار پر بادل نخواستہ واپس چلی گئی۔

جیسا کہ میں نے پہلے بیان کیا ہے، میں خود حیران تھا کہ فادر فرانس کے دُعائیہ کلمات پر میرے اندر اس قدر یقین کیسے پیدا ہو گیا تھا کہ اُن کی دعا کے بعد کم از کم اس جنگل میں اور جب تک کہ میں فادر کی خانقاہ میں واپس نہیں چلا جاتا اُن شیطان صفت عورتوں کا جادو مجھ پر نہیں چل سکے گا۔ فادر فرانس کی بتائی ہوئی نشانیوں کو دیکھتا ہوا آگے بڑھتا رہا اور ان نشانیوں کی راہ نمائی میں، میں نے ایک جنگل عبور کر لیا۔ یہ کوئی زیادہ بڑا جنگل نہیں تھا۔ ایک ڈیڑھ مربع میل کا ٹکڑا ہو گا۔ زیادہ گھنا بھی نہیں تھا۔ فادر نے کہا تھا کہ دو جنگل چھوڑ کر چھوٹے سرسبز پہاڑی ٹیلوں کا سلسلہ شروع ہو گا۔ مجھے

بن جاتا تھا۔ سورج آہستہ آہستہ مغرب کی جانب درختوں کے پیچھے چھپنے لگا تھا۔ موسم خوشگوار تھا۔

پہلا جنگل ختم ہوا تو میدان کا ایک کھلا ٹکڑا آ گیا جہاں کہیں کہیں جھاڑیاں اور گھاس اُگی ہوئی تھی اور کہیں تاڑ اور ناریل کا کوئی اکا دُکا درخت کھڑا تھا۔ میدان کے دوسرے کنارے جنگل کا دوسرا حصہ شروع ہو جاتا تھا جس کے درختوں کی قطار ایک دیوار کی طرح دُور سے نظر آ رہی تھی۔ ایک عجیب پُراسراری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ڈھلتے سورج کی روشنی گلابی ہونے لگی تھی۔ میں شام کا اندھیرا ہونے سے پہلے اپنی منزل پر پہنچ جانا چاہتا تھا۔ میں نے اپنی رفتار تیز کر دی۔ یہ دیکھ کر بھی میرے اندر ایک نئی طاقت پیدا ہوئی تھی کہ میں کانچی اور سندھیا جیسی خونخوار عورتوں کے طلسم سے تھوڑے عرصے کے لئے ہی سہی، مگر محفوظ ضرور ہو گیا تھا۔

جنگل کا دوسرا حصہ پہلے جنگل سے زیادہ گھنا تھا۔ اگر مجھے فادر فرانس نے بعض نشانیاں نہ بتائی ہوتیں تو میں اتنے گھنے جنگل میں بھٹک کر رہ جاتا اور شاید کبھی اُس کے دوسرے کنارے پر نہ پہنچ سکتا۔ راستے میں ایک جگہ چھوٹا سا چشمہ بہتا نظر آیا تو میں دم لینے کے لئے وہاں بیٹھ گیا۔ تھیلے میں سے تھوڑی سی نمکین روٹی نکال کر کھائی، چشمے کے پانی سے پیاس بجھائی، منہ دھویا اور چند لمحے آرام کرنے کے بعد دوبارہ اپنے سفر پر چل پڑا۔ اُس جنگل میں پھیلے ہوئے تنوں والے صدیوں پرانے درخت اپنی گھنی شاخیں پھیلائے چپ چاپ کھڑے تھے۔ اُن کی ساکت خاموشی میں جیسے صدیوں کے راز خوابیدہ تھے۔ ایک وہ زمانہ تھا جب انسان نے ایسے ہی کسی جنگل میں آنکھیں کھولی تھیں۔ یہی جنگل اس کا گھر تھے۔ آج ان جنگلوں میں آتے ہوئے انسان کو خوف محسوس ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ جنگل انسان کو واپس بلاتے ہیں۔ کیا انسان واپس ان جنگلوں میں جائے گا؟ انسان چاہے جنگل سے کتنی دُور چلا جائے مگر جنگل اس کا انتظار کرتے رہیں گے...... اور جنگل ایک ہزار، دو ہزار سال تک بھی انتظار کر سکتے ہیں۔

مجھے یہ خطرہ بھی لگا ہوا تھا کہ کسی طرف سے اچانک کوئی جنگلی درندہ نکل کر مجھ پر حملہ نہ کر دے۔ میں دائیں بائیں دیکھ کر چل رہا تھا۔ ابھی تک مجھے نہ تو کوئی جنگلی جانور دکھائی دیا تھا نہ کسی جنگلی درندے کی آواز ہی سنائی دی تھی۔ دوسرے جنگل کو عبور کرتے کرتے

شام ہوگئی۔ سورج غروب ہوگیا اور آسمان پر اُس کی گلابی روشنی باقی رہ گئی۔ یہ روشنی
آہستہ آہستہ گہری ہوتی جا رہی تھی۔ اب میرے سامنے چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کا ایک
سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ شفق کی گہری ہوتی گلابی روشنی میں ان پہاڑی ٹیلوں کی
ڈھلانیں چمک رہی تھیں۔ جیسے جیسے میں ان پہاڑیوں کی طرف بڑھ رہا تھا، اُن
ڈھلانوں کی گلابی چمک ماند پڑ رہی تھی۔

میں اپنی منزل پر پہنچ گیا تھا......

یہی وہ پہاڑیاں تھیں جن کے درمیان فادر فرانس کے کہنے کے مطابق ایک جھیل تھی
اور اُس جھیل کے ایک جانب پراسرار خاتون کا پرانا بنگلہ تھا۔ وہی پراسرار خاتون جس
کے پاس میری مصیبت کا علاج تھا۔ میں اُس عورت کے اُن چار شکاری کتوں سے پوری
طرح باخبر تھا جن کے بارے میں فادر نے بتایا تھا کہ وہ اُس خاتون کی حفاظت کرتے
ہیں اور کوئی اجنبی اس علاقے میں داخل ہو جائے تو اُس کی بو پاتے ہی اُس پر حملہ آور ہو
جاتے ہیں۔ میں ہر طرف سے چوکس ہو کر چل رہا تھا۔ اُن پہاڑی ٹیلوں کا سلسلہ بڑا
عجیب اور پراسرار تھا۔ ایک ٹیلہ ختم ہوتا تو سامنے دوسرے ٹیلے کی ڈھلان آ جاتی۔ اُس
ٹیلے کی ڈھلان کے ساتھ ساتھ چلتا آگے بڑھتا تو تیسرا ٹیلہ ایک دیوار کی طرح سامنے آ
جاتا۔ اسی طرح میں آگے بڑھتا گیا۔ ایک جگہ آ کر ایک سرسبز ڈھلان والے ٹیلے سے
نکل کر دوسری طرف آیا تو سامنے بڑا پرفضا منظر تھا۔ ایک جھیل تھی جس کی تین اطراف
میں اُونچے اُونچے درختوں کی قطاریں تھیں اور چوتھی جانب گھنے درختوں کے نیچے جھیل
کے کنارے ایک سیاہ چٹان سینہ تانے کھڑی تھی۔ فادر فرانس نے بتایا تھا کہ اسی چٹان
کے عقب میں پراسرار خاتون کا پرانا بنگلہ ہے۔ میں نے سیاہ چٹان کی طرف چلنا شروع
کر دیا۔

جب چٹان قریب آ گئی تو میں محتاط ہو گیا۔ پراسرار خاتون کے شکاری کتے میری بو پا
کر مجھ پر حملہ کر سکتے تھے۔ میں قدم قدم چلنے لگا اور چلتے چلتے کسی نہ کسی درخت کو نگاہ
میں رکھ لیتا تھا کہ اگر شکاری کتوں نے حملہ کر دیا تو میں اس درخت پر چڑھ جاؤں گا۔
میں چٹان سے سو گز کے فاصلے پر تھا کہ مجھے کتوں کے بھونکنے کی آواز سنائی دی۔ میں
جلدی سے ایک درخت پر چڑھ گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد چار سیاہ رنگ کے بڑے صحت مند

کتے جھاڑیوں میں سے نکلے اور جس درخت پر میں چڑھا ہوا تھا، اُس کے نیچے آ کر منہ
اُٹھا کر زور زور سے بھونکنے لگے۔ میں درخت کی شاخوں میں خاموش بیٹھا رہا۔ شکاری
کتے جب بھونک بھونک کر تھک گئے تو ایک ایک کر کے واپس چلے گئے۔

اُس وقت تک شام کا اندھیرا ہو چکا تھا۔ میں کافی دیر تک درخت کی شاخوں میں
چھپ کر بیٹھا رہا، جب مجھے یقین ہو گیا کہ اب کتے میرے جسم کی بو کے عادی ہو چکے
ہیں اور وہ میری بو پا کر بھونکیں گے نہیں تو میں درخت سے اُتر آیا۔ رات کے اندھیرے
نے درختوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ یہ سنبل اور صنوبر کے درخت تھے۔ سنبل کا
درخت بڑا گھنا ہوتا ہے اور اس کی جڑیں زمین سے نکل کر دُور تک چلی گئی ہوتی ہیں۔
صنوبر کے درخت بھی وہاں تھے۔ مگر صنوبر کے درخت اتنے گھنے نہیں تھے۔ اور اُن کے
تنے ستونوں کی طرح کے تھے۔ جھیل پر اندھیرے کی دُھند سی چھائی ہوئی تھی۔ میں سیاہ
چٹان کی سمت چل رہا تھا کیونکہ مجھے بتایا گیا تھا کہ پراسرار خاتون کا پرانا بنگلہ سیاہ چٹان
کے پیچھے واقع ہے۔ میرا اندازہ درست نکلا۔ شکاری کتوں کو میری بو پہنچ رہی تھی مگر وہ
خاموش تھے۔ اس لئے کہ اب یہ بو اُن کے لئے اجنبی نہیں تھی۔ اس کے باوجود میں
پھونک پھونک کر قدم اُٹھا رہا تھا۔ اندھیرے میں مجھے بہت کچھ نظر آ رہا تھا۔ جنگل کی
رات کا اندھیرا شہر کی راتوں کے اندھیرے سے بڑا مختلف ہوتا ہے۔ جنگل کے اُوپر کھلا
آسمان ہوتا ہے۔ آسمان پر ستارے بھی چمک رہے ہوتے ہیں جن کی وجہ سے اندھیرے
میں بھی پھیکی پھیکی سی روشنی کی دُھند موجود رہتی ہے۔

سیاہ چٹان کے پاس آ کر میں رُک گیا۔

سامنے نگاہیں اُٹھا کر دیکھا، صنوبر کے اُونچے درختوں کے تنوں کے درمیان کچھ
فاصلے پر ایک ڈھلواں چھت والا ایک منزلہ مکان نظر آیا۔ یہی پراسرار خاتون کا پرانا بنگلہ
تھا۔ بنگلہ اندھیرے کی چادر اوڑھے خاموش تھا۔ صرف دائیں جانب کسی کمرے کے
روشندان میں مدھم سی روشنی ہو رہی تھی۔ چٹان کی اوٹ میں کھڑے ہو کر میں دیر تک
پرانے بنگلے کی طرف دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے؟ پراسرار خاتون کے
بارے میں فادر فرانس نے بڑی عجیب و غریب اور غیر معمولی باتیں بتائی تھیں اور کہا تھا
کہ وہ انسانوں کی دنیا سے ناطہ توڑ چکی ہے اور انتہائی تنہائی کی زندگی بسر کر رہی ہے۔

لوگ اُسے کوئی بدرُوح سمجھ کر جنگل کے اُس حصے کی طرف جانے سے ڈرتے ہیں۔ وہ خود بھی انسانوں سے دُور بھاگتی ہے اور کسی سے ملنا گوارا نہیں کرتی۔ چار شکاری کتے اُس کی حفاظت کرتے ہیں اور کسی انسان یا جنگلی درندے کو بنگلے کی چار دیواری میں داخل نہیں ہونے دیتے۔

فادر کی یہ بات بھی میرے ذہن میں تھی کہ اس پراسرار عورت کے پاس کوئی غیبی طاقت ہے جس کی مدد سے وہ مجھے میری مصیبت سے ہمیشہ کے لئے نجات دلا سکتی ہے۔ مگر اُسے مدد کرنے پر آمادہ کرنا ناممکن نظر آتا ہے۔ کیونکہ وہ کسی انسان کی شکل تک دیکھنا گوارا نہیں کرتی۔ اس کے باوجود مجھے اُس پراسرار عورت سے ضرور ملنا تھا اور اُسے اپنی مدد کرنے پر راضی کرنا تھا اس لئے کہ یہ میری زندگی اور موت کا مسئلہ تھا۔ چنانچہ میں سوچ سمجھ کر کوئی قدم اُٹھانا چاہتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ جلدی میں اور بے سوچے سمجھے اُٹھایا ہوا قدم مجھے اُس عورت کی مدد سے ہمیشہ کے لئے محروم کر سکتا ہے۔

تھوڑی دیر بعد درختوں کے پیچھے سے چاند اُبھرنے لگا۔ وہ آخری تاریخوں کا چاند تھا جو پورا گول بھی نہیں ہوتا اور اس کی چاندنی بھی سرخی مائل زرد اور اُداس ہوتی ہے۔ جنگل میں درختوں کے درمیان زرد چاندنی کا غبار سا پھیل گیا۔ پرانے بنگلے پر گہرا سکوت طاری تھا۔ زرد چاندنی کی دُھند میں پرانا بنگلہ زیادہ پراسرار لگنے لگا تھا۔ میں آنکھیں سکیڑے بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ بنگلے کی چار دیواری کے اندر اس کا احاطہ ویران پڑا تھا۔ میرا وہاں اس سے زیادہ دیر رُکنا بیکار تھا۔ میں وہاں سے ہٹ کر پیچھے آ گیا اور جھیل کی طرف چل پڑا۔

مجھے بتایا گیا تھا کہ پراسرار خاتون آدھی رات کو جھیل کنارے آ کر چہل قدمی کیا کرتی ہے۔ جھیل کی سطح ساکن تھی اور زرد چاندنی میں دوسرے کنارے تک نظر آ رہی تھی۔ میں کسی ایسی جگہ کی تلاش میں تھا جہاں چھپ کر میں پراسرار خاتون کو جھیل کی طرف آتے دیکھ سکوں۔ ایک جگہ جھیل کے کنارے سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ صرف دو تین سیڑھیاں باہر تھیں، باقی پانی میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ میں وہیں ایک جگہ صنوبر کے درخت کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گیا۔ وہاں سے مجھے وہ چھوٹا سا تنگ راستہ دکھائی دے رہا تھا جو درختوں کے درمیان سے ہوتا پرانے بنگلے کی طرف جاتا تھا۔ قیاس یہی تھا کہ اگر

پراسرار خاتون آدھی رات کو چہل قدمی کے لئے نکلی تو وہ اسی راستے سے جھیل کی طرف آئے گی۔ جہاں میں چھپا ہوا تھا وہاں سے میں پراسرار خاتون کو اچھی طرح سے جھیل کی طرف آتے دیکھ سکتا تھا۔

رات کتنی گزر گئی تھی؟ مجھے اس کا اندازہ نہیں تھا۔ چاند پہلے درختوں کے پیچھے تھا، اب درختوں کے تھوڑا اُوپر آ گیا تھا۔ میں بڑے صبر کے ساتھ درخت کی آڑ لے کر ایک جھاڑی کے پیچھے بیٹھا رہا۔ رات گزرتی جا رہی تھی۔ شبنم گرنے لگی تھی اور رات کی فضا بھیگی بھیگی اور ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ کسی کسی وقت درختوں کے پتوں پر سے شبنم کے قطروں کے گرنے کی ترپ ترپ کی آواز آ جاتی تھی۔ اس کے سوا سارا جنگل اس طرح گہری خاموشی میں ڈوبا ہوا تھا جیسے وہاں کبھی کوئی جانور، کبھی کوئی انسان، کوئی پرندہ تک نہ بولا ہو۔ ایک دو بار مجھے اونگھ سی آ گئی لیکن میں نے جلدی سے اپنے سر کو جھٹکا اور ہوشیار ہو کر بیٹھ گیا۔

میری نظریں اُس تنگ سے راستے پر لگی ہوئی تھیں جو صنوبر کے درختوں کے درمیان سے ہو کر پراسرار خاتون کے پرانے بنگلے کی طرف جاتا تھا۔ اُداس زرد چاندنی میں یہ راستہ اس قدر ویران لگ رہا تھا جیسے اس پر کبھی کوئی آیا گیا نہ ہو۔ جنگل کی ساری فضا دُھندلی چاندنی میں کسی کے غم میں ڈوبی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ میں بڑے جنگل دیکھ چکا تھا مگر چاندنی رات میں ایسا خاموش اور سوگوار جنگل میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ زرد چاند سرخی مائل رنگت اختیار کر کے مغربی اُفق میں ڈھلتا جا رہا تھا اور پراسرار خاتون کے پرانے بنگلے کو جانے والا راستہ ویران پڑا تھا۔

پھر ایسا ہوا کہ دُور جنگل کے گنجان حصے سے ایک آواز سنائی دی...... یہ آواز کسی عورت کی تھی۔ میں نے چونک کر اُس طرف دیکھا جدھر سے یہ آواز آ رہی تھی۔ یہ آواز جھیل کے کنارے جس طرف صنوبر کے درختوں کے جھنڈ تھے اُس طرف سے آ رہی تھی۔ یہ آواز نہ تو کوئی چیخ تھی اور نہ کسی کو بلانے کی آواز تھی۔ آواز کا لہجہ ایسا تھا جیسے کوئی عورت بھجن یا کوئی گیت گا رہی ہے۔ آواز گانے سے مشابہہ تھی۔ میں اُس آواز کی طرف چل پڑا۔ صنوبر کے درختوں کے قریب پہنچا تو آواز رُک گئی۔ پھیکی چاندنی میں صنوبر کے درختوں کے پیچھے مجھے ایک انسانی سایہ نظر آیا جو جھیل کی طرف جا رہا تھا۔ غور

سے دیکھا تو یہ کوئی عورت تھی۔ مجھ سے اُس کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ وہ مجھے صاف نظر آ رہی تھی۔ اُس عورت کے سیاہ بال اُس کے شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ اُس کے ہاتھوں میں پھولوں کا گلدستہ تھا اور وہ بڑے وقار اور بڑے اعتماد سے قدم اُٹھاتی آہستہ آہستہ جھیل کی طرف چلی جا رہی تھی۔

وہ اس طرح چل رہی تھی جس طرح صبح کی سہانی ہوا چلتی ہے...... جس طرح زمین سے اُٹھتا ہوا دُھواں آسمان کی طرف جاتا ہے...... اُس کی چال میں کوئی کوشش، کوئی بناوٹ نہیں تھی۔ سب سے حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اُس کا جسم ہر قسم کے لباس سے بے نیاز تھا۔ میں پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے اُس کا تعاقب کرنے لگا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ یہ پرانے بنگلے والی وہی پراسرار خاتون ہے جس کے ہاتھ میں میری مصیبت کا علاج ہے۔ پراسرار خاتون جھیل کنارے ایک چھوٹے سے چبوترے پر بیٹھ گئی۔ وہ دوزانو ہو کر بیٹھی تھی۔ اُس نے پھولوں کا گلدستہ اپنے سامنے رکھ دیا تھا۔ ہاتھ جوڑ کر اُس نے جیسے کسی نظر نہ آنے والے دیوتا کو سر جھکا کر پرنام کیا اور گانے کے لہجے میں کوئی اشلوک پڑھنے شروع کر دیئے۔ بھجن گاتے گاتے وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد سر جھکا کر کسی دیوتا کو پرنام کرتی۔ میں صنوبر کے ایک درخت کے پیچھے چھپا یہ پراسرار اور حسین منظر حیرت کی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ پوجا ختم کرنے کے بعد پراسرار عورت نے گلدستے کے پھول جھیل میں اُچھال دیئے اور چبوترے سے اُٹھ کر جھیل میں اُتر گئی۔ شاید وہاں سیڑھیاں تھیں۔ جھیل کا پانی اُس کی کمر تک آیا ہوا تھا۔ اُس نے بازو کھول دیئے اور پانی میں بیٹھ کر نہانے لگی۔

میں اپنی جگہ سے بالکل نہ ہلا۔

یہ بڑی اچھی بات ہوئی تھی کہ اُس کے محافظ شکاری کتے اُس کے ساتھ نہیں آئے تھے ورنہ وہ ضرور مجھ پر حملہ آور ہوتے۔ کچھ دیر تک نہانے کے بعد وہ باوقار انداز میں قدم اُٹھاتی جھیل سے باہر آ گئی۔ اُس نے اپنے سیاہ لمبے بالوں کو نچوڑ کر اپنے شانوں پر بکھیرا اور بڑی شان سے واپس چل پڑی۔ جب وہ آگے نکل گئی تو میں بھی اُس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ کچھ دُور چلنے کے بعد سامنے پرانا بنگلہ آ گیا۔ وہ پرانے بنگلے کے احاطے میں داخل ہو کر میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ میں حیران تھا کہ میں بنگلے کے

بالکل پاس ہی موجود ہوں اور اُس پراسرار خاتون کے خونخوار کتے ابھی تک خاموش ہیں۔

رات کا منظر ایک بار پھر ساکت اور خاموش ہو گیا۔

میں شکاری کتوں کے حملے سے اپنے آپ کو محفوظ سمجھنے لگا تھا۔ چنانچہ قدرتی طور پر میرے دل میں اُمنگ پیدا ہوئی کہ پراسرار خاتون کو دیکھنا چاہیئے کہ وہ بنگلے کے اندر کیا کر رہی ہے؟ میں نے ایک طرف سے بنگلے کی دیوار پھاندی اور احاطے میں داخل ہو گیا اور جھکا جھکا اُس طرف چلنے لگا جہاں ایک روشندان میں سے مدھم روشنی آ رہی تھی۔ اندھیرے میں قریب جا کر دیکھا کہ روشندان کے نیچے شکستہ سی دیوار میں ایک کھڑکی بھی تھی جس کے پٹ بند تھے۔ میں نے کان کھڑکی کے ساتھ لگا دیئے۔ پراسرار خاتون اسی کمرے میں تھی۔ اندر سے اُس کی دھیمے سُروں میں گانے یا بھجن پڑھنے کی آواز آ رہی تھی۔ اندھیرے میں، میں نے کھڑکی کا جائزہ لیا، ایک جگہ کھڑکی میں جھری سی تھی جس میں روشنی ہو رہی تھی۔ میں نے اُس جھری کے ساتھ آنکھ لگا دی۔

اندر کا منظر جو میں نے دیکھا یہ تھا کہ وہی پراسرار عورت ایک مورتی کے آگے ہاتھ جوڑے بیٹھی بھجن گا رہی تھی اور آہستہ آہستہ دائیں بائیں ہل رہی تھی۔ وہ ابھی تک بے لباس تھی۔ میں نے ذرا غور سے دیکھا، جس مورتی کی وہ پوجا کر رہی تھی وہ کسی دیوی کی نہیں بلکہ مرد دیوتا کی مورتی تھی اور مورتی بھی سر سے پاؤں تک عریاں تھی۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ اُس عورت کا تعلق ہندو دھرم کی ایک شاخ جین مت سے ہے۔ مورتی جین مت کے بانی وردھمن کی تھی جو آج سے چھ سو برس قبل مسیح میں پیدا ہوا تھا۔ یہ دھرم دیوی دیوتا کی پوجا کے خلاف تھا۔ مگر جس طرح گوتم بدھ کے ساتھ ہوا، آگے چل کر جین مت کے بانی وردھمن جسے مہاویر کہا جاتا ہے، اُس کی مورتی کی پوجا شروع ہو گئی۔ جین مت کا بانی بارہ سال تک جنگلوں میں ننگا پھرتا رہا تھا۔ چنانچہ اس دھرم کے ماننے والوں کے دو فرقے بن گئے۔ ایک فرقے کا نام ڈگمبر ہے اور دوسرے فرقے کا نام سوتمبر ہے۔ سوتمبر فرقے کے ماننے والے ننگے نہیں رہتے۔ وہ سفید لباس پہنتے ہیں۔ مہاتما گاندھی کا تعلق جین مت کے اسی سوتمبر فرقے سے تھا۔ جبکہ ڈگمبر فرقے کے لوگ ننگے رہتے ہیں۔ اگرچہ اب اس فرقے کے لوگ بھی شہروں میں لباس پہننے لگے ہیں۔ لیکن

دیہات میں، میں نے اس فرقے کے لوگوں کو جن میں مرد اور عورتیں بھی شامل ہیں اپنی
آنکھوں سے گھروں میں ننگے چلتے پھرتے دیکھا ہے۔ احمد آباد اور گجرات میں آپ
اکثر ننگے سادھو گلیوں، بازاروں میں چلتے پھرتے نظر آئیں گے۔ بھارت کے مشہور مذہبی
میلے کمبھ کے میلے میں جو ننگے سادھو آتے ہیں وہ جین مت کے ڈگمبر فرقے کے
ہوتے ہیں۔ میں نے احمد آباد میں اپنی آنکھوں سے بالکل ننگے سادھوؤں کو دیکھا ہے کہ
اُنہوں نے سارے جسم پر راکھ ملی ہوئی ہوتی ہیں اور کسی نہ کسی کے گھر کے آگے جاکر
بیٹھ جاتے ہیں اور اُس گھر کی عورتیں سادھو کے آگے مٹھائی، دہی اور پوریاں لاکر رکھتی
ہیں اور اُن کے سامنے بیٹھ کر اُنہیں پنکھا جھلتی ہیں۔

ذرا غور کریں! کہ قائداعظم نے کتنی سچی بات کہی تھی کہ بھارت میں دو قومیں رہتی
ہیں۔ ایک مسلمان اور ایک ہندو اور دونوں کے مذہب اور رسم و رواج اور رہن سہن کے
انداز میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اور یہ دونوں ایک ساتھ نہیں رہ سکتیں۔ چنانچہ
مسلمانوں نے قائداعظم کی قیادت میں پاکستان کا نعرہ لگایا اور آج ہم اپنے بزرگوں کی
قربانیوں اور قائداعظم کی بے لوث قیادت کے صلے میں ایک آزاد اسلامی ملک میں
اپنے دین کے بتائے ہوئے راستے کے مطابق زندگی بسر کر رہے ہیں۔ خدانخواستہ اگر
پاکستان نہ بنتا اور بھارت آزاد ہو جاتا اور ہندوؤں کی اکثریت ہونے کی وجہ سے ان
کی حکومت ہوتی تو آپ کو لاہور اور کراچی میں بھی ننگے سادھو چلتے پھرتے نظر آتے۔

کیا آپ یہ گوارہ کر سکتے تھے؟ نہیں...... ہرگز نہیں۔ اس لئے خدا کا شکر ادا کیجئے کہ
قائداعظم نے آپ کو ایک الگ وطن حاصل کر کے دے دیا جہاں آپ دین اسلام کی
روشنی میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اس ملک پاکستان کی قدر و قیمت پہچانیں اور جان کی
بازی لگا کر بھی اس کی حفاظت کریں۔ اپنی داستان بیان کرتے کرتے میں نے مسلمان
قارئین سے یہ چند باتیں کرنی بڑی ضروری سمجھی تھیں۔ اب میں اپنے سنسنی خیز سفر کی
داستان کو آگے بیان کرتا ہوں۔

جیسا کہ میں نے بیان کیا تھا میں نے پراسرار عورت کو مہاویر کی ننگی مورتی کے سامنے
عریاں بیٹھ کر پوجا کرتے دیکھا تو فوراً سمجھ گیا کہ یہ عورت جینی ہے اور اس کا تعلق
جینیوں کے ڈگمبر فرقے سے ہے جو بے لباس ہو کر پوجا کرتے ہیں۔ میرا خیال ہے یہ جو

باتیں میں بیان کر رہا ہوں یہ پاکستان کی ہماری نئی نسل کو بالکل معلوم نہیں ہیں۔ وہ
بھارت کی ہندو قوم کو بھارتی فلموں کے ڈانس گانوں اور ڈش اور کیبل کے چینلوں کی
عینک لگا کر دیکھتے ہیں۔ چونکہ ہر کوئی ویزا لے کر جنوبی علاقے کے شہروں میں نہیں جا
سکتا اس لئے ہندوؤں کے ہزاروں فرقوں کے رونگٹے کھڑے کر دینے والے شرمناک
رسوم و رواج اُن کی آنکھوں سے پوشیدہ ہیں۔ اگر کسی ایک شہر کا ویزہ لے بھی لیں تو
صرف ایک شہر میں آپ کو ہندومت کے ہزاروں فرقوں کا حقیقی روپ دیکھنے کو نہیں مل
سکے گا۔ میں اپنی آوارہ گردیوں کا شکرگزار ہوں کہ میں نے قیام پاکستان سے پہلے پہلے
لاہور سے لے کر بھارت کی جنوبی تکون کے شہر کنیا کماری اور بمبئی سے لے کر بھارت
کے مشرقی ساحل بنگال اور پھر نیچے آندھرا پردیش، مغربی ساحل پر کرناٹک اور اس کے
نیچے کیرل تک سارے علاقے کو چھان مارا اور شہروں، جنگلوں اور دیہاتوں میں گھوم پھر
کر جنوبی ہند کے مندروں میں ایسے ایسے انسانیت سوز منظر اور شرمناک رسوم و رواج
دیکھ لئے کہ ہندو قوم کا حقیقی رُوپ میرے سامنے آگیا۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ پہلے بھی
تو ہندو اور مسلمان ایک ہی ملک میں رہتے تھے۔ اگر پہلے رہتے تھے تو اب کیوں نہیں رہ
سکتے؟ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ آزادی ملنے سے پہلے انگریزوں کی حکومت تھی۔
انگریزوں کا قانون چلتا تھا جس میں اقلیت اور اکثریت کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ ہر قوم کو
ایک جیسے حقوق حاصل تھے۔ کسی ہندو یا جین مت کے ننگے سادھو کی جرات نہیں تھی کہ وہ
بازاروں، گلیوں میں الف ننگا پھرے۔ انگریز اُسے پکڑ کر اندر بند کر دیتا تھا۔ قائداعظم
جانتے تھے کہ آزادی ملنے کے بعد انگریز چلا جائے گا اور پورے ہندوستان پر ہندوؤں
کی حکومت ہوگی اور چونکہ ہندوؤں کی اکثریت ہے اس لئے وہ اپنی مرضی کے قانون
بنائے گا۔ انگریز اپنی فوج میں مسلمانوں کو زیادہ بھرتی کرتا تھا۔ کیونکہ اُسے معلوم تھا کہ
مسلمان لڑنے والی بہادر قوم ہے۔ وہ ہندوؤں کو بہت کم بھرتی کرتا تھا۔ آپ کو شاید
معلوم نہیں کہ قیام پاکستان سے پہلے انگریزی فوج میں یعنی انگریزوں کی بنائی ہوئی
ہندوستانی فوج میں جنوبی ہند کی جو رجمنٹیں ہوتی تھیں اُن کے ننانوے فیصد فوجی یا تو
لانگری (باورچی) یا سپاہی، کلرک اور یا لانڈری کا کام کرنے والے ہوتے تھے۔ وسطی
ہند کے ہندو فوجیوں کی اکثریت انگریزوں کی فوج میں ملٹری اکاؤنٹس یا سگنلز کی ڈیوٹی

کرتی تھی۔ میدانِ جنگ میں لڑنے والی فوجی رجمنٹیں نوے فیصد پنجابیوں یا پٹھانوں پر مشتمل ہوتی تھیں۔ ان کے بعد نیپال کے گورکھوں کا نمبر آتا تھا۔ لیکن اگر پاکستان نہ بنتا تو ظاہر ہے حکمران ہندو اپنی فوج میں ہندوؤں کو زیادہ سے زیادہ بھرتی کرتا، سکھوں کو بھرتی کرتا، بڑے بڑے کلیدی فوجی عہدوں پر ہندو جرنیل ہی ہوتے۔ صرف نام رکھنے کو کہیں کہیں مسلمان فوجی افسر نظر آتا۔ جس طرح آج بھارت کی فوج میں ہم دیکھ رہے ہیں۔ فوجی طاقت بھی ہندو کے ہاتھ میں ہوتی ہے اور سول عہدوں پر بھی ہندو، سکھ ہی نظر آتے ہیں۔ جب فوج ہندو کی ہوتی، سول انتظامیہ ہندو کی ہوتی تو پھر ننگے سادھوؤں کو مسلمانوں کے محلوں میں آزادی سے چلنے پھرنے سے کون روک سکتا تھا؟ ظاہر ہے مسلمان غیرت میں آکر ایسے سادھو کو ختم کر دیتے اور پھر فسادات شروع ہو جاتے اور ایک بار پھر مسلمان مطالبہ کرتے کہ ہمیں ایک علیحدہ اسلامی ملک چاہئے۔ لیکن پھر شاید وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکتے۔ پھر وہی ہوتا جو آج مقبوضہ کشمیر میں ہو رہا ہے۔ انگریز نے تو پاکستان دے دیا تھا، ہندو کبھی نہ دیتا۔ پس ہمیں اپنے وطن پاکستان کی قدر و قیمت کو پہچاننا چاہئے ہمیں اور ہماری نئی نسل کو یہ کبھی نہیں بھولنا چاہئے کہ ہم نے طارق بن زیاد کی طرح واپس جانے والی سب کشتیاں جلا دی ہیں۔ ہمارے لئے جو کچھ ہے پاکستان ہی ہے۔ پاکستان ہی ہماری عزت آبرو اور ہمارے بچوں کا مستقبل ہے۔ اگر یہ ہے تو ہم بھی ہیں۔ اگر خدانخواستہ یہ نہیں تو پھر ہم بھی نہیں ہیں۔

معذرت چاہتا ہوں اپنے سنسنی خیز سفر کے واقعات بیان کرتے کرتے یہ کچھ باتیں میرے دل میں پیدا ہو گئی تھیں جو میں پاکستان کی نئی نسل تک پہنچانا چاہتا تھا۔ اب میں داستان کا سلسلہ وہیں سے دوبارہ شروع کرتا ہوں جہاں میں نے عارضی طور پر منقطع کیا تھا۔ بات یہ ہے کہ ہندو سکھوں کی اسلام دشمن بربریت کے عینی گواہوں میں سے ہم لوگ ہی ہیں جو ابھی زندہ ہیں۔ ہمارے بعد پاکستان کی نئی نسلوں کو یہ بتانے والا کوئی عینی گواہ نہیں ہو گا کہ ہم نے قیام پاکستان کے وقت ہندوؤں سکھوں کو مسلمانوں کا قتل عام کرتے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ ہم نے مسلمان عورتوں کی بے آبرو لاشوں کے ٹکڑے کھیتوں، گلیوں، بازاروں میں بکھرے ہوئے دیکھے ہیں۔ ہم نے مسلمان کے شیر خوار بچوں کی لاشوں کو درختوں پر ٹنگے ہوئے دیکھا ہے اور ہم نے مسلمان قوم کو پاکستان

کی قیمت ادا کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ ایسی قیمت جو انسانی تاریخ میں شاید ہی کسی قوم نے اپنی آزادی اور خود مختاری کے لئے ادا کی ہو۔

اب میں اپنے سفر کی کہانی آگے بیان کرتا ہوں۔

اپنی سچی داستان کا سلسلہ میں نے وہاں پر توڑا تھا جہاں میں بھارت کے ایک گمنام جنگل کے پہاڑی علاقے میں جھیل کے پاس پراسرار خاتون کو اپنے پرانے بنگلے میں جین مت کے بانی مہاویر کی ننگی مورتی کے آگے بے لباس حالت میں ہاتھ جوڑ کر بیٹھی پوجا کرتی دیکھ رہا تھا۔ میں یہ منظر کمرے کے باہر اُس کی بند کھڑکی کی ایک درز میں سے دیکھ رہا تھا۔ یہ وہ عورت تھی جس کے ہاتھ میں میرے ناقابل علاج اور خطرناک روگ کا علاج تھا۔ اور جس کے بارے میں مجھے بتایا گیا تھا کہ وہ مردم بیزار عورت ہے۔ اگر میں اچانک اُس کی مرضی اور اُس کی اجازت کے بغیر اُس کے سامنے چلا گیا تو وہ مجھے اپنی پرائیویٹ زندگی میں دخل اندازی پر کبھی معاف نہیں کرے گی۔ اور پھر میں اپنی مصیبت سے شاید کبھی نجات حاصل نہیں کر سکوں گا اور سندھیا اور کانچی مجھے اپنے دیوی دیوتاؤں کے آگے ذبح کرنے کے لئے اُٹھا کر لے جائیں گی۔

آپ بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ عورت میرے لئے کتنی اہمیت اختیار کر چکی تھی اور اُس کی خوشنودی اور اُس کی رضا مندی حاصل کرنا میرے لئے زندگی اور موت کا مسئلہ بن چکا تھا۔ جب میں اُس پراسرار عورت کو مہاویر کی مورتی کے آگے بغیر لباس کے بیٹھی پوجا کرتے دیکھ رہا تھا تو کمرے میں جلتے ہوئے گلوب والے پرانی ٹائپ کے تیل کے لیمپ کی روشنی اُس کے جسم اور چہرے پر پڑ رہی تھی۔ لیمپ کی نرم روشنی میں صاف معلوم ہو رہا تھا کہ یہ عورت نہیں بلکہ ایک جوان لڑکی ہے جس کی عمر بیس بائیس برس سے زیادہ نہیں ہے۔ اُس کے سیاہ بال اُس کی کمر پر کھلے ہوئے تھے۔ بالوں میں ایک طرف سفید پھول لگا تھا۔ اُس کا جسم اس قدر سڈول اور خوبصورت تھا کہ لگتا تھا کہ قدیم زمانے کے کسی مشہور سنگتراش نے اُسے سنگ مرمر سے تراشا ہے۔ اُس کا رنگ بھی زردی مائل گورا تھا۔ وہ جس رُخ پر بیٹھی تھی، مجھے اُس کے چہرے کا آدھے سے زیادہ حصہ نظر آ رہا تھا۔ لیمپ کی روشنی میں اُس کی کنول کے پھولوں جیسی آنکھیں گھنی سیاہ پلکوں کی چھاؤں میں بڑے سکون سے بند تھیں۔ خوبصورت خدوخال والے چہرے پر ایک معصوم سکون

طاری تھا۔

مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ اس جنگل کی پہلی عورت ہے جو کسی پہلے ارضی دیوتا کی
پوجا کر رہی ہے۔ اُس کے حسین وجود کا عکس جیسے میرے دل میں اُترنے لگا تھا۔ میرا دل
نہیں چاہتا تھا کہ میں نظریں ہٹا کر کسی دوسری طرف دیکھوں۔ اُس لڑکی کا دیدار
میرے اندر زندگی اور زندگی سے محبت کرنے کی ایک نئی طاقت کو جنم دے رہا تھا۔ آپ
اسے محبت یا جو جی میں آئے کہہ لیجئے۔ لیکن میں حقیقت بیان کر رہا ہوں۔ اُس وقت
میرے دل کی حالت ایسی تھی کہ میں چاہتا تھا کہ یہ لڑکی اسی طرح آنکھیں بند کئے بیٹھی
رہے اور میں اسی طرح کھڑکی کے ساتھ لگا اُسے دیکھتا رہوں۔ اس لمحے یقین کریں میں
اُس لڑکی کے معصوم حسن میں اس قدر کھو گیا تھا کہ مجھے اپنی مصیبت بھی یاد نہیں رہی تھی
جس کے علاج کے واسطے فادر فرانسس نے مجھے اُس لڑکی کے پاس بھیجا تھا۔ اس میں کوئی
شک نہیں کہ محبت کا حسین ترین پھول جوانی کے موسم میں ہی کھلتا ہے۔ جوانی کا خون
محبت کے پھول کی آبیاری کرتا ہے، اسے شگفتگی اور نئی سے نئی خوشبوئیں عطا کرتا ہے۔
میرے دیکھتے دیکھتے پراسرار لڑکی نے (اب میں اُسے پراسرار خاتون نہیں کہوں گا)
اپنے آگے ایک لکڑی کی چوکی پر پڑے پھولوں میں سے ایک پھول اُٹھا کر اُسے مہادیو
کی مورتی کے چرنوں میں رکھ دیا، پھر اُٹھ کر ہاتھ جوڑ کر تین بار مورتی کو پرنام کیا اور
دوسرے کمرے کے دروازے کی طرف چل پڑی۔

میں نے کسی عورت کے جسم کو اتنا حسین، اتنا معصوم اور اتنا روشن روشن نہیں دیکھا
تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اُس کے جسم کے اندر بجلی کے بلب جل رہے ہیں۔ اُس کے
جسم میں سے شعاعیں نکلتی معلوم ہو رہی تھیں۔ اُس لڑکی کی روشن شخصیت نے میرے
ذہن کو بھی روشن کر دیا تھا۔ وہ میری میٹرک کے زمانے کی عمر تھی۔ انگریزی ادب سے
مجھے اُس عمر میں ہی لگاؤ ہو گیا تھا اور اس شوق کو پورا کرنے کے لئے میں نے اپنی ہمت
محنت اور کوشش سے میٹرک کے زمانے میں ہی انگریزی زبان کافی سیکھ لی تھی اور
ڈکشنری سامنے رکھ کر ہی سہی لیکن انگریزی ناول اور انگریزی شاعروں کی نظمیں پڑھ لیتا
تھا اور کچھ کچھ سمجھ بھی لیتا تھا۔ اس لڑکی نے میرے ذہن میں انگلستان کے ادیب گا
ورڈی کے ایک ناول کی ہیروئن کی یاد تازہ کر دی تھی جس کا محبوب اُسے چھوڑ کر چلا گیا

اور جو اُس کی یاد میں چاندنی راتوں میں سیب کے درخت کے نیچے بیٹھ کر اُس کی راہ
دیکھا کرتی تھی۔ ہوا چلتی تو سیب کے پھولوں کی پنکھڑیاں اپنے پھولوں سے جدا ہو کر
اُس پر گرتی رہتی تھیں۔

پراسرار لڑکی کے جانے کے بعد مورتی والا کمرہ مجھے یوں خالی خالی لگنے لگا جیسے بہار
کے گزر جانے کے بعد باغ پھولوں سے خالی ہو جاتا ہے اور درختوں کے پتے زرد ہو کر
جھڑنے لگتے ہیں۔

اچانک رات کے سناٹے میں کتوں کے بھونکنے کی آواز گونج اُٹھی...... یہ آواز پرانے
بنگلے کی دوسری طرف سے آ رہی تھی۔ میں جتنی تیز چل سکتا تھا چلتا ہوا سیاہ چٹان کے
پاس آ گیا۔ یہ چٹان عمودی تھی۔ میں کسی نہ کسی طرح اُس کے اُوپر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ کتوں
کے بھونکنے کی آواز دُور ہی سے آ رہی تھی۔ وہ میرے پیچھے نہیں آئے تھے۔ پھر بھی میں
اُس وقت تک چٹان کے اُوپر بیٹھا رہا جب تک کہ اُن کی آواز بند نہیں ہو گئی۔ اس کے
بعد میں چٹان سے اُتر آیا۔ رات مجھے اسی جنگل میں کسی جگہ گزارنی تھی۔ میں جھیل کے
کنارے تھوڑی دُور تک چلا گیا۔ وہاں ایک جگہ چھوٹے سے ٹیلے کے اندر شگاف سا
دکھائی دیا۔ چاند غروب ہو چکا تھا۔ زرد چاندنی غائب ہو گئی تھی۔ جنگل میں ایک بار پھر
اندھیرا ہو گیا تھا۔

شگاف کے پاس آ کر میں نے غور سے اس کو دیکھا۔ اس میں اتنی جگہ ضرور تھی کہ میں
لیٹ سکتا تھا۔ جنگلوں میں رات گزارنا میرے لئے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ میں کئی راتیں
جنگلوں میں بسر کر چکا تھا۔ جنگل میں رات کے وقت صرف مچھر اور چیونٹیاں تنگ کرتی
ہیں یا پھر کسی شیر، چیتے کے حملے کا خطرہ ہوتا ہے۔ اس کا مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ جنگلی
درندوں کا جنگل کے اس حصے کی طرف رُخ نہیں ہے۔ مچھر ضرور تھے جن کا علاج میں
نے یہ کیا کہ خشک جھاڑیاں اور پتے وغیرہ اکٹھے کر کے اُن کو ماچس جلا کر آگ لگائی۔
جب ذرا شعلے بلند ہوئے تو اُنہیں بجھا دیا تاکہ صرف دُھواں نکلتا رہے۔ دُھواں ہو تو
مچھر اس طرف نہیں آتے۔ اگرچہ مجھے نیند بالکل نہیں آ رہی تھی مگر کچھ دیر آرام کرنا بھی
ضروری تھا۔ رات کے وقت جنگل میں کب تک گھوم سکتا تھا؟ میں ٹیلے کے شگاف کے
اندر لیٹ گیا۔ پتہ نہیں مجھے کب نیند آ گئی اور میں سو گیا۔

آنکھ اُس وقت کھلی جب صبح ہو چکی تھی۔ ٹیلوں کی ڈھلانوں پر سنہری دھوپ نکل
تھی۔ میں اُٹھ کر جھیل پر گیا۔ منہ ہاتھ دھویا، تھیلے میں سے نمکین روٹی نکال کر کھائی، جھیل
کا پانی پیا۔ میرے ذہن پر پرانے بنگلے والی پراسرار لڑکی کا خیال چھایا ہوا تھا۔ دل یہ
کہتا تھا کہ پرانے بنگلے پر چلو! شاید اُس کا دیدار ہو جائے۔ میں پرانے بنگلے کی طرف
چل پڑا۔ میں بہت محتاط ہو کر جا رہا تھا۔ مجھے احساس تھا کہ اگر اُس لڑکی نے مجھے دیکھ
تو وہ دوبارہ کبھی میرے سامنے نہیں آئے گی۔ فادر فرانسس نے کہا تھا کہ پراسرار خاتون
دن کے وقت پرانے بنگلے سے باہر نہیں نکلتی لیکن وہ کسی کی قیدی نہیں ہے۔ اگر اُس کا دل
چاہے تو وہ باہر آ بھی سکتی ہے۔ میں درختوں کی آڑ لے کر چل رہا تھا۔ سیاہ چٹان سے ذرا
آگے گیا تو صنوبر کے درختوں کے پیچھے پرانے بنگلے کی عمارت کچھ فاصلے پر میرے
سامنے تھی۔ عجیب بات تھی کہ وہ پرانی عمارت دن کے وقت بھی بڑی پراسرار لگ رہی
تھی۔ بنگلے کا مختصر سا احاطہ خالی اور ویران پڑا تھا جیسے صدیوں سے وہاں کوئی آباد نہ
ڈھلواں چھت پر جنگلی بیلیں چڑھی ہوئی تھیں۔ بڑی پراسرار خاموشی اور ویرانی سی چھائی
ہوئی تھی۔ میں اور آگے نہیں جانا چاہتا تھا، اس ڈر کی وجہ سے کہ کہیں پراسرار لڑکی کی نظر
مجھ پر نہ پڑ جائے۔

درختوں کے پیچھے نصف دائرے میں ایک چکر لگا کر میں پرانے بنگلے کی دوسری
جانب آ گیا۔ اس طرف سے بھی بنگلے کو دُور سے دیکھا۔ اس جانب بھی پرانے بنگلے پر
سناٹا اور ویرانی سی طاری تھی۔ ہوا چلتی تو صنوبر کے درختوں پر سے سوکھے پتے گرنے
لگتے۔ میرا اُس پراسرار لڑکی سے ملنا بے حد ضروری بھی تھا۔ اس وقت سندھیا اور کالی
کی لائی ہوئی مصیبت بلکہ آفت سے یہی لڑکی بقول فادر فرانسس کے نجات دلا سکتی تھی۔
لیکن میں براہِ راست اُس سے ملاقات کا خطرہ بھی مول نہیں لے سکتا تھا۔ دل اُسے
ایک نظر دیکھنے کو بے تاب بھی ہو رہا تھا۔ میرے دل میں اُس لڑکی کے لئے محبت بھی پیدا
ہو گئی تھی اور مجھے اپنی مصیبت سے نجات حاصل کرنے کے لئے اُس کی ضرورت بھی
تھی۔ صورت حال ایسی بن گئی تھی کہ میرا اُس لڑکی کے پاس جانا ضروری ہو گیا تھا۔ لیکن
سب سے بڑی پریشانی یہ تھی کہ میں یونہی منہ اُٹھا کر اُس کے پاس نہیں جا سکتا تھا۔ اس
طرح اُس کے سامنے چلے جانے سے بقول فادر فرانسس سارے کئے کرائے پر پانی پھر

تھا۔ اُس سے ملاقات کے لئے کسی سبب کا موجود ہونا لازمی تھا۔ سبب بھی ایسا کہ جو
قدرتی ہو اور یہ بات میرے اختیار میں نہیں تھی۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ میں کیسی عجیب و
غریب اُلجھن میں مبتلا ہو گیا تھا۔

سنبل کے گھنے درخت کے بہت بڑے تنے کی اوٹ میں بیٹھا میں دیر تک پرانے
بنگلے کی طرف دیکھتا رہا۔ اُس وقت میرے دل میں صرف یہی ایک خواہش تھی کہ شاید کسی
طرح سے وہ حسن و جمال کی دیوی کمرے سے باہر نکلے اور اُس کا دیدار ہو جائے۔ میں
اُس کے قریب تو نہیں جا سکتا تھا مگر دُور سے اُس کے درشن کر سکتا تھا۔ مگر وہ باہر نہ آئی۔
اس سے زیادہ دیر بیٹھنا مناسب نہیں تھا۔ مجھے اُس کے شکاری کتوں کا بھی خطرہ تھا۔ اُن
کا کچھ پتہ نہیں تھا، وہ کسی بھی وقت بھونکتے ہوئے میری طرف آ سکتے تھے۔

میں وہاں سے واپس آ گیا۔

واپس آ کر ٹیلے کے شگاف میں بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے؟ اس
طرح میں کب تک جنگل کے ان ٹیلوں میں گھومتا پھرتا رہوں گا؟ میں نے تھیلا کھول کر
دیکھا، اُس میں صرف دو نمکین روٹیاں رہ گئی تھیں۔ اُن کے ختم ہو جانے کے بعد وہاں
کھانے کو مجھے صرف گھاس اور درختوں کے پتے ہی مل سکتے تھے۔ پھل دار درخت کہیں
بھی مجھے دکھائی نہیں دیا تھا۔ انہی سوچوں میں گم دوپہر ہو گئی۔ میں نے تھوڑی سی خشک
روٹی کھائی، جھیل پر جا کر پانی پیا اور جھیل کے دوسرے کنارے کی طرف نکل گیا۔ اُس
طرف اُس پراسرار لڑکی کے نکل آنے کا امکان نہیں تھا۔ جنگل کے اس حصے میں ناریل
کے درختوں کا ایک جھنڈ تھا۔ میں اُس کے پاس آ گیا۔ درختوں پر کچے پکے ناریل لگے
تھے۔ کچھ ناریل زمین پر بھی گرے تھے۔ ایک ناریل ابھی سبز تھا، زرد نہیں ہوا تھا۔ میں
نے اُسے اُٹھا لیا۔ ایک پتھر مار کر اُسے توڑا تو اُس میں سے پانی اُچھل کر باہر نکلا۔ میں
نے تھوڑا سا چکھا، ناریل کا پانی تازہ اور میٹھا تھا۔ میں نے سارا پانی پی لیا۔

تھوڑی دیر وہیں ناریل کے درختوں کے نیچے بیٹھا سوچتا رہا کہ اُس لڑکی کے قریب
جانے کا کیا سبب پیدا کیا جا سکتا ہے؟ جب سوچتے سوچتے تھک گیا تو اُٹھ کر جھیل کے
کنارے کنارے دُور تک چلتا گیا۔ اسی عالم میں دھوپ ڈھلنا شروع ہو گئی۔ ایک جگہ
بڑے سے پتھر کے قریب سے گزر رہا تھا کہ اچانک پتھر کے پیچھے سے ایک سانپ نکل

آیا...... نسواری رنگ کا سانپ تھا۔ اُس نے میری طرف دیکھتے ہی اپنا پھن پھیلا دیا اور
ہلکی ہلکی پھنکاریں مارنے لگا۔ میں خوف زدہ ہو کر وہیں کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ پھر خیال آ
گیا کہ سنیاسی کی بیٹی رامی نے میرے جسم پر خاص قسم کی جڑی بوٹیوں کی مالش کی تھی اور
اُس کے سنیاسی باپ نے کہا تھا کہ اب تم پر زہریلے سے زہریلے سانپ کے زہر کا کوئی
اثر نہیں ہوگا۔ اس کے باوجود خوف سے میرا حلق خشک ہو گیا تھا۔ کیا معلوم اب تک اس
مالش کا اثر زائل ہو چکا ہو؟ میں نے سن رکھا تھا کہ اگر سانپ اچانک سامنے آ جائے اور
دیکھ بھی لے تو آدمی کو بت بن کر کھڑے ہو جانا چاہئے، ذرا سی بھی حرکت نہیں کرنی
چاہئے، سانپ اپنے آپ وہاں سے چلا جاتا ہے۔ میں نے بھی ایسا ہی کیا اور بت بن
کر کھڑا ہو گیا۔ میں سانپ کو اور سانپ مجھے دیکھ رہا تھا۔ سانپ کی آنکھوں میں اس قسم
کی مقناطیسی کشش تھی کہ مجھے اپنا سر بھاری ہوتا محسوس ہونے لگا تھا، پھر بھی میں نے کسی
قسم کی حرکت نہ کی۔

سانپ بھی اپنی جگہ پر بت سا بنا پھن کھولے اپنی سرخ سرخ آنکھوں سے میری
طرف مسلسل تکتا رہا۔ پھر نہ جانے اُس کو کیا خیال آیا، اُس نے آہستہ سے پھن سکیڑا،
گردن نیچے کی اور پتھر کے پیچھے غائب ہو گیا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور وہیں سے
تیز قدموں سے چلتا واپس اپنے ٹیلے والے شگاف میں آ کر بیٹھ گیا۔ سورج غروب ہو
گیا۔ صنوبر اور سنبل کے درختوں پر چڑیوں کی چہکاریں گونجنے لگیں۔ شام گہری ہونے
تک چڑیوں کی آوازیں شور مچاتی رہیں۔ جب شام کا اندھیرا رات کے پہلے اندھیرے
میں ملنے لگا تو چڑیاں اور دوسرے پرندوں کی آوازیں خاموش ہو گئیں۔ جنگل پر ایک بار
پھر سناٹا چھا گیا۔ میں نے شگاف کے باہر سوکھی شاخیں اور پتھر اکٹھے کر کے آگ لگا
دی۔ جب شعلے بلند ہوئے تو اُنہیں بجھا دیا۔ آگ کی ڈھیری میں سے اب صرف
دھواں نکل رہا تھا جس کی وجہ سے میں جنگل کے مچھروں سے بہت حد تک محفوظ ہو گیا
تھا۔

تھیلی میں سے تھوڑی سی روٹی نکال کر کھائی اور ایک بار پھر اپنی سوچوں میں گم ہو
گیا۔ جنگل پر رات کے آتے ہی گہرا سکوت طاری ہو گیا تھا۔ میں جنگلوں کے اس سکوت
اور جادو کر دینے والی خاموشی کا عادی تھا۔ جو لوگ عادی نہیں ہوتے اور پہلی بار جنہیں

جنگل میں رات آ جاتی ہے تو ان قدیم گھنے جنگلوں کی پراسرار آسیبی خاموشی اُنہیں خوف
زدہ کر دیتی ہے۔ رات کا پہلا پہر گزر چکا تھا۔ دوسرا پہر شروع ہو گیا تھا۔ چاند ابھی نہیں
نکلا تھا۔ اُسے تھوڑی دیر کے بعد نکلنا تھا۔ چاروں طرف تاریکی تھی۔ سکوت تھا...... کبھی
...کسی درخت پر سے سنبل کا کوئی بڑا پھول گرتا تھا تو اُس کی آواز تھوڑی دیر کے لئے
خاموشی کو توڑ دیتی تھی۔ سنبل کا پھول چڑی چھکا کھیلنے والے شٹل کاک کی طرح ہوتا ہے۔
لاہور کے باغ جناح میں سنبل کے بڑے بڑے گھنے درخت ہیں۔ اُن کے پھول آپ
نے ضرور دیکھے ہوں گے۔ مجھے نیند آنے لگی۔ ابھی میں غنودگی کے عالم میں ہی تھا کہ
مجھے ایک آواز سنائی دی...... یہ اُسی پراسرار لڑکی کی کل رات والی آواز تھی۔ میں نے
آنکھیں کھول دیں اور اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

لڑکی کی آواز جھیل کی طرف سے آ رہی تھی۔ آواز کبھی لمبی اور مسلسل ہو جاتی اور کبھی
ایک دم رُک جاتی۔ وہ جنگل کے سناٹے میں رات کے وقت اشنان کرنے سے پہلے کوئی
بھجن وغیرہ گا رہی تھی۔ میرا دل بے اختیار اُس کی طرف کھنچنے لگا۔ میں اُٹھ کر جھیل کی
طرف چل پڑا۔ میں نے وہ جگہ دیکھی ہوئی تھی جہاں وہ نہاتی تھی۔ پراسرار لڑکی کے بھجن
گانے کی آواز قریب ہوتی جا رہی تھی۔ جب میں سیاہ چٹان کی دوسری طرف پہنچا تو بھجن
گانے کی آواز رُک گئی۔ جس وقت میں جھیل کے نزدیک اُس مقام پر پہنچا جہاں کل
رات لڑکی نہا رہی تھی تو مغربی اُفق سے سرخی مائل زرد چاند طلوع ہو گیا اور جنگل کی تاریکی
کافی حد تک چھٹ گئی۔ میں نے ایک جگہ چھپ کر دیکھا کہ وہی پراسرار لڑکی جھیل کے
کنارے والی سیڑھیوں میں بیٹھی تھی۔ پانی اُس کی کمر تک آیا ہوا تھا۔ وہ دونوں ہاتھ
جوڑے بالکل بے حس و حرکت بیٹھی تھی۔ شاید اپنے فرقے کے مطابق پوجا وغیرہ کر رہی
تھی۔ آج وہ بے لباس نہیں تھی۔ اُس کے جسم پر گلابی رنگ کی ساڑھی مجھے نظر آ رہی تھی۔
میرا اُس سے زیادہ دُور نہیں تھا۔ یہی کوئی چالیس گز کا فاصلہ ہوگا۔

چاند آسمان پر کچھ اور اُوپر آ گیا تھا اور اُس کی چاندنی پہلے سے ذرا زیادہ ہو گئی تھی۔
میری نظریں پراسرار لڑکی پر مرکوز تھیں اور میں سوچ رہا تھا کہ اُس لڑکی کو اپنی مدد پر
رضامند کرنے کے لئے میں کیا کر سکتا ہوں؟ مجھے کیا کرنا چاہئے؟ میں اس بات سے
بالکل بے خبر تھا کہ قدرت میرے لئے خود ایک سبب پیدا کرنے والی ہے۔ لڑکی پوجا ختم

کر کے اُٹھی تو جھیل کا پانی اُس کی کمر سے اور نیچے ہو گیا۔ وہ آہستہ آہستہ سیڑھیاں اُترنے لگی۔ جب پانی اُس کے سینے تک پہنچ گیا تو اُس نے دونوں بازو پانی کی سطح پر پھیلا دیئے اور اپنے چہرے پر پانی کے ہلکے ہلکے چھینٹے مارنے لگی۔ میں خاموش نگاہوں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ پھر معلوم نہیں کیا ہوا کہ وہ زور زور سے پانی میں ہاتھ مارنے لگی اور اُس کے حلق سے ایک چیخ سی نکل گئی اور اُس کا سر ایک بار پانی میں ڈوب کر اُبھرا تو گھبرائی ہوئی آواز میں اُس نے چلا کر کچھ کہا۔

ایک دم سے میرے اندر جیسے بجلی سی چمکی اور میں جھیل کی طرف دوڑا۔ وہ جھیل میں ڈوب رہی تھی۔ میں نے جھیل میں چھلانگ لگا دی اور دیوانہ وار تیرتے ہوئے لڑکی کے قریب آ گیا۔ اُس وقت تک وہ گھبراہٹ میں ہاتھ پاؤں مارنے کی وجہ سے کنارے سے بیس پچیس گز دور جا چکی تھی اور اُس کا سر پانی میں ڈوب ڈوب کر اُبھر رہا تھا۔ میں بجلی جیسی تیزی کے ساتھ ڈبکی لگا کر اُس کے نیچے چلا گیا اور پھر جب اُبھرا تو ایک بازو سے میں نے لڑکی کے چہرے کو پانی سے باہر نکال رکھا تھا اور دوسرے بازو سے تیرتے ہوئے کنارے کی طرف آ رہا تھا۔ لڑکی کا رنگ سفید پڑ گیا تھا اور اُس کی آنکھیں بند تھیں۔ کنارے پر لا کر میں نے اُسے زمین پر لٹا دیا۔ لڑکی نڈھال تھی۔ سانس تیز تیز چل رہا تھا۔

میں نے اُسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

"تم ٹھیک ہو جاؤ گی۔ میں اگر اتفاق سے یہاں نہ آتا تو تم ڈوب گئی تھیں۔"

پراسرار لڑکی نے کوئی جواب نہ دیا۔ اپنے سر کو کبھی دائیں اور کبھی بائیں طرف کرتی۔ اُس کے منہ سے بار بار اپنے دیوتا کا نام نکل جاتا تھا۔ میں حیران ہو رہا تھا کہ قدرت نے اُس لڑکی کے پاس پہنچنے کا کیسا سبب بنا دیا کہ نہ صرف میں اُس لڑکی کے قریب پہنچنے میں کامیاب ہو گیا ہوں بلکہ میں نے اُس کی جان بچا کر اُس کو اپنا ممنونِ احسان بھی بنا لیا ہے۔

میں نے لڑکی سے پوچھا۔ "تمہارا نام کیا ہے؟ تم کہاں رہتی ہو؟ مجھے بتاؤ! میں تمہیں تمہارے گھر لے جاتا ہوں۔"

پراسرار لڑکی نے کہنیوں کے سہارے اپنے آپ کو اُوپر اُٹھایا اور مجھ پر حیرت کی نگاہ

ڈالی اور بڑے رُوکھے لہجے میں پوچھا۔

"تم کون ہو؟"

بجائے اس کے کہ وہ میرا شکریہ ادا کرتی کہ میں نے اُس کی جان بچائی ہے اُس نے جس رُوکھے لہجے اور بے تعلقی کے انداز میں مجھ سے سوال کیا اُس پر مجھے غصہ ضرور آیا مگر میں اُسے غصہ دکھانے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ دوسری بات یہ تھی کہ مجھے پہلے سے بتا دیا گیا تھا کہ یہ عورت ایک مختلف قسم کی عورت ہے اور انسانوں سے بیزار ہو کر جنگل میں بن باس لے کر بیٹھی ہے۔ میں نے کہا۔

"پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ تم کہاں رہتی ہو؟ تاکہ میں تمہیں وہاں پہنچا دوں۔ اس کے بعد تمہیں بتا دوں گا کہ میں کون ہوں۔"

پراسرار لڑکی کے چہرے پر اب زندگی کی چمک لوٹ آئی تھی۔ چاندنی میں اُس کا چہرہ بے حد حسین لگ رہا تھا۔ وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی اور اپنی بھیگی ہوئی ساڑھی کو ٹھیک کرتے ہوئے بولی۔ "تم جاؤ! مجھے جہاں جانا ہے میں چلی جاؤں گی۔"

اس سے پہلے کہ میں اُسے کوئی جواب دیتا وہ کھڑی ہو گئی اور چل پڑی۔ دو قدم چلی ہو گی کہ اُس کے قدم لڑکھڑائے اور اگر میں جلدی سے اُسے نہ سنبھالتا تو وہ گر پڑتی۔ اُس پر نقاہت طاری تھی۔ کہنے لگی۔

"اُن درختوں کے پیچھے۔ وہاں...... وہاں میرا گھر ہے۔"

میں نے اُسے سہارا دیا اور وہ آہستہ آہستہ میرے ساتھ چل پڑی۔ اُسے قدم قدم چلاتا جب میں پرانے بنگلے کے احاطے میں داخل ہوا تو ایک جانب سے تین شکاری کتے بھونکتے ہوئے میری طرف بڑھے۔ لڑکی نے اُونچی آواز میں اُنہیں کچھ کہا، کتے مجھ سے کئی گز کے فاصلے پر آ کر ایک دم رُک گئے۔ اس دوران بنگلے کے برآمدے کا دروازہ کھول کر ایک بوڑھا آدمی ہاتھ میں لیمپ لئے باہر آ گیا تھا۔ لڑکی نے بوڑھے سے مخاطب ہو کر کہا۔

"دارا! اِنہیں لے جاؤ۔"

بوڑھے نے حیرت کی ایک نگاہ مجھ پر ڈالی اور کتوں کو پچکارتا ہوا دوسری طرف لے کر چلا گیا۔ میں لڑکی کو سہارا دیئے ایک کمرے میں آ گیا۔ یہ کمرہ اُس کمرے سے بالکل

مختلف تھا جہاں میں نے پچھلی رات کو لڑکی کو مہاویر کی مورتی کے آگے پوجا کرتے دیکھا
تھا۔ یہ پرانے صوفوں اور دیواروں پر گرے ہوئے قرمزی پردوں سے سجا ہوا تھا۔ کارنس
پر ایک بڑے گلوب والا لیمپ روشن تھا۔ لیمپ کے پاس ہی کارنس پر جین مت کے بانی
مہاویر کی برہنہ مورتی رکھی ہوئی تھی۔ ایک طرف دیوار کے ساتھ پلنگ پر بستر لگا تھا۔
کمرے میں آ کر لڑکی پلنگ پر لیٹ گئی اور بڑی بے رُخی سے مجھے کہا۔

''اب تم جاؤ!''

مجھے اُس کی سرد مہری بری ضرور لگی لیکن میں نے سوچا کہ اس لڑکی سے محاذ آرائی
نہیں کرنی چاہئے۔ ایسا کرنے سے اُلٹا میرا ہی نقصان ہوگا۔ میں نے پوچھا۔

''تم ٹھیک ہو نا؟''

لڑکی نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ آہستہ سے بولی۔

''میں نے کہا ہے نا! اب تم جاؤ۔''

میں دروازے کی طرف چل پڑا۔ دروازے کے قریب پہنچا تو پیچھے سے لڑکی کی آواز
آئی۔ ''ٹھہرو!''

میں نے رُک کر پیچھے دیکھا۔ لڑکی اب پلنگ کی ریلنگ کے ساتھ لگ کر بیٹھی ہوئی تھی
اور میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں وہیں رُک گیا تھا۔ وہ بولی۔

''یہاں آؤ!''

میں اُس کے پاس آ گیا۔ اُس نے اپنے قریب رکھے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

''بیٹھ جاؤ!''

میں بیٹھ گیا۔ کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ لڑکی کی ساڑھی جو ابھی تک گیلی تھی اُس
کے بدن سے چپک رہی تھی، مگر اُسے اپنی عریانی کا بالکل احساس نہیں تھا۔ اس کی وجہ اُس
کا عقیدہ تھا جس کی رُو سے اُس کے فرقے کے مرد اور عورتیں عریانی کو عریانی نہیں سمجھتے
تھے بلکہ یہ اُن کے دھرم کا ایک حصہ تھا۔ اُس نے میری طرف نظریں اُٹھا کر پوچھا۔

''تم رات کے وقت جنگل میں کیا کر رہے تھے؟''

میں نے ایک فرضی کہانی ذہن میں پہلے سے تیار کر رکھی تھی۔ میں نے کہا۔

''میں اپنے شکاری دوست کے ساتھ شکار کھیلنے آیا تھا۔ پھر اچانک ایک جگہ شیر

جھاڑیوں میں سے نکل کر ہمارے سامنے آ گیا۔ ہم بندوق چلانا بھول گئے اور بدحواس ہو
کر جدھر منہ اُٹھا بھاگ کھڑے ہوئے۔ میرا دوست کسی اور طرف نکل گیا اور میں کسی اور
طرف نکل گیا اور جنگل میں راستہ بھول گیا۔ اُس وقت سے جنگل میں بھٹکتا پھر رہا تھا۔
صبح ہوئی تو پھرتے پھراتے جھیل کنارے نکل آیا۔ وہاں آ کر میں نے جب تمہاری آواز
سنی اور دیکھا کہ تم جھیل میں ڈوب رہی ہو تو فوراً جھیل میں چھلانگ لگا دی اور تمہیں
ڈوبنے سے بچا لیا۔''

''کیا تم ہندو ہو؟'' لڑکی نے بے نیازی سے پوچھا۔ اُس نے شکریئے کا ایک لفظ تک
نہیں بولا تھا۔

میں نے کہا۔ ''میں مسلمان ہوں۔''

لڑکی کی نظریں چھ سات سیکنڈ تک میرے چہرے پر ٹھہری رہیں۔ پھر اُس نے پلنگ
کے پاس لٹکتی ایک رسّی کو تین بار نیچے کو کھینچا۔ دُور کسی کمرے سے گھنٹی کے ٹن ٹن بجنے کی
دبی دبی سی آواز سنائی دی۔ وہ ایک بار پھر مجھ سے مخاطب ہوئی اور بولی۔

''تم نے میری جان بچا کر مجھ پر جو احسان کیا ہے میں اس کا بدلہ چکانا چاہتی ہوں۔
ہمارے دھرم میں کسی کا احسان رکھنا پاپ ہے۔ بتاؤ! میں تمہارے لئے کیا کر سکتی ہوں؟''

میں دل میں بڑا خوش ہوا کہ وہ خود بخود میری راہ پر آ گئی تھی۔ مگر ابھی میں اُسے اپنی
مصیبت کے بارے میں کچھ نہیں بتانا چاہتا تھا۔ ابھی وہ صرف میرے احسان کا بدلہ چکانا
چاہتی تھی۔ ابھی مجھے اپنی مصیبت کے علاج کے واسطے اُس کی رضا مندی حاصل کرنی
تھی جو بہت ضروری تھی۔ میں نے کہا۔

''مجھے تمہارا یہ مکان، یہاں کا ماحول بڑا اچھا لگا ہے۔ مجھے اجازت دو! کہ میں کبھی
کبھی یہاں آ جایا کروں۔''

اُس نے فوراً جواب دیا۔

''اس کی میں تمہیں اجازت نہیں دے سکتی۔ ایک بات ہو سکتی ہے۔ میں تمہیں ایک
خط لکھ کر دیتی ہوں۔ وہ خط تم جے پور کے ہوٹل کے ٹھاکر محل میں جا کر بوڑھے دیوان کو
دینا۔ جتنی رقم تم مانگو گے وہ تمہیں دے دیں گے۔''

میں نے ذرا سخت لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔

"میں نے کسی لالچ کے لئے تمہاری جان نہیں بچائی۔ ایسا میں نے انسانی ہمدردی
کے جذبے سے کیا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ تم نے میرے انسانی ہمدردی کے جذبے کی
توہین کی ہے۔"

میرا خیال تھا کہ لڑکی ضرور مجھ سے اپنے کاروباری رویئے کی معذرت کرے گی۔ مگر
اُس نے ایسا نہ کیا۔ ویسے ہی سرد مہری کے لہجے میں کہنے لگی۔

"ٹھیک ہے۔ میں تمہیں یہاں آنے کی اجازت دیتی ہوں۔ مگر میری دو شرطیں ہیں۔"

میں دل میں بڑا خوش ہوا۔ میں نے کہا۔

"مجھے تمہارے بنگلے کا ماحول بڑا اچھا لگا ہے۔ اس لئے محض اپنے شوق کی خاطر اس
خواہش کا اظہار کیا ہے۔ ورنہ مجھے اس جنگل سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟ اور پھر مجھے تم
سے کوئی غرض بھی نہیں ہے۔ اپنے شوق کی خاطر میں تمہاری ہر شرط ماننے کو تیار ہوں۔"

اتنے میں وہی بوڑھا چھوٹا سا چاندی کا طشت ہاتھ میں لئے اندر آ گیا۔ طشت میں
دو کپ رکھے ہوئے تھے۔ وہ طشت تپائی پر رکھ کر جس طرح خاموش اور بے آواز
قدموں سے آیا تھا اُسی طرح خاموش اور بے آواز قدم اُٹھاتا واپس چلا گیا۔

لڑکی نے ایک کپ اُٹھالیا اور بولی۔ "یہ چائے ہے۔"

میں نے بھی کپ اُٹھا لیا۔ ایک گھونٹ پیا، حیران رہ گیا کہ اس ویرانے میں اُسے
اتنی عمدہ اور اعلیٰ چائے کہاں سے مل گئی ہے؟ پھر خیال آیا کہ اس لڑکی نے جے پور کے
دیوان اور ٹھاکر محل کا جو ذکر کیا ہے تو ضرور اس کا تعلق راجستھان کے کسی اعلیٰ مگر زوال
پذیر خاندان سے ہوگا۔ میں نے چائے کی تعریف کی تو وہ کہنے لگی۔

"یہ چیزیں دارا میرا پرانا ملازم جے پور جا کر لے آتا ہے۔"

میں اُس کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے بڑی احتیاط سے کام لے رہا تھا کہ وہ میری
کسی بات پر مشتعل ہو کر مجھے بنگلے سے باہر نہ نکال دے۔ چنانچہ میں نے بالکل نہ
پوچھا کہ اُس کا تعلق جے پور وغیرہ کے کس راج ونش سے ہے؟

اُس نے میرے وہاں کبھی کبھی آنے کے بارے میں دو شرطوں کا ذکر کیا تھا۔ میں
معلوم کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں نے اسی موضوع پر آتے ہوئے پوچھا۔

"وہ دو شرطیں کون کون سی ہیں؟"

وہ بڑی نزاکت اور مہذب طریقے سے چائے پی رہی تھی۔ صاف لگتا تھا کہ اُس کی
پرورش کسی پڑھے لکھے اعلیٰ گھرانے میں ہوئی ہے۔ کہنے لگی۔

"پہلی شرط یہ ہے کہ تم یہاں سے جانے کے بعد باہر کی دنیا میں کسی سے میرا ذکر
نہیں کرو گے۔ تمہیں اس کے لئے مجھے وچن دینا ہوگا۔ کیا تم ایسا کر سکو گے؟"

میں نے فوراً کہا۔

"میں وچن دیتا ہوں کہ یہاں سے جانے کے بعد کسی سے تمہارے بارے میں کبھی
کسی حالت میں بھی کوئی ذکر نہیں کروں گا۔"

لڑکی نے چائے کی سنہری کناروں والی پیالی بڑے سکون کے ساتھ طشت میں رکھی
اور میری طرف نگاہیں اُٹھائیں۔ سندھیا اور کانچی نے تو جو طلسم مجھ پر کرنا تھا وہ تو مجھ پر
کیا جا چکا تھا لیکن اس پُراسرار حسین لڑکی کی آنکھیں جو طلسم مجھ پر کر رہی تھیں اُس نے
ایک لمحے میں ہی مجھے مسحور کر دیا تھا۔ وہ بڑی پُرسکون آواز میں بولی۔

"میری دوسری شرط یہ ہے کہ تم ہفتے میں صرف ایک دفعہ یہاں آؤ گے اور جب بھی
آؤ گے دن کے وقت آؤ گے اور بنگلے کے باہر باہر سے ہی ہو کر واپس چلے جاؤ گے۔
مجھ سے ملنے کی کوشش نہیں کرو گے۔"

یہ شرط میرے منصوبے کے بالکل اُلٹ تھی۔ میں نے اپنے لہجے میں بڑی لگاوٹ
بلکہ محبت کی شیرینی پیدا کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن اس بنگلے کا سارا حسن، سارا رُومان تو صرف تمہارے دم قدم سے ہے۔ اگر
میں یہاں آ کر تم سے نہ ملا تو پھر میرے آنے کا فائدہ کیا ہوگا؟"

محبت عورت کی سب سے بڑی کمزوری ہوتی ہے۔ عورت چاہے چنگیز خان کی طرح
پتھر دل کیوں نہ ہو دل سے نکلے ہوئے محبت کے دو بول اُس کے پتھر جیسے دل میں بھی
اُتر جاتے ہیں۔ اور پھر مجھے تو واقعی اُس سے محبت ہو گئی تھی اور میں نے محبت کے بے
پناہ جذبات کے ساتھ اُس سے یہ بات کہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ لڑکی کے حسین اور
بظاہر سخت چہرے پر محبت اور حیا کی ایک لطیف سی لہر نمودار ہوئی اور اُس کے گلاب کی
پنکھڑیوں جیسے ہونٹ ہلکے سے تبسم کے ساتھ کھلے اور کہنے لگی۔

"تمہیں باتیں بنانی بہت آتی ہیں۔"

میں نے کہا۔

''یہ سب کچھ یہاں کے خوبصورت اور پراسرار ماحول نے مجھے سکھا دیا ہے۔''

وہ خاموش نگاہوں سے مجھے تکتی رہی۔ پھر اپنا سیاہ کھلے بالوں والا سر پلنگ کی پشت سے لگایا اور بولی۔

''میں تمہارے احسان کو چکانے کی پابند ہوں۔ ٹھیک ہے۔ تم اگر چاہو تو ہفتے میں ایک بار شام کے وقت مجھے اس کمرے میں آکر مل سکتے ہو۔ لیکن تمہیں زیادہ دیر یہاں بیٹھنے کی اجازت نہیں دوں گی۔''

میں نے کہا۔ ''میرے لئے اتنا ہی بہت ہے۔ اس کے سوا مجھے اور کچھ نہیں چاہئے۔''

اُس نے آنکھیں بند کرلیں اور دھیمی نیند بھری آواز میں کہا۔

''اب تم جا سکتے ہو...... مجھے نیند آ رہی ہے۔''

میں نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

''جاتا ہوں...... چائے بڑی خوبصورت تھی۔ تمہارا بہت بہت شکریہ۔''

میں خاموشی کے ساتھ کمرے سے باہر نکل آیا۔ میری زندگی کے سب سے نازک مشن کا اہم ترین مرحلہ قدرت نے اپنی کارفرمائی بلکہ کرم فرمائی سے اپنے آپ طے کرا دیا تھا۔ اس کامیابی کے لئے میں خدا کا جس قدر بھی شکر ادا کرتا کم تھا۔ پراسرار لڑکی کے پرانے بنگلے کے ویران گیٹ سے نکل کر جب میں رات کے اندھیرے میں ڈوبے ہوئے جنگل کی دنیا میں داخل ہوا تو نیلے آسمان پر رات کے پچھلے پہر کے ستارے چمک کر مجھے جیسے مبارکباد دے رہے تھے۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ جس منزل کو پانے کی خاطر میں جان کی بازی تک لگانے کو تیار تھا اور جس کی کامیابی کے لئے میں منصوبے سوچتے سوچتے تھک گیا تھا وہ منزل اپنے آپ میرے پاس آ جائے گی۔

اُس کامیابی کا سب سے کمزور پہلو، جس کی وجہ سے مجھے کچھ کچھ پریشانی بھی ہو رہی تھی، یہ تھا کہ میرے دل میں اُس لڑکی کے لئے محبت کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا۔ محبت کا جذبہ انسان کی سب سے بڑی طاقت بھی ہوتی ہے اور سب سے خطرناک کمزوری بھی بن جاتی ہے۔ محبت میں آکر انسان بغیر سوچے سمجھے وہ کام بھی بے دھڑک کر گزرتا ہے جس پر عقل و ہوش کی موجودگی میں کرنے سے پہلے وہ کئی بار سوچتا اور غور کرتا ہے۔ محبت

کے اندھے جذبے میں سرشار ہو کر وہ اپنی منزل ضرور پا لیتا ہے، کامیاب ہو جاتا ہے، لیکن کبھی کبھی اُسے اپنی اس کامیابی کا خمیازہ ساری زندگی کے پچھتاوے کی شکل میں اٹھانا پڑتا ہے۔

لیکن اُس لمحے میں اپنی کامیابی کے نشے میں اس قدر مسرور تھا کہ مجھے آگے پیچھے کی کچھ خبر نہیں تھی۔ میں نے صبح ہونے کا بھی انتظار نہ کیا اور راتوں رات جنگل میں بغیر رُکے سفر کر کے فادر فرانسس کی خانقاہ میں پہنچ گیا۔ اُس وقت صبح ہو رہی تھی۔ سرسوتی بھی وہاں موجود تھی۔ وہ میری واپسی کا انتظار کر رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ بڑی خوش ہوئی۔ اُس نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔

''تمہارے چہرے سے لگتا ہے کہ تم کامیاب ہو کر آئے ہو۔''

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کچھ ایسی ہی بات ہے۔ فادر فرانسس کے پاس چلو! ساری بات اُن کے سامنے بیان کروں گا۔''

فادر فرانسس صبح کی عبادت سے ابھی فارغ ہوئے تھے۔ اُنہوں نے بھی میرے خوش خوش چہرے سے بھانپ لیا کہ میں ناکام نہیں لوٹا ہوں۔ جب میں نے اُن کو شروع سے آخر تک پوری داستان سنائی تو اُنہوں نے اپنے سینے پر صلیب کا نشان بناتے ہوئے خدا کا شکر ادا کیا اور بولے۔

''صاف ظاہر ہے کہ اس مشن میں خدا نے تمہاری مدد کی ہے۔ اُس کی مدد اگر تمہارے ساتھ شامل نہ ہوتی تو میں جانتا ہوں اس مرحلے کو طے کرنا تمہارے لئے بہت مشکل بلکہ کسی حد تک ناممکن تھا۔ اس لئے کہ میں اُس لڑکی کی فطرت کو اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ وہ اپنوں کو چھوڑ چکی ہے۔ وہ کسی غیر کو کیسے اپنے قریب آنے کی اجازت دے سکتی ہے؟ مجھے خوشی ہے کہ تم اتنی آسانی کے ساتھ اُس لڑکی کے قریب پہنچے بلکہ اُس پر احسان چڑھانے میں کامیاب ہو گئے ہو۔''

میں نے کہا۔

''فادر! آپ کی دُعا نے بھی بڑا کام کیا ہے۔ یہاں سے جانے اور جنگل میں دو راتیں گزارنے کے بعد بھی مجھ پر سندھیا اور کانچی کے جادوئی منتروں نے حملہ نہیں کیا۔

ایک سیکنڈ کے لئے بھی میرا سر نہیں چکرایا۔''

فادر بولے۔

''چونکہ وہ لڑکی اپنی مرضی سے تمہیں اپنے بنگلے میں لے گئی تھی اس لئے تم باہر کی طرح اُس کے بنگلے میں بھی شیطانی عورتوں کے جادو سے محفوظ ہو گئے تھے۔''

سرسوتی کہنے لگی۔

''فادر! اب اسے آگے کیا کرنا چاہئے؟ یہ کیسے اور کس طرح سے اُس پراسرار خاتون کو بتائے گا کہ میں اس مشکل میں گرفتار ہوں اور مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے؟''

فادر فرانسس سوچنے لگے، پھر چہرہ اُوپر اُٹھا کر میری طرف دیکھا اور بولے۔

''بیٹا! تمہارے مشن کا سب سے اہم اور نازک مرحلہ اب شروع ہونے والا ہے۔ اب تمہیں ایک ایک قدم سوچ سمجھ کر اُٹھانا ہو گا۔ تمہاری ذرا سی بھول، ذرا سی غلطی تمہاری ہمیشہ کے لئے ناکامی کا باعث بن سکتی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''فادر! آپ مجھے جو ہدایت فرمائیں گے، جس طرح کہیں گے، میں اُس پر عمل کروں گا۔''

فادر کہنے لگے۔

یہ بڑی اچھی بات ہوئی ہے کہ اُس نے خود اپنی مرضی سے تمہیں ہفتے میں ایک بار اپنے پرانے بنگلے پر آنے کی اجازت دے دی ہے۔ ابھی تم ایسا کرو گے کہ ہفتے میں کوئی دن چن کر اُس کے ہاں باقاعدگی سے جاؤ گے اور تم اُس سے مل کر صرف اُس کی باتیں سنو گے۔ وہ بھی اگر اُس نے تمہارے سامنے بات کی تو...... تم اپنی طرف سے زیادہ بات نہیں کرو گے۔ تمہاری یہ کوشش ہونی چاہئے کہ تم اُس پراسرار عورت کے سامنے جو بھی بات کرو وہ اُس کے دل کو موہ لینے والی، اُس کے دل پر اثر کرنے والی ہو۔ اس طریقے سے جب تم یہ محسوس کرو کہ اس عورت یا لڑکی کو تمہارے ساتھ ہمدردی ہو گئی ہے اور تم نے اس کے دل میں اپنے لئے تھوڑی بہت جگہ بنا لی ہے تو پھر تم اُس کے سامنے اپنی مصیبت کو بیان کر دینا اور بات ایسے ہی شروع کرنا جیسے تم پر جو آفت پڑی ہے اُس کا کوئی علاج نہیں ہے۔ وہ لاعلاج مرض ہے۔ اس پر مجھے یقین ہے کہ وہ خود ہی تمہاری مدد پر آمادہ ہو جائے گی۔ کیونکہ تمہارا یہ کہہ دینا کہ تمہیں اس مصیبت سے کوئی انسان

نجات نہیں دلا سکتا، اُس پراسرار عورت کی خفیہ طاقتوں کے لئے ایک چیلنج بن جائے گا وہ چونکہ تمہاری مدد کرنے اور تمہیں تمہاری مصیبت سے نجات دلانے کی طاقت رکھتی ہے اس لئے وہ فوراً تمہاری مدد کے لئے تیار ہو جائے گی۔ ویسے تم میرے پاس ہی رہو اور میں تمہیں مشورے دیتا رہوں گا۔''

سرسوتی بڑی خوش ہوئی کہ فادر فرانسس دل و جان سے میری مدد کر رہے تھے۔ میں بھی فادر فرانسس کا بے حد ممنون تھا۔ میں نے سرسوتی اور فادر میں سے کسی کو یہ نہ بتایا کہ میں اُس لڑکی سے محبت کرنے لگا ہوں۔ یہ بات اُن کو بتانے والی بھی نہیں تھی۔ فادر فرانسس کہنے لگے۔ ''یہ بات ہر وقت اپنے ذہن میں رکھنا! کہ قدرت تمہاری مدد کر رہی ہے۔ کوئی ایسی حماقت مت کر بیٹھنا جس سے تم قدرت کی ہمدردی کھو بیٹھو۔''

''میں ایسی کوئی غلطی نہیں کروں گا فادر!'' میں نے اُنہیں یقین دلاتے ہوئے کہا۔

''اب وہاں کس روز تمہارا جانے کا ارادہ ہے؟'' سرسوتی نے پوچھا۔

میں نے کہا۔ ''میں تو کل ہی رات کو وہاں جانا چاہوں گا۔''

فادر فرانسس نے اس پر مشورہ دیا۔

''نہیں...... اتنی جلدی نہیں کرنی چاہئے۔ دو دن کا وقفہ ڈال کر وہاں جاؤ! اس طرح سے قدرتی طور پر اُس لڑکی کے دل میں خیال پیدا ہو گا کہ جس لڑکے نے آنے کے لئے کہا تھا وہ آیا کیوں نہیں؟ وہ غیر ارادی طور پر تمہارا انتظار کرنے لگے گی۔''

فادر فرانسس کی یہ بات میرے دل کو لگی۔ اُنہوں نے بالکل صحیح فرمایا تھا۔ جس طرح پراسرار لڑکی نے ایک دو بار باتیں کرتے ہوئے میری طرف نظریں اُٹھا کر دیکھا تھا، مجھے اُن نظروں میں محبت نہ سہی لیکن ایک دوستی کی، ایک طرح کے احساسِ قربت کی کیفیت کی جھلک ضرور نظر آئی تھی۔ اتنی مختصر ملاقات میں اُس لڑکی کے اکھڑ، ضدی پن اور سرد مہر رویے کے باوجود مجھے ایسے محسوس ہو گیا تھا کہ وہ مجھے اگر پسند نہیں کرتی تو میں اُسے ناپسند بھی نہیں ہوں۔ یہ بات میرے حوصلے کو بڑھا رہی تھی۔ سرسوتی نے کہا۔

''فادر ٹھیک کہتے ہیں شیراز! تم دو دن کا وقفہ ڈال کر اُس کے ہاں جانا۔''

میں نے کہہ دیا۔ ''ٹھیک ہے۔ جیسے آپ لوگ کہتے ہیں میں ویسے ہی کروں گا۔''

OOO

کہنے کو تو میں نے کہہ دیا کہ میں دو دن بعد پرانے بنگلے پر جاؤں گا لیکن یہ دو دن
گزارنے میرے لئے مشکل ہو گئے۔ ہر وقت اُس پراسرار لڑکی کا حسین و جمیل چہرہ
اُس کی لمبی پلکوں والی نیم خوابیدہ آنکھیں میرے ذہن پر چھائی رہتیں۔ مگر میں اپنی محبت
کے بے قابو جذبات کو اپنے قابو میں رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ بڑا نازک مرحلہ تھا۔
میرے لئے ایسا کرنا بہت ضروری بھی تھا۔ میری ذرا سی غفلت، ذرا سی ناسمجھی سارے
کئے کرائے پر پانی پھیر سکتی تھی۔ دن بھر میں فادر فرانسس کی خانقاہ میں ہی آرام کرتا رہا
شام کو ہم کھانا کھانے بیٹھے تو میں نے اُسی پراسرار لڑکی کا ذکر چھیڑ دیا۔

میں نے فادر سے کہا۔ ''فادر! اُس لڑکی نے بہت کوشش کی تھی کہ کسی طرح میں
دوبارہ اُس کے پرانے بنگلے پر نہ آؤں۔ یہاں تک کہ اُس نے مجھے منہ مانگی رقم دینے کی
بھی پیشکش کی اور کہا کہ میں تمہیں جے پور کے کسی ٹھاکر محل کے دیوان کے نام خط لکھ
دیتی ہوں۔ وہ تمہیں جتنی رقم مانگو گے دے دیں گے۔''

فادر کھانا کھاتے ہوئے بڑی توجہ سے میری بات سن رہے تھے۔ بولے۔

''ہاں...... تم یہ مجھے بتا چکے ہو۔''

میں نے کہا۔ ''میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا اس لڑکی کا تعلق کسی شاہی
راجپوت گھرانے سے ہے؟''

فادر فرانسس کہنے لگے۔ ''بے شک...... یہ لڑکی ایک شاہی راجپوت گھرانے سے
تعلق رکھتی ہے۔ مگر مدت ہوئی ان کی بادشاہت ختم ہو چکی ہے۔ میں نے سنا تھا کہ جے
پور کے قریب اب اُن کی صرف ایک حویلی ہی باقی رہ گئی ہے۔ یہ لڑکی پڑھی لکھی ہے مگر
پتہ نہیں کیوں اُس نے ایک دم اپنی عیش و آرام کی زندگی چھوڑ کر بن باس اختیار کر لیا۔

میں نے کہا۔ ''فادر! [illegible]

لڑکی جینی کیسے ہو گئی؟ میرا مطلب ہے اس نے جین مت کی پیروی کیوں شروع کر
دی؟''

فادر فرانسس نے کہا۔ ''اس کے بارے میں مجھے کچھ معلوم نہیں ہے۔ لیکن جین مت
بھی ہندو دھرم کا ایک حصہ ہی ہے۔ بس! اُس لڑکی کا دل مہاویر کی طرف گیا اور اُس نے
مہاویر کی پوجا شروع کر دی۔ تمہیں ان باتوں کی طرف توجہ دینے کی ضرورت نہیں ہے۔
تم صرف اپنے مقصد کو سامنے رکھو! کسی طرح اُس لڑکی کی خفیہ طاقت کی مدد سے وہ
مقصد حاصل کرنے کی کوشش کرو جس کے لئے تم وہاں گئے ہو۔''

میں نے کہا۔ ''میں ایسا ہی کر رہا ہوں فادر!''

''بس! اسی پر نگاہ رکھو۔'' فادر بولے۔ ''باقی کچھ سوچنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

دوپہر کے بعد سرسوتی بھی آ گئی۔ وہ دوسرے دن واپس گئی۔ جب دو دن گزر گئے تو
میں تیسرے دن صبح صبح ہی پراسرار لڑکی سے ملنے اُس کے پرانے بنگلے کی طرف روانہ ہو
گیا۔ راستے میں جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں، دو جنگل پڑتے تھے۔ اس کے بعد چھوٹی
چھوٹی سرسبز ڈھلانوں والی پہاڑیوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جن کے درمیان جھیل تھی
اور اُس جھیل کے کنارے ایک جانب صنوبر اور سنبل کے درختوں میں پراسرار لڑکی کا پرانا
بنگلہ تھا۔

جس وقت میں پرانے بنگلے کے قریب پہنچا تو دن کے دس گیارہ کا وقت ہو چکا تھا۔
موسم بڑا خوشگوار تھا۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ میں
سیاہ چٹان کے قریب سے گزر کر پرانے بنگلے کی طرف بڑھا تو پچاس ساٹھ قدم ہی چلا
ہوں گا کہ پرانے بنگلے کی جانب سے کتوں کے بھونکنے کی خوفناک آوازیں آئیں۔ میں
وہیں رُک گیا۔ یہ پراسرار لڑکی کے شکاری کتوں کی آوازیں تھیں۔ چند لمحوں کے بعد ہی
کتوں کی آواز غائب ہو گئی۔ ضرور پراسرار لڑکی نے اُنہیں چپ کرایا ہو گا۔ اُسے معلوم
تھا کہ دو دن بعد میں اُس سے ملنے آنے والا ہوں۔ اب میں بے خوف ہو کر چلنے لگا۔

پرانے بنگلے کا احاطہ خاموش اور ویران پڑا تھا۔ ہوا کے چلنے سے صنوبر کے درختوں پر
سے زرد خشک پتے آہستہ آہستہ گر رہے تھے۔ یہ بڑا رومانٹک منظر تھا۔ اس منظر کے پس
منظر میں پرانا بنگلہ اور زیادہ پراسرار اور رومانٹک لگ رہا تھا۔ یہ سوچ کر میرے دل کی

دھڑکن تیز ہو رہی تھی کہ ابھی تھوڑی دیر کے بعد میں اُس حسین و جمیل دیوی کے رُوبرو بیٹھا ہوں گا جس کو میں دل و جان سے پیار کرتا ہوں۔ جیسے ہی میں پرانے بنگلے کے احاطے میں داخل ہوا، بنگلے کی دوسری طرف سے شکاری کتوں کے بھونکنے کی آواز سنائی دی۔ وہی داڑھی والا بوڑھا برآمدے میں نمودار ہوا۔ اُس نے ہاتھ جوڑ کر مجھے پرنام کیا اور اشارے سے پیچھے آنے کو کہا۔ میں اُس کے پیچھے چل پڑا۔ برآمدے کے کونے میں ایک کمرہ تھا۔ اُس نے دروازہ کھول کر مجھے اندر جانے کا اشارہ کیا۔

میں کمرے میں داخل ہو گیا۔

یہ پراسرار لڑکی کا بیڈ روم تھا۔ وہ پلنگ پر نیم دراز کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ اُس کی دائیں جانب کھڑکی کھلی تھی جس پر کوئی جنگلی بیل جھکی ہوئی تھی۔ کھڑکی میں سے دن کی مدھم روشنی اندر آ رہی تھی۔ پراسرار لڑکی نے بادامی رنگ کی ریشمی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ بال کھلے تھے، ماتھے پر لال بندیا تھی۔ کمرے کی فضا میں عجیب و غریب خواب جیسی دھیمی دھیمی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ لڑکی نے کتاب پر سے نظریں ہٹا کر میری طرف دیکھا اور بولی۔

''بیٹھ جاؤ!''

پلنگ کے پاس ہی صوفہ رکھا تھا، میں اُس پر بیٹھ گیا۔ وہ کتاب پڑھنے لگی۔ وہ میری موجودگی سے بالکل بے نیاز ہو کر کتاب پڑھنے میں مصروف تھی۔ کھڑکی میں سے آتی روشنی نے اُس کے چہرے کے ایک رُخ کو روشن کر رکھا تھا۔ وہ پندرھویں صدی کے کسی اطالوی ماسٹر پینٹر کی پینٹنگ لگ رہی تھی۔ اپنے آپ ہی اُس نے کتاب بند کر کے ایک طرف رکھ دی۔ میں نے پوچھا۔

''یہ کون سی کتاب ہے؟''

اُس نے بڑے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

''مہاویر جی کے اُپدیشوں کی کتاب ہے۔ مگر تم مسلمان ہو۔ تم اسے نہیں سمجھ سکو گے۔''

جب میں نے اُسے بتایا کہ میں نے مہاویر جی کی زندگی اور جین مت کے بارے میں بہت کچھ پڑھا ہوا ہے اور جب میں نے اُسے جین مت کے دو اہم فرقوں ڈگمبر اور سوتمبر کے بارے میں تفصیل سے بتایا تو وہ پلنگ پر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ کہنے لگی۔

''تمہیں تو ہمارے دھرم کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہے۔''

اِس کے بعد میرے ساتھ اُس کا رُوکھے پن کا رویہ بالکل بدل گیا۔ میں کچھ کہتا تو وہ ہر بات توجہ سے سنتی۔ میں اُس کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے بڑی احتیاط سے کام لیتا۔ میں نے اُسے بالکل نہیں بتایا کہ میں نے اُسے ایک رات جھیل پر بے لباس حالت میں اشنان کرتے اور اُسی رات اپنے کمرے میں مہاویر کی مورتی کے آگے بے لباس حالت میں پوجا کرتے دیکھا تھا۔ میں شام ہونے سے ذرا پہلے واپس آیا۔ ایک ہفتہ ڈال کر اُس سے دوسری بار ملنے گیا تو اُس کے چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ وہ میرا انتظار کر رہی تھی۔ وہ زیادہ تر اپنے مذہب جین مت کے بارے میں گفتگو کرتی رہی۔ ابھی تک میں نے اُس سے یہ پوچھنے کی جرات نہیں کی تھی کہ وہ کون ہے اور اس ویران جنگل میں اکیلی بن باس لے کر کیوں بیٹھی ہے؟ اُس نے بھی مجھ سے ابھی تک میری ذاتی زندگی کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ تیسرے ہفتے جب میں اُس سے مل کر جدا ہونے لگا تو وہ بولی۔

''اگر تم چاہو تو ایک دن چھوڑ کر مجھ سے ملنے آ سکتے ہو۔''

مجھے اور کیا چاہئے تھا؟ میں نے فوراً کہا۔ ''میں بھی یہی چاہتا ہوں۔''

میری اس بات پر وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔ اُس نے اپنے روایتی سرد مہر لہجے میں پوچھا۔ ''تم کس لئے ایسا چاہتے ہو؟''

میں نے کہا، بلکہ میری زبان سے اپنے آپ نکل گیا۔

''اس لئے کہ مجھے تمہارے پاس بیٹھ کر باتیں کرنا بڑا اچھا لگتا ہے۔''

اُس کے خوبصورت چہرے پر حیا کی سرخی سی آ گئی جس کو میں نے صاف دیکھ لیا۔ میں نے ایک ایسی بات کہہ دی تھی جو ایسے موقعوں پر عام طور پر مرد کسی عورت سے کہتے ہوئے جھجکتے ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ عورت برا مان جائے گی۔ وہ اس حقیقت سے بے خبر ہوتے ہیں کہ ایک عورت ایسی بات سننے کے لئے ہر وقت تیار ہوتی ہے جس میں اُس کی تعریف یا اُس سے محبت کرنے کا پہلو نکلتا ہو۔ چنانچہ سوچ سمجھ کر، عقل و ہوش کے ساتھ چلایا ہوا تیر نشانے پر ٹھیک جا کر لگا تھا۔ میں نے اُسے بولنے کا موقع دیئے بغیر ایک اور تیر چلایا اور کہا۔

''تم اتنی پڑھی لکھی لڑکی ہو۔ میں تمہاری باتوں سے بڑا علم حاصل کرتا ہوں۔ تم اتنی

خوبصورتی سے بولتی ہو کہ تمہاری ہر بات میرے دل میں اُتر جاتی ہے۔''
اُس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ اُبھری۔ کہنے لگی۔
''تم بھی بڑی اچھی باتیں کرتے ہو۔ تمہیں ہندو دھرم کے بارے میں بہت کچھ
معلوم ہے۔ میں بھی تمہاری باتیں بڑے غور سے سنتی ہوں۔''
اب میں ایک دن چھوڑ کر اُس کے پاس جانے لگا۔ حالات جیسے جیسے آگے بڑھ
رہے تھے اُن سے میں سرسوتی اور فادر فرانسس کو برابر مطلع کر رہا تھا۔ وہ بڑے خوش تھے
کہ ہر کام منصوبہ بندی کے عین مطابق ہو رہا ہے۔ اس طرح ایک مہینہ گزر گیا۔ اب میں
اور وہ لڑکی ایک دوسرے کے کافی قریب آ چکے تھے۔ قریب ان معنوں میں آ گئے تھے کہ
ہم ایک دوسرے سے بات کرتے ہوئے بالکل نہیں ہچکچاتے تھے۔ ایک دن میں پراسرار
لڑکی کے پاس بیٹھا تھا۔ ہم کھانا کھانے کے بعد چائے پی رہے تھے کہ میں نے کہا۔
''عجیب بات ہے کہ ہم اتنے دنوں سے ایک دوسرے سے مل رہے ہیں مگر ابھی تک
ہمیں ایک دوسرے کا نام تک معلوم نہیں ہے۔''
پراسرار لڑکی ذرا سی مسکرائی، کہنے لگی۔
''تم نے نہیں پوچھا، میں نے بھی نہیں پوچھا۔''
میں نے فوراً کہا۔ ''میرا نام شیراز ہے۔''
وہ تین چار سیکنڈ خاموش رہنے کے بعد بولی۔ ''میرا نام اُرملا ہے۔''
میں نے کہا۔ ''بڑا خوبصورت نام ہے۔''
وہ بولی۔ ''وہ کیسے؟''
میں نے کہا۔ ''اس نام میں میوزک ہے جیسے جل ترنگ بجا ہو۔''
وہ بے اختیار ہنس پڑی۔ اُس کے دانت سفید بے داغ موتیوں کی طرح تھے۔
''کیوں...... میں نے غلط تو نہیں کہا؟''
اُس نے کہا۔
''مجھے اس لئے ہنسی آ گئی تھی کہ یہ بات آج تک مجھے کسی نے نہیں کہی۔''
مجھے موقع مل گیا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ محبت آمیز گفتگو کا سلسلہ جاری رہے۔ میں نے
کہا۔ ''میں تو تمہاری آواز کی بھی تعریف کرنا چاہتا ہوں۔ اس لئے کہ تمہاری آواز بھی

بکل ہے۔''
مجھے ڈر تھا کہ وہ میری بات کا برا نہ مان جائے۔ مگر میں یہ بھی جانتا تھا کہ اس قسم کی
عورت کی بڑی کمزوری ہوتی ہیں۔ اُس نے اچانک ایک ایسا سوال کر دیا جس کی
توقع ہی نہیں تھی۔ کہنے لگی۔
''اور میں کیسی ہوں؟''
اُس نے میرا حوصلہ بڑھا دیا تھا۔ میں اس سنہری موقع کو کیسے ضائع کر سکتا تھا؟ میں
نے بے دھڑک ہو کر کہا۔
''تم اپنی آواز اور اپنے نام سے زیادہ دلکش ہو، زیادہ خوبصورت ہو۔''
اُرملا شرما گئی اور کھڑکی پر جھکی ہوئی بیل کی طرف دیکھنے لگی۔ اُس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ
اپنی خوبصورتی کی تعریف بڑی اچھی لگی ہے۔ شاید ایسی باتیں اُس کے ساتھ پہلے
نے نہیں کی تھیں۔ میں کچھ اور کہنے لگا تو اُس نے گردن موڑ کر میری طرف دیکھا
بولی۔
''تم یہاں کس جگہ رہتے ہو؟''
میں نے اس سوال کا جواب پہلے سے سوچ رکھا تھا۔ میں نے کہا۔
''یہاں سے کچھ دُور جہاں جنگل ختم ہوتا ہے وہاں ایک خانقاہ ہے۔ میں وہاں رہتا
ں۔ ایک بوڑھا ملازم میری دیکھ بھال کرتا ہے۔''
اُرملا کہنے لگی۔ ''تمہارا گھر کہاں ہے؟''
میں نے کہا۔ ''پنجاب میں ہے۔ میں وہاں کالج میں پڑھتا ہوں۔''
وہ بولی۔ ''تم واپس کیوں نہیں چلے جاتے؟ تمہاری پڑھائی کا حرج ہو رہا ہے۔''
میں نے کہا۔ ''میری ایک مجبوری ہے۔ میں اپنے گھر واپس نہیں جا سکتا۔ اگر گیا تو
اں سے نکلتے ہی موت مجھے اپنی طرف کھینچ لے گی۔''
وہ حیران سی ہو کر میرا منہ تکنے لگی۔ ''کیا مطلب ہے تمہارا...... ؟''
اُس نے اپنی مرضی سے مجھ سے یہ سوال کیا تھا۔ وہ خود مجھ سے میری مصیبت کی وجہ
ننا چاہتی تھی بلکہ پوچھ رہی تھی۔ میں اسی موقع کے انتظار میں تھا۔ میں نے کہا۔
''یہ بڑی لمبی کہانی ہے۔ تم نہ ہی سنو تو اچھا ہے۔''

میں نے جان بوجھ کر اُس کے اشتیاق کو ہوا دی تھی۔ وہ کہنے لگی۔

''ایسی کون سی بات ہے؟ تم مجھے بتاؤ! شاید میں تمہاری کچھ مدد کر سکوں۔''

فادر فرانسس نے بتایا تھا کہ اُس لڑکی کے پاس بڑی زبردست خفیہ طاقت ہے اور اپنی اس طاقت کی مدد سے وہ مجھ پر کیا گیا سندھیا اور کانچی کا جادو ہمیشہ کے لئے ختم کر سکتی ہے۔ میں نے کہا۔

''مجھ پر دو عورتوں نے جادو کر رکھا ہے۔ وہ مجھے اپنے کسی دیوتا پر قربان کرنا چاہتی ہیں۔ ایک نیک دل سادھو نے مجھے اُن خونی عورتوں کے چنگل سے نکال لیا تھا اور مجھ پر کوئی منتر پھونک کر کہا تھا کہ میں تمہارے سر پر سے راکھشش عورتوں کا جادو تو نہیں اُتار سکتا لیکن جو منتر میں نے تم پر پھونکا ہے اس کے اثر سے جب تک تم اس جنگل میں ہو تم پر خونی عورتوں کا جادو نہیں چل سکے گا۔ لیکن اگر تم اس جنگل سے باہر نکلے تو ان عورتوں کا جادو حرکت میں آ جائے گا اور وہ تمہیں اُٹھا کر لے جائیں گی۔ بس! اُس وقت سے لے کر اب تک میں اسی جنگل کی حدود میں رہ رہا ہوں۔''

اُرملا نے کہا۔ ''مگر تم نے تو کہا تھا کہ تم اپنے دوست کے ساتھ شکار کھیلنے آئے تھے کہ شیر کے اچانک نکل آنے سے تم ایک دوسرے سے بچھڑ گئے۔''

میں نے کہا۔

''میں نے بالکل ٹھیک کہا تھا۔ لیکن آگے کی بات میں نے تمہیں نہیں بتائی تھی۔ اپنے دوست سے بچھڑنے کے بعد میں جنگل میں بھٹک گیا تھا اور بدقسمتی اور انجانے پن کی وجہ سے ان راکھشش عورتوں کے جال میں پھنس گیا۔

میں دیکھ رہا تھا کہ میری مصیبت کی داستان نے اُرملا پر کافی اثر کیا ہے۔ میں نے اُسے شروع سے آخر تک اپنی ساری روئیداد سنا دی۔ میں نے رانی کا بھی تفصیل سے ذکر کیا اور کہا کہ اُس نے بھی مجھ پر کسی ویدک منتروں کا ٹونہ کیا تھا جس کے اثر سے میں اُس کا غلام بن کر رہ گیا تھا۔

اُرملا نے بڑے غور سے میری داستانِ غم کو سنا۔ جب میں ساری کہانی بیان کر چکا تو میں نے کہا۔

''اب تم خود ہی بتاؤ! کہ میں اس حالت میں کیسے اپنے ماں باپ کے پاس واپس

شہر جا سکتا ہوں؟ جبکہ سندھیا اور کانچی موت بن کر میرے سر پر سوار ہیں اور وہ یہاں سے نکلنے کے بعد کسی بھی وقت مجھے دبوچ سکتی ہیں۔''

میں نے بڑی سمجھداری سے کام لیا تھا اور اپنی داستان میں فادر فرانسس اور سرسوتی کا ذکر نہیں کیا تھا۔ اُرملا میری داستان سن کر خاموش ہو کر گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ پھر اُس نے سر اُٹھا کر میری طرف دیکھا اور بولی۔

''تم نے میری جان بچا کر مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ تمہارے احسان کو چکانے کے لئے میں ضرور تمہاری مدد کروں گی اور تمہیں اس مصیبت سے نجات دلاؤں گی۔ لیکن اس کے لئے تمہیں میرے ساتھ میری حویلی میں چلنا ہوگا۔''

میں تو اپنی نجات کی خاطر اس کے ساتھ جہنم میں جانے کو بھی تیار تھا۔ میں نے کہا۔

''تم جہاں مجھے لے جاؤ گی میں جاؤں گا۔ مگر اتنا ضرور خیال رکھنا کہ اس جنگل اور اس کے اِردگرد کی حدود سے باہر نکلوں گا تو سندھیا اور کانچی کا ویدک ٹونہ حرکت میں آ جائے گا اور وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گی۔''

اُرملا نے بڑی شان سے اپنی گردن اُونچی کی اور پُراعتماد انداز میں کہا۔

''تم میرے ساتھ ہو گے تو اُن کا باپ بھی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔''

مجھے فادر فرانسس کا جملہ یاد آ گیا۔ اُنہوں نے کہا تھا کہ اس پُراسرار عورت کے پاس ویدک جادو ٹونے کی ایسی زبردست خفیہ طاقت ہے کہ اس کا مقابلہ ہندوستان کا بڑے سے بڑا جادوگر بھی نہیں کر سکتا۔ میں نے کہا۔

''اگر تم میری حفاظت کا ذمہ لیتی ہو تو میں تمہارے ساتھ ضرور چلوں گا۔''

اُرملا نے کہا۔ ''میں تمہاری حفاظت کا ذمہ لیتی ہوں۔ تم کل دن نکلتے ہی میرے پاس آ جانا۔ ہم یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔''

میں نے مزید سوال جواب کرنا مناسب نہ سمجھا اور اُس سے اجازت لے کر واپس فادر فرانسس کی خانقاہ میں آ گیا۔ فادر فرانسس کو ساری کہانی سنائی۔ وہ مسکرائے۔ کہنے لگے۔

''میں نے نہیں کہا تھا کہ قدرت تمہاری مدد کر رہی ہے! اب تمہیں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ عورت ہی تمہاری مصیبت سے تمہیں نجات دلا سکتی ہے۔ اب جبکہ وہ اپنی مرضی اور رضامندی سے ایسا کر رہی ہے تو یقین کرو! تمہاری مصیبتوں کے دن ختم

ہونے والے ہیں۔ تم بے دھڑک کل اُس کے ساتھ جاؤ اور وہ جیسا کہے، ویسے کرو۔"

میں نے کہا۔ "فادر! یہاں تو مجھ پر آپ کی دُعا کا اثر تھا اور میں اُن خونی عورتوں کے منحوس جادو سے بچا ہوا تھا۔ پتہ نہیں اُس عورت اُرملا کے ساتھ یہاں سے اتنی دور راجستھان میں جانے کے بعد آپ کی دُعا کا اثر رہتا ہے یا نہیں۔"

فادر فرانسس نے کہا۔

"تم اُس عورت کی خفیہ طاقتوں سے واقف نہیں ہو۔ اگر تم پر میری دُعا کا اثر ایک خاص فاصلے پر جا کر ختم بھی ہو گیا تو اُس عورت کی خفیہ طاقت کا اثر تمہاری حفاظت کرے گا۔ تم بے فکر ہو کر اُس کے ساتھ جاؤ!"

رات کو سرسوتی میرا حال پوچھنے آئی تو اُس کو فادر فرانسس نے ساری بات بیان کر دی۔ سرسوتی پہلے تو خوش ہوئی کہ پراسرار عورت میری مدد پر رضا مند ہو گئی ہے، پھر اُداس ہو کر بولی۔

"مگر فادر! اگر سندھیا اور کانچی کا جادو ٹونہ یہاں سے نکلنے کے بعد حرکت میں آ گیا تو شیراز کی جان کو خطرہ ہوگا۔"

فادر فرانسس نے اُسے سمجھایا کہ ایسا نہیں ہوگا۔

"جب تک شیراز اُس عورت اُرملا کے ساتھ ہوگا، اُس کی جان کی دشمن عورتیں اُس کا بال بھی بیکا نہیں کر سکیں گی۔"

سرسوتی نے مجھ سے پوچھا۔

"اُرملا نے یہ نہیں بتایا کہ تمہیں کتنے دن اُس کے ساتھ رہنا ہوگا؟"

میں نے کہا۔

"اُس نے یہ نہیں بتایا۔ بس! یہی کہا ہے کہ میرے ساتھ میری حویلی میں چلو۔"

فادر فرانسس کہنے لگے۔

"اُس کے آباؤ اجداد کی پرانی حویلی راجستھان کے شہر جے پور کے نواح میں ہے۔ میں نے تمہیں بتایا تھا نا کہ اُس عورت کا تعلق راجستھان کے پرانے راجوں مہاراجوں کے خاندان سے ہے اور یہ پڑھی لکھی خاتون ہے۔ تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اُرملا سندھیا اور کانچی کی طرح بری اور چڑیل قسم کی عورت نہیں ہے۔ اور پھر"

راز کی مدد کر کے اس کے احسان کا بدلہ بھی اُتارنا چاہتی ہے جو اُس کے ہندو دھرم کے مطابق اُس کا فرض بن چکا ہے۔ اگر اُس نے احسان کا بدلہ نہ اُتارا تو اُس کو پاپ لگے گا۔ ایسا پاپ جو اگلے جنم تک اُس کا پیچھا کرے گا۔"

مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ سرسوتی میرے اس طرح اچانک ایک عورت کے ساتھ چلے جانے سے پریشان ہو گئی ہے۔ اُس وقت مجھے پہلی بار محسوس ہوا کہ اس عورت سرسوتی کو شاید مجھ سے پریم ہو گیا ہے۔ مگر مجھے تو ہر حالت میں دوسرے دن اُرملا کے ساتھ جانا تھا۔ سرسوتی اُس رات فادر فرانسس کی خانقاہ میں ہی رہی۔ رات کا کھانا ہم نے اکٹھے کھایا۔ کھانا کھانے کے بعد فادر فرانسس عبادت میں مصروف ہو گئے۔ سرسوتی مجھے ساتھ لے کر خانقاہ کے پیچھے چھوٹے سے باغیچے میں آ گئی۔ یہ چھوٹا سا باغیچہ تھا جس پر فادر فرانسس نے ایک طرف انگور کی بیل کا چھوٹا سا چھپر ڈال رکھا تھا۔ رات کے دس بجے کا عمل ہوگا۔ موسم سرد ہو چکا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے اکتوبر یا نومبر کا مہینہ تھا۔ پنجاب میں تو اس موسم میں سردی شروع ہو چکی ہوتی ہے، جنوبی ہندوستان میں اتنی سردی نہیں ہوتی۔ وسطی ہندوستان یعنی بھوپال، جھانسی میں اور مشرق کی جانب بہار میں ضرور سردی ہوتی ہے۔ ہندوستان کے مشرق میں بہار سے آگے بنگال اور مغرب میں جھانسی بھوپال سے آگے بمبئی تک جاتے جاتے یہ سردی ختم ہو جاتی ہے اور موسم معتدل ہو جاتا ہے۔ ہم وسطی ہند کے علاقے میں تھے۔ چنانچہ رات سرد تھی۔ اور اوس پڑ رہی تھی۔ ہم انگور کی سوکھی بیل کے سائے میں تھے جس کی وجہ سے اوس سے محفوظ تھے۔ سردی ویسے بھی خوشگوار تھی اور مجھے اچھی لگ رہی تھی۔ کھلے نیلے آسمان پر ستارے چمک رہے تھے۔ سرسوتی میرے ساتھ چھوٹے سے بنچ پر بیٹھی تھی۔ وہ محویت کے عالم میں آسمان پر چمکتے ستاروں کو تک رہی تھی۔ ایک پرسکون اور گہری خاموشی نے ہمیں اپنی آغوش میں لے رکھا تھا۔

مجھے سرسوتی کی خاموشی سے اُلجھن سی ہو رہی تھی۔ میں نے بات کرنے کی غرض سے کہا۔ "میرا خیال ہے مجھے زیادہ دن نہیں لگیں گے وہاں۔"

"زیادہ دن لگ بھی گئے تو کیا فرق پڑے گا؟"

اس جملے میں چھپی ہوئی طنز کو میں سمجھ گیا تھا۔ مگر میں انجان بنا رہا اور کہا۔

"مجھے ضرور فرق پڑے گا۔ مجھے اپنے گھر سے بھاگ کر آئے بہت دن ہو گئے ہیں۔ میری پڑھائی کا بھی حرج ہو رہا ہے۔"

سرسوتی نے میری بات کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

"یہ عورت...... میرا مطلب ہے یہ لڑکی اُرملا دیکھنے میں کیسی ہے؟"

سرسوتی مجھ سے کیا کہلوانا چاہتی تھی؟ میں اسے بخوبی سمجھتا تھا۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ سرسوتی کے بارے میں میرے دل کے جذبات وہ نہیں تھے جو اُرملا کے بارے میں تھے۔ سرسوتی کوئی بدصورت نہیں تھی۔ وہ بھی خوبصورت تھی مگر اُس کو دیکھ کر میرے دل کی وہ حالت نہیں ہوئی تھی جو پراسرار لڑکی اُرملا کو دیکھ کر ہوئی تھی۔ میں سرسوتی کی عزت کرتا تھا مگر اُس سے محبت نہیں کرتا تھا۔ جبکہ اُرملا سے مجھے محبت ہو گئی تھی اور میرے لئے اُس سے جدا ہونا ایک بہت بڑی پرابلم بن چکا تھا۔ میں اُس سے جدا نہیں ہونا چاہتا تھا۔ مگر مجھے معلوم تھا کہ ایک دن مجھے اُس سے ضرور جدا ہونا ہے۔ سرسوتی نیم وا آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ ستاروں کی روشنی میں اُس کا چہرہ زیادہ خوبصورت اور پراسرار لگ رہا تھا۔ میں نے کہا۔

"بس! نارمل سی ہے۔ تم سے زیادہ خوبصورت نہیں ہے۔"

میرا خیال تھا کہ سرسوتی اپنی تعریف سے خوش ہو گی۔ لیکن ایسا نہ ہوا۔ کہنے لگی۔

"تم جھوٹ بول رہے ہو۔ تمہیں جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے؟ تم کیوں نہیں کہتے کہ وہ مجھ سے زیادہ خوبصورت ہے، اور یہ کہ تم اُس سے پریم کرتے ہو۔"

میں سرسوتی کی اس بے باکی پر حیران رہ گیا۔ اگرچہ اُس نے سچ بات کہی تھی مگر اُسے میرے سامنے ایسی بات نہیں کرنی چاہئے تھی۔ میں نے جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو سرسوتی؟ میں اُس لڑکی سے کیسے پریم کر سکتا ہوں؟ اور پھر میں جن پریشانیوں اور زندگی اور موت کی کشمکش میں سے گزر رہا ہوں اُس میں پریم کرنے کا ہوش کسے رہتا ہے؟"

سرسوتی نے گہرا سانس لے کر کہا۔

"میں کچھ نہیں جانتی۔ لیکن اتنا ضرور جانتی ہوں کہ تم اس لڑکی اُرملا سے پیار کرنے لگے ہو اور ایک بار تم اُس کے ساتھ جے پور گئے تو پھر واپس نہیں آؤ گے۔"

سرسوتی کے دل میں ایک خیال بیٹھ گیا تھا۔ اس خیال کو اُس کے دل سے نکالنا مشکل تھا۔ مجھے تو اس بات سے بھی کچھ خوف سا محسوس ہونے لگا تھا کہ سرسوتی مجھ سے پیار کرنے لگی ہے۔ یہاں میں ایک بات کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں۔ وہ میری نوجوانی، نوخیزی کا زمانہ تھا اور میں اُس زمانے میں بڑا صحت مند اور خوبصورت ہوا کرتا تھا۔ میرے شانے چوڑے، رنگ گورا اور جسم ورزشی تھا۔ پنجابی نوجوانوں کو ویسے بھی جنوبی اور جنوب مشرقی اور جنوب مغربی علاقوں میں عورتیں بہت پسند کرتی تھیں۔ میں نے ایسا ہوتے دیکھا بھی ہے اور مجھے اس کا تجربہ بھی ہو چکا ہے۔ سرسوتی اگر مجھ سے پریم کرنے لگی تھی تو مجھے اس پر کوئی خاص تعجب نہیں ہوا تھا۔ مجھے تو یہ فکر لگ گئی تھی کہ کہیں حسد یا رقابت میں آ کر سرسوتی کوئی ایسی حرکت نہ کر بیٹھے جو میرے لئے مصیبت کا باعث بن جائے۔ میرے لئے مناسب یہی تھا کہ اُس کے جذبہ رقابت کو ہوا نہ دوں۔ چنانچہ میں نے کہا۔

"سرسوتی! تمہیں میرے بارے میں غلط فہمی ہوئی ہے۔ یقین کرو! میں اُرملا سے پریم نہیں کرتا۔ تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں اپنی غرض کی وجہ سے اُس کے ساتھ جا رہا ہوں۔ اپنی زندگی کا اہم ترین مقصد پورا کرنے اُس کے ساتھ جا رہا ہوں۔ اور جیسے ہی میرا مقصد پورا ہو گیا میں واپس آ جاؤں گا۔"

سرسوتی کو اور زیادہ زیر دام لانے کے لئے میں نے کہا۔

"اور سرسوتی! ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا۔ اگر زندگی میں کبھی کسی عورت سے پریم کرنے کا خیال میرے دل میں پیدا ہوا تو وہ تم ہو گی۔ اور تمہارے سوا دوسرا کوئی نہیں ہو گا۔"

میرا وار بڑا کارگر ثابت ہوا۔ سرسوتی نے بے اختیار ہو کر میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر چوم لیا اور بولی۔

"بس! مجھے اس سے زیادہ اور کچھ نہیں چاہئے۔ لیکن جانے سے پہلے تمہیں مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہو گا۔"

"میں تمہارے ساتھ ہر وعدہ کرنے کو تیار ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

سرسوتی نے کہا۔

''وعدہ کرو! کہ تم جے پور میں زیادہ دن نہیں لگاؤ گے۔ اور وہاں سے سیدھا میرے پاس آؤ گے۔''

میں اُس سے ایسا کوئی وعدہ نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن عقلمندی کا تقاضہ یہی تھا کہ میں سرسوتی سے ایسا وعدہ کرلوں۔ پس! میں نے کہا۔

''میں پکا وعدہ کرتا ہوں کہ اپنا مقصد پورا ہو جانے کے بعد میں سیدھا تمہارے پاس آؤں گا۔''

سرسوتی خوش ہوگئی۔ اور اُس نے بڑی گرمجوشی سے مجھے اپنے ساتھ لگا لیا۔ جتنی دیر وہ مجھ سے لگی رہی میں دل میں یہی دُعا مانگتا رہا کہ یا خدا! مجھے اس عورت کی محبت اور شر، دونوں سے محفوظ رکھنا! میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ سرسوتی کو معلوم تھا کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں لیکن اُس نے میرے جھوٹ کو سچ بنا لیا تھا۔ عورت محبت میں جھوٹ کو بھی سچ سمجھ لیتی ہے۔ وہ جان بوجھ کر دھوکا کھاتی ہے۔

اگلے دن صبح صبح میں فادر فرانسس سے اجازت اور اُن کی دُعا لے کر اُرملا کے پرانے بنگلے کی طرف چل پڑا۔ سرسوتی نے مجھے اُداس نظروں سے رُخصت کیا۔ جس وقت میں چلا تھا اُس وقت ابھی اندھیرا تھا۔ پہلے جنگل کو عبور کرنے کے بعد دوسرے جنگل میں داخل ہوا تو دن کا اُجالا ہو گیا تھا اور درختوں پر پرندے چہچہا رہے تھے۔ اُرملا میرا انتظار کر رہی تھی۔ پرانے بنگلے کے احاطے میں ایک بند گھوڑا گاڑی کھڑی تھی۔ خدا جانے وہ کہاں سے آگئی تھی؟ اُرملا اپنے کمرے میں تیار ہو کر بیٹھی تھی۔ مجھے دیکھ کر کہنے لگی۔

''مجھے ڈر تھا تم دیر نہ کرو۔ ہمیں جس سٹیشن سے ٹرین پکڑنی ہے وہاں گاڑیاں دو تین منٹ سے زیادہ نہیں ٹھہرتیں۔''

میں اور اُرملا بند گھوڑا گاڑی میں بیٹھ گئے۔ اُس کا بوڑھا ملازم کوچوان کی سیٹ پر بیٹھ گیا اور گھوڑا گاڑی اپنی منزل کی طرف چل پڑی۔

بند گھوڑا گاڑی کی دونوں جانب چوکور کھڑکیاں تھیں جن میں سے باہر کا منظر نظر آرہا تھا۔ جنگل کے جس علاقے میں سے ہم گزر رہے تھے وہ میرے لئے اجنبی تھا۔ چھوٹی پہاڑیاں پیچھے رہ گئیں اور میدانی علاقہ شروع ہو گیا۔ اُرملا کہنے لگی۔

''میں ٹھاکر محل میں تمہارا تعارف اشونی کمار کے نام سے کراؤں گی۔ ایسا کرنا

ضروری ہے۔ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟''

میں نے جواب دیا۔ ''بالکل نہیں۔''

وہ خاموش ہوگئی۔ اُرملا کے لباس میں سے ایسی خوشبو آرہی تھی جو شمالی ہند کے مندروں میں پوجا پاٹھ کے وقت آیا کرتی تھی۔ اُس میں گیندے اور چنبیلی کے پھولوں کی ہلکی ہلکی مہک بھی تھی۔ گیندا ہندو مندروں میں پوجا کا پھول ہے اسے سورج کی علامت سمجھا جاتا ہے۔

میں نے اُرملا سے پوچھا۔ ''یہ ریلوے سٹیشن کون سا ہے جہاں ہم جا رہے ہیں؟''

اُس نے کسی سٹیشن کا نام لیا جو میں بھول گیا ہوں۔ کہنے لگی۔

''ہم پہلے گوالیار جائیں گے، وہاں سے آگرہ جائیں گے۔ آگرہ سے ہم جے پور جانے والی گاڑی پکڑیں گے۔ اس طرح ہم شام کے وقت جے پور پہنچیں گے۔''

یہ سفر کافی لمبا تھا۔ میں اس کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ ہمیں ایک مختصر سے قصباتی سٹیشن پر چھوڑ کر بوڑھا ملازم گھوڑا گاڑی واپس لے گیا۔ جانے سے پہلے اُس نے جے پور کے دو ٹکٹ لا کر ہمیں دے دیئے تھے۔ اُس سٹیشن سے ہم ایک ٹرین میں بیٹھ کر آگرہ ریلوے سٹیشن پر پہنچے جہاں سے ہمیں گوالیار والی گاڑی مل گئی۔ گوالیار سے پھر ہم نے گاڑی تبدیل کی اور جے پور والی ٹرین میں بیٹھ کر جے پور روانہ ہو گئے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے آگرہ پہنچنے کے بعد میں نے اُرملا سے کہا۔

''میں بیٹھے بیٹھے تھک گیا ہوں۔ پلیٹ فارم پر تھوڑی دیر چل پھر لوں۔ ابھی گاڑی آنے میں دیر ہے۔''

اُرملا نے کہا۔

''میں تمہیں اس کی اجازت نہیں دوں گی۔ تم اس وقت بھی شیطانی عورتوں کے ایک جادو کی زد میں ہو۔ اگر تم میرے حصار کے دائرے سے ذرا باہر نکلے تو پھر میں تمہاری زندگی کی ذمہ دار نہیں ہوں گی۔''

میں نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا۔

ہم شام کے وقت جے پور پہنچے۔ سٹیشن کے باہر ایک لمبی موٹر کار ہمیں لینے آئی ہوئی تھی۔ ڈرائیور نے وردی پہنی ہوئی تھی اور سر پر راجستھانی سرخ پگڑی باندھ رکھی تھی۔

اُرملا نے کسی طریقے سے اپنے آنے کی اطلاع ٹھاکر محل میں پہلے سے پہنچا دی تھی۔ ہم گاڑی میں بیٹھ گئے۔ گاڑی جے پور کی سڑکوں پر سے ہوتی ہوئی شہر سے باہر نکل آئی۔ نیم صحرائی علاقہ شروع ہو گیا تھا۔ آسمان پر مغرب کی جانب شام کی سرخی گہری ہوتی جا رہی تھی۔ دُور دُور کھیت بھی تھے، ریتلے میدان بھی تھے۔ گاڑی ایک پکی سڑک پر جا رہی تھی۔ ایک جگہ دائیں جانب چھوٹی سڑک نکلتی تھی۔ گاڑی اُس طرف مُڑ گئی۔ سامنے درختوں کے ایک مختصر سے جھنڈ کے پاس ایک دو منزلہ عمارت دکھائی دی۔ یہی ٹھاکر محل تھا۔ عمارت پرانے زمانے کی تھی۔ عمارت کے پھاٹک پر ایک پہریدار بیٹھا تھا۔ گاڑی کو آتا دیکھ کر اُس نے پھاٹک جلدی سے کھول دیا۔ گاڑی اُس کے قریب سے گزری تو اُس نے ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا۔ ڈرائیور نے عمارت کے پرانی وضع کے دروازے کے آگے گاڑی کھڑی کی اور جلدی سے اُتر کر دروازہ کھول دیا۔

میں اُرملا کے ساتھ گاڑی سے باہر آ گیا۔ ہم اندر داخل ہو گئے۔ یہ قدیم وضع کی محل نما حویلی تھی۔ ڈیوڑھی سے گزرنے کے بعد ایک کشادہ دالان تھا جس کے وسط میں فوارہ لگا تھا جس کے حوض میں گھاس اُگ رہی تھی۔ لگتا تھا ایک عرصے سے بند پڑا ہے۔ ہم ایک بڑے ہال کمرے میں آ گئے۔ اُونچی چھت، بیل بوٹوں والے ستون، دیواروں پر مینا کاری کی گئی تھی۔ فرش گرد آلود پرانے قالین سے ڈھکا ہوا تھا۔ دیواروں کے ساتھ پرانی وضع کی بھاری بھاری کرسیاں لگی تھیں۔ سنگ مرمر کی لمبوتری میز کی دونوں جانب ملکہ وکٹوریہ کے زمانے کے بھدے اور بھاری بھرکم صوفے بچھے ہوئے تھے۔ دروازوں پر پردے گرے ہوئے تھے۔ اُرملا نے مجھے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور بولی۔

''تم یہاں بیٹھو! میں تھوڑی دیر میں آتی ہوں۔''

وہ ایک دروازے کا پردہ ہٹا کر چلی گئی۔ ہال کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ یہ خاموشی ایسی لگتی تھی جیسے صدیوں سے چھائی ہوئی ہو۔ لال راجستھانی پگڑی والا ادھیڑ عمر خادم میرے آگے شربت کا گلاس رکھ کر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد ہی اُرملا آ گئی۔

اُس نے ہلکے فیروزی رنگ کی ریشمی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ کانوں میں فیروزی رنگ کے بندے چمک رہے تھے۔ وہ میرے پاس صوفے پر بیٹھ گئی۔ کہنے لگی۔

''یہ ہماری آبائی حویلی ہے۔ ہمارے پرکھوں کی یہی ایک نشانی رہ گئی ہے۔ ہمارے

دیوان جی نے حویلی کا انتظام سنبھالا ہوا ہے۔''

میں نے پوچھا۔ ''تمہارے ماتا پتا بھی یہیں رہتے ہوں گے؟''

اُرملا بولی۔ ''میرے ماتا پتا سورگ باش ہو چکے ہیں۔ جائیداد کا بٹوارہ ہو گیا۔ میرے حصے میں یہ حویلی اور کچھ زرعی زمین آئی ہے۔ اسی سے گزارہ ہوتا ہے۔ مگر تمہیں ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہونی چاہئے۔ میں نے تمہارے لئے ایک کمرہ ٹھیک کروا دیا ہے۔ تم چل کر اشنان کر کے کپڑے تبدیل کر لو!''

ہم وہاں سے اُٹھ کر ایک لمبی، خاموش اور ٹھنڈی راہداری میں سے ہوتے ہوئے ایک کمرے میں آ گئے۔ چھوٹا سا کمرہ تھا۔ کھڑکی کے پاس پلنگ پر بستر لگا تھا۔

اُرملا نے کہا۔ ''تمہارے کپڑے پلنگ پر پڑے ہیں۔ وہ سامنے غسل خانہ ہے۔ میں کچھ دیر بعد آؤں گی۔''

وہ چلی گئی۔ پلنگ پر تہہ کیا ہوا ایک سفید کھدر کا کرتہ پاجامہ رکھا تھا۔ میں نے غسل خانے میں جا کر غسل کیا، کپڑے بدلے اور صوفے پر بیٹھ کر تپائی پر پڑا اخبار اُٹھا کر دیکھنے لگا۔ انگریزی کا اخبار تھا۔ تاریخ پڑھی تو معلوم ہوا کہ نومبر کا مہینہ گزر رہا ہے۔ اخبار کی خبریں پڑھ کر معلوم ہوا کہ ہندوستان میں پاکستان کی تحریک زوروں پر ہے۔ کانگریس پاکستان کی مخالفت کر رہی ہے اور انگریز مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان کسی نقطے پر مفاہمت کرانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

رات کا کھانا میں نے اور اُرملا نے اکٹھے بیٹھ کر کھایا۔ کھانا کھانے کے بعد اُس نے کہا۔ ''اب تم آرام کرو! باقی باتیں کل ہوں گی۔''

اُس کے جانے کے بعد میں پلنگ پر لیٹ کر سوچنے لگا کہ کیا یہ لڑکی اُرملا میری مصیبت اور میرے دُکھ درد کا علاج کر سکے گی؟ اس کے ساتھ جو میری جذباتی وابستگی ہو گئی تھی وہ اپنی جگہ پر تھی لیکن میں جس عذاب میں مبتلا تھا اُس کی ذہنی اذیت اپنی جگہ پر تھی۔ کبھی لگتا یہ لڑکی واقعی کوئی خفیہ طاقت رکھتی ہے اور یہ مجھے سندھیا اور کانچی کی لائی ہوئی مصیبت سے نجات دلا دے گی۔ اور کبھی لگتا کہ اس سے کچھ نہیں ہو سکے گا اور میں آج نہیں تو کل دوبارہ اُن خونخوار شیطانی عورتوں کے چنگل میں پھنس جاؤں گا جو مجھے اپنے دیوتا کی بھینٹ چڑھا دیں گی۔

دل میں ہر قسم کے اندیشے پیدا ہو رہے تھے۔ اپنا شہر، اپنا گھر بھی یاد آتا تھا۔ مگر بڑی آسانی سے ٹرین میں بیٹھ کر اپنے شہر جا سکتا تھا۔ لیکن مجھے نظر نہ آنے والی زنجیروں میں جکڑ کر ایک ایسی لوہے کی چار دیواری میں بند کر دیا گیا تھا جو میرے ساتھ ساتھ چلتی تھی اور میں اُس چار دیواری سے باہر نکلنے کی جرات بھی نہیں کر سکتا تھا۔ صحرائی علاقہ ہونے کی وجہ سے رات کو ٹھنڈ ہو گئی تھی۔ میں نے کمبل اُوپر کر لیا، ٹیبل لیمپ بجھا دیا اور آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر نیند کا دُور دُور تک نام و نشان تک نہیں تھا۔ آنکھیں جلنے لگیں۔ پھر ایسا ہوا کہ مجھ پر غنودگی سی طاری ہونے لگی۔ اسی عالم غنودگی میں مجھے ایک آواز سنائی دی۔ یہ کسی عورت کی آواز تھی۔ آواز قریب سے آئی تھی جیسے کوئی میرے پلنگ کے پاس کھڑا ہو۔ میں نے جلدی سے آنکھیں کھول کر دیکھا، کمرے میں ہلکا ہلکا اندھیرا تھا۔ اُس اندھیرے میں مجھے کوئی انسان دکھائی نہ دیا۔

عورت کی آواز پھر آئی...... ''شیراز!''

یہ کانچی کی آواز تھی...... قدرتی طور پر خوف کی ایک سرد لہر میرے جسم میں دوڑ گئی۔ میں خاموش رہا۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ کانچی کی آواز دوبارہ آئی۔

''میں جانتی ہوں تم جاگ رہے ہو اور میری آواز سن رہے ہو۔ تم جو کچھ کر رہے ہو مجھے معلوم ہے۔ تمہیں شاید یہ معلوم نہیں کہ کانچی تمہارا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ یہ عورت تمہیں مجھ سے بچا لے گی؟ یہ تمہاری بھول ہے۔ یہ عورت میرا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ فادر فرانسس، سرسوتی اور اس عورت اُرملا نے تمہارے گرد میرے منتروں سے بچنے کے لئے جو دائرہ کھینچا ہوا ہے وہ بہت جلد کمزور پڑ جائے گا۔ اس کے بعد میں تمہیں لے جاؤں گی اور پھر تمہیں کوئی نہیں بچا سکے گا۔''

میں نے کہا۔ ''کانچی! تم میرے ساتھ ایسا سلوک کیوں کر رہی ہو؟ میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟''

کانچی کی ہنسی کی آواز آئی۔ کہنے لگی۔

''میں حیران ہوں کہ ابھی تک تم یہ بھی نہیں سمجھ سکے کہ تمہارا وجود میرے لئے کتنا ضروری ہو چکا ہے۔ تمہیں دیوی ماتا کی بھینٹ چڑھا کر مجھے اور سندھیا کو دیوتاؤں سے بھی بڑھ کر شکتی ملنے والی ہے۔ تم پر ہم نے بڑی محنت کی ہے۔ ہم تمہیں کیسے چھوڑ سکتی

ہیں؟''

مجھے غصہ آ گیا۔ میں نے کہا۔

''پھر میری ایک بات بھی کان کھول کر سن لو! میرا خدا میرے ساتھ ہے۔ اور اُس نے ہمیشہ کفر پر اسلام کو فتح عطا کی ہے۔ میں ایک خدا اور اُس کے رسول ﷺ کو ماننے والا مسلمان ہوں۔ تم کافر ہو۔ بہت جلد میں تم دونوں کو نیست و نابود کر دوں گا۔

کانچی نے جواب دیا۔

''تم اگر سچے مسلمان ہوتے تو ایسا کر سکتے تھے۔ پھر شاید تم پر ہمارے جادوئی منتروں کا بھی اثر نہ ہوتا۔ لیکن تم سچے مسلمان نہیں ہو۔ تمہارے دل پر گناہ آلود جنسی خواہشات کا غلبہ ہے۔ ان خواہشات نے تمہارے ایمان کو کمزور کر دیا ہے۔ تم اپنی خواہشات پر فتح نہیں پا سکتے، میرا مقابلہ کیسے کرو گے؟ میں جا رہی ہوں۔ میری باتوں پر غور کرنا! وقت آنے پر میں پھر آؤں گی۔''

اس کے بعد دیر تک کمرے میں خاموشی چھائی رہی۔ کانچی جا چکی تھی۔ میں پریشان ہو کر اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ ساری رات اسی پریشانی میں گزر گئی۔ صبح میں نے اُرملا کو بتایا کہ رات کانچی کی آواز پھر آئی تھی۔

''اُس نے مجھے کہا ہے تم نے یعنی اُرملا نے میرے اِردگرد جو حفاظتی حصار کھینچ رکھا ہے وہ بہت جلد ختم ہو جائے گا۔ اور پھر وہ مجھے ماتا دیوی کی بھینٹ چڑھانے کے لئے اٹھا کر لے جائے گی۔''

اُرملا غور سے میری بات سن رہی تھی۔ میں نے کہا۔ ''کانچی نے یہ بھی کہا ہے کہ مجھے اُرملا کی شکتی بھی اس کی گرفت سے نہیں بچا سکے گی۔''

اُرملا خاموش تھی۔ اُس کی خاموشی سے مجھے اُلجھن ہو رہی تھی۔ میں نے کہا۔

''کیا کانچی سچ کہتی تھی؟ کیا واقعی تم بھی مجھے ان خونی عورتوں سے چھٹکارا نہیں دلا سکو گی؟ اگر ایسی بات ہے تو پھر تم کیوں میرے لئے تکلیف اُٹھا رہی ہو؟ بہتر ہے کہ میں اپنے آپ کو قسمت کے حوالے کر دوں اور یہاں سے اپنے شہر چلا جاؤں۔ پھر جو ہو گا دیکھا جائے گا۔''

اُرملا نے آہستہ سے کہا۔

''میری جان بچانے کے بعد تمہاری جان بچانا میرا فرض بن گیا ہے۔ جو کچھ میں تمہارے لئے کرنا چاہتی ہوں مجھے کر لینے دو! اس کے بعد کوئی فیصلہ کرنا۔ ابھی تم نے مجھ سے الگ ہونے کی غلطی کی تو یقین کرو! تمہاری موت یقینی ہے۔ پھر شاید میں بھی تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکوں گی۔''

مجھے تھوڑا سا اطمینان ہو گیا کہ شاید یہ عورت کچھ کر گزرے اور مجھے پھر سے نئی زندگی مل جائے۔

اُرملا اور میں اس وقت ناشتہ کر رہے تھے۔ کہنے لگی۔ ''تم آج رات میرے ساتھ ایک جگہ جاؤ گے اور جیسا میں کہوں گی، ویسا کرو گے۔''

میں تو پھنس چکا تھا، اور اُس عورت اُرملا کے رحم وکرم پر تھا۔ کیا جواب دیتا؟ خاموش رہا۔ جان بچانے کی فکر اور ایک اذیت ناک موت کے خوف نے میرے دل میں اُرملا سے محبت کے جذبات کی آگ پر راکھ ڈال دی تھی۔ اب اس آگ میں سے کوئی شعلہ بلند نہیں ہوتا تھا، صرف دُھواں نکلتا تھا جو اس بات کی علامت تھا کہ یہاں آگ موجود ہے۔

شام کے وقت وہ میرے کمرے میں آ گئی۔ میں پلنگ پر نیم دراز کھڑکی کی سلاخوں میں سے باہر غروبِ آفتاب کا منظر دیکھ رہا تھا۔ جب سے میں اس حویلی نما محل یا محل نما حویلی میں آیا تھا ایک لمحے کے لئے مجھے باہر جانے کی اُرملا نے اجازت نہیں دی تھی۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میں ایک قید خانے سے نکل کر دوسرے قید خانے میں آ گیا ہوں۔

اُرملا کو دیکھ کر اُس کے حسین چہرے کے دیدار سے میرے بے چین جذبات کو تھوڑا سکون ضرور ملا۔ میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اُرملا میرے قریب رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اُس نے سبز رنگ کی ریشمی ساڑھی پہنی ہوئی تھی اور بالوں میں ایک طرف گیندے کا گولڈن پھول سج رہا تھا۔ کہنے لگی۔

''رات کو میں تمہیں لے کر جہاں جا رہی ہوں، وہ میرے لئے بڑا پوتر استھان ہے۔ اُس کا نام کلش منڈل ہے۔ وہاں ایک ایسی عورت کی ہڈیاں کانسی کے مٹکے میں ڈال کر دفن کی گئی ہیں جسے میں اپنی گورو مانتی تھی۔ اُس کا نام رام جنی تھا۔ میں نے یجروید اور اتھروید کے سارے خفیہ منتر اُس سے سیکھے تھے۔ تم پر جن دو عورتوں نے جادو

باہے، اُنہوں نے چاروں ویدوں کا ھون کیا ہوا ہے۔ اُن کے پاس مجھ سے زیادہ ت ہے۔ اگر مجھے تمہارا احسان نہ اُتارنا ہوتا تو میں تمہیں نہ تو اپنے جنگل والے بنگلے آنے کی اجازت دیتی اور نہ اپنے ساتھ یہاں لاتی۔ تمہیں وہیں کہہ دیتی کہ میں ہاری کوئی مدد نہیں کر سکتی۔ لیکن تمہارے احسان نے مجھے باندھ کر رکھ دیا ہے اور ہاری مدد کرنا میرا فرض بن گیا ہے۔ میری گورو رام جنی کی خفیہ طاقت کا مقابلہ کوئی نہیں ر سکتا۔''

مجھ سے صبر نہ ہو سکا۔ میں اُس کی بات کاٹتے ہوئے بول پڑا۔

''مگر تمہاری گورو تو مر چکی ہے۔ وہ میری مدد کیسے کرے گی؟''

اُرملا کہنے لگی۔

''میری گورو رام جنی اگرچہ مر چکی ہے۔ مگر میرے بلانے پر اُس کی آتما وہاں آ جاتی ہے اور مجھ سے باتیں کرتی ہے۔ مجھے پورا وشواش ہے کہ وہ میرے کہنے پر تمہاری مدد کو یار ہو جائے گی اور تمہیں دونوں عورتوں کے عذاب سے مکتی مل جائے گی۔''

مجھے اُرملا کی باتوں پر کچھ یقین آیا، کچھ نہ آیا۔ تذبذب کی حالت میں اُس کے سامنے بیٹھا رہا۔ اُرملا کہہ رہی تھی۔

''تم آج رات کھانا نہیں کھاؤ گے، صرف پانی پیو گے۔ ابھی میں تمہارے لئے ئے بھجواتی ہوں۔ صرف خالی چائے ہو گی۔ تمہیں کل صبح تک کچھ کھانے سے پرہیز کرنا گا۔''

میں نے بے دلی سے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔''

''میں رات گہری ہوتے ہی آ جاؤں گی۔ تم تیار رہنا۔''

میں نے پوچھا۔ ''یہ کلش منڈل کہاں پر ہے؟''

اُس نے کہا۔ ''زیادہ دُور نہیں ہے۔''

وہ چلی گئی۔ اُس کے جانے کے دس پندرہ منٹ بعد ایک سرخ پگڑ والا نوکر مجھے ئے دے گیا۔ میں آہستہ آہستہ چائے پینے لگا۔ کھڑکی کی سلاخوں کے باہر شام کا ندھیرا پھیل رہا تھا۔ شام کے وقت باہر اور زیادہ سکوت طاری ہو گیا تھا۔ لگتا تھا کہ ہاں کبھی کوئی نہیں بولا۔ کسی پرندے تک کے بولنے کی صدا نہیں آ رہی تھی۔

اچانک کسی کی سرگوشی کی آواز آئی...... میں نے چونک کر پیچھے دیکھا۔ پیچھے کوئی نہیں تھا۔ کمرہ خالی تھا۔ سرگوشی کی آواز دوبارہ سنائی دی۔

''تمہیں یہ عورت جہاں لے جا رہی ہے وہاں موت تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ وہاں مت جانا۔''

یہ کانچی کی آواز تھی۔ میں نے پیالی میز پر رکھ دی اور کہا۔

''وہاں میری موت نہیں، تمہاری موت تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ یہ عورت میری دوست ہے، میری ہمدرد ہے۔ یہ مجھے تمہارے پھندے سے آزاد کروا رہی ہے۔ آج رات گزر جانے کے بعد میں تمہاری قید سے ہمیشہ کے لئے آزاد ہو جاؤں گا۔''

کانچی کی آواز سانپ کی پھنکار جیسی ہو گئی۔ کہنے لگی۔

''یہ عورت تو کچھ بھی نہیں۔ اس کی گورو رام جی بھی میری طاقت کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ جو عورت خود مر چکی ہے وہ تمہاری کیا مدد کرے گی؟ میں تمہیں ایک بار پھر خبردار کرتی ہوں اُس عورت اُرملا کے ساتھ کلش منڈل نہ جانا! ورنہ ساری زندگی پچھتاؤ گے۔''

میرا جی چاہا کہ کانچی کو پنجابی میں گالیاں دُوں۔ مگر میں نے صرف اتنا ہی کہا۔

''کانچی! دفع ہو جاؤ۔''

کانچی کا ایک قہقہہ بلند ہوا جو آہستہ آہستہ رات کی خاموشی میں گم ہو گیا۔ یہ شیطان صفت عورت مجھے پریشان کر گئی تھی۔ خوامخواہ میرے دل میں وہم پیدا ہو گیا تھا کہ اگر اُرملا کی گورو رام جی بھی میری مدد نہ کر سکی تو میرا کیا بنے گا؟ یہ بات بھی میرے ایمان کی کمزوری کی دلیل تھی۔ مجھے خدا پر بھروسہ کرنا چاہئے تھا۔ کبھی ایسا ہوتا کہ میرا خدا کی ذات پر توکل چٹان کی طرح مضبوط اور ناقابل شکست ہو جاتا اور کبھی میرے دل میں شکوک و شبہات اُبھرنے لگتے اور میرا توکل کمزور پڑنے لگتا۔

اُرملا نے اپنے نوکر کے ہاتھ مجھے ایک چھوٹا ٹائم پیس بھجوا دیا تھا۔ اُس ٹائم پیس پ رات کے نو بجنے میں دس منٹ باقی تھے کہ کمرے کے دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ میں سنبھل کر بیٹھ گیا اور کہا۔

''آ جاؤ!''

اُرملا اندر آ گئی۔ وہ خاکی پتلون اور بش شرٹ میں تھی اور کندھے پر تھیلا لٹکا ہوا تھا۔

اُس نے پوچھا۔ ''تم تیار ہو؟''

میں نے کہا۔ ''ہاں!''

''تو پھر چلو!''

میں اُس کے ساتھ کمرے سے نکل گیا۔

ہم حویلی سے باہر آئے تو باہر ایک جیپ کھڑی تھی۔ اُرملا نے تھیلا کندھے سے اُتار کر جیپ میں رکھا، خود اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ مجھے ساتھ والی سیٹ پر بٹھایا، جیپ کو سٹارٹ کیا اور جیپ ایک طرف روانہ ہو گئی۔ آسمان پر ستارے جھلملا رہے تھے۔ صحرا کا آسمان اگر بادل نہ ہوں تو رات کے وقت گہرا نیلا اور نکھرا ہوتا ہے۔ اور ستاروں کی چمک دمک شہروں کی نسبت دوگنا زیادہ ہوتی ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ستاروں کی چمک جب صحرائی ریت کے ذروں پر پڑتی ہے تو وہ بھی چمک اُٹھتے ہیں اور صحرائی رات روشن روشن سی ہوتی ہے۔

جیپ ریت پر چلی جا رہی تھی۔ یہ کوئی باقاعدہ سڑک نہیں تھی۔ ریت کا کھلا میدان تھا۔ کہیں کہیں جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔ کیکر اور ببول کے اِکا دُکا درخت ستاروں کی روشنی میں کہیں کہیں سر جھکائے خاموش کھڑے تھے۔ اُرملا خاموش تھی۔ میں بھی خاموش تھا۔ شام کو کانچی نے آ کر مجھ سے جو باتیں کی تھیں میں نے اُن کا ذکر کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ کسی وقت خیال ضرور آتا تھا کہ اُرملا نے خود اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ کانچی اور سندھیا کی ویدک طاقت مجھ سے زیادہ ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کلش منڈل پہنچنے سے پہلے شیطانی عورتیں ہم پر حملہ آور ہو جائیں۔ پھر خیال آتا کہ وہ ایسا نہیں کر سکتیں۔ اگر ایسا کر سکتیں تو اب تک وہ میرے ساتھ اُرملا کو بھی ختم کر چکی ہوتیں۔

جیپ ستاروں کی روشنی میں کھلے صحرا میں دوڑتی چلی جا رہی تھی۔ صحرا میں کچھ اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ ہم نے کتنا سفر طے کر لیا ہے؟ میرا خیال ہے کہ آدھا گھنٹہ تو ضرور گزر گیا ہو گا۔ اب دائیں بائیں دُور دُور چھوٹے بڑے صحرائی ٹیلے نظر آنے لگے تھے۔ میں نے اس خاموشی کو توڑتے ہوئے اُرملا سے پوچھا۔

''یہ ریت کے ٹیلے نظر آ رہے ہیں نا؟'' اُرملا نے کہا۔ ''ان میں کچھ ریت کے ٹیلے ہیں اور کچھ پتھریلی خشک پہاڑیاں ہیں۔''

ہم پھر خاموش ہو گئے۔ صحرا کی ریت سخت ہو گئی تھی۔ اُرملا نے جیپ کی رفتار تیز کر دی۔ جیپ اُسی طرف جا رہی تھی جس طرف چھوٹے چھوٹے ریت کے ٹیلے تھے۔ ان ٹیلوں کے قریب آ کر جیپ ایک طرف گھوم گئی۔ اُرملا نے جیپ کی رفتار کم کر دی تھی۔ ایک ٹیلے کے پاس جا کر جیپ اُس نے روک دی اور بولی۔

''گورو رام جی کا کلش منڈل ٹیلے کے اُوپر ہے۔''

یہ ٹیلا پتھریلی چھوٹی پہاڑی تھی۔ ایک طرف ڈھلان میں اُوپر جانے کا راستہ بنا ہوا تھا۔ اُرملا نے تھیلا کندھے پر ڈال رکھا تھا۔ میں اُس کے پیچھے چڑھائی چڑھ رہا تھا۔ ہم بہت جلد ٹیلے کے اُوپر پہنچ گئے۔ ستاروں کی روشنی میں ٹیلے کی چوٹی پر ہموار زمین پر ایک چھوٹا سا چبوترہ تھا جس پر ایک بُرجی بنی ہوئی تھی۔ میں نے اس قسم کے سادھ دیکھے ہوئے تھے۔ ان جگہوں پر کانسی یا مٹی کے مٹکوں میں ہندو عقیدت مند اپنے گوروؤں یا سنت سادھوؤں کی ہڈیاں چتا کی راکھ میں سے نکال کر دفن کر دیتے تھے تا کہ ان کا ایک نشان بنا رہے اور وہ پوجا کرتے رہیں۔

اُس بُرجی کے نیچے بھی اُرملا کی گورو رام جی کی ہڈیاں دفن تھیں۔ اُرملا نے اپنی جوتی بھی اُتار دی اور مجھے بھی جوتی اُتارنے کو کہا۔ میں نے جوتی اُتار دی۔ اُرملا نے تھیلا کھول کر اُس میں سے گیروے رنگ کی چادر نکالی اور میری طرف دیکھ کر کہا۔

''تم مسلمان ہو...... مسلمان شرم و حیا کا بڑا خیال رکھتے ہیں۔ میں کپڑے بدلنے لگی ہوں۔ تم مجھے کپڑے بدلتے دیکھ بھی لو گے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔ اگر چاہو تو منہ دوسری طرف کر سکتے ہو۔''

میں نے منہ دوسری طرف کر لیا۔ تھوڑی دیر بعد اُرملا نے کہا۔

''اب تم چہرہ میری طرف کر سکتے ہو۔''

میں نے منہ اُس کی طرف کیا تو دیکھا کہ اُس نے بش شرٹ اور پتلون اُتار کر جسم پر گیروی چادر لپیٹ رکھی تھی۔ پھر اُس نے تھیلے میں سے ایک بوتل نکال کر اُسے کھولا۔ بوتل میں پانی تھا۔ یقیناً گنگا دریا کا پانی ہو گا جسے ہندو لوگ بڑا مقدس سمجھتے ہیں۔ اُس نے سادھ کی بُرجی اور چبوترے پر بوتل میں سے پانی نکال کر چھڑکا، بوتل بند کر کے تھیلے میں رکھی اور کہنے لگی۔

''تم میرے دائیں جانب آ کر بیٹھ جاؤ!''

اُرملا کلش منڈل کی بُرجی سے پانچ فٹ کے فاصلے پر بیٹھ گئی۔ میں اُس کی دائیں جانب اُس کی ہدایت کے مطابق چار فٹ کا فاصلہ ڈال کر بیٹھ گیا۔ وہ کچھ دیر ہاتھ باندھے، سر جھکائے منہ ہی منہ میں کچھ پڑھتی رہی۔ اُس کی دھیمی دھیمی بڑبڑاہٹ مجھے سنائی دے رہی تھی۔ وہ کوئی خفیہ منتر پڑھ رہی تھی۔

منتر ختم کر کے اُس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

''میں اپنی گورو رام جی کی آتما کو بلانے والی ہوں۔ مجھے اُس سے تمہارے بارے میں پوچھنا ہے۔ رام جی کی آتما مجھ سے باتیں کرے گی۔ میں اُس کی آواز سنوں گی۔ مگر تم نہیں سن سکو گے۔ جب تک میں اپنی گورو کی آتما سے باتیں کرتی رہوں، تم خاموش رہنا۔''

میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔''

اب اُرملا قدرے اُونچی آواز میں منتر یا اشلوک پڑھنے لگی۔ میں اُس کے پہلو میں خاموش بیٹھا سوچ رہا تھا کہ مجھے میرے گناہوں کی سزا مل رہی ہے۔ اگر میرا ایمان پختہ ہوتا اور اپنے دل میں پیدا ہونے والے گناہ کے ناپاک خیالات کے پیچھے نہ لگتا اور انہیں اپنے دل سے نکال باہر پھینکتا تو کبھی اس عذاب میں مبتلا نہ ہوتا۔ کانچی اور سندھیا کو دیکھ کر میری حرص و ہوس بھی بے لگام ہو گئی تھی اور یہ اُسی کی سزا مجھے مل رہی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان اپنے ہی بنائے ہوئے جال میں پھنستا ہے، کوئی دوسرا اُسے نہیں پھنساتا۔

ہمارے اُوپر ستاروں سے بھرا ہوا کھلا نیلا صحرا کا آسمان تھا۔ فضا میں خنکی بڑھ رہی تھی۔ اُرملا نے مجھے زیادہ اِدھر اُدھر دیکھنے سے منع کیا تھا۔ میں کسی کسی وقت اُرملا کی گورو کی سادھ والی بُرجی کو دیکھ لیتا تھا۔ یہ تجسس بھی تھا کہ کیا واقعی اُرملا کی گورو رام جی کی آتما آ جائے گی؟ اشلوک پڑھتے پڑھتے اُرملا کی آواز دھیمی ہو گئی، پھر وہ خاموش ہو گئی۔ میں نے گوشہ چشم سے اُس کی طرف دیکھا۔ وہ ہاتھ جوڑ کر آہستہ آہستہ آگے پیچھے ہل رہی تھی اور چپ تھی۔ کچھ دیر وہ اسی طرح کرتی رہی، پھر اُس نے آگے پیچھے ہلنا بند کر دیا اور کسی کو مخاطب کر کے بولی۔

"گورو رام جنی کی پوتر آتما کو میں نمسکار کرتی ہوں۔"

شاید رام جنی کی آتما آ گئی تھی۔ مگر مجھے وہ کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ رام جنی کی آتما نے اُرملا سے کچھ کہا جس کے جواب میں اُرملا نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔

"گرو میّا! مجھے شما کر دینا کہ میں نے تمہیں پرلوک سے یہاں آنے کی تکلیف دی۔"

اُرملا کچھ کہتے کہتے رُک گئی۔ شاید رام جنی کی نظر نہ آنے والی آتما نے اُسے کچھ کہا تھا۔ اُس کے جواب میں اُرملا کہنے لگی۔

"گرو میّا! یہ مسلمان ہے، ہندو نہیں ہے۔ میں اسے اپنے ساتھ کبھی نہ لاتی۔ مگر اس کو ساتھ لانا بڑا ضروری تھا۔ اس نے مجھے ڈوبنے سے بچا کر مجھ پر بڑا احسان کیا ہے۔ مجھے میرے جیون کا دان دیا ہے۔ تم خود جانتی ہو کہ اگر میں نے اس کو اس کے احسان کا بدلہ نہ دیا تو مجھے ایسا پاپ لگے گا جو جنم جنم تک میرے ساتھ رہے گا اور میری آتما کو شانتی نہیں ملے گی......"

اُرملا ایک بار پھر کچھ بولتے ہوئے اچانک خاموش ہو گئی۔ ایسے لگ رہا تھا کہ رام جنی کی آتما اُسے کچھ کہہ رہی ہے۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد اُرملا نے کہا۔

"میّا! اس پر ایک بھاری مصیبت آن پڑی ہے۔ اس کو مصیبت سے نکال کر میں اس کے احسان کا بدلہ چکا سکتی ہوں۔ مگر مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ تمہاری مدد کے بغیر میں اس کی مصیبت دُور نہیں کر سکتی۔"

وہ ایک دو سیکنڈ چپ رہنے کے بعد بولی۔

"ہاں گرو میّا! میں تمہیں اس کی مصیبت کے بارے میں ہی بتانے والی ہوں۔"

اور پھر اُرملا نے مختصر مگر بڑے پُر اثر انداز میں رام جنی کی آتما کو میری مصیبت کی داستان ساری کی ساری بیان کر دی اور آخر میں کہا۔

"میّا! میں تمہارے پاس مدد کے لئے آئی ہوں۔ تمہاری مدد سے اس نوجوان کی زندگی بھی سنور جائے گی اور موت کے بعد میری آتما کو بھی شانتی نصیب ہو گی۔"

ایک لمحے کے توقف کے بعد اُرملا نے جلدی سے کہا۔ "میں سن رہی ہوں گرو میّا!"

اس کے بعد اُرملا خاموش ہو گئی۔ اُس کے انداز سے ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے رام جنی کی آتما اُسے کچھ بتا رہی ہے، کچھ سمجھا رہی ہے۔ مجھے آتما کی آواز تو نہیں آ رہی تھی مگر

اُرملا اُسے سن رہی تھی اور وقفے وقفے کے بعد سر ہلا کر ہاتھ باندھ کر کہتی۔

"ٹھیک ہے میّا! ٹھیک ہے۔ میں ایسا ہی کروں گی۔ میں تمہاری آگیا کا پالن کروں گی۔"

پھر اُس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر رام جنی کی بُرجی کو سجدہ کیا اور سر اُٹھا کر تین بار اوم! اوم! اوم! کہا اور پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولی۔

"تم بڑے خوش قسمت ہو۔ رام جنی کی آتما نہ صرف تمہاری مدد کے لئے تیار ہو گئی ہے بلکہ اُس نے وہ طریقہ بھی بتا دیا ہے جس پر عمل کر کے تمہیں سندھیا اور کانچی کے عذاب سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مکتی مل جائے گی۔"

میں بڑا خوش ہوا کہ اب میرے پاپ کٹ جائیں گے۔ میں نے پوچھا۔

"اس کے لئے مجھے کیا کرنا ہو گا اُرملا؟"

ہم چبوترے سے نیچے اُتر آئے تھے۔ اُرملا کپڑے بدل رہی تھی۔ اُس نے بڑی بے حیائی اور بغیر کسی ہچکچاہٹ کے چادر جسم سے اُتار دی تھی اور پتلون اُٹھا کر پہن رہی تھی۔ میں نے منہ دوسری طرف کر لیا۔ میں پہلے ہی اپنے گناہوں کی کافی سزا بھگت چکا تھا اور بھگت رہا تھا۔ میں اپنے گناہوں میں مزید اضافہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اُرملا کہنے لگی۔

"میں کپڑے بدل لوں، پھر تمہیں وہ سب کچھ بتا دُوں گی جو رام جنی کی آتما نے مجھے کہا ہے۔"

مجھ سے صبر نہ ہو سکا۔ میں نے پوچھا۔ "مجھے سندھیا اور کانچی کے جادو سے مکتی مل جائے گی نا؟"

اُرملا بولی۔ "اگر ہم نے گرو میّا کی آتما کی ہدایتوں پر پورا پورا عمل کیا تو تمہیں مکتی مل جائے گی۔ ضرور مل جائے گی۔ اب تم میری طرف منہ کر سکتے ہو۔"

میں نے اپنا چہرہ اُرملا کی طرف موڑ دیا۔ اُس وقت اُرملا اپنی بش شرٹ کے سامنے والے بٹن بند کر رہی تھی۔ میں نے نظریں نیچی کر لیں۔ اب میں ہر قسم کے گناہ سے اپنے آپ کو بچانا چاہتا تھا۔ میں نے دل میں توبہ کر لی تھی اور مجھے معلوم تھا کہ توبہ اسی صورت میں قبول ہوتی ہے جب آدمی اس کے بعد گناہ نہ کرے۔

اُرملا نے کپڑے بدلنے کے بعد تھیلا کندھے پر ڈالا اور کہنے لگی۔

''حویلی میں چل کر تمہیں سب کچھ بتا دُوں گی۔''

ٹیلے کی ڈھلان اُترنے کے بعد ہم جیپ میں بیٹھ گئے اور ہمارا واپسی کا سفر شروع ہو گیا۔ مجھے یہ معلوم کرنے کے لئے بے چینی ہو رہی تھی کہ رام جنی کی آتما نے اُسے کیا کہا ہے؟ جب ہم ٹیلے سے کافی دُور نکل آئے تو میں نے اُرملا سے پوچھا۔

''تھوڑا سا ہی بتا دو! تمہاری گورو کی آتما نے کیا کہا ہے؟''

اُرملا نے سرد مہری سے جواب دیا۔ ''میں نے تمہیں کہہ دیا ہے، حویلی میں چل کر بتاؤں گی۔ یہاں ایسی باتیں نہیں بتا سکتی۔''

اس کے بعد میں نے اُرملا سے کوئی سوال نہ کیا۔ حویلی کے باہر جیپ کھڑی کرنے کے بعد اُرملا میرے ساتھ میرے کمرے میں ہی آ گئی۔ پتلون اور بش شرٹ میں وہ بڑی ماڈرن اور فیشن ایبل پڑھی لکھی لڑکی لگ رہی تھی۔ ہم صوفے پر بیٹھ گئے۔ اُس وقت رات کے دو بجنے والے تھے۔ اُرملا بغیر کسی تمہید کے کہنے لگی۔

''تم خوش قسمت ہو شیراز! گرو مُنیا مسلمانوں کو اچھا نہیں سمجھتی۔ مگر ایک تو میں تمہیں ساتھ لے کر گئی تھی دوسرے تمہاری صورت دیکھنے کے بعد گرو منیا کی آتما نے کہا کہ میں اس کی مدد کروں گی۔ یہ لڑکا بھولپنے میں پھنس گیا ہے۔''

مجھے یہ سن کر بڑی خوشی ہوئی۔ میں کچھ پوچھنے لگا تو اُرملا نے کہا۔

''تمہیں بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جو کچھ میں کہوں اسے غور سے سنتے جاؤ! پہلی بات تو یہ ہے کہ اس مہم میں مجھے تمہارے ساتھ جانا ہوگا۔ کیونکہ یہ تمہارے اکیلے کا کام نہیں ہے۔ گرو منیا کی آتما نے بھی مجھے حکم دیا ہے کہ میں سارا عمل اپنی نگرانی میں کروں۔''

اُرملا نے چونکہ مجھے بیچ میں بولنے سے منع کیا تھا اس لئے میں خاموش رہا۔ اُس نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''کیا تمہیں وہ جگہ یاد ہے جہاں کانچی تمہیں لے کر گئی تھی اور جہاں سندھیا تمہیں ملی تھی؟''

میں نے کہا۔ ''ہاں...... یاد ہے۔ وہ یہاں سے کافی دُور دکن کی سرحد کے قریب اُچیت گڑھ سٹیشن کے پاس ایک جنگل ہے، وہاں ایک تالاب ہے، تالاب کے پیچھے ویران مندر ہے جہاں سندھیا اور کانچی نے مجھے بند رکھا تھا اور جہاں وہ مجھے اپنی دیوی

کی مورتی کے آگے قربان کرنا چاہتی تھیں۔''

''یہ اچھی بات ہے کہ تمہیں وہ جگہ یاد رہی۔'' اُرملا بولی۔ ''اب ایسا ہے کہ کل کا دن چھوڑ کر ہم پرسوں کسی وقت یہاں سے نکل چلیں گے۔''

میں نے حیران سا ہو کر پوچھا۔

''تو کیا تم مجھے میری جان کی دشمن عورتوں کے حوالے کرنے جاؤ گی؟''

''یہ تم نے کیسے سوچ لیا؟'' اُرملا نے کہا۔ ''میں تمہاری جان کی دشمن تو نہیں ہوں۔ اور پھر میں تمہارے ساتھ ہوں گی۔ میرے ساتھ ہوتے ہوئے وہ تمہیں ہاتھ بھی نہیں لگا سکتیں۔''

مگر ہم وہاں کیا کرنے جائیں گے؟'' میں نے پوچھا۔

اُرملا نے کہا۔ ''میں تمہیں وہاں پہنچ کر سب کچھ بتا دُوں گی۔ بہرحال! تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اب تم سو جاؤ! باقی باتیں کل ہوں گی۔''

اتنا کہہ کر وہ چلی گئی۔

دوسرے دن میں دیر تک سویا رہا۔ سو کر اُٹھا تو دوپہر ہو رہی تھی۔ میں نے بوڑھے ملازم سے اُرملا کے بارے میں پوچھا تو اُس نے بتایا کہ رانی صاحبہ کسی کام سے گئی ہوئی ہیں تھوڑی دیر تک آ جائیں گی۔ میں اپنے کمرے میں ہی بیٹھا رہا۔ وہیں کھانا کھایا۔ تیسرے پہر اُرملا آ گئی۔ جب وہ میرے کمرے میں آئی تو اُس نے وہی بش شرٹ اور پتلون پہن رکھی تھی اور تھیلا اُس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ میرے سامنے بیٹھ گئی۔

''ہم کل منہ اندھیرے یہاں سے نکل پڑیں گے۔''

جب میں نے اُس سے پوچھا کہ وہ کہاں گئی ہوئی تھی تو کہنے لگی۔

''رام جنی کی آتما نے تمہارے واسطے جس وِش کنیا جڑی بوٹی کا کہا تھا اُس کی تلاش میں گئی تھی۔''

''جڑی بوٹی...... کس لئے؟'' میں نے پوچھا۔

اُرملا بولی۔ ''تمہیں ہر بات سمجھانے کی مجھے ضرورت نہیں ہے۔ اور تم سمجھو گے بھی نہیں۔ سنو! یہ وہ جڑی بوٹی ہے جس کا زہر ایک سیکنڈ میں تمہاری دشمن سندھیا اور کانچی کو ہلاک کر دے گا۔''

''کیا مجھے اُنہیں زہر دینا ہوگا...... یہ کیسے ہوگا؟''

اُرملا کہنے لگی۔ ''تم اُنہیں زہر نہیں دو گے، بلکہ تم خود زہر پیو گے۔''

میں حیرت زدہ ہوگیا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔ وہ بولی۔

''تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ جو زہر میں تمہیں پلاؤں گی اُس کا تم پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔''

میں نے اور زیادہ حیرت زدہ ہو کر کہا۔ ''یہ کیسے ہوسکتا ہے؟''

وہ بولی۔ ''جس طرح سانپ کے منہ میں زہر موجود ہوتا ہے مگر سانپ پر اس کے زہر کا کچھ اثر نہیں ہوتا، اسی طرح تمہارے خون میں زہر موجود ہوگا مگر اس کا تم پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔ اب یہ مت پوچھنا کہ یہ کیسے ممکن ہے؟ میں تمہیں بتاتی ہوں۔ تمہیں زہر کے قطرے پلانے سے پہلے میں تم پر یجروید کے خفیہ منتروں کا چلہ کروں گی۔ ان منتروں کے اثر سے تم زہر کی تاثیر سے محفوظ رہو گے۔ لیکن جب یہ زہر سندھیا اور کانچی کے جسم میں داخل ہوگا تو اُنہیں فوراً ہلاک کر دے گا۔ اور جب دونوں مرگئیں تو اُنہوں نے تم پر جو جادو کیا ہوا ہے وہ بھی خود بخود ختم ہو جائے گا۔''

''لیکن میرے خون کا زہر ان عورتوں کے خون میں کیسے داخل ہوگا؟''

میرے اس سوال پر اُرملا نے کہا۔

''تم بھول گئے ہو کہ وہ خون پینے والی عورتیں ہیں۔ اُنہیں تمہارے خون کا نشہ ہوگیا ہے۔ تمہیں دیوی کے آگے قربان کرنے سے پہلے وہ دونوں عورتیں تمہارے خون سے اپنا نشہ پورا کریں گی۔ اور اس طرح تمہارے خون کے ساتھ تمہارے خون کا زہر بھی اُن کے جسم میں داخل ہو جائے گا۔''

میں اُرملا کو دیکھتا رہ گیا۔ اُس نے کہا۔

''اُن خونی عورتوں کو ہلاک کرنے کا دوسرا کوئی راستہ، کوئی طریقہ نہیں ہے۔ کیونکہ اُن کے پاس ویدوں کے خفیہ منتروں کی زبردست طاقت ہے۔ گرومیتا کی آتما نے کہا ہے کہ اس طرح تمہیں اُن عورتوں کے عذاب سے نجات مل جائے گی۔ لیکن ایک بات کا تمہیں خاص خیال رکھنا ہوگا۔ اور وہ یہ کہ جب دونوں عورتیں باری باری تمہارے بدن کے کسی حصے کا خون پی رہی ہوں تو تمہیں اُن کا خون نہیں پینا ہوگا۔ اگر تم نے اُن کا خون

پی لیا تو وہ زہر جو تمہارے خون کے ساتھ اُن کے خون میں شامل ہوا ہوگا، وہ اُن کے ساتھ تمہیں بھی ہلاک کر دے گا۔''

اب ساری بات میری سمجھ میں آگئی تھی۔ میں نے کہا۔

''میں اُن کا خون نہیں پیوں گا۔''

یہ حقیقت ہے کہ مجھے بھی اُن عورتوں کے خون کی لذت کا نشہ پڑ گیا تھا اور میں بھی کسی کسی وقت دانتوں سے اُن کے جسم کو کاٹ کر تھوڑا بہت خون پی لیا کرتا تھا۔ مگر اب ایسا کرنا میرے لئے موت کا پیغام تھا۔

○○○

اُرملا نے تھیلے میں سے کپڑے میں لپٹی ہوئی ایک جڑی بوٹی نکال کر مجھے دکھائی۔ اُس کے پتے ہلکے سبز رنگ کے چھوٹے چھوٹے تھے۔ اُس نے کہا۔

''یہ وِش کنیا بوٹی ہے۔ رات کو میں اس کا زہر نکال کر اس پر یجروید کے خفیہ منتروں کا جاپ کروں گی۔ اس کے بعد صبح یہاں سے روانہ ہونے سے پہلے تمہیں اس کے چند قطرے پلا دُوں گی اور تم پر وہ منتر پڑھ کر پھونک دُوں گی جو مجھے میری گورو کی آتما نے بتایا ہے۔ اس کے اثر سے یہ زہر تمہیں کچھ نہیں کہے گا اور تمہارے خون میں موجود رہے گا۔ اب میں چلتی ہوں۔ مجھے اس پوتر بوٹی میں سے زہر نکالنا اور اس پر یجروید کے منتروں کا جاپ کرنا ہے۔ یہ کافی لمبا کام ہے۔ میں صبح صبح تمہارے پاس آؤں گی اور ہم اپنی مہم پر روانہ ہو جائیں گے۔''

اُرملا کے جانے کے بعد میں سوچ میں پڑ گیا کہ اگر اُس بوٹی کے زہر ہلاہل نے مجھ پر اثر کر دیا تو میں تو مارا جاؤں گا۔ ہو سکتا ہے اُرملا کے منتر پڑھنے میں کچھ کمی رہ جائے۔ ہو سکتا ہے اُس کی گورو کی آتما نے اُسے کوئی غلط منتر بتا دیا ہو تا کہ میں اس زہر کے پیتے ہی ہلاک ہو جاؤں کیونکہ رام جنی کی آتما بقول اُرملا کے مسلمانوں کو ناپسند کرتی تھی۔ کوئی ایسا پریشان کر دینے والا خیال نہیں تھا جو اُس وقت میرے ذہن میں نہیں آ رہا تھا۔ مگر اس کے سوا دوسرا کوئی راستہ بھی نہیں تھا...... کوئی چارہ کار بھی نہیں تھا۔

صبح صبح ابھی اندھیرا ہی تھا کہ اُرملا میرے کمرے میں آ گئی۔ وہ رات والے لباس پتلون بش شرٹ میں ہی تھی۔ تھیلا اُس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ پلنگ پر میرے پاس ہی بیٹھ گئی۔ میز پر پانی کا جگ اور ایک گلاس پڑا تھا۔ اُس نے تھیلے میں سے چھوٹی سی نیلے رنگ کی شیشی نکال کر مجھے دکھائی اور بولی۔

''اس میں وِش کینا بوٹی کا زہر ہے۔''

پھر اُس نے میز پر سے گلاس اُٹھایا۔ شیشی میں سے زہر کے چند قطرے گلاس میں ٹپکا دیئے۔ شیشے کے گلاس میں سے سبز رنگ کا زہر دیکھتے ہی میری جان تھوڑی دیر کے لئے ہوا ہو گئی۔ مجھے ایسے لگا جیسے یہ زہر پیتے ہی میری موت واقع ہو جائے گی۔ اگر یہ واقعی زہر ہے تو مجھے ضرور ہلاک کر دے گا۔ کہاں کے ویدک منتر اور کہاں کی رام جنی کی آتما...... یہ سب بیکار باتیں ہیں۔ زہر کا کام انسان کو ہلاک کرنا ہے اور میں اس کے پیتے ہی ہلاک ہو جاؤں گا۔ میں نے اسی لمحے اپنا ارادہ بدل لیا اور اُرملا سے کہا۔

''اُرملا! میں یہ زہر نہیں پیوں گا۔ میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ اس کے پینے سے میں مر جاؤں گا اور میں مرنا نہیں چاہتا۔''

اُرملا نے تعجب خیز نگاہوں سے مجھے دیکھا اور بولی۔

''بچوں جیسی باتیں مت کرو! میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ اس کے پینے سے تمہیں کچھ نہیں ہو گا۔''

میں نے کہا۔

''تو پھر پہلے تم اسے پی کر دکھاؤ! اگر اس کو پی کر تم زندہ رہیں تو میں بھی پی لوں گا۔''

اُرملا نے کہا۔ ''اس زہر پر صرف تمہارے نام کا چلہ کاٹا گیا ہے۔ اور تمہارے نام کا منتروں کا جاپ کیا گیا ہے۔ تمہارے سوا اسے جو کوئی بھی پیئے گا ہلاک ہو جائے گا۔ یہ زہر صرف تمہارے لئے بے اثر ہے۔ میرے لئے اور سندھیا اور کانچی اور دوسرے کسی انسان کے لئے بے اثر نہیں ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ سندھیا اور کانچی کو ہلاک کئے بغیر زندہ رہ سکو گے تو یہ تمہاری بھول ہے۔ آدمی اگر کوئی غلط کام کرتا ہے تو اُسے اس کا نتیجہ ضرور بھگتنا پڑتا ہے۔ تم نے بھی ایک پاپ کیا ہے...... گناہ کیا ہے جس کی سزا تم بھگت رہے ہو۔ کافی بھگت چکے ہو۔ تمہارے اس گناہ کی سزا تمہاری موت پر ختم ہوتی ہے۔ میں تمہیں بے موت مرنے سے بچانا چاہتی ہوں تا کہ تم بھی زندہ رہو اور تم نے میری جان بچا کر مجھ پر جو احسان کیا ہے اسکا بدلہ بھی چکا سکوں۔ اپنی غلطیوں کی وجہ سے تم اُن خطرناک عورتوں کے چنگل میں بری طرح پھنس چکے ہو۔ وہ دیوی ماتا پر تمہیں قربان کر کے خود دیوتاؤں سے بھی زیادہ طاقتور بننے کے خواب دیکھ رہی ہیں۔ وہ تمہیں نہیں چھوڑیں گی۔ مجھ سے الگ ہوتے ہی وہ تمہیں قابو کر لیں گی اور

تمہیں اذیت ناک موت کے حوالے کر دیں گی۔''

اُرملا سچ کہہ رہی تھی۔ اُرملا سے الگ ہونے کی صورت میں میرا یہی انجام ہو سکتا تھا۔ اُرملا نے شیشے کے گلاس میں تھوڑا سا پانی ڈال کر زہر کو اُس میں حل کر دیا اور گلاس میری طرف بڑھا کر بولی۔

''میں تمہاری دشمن نہیں ہوں، تمہاری ہمدرد ہوں، خیر خواہ ہوں۔ تمہیں زندگی کے آخری لمحوں تک زندہ اور خوش دیکھنا چاہتی ہوں اور ایسا صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ تمہاری جانی دشمن دونوں عورتیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائیں۔ یقین کرو! اس گلاس میں جو کچھ بھی ہے وہ تمہارے واسطے امرت ہے۔ آبِ حیات ہے اور سندھیا اور کانچی کے واسطے زہر ہے۔ موت کا پیغام ہے۔ وقت ضائع نہ کرو! اسے پی جاؤ۔''

میرے لئے اب سوچنے اور سمجھنے کی مزید گنجائش نہیں رہی تھی۔ میں نے گلاس اُٹھایا، اللہ کا نام لیا، دل میں کلمہ پاک پڑھا اور سانس بند کر کے زہر کے دونوں گھونٹ پی گیا۔ گلاس میز پر رکھ کر سانس لیا تو میرا حلق کڑوا ہو گیا تھا۔ میں نے گھبرا کر کہا۔

''اُرملا! میرا حلق سخت کڑوا ہو گیا ہے۔''

اُرملا نے پہلی بار میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور مسکراتے ہوئے بولی۔

''یقین کرو! تم نے زہر نہیں، امرت پیا ہے۔ تمہارے حلق کا کڑوا پن تھوڑی دیر بعد دُور ہو جائے گا۔ اب جلدی سے تیار ہو جاؤ! ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔''

وہ چلی گئی۔ مجھ پر ایک نفسیاتی اثر تھا کہ میں نے زہر پیا ہے۔ جس کی وجہ سے مجھ پر کچھ دیر گھبراہٹ سی طاری رہی۔ میں نے سادہ پانی کے دو تین گھونٹ پیے، اس کے بعد حلق کی کڑواہٹ جاتی رہی۔ میں نے اپنے جسم پر بار بار ہاتھ پھیر کر دیکھا کہ کہیں زہر کے اثر سے جسم سن تو نہیں ہو رہا؟ مگر ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ میری جسمانی حالت بالکل نارمل تھی۔ میں نے غسل خانے میں جا کر غسل کیا، کپڑے بدلے اور کمرے میں آ کر اُرملا کا انتظار کرنے لگا۔ کھلی کھڑکی کے باہر صبح سے پہلے کی ہلکی ہلکی نیلی روشنی آسمان پر نمودار ہونے لگی تھی۔ اتنے میں اُرملا اندر آ گئی۔ کہنے لگی۔

''آ جاؤ......!''

حویلی کے باہر اُس کی جیپ کھڑی تھی۔ ہم جیپ میں بیٹھ گئے اور جیپ ایک طرف کو

چل پڑی۔ اُرملا پورا پروگرام بنا چکی تھی۔ اُسے معلوم تھا کہ جے پور سے کون سی ٹرین پکڑ کر حیدر آباد دکن کی طرف جانا ہے۔ جے پور کے سٹیشن سے ایک ٹرین صبح صبح ورنگل کی طرف چلتی تھی جو ریاست حیدر آباد میں واقع ہے۔ یہ بڑا لمبا سفر تھا۔ یہ وسطی ہندوستان کا سفر تھا۔ راستے میں کئی مشہور شہر آئے اور گزر گئے۔ پورا ایک دن، ایک رات اور دوسرا آدھا دن سفر میں گزر گیا۔ میں خدا کا شکر ادا کر رہا تھا کہ اُرملا کے پلائے ہوئے زہر نے مجھ پر کوئی اثر نہیں کیا تھا۔ میں ایسے مطمئن تھا جیسے مجھے نئی زندگی مل گئی ہو۔

لیکن آگے جو مرحلہ درپیش تھا وہ ایک بار پھر اپنے آپ کو موت کے حوالے کرنے کے برابر تھا۔ یعنی مجھے اپنے آپ کو سندھیا اور کانچی جیسی خونخوار اور میری جان کی دشمن عورتوں کے حوالے کرنا تھا۔ اُرملا نے مجھے دورانِ سفر سب کچھ سمجھا دیا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہوگا، اور کیسے کرنا ہوگا؟ یہ بڑا خطرناک مرحلہ تھا۔ مگر اپنی جان بچانے اور شیطان صفت عورتوں کے جان لیوا جادو سے نجات حاصل کرنے کے لئے مجھے ہر حالت میں اُس مرحلے میں سے گزرنا تھا۔ دل میں کئی بار یہ خیال آیا کہ جس طرح زہر نے مجھ پر کوئی اثر نہیں کیا، ہو سکتا ہے سندھیا اور کانچی پر بھی اس کا کوئی اثر نہ ہو۔ پھر تو میں اُن عورتوں کے قبضے میں ہوں گا، اور پھر اُرملا بھی مجھے ایک انتہائی اذیت ناک گھناؤنی موت سے نہ بچا سکے گی۔

ورنگل پہنچنے کے بعد ہم دونوں نے ریلوے سٹیشن کے ریفریشمنٹ رُوم میں ہی بیٹھ کر کھانا کھایا، وہیں منہ ہاتھ دھو کر تازہ دم ہوئے۔ اُرملا باتھ رُوم سے منہ ہاتھ دھو کر بالوں میں کنگھی کر کے باہر نکلی تو مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ وہ عورت ہے جس کے پاس ہندوؤں کے خفیہ منتروں کی زبردست خفیہ طاقت ہے اور اُس نے مجھے ایک ایسا زہر تیار کر کے پلایا ہے جو دوسروں کے لئے زہر لیکن میرے لئے آبِ حیات بن گیا ہے۔

ہمیں ورنگل سے اُچت گڑھ جانے والی ٹرین پکڑنی تھی جو سہ پہر کے تین بجے چلتی تھی۔ ہم ریفریشمنٹ میں ہی چائے منگوا کر بیٹھے رہے۔ مجھے ایک خدشہ لگا ہوا تھا۔ میں نے اُرملا سے کہا۔

''اُرملا! ایک بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔''

''کون سی بات؟'' اُرملا نے چائے کا چھوٹا سا گھونٹ بھر کر پوچھا۔

میں نے کہا۔ ''وہ بات یہ ہے کہ ہم دو ایسی عورتوں کو موت کے گھاٹ اُتارنے جا
رہے ہیں جن کے بارے میں تم خود کہہ چکی ہو کہ اُن کے پاس ویدک منتروں کی تم سے
بھی زیادہ طاقت ہے اور اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ میں جہاں بھی ہوتا ہوں، دن ہو
یا رات...... کانچی کو پتہ چل جاتا ہے اور وہ مجھ سے ہم کلام ہو جاتی ہے۔ مجھے آواز دیتی
ہے۔ مجھ سے باتیں کرتی ہے۔ تو اب جبکہ میں اُسے ہمیشہ کے لئے ختم کرنے جا رہا ہوں
تو کیا اُسے میرے منصوبے کا علم نہیں ہو جائے گا؟ ایسی صورت میں اگر وہ اور کچھ نہیں کر
سکتی تو کم از کم اتنا ضرور کرے گی کہ سندھیا کو ساتھ لے کر اپنے خونی مندر سے فرار ہو
جائے اور ہم اُن دونوں کو تلاش ہی کرتے رہ جائیں اور ہمارا سارا منصوبہ خاک میں مل
جائے۔''

اُرملا مسکرائی۔ کہنے لگی۔ ''شاید یہ بات میں نے تمہیں نہیں بتائی کہ جس وقت میں
تمہارے ساتھ ہوتی ہوں تو سندھیا اور کانچی...... اُن دونوں عورتوں میں سے کسی کو
تمہارے بارے میں کچھ پتہ نہیں چل سکتا کہ تم کہاں ہو اور کیا کرنے کہاں جا رہے ہو؟
میں اس لئے بھی تمہارے ساتھ آئی ہوں کہ میرے ساتھ ہونے کی وجہ سے ہمارے
منصوبے کا اُن عورتوں کو پتہ نہ چل سکے۔ اس لئے تمہیں اس بارے میں پریشان نہیں
ہونا چاہئے۔''

میں خاموش ہو گیا۔

اُچت گڑھ جانے والی گاڑی ایک ڈیڑھ گھنٹہ لیٹ تھی۔ وہ سٹیشن پر پہنچی تو ہم اُس
میں بیٹھ گئے۔ چونکہ ٹرین پہلے ہی لیٹ تھی اس لئے ورنگل کے سٹیشن پر وہ زیادہ دیر نہ رُکی
اور چل پڑی۔ ڈیڑھ گھنٹے کے سفر کے بعد اُچت گڑھ کا سٹیشن آ گیا۔ ہم ٹرین سے اُتر
پڑے۔ یہ سٹیشن مجھے اچھی طرح یاد تھا۔ کانچی مجھے رانی کی قید سے نکال کر اسی سٹیشن پر
کر اُتر گئی تھی۔ اس کے بعد وہ جنگل کے جس راستے میں سے گزری تھی وہ راستہ بھی
میری یادداشت میں محفوظ تھا۔ اُرملا کہنے لگی۔

''راستہ بھول تو نہیں جاؤ گے؟''

ہم سٹیشن سے باہر آ گئے تھے۔ میں نے کہا۔

''میں بالکل نہیں بھولا...... جب ہم جنگل میں داخل ہوں گے تو ایک ندی آئے گی۔

ب سے بڑی نشانی ہے۔ اُس کے آگے کا راستہ اچھی طرح سے میرے ذہن میں
ہے۔''

اُچت گڑھ اُس زمانے میں ایک قصبہ تھا جس کی آبادی زیادہ نہیں تھی۔ اب وہ بھی
ہر بن گیا ہو گا۔ 1947ء کے زمانے میں اتنی زیادہ آبادی نہیں تھی۔ ایک کچی سڑک
بے کی طرف جاتی تھی۔ ہم اُس سڑک پر چل پڑے۔ اُرملا اپنی پتلون، بش شرٹ اور
ندھے پر لٹکتے تھیلے کے باعث شکاری لگ رہی تھی۔ میں نے بھی کرتے پاجامے کی
ہائے پتلون اور قمیض پہن رکھی تھی۔ یہ دونوں کپڑے مجھے اُرملا نے دیئے تھے۔ کوئی
ہیں دیکھتا تو یہی سمجھتا کہ ہم جنگل میں شکار کھیلنے جا رہے ہیں۔ کچھ دُور چلنے کے بعد
ڑک سے پرے ایک کچی پگڈنڈی کھیتوں میں جاتی تھی۔ مجھے یاد آ گیا، کانچی یہیں سے
ڈکر کھیتوں میں داخل ہوئی تھی۔ میں بھی پگڈنڈی پر مُڑ گیا۔ اُرملا نے کہا۔

''ہم ٹھیک جا رہے ہیں نا؟''

میں نے کہا۔ ''ابھی تک تو ٹھیک ہی جا رہے ہیں۔''

میں نے اُسے بتایا کہ جب کانچی مجھے ساتھ لے کر چلی تھی تو وہ بھی اسی جگہ سے
کھیتوں میں داخل ہوئی تھی۔ اُرملا مطمئن ہو گئی۔ کھیت ختم ہوئے تو نیم پتھریلا علاقہ آ
گیا۔ یہاں کہیں کہیں ناریل اور تاڑ کے درخت تھے۔ ایک جگہ تاڑ کے تین درخت
ساتھ ساتھ کھڑے تھے۔ یہ بھی ایک نشانی تھی۔ میں اُس طرف کو چل پڑا۔ آگے ندی آ
گئی۔ ندی کو دیکھ کر میں نے اُرملا سے کہا۔

''یہی ندی ہے جس کا میں نے تم سے ذکر کیا تھا۔ بس! اس کے آگے جنگل شروع ہو
جائے گا۔''

غیر ہموار اُونچی نیچی زمین پر کوئی ایک میل چلے ہوں گے کہ دُور سے جنگل کے
کنارے والے درخت نظر آ گئے۔ اُرملا نے میرا ہاتھ پکڑا اور ایک جگہ بیٹھتے ہوئے مجھے
بھی اپنے ساتھ بٹھا لیا۔ کہنے لگی۔

''تم نہیں جانتے مگر میں جانتی ہوں کہ اُس جنگل میں ان عورتوں کے سائے کا اثر
ہے۔ اب ہمیں بڑی ہوشیاری اور احتیاط سے کام لینا ہو گا۔ تم صرف اتنا کرنا کہ جنگل
میں داخل ہونے کے بعد میرا ہاتھ پکڑ لینا۔ مطلب یہ کہ اپنے جسم کو میرے جسم کے ساتھ

لگا کر رکھنا۔ اس طرح کرنے سے دونوں عورتوں میں سے کسی کو بھی تمہارے وجود کا علم نہیں ہو سکے گا۔''

میں نے کہا۔ ''مگر میں کب تک تمہارے جسم کے ساتھ جسم لگائے رکھ سکوں گا؟ چلتے چلتے آدمی ایک دوسرے سے الگ ہو ہی جاتا ہے۔''

اُرملا نے سختی سے کہا۔

''میں تمہیں حکم دیتی ہوں کہ جنگل میں جاتے ہی میرا ہاتھ یا میرا بازو پکڑ لینا! اور جب تک میں نہ کہوں اُسے مت چھوڑنا۔ سمجھ گئے؟''

پہلے کبھی اُرملا نے مجھ سے اتنی سختی سے بات نہیں کی تھی۔ مگر وہ سب کچھ میری بھلائی کے لئے ہی کہہ رہی تھی۔ میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔''

ہم اُٹھے اور جنگل کی سمت چل پڑے۔ وہاں سے چلتے ہی میں نے اُرملا کا بازو ایک ہاتھ سے پکڑ لیا تھا اور اُس کے ہم قدم ہو کر چل رہا تھا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ اُرملا نے یونہی مجھے سختی سے ہدایت نہیں کی۔ میرے لئے واقعی خطرناک زون یعنی خطرناک علاقہ شروع ہو رہا تھا۔ جہاں جنگل کے درختوں کی پہلی قطار شروع ہوتی تھی وہاں ایک طرف ٹوٹی پھوٹی بُرجی کا کھنڈر تھا۔ کانچی اور میں اسی جگہ سے جنگل میں داخل ہوئے تھے۔ میں نے اُرملا کو یہ بات بتائی اور ہم بھی اُسی جگہ سے جنگل میں داخل ہو گئے۔

جنگل میں داخل ہونے کے فوراً بعد اُرملا نے میرے کان میں آہستہ سے کہا۔

''اب صرف میں تم سے بات کروں گی۔ تم میری کسی بات کا جواب نہیں دو گے۔ مقصد یہ ہے کہ یہاں تمہاری آواز نہیں نکلنی چاہئے۔''

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا، زبان سے کچھ نہ کہا۔

اب میرے دل کو پریشانی لگ گئی تھی کہ اُرملا مجھے اُن عورتوں کے حوالے کرنے والی ہے۔ وہ یہ سب کچھ کیسے کرے گی؟ مجھے سندھیا اور کانچی کے قبضے میں جانے سے خوف بھی محسوس ہو رہا تھا۔ خدا جانے میں دوبارہ اُن کے قبضے سے زندہ نکل بھی سکوں گا یا نہیں؟ اب میں اپنی یہ پریشانی اُرملا کے آگے بیان نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اُس نے مجھے خاموش رہنے کی ہدایت کر رکھی تھی۔ میرے دل کی دھڑکن کسی وقت اپنے آپ اچانک تیز ہو جاتی تھی۔ ہر لمحے یہ ڈر تھا کہ اچانک دونوں عورتوں میں سے کوئی عورت مجھ پر

ظاہر نہ کر دے یا مجھ پر کیا گیا جادو ٹونہ اچانک دوبارہ بیدار نہ ہو جائے۔ ہم جنگل میں آگے جا رہے تھے۔ سورج ڈھلنے لگا تھا مگر ابھی دن کی روشنی باقی تھی کیونکہ آسمان جو درختوں ہی سے نظر آ رہا تھا، بادلوں سے صاف تھا۔

میں اپنے اندازے اور یادداشت کے مطابق اُرملا کو ٹھیک لے جا رہا تھا۔ ایک جگہ جنگل کے درخت ذرا دُور دُور ہوئے تو میں نے دو ڈھائی سو گز کی دُوری پر کچھ درختوں کا جھنڈ دیکھا۔ میں نے اُسے پہچان لیا۔ میں نے اُرملا کا بازو پکڑ رکھا تھا۔ میں نے کہا۔

''اُرملا! ہم کانچی، سندھیا کے ویران خونی مندر کے نزدیک پہنچ گئے ہیں۔''

اس بات سے مجھے کچھ کچھ حوصلہ ہو رہا تھا کہ ابھی تک مجھے کانچی کی آواز سنائی نہیں دی تھی۔ میں اُس کی سلطنت کی حدود کے اندر پہنچ چکا تھا اور اُسے ہلاک کرنے کی نیت سے آیا تھا۔ ظاہر ہے وہ میرے وجود اور میری موجودگی سے بے خبر تھی۔ ورنہ اب تک وہ اُرملا پر نہ سہی مگر مجھ پر ضرور حملہ آور ہو چکی ہوتی۔ اس کا مطلب تھا کہ اُرملا جھوٹ نہیں بول رہی تھی۔ اُس نے جو کچھ مجھ سے کہا تھا وہ سچ تھا۔ اُرملا رُک کر درختوں کے جھنڈ کو دیکھنے لگی جس طرف میں نے اشارہ کیا تھا۔

میں نے اُرملا کے کان کے قریب منہ لے جا کر سرگوشی کی۔ میں نے اُسے بتایا کہ یہی درختوں کا وہ جھنڈ ہے جس کے سائے میں کانچی، سندھیا کا ویران خونی مندر ہے۔ وہ بڑے غور سے درختوں کے جھنڈ کو دیکھ رہی تھی۔ پھر آہستہ سے بولی۔

''اس کا مطلب ہے ہمیں جو کچھ کرنا ہے وہ ان درختوں کے قریب پہنچتے ہی شروع ہو جائے گا۔''

میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ وہ کیا کرنے والی ہے۔ مگر میں اُسے روک نہیں سکتا تھا۔ اُس کو روکنے میں میرا ابھی نقصان تھا۔ ہم چل پڑے۔ جب درختوں کا جھنڈ کوئی سو گز دُور رہ گیا تو اُرملا نے مجھے زمین پر بٹھا لیا، خود بھی زمین پر بیٹھ گئی اور اپنا منہ میرے کان کے قریب لا کر دھیمی آواز میں بولی۔

''میری بات غور سے سنو! جیسے میں کہوں، ویسے ہی کرنا۔ جب میں کہوں کہ میرا بازو چھوڑ کر درختوں کے جھنڈ کی طرف چل پڑو تو تم چل پڑنا۔ ہو سکتا ہے دس پندرہ قدم چلنے کے بعد یا ہو سکتا ہے پچاس ساٹھ قدم چلنے کے بعد کانچی کا جادو تمہارے جسم میں حرکت

میں آ جائے۔ تمہارا سر چکرائے اور تم اپنے آپ اپنی خوشی اور اپنی مرضی سے ویران خونی
مندر کی طرف چلنا شروع کر دو۔ تم مجھے بھولو گے نہیں، لیکن کانچی کے جسم، اس کے خون
کی بو اور خواہش تم پر غالب آ جائے گی اور تم ایک طلسمی پتلے کی مانند کانچی کے استھان کی
طرف چلنے لگو گے۔ لیکن گھبرانا مت! میں تمہاری حفاظت کروں گی، تمہاری نگرانی کروں
گی اور تمہیں نازک وقت پر بتاتی رہوں گی کہ تمہیں کیا کرنا ہے؟ میں تمہارے ساتھ نہیں
ہوں گی، مگر جب میں اپنی جگہ پر تم سے دھیمی آواز میں بولوں گی تو تم میری آواز سن سکو
گے۔ میرا بازو چھوڑ دو اور خونی مندر کی طرف چلنا شروع کر دو! یہ مت بھولنا کہ یہ
تمہاری آخری آزمائش کا وقت ہے اور تمہیں اس آزمائش میں پورا اُترنا ہے۔ اگر ناکام
ہو گئے تو پھر مجھ پر تو تمہارے احسان کا پاپ جنم جنم تک رہے گا ہی لیکن تم بھی زندہ نہ بچ
سکو گے۔ جاؤ!''

اُس نے میرا ہاتھ اپنے بازو سے الگ کر دیا اور دوڑ کر دس پندرہ قدم مجھ سے دُور
ایک درخت کی اوٹ میں ہو گئی۔ اُس وقت مجھے محسوس ہوا کہ میرا آخری انسانی سہارا
بھی مجھ سے الگ ہو گیا ہے اور میں آلام و مصائب کے ہجوم میں اکیلا رہ گیا ہوں۔

میں گھبرا گیا۔ جی چاہا واپس بھاگ جاؤں...... پھر خیال آیا کہ بھاگنے سے کچھ نہیں
ہو گا۔ جتنی تیز بھاگوں گا موت اتنی ہی تیز میرے پیچھے بھاگے گی۔ چاروں طرف
دروازے بند ہیں۔ اب لڑنا اور مقابلہ کرنا ہے۔ لڑتے لڑتے دشمن کو شکست دینی ہے یا
لڑتے لڑتے مر جانا ہے۔ دوسرا کوئی راستہ نہیں ہے۔ میں سنبھل گیا اور دل کو مضبوط کیا۔
کیا اُسی لمحے میرے کانوں میں اُرملا کی دھیمی سرگوشی سنائی دی۔

''ہمت نہ ہارنا...... ہمت ہار گئے تو اذیت ناک موت مرو گے۔''

میں نے دُور سے دکھائی دینے والے خونی مندر والے درختوں کو غور کر دیکھا اور
ایک نئے عزم اور نئے حوصلے کے ساتھ اللہ کا نام لے کر اُن درختوں کی طرف قدم
بڑھائے۔ چند قدم ہی چلا ہوں گا کہ ایک دم مجھے چکر آ گیا...... میں وہیں رُک گیا۔ ایک
پل کے لئے زمین و آسمان گھوم گئے۔ میں سمجھ گیا کہ کانچی کا طلسم میرے جسم میں پوری
طاقت کے ساتھ بیدار ہو گیا ہے۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ دوسرے پل میں چکر
غائب ہو گیا۔ کانچی اور سندھیا کے جسم اور اُن کے خون کی بو میرے چہرے کے قریب

سے ہو کر گزر گئی...... میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ دل میں جتنی خواہشیں تھیں سب ختم
ہو گئیں۔ صرف ایک ہی خواہش رہ گئی کہ جیسے بھی ہو، جس طرح بھی ہو میں اُڑ کر کانچی یا
سندھیا کے پاس پہنچ جاؤں۔ یہ خواہش ایک شعلے کی طرح میرے دل میں سے بلند ہوئی
اور اُس نے ایک آتشیں بگولے کی طرح آناً فاناً مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا...... میرے
قدم تیز ہو گئے۔

کانچی اور سندھیا کے جسموں کی بو مجھے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ میں دیوانہ وار ایک
ایسے آدمی کی طرح، جس کی عقل پر شیطان غالب آ گیا ہو آگے بڑھتے ہوئے درختوں
کے جھنڈ میں پہنچ گیا۔ خونی مندر کا ویران ٹوٹا پھوٹا کھنڈر میرے سامنے تھا۔ جیسے ہی میں
اُس کی طرف بڑھا مجھے کانچی کی آواز آئی۔

''میں جانتی تھی تم ضرور آؤ گے۔ میں جانتی تھی تم میرے بغیر نہیں رہ سکو گے۔''

خونی مندر کا شکستہ دروازہ جہاں سے نیچے سیڑھیاں جاتی تھیں، میری آنکھوں کے
سامنے تھا۔ میں ذرا سا آگے گیا تو شکستہ دروازے میں کانچی نمودار ہوئی۔ اُس نے سرخ
ریشمی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ بال کھلے تھے اور چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ اُس نے دونوں
بازو میری طرف بڑھائے اور بولی۔

''آ جاؤ...... میرے پاس آ جاؤ!''

اور اُس نے آگے بڑھ کر مجھے تھام لیا۔ اُس وقت میرے دل و دماغ پر صرف کانچی
اور سندھیا کا خیال چھایا ہوا تھا۔ دوسرا کوئی خیال نہیں تھا۔ میں اُرملا کو بھی بھول چکا تھا۔
کانچی مجھے اپنے ساتھ لگائے تہہ خانے کی سیڑھیاں اُترنے لگی۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ
اُس وقت مجھے یہ بھی یاد نہیں رہا تھا کہ میں اپنی موت کو گلے لگا رہا ہوں۔ نیچے تنگ سی راہ
داری میں صرف ایک جگہ طاق میں دیا جل رہا تھا۔ وہ مجھے اپنی کوٹھڑی میں لے آئی۔ مجھے
پلنگ پر بٹھا کر خود میرے سامنے چوکی پر بیٹھ گئی۔ کوٹھڑی کے طاق میں لالٹین جل رہی
تھی۔ دیوار کے پاس پتھروں کے چبوترے پر اُسی منحوس دیوی کی مورتی رکھی ہوئی تھی جس
کے آگے کانچی اور سندھیا نے مجھے ذبح کر کے دیوی کی خوشنودی حاصل کرنے کے بعد
دیوتاؤں سے بھی بڑھ کر طاقت اور شکتی حاصل کرنی تھی۔ مگر اُس لمحے میں یہ سب کچھ بھولا
ہوا تھا۔ کانچی نے میرے گھٹنوں کو چھو کر وہی ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگایا اور بولی۔

''تم میرے لئے دیوتا سمان ہو...... تمہیں پا کر مجھے دیوتاؤں کے سورگ کا آنند ملا ہے۔''

میری حالت ایک ایسے انسان کی تھی جو جاگتے میں خواب دیکھ رہا ہو۔ میں نے کہا۔

''کانچی! تمہارے بغیر میں بھی اُداس تھا۔ پتہ نہیں کون سی شکتی تھی جس نے مجھے تم سے الگ کر رکھا تھا؟ جو مجھے تم سے ملنے نہیں دے رہی تھی؟''

کانچی کہنے لگی۔

''جو ہونا تھا ہو چکا۔ ان باتوں کو اب ہمیں بھول جانا چاہئے اور سورگ کے آنند کی ایک نئی زندگی شروع کرنی چاہئے۔ سندھیا کو بھی تمہارے بغیر ایک پل کے لئے قرار نہیں تھا۔ ہر گھڑی تمہیں یاد کرتی رہتی تھی۔''

مجھے اُس لمحے سندھیا کے جسم کی بو بھی آ رہی تھی۔ میں نے کہا۔

''کہاں ہے سندھیا؟ مجھے اُس کے پاس لے چلو! میں اُس سے ملنے کو بھی بے چین ہوں۔''

کانچی نے اُٹھ کر اپنا بازو میرے بازو میں ڈالا اور بولی۔

''آؤ! سندھیا اپنی کوٹھڑی میں تمہارا انتظار کر رہی ہے۔''

راہ داری میں سب سے آخری کوٹھڑی یا کمرہ سندھیا کا تھا۔ سندھیا اُس وقت دیوتا کی مورتی کے سامنے بیٹھی پوجا کر رہی تھی۔ ہم کمرے میں داخل ہوئے تو اُس نے گردن موڑ کر کانچی کے ساتھ مجھے دیکھا۔ اُس کا چہرہ ایک دم کھل اُٹھا۔ اُٹھ کر ہمارے پاس آئی، میرا ہاتھ پکڑ کر چوما، اُسے آنکھوں سے لگایا اور بولی۔

''تمہیں دیکھنے کو آنکھیں ترس گئی تھیں۔ آخر تمہیں ہماری محبت کھینچ کر لے ہی آئی۔''

میں نے کہا۔ ''تمہارے بغیر میں نے جس طرح تڑپ تڑپ کر دن رات بسر کئے ہیں وہ میں ہی جانتا ہوں۔''

سندھیا نے آگے بڑھ کر میرا ماتھا چوم لیا۔ اُس لمحے ایک تیز خمار آلود بو نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ سندھیا جلدی سے الگ ہو گئی اور کانچی سے کہا۔

''آج رات جشن ہو گا۔ ہم شیراز کے آنے کی خوشی منائیں گی۔''

''ہاں......'' کانچی نے خوش ہو کر کہا۔ ''آج کت رات بڑی دیر کے بعد آئی ہے۔''

ہم لیلا رچائیں گے۔ جی بھر کر خوشی کریں گے۔''

سندھیا نے میرے بالوں میں اُنگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

''تم تھکے ہوئے لگتے ہو۔ ابھی جا کر آرام کرو! رات کو ملاقات ہو گی۔''

کانچی نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ ''آؤ...... آ جاؤ!''

وہ مجھے میری کوٹھڑی میں لے کر آ گئی۔ میں نے اُس کوٹھڑی کو فوراً پہچان لیا۔ اُس میں اپنے ہوش و حواس میں نہیں تھا۔ عقل و شعور میرا ساتھ چھوڑ چکے تھے۔ میرے میں اُن عورتوں کا گناہ آلود خیال غالب تھا۔ اُس کی وجہ سوائے اس کے اور کچھ تھی کہ میرا ایمان کمزور تھا، میرا کردار کمزور تھا، میرے خیالات پر حرص و ہوس کا غبار چکا تھا۔ اس طاقت نے میرا ساتھ چھوڑ دیا تھا جو ایک بلند کردار صاحب ایمان انسان کی ایسے لمحوں میں حفاظت کرتی ہے اور اسے گناہ کی دلدل میں گرنے سے بچا لیتی ہے۔ اس کی بجائے میں سفلی خواہشات کا غلام بن چکا تھا۔ کانچی مجھے میری کوٹھڑی میں چھوڑ کر جا چکی تھی۔ عین اُسی لمحے میرے کان میں اُرملا نے سرگوشی کی۔

''ہوش میں آؤ...... تم ایک مقصد لے کر یہاں آئے ہو۔ میں جس اندھے کنویں سے تمہیں بچانا چاہتی ہوں اس میں اپنے آپ کو مت گراؤ!''

مجھے ایک دم جیسے ہوش آ گیا۔ مجھے سب کچھ یاد آ گیا کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں اور کیا کرنا چاہئے؟ میں کچھ بولنے لگا تو اُرملا نے سرگوشی میں مجھے بولنے سے منع کرتے ہوئے کہا۔

''ہرگز ہرگز مجھ سے بات نہ کرنا...... تم نے بات کی تو وہ دونوں سن لیں گی اور پھر بھی تمہیں اُن کے چنگل سے نہ بچا سکوں گی۔ دھیان سے سنو! آج رات جب وہ ہوشی کے عالم میں ہوں گی تو تمہیں اپنا آپ اُن دونوں کے حوالے کر دینا ہو گا تا کہ وہ تمہاری گردن پر اپنے نوکیلے دانت گاڑ کر تمہارا خون پئیں۔ اور یوں تمہارے جسم میں کنیا بوٹی کا جو زہر شامل ہے وہ اُن کے خون میں شامل ہو جائے۔ بس! تمہیں صرف اتنا کرنا ہے۔ باقی جو ہو گا میں اسے سنبھال لوں گی۔ جو کچھ میں نے کہا ہے اسے یاد رکھنا! میں جا رہی ہوں۔''

اُرملا کی آواز کے خاموش ہو جانے کے بعد میں دیر تک اپنے ہوش و حواس میں رہا۔

لیکن جیسے جیسے رات گزرتی گئی، عقل و خرد میرا ساتھ چھوڑنے لگے اور مجھ پر ایک بار پھر کانچی اور سندھیا کا خیال غالب آ گیا اور میں پلنگ پر لیٹا جاگتا رہا اور انتظار کرتا رہا کہ کب رات کو رہس لیلا کا جشن شروع ہوگا اور کب میرے جسم کی پیاس کو تسکین ملے گی۔

سندھیا کے کمرے سے اشلوک پڑھنے کی آواز آنے لگی۔ پھر اس کے ساتھ کانچی کی آواز بھی شامل ہو گئی۔ میں حالت اضطراب میں کئی بار پلنگ سے اُٹھ کر بند دروازے تک گیا اور پھر واپس آ کر لیٹ گیا۔ آخر انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں اور راہ داری میں مجھے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میں سمجھ گیا کہ کانچی مجھے لینے آئی ہے۔ میں بے چین نگاہوں سے بند دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ باہر سے دروازے کی کنڈی کھلنے کی آواز آئی۔ دروازے کا ایک پٹ آہستہ سے کھلا اور کانچی کی بجائے اُرملا دبے پاؤں اندر آ گئی۔ میں گھبرا کر اُٹھ بیٹھا۔ اُرملا دبے دبے تیز قدم اُٹھاتی میرے پاس آ کر پلنگ پر بیٹھ گئی اور سرگوشی میں بولی۔

''تمہارے امتحان کا وقت آ گیا ہے۔''

میں کچھ بولنے لگا تو اُرملا نے میرے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھ لیا اور سرگوشی کی۔

''میں نے تمہیں بولنے سے منع کیا ہوا ہے۔ تم نے مجھ سے کوئی بات کی تو سارے کئے کرائے پر پانی پھر جائے گا۔ ہمارا راز فاش ہو جائے گا۔ دھیان سے سنو! کانچی تمہیں لینے آ رہی ہے۔ اُس کے ساتھ جاؤ! اور اپنی عقل اپنے قابو میں رکھو۔ تم جانور نہیں ہو، انسان ہو۔ انسانوں کی طرح اپنے جذبات پر کنٹرول کرو! تمہیں اُن عورتوں کے خون میں اپنے خون کو ہر حالت میں شامل کرنا ہے۔ اس میں اُن دونوں کی موت اور تمہاری نجات ہے۔ جب وہ تمہارے خون کو ایک بار پی لیں تو اس کے بعد ہرگز ہرگز تم اُن کا خون پینے کی غلطی نہ کرنا ورنہ اس کا انجام بہت بھیانک ہوگا۔ میں جانتی ہوں اس وقت اپنے جذبات کو قابو میں رکھنا بہت مشکل ہوگا۔ مگر یاد رکھو! صرف جانور اپنے جذبات کے غلام ہوتے ہیں۔ انسان اپنے جذبات کو لگام ڈال سکتا ہے۔ میں تم سے دُور نہیں ہوں گی۔ اُسی جگہ پر ہوں گی اور تمہیں دیکھ رہی ہوں گی۔''

سندھیا کے کمرے سے اشلوک گانے کی آواز بند ہو گئی۔ اُرملا جلدی سے اُٹھی اور سرگوشی میں بولی۔

''کانچی آنے والی ہے۔ میں جاتی ہوں۔ مگر اسی جگہ پر رہوں گی۔ فکر نہ کرنا۔''

اُرملا کوٹھڑی سے دبے پاؤں نکل گئی۔ دروازہ بند کر کے اُس نے باہر سے کنڈی لگا دی۔ کچھ لمحے خاموشی چھائی رہی، پھر راہ داری میں کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی جو میری کوٹھڑی کے پاس آ کر رُک گئی۔ کسی نے باہر سے دروازے کی کنڈی اُتاری۔ دروازہ کھلا اور کانچی اندر آ گئی۔ طاق میں جلتی لالٹین کی روشنی میں، میں نے دیکھا کہ اُس نے اپنے جسم کے گرد گیروے رنگ کی چادر لپیٹ رکھی تھی اور اُس کا ایک کندھا ننگا تھا جیسے کہ جوگنیں اور جوگی اشنان کرنے کے بعد رکھا کرتے ہیں۔

میں بستر پر اُٹھ بیٹھا۔ کانچی نے آگے بڑھ کر میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور نیم وا ہونٹوں کے تبسم کے ساتھ بولی۔

''رہس لیلا کا سمے ہو گیا ہے...... میرے ساتھ آ جاؤ!''

میں اُس کے ساتھ چل پڑا۔ اُس وقت میں آدھا اپنے ہوش و حواس میں تھا، آدھا نہیں تھا۔ ایک لہر عقل کی آتی تھی اور ذہن سے جہالت غائب ہو جاتی تھی۔ دوسرے لمحے جہالت کی لہر آتی تھی اور عقل غائب ہو جاتی تھی۔ سندھیا کے کمرے میں لالٹین کی لَو نیچی کر دی گئی تھی۔ مورتی کے آگے فرش پر چادر بچھی تھی اور کانسی کی تھالی میں لوبان اور بخورات سلگ رہے تھے۔ فضا اُن کی تیز خوشبوؤں سے بوجھل ہو رہی تھی۔ سندھیا نے بھی اپنے بدن کو گیروے رنگ کی چادر سے ڈھانپ رکھا تھا۔ ایک بازو اُس کا بھی چادر سے باہر تھا۔ اُنہوں نے مجھے اپنے درمیان بٹھا لیا اور مورتی پوجا شروع کر دی۔ مجھ پر ویسے ہی از خود رفتگی کی کیفیت طاری تھی۔ اُوپر سے کمرے میں پھیلی لوبان اور بخورات کی بوجھل خوشبوئیں مجھے اور زیادہ نڈھال کر رہی تھیں۔ دیر تک دونوں عورتیں بھجن کیرتن کرتی رہیں۔ جب کیرتن ختم ہو گیا تو سندھیا نے کانچی سے مخاطب ہو کر کہا۔

''دیوتاؤں کو سوم رس پلانے کا وقت ہو گیا ہے۔''

کانچی اُٹھ کر کونے میں گئی اور کانسی کی ایک کٹوری اور گلاسیاں لے کر آ گئی۔ اس کے ساتھ ہی سوم رس کا دور شروع ہو گیا...... اُنہوں نے خود سوم رس کے دو دو گلاس پئے اور مجھے صرف ایک گلاس پینے کو دیا۔

شاید وہ نہیں چاہتی تھیں کہ مجھے زیادہ نشہ ہو۔ میں نے یہ ظاہر کیا کہ میں بہت زیادہ

سرور کی حالت میں ہوں۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھیں۔ پھر وہ ڈرامہ شروع ہو گیا جس کا مجھے انتظار تھا...... سب سے پہلے سندھیا پیار سے میری گردن اور چہرے پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ پھر میرا ماتھا چوم کر میری گردن کے ساتھ منہ لگا دیا...... مجھے گردن میں سوئی چبھنے کی ہلکی سی درد ہوئی۔ اُس نے دانت سے میری گردن پر ایک جگہ کاٹا تھا۔ میں بے حس وحرکت لیٹا رہا۔ اُس نے ہونٹ میری گردن کے ساتھ لگا رکھے تھے۔ جب اُس نے اپنا چہرہ الگ کیا تو لالٹین کی روشنی میں مجھے اُس کے ہونٹوں پر خون لگا ہوا نظر آیا۔ میرے خون کا زہر اُس کے خون میں شامل ہو چکا تھا۔ یہ میری پہلی فتح تھی۔ اگر واقعی میرے خون میں وش کنیا کی بوٹی کا زہر ملا ہوا تھا تو پھر سندھیا کا تھوڑی دیر میں کام تمام ہونے والا تھا۔ میں پوری طرح اپنے ہوش وحواس میں تھا۔

سندھیا سوم رس اور خون کے نشے میں اُٹھ کر مورتی کے آگے رقص کرنے لگی۔ میں کانچی کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا کہ وہ بھی آ کر میرے خون کے چند قطرے پئے اور میری اُس سے ہمیشہ کے لئے جان چھوٹے۔ مگر وہ سندھیا کے ساتھ رقص میں شامل ہو گئی تھی۔ میں نے نشے اور سرور میں ڈوبے ہوئے انسان کی اداکاری کرتے ہوئے لیٹے لیٹے اپنا ہاتھ کانچی کی طرف بڑھایا اور کہا۔

''کانچی! میرے پاس نہیں آؤ گی؟''

کانچی نے رقص کرتے ہوئے میری طرف نگاہ ڈالی اور اسی طرح رقص کرتی میرے پاس آ گئی۔ اُس کی آنکھوں سے درندگی اور وحشت برس رہی تھی۔ اُس نے حلق سے عجیب سی ڈراؤنی آواز نکالی اور اپنا منہ میری گردن پر اُس جگہ رکھ دیا جہاں خون لگا ہوا تھا۔ اُس کی زبان میری گردن کے زخم پر چلنے لگی۔ جیسے ہی اُس کی زبان میری گردن کے زخم پر دائیں بائیں گھومی، وہ تڑپ کر مجھ سے الگ ہو گئی اور میرا خون تھوکتے ہوئے چیخ کر کہا۔

''سندھیا! اس کے خون میں وش کنیا کا زہر ہے......''

ہمارا راز فاش ہو چکا تھا...... میں جلدی سے اُٹھ کر بیٹھ گیا اور سندھیا کی طرف دیکھا۔ سندھیا پر زہر اپنا اثر کر چکا تھا۔ وہ رقص کرتے کرتے چکرا کر گر پڑی۔ کانچی کا سر بھی ڈولنے لگا۔ میں وہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا مگر بھاگنے سے پہلے کانچی کو مرتے

دیکھنا چاہتا تھا تاکہ مجھے یقین ہو جائے کہ کانچی اب میرا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی اور یہ کہ وہ مر چکی ہے۔

لیکن کانچی زندہ تھی۔ ابھی مری نہیں تھی۔ وہ مورتی کے آگے کھڑے ڈول رہی تھی جیسے ابھی گر پڑے گی۔ میں اُس کی موت کے انتظار میں ایک طرف دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا تھا۔ اچانک کانچی نے سر اُٹھا کر میری طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھیں شعلے برسا رہی تھیں۔ وہ سنبھل گئی تھی۔ اُس نے منہ اُوپر کر کے ایک خوفناک قہقہہ لگایا۔ مورتی کے پاس پڑی ہوئی چھری اُٹھائی اور چیخ کر کہا۔

''سندھیا مر گئی ہے...... میں زندہ ہوں۔ دیوتاؤں نے مجھے بچا لیا ہے۔ دیوتا تیرا خون میں ڈوبا کٹا ہوا سر مانگتے ہیں۔''

میں ڈر گیا۔ میں نہتا تھا اور پوری طرح ہوش میں بھی نہیں تھا۔ میں ڈر کر دروازے کی طرف دوڑا۔ کانچی چھری لہرا کر مجھ پر جھپٹی ...... میں کسی شے سے ٹکرایا اور لڑکھڑا کر گر پڑا۔ کانچی ایک بھیانک چیخ کے ساتھ مجھ پر حملہ آور ہوئی......

قریب تھا کہ وہ میری گردن پر چھری چلا دیتی کہ عین اُسی وقت دھڑاک سے دروازہ کھلا اور اُرملا نے اندر آتے ہی ویدک سنسکرت کے کسی شبد کا نعرہ لگایا۔ اُس شبد کو سنتے ہی کانچی وہیں رُک گئی۔ اُس کا چھری والا ہاتھ اُوپر کو اُٹھے کا اُٹھا رہ گیا۔ اُس کے بدن پر لرزہ طاری ہو گیا۔ اُس کی اُس وقت کی شکل مجھے ساری زندگی یاد رہے گی۔ اُس نے میری گردن کے زخم کا جو تھوڑا بہت خون چاٹ کر تھوک دیا تھا وہ اُس کے ہونٹوں اور تھوڑی پر ابھی تک لگا ہوا تھا۔ اُس کی سرخ آنکھوں سے چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں۔ اُس کا سارا جسم کانپ رہا تھا۔ چھری اچانک اُس کے ہاتھ سے گر پڑی اور وہ ایک طوفانی بگولے کی طرح ڈرا دینے والے شور کے ساتھ کوٹھڑی کے دروازے سے نکلتے ہی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔

اُرملا نے جلدی سے مجھے بازوؤں سے پکڑ کر اُٹھایا۔ میرا سر گھوم رہا تھا۔ جسم میں سے جیسے آدھی جان نکل گئی تھی۔ اُرملا نے سہارا دے کر مجھے دیوار کے ساتھ لگے پلنگ پر بٹھا دیا اور بولی۔

''تم نے تو اُن میں سے کسی کا خون نہیں پیا؟''

میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ اُرملا اُٹھ کر سندھیا کی لاش کے پاس گئی اور جھک کر غور سے دیکھنے لگی۔ پھر میرے پاس آ کر بیٹھ گئی اور بولی۔

''سندھیا تو مر چکی ہے۔ کانچی کو بھی مر جانا چاہئے تھا۔ وہ کیسے زندہ بچ گئی؟ اُس کے ہونٹوں پر تو تمہارا خون لگا ہوا تھا۔ کیا اُس نے تمہارا خون نہیں پیا تھا؟''

میری حالت اُرملا کے آ جانے اور کانچی کے بھاگ جانے کی وجہ سے کافی سنبھل گئی تھی۔ میں نے کہا۔

''یہ کام سب سے پہلے سندھیا نے کیا تھا۔ اُس کے جسم میں میرا خون پوری طرح شامل ہو گیا تھا۔ اس کے بعد جب کانچی نے میری گردن پر منہ رکھا تو میری گردن کے زخم پر دو تین بار زبان پھیرنے کے بعد ایک دم سے پیچھے ہٹ گئی اور بار بار خون تھوکنے لگی اور چیخنے چلانے لگی۔''

''اُس نے زبان سے کچھ کہا تھا؟'' اُرملا نے سوال کیا۔

میں نے جواب دیا۔ ''ہاں...... اُس نے میری طرف خونخوار آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا تھا کہ سندھیا تو مر چکی، میں زندہ ہوں۔ دیوتاؤں نے مجھے بچا لیا۔ دیوتا تیرا خون میں ڈوبا کٹا ہوا سر مانگتے ہیں۔ اور چھری لے کر اُس نے مجھ پر حملہ کیا ہی تھا کہ میں گھبرا کر دروازے کی طرف بھاگا اور کسی چیز سے ٹھوکر کھا کر گر پڑا۔ اس کے بعد تم اندر آ گئیں۔''

اُرملا نے پوچھا۔

''اُس کو معلوم تو نہیں ہوا کہ تمہارے خون میں وش کنیا کا زہر ملا ہوا ہے؟''

میں نے کہا۔ ''ہاں...... اُس نے خون تھوکتے تھوکتے چیخ کر کہا تھا، سندھیا! اس کے خون میں وش کنیا کا زہر ہے......''

اُرملا کے چہرے پر گہری سوچ اُبھر آئی۔ اُس کے منہ سے جیسے اپنے آپ نکل گیا۔

''یہ اچھا نہیں ہوا۔''

میں پریشان ہو گیا۔ میں نے پوچھا۔ ''اب کیا ہو گا؟''

اُرملا مجھے جواب دینے کی بجائے اُٹھی اور سندھیا کی لاش کے پاس چلی گئی۔ میں بھی اُس کے پیچھے پیچھے گیا۔ سندھیا کی لاش کالی سیاہ پڑ گئی تھی۔ اُرملا نے مجھ سے کہا۔

''وہ چھری اُٹھا کر لاؤ!''

کانچی کے ہاتھ سے گری ہوئی چھری دروازے کے پاس ہی پڑی تھی۔ میں نے جلدی سے چھری لا کر اُرملا کو دی۔ اُرملا نے چھری سے سندھیا کے سیاہ بالوں کی ایک لٹ کاٹ کر اپنی پتلون کی جیب میں رکھ لی اور بولی۔

''یہاں سے نکل چلو!''

مجھے ڈر تھا کہ کانچی ضرور راہ داری میں کسی جگہ چھپی ہوئی ہو گی اور جیسے ہی میں اُس کے قریب سے گزروں گا تو وہ مجھ پر حملہ کر دے گی۔ جب میں نے اُرملا سے اپنے اس اندیشے کا اظہار کیا تو وہ بولی۔

''وہ اب یہاں نہیں ہے۔ یہی ہماری بدقسمتی ہوئی ہے کہ وہ ہمارے ہاتھ سے نکل گئی ہے۔ مجھے اس وقت تمہاری فکر پڑ گئی تھی کہ کہیں تم پر بھی زہر کا اثر نہ ہو گیا ہو۔ میں تمہیں سنبھالنے لگی تو کانچی کو بھاگنے کا موقع مل گیا۔ ورنہ وہ یہاں سے زندہ بچ کر نہیں جا سکتی تھی۔ اُس لمحے کانچی پر میرے خفیہ ویدک منتر کا اثر بہت شدید اور گہرا تھا۔ اب اُس پر اپنی خفیہ طاقت غالب آ گئی ہو گی۔''

ہم خونی مندر کی پراسرار خاموش راہ داری میں سے گزر رہے تھے۔ میں کانچی کے زندہ بچ نکلنے سے اس قدر خوفزدہ تھا کہ اُرملا کے بالکل ساتھ لگ کر چل رہا تھا۔ ہم مندر سے باہر نکل آئے۔

باہر جنگل میں رات کا تاریک سناٹا چھایا ہوا تھا۔ مجھے ایسے لگ رہا تھا کہ کانچی اچانک چیخ مار کر کسی درخت کے پیچھے سے نکل آئے گی۔ اُرملا کے ساتھ ہونے سے مجھے کچھ حوصلہ ہی ہو رہا تھا۔ یہ بات ثابت ہو چکی تھی کہ اُرملا کو دیکھ کر کانچی پر لرزہ طاری ہو گیا تھا اور وہ بھاگ گئی تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی یقینی تھی کہ چونکہ کانچی مری نہیں تھی اس لئے میرے سر پر اُس کے جادوئی منتر کا اثر ابھی زندہ تھا۔ جب میں نے اس بارے میں اُرملا سے پوچھا تو وہ کہنے لگیں۔

''چونکہ وہ زندہ ہے۔ اس لئے اُس کے جادو کا اثر بھی تمہارے جسم میں موجود رہے گا۔ لیکن میرے ہوتے ہوئے یہ جادو تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔''

اُرملا ٹھیک کہتی تھی مگر ہر وقت نہ میں اُرملا کے ساتھ رہ سکتا تھا اور نہ وہ میرے ساتھ

رہ سکتی تھی۔ ہم خونی مندر والے درختوں کے جھنڈ سے نکل کر اُس کے پیچھے واقع قدیم
تالاب کے کنارے کنارے جا رہے تھے۔ رات کا اندھیرا چاروں طرف پھیلا ہوا تھا۔
یہ جگہ گھنے درختوں سے کچھ کچھ خالی تھی۔ ورنہ یہ وسطی ہند کے گھنے جنگلوں کا سلسلہ تھا جو
جنوب تک پھیلتا چلا گیا تھا۔ میں نے اُرملا سے پوچھا۔

''ہم کہاں جا رہے ہیں؟''

''واپس۔'' اُس نے جواب دیا۔ ''اب ہمارا یہاں کیا کام ہے؟''

میں نے اُرملا سے پوچھا۔ ''کیا میں ایک بات تم سے پوچھ سکتا ہوں؟''

''پوچھو!'' اُس نے چلتے ہوئے کہا۔

میں نے کہا۔ ''تم نے سندھیا کے بالوں کی لٹ کس لئے کاٹی تھی؟''

اُرملا کہنے لگی۔ ''وہ میں تمہیں اپنے ٹھاکر محل میں جا کر بتاؤں گی۔''

میں سمجھ گیا کہ اس میں ضرور کوئی گہرا راز ہے جو اُرملا مجھے اس وقت بتانا نہیں چاہتی
تھی۔ اُرملا تالاب کے کنارے ایک پتھر کی سِل پر بیٹھ گئی اور بولی۔

''یہاں میرے پاس آ کر بیٹھ جاؤ!''

میں اُس کے پاس بیٹھ گیا۔ اُس نے کہا۔

''گردن پر سے کپڑا ہٹا کر مجھے وہ جگہ دکھاؤ جہاں سندھیا نے اپنا دانت چبھویا تھا۔''

گردن کے زخم پر کبھی کبھی مجھے ہلکی سی درد ہو جاتی تھی۔ میں نے قمیض گردن سے
ہٹائی۔ اُرملا نے گردن پر اُنگلی پھیری اور جہاں زخم پر خون جم چکا تھا وہاں اُنگلی رکھ کر بولی۔

''صبح تک یہ زخم ٹھیک ہو جائے گا۔ تمہارے خون میں جو زہر شامل ہو چکا ہے وہ
اسے ٹھیک کر دے گا۔''

مجھے پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے تالاب کا پانی پینا چاہا تو اُرملا نے مجھے منع کر
دیا۔ ''نہیں...... یہ پانی مت پینا۔ آگے ایک ندی آتی ہے۔ اُس کے پانی سے پیاس بجھا
لینا۔''

ہم اُٹھ کر چلنے لگے۔ جس وقت ہم گھنے جنگل کے علاقے سے باہر آئے اُس وقت
رات ڈھل رہی تھی اور آسمان پر مشرق کی جانب ستاروں کی چمک ماند پڑنے لگی تھی۔ اور
دُور سے اُچیت گڑھ کے ریلوے سٹیشن کے سگنل کی سرخ بتی جھلملاتی دکھائی دے رہی

تھی۔ یہاں درختوں کے درمیان ندی بہہ رہی تھی۔ میں نے ندی کا پانی پیا اور اُچیت
گڑھ سٹیشن کی سمت چلنے لگے۔

سٹیشن رات کے پچھلے پہر ویران پڑا تھا۔ سٹیشن کی ڈیوڑھی کی بتی روشن تھی۔ ہم
ڈیوڑھی میں ہی ایک بنچ پر بیٹھ گئے۔ میں نے اُرملا سے تشویش کے لہجے میں کہا۔

''کاش! سندھیا کے ساتھ کانچی بھی مر جاتی۔ سندھیا کو میرے خون کے زہر کا پتہ
نہیں چلا تھا مگر کانچی تو زبان لگاتے ہی پرے ہٹ گئی اور خون تھوکنے لگی۔ ایسا کیوں
ہوا؟''

اُرملا نے قدرے خاموشی کے بعد کہا۔

''کانچی کے پاس سندھیا سے زیادہ ویدک شکتی ہے۔ اُسے اُس کی شکتی نے بتا دیا تھا
کہ تمہارے خون میں زہر شامل ہے اور زہر بھی وش کنیا کی بوٹی کا ہے جو بڑا قاتل زہر
ہوتا ہے۔''

میں خاموشی سے سنتا رہا۔ اُرملا کہنے لگی۔

''اور کانچی کو یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ تمہارے پیچھے کسی کی زبردست شکتی کام کر رہی
ہے جس نے ان دونوں کو ہلاک کرنے کا منصوبہ بنا کر تمہیں وہاں بھیجا اور تمہیں وش کنیا
کا زہر پلا دیا۔ اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ یہ کوئی بہت بڑی شکتی ہے جس کی وجہ سے تم پر
زہر کا اثر نہیں ہوا۔ یہی وجہ تھی کہ اُس نے تمہیں اُسی لمحے قتل کرنے کی کوشش کی۔ پھر
جب اچانک مجھے سامنے دیکھا تو ساری بات اُس کی سمجھ میں آ گئی اور میری زبردست
شکتی کے سامنے اُس پر لرزہ طاری ہو گیا۔ تمہیں گرا ہوا دیکھ کر میری توجہ کانچی سے ہٹ
گئی اور کانچی کو جان بچا کر بھاگ جانے کا موقع مل گیا۔''

''مگر وہ کہاں چلی گئی تھی؟ ہو سکتا ہے وہ ہمارا پیچھا کر رہی ہو۔'' میں نے کہا۔

''وہ اتنی بیوقوف نہیں ہے کہ مجھے تمہارے ساتھ دیکھ کر وہ تمہارا پیچھا کرے۔'' اُرملا
بولی۔

میں نے تجسس سے پوچھا۔

''لیکن وہ غائب تو ہو ہی نہیں سکتی۔ ضرور یہیں کہیں آس پاس ہی ہو گی۔''

اُرملا نے مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''فکر مت کرو...... وہ ہمارے آس پاس نہیں ہے۔''

صبح ہو رہی تھی۔ رات کا اندھیرا چھٹنے لگا تھا۔ کچھ دیہاتی مسافر سامان اُٹھائے ڈیوڑھی میں آ کر بیٹھ گئے۔ اُرملا کہنے لگی۔ ''چلو! ٹکٹ لے آئیں۔''

میں نے کہا۔ ''تم بیٹھو! میں جا کر لے آتا ہوں۔''

وہ بولی۔ ''نہیں...... تمہیں اکیلے نہیں جانا چاہئے۔''

ٹکٹ گھر ڈیوڑھی کے باہر ایک جانب تھا۔ ہم نے وہاں سے جے پور کے دو ٹکٹ لئے اور پلیٹ فارم پر آ گئے۔ دن نکل آیا تھا جب ٹرین آ کر پلیٹ فارم پر رُک گئی۔ ہم ایک ڈبے میں چڑھ گئے۔ ورنگل سے ہم نے جے پور جانے والی گاڑی پکڑی اور اپنی منزل کی طرف چل پڑے۔ ایک بار پھر ٹرین کا ایک طویل تھکا دینے والا سفر شروع ہو گیا۔ ایک دن، ایک رات اور دوسرا آدھا دن ٹرین میں سفر کرتے گزر گیا۔ تیسرے پہر ٹرین جے پور پہنچی۔ اُرملا کے ٹھاکر محل میں آ کر ہم نے منہ دھویا، کپڑے بدلے اور چائے پی۔ پھر اُرملا میرے کمرے میں آ گئی۔ اُس نے ساڑھی پہن رکھی تھی۔ تھیلا اُس کے ہاتھ میں تھا جو اُس نے میز پر رکھ دیا اور اُس میں سے ایک زرد رنگ کا چھوٹا سا لفافہ نکالا، اُسے کھولا اور سندھیا کے سیاہ بالوں کی لٹ نکال کر مجھے دکھائی اور بولی۔

''اگر سندھیا کی لاش وہاں پر نہ ملتی اور میں اُس کے بالوں کی لٹ کاٹ کر نہ لاتی تو ہمارے لئے کانچی کا کام تمام کرنا شاید ناممکن تھا۔''

میں نے کہا۔ ''میں تمہاری بات سمجھ نہیں سکا۔''

اُرملا نے بالوں کی لٹ دوبارہ لفافے میں بند کر کے لفافہ تھیلے میں رکھ لیا اور کہنے لگی۔

''جب تک تمہیں ساری بات کا پتہ نہیں چلے گا تمہاری سمجھ میں کچھ نہیں آئے گا۔''

مجھ پر مایوسی اور نااُمیدی کے سائے چھانے لگے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ معاملہ اُلجھتا چلا جا رہا ہے اور شاید اب اُرملا بھی اندھیرے میں بھٹک رہی ہے۔ اُس کی سمجھ میں بھی کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اُرملا میرے سامنے آرام کرسی پر بیٹھی تھی۔ اُس نے کھلے بال ریشم کے سرخ فیتے سے باندھ رکھے تھے۔ وہ میک اَپ کے بغیر بھی بڑی خوبصورت لگ رہی تھی۔ مگر اُس وقت مجھے اپنی جان کی پڑی ہوئی تھی۔ اُرملا کی خوبصورتی کا مجھ پر کچھ اثر نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے بے دِلی سے پوچھا۔

''مجھے سمجھاؤ! کہ اصل بات کیا ہے؟''

اُرملا نے اپنے ماتھے پر آئی ہوئی بالوں کی ایک لٹ کو ہاتھ سے پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا۔ ''شیراز...... میں تمہیں دریا سے نکال کر لے آئی ہوں۔ اب تمہارے سامنے ایک سمندر ہے جس کی تہہ میں کئی طوفان چھپے ہوئے ہیں۔ سمندر کا یہ سفر تمہیں اکیلے ہی طے کرنا ہوگا۔''

میں نے کہا۔

''اُرملا! معاملے کو اور زیادہ مت اُلجھاؤ۔ صاف صاف بتاؤ تم کیا کہنا چاہتی ہو؟''

اُس نے ہاتھ اُٹھا کر مجھے پُرسکون رہنے کا اشارہ کیا۔ خود بھی چند سیکنڈ تک خاموش رہی، پھر گہرا سانس بھر کر بولی۔

''کانچی کے علم میں یہ بات آ چکی ہے کہ تمہارے پیچھے میری شکتی کام کر رہی ہے۔ اب وہ تمہارے سامنے آنے کی بجائے پوشیدہ رہ کر تمہیں اپنے جال میں پھنسانے کی سرتوڑ کوشش کرے گی۔ اس کے باوجود تمہیں اُس کے پاس جانا ہوگا۔''

میں حیران ہو کر اُس کا منہ تکنے لگا کہ یہ اُس نے کیا کہہ دیا ہے؟ وہ خود مجھے اُس عورت کے چنگل سے نکال کر لائی ہے اور اب پھر مجھے اُسی عورت کے پاس بھیج رہی ہے۔ وہ کہنے لگی۔

''میں جانتی ہوں تمہیں یہ سن کر حیرانی ہوئی ہے کہ میں تمہیں خود موت کے منہ میں بھیج رہی ہوں۔ لیکن میں تمہیں تمہاری جان کی دشمن کانچی سے ہمیشہ کے لئے نجات دلانا چاہتی ہوں اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے تمہارا کانچی کے پاس جانا ناگزیر ہے۔''

''مگر کیوں اُرملا؟'' میں نے پوچھا۔ ''اب تو وہ مجھے دیکھتے ہی ہلاک کر ڈالے گی۔''

اُرملا بولی۔ ''یہ تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ لیکن اگر میں یہ کہوں کہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے اور تمہیں اپنی زندگی بچانے کے لئے کانچی کے پاس جانا ہی ہوگا تو پھر تم کیا کہو گے؟ کیا اُس کے پاس نہیں جاؤ گے؟''

''مگر وہ تو میری موت کا پیغام ہے۔ میں اُس کے پاس گیا نہیں کہ وہ فوراً مجھے اپنے منتروں کے طلسم میں جکڑ کر میرا سر کاٹ کر اپنی دیوی کو پیش کر دے گی۔'' ''تم مجھے صرف اتنا بتا دو! کہ میرا اُس قاتل عورت کے پاس جانا اتنا ضروری کیوں ہے؟''

اس سوال پر اُرملا نے کہا۔
''میں تمہیں بتاتی ہوں...... تمہیں یاد ہے میں نے خونی مندر میں سندھیا کی کوٹھڑی میں پڑی اُس کی لاش کے سر کے بال کاٹے تھے۔''
''ہاں...... مجھے یاد ہے۔'' میں نے فوراً کہا۔
اُرملا بولی۔
''میں نے یونہی سندھیا کی لاش کے سر کے بال نہیں کاٹے تھے۔ اُس میں ایک راز تھا۔ وہ راز یہ تھا کہ ان بالوں کی مدد سے تم کانچی سے نجات حاصل کر سکتے ہو۔''
میں نے اور زیادہ حیران ہوتے ہوئے کہا۔ ''وہ کیسے؟''
اُرملا نے کہا۔ ''میں تمہیں پہلے بھی بتا چکی ہوں کہ کانچی کے پاس زبردست خفیہ ویدک طاقت ہے۔''
میں نے فوراً کہا۔ ''مگر یہ طاقت تو تمہارے پاس بھی ہے۔''
اُرملا نے جواب میں کہا۔
''میری اور کانچی کی طاقت میں فرق ہے۔ یہ ایک بنیادی فرق ہے۔ میں نے اپنے شوق اور اپنی سادھنا (ریاضت) سے چاروں ویدوں کی خفیہ طاقت حاصل کی ہے۔ جبکہ یہ خفیہ طاقت کانچی کے خون میں شامل ہو چکی ہے۔ اُس نے اپنے باپ دادا سے یہ علم حاصل کیا اور طاقت حاصل کر رکھی ہے۔''
میں نے اعتراض کرتے ہوئے کہا۔
''اگر ایسی بات ہے تو پھر تمہیں اپنے سامنے دیکھ کر کانچی پر لرزہ کیوں طاری ہو گیا تھا؟ اور وہ بھاگ کیوں گئی تھی؟''
اُرملا نے کہا۔ ''اس کی ایک وجہ ہے۔ یاد رکھو! بدی چاہے کتنی طاقتور، کتنی زبردست ہو جائے، جب نیکی سے اُس کا آمنا سامنا ہو گا تو بدی کے قدم ضرور ڈگمگا جائیں گے۔ کانچی اپنی طاقت کو برائی کے لئے استعمال کرتی ہے، جبکہ میں اپنی طاقت کو انسانیت کی بھلائی کے لئے استعمال کرتی ہوں۔ اس طرح میری طاقت نیکی کی طاقت ہے اور کانچی کی طاقت بدی کی طاقت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ چھری اُٹھا کر تمہیں قتل کرنے والی تھی تو اچانک میرے سامنے آ جانے سے اُس پر لرزہ طاری ہو گیا اور وہ گھبرا کر

گ گئی۔
میں نے کہا۔
''لیکن میرے پاس تو تمہاری طاقت نہیں ہے۔ پھر میں اُس کے سامنے جانے کی ات کیسے کر سکتا ہوں؟ وہ تو اسی وقت مجھے جان سے مار ڈالے گی۔ لیکن میں تم سے پھر سوال کروں گا کہ جان کا خطرہ مول لے کر میرا کانچی کے پاس جانا کیوں ضروری ؟''
اُرملا بولی۔
''یہی میں تمہیں بتانے والی تھی کہ تم بیچ میں بول پڑے ہو۔ اب چپ رہ کر جو کچھ کہتی ہوں وہ سنو۔ اس کے بعد تم خود ہی فیصلہ کرنا کہ تمہیں کانچی کے پاس یا دوسرے لوں میں موت کے منہ میں جانے کا خطرہ مول لینا چاہئے یا نہیں۔''
''ٹھیک ہے...... میں نہیں بولوں گا۔'' میں یہ کہہ کر خاموش ہو گیا۔
اُرملا بات آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔
''یہ بات طے ہے کہ تمہیں کانچی کی موت کی صورت میں ہی اُس سے نجات مل سکتی ہے۔ اور وہ بھی اس حالت میں ممکن ہے کہ کانچی کو اس طریقے سے موت کے گھاٹ ارا جائے جو طریقہ ایسی جادوگرنی عورتوں کے لئے ویدوں میں لکھا گیا ہے۔ اگر یے تم اُس کو دُور سے گولی مار کر ہلاک کرو گے تو اُس کی آتما تمہارے سر پر سوار ہو ائے گی اور پھر وہ بڑی آسانی سے تمہارا کام تمام کر سکے گی۔ لیکن اگر ویدوں کے ئے ہوئے طریقے سے اُسے ہلاک کیا جائے گا تو اُس کی بری اور گناہ گار آتما اپنے پ گندے تالابوں کی جونک کا جنم لے لے گی اور تمہیں ہمیشہ کے لئے اُس سے کارا مل جائے گا۔''
''ویدوں میں کون سا طریقہ بتایا گیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔
اُرملا بولی۔ ''وہی میں تمہیں بتانے جا رہی تھی۔ سنو! میں نے سندھیا کے بالوں کی ٹ کاٹ کر اپنے پاس رکھ لی ہے۔ اب اگر کسی طرح کانچی کے بالوں کی لٹ ہمیں مل ئے تو میں سندھیا اور کانچی دونوں کے بالوں کی لٹوں کو جلا کر ان کی راکھ پر ویدک روں کا ایک خاص عمل کروں گی۔ اس کے بعد اگر وہ راکھ سوم رس میں ملا کر کانچی کو

کسی طرح پلا دی جائے تو اُس کی حقیقی موت واقع ہو جائے گی اور اُس کی آتما گندے تالاب کی جونک کی شکل میں جنم لے کر قیامت تک تم سے دُور ہو جائے گی اور تم اُس کے جادو ٹونے سے آزاد ہو کر نئی زندگی شروع کر سکو گے۔ پھر تمہیں میری حفاظت کی بھی ضرورت نہیں رہے گی۔ تم جہاں چاہو آزادی سے آ جا سکو گے۔''

میں بڑے غور سے سن رہا تھا۔ اُرملا نے اپنی بات ختم کی تو میں نے کہا۔

''لیکن اُرملا! میں سمجھتا ہوں کہ یہ کام تم بڑی آسانی سے کر سکتی ہو۔ تمہارے پاس اُس سے زیادہ شکتی ہے۔''

اُرملا کہنے لگی۔

''میں جانتی تھی کہ تم یہی کہو گے۔ لیکن تم بھول گئے ہو کہ کانچی کبھی میرے سامنے نہیں آئے گی۔ اُس کے بالوں کی لٹ کاٹنا تو دُور کی بات ہے وہ میرے قریب بھی نہیں پھٹکے گی۔''

میں نے کہا۔ ''لیکن میں یہ کام کیسے کر سکوں گا؟ اُس کو تو پہلے سے معلوم ہے کہ میں نے اُس کے خون میں اپنے خون کا زہر شامل کر کے اُسے ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی اور اُس کی سہیلی سندھیا کو میں اس طرح ہلاک کر چکا ہوں۔ اب وہ مجھے اتنی مہلت کیسے دے گی کہ میں اُس کے بالوں کی لٹ کاٹ سکوں؟ وہ تو مجھے دیکھتے ہی میرا کام تمام کر ڈالے گی۔''

اُرملا نے کہا۔ ''مجھے یہ سب معلوم ہے۔ لیکن ایک بات تم بھول رہے ہو کہ کانچی کو تمہارے خون کا نشہ بھی لگ چکا ہے۔ اگر تم اُس کے پاس گئے تو وہ سب سے پہلے تمہارے خون سے اپنا نشہ پورا کرے گی، اس کے بعد تمہیں ماتا دیوی کی بھینٹ چڑھانے کی تدبیر کرے گی۔ اب یہ تم پر منحصر ہے کہ جب وہ تمہیں تمہارے خون سے اپنی پیاس بجھانے کی مہلت دے تو تم کوئی ایسی ترکیب کرو کہ اُس کے بالوں کی لٹ کاٹ ڈالو اور پھر وہ لٹ لے کر میرے پاس آ بھی جاؤ۔''

میں نے کہا۔

''کیا کانچی مجھے اتنی مہلت دے دے گی کہ میں اُس کے بالوں کی لٹ کاٹ کر تمہارے پاس لے آؤں، تم اُس کے بالوں کو سندھیا کے بالوں کی لٹ سے ملا کر دونوں

کو جلا کر راکھ کرو اور اُس راکھ پر ویدک منتروں کا عمل کرو اور میں وہی راکھ لے کر دوبارہ کانچی کے پاس جاؤں اور اُس راکھ کو سوم رس میں ملا کر کانچی کو پلانے کی کوشش کروں..... نہیں اُرملا! نہیں..... یہ بڑا لمبا سلسلہ ہے۔ کانچی کسی حالت میں مجھے اتنی مہلت نہیں دے گی۔ لیکن میرے خون میں وش کنیا کی بوٹی کا زہر شامل ہو گیا ہے۔ اگر فرض کر لیا میں کانچی کے پاس چلا جاتا ہوں اور وہ میرے خون سے اپنی پیاس بجھاتی ہے تو جب میرے خون کا زہر اُس کے خون میں شامل ہو جائے گا تو وہ تو اُسی وقت مر جائے گی۔ پھر اُس کے بالوں کی لٹ کاٹنے کی کیا ضرورت ہے۔ کیا ایسا نہیں ہو گا؟''

اُرملا کہنے لگی۔

''پہلی بات تو یہ ہے کہ اب تک تمہارے خون میں سے وش کنیا کی بوٹی کے زہر کا اثر ختم ہو چکا ہو گا۔ فرض کر لیا اگر میں تمہیں دوبارہ وش کنیا بوٹی کا زہر پلا کر بھیجتی ہوں تو کانچی دوسری بار دھوکہ نہیں کھائے گی۔ وہ تمہارے خون سے اپنی پیاس بجھانے، اپنا نشہ پورا کرنے سے پہلے تمہارے خون کو زبان سے چکھ کر دیکھے گی۔ اگر تمہارے خون میں زہر ملا ہوا ہو گا تو کانچی کو فوراً پتہ چل جائے گا اور وہ وہیں تمہیں موت کے گھاٹ اُتار دے گی۔''

میں نے عاجز آتے ہوئے پوچھا۔

''خدا کے لئے مجھے یہ بتاؤ! کہ تمہارے پاس ایسی کون سی ترکیب ہے کہ جس پر عمل کرتے ہوئے میں کانچی کے پاس جا کر اُس کے بالوں کی لٹ کاٹ کر تمہارے پاس لا سکتا ہوں؟ اور پھر دونوں لٹوں کو جلا کر اُس کی راکھ لے کر واپس بھی کانچی کے پاس جا سکوں گا؟ یہ سب کچھ مجھے ناممکن لگتا ہے۔''

اُرملا بولی۔ ''اگر تم ہمت سے کام لو تو یہ ناممکن نہیں ہے۔ ایسا ہو سکتا ہے۔ اور تمہیں ہمت سے کام لینا پڑے گا۔ کیونکہ یہ کانچی کی موت کا ہی نہیں، تمہاری زندگی اور موت کا مسئلہ بھی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''تو پھر بتاؤ! تم نے کیا سوچا ہے؟''

اس کے بعد اُرملا نے مجھے جو ترکیب بتائی اُس میں کامیابی کا امکان صرف ایک فیصد تھا۔ ننانوے فیصد میری موت ہی موت تھی۔ اگر میں جان کی بازی لگا کر اُرملا کی

بتائی ہوئی ترکیب پر عمل نہیں کرتا ہوں اور کانچی زندہ رہتی ہے تو وہ طائرِ موت بن کر مجھے
کہیں بھی جھپٹ کر مار سکتی تھی۔ اور اگر میں اُرملا کی بتائی ہوئی ترکیب پر عمل کرتا ہوں تو
اس میں ایک فیصد ہی سہی لیکن یہ امکان ضرور موجود تھا کہ میں کانچی کے ہاتھوں آنے
والی درندہ صفت موت سے نجات حاصل کرلوں۔ میرے سامنے دوسرا کوئی راستہ بھی
نہیں تھا۔ میں نے اُرملا کی حکمت عملی پر چلنے کا فیصلہ کرلیا۔ اُرملا نے میرا فیصلہ سن کر کہا۔

''مجھے پورا وشواش ہے اگر تم نے جرات اور ہوشمندی سے کام لیا تو تم اپنے مقصد
میں ضرور کامیاب ہو جاؤ گے۔''

میں نے گہرا سانس لے کر اُرملا سے کہا۔

''اُرملا! مجھ سے وعدہ کرو! کہ اگر میں کامیاب نہ ہوا اور کانچی کے ہاتھوں دیوی ماتا
کی بھینٹ چڑھ گیا تو میرے گھر والوں کو خط لکھ کر یہ بتا دینا کہ میں جنگل میں ایک آدم
خور شیر کے ہاتھوں مارا گیا ہوں اور میری غائبانہ نمازِ جنازہ ضرور پڑھ دیں۔ میں تمہیں
اپنے گھر کا ایڈریس ابھی لکھے دیتا ہوں۔ مجھے کاغذ پنسل لا دو!''

اُرملا بولی۔

''ایسی باتیں کیوں سوچتے ہو؟ تمہیں حوصلے سے کام لینا چاہئے۔ مجھے یقین ہے تم
کامیاب ہو کر واپس آؤ گے۔ اور پھر میں کسی نہ کسی جگہ تمہاری حفاظت کے واسطے موجود
ہوں گی۔''

مگر اب مجھے اُرملا کی مدد پر بھی زیادہ بھروسہ نہیں رہا تھا۔ کیونکہ یہ ایک لمبا منصوبہ تھا
اور اُسمیں قدم قدم پر میری جان جانے کا اندیشہ تھا۔ اُرملا کہاں کہاں مجھے بچا سکتی تھی؟
میرے اصرار پر اُرملا کاغذ پنسل لے آئی۔ میں نے اُس پر اپنے گھر کا ایڈریس لکھ کر
اُسے دے دیا۔ اُرملا نے اس موضوع پر مزید گفتگو کرنا مناسب خیال نہ کیا اور بولی۔

''تم تھوڑی دیر کے لئے آرام کرو! باقی باتیں رات کو کھانے کے بعد ہوں گی۔''

آرام کا لفظ میری زندگی کی ڈکشنری سے غائب ہو چکا تھا۔ وہ چلی گئی اور میں فکر و
تفکرات کے اندھیروں میں بھٹکنے لگا۔ مجھے نہیں پتہ کب شام اور پھر رات ہوگئی اور اُرملا
کے بوڑھے ملازم نے آ کر کہا کہ کھانا لگ گیا ہے ٹھاکرانی آپ کو بلا رہی ہیں۔ حویلی
کے ایک کمرے میں میز پر کھانا لگا دیا گیا تھا۔ میری بھوک بھی غائب تھی۔ جو مہم مجھے

درپیش تھی اور جسے مجھے اکیلے ہی سر کرنا تھا اُس کے قدم قدم پر پیدا ہونے والے
اندیشوں اور خطرات نے مجھے گھیر رکھا تھا۔ اُرملا نے غلط نہیں کہا تھا۔ اس خطرناک اور
جان لیوا منصوبے پر میرے سوا دوسرا کوئی عمل نہیں کر سکتا تھا۔ اُرملا میرے فکرمند چہرے
سے میرے دل کی حالت جان گئی تھی۔ ویسے بھی اُسے سب کچھ معلوم تھا۔ اُس نے میرا
ہاتھ تھام کر مجھے اپنے ساتھ والی کرسی پر بٹھا لیا اور بولی۔

''شیراز! اس طرح کیسے چلے گا؟ اگر پہلے قدم پر ہمت ہار بیٹھو گے تو منزل پر کیسے
پہنچ پاؤ گے؟ تمہیں زندہ رہنا ہے۔ ہر حالت میں زندہ رہنا ہے۔ اپنے لئے بھی اور
میرے لئے بھی......''

میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ اُس نے ویسے ہی کہہ دیا تھا یا اُس نے اپنے دل کی کیفیت
بیان کر دی تھی؟ لیکن اُس جملے نے مجھ پر زبردست اثر کیا۔ بالکل ایسے ہوا جیسے اچانک
گرجدار آواز کے ساتھ بجلی چمکی ہو اور اُس کی چمک نے میری رُوح میں ناقابلِ شکست
توانائی بھر دی ہو۔ مجھے اپنے جسم کے اندر ایک عجیب غیر انسانی طاقت کا احساس ہوا۔
میں نے اُرملا کی طرف چہرہ اُٹھایا اور کہا۔

''اُرملا! کیا واقعی میری زندگی تمہارے لئے بھی ضروری ہے؟''

اُرملا کے چہرے پر حیا کی سرخی دوڑ گئی۔ اُس نے نظریں جھکا لیں۔ میں نے اُس کا
ہاتھ تھام لیا۔ ''کیا یہ تمہارے دل کی آواز تھی اُرملا؟ کیا تم نے جو کچھ کہا، سچ ہے؟''

اُرملا نے دبی زبان میں کہا۔ ''تو کیا تم اسے جھوٹ سمجھتے ہو؟''

میں نے بے اختیار ہو کر اُس کا ہاتھ چوم لیا۔ اُس نے آہستہ سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور
بولی۔ ''اب کھانا کھاؤ! باقی باتیں پھر کریں گے۔''

میری بھوک چمک اُٹھی تھی۔ محبت میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ محبت آدمی کے مُردہ
جسم میں زندگی کی نئی لہر دوڑا دیتی ہے۔ مایوسی، اندیشوں اور نا اُمیدیوں کے سیاہ بادل
ایک دم سے چھٹ گئے تھے اور طاقت توانائی اور اُمید افزا روشنیوں کی نئی صبح طلوع ہو
رہی تھی۔ ہم نے بڑے خوشگوار موڈ میں کھانا کھایا۔ اُرملا کو بھی محسوس ہو گیا تھا کہ اُس
کے ذرا سے اظہارِ محبت نے میرے تنِ مُردہ میں نئی رُوح پھونک دی ہے۔ چنانچہ جب
کھانا کھانے کے بعد وہ میرے کمرے میں آئی تو میرے پاس پلنگ پر بیٹھ گئی۔ اُس نے

میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ کہنے لگی۔

''یہ مت سمجھنا! کہ میں نے تمہارا حوصلہ بڑھانے کی خاطر ایسی بات کہہ دی ہے۔ نہیں شیراز! میں ایسی عورت نہیں ہوں کہ جھوٹی باتوں سے تمہارا جی پرچانے کی کوشش کروں۔ مجھے اُسی لمحے تم سے پیار ہو گیا تھا جب تم نے مجھے جھیل میں ڈوبنے سے بچایا تھا۔ اس لئے نہیں کہ تم خوش شکل اور صحت مند نوجوان ہو، بلکہ اس لئے کہ تم نے میری جان بچانے کے لئے اپنی جان کی بازی لگا دی تھی۔ عورت ایسے مرد کو پسند کرتی ہے جو بہادر ہو اور اس کی حفاظت کے واسطے بڑے سے بڑا خطرہ مول لے سکے۔''

میں نے کہا۔ ''تم نے پہلے اس کا ذکر کیوں نہیں کیا؟''

اُرملا بولی۔ ''میں نے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ یاد رکھو! عورت مرد کی طرح پیار نہیں کرتی۔ مرد اندھا دُھند محبت کرتا ہے جبکہ عورت کی محبت رات کے پچھلے پہر چلنے والی نرم رو ہوا کا جھونکا ہوتی ہے جو نازک پھولوں کے قریب سے بھی بڑی احتیاط سے گزرتی ہے کہ کہیں اُس کے چھونے سے پھول کی پنکھڑیاں نہ بکھر جائیں۔''

ایسی شاعری میں پہلی بار اُرملا کی زبان سے سن رہا تھا۔ اُس نے میرے ہاتھ کو بڑی نرمی سے دباتے ہوئے کہا۔

''اس کے باوجود عورت چاہتی ہے کہ وہ اپنے محبوب کے سامنے محبت کا جی کھول کر اظہار کرے۔ میں بھی ایسا کرنا چاہتی تھی مگر غیر شعوری طور پر کسی موقع کا انتظار کر رہی تھی۔ اب شاید اس کا موقع آ گیا تھا اور میرے دل سے بے اختیار وہ بات نکل کر میری زبان پر آ گئی جسے میں نے ایک عرصے سے دل میں چھپا کر رکھا ہوا تھا۔

میرے کانوں میں اُرملا کے محبت بھرے بول میوزک کے لطیف سُر بن کر گونج رہے تھے۔ میں چاہتا تھا کہ وہ بولتی چلی جائے اور جو کچھ کہہ رہی ہے اُسے بار بار دہراتی چلی جائے۔ میں چپ تھا، صرف سن رہا تھا۔ اُرملا کہہ رہی تھی۔

''میں جانتی ہوں تمہارا مذہب کوئی اور ہے، میرا مذہب کوئی اور ہے۔ ہم زندگی بھر اکٹھے مل کر نہیں رہ سکتے۔ لیکن سچی اور حقیقی محبت ان باتوں سے بے نیاز ہوتی ہے۔ جسمانی محبت کا سفر جسم کے مر جانے پر ختم ہو جاتا ہے۔ مگر حقیقی اور سچی محبت کا سفر موت کے بعد بھی جاری رہتا ہے۔ موت اس کی پہلی منزل ہوتی ہے۔ اس کے آگے اُس کی

دوسری منزلوں کے سفر کا آغاز ہوتا ہے۔''

اُرملا کی باتیں مجھے نیا ولولہ، نئی طاقت بخش رہی تھیں۔ مجھے اپنے دل کی ہر دھڑکن کے ساتھ اس حقیقت کا احساس ہوتا تھا کہ میری زندگی کس قدر قیمتی ہے۔ اس کی صرف مجھے ہی نہیں اُرملا کو بھی ضرورت تھی۔ کیونکہ ہمارے جسم ہماری لافانی محبت کی پہلی منزل تھے۔ اگر ہمارے جسم نہ ہوتے تو ہم ایک دوسرے کو دیکھ بھی نہیں سکتے تھے۔ اور اگر دیکھتے نہیں تو محبت کیسے ہوتی؟ محبت کرنے والے جب ایک دوسرے کو دیکھ لیتے ہیں تو پھر چاہے ان کے جسم فنا ہو جائیں مگر اُن کی محبت کا سفر جاری وساری رہتا ہے۔

○○○

کچھ دیر تک ہم پیار محبت کی باتیں کرتے رہے۔

میری اس خطرناک مہم میں اُرملا کی محبت کی طاقت بھی شامل ہوگئی تھی۔ اب مجھے صرف اپنے لئے ہی نہیں، اُرملا کے لئے، اپنی محبت کے لئے بھی زندہ رہنا تھا۔ اس کے بعد اُرملا نے مجھے وہ بات بتائی جس کا اب تک اُس نے ذکر نہیں کیا تھا۔ کہنے لگی۔

''میں ایک ضروری بات تمہیں بتانا بھول گئی ہوں۔ یہ بات اپنے ذہن میں رکھنا اور اسے ایک لمحے کے لئے بھی فراموش نہ کرنا کہ کانچی کے سر کے بال بے جان نہیں ہیں۔ جس طرح ہمارے بال بے جان ہوتے ہیں اور اُنہیں قینچی سے کاٹو تو ہمیں درد نہیں ہوتا۔ کانچی کے بال ایسے نہیں ہیں۔ اُس کے بالوں میں بھی جان ہے۔ اگر اُس کے بال کاٹے جائیں گے تو اُسے درد ہوگا۔''

اس نئے انکشاف نے میری مہم کو اور زیادہ مشکل اور خطرناک بنا دیا تھا۔ میں نے کہا۔

''اس کا مطلب ہے کہ میں کانچی کے بال اُس وقت بھی نہیں کاٹ سکوں گا جب وہ سو رہی ہوگی؟''

''ہاں......'' اُرملا بولی۔ ''اُس کے بالوں میں جان ہے۔ بال کاٹنا تو دُور کی بات ہے، تم اُس کے بالوں کو ہاتھ بھی لگاؤ گے تو وہ جاگ پڑے گی۔''

میں نے مایوسانہ لہجے میں کہا۔

''پھر تو میں اپنے منصوبے میں کبھی کامیاب نہیں ہوسکوں گا۔''

اُرملا کہنے لگی۔ ''میں نے جب سندھیا کے بالوں کی لٹ کاٹی تھی تو وہ مر چکی تھی۔ کیونکہ سندھیا کی موت کے بعد اُس کے سر کے بال بھی مر گئے تھے۔ لیکن کانچی ابھی زندہ ہے۔''

''پھر مجھے کیا کرنا چاہئے؟''

اُرملا نے کچھ سوچنے کے بعد کہا۔

''اس کی ایک ہی صورت ہے۔ کانچی کے بال بڑے گھنے اور لمبے ہیں۔ وہ بالوں میں کسی نہ کسی وقت کنگھی ضرور کرتی ہوگی اور اُس کے تھوڑے بہت بال ضرور جھڑتے ہوں گے۔ اگر کسی طرح تم اُس کے جھڑے ہوئے بالوں کو حاصل کرسکو تو تمہیں اُس کے بال کاٹنے کا خطرہ مول لینے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔''

مجھے اس کا خیال ہی نہیں آیا تھا۔ اُرملا نے کافی حد تک مسئلے کو حل کر دیا تھا۔ میں نے کہا۔ ''یہ تم نے ٹھیک کہا ہے۔ ایسا ہوسکتا ہے۔ اب یہ بتاؤ کہ مجھے اپنی مہم کا آغاز کب اور کہاں سے کرنا ہوگا؟''

اُرملا نے جواب دیا۔ ''سب سے پہلے مجھے یہ پتہ کر لینے دو کہ کانچی اس وقت کہاں ہے؟ باقی باتیں اس کے بعد ہی طے کی جاسکتی ہیں۔''

''یہ پتہ کیسے چلے گا؟''

''اس کا پتہ میں اپنی سادھنا (ریاضت) سے لگاؤں گی۔''

دوسرے روز اُرملا ٹھاکر محل کے ایک چھوٹے کمرے میں سادھنا کرنے بیٹھ گئی۔ اپنے دیوتا کی عریاں مورتی اُس نے اپنے سامنے رکھ لی تھی۔ دن بھر وہ کچھ کھائے پیئے بغیر کمرے میں سادھنا میں مشغول رہی۔ شام کے وقت کمرے سے باہر آ کر اُس نے شربت پی کر اپنا برت توڑا۔ میں اپنے کمرے میں ہی رہا۔ اور کہیں جا نہیں سکتا تھا۔ کانچی کا خوف موت بن کر میرے سر پر ہر وقت منڈلاتا رہتا تھا۔ اُرملا اشنان کرنے کے بعد میرے پاس آ گئی۔ اُس نے کاسنی رنگ کی ریشمی ساڑھی پہن رکھی تھی جس میں وہ بڑی خوبصورت دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے اُس کے آتے ہی پوچھا۔

''کانچی کا کچھ پتہ چلا؟''

کہنے لگی۔

''جب میں کچھ پوچھنے کے لئے اپنے دیوتا کی سادھنا کرتی ہوں تو وہ مجھے سب کچھ بتا دیتے ہیں۔ اس لئے کہ میں دیوتاؤں سے کبھی کوئی غلط کام کے بارے میں نہیں پوچھتی۔ میری نیت ہمیشہ انسانوں کی بھلائی کی ہوتی ہے۔''

اس طرح کی دو تین باتیں کرنے کے بعد اُرملا کہنے لگی۔

"کانچی دیوی اگنی کی ہون تپسیا کر رہی ہے۔"

اُرملا نے کانچی کا اچانک ذکر کر دیا تھا اس لئے میں کچھ سمجھ نہ سکا۔ میں نے ایک لمحے کے توقف کے بعد پوچھا۔ "کیا مطلب؟"

اُرملا نے سانس لے کر مجھے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

"میری سادھنا نے مجھے بتایا ہے کہ کانچی اس وقت صوبہ آسام میں ہے۔ تم یوں سمجھو کہ وہ دیوی اگنی کا ایک خاص چلہ کاٹ رہی ہے۔"

"وہ کس لئے؟" میں نے پوچھا۔

"یہ چلہ کاٹنے کے بعد اُس میں اتنی شکتی آ جائے گی کہ میری شکتی بھی اُس کا مقابلہ نہیں کر سکے گی۔ پھر وہ مجھے شکست دے کر تمہیں اپنے قبضے میں کر سکے گی۔ تمہیں حاصل کرنا اُس کے لئے جیون اور مرن کا مسئلہ بن چکا ہے۔ تم پر اُس نے سندھیا کے ساتھ مل کر وہ تمام دیوی دیوتاؤں کی رسومات اور سنسکار پورے کر دیئے ہیں جو اب اکیلی کانچی کسی دوسرے مسلمان پر نہیں کر سکتی۔ اب صرف تم ہی ایک ایسے مسلمان نوجوان ہو جس کو ماتا دیوی کی بھینٹ چڑھا کر وہ دیوتاؤں سے بھی زیادہ طاقتور بن جائے گی۔ اُس کے جسم میں تمام شیطانی طاقتیں حلول کر جائیں گی اور وہ اکیلی جس ملک پر چاہے اُسے تہس نہس کر کے راج کر سکے گی۔"

اُرملا کی زبانی یہ تفصیل سننے کے بعد قدرتی طور پر مجھے پریشانی ہوئی۔ میں نے کہا۔

"پھر اب کیا ہو گا؟"

اُرملا نے جواب دیا۔

"ہمیں جتنی جلدی ہو سکے اُس عورت کانچی کو ہلاک کر دینا ہو گا۔ نہیں تو یہ انسانوں پر ایک عذاب بن کر نازل ہو جائے گی۔"

"مگر آسام کا صوبہ تو بہت بڑا صوبہ ہے۔ مجھے کیسے پتہ چلے گا کہ کانچی کس جگہ تپسیا کر رہی ہے؟" میں نے پوچھا۔

اُرملا بولی۔

"جب تم یہاں سے چلو گے اور پچاس ساٹھ قدم چلنے کے بعد میری حفاظت کے دائرے سے نکل جاؤ گے تو کانچی کا طلسم تمہارے جسم میں حرکت میں آ جائے گا اور پھر

کانچی خود بخود تمہیں اپنے استھان پر لے جائے گی۔"

جب میں نے اس اندیشے کا اظہار کیا کہ کہیں ایسا نہ ہو جائے کہ کانچی مجھے تمہارے حفاظتی دائرے سے نکلنے کے فوراً بعد مجھ پر حملہ کر دے اور ماتا دیوی کی بھینٹ چڑھانے کے لئے میرا سر کاٹ ڈالے تو اُرملا کہنے لگی۔

"میں جانتی ہوں، ابھی وہ ایسا نہیں کرے گی۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اس وقت وہ دیوی اگنی کی تپسیا کرنے بیٹھی ہوئی ہے اور جس جگہ وہ بیٹھی ہے وہاں سے باہر نہیں نکل سکتی۔ وہ کم از کم تین دن سادھی لگا کر بیٹھی رہے گی۔ دوسری بات یہ ہے کہ سندھیا کے مر جانے کے بعد اُس نے تم پر ایک خاص رسم پوری کرنی ہے۔ جب تک وہ رسم پوری نہیں کر لے گی تمہیں پاروتی دیوی کی بھینٹ نہیں چڑھا سکے گی۔"

میں جان لیوا جہالت اور خونی رسومات کے بڑے خوفناک چکروں میں پھنس گیا تھا۔ میں ان کا مقابلہ کرنے پر مجبور تھا۔ اس کے سوا دوسرا کوئی راستہ بھی نظر نہیں آتا تھا۔

اُرملا کہنے لگی۔

"جب کانچی تمہیں اپنے قبضے میں کر لے اور تمہیں اپنے پاس لے آئے تو وہ تم سے میرے بارے میں ضرور پوچھے گی اور تم اُسے وہی بتاؤ گے جو میں نے تمہیں بتا دیا ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ جب تک وہ دیوی اگنی کا چلہ کاٹ نہیں لیتی اور مجھے شکست دینے کی طاقت حاصل نہیں کر لیتی اُسے ہر لمحے یہی خطرہ لگا رہے گا کہ کہیں عین وقت پر اُرملا آ کر تمہیں اُس سے چھین کر نہ لے جائے۔ لیکن جب تم اُسے بتاؤ گے کہ تم اپنی مرضی سے اُس کے پاس آئے ہو اور اُرملا سے جان بچا کر آئے ہو کیونکہ وہ تمہیں اپنے دیوتاؤں پر قربان کرنے کی تیاریاں کر رہی تھی تو وہ کم از کم اُس وقت تک ضرور مطمئن ہو جائے گی جب تک کہ وہ اپنا چلہ پورا کر کے مجھ سے زیادہ طاقت حاصل نہیں کر سکتی۔ اس کے فوراً بعد تمہیں اپنی کارروائی شروع کر دینی ہو گی اور جیسے بھی ہو سکے کانچی کے سر کے جھڑے ہوئے بال حاصل کر کے وہاں سے فوراً نکل پڑنا ہو گا۔"

میں نے کہا۔ "کیا وہ مجھے نکلنے دے گی؟ اُس وقت تو کانچی کے پاس تم سے زیادہ شکتی آ گئی ہو گی۔ وہ تو مجھے راستے میں ہی دبوچ لے گی۔"

اُرملا بولی۔

"تم اکیلے نہیں جاؤ گے۔ میں ایک خاص فاصلہ رکھ کر اس مہم میں تمہارے ساتھ سفر کروں گی۔ جب تم کانچی کے بالوں کا گچھا لے کر وہاں سے نکلو گے تو میں اُسی وقت تم سے بالوں کا گچھا لے لوں گی۔ سندھیا کے بال میرے پاس ہوں گے۔ میں وہیں اُن دونوں کو جلا کر اُن کی راکھ تمہیں دے دُوں گی۔"

میں نے کہا۔ "کانچی مجھے اتنا موقع کہاں دے گی؟ وہ تو فوراً مجھے اپنے قبضے میں کر کے لے جائے گی۔"

اُرملا نے کہا۔

"اگر وہ تمہیں لے بھی گئی تو جب تک ضروری رسومات پوری نہیں کر لے گی تمہیں دیوی ماتا کے آگے قربان نہیں کرے گی۔ اس دوران میں جیسے اور جس طرح بھی ہو سکا دونوں عورتوں کے بالوں کی راکھ تم تک پہنچا دُوں گی۔ یہ کام مشکل دکھائی دیتا ہے مگر ہمیں ہر حالت میں اسے پورا کرنا ہو گا۔ ورنہ تمہارے احسان کا بوجھ مجھے جنم جنم تک چین نہیں لینے دے گا اور تم بھی زندہ نہیں رہ سکو گے۔"

میری عقل کام نہیں کر رہی تھی۔ میں مجبور تھا کہ اُرملا جو کچھ کہتی جا رہی ہے اُس پر آنکھیں بند کر کے عمل کرتا جاؤں اور انجام خدا پر چھوڑ دُوں۔

میں راجستھان میں تھا۔ وہاں سے آسام بڑی دُور تھا۔ اُرملا نے مجھے بتا دیا تھا کہ مجھے کون سی ٹرین پکڑنی ہو گی اور کہاں کہاں ٹرین تبدیل کرنی ہو گی؟ اُس نے مجھے کافی پیسے بھی دے دیئے تھے۔ اُس کا یہ بھی خیال تھا کہ شاید کانچی اُرملا کے حلقہ اثر سے نکلنے کے بعد مجھ پر حملہ کرنے میں جلدی نہ کرے اور یہ دیکھے کہ میں کہاں جا رہا ہوں؟ کیونکہ اُرملا کے حفاظتی دائرے سے نکل آنے کے بعد کانچی کے لئے مجھے قابو کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہو گا۔ وہ جہاں اور جب چاہے مجھے دبوچ سکے گی۔ اُرملا نے یہ بھی کہا تھا کہ میں تم سے اتنی دُور رہوں گی کہ کانچی کو میری خبر نہیں لگ سکے گی۔ اور اُسے یہ پتہ نہیں چلے گا کہ میں تمہارے ساتھ ساتھ آ رہی ہوں۔ یہ ایک دوسرا گورکھ دھندہ تھا جو میری سمجھ سے باہر تھا۔

میں ایک کٹھ پتلی کی طرح، جس کا اپنا کوئی ارادہ نہیں ہوتا اور جس کی ڈوری کٹھ پتلی نچانے والے کے ہاتھ میں ہوتی ہے، اللہ کے بھروسے پر اور اُسی کا نام لے کر اُرملا کی

حویلی ٹھاکر محل سے نکل پڑا...... مجھے اتنا پتہ تھا کہ اُرملا میرے ساتھ ہے لیکن میں اُسے دیکھ نہیں سکتا تھا۔ وہ مجھ سے دُور دُور تھی اور مجھے دکھائی نہیں دیتی تھی۔ میری حالت اُس وقت اُس آدمی جیسی تھی جس کے پاس اپنے بچاؤ کے لئے کوئی ہتھیار نہ ہو اور جسے آدم خوروں کے جنگل میں اکیلا چھوڑ دیا گیا ہو۔ کانچی کے اچانک حملے کا خوف میرے سر پر منڈلا رہا تھا۔

میں صبح صبح اُرملا سے جدا ہو کر ٹھاکر محل سے نکلا تھا۔ جے پور سے گاڑی پکڑی اور دلی کی طرف روانہ ہو گیا۔ یہاں آ کر ملک کے سیاسی حالات کا علم ہوا۔ پتہ چلا کہ تحریک پاکستان کامرانی کے آخری مراحل میں داخل ہو چکی ہے اور ہندوستان کے مسلمانوں میں زبردست جوش و خروش پایا جاتا ہے۔ سیاست سے میں پہلے ہی بہت دُور تھا۔ اس کے علاوہ میں اپنی مصیبت میں پھنسا ہوا تھا۔ مسافروں کی زبانی اتنا ضرور سنا کہ انگریز ہندوستان کو آزادی دے کر واپس انگلستان جانے کی تیاریاں کر رہے ہیں اور پاکستان بن جائے گا۔ یہ بھی سنا کہ ہندو پاکستان کی زبردست مخالفت کر رہے ہیں اور پنجاب میں کہیں کہیں فسادات بھی شروع ہو گئے ہیں۔

دِلی پہنچ کر میں آسام کے دارالحکومت گوہاٹی جانے والی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ ابھی تک مجھے نہ تو اُرملا آس پاس کہیں دکھائی دی تھی اور نہ میری جان کی دشمن کانچی کے طلسم نے میرے جسم میں کوئی حرکت کی تھی۔ مجھے ایک لمحے کے لئے بھی طلسمی چکر نہیں آیا تھا۔ اُرملا کا خیال درست تھا۔ کانچی نے مجھے چھوٹ دے رکھی تھی۔ وہ یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ میں اُرملا کی حفاظت سے از خود نکل کر کہاں اور کس طرف جا رہا ہوں؟ میں اُس کے رحم و کرم پر تھا وہ جس وقت اور جہاں چاہے مجھ پر جھپٹ سکتی تھی۔ مگر اُس نے ابھی تک ایسی کوئی حرکت نہیں کی تھی۔ اور یہ ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ کانچی کو میرے باہر نکل آنے کی خبر نہ ہوئی ہو۔ ٹرین کا یہ سفر بھی کافی لمبا تھا۔ اُرملا نے مجھے وہ جگہ بتا دی تھی جہاں کانچی اگنی دیوی کا چلہ کاٹ رہی تھی۔ اس کا علم اُسے اپنی سادھنا سے ہوا تھا۔ اُس نے بتایا تھا کہ گوہاٹی سے چھوٹی لائن کی ایک ٹرین کاٹھ گڑھ کو جاتی ہے۔ کاٹھ گڑھ پہنچ کر تم ٹرین سے اُتر جانا۔ وہاں سے گنگا مٹھ گاؤں کو ایک راستہ جنگل میں سے ہو کر جاتا ہے۔ گنگا مٹھ گاؤں کے جنوب میں تمہیں ایک ٹیلے کی ڈھلان پر تاڑ کے درختوں کی قطار نظر آئے

گی۔ اُسی ٹیلے کے دامن میں ایک جگہ بانس کی جھونپڑی میں کانچی چلہ کرنے بیٹھی ہوئی ہے۔

آسام کے دارالحکومت گوہاٹی پہنچتے پہنچتے رات ہوگئی۔ سوچا اس وقت میں کہاں جاؤں گا؟ وہیں پلیٹ فارم پر تھوڑا سا کھانا کھا کر ایک بنچ پر لیٹ گیا کہ صبح اپنی مہم پر نکلوں گا۔ کانچی کا جادو ابھی تک خاموش تھا۔ اس نے میرے جسم میں کوئی حرکت نہیں کی تھی۔ لیکن یہ ناممکن تھا کہ کانچی کو میری آمد کا علم نہ ہوا ہو۔ میں بنچ پر لیٹا تھا۔ رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ میں آنکھیں بند کرتے ہوئے ڈر رہا تھا کہ کہیں آنکھیں بند کرنے سے مجھے چکر نہ آجائے۔

مجھے کسی کی سرگوشی سنائی دی...... میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ میں سمجھ گیا کہ کانچی آ گئی ہے۔ مگر وہ کانچی نہیں، اُرملا کی سرگوشی تھی۔ اُرملا کہہ رہی تھی۔

''گھبرانا نہیں...... میں تمہارے ساتھ ہوں۔ مگر میں تمہارے سامنے نہیں آسکتی۔ وقت آنے پر تمہارے سامنے بھی آجاؤں گی۔ میرے جواب میں بولنا مت۔ میں پھر تم سے بات کروں گی۔'' اور اُرملا کی سرگوشی غائب ہوگئی۔

اُرملا کی سرگوشی سے میرے دل کو تھوڑا سا حوصلہ ملا۔ کم از کم وہ تو میرے ساتھ تھی۔ میں اکیلا نہیں تھا۔ اگرچہ اُرملا اس پوزیشن میں نہیں تھی کہ مجھے کانچی کے حملے سے بچا سکتی پھر بھی اُس کا ساتھ ہونا ہی میرے لئے کافی تھا۔ ساری رات اسی حالت میں گزر گئی کہ کبھی غنودگی چھا جاتی اور کبھی چونک کر آنکھیں کھول دیتا۔ دن نکل آیا۔ برانچ لائن پر جانے والی گاڑی مل گئی جو کاٹھ گڑھ سے ہو کر آگے جاتی تھی۔ ڈیڑھ گھنٹے کے سفر کے بعد کاٹھ گڑھ کا سٹیشن آیا تو میں اُتر پڑا۔

آسام کا صوبہ بنگال کے ساتھ ہی ملا ہوا ہے۔ مگر آسامی لوگوں کے رنگ بنگالیوں کی طرح گہرے سانولے نہیں ہوتے۔ اُن کے رنگ سفیدی مائل ہوتے ہیں اور نقش چینیوں سے ملتے جلتے ہیں۔ اگرچہ مجھے اُرملا نے بتا دیا تھا کہ سٹیشن سے اُتر کر تمہیں کھیتوں میں جاتی ایک پگڈنڈی نظر آئے گی، اُس پر چل پڑنا۔ پھر بھی میں نے ایک آدمی سے پوچھ لیا کہ گنگا مٹھ کا گاؤں یہاں سے کس طرف ہے؟ اُس نے کھیتوں کی جانب اشارہ کر کے بتایا کہ یہاں سے آگے ہے۔ یہ وہی پگڈنڈی ہو سکتی تھی جو مجھے اُرملا

نے بتائی تھی۔ میں اُس پر چل پڑا۔ دونوں جانب ہرے بھرے کھیت تھے۔ بیچ میں کہیں کہیں ناریل اور تاڑ کے درخت کھڑے تھے۔ کھیت زیادہ تر دھان کے تھے۔ کھیتوں میں پانی کھڑا تھا۔ آسام میں بارشیں بہت ہوتی ہیں اور ہریالی اور جنگل بہت ہیں۔ پہاڑی علاقہ ہے۔ جگہ جگہ چھوٹے بڑے ٹیلے تھے جن کی ڈھلانوں پر کہیں کہیں جھونپڑے دکھائی دیتے تھے۔

کھیتوں میں سے گزرنے کے بعد جھاڑیوں اور درختوں کا جنگلی علاقہ شروع ہوگیا۔ پھر ذرا کھلا علاقہ آگیا۔ دائیں جانب بانس کے جھونپڑے نظر آئے جو ساتھ ساتھ بنے ہوئے تھے۔ دھان کے ایک کھیت میں آسامی کسان کام کر رہے تھے۔ میں نے ایک آدمی سے گنگا مٹھ گاؤں کا پوچھا تو اُس نے بتایا کہ وہی گنگا مٹھ کا گاؤں ہے۔ اُرملا نے کہا تھا کہ گاؤں کے جنوب کی طرف جانا۔ وہاں آگے جا کر ایک ٹیلہ ملے گا جس کی ڈھلان پر تاڑ کے درختوں کی ایک قطار دکھائی دے گی۔ اُسی ٹیلے کے دامن میں ایک جگہ وہ جھونپڑا ہے جہاں کانچی چلہ کاٹنے بیٹھی ہوئی ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ میں اپنی موت کی سرحد میں داخل ہو چکا تھا۔ مجھے تعجب تھا کہ میری موت نے، یعنی کانچی نے اب تک مجھ سے رابطہ قائم نہیں کیا تھا۔ یہ بھی اچھی طرح سے جانتا تھا کہ کانچی اپنی ایک شکتی کے زور پر مجھے اُس وقت دیکھ سکتی ہے جب میں اُرملا کی خفیہ شکتی کے حفاظتی حصار سے باہر نکل آؤں۔ وہ مجھ سے بات بھی کر سکتی ہے، مگر اُسے میرے دل کا حال معلوم نہیں ہو سکتا تھا، میرے دل میں کیا ہے اور کس نیت سے اُس کے پاس آرہا ہوں؟ یہ اُسے کبھی معلوم نہیں ہو سکتا تھا۔

میں نے کانچی پر یہ کبھی ظاہر نہیں ہونے دیا تھا کہ مجھے معلوم ہے کہ وہ مجھے اپنی کسی دیوی پر قربان کرنا چاہتی ہے۔ اسی وجہ سے میں بے دھڑک ہو کر اُس کے پاس جا رہا تھا۔ میں نے اُس کے ساتھ جو ڈرامہ کرنا تھا وہ مجھے اُرملا نے اچھی طرح سمجھا دیا ہوا تھا۔ چلتے چلتے میں ایک ٹیلے کے پاس آگیا جس کی ڈھلان پر مجھے تاڑ کے درختوں کی ایک قطار اُوپر سے نیچے آتی دکھائی دی۔ تاڑ کا درخت بجلی کے کھمبے کی طرح کا ہوتا ہے جس کے اُوپر کو جاتے تنے پر کوئی ٹہنی نہیں ہوتی، صرف درخت کے اُوپر کھجور کے درخت کی طرح کی شاخیں ہوتی ہیں جو جھنڈ سا بنا کر اُوپر کو اُٹھی ہوئی ہوتی ہیں۔ اُس درخت

کی ٹہنی کو کاٹا جائے تو اُس میں سے دودھ سا نکلتا ہے جس کو تاڑی کہتے ہیں۔ گاؤں کے لوگ درخت پر چڑھ کر اُس کی ٹہنی کو ایک جگہ سے کاٹ کر اس کے آگے مٹی کا مٹکا لٹکا دیتے ہیں جس میں ساری رات قطرہ قطرہ دودھ ٹپکتا رہتا ہے۔ دن کے وقت مٹکا تاڑی کے دُودھ سے بھر جاتا ہے تو اُسے اُتار کر لوگ پیتے ہیں۔ میں نے ایک بار وہ پیا تھا۔ اُس کا ذائقہ میٹھی لسی کی طرح کا تھا۔ اس وقت اُس میں نشہ نہیں ہوتا۔ اگر مٹکا دن بھر دُھوپ میں درخت پر لٹکا رہے تو اُس میں نشہ پیدا ہو جاتا ہے۔ گاؤں کے لوگ تاڑی کا نشہ بھی کرتے ہیں۔ وہ دو دو دن تک مٹکے تاڑ کے درخت سے لٹکائے رکھتے ہیں، پھر انہیں اُتار کر دودھ کو اُبالتے ہیں، اس میں کچھ اور نشے والی چیزیں بھی ملا دیتے ہیں اور وہ تاڑی بن جاتی ہے جو انگریزوں کے زمانے میں بلکہ اب بھی آسام کے دیہات میں عام مل جاتی ہے۔ میں نے مردوں کے علاوہ عورتوں کو بھی تاڑی پی کر نشے میں دُھت پڑے ہوئے دیکھا ہے۔ صرف آسام میں ہی نہیں، بلکہ سارے جنوبی ہندوستان میں مزدور مرد اور عورتوں کی اکثریت تاڑی کا نشہ کرتی ہے۔ ایک دفعہ میں نے شراب والی تاڑی پی لی تھی۔ دو دن تک میرا سر ڈولتا رہا تھا۔ چنانچہ تاڑی کے درختوں کی قطار کو میں نے فوراً پہچان لیا۔

میں پہاڑی ٹیلے کی طرف بڑھا۔ ٹیلے کے نیچے دامن میں درخت اور جھاڑیاں ایک دوسرے میں اس قدر اُلجھے ہوئے تھے کہ راستہ نہیں مل رہا تھا۔ ذرا جھاڑ ختم ہوا تو مجھے ایک طرف گھنے درخت کے نیچے ایک جھونپڑی دکھائی دی۔ میں جھاڑیوں کے پیچھے رُک کر جھونپڑی کو دیکھنے لگا۔ اب میں اس انتظار میں تھا کہ کب کانچی مجھ پر حملہ کرتی ہے اور کب اُس کا طلسم میرے جسم میں حرکت میں آتا ہے؟ کیونکہ اتنا مجھے معلوم تھا کہ کانچی کو میری موجودگی کا پتہ چل چکا ہے۔ آخر میرا اندازہ صحیح نکلا۔ مجھے جھاڑیوں کی اوٹ میں کھڑے چند لمحے ہی گزرے تھے کہ میرے کانوں میں کانچی کی آواز گونجی......

"تم جس مقصد کو دل میں لے کر یہاں آئے ہو، میں اسے اچھی طرح جانتی ہوں۔ مگر مجھے حیرانی ہے کہ ایک لمحے کے لئے بھی تم نے یہ نہیں سوچا کہ تم میری دشمن کی حفاظت سے نکل آنے کے بعد میرے رحم و کرم پر ہو گے اور میں جس وقت چاہوں تمہیں دبوچ سکتی ہوں۔"

میں نے اُرملا کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے کہا۔

"کانچی! یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ مجھے تمہاری شکتی تمہاری طاقت کا پتہ نہ ہو؟"

کانچی نے پوچھا۔

"تو پھر تمہیں یہاں آنے کی جرات کیسے ہوئی؟ اُس عورت کے اشارے پر تم نے ایک دفعہ مجھے زہر دینے کی کوشش کی تھی۔ سندھیا تو تمہارے فریب میں آ کر مر گئی لیکن مجھے میری طاقت، میری شکتی نے بچا لیا۔ اب تم مجھے ہلاک کرنے کے واسطے اپنی کمان میں کون سا تیر چڑھا کر آئے ہو؟"

میں نے آواز اور لہجے میں عاجزی، نرمی اور محبت کا اثر پیدا کرتے ہوئے کہا۔

"کانچی! اس دفعہ مجھے تمہاری محبت تمہارے پاس کھینچ لائی ہے۔"

"محبت......؟" یہ کہہ کر کانچی نے ایک قہقہہ لگایا۔

میں نے فوراً کہا۔ "تم چاہے میری ہنسی اُڑاؤ...... مگر یہ سچ ہے کانچی! کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔"

کانچی کی آواز آئی۔

"اچھا...... کیا سچ مچ تم مجھ سے پریم کرتے ہو؟ اگر یہ بات ہے تو میرے پاس آؤ! میں جھونپڑی میں ہوں۔"

میں جھونپڑی کی طرف چلا۔ جھونپڑی کے آگے بوریا لٹک رہا تھا۔ میں نے اُسے ہٹا کر دیکھا۔ جھونپڑی میں دیا جل رہا تھا، فرش پر ہرن کی کھال بچھی تھی اور کانچی اپنے سیاہ بال کھولے ایک مورتی کے آگے آلتی پالتی مار کر بیٹھی تھی۔ اُس کا گلابی آنکھوں والا گہرا سانولہ چہرہ دیئے کی روشنی میں بڑا ڈراؤنا لگ رہا تھا۔ اُس کے چہرے پر کسی قسم کا کوئی تاثر نہیں تھا۔ میری طرف دیکھ کر بولی۔

"میرے پاس آ کر بیٹھ جاؤ......!"

میں اُس کے پہلو میں دو زانو ہو کر بیٹھ گیا۔ اُس نے اپنا رُخ مورتی کی طرف سے ہٹا کر میری طرف کر لیا۔ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

"تمہیں مجھ سے کیسے پریم ہو گیا؟ تم نے تو مجھے زہر دے کر مارنے کی کوشش کی تھی۔"

میں نے کہا۔

"میں نے ایسا اُرملا کے اشارے پر کیا تھا۔ اُس عورت نے مجھ پر جادو کر دیا ہوا تھا۔ اُس نے مجھے کسی بوٹی کا زہر پلا کر کہا تھا کہ میں تمہارے پاس جاؤں اور اپنے خون کا زہر تمہارے خون میں شامل کر کے تمہیں ہلاک کر دُوں۔ خدا کا شکر ہے کہ میں تمہارے ساتھ ایسا نہ کر سکا۔"

کانچی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"ہو سکتا ہے اب بھی اُرملا نے تمہیں مجھے ہلاک کرنے کے واسطے بھیجا ہو۔"

میں نے کہا۔ "نہیں کانچی! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اُس نے نہ تو مجھے کسی بوٹی کا زہر پلایا ہے اور نہ تمہیں ہلاک کرنے کے لئے مجھے بھیجا ہے۔ بلکہ میں خود اُس سے جان بچا کر بھاگا ہوں۔"

کانچی نے ہلکا سا قہقہہ لگایا، کہنے لگی۔

"اچھا! وہ تمہاری اور تم اُس کے دشمن کب سے ہو گئے؟ تم تو اُس سے پریم کرتے تھے۔ وہ بھی تمہیں چاہتی تھی۔ پھر وہ تمہیں مارنے کی کوشش کیوں کرے گی؟"

جو کچھ مجھے اُرملا نے سمجھایا ہوا تھا، میں اسی پر عمل کر رہا تھا۔ میں نے کہا۔

"کانچی! یہ سچ ہے کہ مجھے اُرملا سے محبت ہو گئی تھی۔ میں اُسے دیوانوں کی طرح چاہنے لگا تھا، لیکن اُس وقت تک میں نے اُس کا اصلی رُوپ نہیں دیکھا تھا۔ جب مجھے اُس کا اصلی رُوپ نظر آیا تو میں خوف زدہ ہو گیا، مجھ پر دہشت طاری ہو گئی اور میں اُس سے جان بچا کر بھاگنے کے لئے موقع کی تلاش میں رہا۔ کل مجھے موقع مل گیا اور میں اُس کی قید سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا اور تمہارے پاس آ گیا ہوں کیونکہ اُرملا کا اصلی رُوپ دیکھنے کے بعد مجھ پر تمہاری سچی محبت ظاہر ہو گئی ہے اور میری آنکھوں کے سامنے سے جھوٹ کا پردہ ہٹ گیا ہے۔ مجھے اب معلوم ہوا ہے کہ جس عورت سے میں سچا پیار کرتا ہوں اور جو عورت مجھ سے پیار کرتی ہے وہ کانچی ہی ہے۔ اس کے علاوہ میں یہ بھی اچھی طرح جانتا ہوں کہ اُرملا کے انتقام کی آگ سے صرف تم ہی مجھے بچا سکتی ہو کیونکہ تم بھی دل میں مجھ سے پریم کرتی ہو اور اُرملا کی ویدک طاقت تمہاری شکتی کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔"

کانچی بڑی توجہ سے میری کہانی سن رہی تھی۔ جب میں ایک لمحے کے لئے خاموش

ہوا تو اُس نے ایک ایسا سوال کر دیا جس کا جواب نہ تو میں نے سوچا تھا اور نہ اُرملا کے ہی دل میں یہ سوال پیدا ہوا تھا۔ کانچی نے مجھ سے پوچھا۔

"مجھے سب سے پہلے یہ بتاؤ! تمہیں کس نے بتایا ہے کہ میں اس جگہ تمہیں ملوں گی؟ اگر تمہیں کسی نے نہیں بتایا تو پھر تمہیں کیسے پتہ چلا کہ میں جے پور سے اتنی دُور آسام کے ایک جنگل میں بیٹھی ہوں؟"

ایک سیکنڈ کے لئے میں اندر سے ہل گیا۔ مجھے خیال ہی نہیں آیا تھا۔ اُرملا کو بھی خیال نہیں آیا تھا کہ اگر کانچی نے مجھ سے یہ سوال کر دیا تو میں اُسے کیا جواب دُوں گا؟ مگر قدرت اُس وقت مجھ پر مہربان تھی اور میری راہ نمائی کر رہی تھی۔ فوراً مجھے اُس کا جواب سوجھ گیا۔ میں نے کہا۔

"کانچی! جب میں اُرملا کی قید سے جان بچا کر بھاگا اور اُس کے جادو کے دائرے سے باہر نکلا تو مجھے تمہارے جسم کی خوشبو آنا شروع ہو گئی۔ میں تمہاری خوشبو کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ جس طرف سے تمہاری خوشبو کا جھونکا آتا میں اُسی طرف رُخ کر لیتا۔ آخر چلتے چلتے میں یہاں تک آ گیا اور مجھے یہ جھونپڑی نظر پڑی جس میں سے تمہارے جسم کی تیز خوشبو نکل رہی تھی۔ کانچی! یقین جانو اگر میری محبت اور تمہارے جسم کی خوشبو مجھے راستہ نہ دکھاتی تو میں کبھی تمہارے پاس نہیں پہنچ سکتا تھا۔ پھر نہ جانے میرا کیا حشر ہوتا؟ اُرملا نے مجھ پر جو جادو ٹونہ کر رکھا ہے وہ مجھے کہیں بھی چین سے نہ بیٹھنے دیتا اور کہیں نہ کہیں وہ مجھے ضرور اپنے جال میں پھنسا لیتی اور مجھے آگ میں زندہ جلا دیتی۔"

کانچی بغیر پلکیں جھپکے میری طرف تکے جا رہی تھی۔ اُس کے چہرے سے میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ اُس پر میری اس دلیل کا کچھ نہ کچھ اثر ہو گیا ہے۔ اُس نے مجھ سے پوچھا۔ "اُرملا تم سے کیا چاہتی تھی؟ وہ تمہیں آگ میں کیوں جلانا چاہتی تھی؟"

میں نے کہا۔

"مجھے نہیں معلوم وہ ایسا کیوں کرنا چاہتی تھی؟ اُس نے مجھے کچھ بتایا بھی نہیں تھا۔ مجھے صرف اتنا ہی اندازہ ہے کہ وہ مجھے آگ میں زندہ جلا کر میری راکھ کسی دیوی دیوتا کی بھینٹ چڑھانے کے بعد کوئی بہت بڑی شکتی حاصل کرنے کی خواہشمند تھی۔ ایک دو بار جب میں نے اُس کے آگے تمہاری شکتی کا ذکر کیا تھا تو اُس نے جھنجھلا کر کہا تھا تم

میرے آگے کانچی کی شکتی کا نام نہ لیا کرو! مجھے بہت جلد ایسی شکتی ملنے والی ہے کہ ایک کانچی تو کیا اُس جیسی ہزاروں کانچیاں میرا مقابلہ نہ کر سکیں گی۔ پھر میں اپنے ہاتھوں کانچی کا سر کاٹ کر تمہارے پاس لے آؤں گی۔

میں نے جان بوجھ کر کانچی کو ایسا کہہ دیا تھا تاکہ اُس کے دل میں اُرملا کے خلاف دشمنی اور میرے حق میں دوستی کے جذبات پیدا ہو جائیں۔ میں نے دیکھا کہ کانچی کا چہرہ غصے سے آگ بھبھوکا ہو گیا۔ کہنے لگی۔

''اس معمولی دیوداسی کی یہ ہمت کہ میرے مقابلے پر اُتر آئے؟''

اُس نے دو تین بار اپنے سر کو دائیں بائیں جھٹکا اور بولی۔

''بہت جلد اُرملا کو اپنی اصل قیمت معلوم ہو جائے گی اور تمہیں بھی میری طاقت کا علم ہو جائے گا جب میں اُرملا کا سر کاٹ کر تمہارے سامنے رکھ دوں گی۔''

میں دل میں خوف محسوس کرنے لگا۔ کیونکہ کانچی، اُرملا کی شکتی کو شکست دینے کے لئے ہی اگنی دیوی کا چلہ کر رہی تھی۔ تین دن کا چلہ کاٹنے کے بعد طاقت میں اُس نے اُرملا سے آگے نکل جانا تھا اور وہ ایسا کر سکتی تھی۔ پھر خیال آیا کہ اس سے پہلے کہ کانچی اُرملا کے خلاف کوئی جان لیوا قدم اُٹھائے میں اور اُرملا مل کر اُسے ہمیشہ کے لئے موت کی نیند سلا چکے ہوں گے۔ مگر ہمارے منصوبے کی کامیابی میں وقت لگنا تھا۔ اس دوران میرا یہ کام تھا کہ میں کسی طریقے سے کانچی کو روکے رکھوں کہ وہ اُرملا کے خلاف کوئی انتہائی قدم نہ اُٹھائے۔

میں نے فوراً کانچی کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔

''یہی میں نے اُرملا سے کہا تھا کہ اُرملا! تم کانچی کی طاقت، اس کی ویدک شکتی کو نہیں جانتی ہو۔ تم نے ویدوں کا علم ضرور پڑھا ہے جبکہ کانچی نے ویدوں کے علم کو اپنے خون میں شامل کر لیا ہوا ہے۔ تم میں اور کانچی میں زمین اور آکاش کا فرق ہے۔''

اپنی تعریف سن کر کانچی بہت خوش ہوئی۔ اُس کی آنکھوں میں خوشی کی ایک دوسری چمک بھی تھی۔ یہ چمک اُس شکاری کی آنکھوں کی تھی جس کا شکار خود بخود اُس کے جال میں آ کر پھنس گیا ہو۔ کانچی یہی سمجھ رہی تھی کہ اُس نے مجھے پکڑنے کے لئے جو پنجرہ کھلا رکھا ہوا تھا، میں خود بخود اُس کے اندر آ کر بیٹھ گیا ہوں۔ لیکن جب تک وہ اپنا چلہ نہیں

کاٹ لیتی اور اس کے بعد دیوی کی قربانی کی کچھ رسمیں ادا نہیں کر لیتی وہ مجھے قربان نہیں کر سکتی تھی۔ میرے خیال کے مطابق میرے پاس زیادہ سے زیادہ تین یا چار دن ہی تھے۔ اس دوران مجھے کانچی کے بال لے جا کر اُنہیں اُرملا کے حوالے کرنا تھا۔ اُرملا نے کہا تھا کہ میں تمہارے آس پاس ہی رہوں گی۔ اور جب تم کانچی کے بال حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاؤ گے تو میں خود ہی تم سے رابطہ کر لوں گی۔

میں نے کانچی سے کہا۔

''مجھے ڈر ہے کانچی! کہ اُرملا کہیں یہاں بھی نہ آ جائے اور مجھے بے ہوش کر کے اُٹھا کر نہ لے جائے۔''

کانچی کو غصہ آ گیا۔ کہنے لگی۔

''اُس کی کیا مجال کہ یہاں آ سکے۔ تم چنتا مت کرو! جب تک تم میرے پاس موجود ہو، وہ تمہیں چھو بھی نہیں سکتی۔ میرا دو دن کا چلہ باقی رہ گیا ہے۔ اس کے بعد میرے اندر اتنی شکتی آ جائے گی کہ میں اُرملا کا قصہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دوں گی۔''

میں نے دیئے کی روشنی میں جھونپڑی کا جائزہ لیا۔ جھونپڑی چھوٹی تھی۔ فرش پر گھاس پھونس بچھا ہوا تھا۔ میں نے کانچی سے پوچھا۔ ''کیا تم اسی جھونپڑی میں رہتی ہو؟''

کانچی نے مسکرا کر کہا۔

''یہ میری پوجا پاٹھ کی جگہ ہے۔ جہاں میں رات کو سوتی ہوں وہ جگہ جنگل کے اندر ہے۔ تم تھوڑی دیر میرے پاس ہی بیٹھو۔ پھر میرے ساتھ چلنا۔''

میں ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا۔ کانچی نے چلے کے منتروں کا جاپ شروع کر دیا۔ اُس کی کمر پر اُس کے سیاہ بال بکھرے ہوئے تھے۔ میں اُن بالوں کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ یہ وہ بال تھے جن کی ایک لٹ کاٹ کر مجھے لے جانی تھی۔ اُرملا نے کہا تھا کہ کانچی کے بالوں میں جان ہے۔ وہ زندہ ہیں۔ اور اگر اُنہیں کاٹا جائے تو کانچی کو درد ہو گا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟ میں نے اس کا تجربہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ پوجا پاٹھ کے بعد ہم دوسرے بڑے جھونپڑے میں آ گئے۔ یہاں زمین پر گیروے رنگ کی چادر بچھی ہوئی تھی اور کونے میں چھوٹا سا چبوترہ تھا جس کے اُوپر کسی دیوی کی مورتی رکھی ہوئی تھی۔ مورتی کے آگے تھالی میں پھول اور جنگلی پھل پڑے تھے۔ ایک

طرف پرانا صندوق پڑا تھا اور بانس کو جوڑ کر بنائی گئی دیوار کے ساتھ کانچی کی دو ساڑھیاں لٹک رہی تھیں جن میں سے ایک کا رنگ سفید اور دوسری کا رنگ گلابی تھا۔ وہیں صندوق کے پاس ہی زمین پر بستر بچھا تھا۔ کانچی بستر پر بیٹھ گئی۔ اُس نے مجھے اپنے سامنے بیٹھنے کو کہا۔ میں بیٹھ گیا۔ وہ میری طرف دیکھ کر خوش ہو رہی تھی۔ خوش کیوں نہ ہوتی؟ بغیر کسی تگ و دو کے میں اپنے آپ اُس کے پاس چلا آیا تھا اور اب وہ بڑی آسانی سے دیوی ماتا پر میری قربانی دے کر دیوتاؤں سے بھی بڑھ کر شکتی حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکتی تھی۔

اُس کا خوش ہونا میری سمجھ میں آ رہا تھا۔ میں نے اُس کے بالوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کانچی! تمہارے بال بڑے خوبصورت ہیں۔ اس جنگل میں تم ان کی کیسے دیکھ بھال کرتی ہو؟''

کانچی نے اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''میں اشنان کرنے سے پہلے انہیں جنگلی بوٹیوں سے دھوتی ہوں۔ یہ مجھے بہت پیارے ہیں۔''

اور وہ اپنے بالوں پر بڑے پیار سے ہاتھ پھیرنے لگی۔ میں نے مناسب موقع سمجھ کر کہا۔ ''کانچی! کیا مجھے اجازت دو گی کہ میں بھی تمہارے بالوں کو پیار کروں؟''

اُس نے اپنے بالوں کا جوڑا باندھتے ہوئے کہا۔

''نہیں...... ابھی نہیں۔ ابھی مجھے کل کا دن ھون کرنا ہے۔ اس کے بعد تم بے شک میرے بالوں کو پیار کر لینا۔''

شام ہوئی تو کانچی نے جھونپڑی کے باہر آگ جلا کر چاول بنائے جو ہم دونوں نے اچار کے ساتھ کھائے۔ کہنے لگی۔

''جب تک میرا چلہ ختم نہیں ہو جاتا میں صرف چاول ہی اچار کے ساتھ کھا سکتی ہوں۔ اس کے بعد میں تمہارے لئے سبزی بھی بناؤں گی۔ تمہیں سبزی پسند ہے نا؟ مگر تم تو مسلمان ہو۔ مسلمان گوشت کھاتے ہیں۔ میں گوشت نہیں کھاتی۔''

میں نے کہا۔ ''نہیں کانچی...... میں مسلمان ضرور ہوں مگر گوشت نہیں کھاتا۔''

میں نے دل میں سوچا کہ یہ عورت خون بڑے شوق سے پیتی ہے مگر گوشت سے پرہیز کرتی ہے۔ کانچی جھونپڑی میں آ گئی۔ وہاں سے سفید ساڑھی لے کر آئی اور کہنے لگی۔

''میں ندی پر اشنان کرنے جا رہی ہوں۔ تم میری جھونپڑی میں بیٹھ جاؤ! جلدی آ جاؤں گی۔'' پھر میرے قریب ہو کر بولی۔ ''تم چلے تو نہیں جاؤ گے نا؟''

میں نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔

''تمہاری محبت مجھے کھینچ کر یہاں لائی ہے۔ اب میں تم سے جدا ہونے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔'' وہ مسکراتی ہوئی ندی کی طرف چل دی۔

میں کچھ دیر جھونپڑی کے باہر ہی بیٹھا رہا۔ جنگل میں اندھیرا چھانے لگا تھا۔ ٹیلے کی سرسبز ڈھلان کی جانب سے ٹھنڈی ہوا کا جھونکا کبھی کبھی چھو کر گزر جاتا تھا۔ پھر میں جھونپڑی میں آ گیا۔ میں نے جھونپڑی کے کونے کھدروں کی تلاشی لی کہ شاید کانچی نے بالوں میں کنگھی پھیرنے کے بعد وہاں کہیں بالوں کا گچھا بنا کر پھینک دیا ہو، مگر کافی تلاش کے بعد مجھے کہیں اُس کے بال نہ ملے۔ میں نے صندوق کھول کر دیکھا، صندوق میں کچھ پرانے کپڑے پڑے تھے۔ ایک چھوٹی سی گٹھڑی میں ایک انسانی کھوپڑی اور کچھ ہڈیاں تھیں۔ میں نے گٹھڑی کو دوبارہ باندھ کر اسی طرح رکھ دیا اور صندوق بند کر کے بستر پر بیٹھ کر سوچنے لگا کہ کانچی کے بال کس طرح حاصل کئے جا سکتے ہیں؟

مورتی والے چبوترے کے پاس اینٹوں کے اُوپر جہاں دیا جل رہا تھا وہاں مجھے کوئی شے چمکتی دکھائی دی میں اُٹھ کر وہاں گیا تو دیکھا کہ وہ پیتل کی ایک سرمہ دانی تھی اور اُس کے پاس ہی لکڑی کی ایک چھوٹی کنگھی بھی رکھی تھی۔ میں نے جلدی سے کنگھی کو اُٹھا کر دیکھا کہ شاید اس کے ساتھ کانچی کے بال لگے ہوئے ہوں، مگر وہاں ایک بھی بال نہیں تھا۔ کنگھی کرتے ہوئے کانچی کے کچھ بال ضرور جھڑ کر کنگھی کے ساتھ لگ جاتے ہوں گے۔ یہ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ وہ ان بالوں کو کہاں رکھتی ہے؟ کنگھی بالکل صاف تھی۔ اُس کے دندانوں میں ایک بھی بال نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں جلدی سے بستر پر آ کر بیٹھ گیا۔ اتنی دیر میں کانچی جھونپڑی میں داخل ہوئی۔ اُس نے گیروے رنگ کی ساڑھی اُتار کر سفید رنگ کی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ اُس کے بال ابھی تک گیلے تھے۔ میں نے کہا۔

''مجھے پتہ ہوتا تو میں آتی دفعہ تمہارے لئے قصبے سے ایک تولیہ خرید کر لے آتا جس سے تم اپنے بالوں کو سکھا لیتیں۔''

کانچی نے نیم وا آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور بولی۔

''اچھا...... تمہیں میرا اتنا خیال ہے؟''

میں نے کہا۔

''کانچی! میں نے تمہیں آج تک نہیں بتایا جب رانی نے مجھے مندر کے نیچے تہہ خانے میں قید میں ڈال دیا تھا اور تم پہلی بار میرے لئے کھانا لے کر آئی تھیں تو تمہیں دیکھ کر میرے دل میں تمہارے لئے محبت کا ایک طوفان سا اُمڈ آیا تھا۔ مجھے اُسی لمحے تم سے پیار ہو گیا تھا۔ لیکن میں قید کی حالت میں تھا۔ خواہش کے باوجود تم سے محبت کا اظہار نہ کر سکا۔ اور پھر جب تم نے مجھے رانی کی قید سے نکال کر مجھ پر جو احسان کیا اُس نے مجھے تمہارا اور زیادہ گرویدہ بنا دیا تھا۔ یقین کرو کانچی! یہ تمہاری محبت ہی ہے جو مجھے تمہارے پاس کھینچ لائی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میں اُرملا سے جان بچا کر تم سے مدد لینے آیا ہوں، لیکن اس میں تمہاری محبت نے بھی بڑا کام کیا ہے۔''

کانچی کپڑے کو اپنے بالوں پر آہستہ آہستہ پھیر کر اُنہیں سکھا رہی تھی۔ وہ بالوں کو بالکل نہیں جھٹک رہی تھی۔ اُرملا نے ٹھیک کہا تھا کہ کانچی کے بالوں میں جان ہے۔ جھٹکنے سے کانچی کو تکلیف ہو سکتی تھی۔ کہنے لگی۔

''تو کیا مجھے تم سے پریم نہیں تھا؟ تم سے پریم نہ ہوتا تو میں کبھی تمہیں رانی کی قید سے نکال کر نہ لے جاتی۔''

میں دل میں ہنس پڑا۔ کانچی نے محبت کی وجہ سے نہیں بلکہ اس لئے مجھے رانی کی قید سے نکالا تھا کہ وہ سندھیا کے ساتھ مل کر دیوتاؤں کی شکتی حاصل کرنے کے لئے مجھے ماتا دیوی پر قربان کرنا چاہتی تھی۔ میں نے کہا۔

''ہاں کانچی! میں جانتا ہوں۔ اگر تمہیں مجھ سے پریم نہ ہوتا تو تم مجھے رانی کی قید سے بھگا لے جانے کا خطرہ کبھی مول نہ لیتیں۔ میں کتنا خوش قسمت ہوں کہ ایک بار پھر اپنی محبت کے پاس آ گیا ہوں۔''

کانچی مورتی والے چبوترے کے پاس گئی، وہاں اینٹوں کے اُوپر جو کنگھی رکھی ہوئی تھی وہ اُٹھائی اور اپنے لمبے بالوں میں پھیرنے لگی۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ کنگھی کے ساتھ جو بال چمٹ جائیں گے وہ اُنہیں کہاں پھینکتی ہے؟ وہ بڑی احتیاط کے ساتھ آہستہ آہستہ اپنے بالوں میں کنگھی پھیر رہی تھی۔ ساتھ ساتھ مجھ سے باتیں بھی کرتی جا رہی

تھی۔ کہنے لگی۔

''تمہارے ذریعے اُرملا نے میری سب سے پیاری سہیلی سندھیا کو زہر دے کر مارا ہے۔ میں اُسے کبھی نہیں بھول سکتی۔ میں اُرملا سے اپنی سہیلی کے خون کا بدلہ لے کر رہوں گی۔''

میں نے شرمسار سا ہو کر کہا۔

''کانچی! مجھے بہت افسوس ہے کہ یہ سب کچھ میرے ذریعے ہوا۔ اگر اُرملا دھوکے سے مجھے کسی بوٹی کا زہر پلا کر نہ بھیجتی تو ایسا کبھی نہ ہوتا۔ مگر اُس نے تو مجھ پر جادو کر رکھا تھا۔ مجھے کچھ پتہ نہیں تھا کہ میرے خون میں زہر ملا دیا گیا ہے۔''

کانچی نے کنگھی اینٹوں پر رکھ کر اپنے بالوں کا جوڑا بناتے ہوئے کہا۔

''میں جانتی ہوں، اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔ میں زندہ بچ گئی، یہی میرے لئے بہت ہے۔ مگر میں اُرملا کو چھوڑوں گی نہیں۔''

میں نے فوراً کہا۔ ''اب تو وہ تمہاری ہی نہیں، میری جان کی بھی دشمن بن گئی ہے۔''

کانچی بالوں کا جوڑا باندھنے کے بعد میرے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ کہنے لگی۔

''تم کیوں چنتا کرتے ہو؟ میں جو تمہارے ساتھ ہوں۔''

اور وہ میری گردن پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ اُس کے ہاتھ کی اُنگلیاں کھردری تھیں۔ مجھے ایسے لگا جیسے وہ خون پینے کے لئے میری گردن پر کوئی جگہ تلاش کر رہی ہے۔ میرے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ مگر کانچی سے ہمیشہ کے لئے چھٹکارا پانے کے لئے میں اُسے اپنا خون پلانے کو بھی تیار تھا۔ میں نے اپنا ہاتھ کانچی کی گردن پر پھیرنا چاہا تو وہ جلدی سے مجھ سے الگ ہو گئی۔ کہنے لگی۔

''ابھی میں دیوتاؤں کا چلہ کر رہی ہوں۔ کل میرا اھون ختم ہو جائے گا۔ پھر تم بے شک ایسا کر سکتے ہو۔''

جب رات زیادہ گہری ہو گئی تو کانچی مورتی کے آگے بیٹھ گئی اور بولی۔

''تم میرے بستر پر سو جاؤ! میں دوسری جگہ سو جاؤں گی۔ اور اب مجھ سے کوئی بات نہ کرنا۔ میں سمادھی لگانے لگی ہوں۔''

میں خاموشی سے اُس کے بستر پر لیٹ گیا۔ میں نے اپنا رُخ کانچی کی طرف کیا ہوا

تھا اور اُسے دیکھ رہا تھا۔ دیئے کی روشنی اُس کے چہرے کے ایک رُخ پر پڑ رہی تھی۔ وہ دیوتا کی مورتی کے آگے پالتی مار کر بیٹھی تھی۔ کچھ دیر وہ کسی اشلوک کا جاپ کرتی رہی، پھر اُس نے اپنے دونوں ہاتھ اپنے گھٹنوں پر رکھ دیئے اور بے حس و حرکت ہو گئی۔ وہ بالکل پتھر کے بت کی طرح ہو گئی۔ اُس کا جسم ذرا سی بھی حرکت نہیں کر رہا تھا۔ میں دن بھر کا تھکا ہوا تھا۔ مجھے نیند آنے لگی اور کچھ دیر بعد مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔ رات کو کسی وقت آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا، کانچی مورتی کے سامنے نہیں بیٹھی تھی۔ سر اُٹھا کر دیکھا تو وہ مورتی کی دائیں جانب لیٹی ہوئی تھی۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور کچھ دیر بعد میں بھی سو گیا۔

دوبارہ آنکھ کھلی تو جھونپڑی کا پردہ ہٹا ہوا تھا۔ دن کی روشنی اندر آ رہی تھی۔ باہر درختوں پر پرندے بول رہے تھے۔ کانچی اپنی جگہ پر نہیں تھی۔ میں نے اُٹھ کر سب سے پہلا کام یہ کیا کہ چبوترے کے پاس جا کر اُس کی کنگھی کا جائزہ لیا کہ رات کو اُس نے اشنان کرنے کے بعد بالوں میں اُسے پھیرا تھا شاید اس میں کچھ بال رہ گئے ہوں۔ مگر کنگھی میں ایک بال بھی نہیں تھا۔ میں نے جلدی سے کنگھی وہیں رکھ دی اور جھونپڑی سے باہر نکل آیا۔ خوب دُھوپ نکلی ہوئی تھی مگر آسمان پر ایک طرف بادلوں کے ٹکڑے بھی آگے بڑھ رہے تھے۔ موسم سرد ہو رہا تھا، ہوا چل رہی تھی۔ بادل کا ایک بڑا سا ٹکڑا سورج کے سامنے آ گیا تو دائیں جانب کی پہاڑی ڈھلانوں پر سے دُھوپ غائب ہو گئی اور ہلکا ہلکا اندھیرا سا چھا گیا۔ جھونپڑی کے پیچھے ندی بہتی تھی۔ میں اُسی طرف نکل گیا۔ اچانک میری نگاہ ندی کی طرف اُٹھی تو دیکھا کہ کانچی ندی کے پانی میں کھڑی اشنان کر رہی تھی اور دونوں ہاتھوں سے پانی تھوڑی تھوڑی دیر بعد آسمان کی طرف اُچھال دیتی تھی۔ وہ اس طرح سے سورج دیوتا کی پوجا کر رہی تھی۔ وہ برہنہ تھی۔ اُس کی پشت میری طرف تھی اور کمر تک اُس کا جسم پانی میں تھا۔

میں دوسری طرف نکل گیا اور جنگلی درختوں کے درمیان پھرنے لگا۔ چلتے پھرتے میں ذرا دُور نکل گیا۔ اور جب دوسرے ٹیلے کی اوٹ میں پہنچا تو ایک درخت کے پیچھے سے نکل کر اچانک اُرملا میرے سامنے آ گئی۔ میں وہیں رُک گیا۔ اُرملا تیز تیز چلتی میرے پاس آئی اور پوچھا۔ ''کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوئی؟''

میں کچھ کہنے لگا تو وہ میرا ہاتھ پکڑ کر تیز تیز چلتی مجھے دُور لے گئی۔ ایک چٹان کی اوٹ میں آ کر اُس نے مجھے جھاڑی کی اوٹ میں اپنے پاس بٹھا لیا اور بولی۔

''اب بتاؤ! کیا ہوا؟''

میں نے مختصر الفاظ میں اُسے سارے واقعات بیان کر دیئے اور کہا کہ کانچی نے اُس کے خلاف شکتی حاصل کرنے کے لئے جو چلہ شروع کیا تھا وہ ختم ہو گیا ہے اور اب اُسے اُس سے سنبھل کر رہنا چاہئے۔ اُرملا نے کہا۔

''بدی چاہے کتنی طاقت حاصل کر لے، وہ نیکی کی طاقت کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ لیکن اچھا کیا تم نے مجھے بتا دیا۔ اب میں تم لوگوں سے زیادہ دُور رہنے کی کوشش کروں گی۔ مگر تمہیں اُس کے بال ضرور حاصل کرنے ہوں گے۔ اگر تم اس میں ناکام ہو گئے تو یہ عورت کانچی سارے انسانوں پر ایک عذاب بن کر ٹوٹ پڑے گی اور پھر شاید ہم بھی اُس کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔''

میں نے کہا۔ ''میرے سامنے اُس نے کنگھی کی تھی۔ کنگھی کو میں نے بعد میں دیکھا تو اس کے ساتھ ایک بھی بال نہیں لگا ہوا تھا۔''

اُرملا کہنے لگی۔ ''ایسا نہیں ہو سکتا۔ اُس کے سر کے بال ضرور ٹوٹتے ہوں گے۔ تم اُس پر نگاہ رکھو! میرا خیال ہے وہ جھڑے ہوئے بالوں کا گچھا بنا کر ضرور کسی جگہ زمین میں دبا دیتی ہو گی۔ دیر نہ کرو! یہ کام جتنی جلدی ہو اتنا ہی اچھا ہے۔ میں جانتی ہوں اب وہ اپنی شکتی سے مجھے ہلاک کرنے کی کوشش کرے گی۔''

میں نے پریشان سا ہو کر کہا۔

''کیا وہ ایسا کر سکے گی؟ میرا مطلب ہے کیا......؟''

اُرملا نے میرا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی کہا۔

''اُس کی طاقت برائی کی طاقت ہے۔ میری طاقت انسانوں کی بھلائی کی طاقت ہے۔ اُس کی طاقت مجھے ہلاک تو نہیں کر سکے گی لیکن ایسا ہو سکتا ہے کہ کچھ عرصہ کے لئے مجھ پر غالب آ جائے۔''

مجھے اُرملا سے محبت تھی۔ کانچی میرے علاوہ اب اُرملا کی جان کے لئے بھی خطرہ بن گئی تھی۔ اُرملا کو کانچی کے ہاتھوں کوئی مصیبت اُٹھانی پڑے اور وہ کسی اذیت میں مبتلا ہو

جائے یہ میں ہرگز برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے اسی وقت دل میں فیصلہ کر لیا کہ چاہے کچھ ہو جائے اگر مجھے کانچی کے اُترے ہوئے بال نہ ملے تو میں اُس کے زندہ بالوں کی لٹ کاٹ کر نکل بھاگوں گا۔ پھر جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ یہ میرا جذباتی فیصلہ تھا مگر محبت کے فیصلے جذباتی ہوتے ہیں اور محبت میں جذباتی فیصلے ہی سوجھتے ہیں۔ محبت میں عقل سے کام لو تو محبت میں جوش باقی نہیں رہتا۔

اُرملا کہہ رہی تھی۔

''اس بات کا خیال رکھنا! کہ اُسے کسی طرح سے تم پر شک نہ پڑ جائے۔ تم اپنے ہوش و حواس میں رہنا!''

میں نے کہا۔ ''اگر اُس نے مجھ پر دوبارہ جادو ٹونہ کر دیا تو کہیں اُسے میرے دل کا حال نہ معلوم ہو جائے۔''

اُرملا نے کہا۔ ''تم اپنے آپ اُس کے پاس پہنچ چکے ہو۔ اس لئے اب جادو ٹونا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اور اگر اُس نے ایسا کیا بھی تو آس پاس میری موجودگی تم پر اس کا اثر نہیں ہونے دے گی۔ اور سنو! یہاں سے کچھ دُور دوسرے ٹیلے کے پیچھے ایک سیاہ چٹان کھڑی ہے۔ اس چٹان کے اندر ایک چھوٹا سا غار ہے۔ میں تمہیں اب وہیں ملوں گی۔ تمہارا زیادہ دیر میرے پاس رہنا ٹھیک نہیں۔ کانچی اشنان کر کے واپس آ رہی ہو گی۔ جاؤ!''

میرے جانے سے پہلے اُرملا تیز قدموں سے چل کر درختوں اور جھاڑیوں کے پیچھے میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ میں جلدی جلدی چلتا جھونپڑی میں واپس آ گیا۔ کچھ ہی دیر بعد کانچی بھی آ گئی۔ میری طرف دیکھ کر اپنے گیلے بالوں کو کپڑے سے خشک کرتے ہوئے بولی۔

''میرا چلہ پورا ہو گیا ہے۔ اب میری شکتی اُرملا کی شکتی سے دس گنا زیادہ ہو چکی ہے۔ وہ دوسری بار جنم لے کر بھی آ جائے تو میرا مقابلہ نہیں کر سکے گی۔ میں دیکھتی ہوں وہ میرے انتقام کی آگ سے کیسے بچتی ہے؟ وہ میری سہیلی سندھیا کی قاتل ہے۔ اُس نے مجھے بھی زہر دے کر ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی۔ میں اُس سے پورا پورا بدلہ لوں گی اور تمہیں بھی اُس سے نجات مل جائے گی۔''

میں اُس کی ہاں میں ہاں ملانے پر مجبور تھا۔ میں نے کہا۔

''یہ تو بڑی اچھی بات ہوئی ہے۔ میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ اُس سے نجات ملے۔''

کانچی نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا اور مجھے لے کر جھونپڑی کے اندر آ گئی اور چبوترے سے کنگھی اُٹھا کر بالوں پر پھیرنے لگی اور کہا۔

''میرا صرف ایک سنسکار باقی رہ گیا ہے۔ مجھے سندھیا کی سمادھی پر جا کر اُس کی بے چین آتما کو بلانا اور اُسے یہ خوش خبری سنانی ہے کہ جس نے اُسے زہر دے کر ہلاک کیا تھا میں اُس کا بدلہ چکانے جا رہی ہوں اور اُرملا کا سر کاٹ کر سب سے پہلے اُس کی سمادھی پر لاؤں گی۔''

میں نے پوچھا۔ ''کیا تم پرانے مندر کے تہہ خانے میں جاؤ گی؟''

کانچی زور زور سے بالوں میں کنگھی پھیر رہی تھی۔ کہنے لگی۔

''نہیں...... میں وہاں سے سندھیا کی لاش اُٹھا لائی تھی۔ یہاں سے دو پہاڑیاں چھوڑ کر میں نے ایک جگہ اُس کی چتا جلا کر وہیں اُس کی ہڈیاں اور راکھ دفن کر دی تھیں۔''

میں نے یونہی کہہ دیا کہ میں بھی تمہارے ساتھ جاؤں گا۔

وہ بولی۔ ''تم کیوں جاؤ گے؟''

میں نے کہا۔ ''میں سندھیا کی آتما سے معافی مانگنا چاہتا ہوں۔ اور اُسے بتانا چاہتا ہوں کہ اُس کی موت میں میرا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ میں بے قصور ہوں۔''

کانچی اب کنگھی نہیں کر رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ وہ کنگھی میں سے اپنے سر کے اُترے ہوئے بالوں کو نکال رہی تھی۔ میں نے اپنی نگاہیں اُس پر جما دیں۔ کہنے لگی۔

''تمہیں اُس کی آتما سے معافی مانگنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اُس کی آتما کو سب کچھ معلوم ہے۔''

میں ایک لمحے کے لئے بھی اپنی نگاہیں کانچی کے ہاتھوں پر سے نہیں ہٹا رہا تھا۔ اُس نے کنگھی میں سے بال اُتار کر اُن کا چھوٹا سا گچھا بنایا اور اُسے مٹھی میں دبا لیا اور بولی۔

''تم یہیں بیٹھو! میں ابھی آتی ہوں۔''

میں سمجھ گیا کہ وہ بالوں کے گچھے کو کسی جگہ زمین میں دبانے کے لئے جا رہی ہے۔ جب وہ جھونپڑی سے باہر نکل گئی تو میں بھی دبے پاؤں جھونپڑی کے دروازے کے

پاس آ گیا۔ میں نے کانچی کو دیکھا کہ وہ جھونپڑی کے پیچھے مُڑ گئی تھی۔ میں جھونپڑی کی بانس کی دیوار کی اوٹ میں چھپ کر اُسے جاتے ہوئے دیکھنے لگا۔ کانچی چند قدم چل کر ایک درخت کے پاس بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر تک وہ وہیں بیٹھی رہی۔ پھر اپنے ہاتھ صاف کرتی ہوئی اُٹھی اور واپس مُڑی۔ میں جلدی سے جھونپڑی کے اندر جا کر بستر پر بیٹھ گیا۔

وہ اپنے بال زمین میں دبا کر آ رہی تھی۔ اُرملا کا قیاس درست تھا۔ کانچی اپنے اُترے ہوئے بالوں کو زمین میں دفن کر دیتی تھی۔ وہ جھونپڑی میں داخل ہونے کے بعد میرے پاس بیٹھ گئی اور کہنے لگی۔

''میں دوپہر کے بعد سندھیا کی سمادھی پر جاؤں گی۔ میں نے تمہارے اُٹھنے سے پہلے چاول کھا لئے تھے۔ باقی چاول ہنڈیا میں پڑے ہیں۔ تم کھا لینا۔''

تم واپس کس وقت آؤ گی؟'' میں نے پوچھا۔

وہ بولی۔ ''شام ہونے سے پہلے پہلے واپس آ جاؤں گی۔ تم یہیں رہنا۔''

میں نے کہا۔

''تمہیں چھوڑ کر اب میں کہیں نہیں جانا چاہتا کانچی! اب سارا جیون تمہارے ساتھ ہی رہوں گا۔''

کانچی نے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں مجھے شک کے سائے لہراتے نظر آئے۔ کہنے لگی۔

''کیا تم دل سے ایسا کہہ رہے ہو؟''

میں نے اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''میں اپنے دل سے کہہ رہا ہوں۔''

کانچی ابھی تک اُسی شک وشبے والے انداز میں مجھے تک رہی تھی۔ کہنے لگی۔

''وقت آنے پر اپنے آپ معلوم ہو جائے گا کہ کون کس سے پیار کرتا ہے۔''

وہ اُٹھی۔ مجھ سے کہا۔ ''تم باہر جاؤ! مجھے ساڑھی بدلنی ہے۔''

میں اُٹھ کر باہر آ گیا۔ جھونپڑی کے آگے ایک طرف بڑا سا پتھر پڑا تھا۔ میں اُس پر بیٹھ گیا۔ آسمان پر بادل چھا گئے تھے اور دُھوپ غائب ہو چکی تھی۔ بڑی خنک اور خوشگوار ہوا چل رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ بارش ہو گی۔ یہ جنوری فروری کے دن تھے۔ آسام میں اس موسم میں بارشیں ہوتی ہیں۔ میں نے اُس درخت کی نشانی کو ذہن میں یاد رکھ لیا

جس کے نیچے کانچی نے اپنے بالوں کا گچھا دبایا تھا۔ میں اُس کے جانے کا انتظار کر رہا تھا۔ اُسے سندھیا کی سمادھی پر جانا تھا۔ کانچی نے آواز دے کر مجھے جھونپڑی کے اندر بلا لیا۔ کہنے لگی۔

''باہر بادل آ رہے ہیں۔ شاید بارش ہو۔ تم جھونپڑی میں ہی ٹھہرو۔ میں ابھی جا کر سندھیا کی آتما کے لئے آخری سنسکار پورا کر آتی ہوں۔ بارش آ گئی تو نکل نہ سکوں گی۔''

میں نے کہا۔ ''ہاں...... بادل بہت آ گئے ہیں۔ میں جھونپڑی میں ہی رہوں گا۔''

میں اُس کے ساتھ ہی جھونپڑی سے باہر نکل آیا اور جھونپڑی کے دروازے کے پاس کھڑا اُسے جاتے دیکھتا رہا۔ جب وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گئی تو میں پتھر پر بیٹھ گیا۔ میرے دل میں شک تھا کہ کہیں کانچی چھپ کر مجھے دیکھ نہ رہی ہو۔ میں بڑی بے نیازی سے پتھر پر بیٹھا رہا۔ کانچی نے کہا تھا کہ وہ شام ہونے سے پہلے پہلے واپس آ جائے گی۔ مجھے کوئی جلدی نہیں تھی۔ جب بیٹھے بیٹھے پندرہ منٹ گزر گئے تو میں اُٹھ کر درختوں کے درمیان ٹہلنے لگا تا کہ اگر دُور سے کوئی دیکھے تو یہی سمجھے کہ میں وقت کاٹنے کے لئے چہل قدمی کر رہا ہوں۔

جب مجھے یقین ہو گیا کہ کانچی وہاں سے کافی دُور جا چکی ہو گی تو میں سست قدموں سے چہل قدمی کے انداز میں اُس طرف مُڑ گیا جہاں کانچی نے بالوں کی لٹ دبائی تھی۔ یہ جگہ جھونپڑی سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھی۔ میں اُس درخت کے قریب پہنچ گیا جس کے سائے میں کانچی کے بالوں کی لٹ دفن تھی۔ ایک دم سے درخت کے پاس جانے کی بجائے میں ایک منٹ درخت سے چند قدم دُور رہ کر ٹہلتا رہا۔ اس دوران میری نظروں نے آس پاس کے ماحول کا پورا جائزہ لے لیا تھا۔ وہاں میرے سوا کوئی نہیں تھا۔ میں درخت کے نیچے آ کر اُس جگہ بیٹھ گیا جہاں کانچی نے کچھ دیر پہلے اپنے بال دبائے تھے۔ میں وہاں سے مٹی ہٹانے لگا۔ بارشوں کی وجہ سے وہاں کی مٹی نرم تھی۔ ایک فٹ زمین کھودی تو نیچے بالوں کا گچھا نظر آ گیا۔ میں نے جلدی سے اُسے نکال کر جیب میں رکھ لیا۔

وہیں ایک منٹ تک بیٹھا رہا جیسے تھکان دُور کر رہا ہوں۔ پھر اُٹھا اور درختوں سے نکل کر اُن ٹیلوں کی طرف تیز تیز قدموں سے چلنے لگا جس طرف آنے کے لئے مجھے اُرملا

نے کہا تھا۔ ایک ٹیلے کو پیچھے چھوڑ دیا، پھر دوسرے ٹیلے کے پیچھے آ گیا۔ ایک جانب سیاہ چٹان کھڑی تھی۔ یہ وہ چٹان تھی جس کے غار میں اُرملا میرا انتظار کر رہی تھی۔ جھاڑیوں کے پیچھے چٹان کے غار کا منہ نظر پڑا تو میں اُس میں گھس گیا۔ اُرملا نے مجھے داخل ہوتے دیکھ لیا تھا۔ اُس نے آہستہ سے مجھے آواز دی اور میرے پاس آ گئی۔

''بال لے آئے ہو......؟'' اُس نے پوچھا۔

''ہاں......'' میں نے جیب سے بالوں کی لٹ نکال کر اُس کو دے دی۔

اُرملا نے بالوں کی لٹ کو غور سے دیکھا، اُنہیں سونگھا اور بولی۔

''ہاں...... یہ کانچی کے ہی بال ہیں۔ وہ کہاں ہے؟''

میں نے اُسے کہا کہ وہ آخری سنسکار کے لئے سندھیا کی سمادھی پر گئی ہے۔ کہتی تھی شام سے پہلے واپس آ جاؤں گی۔ اُرملا نے تھیلے میں سے سندھیا کے بالوں کی لٹ نکال کر دونوں بالوں کو ایک جگہ پتھروں کے پاس رکھ دیا، پھر تھیلے میں سے ماچس نکال کر اُنہیں آگ لگا دی۔ جب بال اچھی طرح سے جل گئے تو اُن کی راکھ ایک کاغذ میں ڈال کر کاغذ کی پُڑیا بنا کر میرے حوالے کی اور کہا۔

''اب یہ راکھ کسی طریقے سے سوم رس میں ملا کر کانچی کو پلا دینی ہے۔ اس کا ایک گھونٹ ہی کافی ہو گا۔ اگر تم ناکام ہو گئے تو پھر تمہیں اور مجھے کانچی کے خوفناک انتقام سے شاید کوئی نہیں بچا سکے گا۔ پھر میں بھی تمہاری مدد نہ کر سکوں گی۔ کیونکہ اُس کے پاس مجھ سے زیادہ طاقت، زیادہ شکتی آ چکی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''میں آج رات پوری کوشش کروں گا۔''

اُرملا بولی۔ ''تمہارے پاس صرف آج کی رات ہی ہے۔ ہو سکتا ہے کل وہ تمہیں دیوی ماتا پر قربان کرنے کے لئے یہاں سے لے جائے۔ تمہیں جو کچھ کرنا ہے آج کی رات ہی کرنا ہے۔''

میں نے بڑے اعتماد کے ساتھ کہا۔ ''میں یہ کام کر گزروں گا۔ تم بے فکر رہو!''

میں نے اُس سے پوچھا۔ ''اگر میں کانچی کو راکھ پلانے میں کامیاب ہو گیا تو کیا وہ اسی وقت مر جائے گی؟''

اُرملا نے کہا۔ ''یہ راکھ سوم رس کے ساتھ مل کر قاتل زہر بن جائے گی اور پہلے ہی

گھونٹ میں کانچی کے جگر اور انتڑیوں کو کاٹ کر رکھ دے گی۔ اُس کا انجام وہی ہو گا جو سندھیا کا ہوا تھا۔

''تم کہاں پر ہو گی؟'' میں نے پوچھا۔

اُرملا بولی۔ ''جب تک کانچی مرتی نہیں میں اُس کی جھونپڑی کے قریب آنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتی۔ میں اسی چٹان والے غار میں تمہارا انتظار کروں گی۔''

میں نے کہا۔ ''اور اگر کانچی کو عین وقت پر پتہ چل گیا کہ میں نے اُسے ہلاک کرنے کی کوشش کی ہے تو وہ تو مجھے زندہ نہیں چھوڑے گی۔''

اُرملا فکر مند ہو کر بولی۔ ''یہی غم مجھے بھی لگا ہوا ہے۔''

پھر اُس کا چہرہ اچانک تمتما اُٹھا۔ میری طرف دیکھ کر بولی۔

''میں تمہیں بچانے کے لئے اپنی جان کی بازی بھی لگا سکتی ہوں۔ تم فکر مت کرو! میں رات کے وقت کانچی کی جھونپڑی کے آس پاس آ جاؤں گی۔ اگر اُسے میرا پتہ چل بھی گیا تو میں اُس کا مقابلہ کروں گی۔ لیکن تمہیں اُس کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑوں گی۔''

اُرملا کے اس عزم نے مجھ پر بڑا اثر کیا۔ وہ صرف میری خاطر اپنی جان خطرے میں ڈال رہی تھی۔ میں نے اُسے کہا۔

''نہیں اُرملا! تم ایسا مت کرنا۔ میرا خدا میرے ساتھ ہے۔ مجھے کچھ نہیں ہو گا۔''

اُرملا نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر اُسے بڑی محبت سے چوم کر کہا۔

''میں نے تمہیں کہہ دیا نا! کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ اور عورت جب کسی مرد کو سچے دل سے پیار کرتی ہے تو وہ اُس کی خاطر پہاڑوں سے بھی ٹکرا سکتی ہے۔''

اُس نے میرے ہاتھ کو ایک بار پھر چوما اور بولی۔ ''اب تم جاؤ! کہیں کانچی جلدی واپس نہ آ جائے۔''

میں نے بے اختیار ہو کر اُرملا کا ہاتھ چوم لیا۔ اُرملا نے بھی جذبات میں آ کر مجھے اپنے ساتھ لگا لیا، پھر جلدی سے الگ ہو گئی۔

''اب تم جاؤ......!''

اُرملا کے محبت بھرے سلوک نے میرے ارادوں کو چٹان کی طرح مضبوط بنا دیا تھا۔ میں غار سے نکلا اور کانچی کی جھونپڑی کی طرف چل پڑا۔ اُس وقت بوندا باندی شروع ہو

گئی تھی۔ جھونپڑی تک پہنچتے پہنچتے بارش ہونے لگی۔ مگر بارش ابھی ہلکی تھی۔ بالوں کی راکھ والی پڑیا میری جیب میں ہی تھی۔ میں جھونپڑی کے دروازے کے پاس بیٹھ گیا اور باہر بارش کو دیکھنے لگا۔

اپنے دل میں طرح طرح کے پروگرام بنا رہا تھا۔ رات کو سوم رس میں بالوں کی راکھ ملانے کے طریقے سوچ رہا تھا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ آخر میں نے یہ کہہ کر اس موضوع پر سوچنا بند کر دیا کہ اُس وقت جس قسم کی صورتحال ہو گی اُس کے مطابق کوئی ترکیب سوچ لوں گا۔

بارش ایک دم تیز ہو گئی۔ دس پندرہ منٹ تیز بارش ہوتی رہی، پھر بارش رُک گئی۔ یہ نیم پہاڑی علاقہ تھا۔ نشیب و فراز بہت تھے۔ بارش کتنی تیز ہو پانی رُکتا نہیں تھا، نکل جاتا تھا اور ندی نالوں میں شامل ہو جاتا تھا۔

○○○

شام کا اندھیرا آہستہ آہستہ گہرا ہونے لگا تو کانچی آ گئی۔

میں جھونپڑی کے باہر پتھر پر بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھ کر مسکرا دی۔ کہنے لگی۔

''تم میرا انتظار کرتے ضرور تھک گئے ہو گے۔ فکر نہ کرو! آج رات میں تمہیں خود تھپک تھپک کر سلاؤں گی۔ تمہاری ساری تھکان دُور ہو جائے گی۔''

میں نے دل میں کہا فکر نہ کرو! آج کی رات تمہاری زندگی کی آخری رات ہو گی۔ میں نے مسکراتے ہوئے اُسے کہا۔ ''تمہارے انتظار میں میری آنکھیں ضرور تھک گئی تھیں۔ اب تم آئی ہو تو میری آنکھوں کو سکون نصیب ہوا ہے۔''

کانچی میرے بالوں میں پیار سے اُنگلیاں پھیرتے ہوئے جھونپڑی میں چلی گئی۔ اندر سے اُس کی آواز آئی۔

''میں کھانا بنانے لگی ہوں...... دونوں مل کر کھائیں گے۔''

جھونپڑی کے اندر سے وہ کچھ سوکھی لکڑیاں لائی۔ باہر ایک درخت کے نیچے پتھر کا چولہا بنا ہوا تھا۔ میں اُس کے ساتھ کام کرنے لگ گیا۔ ہم نے آگ جلا کر کیتلی میں چاول اُبالے اور جھونپڑی میں بیٹھ کر بڑے مزے سے کھانے لگے۔ ساتھ اچار بھی تھا۔ میں نے کہا۔ ''کانچی! میرا تو جی چاہتا ہے کہ میں اسی جھونپڑی میں تمہارے ساتھ زندگی گزار دوں۔ تمہیں چھوڑ کر جانے کو اب دل نہیں مانتا۔ پھر دل میں یہ خیال بھی آتا ہے کہ اگر تمہیں چھوڑ کر کہیں گیا تو اُرملا مجھے زندہ نہیں چھوڑے گی۔''

کانچی کہنے لگی۔ ''جب تک میں تمہارے ساتھ ہوں اُرملا تمہارے قریب آنے کی ہمت نہیں کر سکتی۔ اور میں اب ہمیشہ تمہارے پاس رہوں گی۔''

پھر بولی۔ ''اُرملا کی زندگی کے دن تو اب پورے ہو چکے ہیں۔ کل تم میرے ساتھ ہمارے پہلے والے مندر میں چلو گے۔ وہاں تم سندھیا کی آتما سے میرے سامنے بات کرو

گے اور اسے کہو گے کہ تم اپنے کیئے پر پشیمان ہو۔ اور یہ کہ اس کو ہلاک کرنے میں تمہارا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ یہ ساری سازش اُرملا کی تھی۔ اس کے بعد ہم واپس اسی جھونپڑی میں آ جائیں گے۔ اور پھر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے کے ہو جائیں گے۔''

میں فوراً سمجھ گیا کہ کل وہ مجھے خونی مندر میں کس لئے لے جا رہی ہے؟ سندھیا کی آتما سے معافی مانگنے کا ایک بہانہ تھا۔ دراصل وہ کل مجھے دیوی ماتا کی بھینٹ چڑھانے کا منصوبہ بنا چکی تھی۔ اب یہی اُس کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد تھا اور اسی کی خاطر وہ مجھ سے اتنی محبت اور پیار کا سلوک کر رہی تھی۔ اور یہ بھی کچھ بعید نہیں تھا کہ اُس نے اسی رات کو ہی مجھے ہلاک کرنے کا پروگرام بنا رکھا ہو۔ ورنہ وہ مجھے یہ کبھی نہ کہتی کہ آج رات میں تمہیں خود تھپک تھپک کر سلاؤں گی۔ وہ یہی سمجھ رہی تھی کہ میں اُس کے جادو ٹونے کے زیر اثر ہوں۔ اُس کے جادوٹونے کا اثر ہی مجھے کھینچ کر اُس کے پاس لے آیا ہے۔ جبکہ ایسی بات نہیں تھی اور اُرملا کی آس پاس موجودگی نے مجھے کانچی کے جادوٹونے سے محفوظ کر رکھا تھا۔ عجیب صورتحال پیدا ہو گئی تھی۔ وہ رات ہم دونوں کے لئے بھاری تھی۔ ہم دونوں نے دل میں ایک دوسرے کو قتل کرنے کا منصوبہ بنا رکھا تھا۔ اور وہ رات ہم دونوں میں سے کسی کی زندگی کی بھی آخری رات ثابت ہو سکتی تھی۔

میں اپنی جگہ پر چوکس تھا اور وہ اپنی جگہ پر ہوشیار تھی۔ کچھ پتہ نہیں تھا اس رات کو کیا ہونے والا تھا؟ رات گہری ہونا شروع ہو گئی۔ جنگلوں کی رات موت کی خاموشی لے کر آتی ہے۔ ایسا سکوت چھا جاتا ہے کہ دل کی دھڑکن کی آواز بھی صاف سنائی دیتی ہے۔ اگر جنگل میں درندوں کا بسیرا ہو تو آدھی رات کے بعد کسی لگڑ بگڑ کی آواز یا کسی شیر کی دھاڑ دُور سے سنائی دے جاتی ہے جو جنگل کے سکوت کو اور زیادہ دہشت ناک بنا دیتی ہے۔ مگر آسام کے جنگل کے ہم جس علاقے میں تھے وہاں شیر چیتے نہ ہونے کے برابر تھے۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ جنگل کا یہ علاقہ آبادی کے قریب تھا۔ جب رات زیادہ گہری ہو گئی تو کانچی نے مورتی کے آگے دیا جلا دیا اور لوبان سلگا دیا۔ کہنے لگی۔

''میں تھوڑی پوجا کر لوں..... پھر بیٹھ کر باتیں کریں گے۔''

میں نے بالوں کی راکھ والی پڑیا جیب میں سنبھال کر رکھ لی تھی اور اپنے ذہن میں وہ ترکیب بھی سوچ لی تھی جس پر عمل کر کے مجھے پڑیا نکال کر اُس کی راکھ کانچی کے گلاس

میں ڈالنی تھی۔ اُرملا نے کہا تھا کہ راکھ کی ایک چٹکی ہی کافی ہو گی۔ میں پہلے بھی دیکھ چکا تھا کہ کانچی رات کو مورتی پوجا کے بعد سوم رس ضرور پیتی تھی۔ وہ کہتی تھی کہ یہ دیوتاؤں کے نام پر پیتی ہوں۔ میں زمین پر بچھے ہوئے بستر پر چوکڑی مار کر بیٹھ گیا اور کانچی کو مورتی پوجا کرتے دیکھنے لگا۔ پہلے تو وہ دھیمی آواز میں منتروں کا جاپ کرتی رہی، پھر اونچی آواز میں اشلوک پڑھنے شروع کر دیئے۔ اس کے بعد کانچی نے چھ سات بار مورتی کے آگے ماتھا ٹیکا، لوبان کے دُھوئیں کو اپنے ہاتھوں کی مٹھیوں میں لے کر اپنے جسم پر ملا اور اُٹھ کھڑی ہوئی۔ میری طرف ایک نگاہ ڈال کر دیکھا اور بولی۔

''تم جاگ رہے ہو؟''

میں نے کہا۔ ''مجھے نیند نہیں آ رہی۔''

کہنے لگی۔ ''میں خود تمہیں سلا دوں گی۔''

میں نے دل میں کہا میں بھی خود تمہیں سلا دوں گا۔ ہمیشہ کی نیند......! میں نے دل میں سوچ لیا تھا کہ چاہے کچھ ہو جائے میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو کر رہوں گا۔ خدا پر پختہ یقین اور اُرملا کی محبت نے میرے دل میں اعتماد کی بھرپور طاقت پیدا کر دی تھی۔ آخر میں انسان تھا۔ دل میں ایک لمحے کے لئے خیال کی لہر اُبھرتی، اگر میں ایسا نہ کر سکا تو کیا ہو گا؟ مگر میں اس خیال کو فوراً اپنے دل سے نکال دیتا۔

کانچی میرے پاس آ کر بیٹھ گئی اور میرا ہاتھ پکڑ کر پیار محبت کی باتیں کرنے لگی۔ اُس نے ایک بار میری گردن کی اُس جگہ کو بھی چوما جہاں اُس کے خون پینے کی وجہ سے زخم ہو گیا تھا۔ مگر اب زخم کا صرف معمولی سا نشان ہی باقی تھا۔ گردن کے ساتھ منہ لگانے کے ایک سیکنڈ بعد اُس نے منہ پیچھے کر لیا تھا۔ میں نے اس طرح کی اداکاری شروع کر دی تھی جیسے مجھ پر اُس کے جادوٹونے کا اثر ہونا شروع ہو گیا ہے۔ میں کبھی اپنی گردن کو دائیں طرف اور کبھی بائیں طرف جھکا لیتا اور ایسی آواز بنا کر بولتا جیسے میں نے بہت زیادہ نشہ کیا ہوا ہو۔

میری اس کیفیت سے کانچی کے جذبات بھی بیدار ہو رہے تھے۔ اچانک وہ اُٹھ کر جھونپڑے کے کونے میں جہاں صندوق پڑا تھا گئی۔ میں دیکھ رہا تھا۔ میں پوری طرح سے چوکس اور ہوشیار تھا۔ کانچی صندوق کے پاس رکھی ہوئی کانسی کی کٹوری اور کانسی کی

دو گلاسیاں لے کر آ گئی۔ کہنے لگی۔

''دیوتاؤں کا حکم ہے کہ میں خود بھی سوم رس پیوں اور تمہیں بھی پلاؤں۔''

میں اسی لمحے کا انتظار کر رہا تھا۔ اُس نے کانسی کی کٹوری اور گلاسیاں مورتی کے پاس رکھ دیں اور مجھے بھی وہیں بلا لیا۔

''یہاں آ جاؤ...... ہم دیوتاؤں کو خود اپنے ہاتھ سے سوم رس پلائیں گے۔''

میں اُٹھا اور اُس کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ اُٹھنے سے پہلے میں نے خدا سے دُعا مانگی کہ یا اللہ پاک! مجھے اس امتحان میں کامیاب کرنا۔ میں اپنے گناہوں سے توبہ کرتا ہوں اور آئندہ کبھی ایسا گناہ نہ کرنے کا عہد کرتا ہوں۔

مورتی کے آگے ٹاٹ کا ٹکڑا بچھا تھا جس پر ہم آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ کانچی نے دو چار اشلوک بولے اور کٹوری کا ڈھکن ہٹا کر دونوں گلاسیوں میں سوم رس ڈال دیا۔ ایک گلاسی مجھے دی، دوسری گلاسی اپنے ہاتھ میں پکڑی اور مجھے کہا۔

''کہو...... ترلوک کے دیوتاؤں کے نام۔''

میں نے کہہ دیا۔ ''ترلوک کے دیوتاؤں کے نام۔''

وہ بولی۔ ''جلدی سے پی جاؤ...... دیوتا پیاسے ہیں۔''

میں سانس روک کر بڑی مشکل سے بد ذائقہ سوم رس کے تین گھونٹ پی گیا۔ کانچی نے پوری گلاسی اپنے حلق میں اُنڈیل لی۔ میں یہی چاہتا تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ سوم رس پئے اور جلدی مدہوش ہو جائے۔ اس کے بعد اُس نے دوسری مرتبہ گلاسیوں کو سوم رس سے بھرا اور بولی۔

''دیوتاؤں کی پیاس ابھی نہیں بجھی...... اسے بھی پی جاؤ!''

میں جی کڑا کر کے دوسری گلاسی بھی آدھی سے زیادہ پی گیا۔ کانچی نے دوسری بار بھی اپنی گلاسی خالی کر دی۔ پھر وہ اُٹھی اور کونے میں صندوق کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔ جھونپڑی کے بانس کے ساتھ لٹکی ہوئی لالٹین کی مدھم روشنی میں، میں نے دیکھا کہ اُس نے ساڑھی اُتار کر صندوق میں رکھ دی اور گیروے رنگ کی چادر اوڑھ لی۔ اس چادر پر سنسکرت زبان میں منتر اور اشلوک چھپے ہوئے تھے۔ اس قسم کی چادریں ہندوستان کے مہنت اور پجاری اکثر پوجا پاٹھ کرتے وقت اوڑھ لیا کرتے ہیں۔ وہ پاس آ گئی۔ اب ''

میری گردن پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ میرے خون سے اپنی پیاس بجھانا چاہتی ہے۔ میں خاموش بیٹھا رہا اور یہی ظاہر کیا کہ مجھ پر نیم بے ہوشی طاری ہو رہی ہے۔

کانچی اپنا منہ میری گردن کے پاس لائی اور پھر جلدی سے منہ پیچھے کر لیا اور بولی۔

''تمہارے خون میں ابھی تک اُرملا کے ملائے ہوئے زہر کا اثر ہے۔''

پھر اُس نے غصے میں میرا گریبان پکڑ کر مجھے اپنی طرف کھینچا اور بولی۔

''تم مجھے بھی قتل کرنے آئے تھے...... کیوں آئے تھے؟''

میں نے کہا۔ ''کانچی! اُرملا نے مجھ پر جادو کیا ہوا تھا۔ میں اُس کے اثر میں تھا۔ میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ میں تو اُس وقت بھی تم سے پریم کرتا تھا اور اب بھی پریم کرتا ہوں۔''

اُس نے میرا گریبان چھوڑ دیا اور ہلکا سا قہقہہ لگا کر بولی۔

''تم ڈر گئے......؟ میں تو تم سے مذاق کر رہی تھی۔ میں سب کچھ جانتی ہوں...... میں یہ بھی جانتی ہوں کہ اس وقت تمہارے دل میں کیا ہے۔''

میں ڈر گیا۔ کہیں اس عورت کو پتہ تو نہیں چل گیا کہ میں اسے ہلاک کرنے کا ارادہ لے کر آیا ہوں اور میری جیب میں اُس کے اور سندھیا کے بالوں کی راکھ موجود ہے؟ میں نے اُوپر اُوپر سے مسکراتے ہوئے کہا۔

''میرے دل میں تمہارے پریم کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ یہ بات تمہارے دیوتا بھی جانتے ہیں۔''

اس دوران کانچی نے سوم رس کی تیسری گلاسی بھی بھر کر چڑھا لی تھی۔ وہ ہنس پڑی۔

''مجھے سب معلوم ہے...... جو دیوتاؤں کو معلوم ہے وہ مجھے بھی معلوم ہے۔''

وہ اُٹھی اور اُس نے مورتی کے سامنے رقص کرنا شروع کر دیا۔ ناچتے ہوئے اُس کے قدم بار بار ڈگمگا رہے تھے۔ میں اپنے ہوش و حواس میں تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں نے واہیات سوم رس کے چار پانچ گھونٹ ہی پئے تھے۔ وقت آ گیا تھا کہ میں اپنا عمل شروع کر دوں۔ ناچتے ناچتے ایک بار جب اُس نے مورتی کو ماتھا ٹیکتے ہوئے اپنا سر زمین کے ساتھ لگا دیا تو میں نے جلدی سے جیب میں سے پڑیا نکال کر کھولی اور جلے ہوئے بالوں کی راکھ کانچی کی گلاسی میں ڈال کر اُس کی کٹوری میں سے مزید سوم رس انڈیل دیا۔

اُس وقت میرا دل بڑے زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ یہی ڈر لگ رہا تھا کہ اگر کانچی کو پتہ چل گیا تو وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گی۔ لیکن جب تک وہ میرے سامنے بالوں کی راکھ والا سوم رس نہیں پی لیتی میں وہاں سے فرار نہیں ہو سکتا تھا۔ میں اُس کی موت اپنی آنکھوں کے سامنے واقع ہوتی دیکھ کر وہاں سے بھاگنا چاہتا تھا۔ اُس وقت مجھے بے اختیار اُرملا کا خیال آ گیا جو یقینی طور پر اس لمحے جھونپڑے کے آس پاس ہی تھی۔ میں نے یہ کام اتنی تیزی سے کیا تھا کہ کانچی کو بالکل خبر تک نہ ہو سکی۔ میں نے راکھ کی پڑیا والا کاغذ جیب میں ڈالا تو کانچی نے سر اُٹھا کر مورتی کو تین بار پرنام کیا اور میرے قریب ہو کر بیٹھ گئی۔ اُس نے کٹوری میں سے سوم رس پہلے میری گلاسی میں ڈالا، پھر اپنی گلاسی میں ڈالا۔ اُس کی گلاسی میں دو تین گھونٹ سوم رس کے پہلے سے موجود تھے۔

بڑا نازک لمحہ تھا۔ ایک طرح سے میری موت میرے سر پر منڈلانے لگی تھی۔ اگر کانچی کو ذرا سا بھی شک پڑ گیا کہ میں نے اُس کے سوم رس میں کچھ ملا دیا ہے تو وہ اپنے انتقام کی آگ میں مجھے بھسم کرنے سے گریز نہیں کرے گی۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی۔ میں موت کے اس کھیل کو جلدی ختم کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اپنی گلاسی اُٹھا لی اور کانچی سے کہا۔

''دیوتاؤں کے نام......''

کانچی نے کہا۔ ''دیوتاؤں کے نام......''

مگر اُس نے اپنی گلاسی نہیں اُٹھائی۔ میں نے کہا۔

''تم بھی دیوتا کو سوم رس پلاؤ کانچی!''

کانچی آنکھیں سکیڑے مجھے دیکھنے لگی۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے اُسے میری سازش کا پتہ چل گیا تھا۔ میں نے ہمت سے کام لیتے ہوئے کہا۔

''کانچی! میں چاہتا ہوں سوم رس کے یہ چند گھونٹ ہم دونوں ایک ساتھ دیوتاؤں کو پیش کریں۔''

کانچی نے مسکراتے ہوئے اپنی گلاسی اُٹھا لی۔ میں نے گلاسی اپنے ہونٹوں سے لگائی تو کانچی نے بھی اپنی گلاسی کو ہونٹوں کے ساتھ لگا لیا اور میرے دیکھتے دیکھتے سارا سوم رس پی گئی۔ اُس لمحے میں اس قدر خوف زدہ ہوا جیسے زہر والا سوم رس میں نے پی لیا ہو۔

میری نظریں کانچی پر جمی ہوئی تھیں۔ میں اُس کے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ لالٹین کی دھیمی روشنی میں اُس کا چہرہ ویسے کا ویسے ہی تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اُس پر سوم رس میں حل کی ہوئی راکھ کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ کانچی کے حلق سے ایسی چیخ بلند ہوئی جیسے اُس کا جگر کٹ گیا ہو...... میں گھبرا کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ کانچی بھی کھڑی ہو گئی۔ وہ ڈول رہی تھی اور میری طرف غضبناک آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ اُس نے کچھ کہنا چاہا مگر اُس کی زبان لڑکھڑا گئی۔

کانچی کی چیخ کی آواز پر اُرملا اچانک اندر آ گئی۔ کانچی ڈولتے ڈولتے ایک دم سنبھل گئی۔ اُرملا کو دیکھ کر کانچی کی آنکھوں سے چنگاریاں سی پھوٹنے لگیں۔ اس سے پہلے کہ کانچی کوئی حرکت کرتی، اُرملا نے میرا بازو پکڑ کر مجھے کھینچا اور بولی۔

''نکلو یہاں سے......!''

میں اور اُرملا دیوانہ وار باہر کی طرف دوڑے۔ ہم نے ایک لمحے کے لئے بھی پیچھے مُڑ کر نہ دیکھا۔ اُرملا اور میں بس دوڑتے چلے جا رہے تھے۔ اُس نے دوڑتے دوڑتے مجھے صرف اتنا کہا تھا۔

''رُکنا نہیں......!''

ہم جھونپڑی کے عقبی تالاب اور اس کے بعد جو ندی آتی تھی اُس سے بھی آگے نکل گئے۔ رات کی تاریکی میں ہمیں اتنا ضرور دکھائی دیتا تھا کہ ہمیں کس طرف جانا ہے۔ اُرملا میری راہ نمائی کر رہی تھی۔ شام کو اور شروع رات میں جو بارش ہوئی تھی اُس سے زمین پر اُگی ہوئی گھاس گیلی تھی۔ پہاڑی علاقہ ہونے کی وجہ سے بارش کا پانی نشیب میں بہہ گیا تھا جس کی وجہ سے ہمیں دوڑنے میں رُکاوٹ پیش نہیں آ رہی تھی۔ ہم جنگل میں داخل ہو گئے۔ جنگل میں داخل ہونے کے بعد درختوں اور جھاڑیوں کی رُکاوٹ کے باعث ہماری رفتار دھیمی ہو گئی۔ میرا سانس پھول رہا تھا۔ اُرملا بھی تیز تیز سانس لے رہی تھی۔ وہ ایک جگہ رُک گئی۔ اپنا سانس ٹھیک کرتے ہوئے بولی۔

''تم نے راکھ کانچی کو پلا دی تھی؟''

میں نے کہا۔ ''ہاں! پڑیا کی ساری راکھ میں نے کانچی کے گلاس میں ڈال دی تھی۔''

میں سانس لینے کے لئے رُک گیا۔ اُرملا نے پوچھا۔

''تمہارے سامنے اُس نے راکھ والا سوم رس پیا تھا؟''

میں نے کہا۔ ''بالکل ... میرے سامنے پیا تھا۔ پہلے تو اس پر کچھ اثر نہیں ہوا۔ پھر ایک دم سے اُس کے حلق سے ڈرا دینے والی چیخ نکلی اور وہ ڈولنے لگی۔''

اُرملا نے دوتین لمبے لمبے سانس لے کر کہا۔ ''میں اُس کی چیخ کی آواز سن کر ہی اندر آئی تھی۔''

''میرا خیال ہے کانچی اب تک مر چکی ہوگی۔'' میں نے کہا۔

''ہاں!'' اتنا کہہ کر وہ اُٹھی اور بولی۔ ''یہاں زیادہ دیر رُکنا خطرناک ہوسکتا ہے۔''

اور پھر ہم گھنے درختوں اور جھاڑیوں میں جتنی تیز چل سکتے تھے چلنے لگے۔ آگے زمین نشیبی تھی، وہاں ہماری رفتار تیز ہوگئی۔ گھنا جنگل ختم ہوگیا۔ ہم ایک ٹیلے کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کھلی جگہ پر آ گئے۔ رات کے اندھیرے میں ہمارے اِرد گرد دھان اور پٹ سن کے کھیت تھے۔ ایک طرف گنگا مٹھ کا گاؤں تھا جہاں کہیں کہیں روشنی ہو رہی تھی۔ وہاں سے ہمارا رُخ گوہاٹی کے ریلوے سٹیشن کی طرف ہوگیا۔ ایک گاؤں کے قریب سے گزر جانے کے بعد دُور سے ہمیں سٹیشن کے سگنل کی بتی نظر آئی تو اُرملا نے کہا۔

''کانچی ابھی تک ہمارے پیچھے نہیں آئی۔ اس کا مطلب ہے کہ راکھ نے اپنا کام کر دیا ہے۔ کانچی مر چکی ہے۔''

''خدا کرے ایسا ہی ہو۔'' میرے منہ سے اپنے آپ نکل گیا۔

ہم گوہاٹی کے سٹیشن پر آ کر اُس کی ڈیوڑھی میں بیٹھ گئے۔ اُرملا بے چین دکھائی دے رہی تھی۔ کہنے لگی۔

''گاڑی پتہ نہیں کب آئے گی؟ ہمارا یہاں زیادہ دیر رُکنا ٹھیک نہیں۔''

میں خود پریشان تھا۔ میں نے کہا۔

''پھر ہم کیا کریں..... کیوں نہ ہم یہاں سے پیدل چل پڑیں؟ صبح ہونے تک یہاں سے کچھ دُور تو نکل ہی جائیں گے۔''

اُرملا اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ کہنے لگی۔ ''یہاں کوئی آدمی بھی نظر نہیں آتا۔''

اتنے میں ایک آدمی سٹیشن کی ڈیوڑھی میں داخل ہوا۔ اُس کے ہاتھ میں جلتی ہوئی لالٹین تھی۔ اُرملا نے مجھ سے کہا۔ ''یہ سٹیشن کا آدمی ہے۔ اس سے پوچھو دِلّی کی طرف

جانے والی گاڑی کب آئے گی؟''

میں نے آگے بڑھ کر اُس آدمی سے پوچھا تو وہ بولا۔ ''دِلّی جانے والی گاڑی صبح آئے گی۔ ابھی ڈنگا پاڑی جانے والی پسنجر گاڑی آ رہی ہے۔''

میں نے اُرملا کو آ کر بتایا تو وہ بولی۔ ''ہم اُسی گاڑی میں بیٹھ جاتے ہیں۔ یہاں سے نکلنا بہت ضروری ہے۔''

اُس نے مجھے کچھ کرنسی نوٹ تھیلے میں سے نکال کر دیئے اور کہا۔

''اگر بکنگ آفس کھل گیا ہو تو جا کر جے پور کے دو ٹکٹ لے آؤ!''

چونکہ ٹرین آ رہی تھی اس لئے سٹیشن کے باہر کی جانب بکنگ آفس کھل گیا تھا۔ میں نے جے پور کے دو ٹکٹ لئے اور اُرملا کے پاس آ گیا۔ اُس نے ایک ٹکٹ خود رکھ لیا اور دوسرا ٹکٹ مجھے دے کر کہا۔

''اسے اپنے پاس رکھو! کچھ پتہ نہیں آگے کس قسم کے حالات بن جائیں ... تم جے پور پہنچنے کی کوشش کرنا۔''

زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ ایک ٹرین آ کر پلیٹ فارم پر رُک گئی۔ ٹرین پر سوار ہونے والے صرف میں اور اُرملا دو ہی مسافر تھے۔ ہم جلدی سے ایک ڈبے میں سوار ہو گئے۔ ٹرین تین چار منٹ تک رُکی، پھر چل پڑی۔ ڈبے کے اکثر مسافر سو رہے تھے۔ ہم دروازے کے قریب ایک سیٹ پر بیٹھے تھے۔ ٹرین نے سپیڈ پکڑی تو اُرملا کہنے لگی۔

''اچھا ہوا کہ یہ گاڑی مل گئی۔ ہم کانچی سے جتنی دور ہو جائیں اتنا ہی بہتر ہے۔''

میں نے کہا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ تمہارے دل میں شک ہے کہ شاید کانچی زندہ ہو؟''

وہ بولی۔ ''وشواس سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ کانچی نے ترلوک کے دیوتاؤں کا چلّہ کاٹ کر بڑی زبردست شکتی حاصل کر لی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اپنی شکتی کی وجہ سے وہ بچ گئی ہو۔''

میرا دل بیٹھ گیا۔ میں نے کہا۔

''اُرملا! اگر کانچی زندہ بچ گئی تو یہ ہم دونوں کے لئے بہت برا ہوگا۔ میرے ساتھ وہ تمہیں بھی کہیں اور کسی جگہ دبوچ سکتی ہے۔''

اُرملا بولی۔

''وہ ایسا ہی کرے گی۔ میں اُس کی شکتی کا مقابلہ نہ کرسکوں گی۔ لیکن تم ایک بات یاد رکھنا! اگر مجھ پر اچانک کوئی مصیبت نازل ہوگئی تو تم مجھے بچانے کی کوشش مت کرنا اور اپنی جان بچا کر بھاگ جانا۔ مجھے بچانے کی کوشش کرو گے تو خود اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔''

میں نے کہا۔

''اُرملا! تمہیں مصیبت میں دیکھ کر میں اپنی جان بچا کر نہیں بھاگ سکتا۔ یہ میرے اختیار میں نہیں ہے۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ میں اپنی جان لڑا دُوں گا اور تمہیں مصیبت سے نکال کر لے جاؤں گا۔''

اُرملا نے اپنا سر نفی میں ہلاتے ہوئے کہا۔ ''یہ بیوقوفی مت کرنا! اگر کانچی زندہ بچ گئی تو وہ اپنی پوری شکتی کے ساتھ حملہ کرے گی۔''

میں نے محبت کے جذبے کے ساتھ کہا۔

''اُرملا! اگر ایسا وقت آ گیا تو میں تم سے پہلے اپنی جان دُوں گا۔''

اُرملا نے میرا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر اپنی آنکھوں سے لگایا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ ٹرین رات کے اندھیرے میں پوری رفتار سے دوڑتی چلی جا رہی تھی۔ یہ چھوٹی ریلوے لائن کی ٹرین تھی۔ ہمیں صوبہ آسام سے نکل کر بنگال اور بنگال سے آگے صوبہ بہار میں سے ہوتے ہوئے آگے دِلّی جانا تھا جہاں سے جے پور کی ٹرین پکڑنی تھی۔

ٹرین کی رفتار کم ہونے لگی۔ ٹرین چڑھائی چڑھ رہی تھی۔ اگر آپ ہندوستان کے نقشے پر نگاہ ڈالیں تو آپ کو صوبہ آسام شمال مشرق میں اُوپر کی جانب بھوٹان اور سکم کی جنوبی سرحد کے ساتھ نظر آئے گا۔ آج کل آسام کے کئی صوبے بن گئے ہیں۔ مگر اُن دنوں یہ پورے کا پورا ایک وسیع و عریض صوبہ تھا۔ یہاں اُونچی نیچی پہاڑیاں، ندی نالے، دریا اور پہاڑوں کی گہری وادیوں میں جنگل پھیلے ہوئے تھے۔ گوہاٹی آسام کے بالکل شمالی کونے میں ہے جہاں سے ہم چلے تھے۔ چڑھائی چڑھتے وقت ہمیں پتہ چلا کہ گاڑی کے پیچھے بھی ایک انجن لگا ہوا ہے۔ رات کے اندھیرے میں جب ٹرین ایک جگہ نصف دائرے میں گھومی تو ٹرین کے پچھلے ڈبے دکھائی دیئے جن میں روشنی ہو رہی تھی اور

اُن کے پیچھے ایک اور انجن لگا ہوا تھا جو پورا زور لگا کر چل رہا تھا۔ اُرملا بالکل میرے ساتھ ہی بیٹھی ہوئی تھی۔ کھڑکی میں سے اندھیرے میں پیچھے کو جاتے درخت کبھی کبھی بالکل قریب سے ہو کر نکل جاتے تھے۔

اُس نے کہا۔ ''ہم گوہاٹی دِلّی مین لائن سے ہٹ کر جنوب کی سمت جا رہے ہیں۔''

میں وہاں کے علاقوں سے اتنی زیادہ واقفیت نہیں رکھتا تھا۔ میں نے پوچھا۔

''ہم دِلّی تو پہنچ جائیں گے نا؟''

اُرملا نے جواب دیا۔

''پہنچ جائیں گے۔ مگر پتہ نہیں کب پہنچیں گے؟ کیونکہ ہمیں ڈنگا پاڑی کے سٹیشن سے دِلّی کی طرف گاڑی پکڑنی ہوگی۔ وہاں سے کوئی گاڑی سیدھی دِلّی نہیں جاتی۔''

میں نے تشویش کے ساتھ کہا۔

''اس کا مطلب ہے کہ ہم ان پہاڑی جنگلی علاقوں میں پھنس کر رہ گئے ہیں؟''

''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' اُرملا بولی۔ ''اگر کانچی سچ مچ مر چکی ہے تو ہمیں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ لیکن اگر ہماری بدقسمتی سے کانچی مری نہیں اور زندہ ہے تو ہمارے لئے خطرہ پیدا ہوسکتا ہے۔''

ٹرین ابھی تک چڑھائی چڑھ رہی تھی۔ میں سوچ میں پڑ گیا کہ خدا جانے اس کانچی کے عذاب سے مجھے کب رہائی نصیب ہوگی؟ اُرملا نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''جنگلوں اور ویرانوں میں کانچی کا ویدک جادوٹونہ زیادہ اثر کرتا ہے۔ جے پور پہنچنے کے بعد اپنے ٹھاکر محل کی حویلی میں ہم کافی حد تک محفوظ ہو جائیں گے۔''

''وہ کس طرح؟'' میں نے پوچھا۔

اُرملا کہنے لگیں۔ ''ٹھاکر محل میں ہمارے باپ داداؤں کے وقت سے بھی پہلے کے وقتوں سے وشنو اور کرشن مہاراج کا بھجن کیرتن ہوتا آیا ہے۔ کانچی کا جادوٹونہ وہاں کام نہیں کر سکے گا۔''

میں نے کہا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ جب تک کانچی زندہ ہے ہم ٹھاکر محل کی چار دیواری سے باہر نہیں جا سکیں گے؟''

اُرملا کہنے لگی۔

''تم بہت جلد ناراض ہو جاتے ہو۔ یہ سب کچھ بعد میں بھی سوچا جا سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے اس کا بھی کوئی حل نکل آئے۔ اور کیا خبر کہ کانچی واقعی مر چکی ہو۔''

اس کے بعد میں خاموش ہو گیا۔ ٹرین اب نشیب میں اُتر رہی تھی اور اس کی رفتار تیز ہو گئی تھی۔ اس کے بعد ٹرین میدانی علاقے میں آ گئی اور اس کی رفتار کم ہونا شروع ہو گئی۔ اُرملا نے کھڑکی سے باہر دیکھ کر کہا۔

''کوئی سٹیشن آ رہا ہے۔''

یہ وہی ڈنگا پاڑی کا سٹیشن تھا۔ یہ ٹرین یہاں آ کر ختم ہو جاتی تھی۔ اُس وقت آسمان پر صبح کی ہلکی سفیدی ظاہر ہونا شروع ہو گئی تھی۔ آسمان پر اسی طرح بادل چھائے ہوئے تھے۔ دوسرے مسافروں کے ساتھ ہم بھی وہاں اُتر گئے۔ ٹرین کو واپس گوہاٹی جانا تھا۔ گوہاٹی جانے والے مسافروں کا ہجوم پہلے سے وہاں موجود تھا۔ مسافر ٹرین میں سوار ہونے لگے۔ ہم پلیٹ فارم کی ایک جانب ہٹ کر بنچ پر ایک سٹال کی اوٹ میں بیٹھ گئے۔ جب ٹرین واپس چلی گئی تو پلیٹ فارم پر خاموشی چھا گئی۔ سامنے ایک اور چھوٹا سا پلیٹ فارم تھا جہاں سے ایک چھوٹی لائن کا انجن شنٹ کرتا گزر گیا۔ یہ پہاڑی سٹیشن تھا۔ معلوم ہوا کہ ہم ابھی تک آسام کے صوبے میں ہی ہیں اور وہاں سے بنگال کی سرحد ڈیڑھ دن کی مسافت پر ہے۔

میں نے اُرملا سے کہا۔ ''اب کیا کرنا چاہئے؟''

اُس نے کہا۔ ''پتہ کرو! کہ یہاں سے بنگال کی طرف گاڑی کب روانہ ہوتی ہے؟''

سٹیشن کی ڈیوڑھی والے گیٹ پر ایک ٹکٹ چیکر کرسی پر بیٹھا تھا۔ میں اُس کے پاس چلا گیا۔ اُس سے بنگال کی طرف جانے والی گاڑی کا پوچھا تو وہ بولا۔

''یہاں کوئی ٹرین سیدھی دِلّی نہیں جاتی۔ ابھی ایک گھنٹے بعد ایک پسنجر ٹرین آئے گی جو تمہیں شیلانگ تک لے جائے گی۔ شیلانگ سے گورکھ پور والی ٹرین پکڑنا۔ گورکھ پور سے تمہیں دِلّی جانے والی گاڑی مل جائے گی۔''

یہ ساری تفصیل میں نے اُرملا کو بتا دی۔ اُرملا کے چہرے پر میں پہلی بار ایسا تاثر دیکھ رہا تھا جیسے وہ کسی آنے والے خطرے سے خوف زدہ ہو۔ وہ بنچ پر سمٹی ہوئی بیٹھی تھی۔ کہنے لگی۔ ''بھگوان کرے شیلانگ تک جانے والی گاڑی وقت پر آ جائے۔''

میں اُس کے پاس بیٹھ گیا۔ مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں نے اُس سے پوچھا۔

''کیا بات ہے اُرملا؟ تم کچھ گھبرائی ہوئی لگتی ہو۔ اس سے پہلے میں نے تمہیں کبھی اس حالت میں نہیں دیکھا۔''

اُرملا نے کہا۔ ''میں کانچی کی طرف سے پریشان ہوں۔''

کانچی کی وجہ سے پریشان میں بھی تھا۔ اُرملا کو گھبرائی ہوئی دیکھ کر میری پریشانی بڑھ گئی۔ میں نے کہا۔ ''کیا تم اپنے گیان یا اپنے ویدک علم کی مدد سے یہ پتہ نہیں لگا سکتیں کہ کانچی زندہ ہے یا نہیں؟''

اُرملا نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''کانچی کو نئی شکتی مل گئی ہے۔ میرا علم اور میرا گیان اُس تک نہیں پہنچ سکتا۔ اسی وجہ سے میں کسی وقت پریشان ہو جاتی ہوں۔ اگر وہ زندہ ہوئی اور اُس نے ہم پر حملہ کر دیا تو میری ویدک شکتی تمہیں تو اُس کے حملے سے محفوظ رکھے گی۔ وہ تمہیں نہیں پکڑ سکے گی۔ لیکن میں اُس کے حملے کی زد سے نہیں بچ سکوں گی۔''

میں نے کہا۔ ''اُرملا! اگر ایسی گھڑی آ گئی تو میں کانچی کا مقابلہ کروں گا۔ میں تمہیں کوئی گزند نہیں پہنچنے دُوں گا۔ چاہے میری جان چلی جائے۔''

اُرملا نے چہرہ اُوپر اُٹھا کر میری طرف دیکھا اور بولی۔ ''ایسی بات پھر نہ کہنا۔ میری وجہ سے تمہیں کچھ ہو جائے، یہ میں کبھی برداشت نہیں کر سکتی۔''

دن نکل آیا تھا۔ مسافر ڈیوڑھی میں سے گزر کر پلیٹ فارم کی طرف جانے لگے تھے۔ اُرملا گہری سوچ میں تھی۔ اُس نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور بولی۔

''ایک بہت ضروری بات میں تمہیں بتانا چاہتی ہوں۔ دھیان سے سننا! اگر کانچی زندہ ہے تو وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گی اور تمہیں اپنے منتروں کی شکتی سے اپنے ساتھ لے جائے گی تاکہ دیوی ماتا کے آگے تمہاری قربانی دے کر ترلوک کے سارے دیوتاؤں سے زیادہ شکتی حاصل کر سکے۔ اگر مجھے کچھ ہو گیا تو......''

میں نے اُرملا کا ہاتھ پکڑ کر بڑے جذبے کے ساتھ کہا۔ ''میں تمہیں کچھ نہیں ہونے دُوں گا۔''

اُرملا مجھے ڈانٹنے کے لہجے میں بولی۔ ''تم ایک پل کے لئے خاموش نہیں رہ سکتے؟''

میں چپ ہو گیا۔ اُرملا کہنے لگی۔

''اگر کانچی مجھے ہلاک کرنے میں کامیاب ہو گئی تو تم غیر محفوظ ہو جاؤ گے۔ پھر کانچی تمہیں آسانی سے قابو کر لے گی۔ اور اس بار اگر تم اُس کے قبضے میں چلے گئے تو وہ ایک پل بھی ضائع نہیں کرے گی اور تمہارا سر کاٹ کر ماتا دیوی کے پاس لے جائے گی۔''

ایک بار تو میرا رنگ اُڑ گیا۔ اُرملا نے میری پریشانی کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔

''مگر میں تمہیں کانچی کے ہاتھوں مرنے نہیں دُوں گی۔ میں نے زندگی میں پہلی بار کسی سے محبت کی ہے۔ اور جس سے محبت کی ہے وہ تم اور صرف تم ہو...... میں تمہیں ہمیشہ زندہ دیکھنا چاہتی ہوں۔''

اُرملا نے میرے دل کے نازک تار ہلا دیئے تھے۔ میں بھی اُرملا سے بے پناہ پیار کرنے لگا تھا۔ میں نے بھی زندگی میں پہلی بار کسی لڑکی سے اتنی شدت اور رُوح کی گہرائیوں سے محبت کی تھی۔ اور وہ لڑکی اُرملا ہی تھی۔ میں بھی اُسے ہمیشہ زندہ اور اپنی نظروں کے سامنے دیکھنا چاہتا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا اُرملا نے اپنے بائیں ہاتھ کی اُنگلی سے اپنی انگوٹھی اُتار کر مجھے دی اور بولی۔

''یہ تمہاری چھوٹی اُنگلی میں پوری آ جائے گی۔ اسے پہن کر دیکھو!''

یہ سونے کی سادہ انگوٹھی تھی جس میں سفید ہیرا جڑا ہوا تھا۔ میں نے اپنے بائیں ہاتھ کی چھوٹی اُنگلی میں پہنی تو وہ مجھے پوری آ گئی۔ میں نے کہا۔

''میں محبت کی اس نشانی کو اپنے دل سے لگا کر رکھوں گا۔''

اُرملا کہنے لگی۔ ''یہ میری محبت کی نشانی بھی ہے اور یہ تمہیں کانچی کے جادو ٹونے سے بچائے رکھے گی۔ اس کو کبھی اپنے سے جدا نہ کرنا۔''

میں نے کہا۔ ''اگر ایسی بات ہے تو پھر یہ انگوٹھی کانچی کے حملے سے تمہیں بھی تو بچا سکتی ہے۔ تم اسے اپنے پاس کیوں نہیں رکھ لیتیں؟''

وہ کہنے لگی۔

''اس انگوٹھی میں اتنی طاقت تو نہیں کہ ترلوک کے دیوتاؤں کی شکتی کا مقابلہ کر سکے لیکن جب یہ انگوٹھی تم پہن لو گے تو اس کی طاقت ایک ہزار گنا زیادہ بڑھ جائے گی۔''

میں نے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔ ''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟''

اُرملا نے کہا۔ ''اس لئے کہ تم مسلمان ہو۔ تم اسے پہنو گے تو اس میں تمہارے ایمان کی طاقت بھی شامل ہو جائے گی۔ پھر ترلوک تو کیا اگر سارے آکاش کے دیوتا مل کر بھی آ جائیں تو تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔ مجھے خوشی ہو رہی ہے کہ یہ انگوٹھی تم نے پہن لی ہے۔ اب تم مجھ سے جدا ہو کر بھی اُس خبیث عورت کانچی سے محفوظ رہو گے۔''

میں نے کہا۔

''لیکن میں نہیں چاہتا کہ تم مجھ سے جدا ہو جاؤ۔ میں تمہیں اپنے ساتھ رکھوں گا۔ یں تمہارے ساتھ رہوں گا۔ ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ ہمارا جینا اور مرنا یک ساتھ ہو گا۔''

اُرملا کے چہرے پر ایک اُداس تبسم پھیل گیا۔ کہنے لگی۔

''کاش! ایسا ہو سکتا۔ مگر مجھے لگ رہا ہے کہ ایسا نہیں ہو گا۔''

میں نے اُس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا اور کہا۔

''ایسی بدشگونی کی باتیں نہ کرو اُرملا! ہم دونوں زندہ رہیں گے اور ایک دوسرے ے ساتھ رہیں گے۔''

اُرملا نے محبت کا موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

''ایک بات کا خیال رکھنا! یہ انگوٹھی تمہاری اُنگلی سے کبھی الگ نہیں ہونی چاہئے۔ ے سوتے جاگتے میں اپنی اُنگلی میں ہی پہنے رکھنا۔ اور سنو! اگر کبھی بدقسمتی سے یہ انگوٹھی م سے گم ہو گئی یا اسے کوئی تمہارے سوتے میں اُتار کر لے گیا تو پھر اس سنسار کی کوئی اقت تمہیں کانچی کے انتقام سے نہیں بچا سکے گی۔''

میں نے کہا۔ ''میں اس انگوٹھی کو ہمیشہ اپنے پاس رکھوں گا۔ سوتے میں بھی اس سے فل نہیں رہوں گا۔''

اُرملا نے آہ بھر کر کہا۔ ''یہ سب اس صورت میں ہے کہ اگر کانچی زندہ بچ گئی ہو۔ دُعا رو کہ وہ مر چکی ہو۔''

گاڑی کے آنے کا ٹائم ہو رہا تھا۔ ہم سٹیشن کی ڈیوڑھی سے اُٹھ کر پلیٹ فارم پر آ گئے۔ ہاں کافی مسافر اپنا اپنا سامان لئے گوہاٹی جانے کے لئے بیٹھے تھے۔ گوہاٹی واپس انے والی ٹرین پلیٹ فارم پر کھڑی تھی مگر سٹیشن کے چند ایک خلاصی اس کی صفائی میں

لگے ہوئے تھے۔ شیلانگ جانے والی ٹرین دوسرے ٹریک پر آ رہی تھی۔ ہم دوسرے پلیٹ فارم پر چلے آئے۔ یہاں صرف ایک چائے کا سٹال تھا۔ وہاں ہم نے چائے کے ساتھ کچھ تھوڑا بہت کھا لیا اور ٹرین کا انتظار کرنے لگے۔

میں نے اُرملا سے کہا۔

''اگر کانچی زندہ بھی ہے تو ہمارے پیچھے یہاں تک نہیں آ سکے گی۔ ہم اُس سے بہت دُور نکل آئے ہیں۔ وہ جادو ٹونہ ضرور جانتی ہے مگر وہ کوئی جن بھوت یا چڑیل نہیں ہے کہ ایک جگہ سے غائب ہو کر سینکڑوں میل دُور دوسری جگہ نکل آئے۔''

اُرملا نے کہا۔

''یہ تم ٹھیک کہتے ہو۔ کانچی جن بھوت نہیں انسان ہے۔ اور وہ غائب نہیں ہو سکتی۔ مگر وہ میری اور تمہاری بو پر ہمارے پیچھے پیچھے آ سکتی ہے۔ خاص طور پر اُسے تمہارے جسم کی بو تو سینکڑوں میل دُور سے آ جائے گی کیونکہ تم نے اُس کا اور اُس نے تمہارا خون پیا ہوا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''اس وقت تک ہم تمہارے ٹھاکر محل جے پور پہنچ چکے ہوں گے۔ وہاں تو ہمیں کوئی خطرہ نہیں ہو گا نا؟''

اُرملا ایک لمحے خاموش رہی۔ پھر میری طرف نگاہیں اُٹھائیں اور کہا۔

''تمہیں کوئی خطرہ نہیں ہو گا۔ لیکن مجھے ہو گا۔ کیونکہ میری ویدک طاقت اُس کی شکتی کے آگے کمزور پڑ چکی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''تم نے تو کہا تھا کہ نیکی کی طاقت بہت بڑی طاقت ہوتی ہے۔ اور برائی کتنی ہی طاقتور کیوں نہ ہو وہ نیکی کی طاقت کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ پھر تم اُس سے کیوں ڈرتی ہو؟''

اُرملا کہنے لگی۔

''اس لئے کہ میں ہندو ہوں۔ میں نے ساری زندگی پتھر کے بتوں کی پوجا کی ہے۔ جبکہ تم مسلمان ہو ایک خدا کو مانتے ہو۔ اگر نیکی کی یہ طاقت تمہارے پاس ہو گی تو برائی کی بڑی سے بڑی قوت بھی تمہارے آگے نہ ٹھہر سکے گی۔ شرط صرف یہ ہے کہ تمہارا اپنے خدا پر ایمان چٹان سے بھی زیادہ مضبوط ہو۔ اب تم سمجھ گئے ہو گے کہ میں کبھی کانچی

کی بدی کی شکتی سے کیوں گھبرانے لگتی ہوں۔''

دُور سے انجن کی سیٹی کی آواز سنائی دی۔ شیلانگ جانے والی ٹرین آ رہی تھی۔ یہ بھی چھوٹی لائن کی ٹرین تھی۔ آگے کوئلے سے چلنے والا انجن لگا تھا۔ ٹرین پلیٹ فارم پر آ کر رُکی تو ہم اُس میں سوار ہو گئے۔ کچھ دیر کے بعد ٹرین شیلانگ کی جانب روانہ ہو گئی۔

راستہ زیادہ تر پہاڑی تھا۔ ٹرین کبھی چڑھائی چڑھتی اور کبھی چڑھائی سے نیچے اُترنے لگتی۔ اُس وقت ٹرین کی سپیڈ زیادہ ہو جاتی تھی۔ راستے میں کئی چھوٹے چھوٹے دریا آئے۔ ٹرین نے کئی پہاڑی ٹیلوں کے چکر کاٹے۔ رات ہو چکی تھی جب ہم شیلانگ پہنچے۔ یہاں سے ہمیں گورکھپور جانے والی گاڑی پکڑنی تھی۔ معلوم ہوا کہ گورکھپور والی گاڑی صبح جائے گی۔ رات ہم نے شیلانگ سٹیشن کے ویٹنگ رُوم میں گزاری۔ اگلے دن دس بجے ٹرین چلی۔ اُس وقت بارش ہو رہی تھی۔ آسام کی بارشیں بڑی موسلا دھار ہوتی ہیں۔ لیکن چاہے جتنی بارش ہو جائے پانی کہیں نہیں کھڑا ہوتا۔ سارا پانی نشیبی ندی نالوں میں چلا جاتا ہے۔

وہ سارا دن اور ساری رات سفر میں گزر گئی۔ اس کے اگلے دن دوپہر کے وقت گورکھپور آیا۔ کافی بڑا اسٹیشن تھا۔ دوپہر کو ہم دِلّی جانے والی ٹرین میں بیٹھے دِلّی کی طرف جا رہے تھے۔

یہ ٹرین گونڈہ سے ہو کر وایا لکھنؤ دِلّی جاتی تھی۔ گونڈہ اُس زمانے کے صوبجات متحدہ اور آج کے اُتر پردیش کے شمال مشرق میں واقع ہے۔ وسطی ہند کے جنگلوں کے بعد گونڈہ کے جنگل ہندوستان کے انتہائی گنجان اور خطرناک جنگل ہیں۔ میں مشہور انگریز شکاری جم کاربٹ کے ان جنگلوں میں شکار کے قصے پڑھ چکا تھا۔ گونڈہ کے جنگلوں میں شیر، چیتے، ریچھ اور بھیڑیئے عام پائے جاتے ہیں۔ جہاں جنگل زیادہ گھنا ہے وہاں دلدلیں بھی ہوتی ہیں، گدلے پانیوں کے تالاب ہوتے ہیں جن میں مگرمچھ تیرتے پھرتے ہیں اور کناروں پر جھک کر پانی پیتے جانوروں کو خاموشی سے جھپٹ کر دبوچ کر لے جاتے ہیں۔

ریلوے لائن گونڈہ کے جنگلوں کے درمیان میں سے گزرتی تھی۔ میں ٹرین کی کھڑکی میں سے اُن جنگلوں کے گھنے درختوں کو تیزی سے پیچھے جاتے دیکھ رہا تھا۔ ان سنسان

جنگلوں کی گنجان خاموشی دل پر ایک ہیبت طاری کر رہی تھی۔ رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا جب ہم دِلّی پہنچے۔ اتنے عرصے کے بعد ایک بڑے شہر کے سٹیشن کی رونق اور چہل پہل دیکھی تو ایسے لگا کہ میں توہمات اور جہالت کے اندھیروں سے نکل کر ترقی و تہذیب کی روشنیوں میں آ گیا ہوں۔ جو واقعات اور حادثات مجھ پر گزرے تھے وہ سب ایک ڈراؤنا خواب لگ رہے تھے۔ مگر وہ خواب نہیں تھے۔ اُن حیرت انگیز اور طلسم ہوشربا جیسے واقعات کا ایک اہم کردار اُرملا میرے ساتھ تھی۔ اُس کی دی ہوئی انگوٹھی میری اُنگلی میں موجود تھی اور میری جان کی دشمن کانچی کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ مر چکی ہے یا ابھی زندہ ہے...... اُس کی موت کی تصدیق کئے بغیر میں اپنی باقی زندگی سکون کے ساتھ اور بے فکر ہو کر نہیں گزار سکتا تھا۔

بڑا شہر تھا...... آدھی رات کے بعد بھی دِلّی کے سٹیشن پر بڑی رونق تھی۔ جے پور جانے والی گاڑی ہمیں ساڑھے چار بجے ملی۔ اُس وقت سحر کا اُجالا نمودار ہو رہا تھا۔ دوپہر سے پہلے پہلے ہم جے پور آ گئے۔ ٹھاکر محل میں آ کر میں نے سکھ کا سانس لیا۔ نہا دھو کر لباس تبدیل کیا، کھانا کھایا۔ اُرملا نے کہا۔

''تم کچھ دیر آرام کر لو...... شام کو باتیں کریں گے۔''

کئی دنوں سے پوری نیند نہیں لی تھی۔ دوپہر کو سویا تو شام کے وقت بیدار ہوا۔ اُرملا میرے کمرے میں آ گئی۔ حویلی کا بوڑھا ملازم میرے کمرے میں ہی چائے لے آیا۔ ہم چائے پیتے ہوئے ساتھ ساتھ باتیں کرنے لگے۔ اگر اُرملا کی دی ہوئی انگوٹھی میں واقعی کوئی تاثیر تھی تو اس کے معنی یہ تھے کہ جب تک انگوٹھی میری اُنگلی میں موجود ہے کم از کم اُس وقت تک میں کانچی کے شر سے محفوظ ہو گیا تھا۔ لیکن اُرملا محفوظ نہیں تھی۔ کانچی کے ترلوک کے چلّے کے بعد دیوتاؤں کی طاقت حاصل کر لینے سے اُرملا کی زندگی کو زبردست خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔ کانچی کسی وقت بھی اُس پر حملہ کر سکتی تھی۔ جب میں نے اُرملا کے آگے اس خطرے کا اظہار کیا تو اُس نے کہا۔

''یہ تو ہونا ہی تھا۔ جیسے بھی ہو گا، میں کانچی کا مقابلہ کروں گی۔ جب تک مقابلہ کر سکی کرتی چلی جاؤں گی۔ اگر ہار گئی تو ظاہر ہے کانچی مجھے زندہ نہیں چھوڑے گی۔''

میں نے کہا۔ ''ایسا نہ کہو اُرملا! کانچی تمہارا بال بھی بانکا نہ کر سکے گی۔''

میں اُسے حوصلہ دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ جبکہ میں بخوبی جانتا تھا کہ اُرملا اُس خبیث عورت کانچی کی دشمن نمبر ایک ہے۔ اور وہ اُرملا کو موت کے گھاٹ اُتارنے کے ہر ممکن جتن کرے گی۔ اور اب تو اُس کے پاس اُرملا سے بڑھ کر شکتی آ گئی ہوئی ہے۔

اُرملا میری طرف متوجہ ہو کر بولی۔

''میں چاہتی ہوں کہ جب تک ہمیں یہ پتہ نہیں چل جاتا کہ کانچی واقعی مر گئی ہے اُس وقت تک تم میرے پاس ہی رہو! اس میں کوئی شک نہیں کہ میری انگوٹھی پہننے کے بعد تم کانچی کے شر سے محفوظ ہو گئے ہو اور جہاں چاہے جا سکتے ہو۔ لیکن تمہارے جانے کے بعد مجھے یہی پریشانی لگی رہے گی کہ اگر کانچی زندہ ہے تو وہ تمہیں اس انگوٹھی سے محروم کرنے کی سرتوڑ کوشش کرے گی اور اگر وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب ہو گئی تو وہ اسی وقت تمہارا سر کاٹ کر لے جائے گی اور میں جیتے جی مر جاؤں گی۔''

اُرملا واقعی مجھ سے محبت کرنے لگی تھی۔ میں خود اُس کی محبت میں ڈوب چکا تھا۔ بے پناہ محبت کے یہ طوفانی جذبات ہمیں کہاں لے جائیں گے؟ اس کے بارے میں ہم نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ میں نے بے اختیار ہو کر اُرملا کا ہاتھ چوم لیا اور کہا۔

''ایسی باتیں مت سوچو اُرملا! ہم بہت جلد آگ اور خون کے اس طوفان سے نکل جائیں گے۔ پھر ہم ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ رہیں گے۔ کبھی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے۔''

وہ کسی گہری سوچ میں تھی۔ وہ حالات کی نزاکت کو مجھ سے زیادہ جانتی تھی۔ کہنے لگی۔

''میرا خیال ہے ہم اپنے پرانے بنگلے میں چلے جاتے ہیں۔''

''یہاں رہنے میں کیا حرج ہے؟'' میں نے پوچھا۔

اُس نے کہا۔ ''وہاں میں نے پانچ برس تک تپسیا کی ہے۔ وہاں میرے گرو دیو کا سایہ ہے۔ کانچی وہاں اتنی آسانی سے مجھ پر حملہ آور نہیں ہو سکے گی۔ اور پھر وہاں سادھی کر کے میں یہ معلوم کرنے کی بھی کوشش کر سکتی ہوں کہ کانچی زندہ ہے یا نہیں؟''

میں اُس ویران جنگل والے سنسان بنگلے میں نہیں جانا چاہتا تھا۔ جے پور بڑا شہر تھا۔ اس شہر کی فضاؤں میں ماڈرن تہذیب کی روشنی تھی۔ میں نے کہا۔

''پتہ نہیں کیوں میرا دل وہاں جانے کو نہیں مانتا۔''

اُرملا نے کہا۔ ''جو میں جانتی ہوں تم نہیں جانتے۔ ہمارے لئے یہی بہتر ہے کہ کچھ وقت کے لئے ہم پرانے بنگلے میں چلے جائیں۔''

اب میں انکار نہیں کرسکتا تھا۔ وہ رات ہم نے جے پور والے ٹھاکر محل میں ہی بسر کی۔ اگلے روز ہم اُرملا کے پرانے اور ویران بنگلے کی طرف چل پڑے۔ یہ سفر بھی کافی طویل اور تھکا دینے والا تھا۔ سارے راجستھان میں سے گزر کر ہم صوبہ مدھیہ پردیش میں بھوپال شہر سے ہو کر وہاں سے ڈیڑھ سو میل کی مسافت پر عین وسطی گھنے جنگلوں کے درمیان واقع جمنا پور کے سٹیشن پر ٹرین سے اُترے۔ پورا دن اور رات کا پہلا پہر سفر میں گزر گیا۔ بھوپال کے ریلوے سٹیشن پر میں نے ایک چھوٹے سے جلوس کو دیکھا تھا جو پاکستان زندہ باد، قائداعظم زندہ باد کے نعرے لگاتا سامنے والے پلیٹ فارم پر سے گزر گیا تھا۔ میں نے ایک آدمی کو یہ کہتے بھی سنا تھا کہ انگریز جا رہا ہے۔ پاکستان بن کر رہے گا۔

ٹرین جمنا پور رات کے نو بجے پہنچی تھی۔ اُرملا نے کہا۔

''یہاں سے ہمیں پرانے بنگلے تک پیدل جانا ہوگا۔ سارا راستہ جنگل میں سے ہو کر گزرتا ہے۔ رات کے وقت جانا ٹھیک نہیں ہے۔''

''پھر کیا کریں؟'' میں نے پوچھا۔

اُرملا نے کہا۔

''رات سٹیشن پر ہی گزارنی ہوگی۔ دن کی روشنی نکلتے ہی چل پڑیں گے۔''

وہ رات ہم نے کسی نہ کسی طرح جمنا پور کے معمولی سے سٹیشن پر ہی گزار دی۔ اگلے روز سورج طلوع ہوا تو ہم پرانے بنگلے کی طرف روانہ ہو گئے۔ ہم دونوں ہی راستے کو اچھی طرح سے جانتے تھے۔ پہلے جنگل کا ایک ٹکڑا عبور کیا، ایک مختصر سے میدان میں سے گزرنے کے بعد جنگل کا دوسرا ٹکڑا آ گیا۔ اُرملا جنگل کے کنارے کنارے چل رہی تھی۔ ایک جگہ سے ہم جنگل کے اندر داخل ہو گئے۔ جس وقت ہم پرانے ویران بنگلے کے عقب والی جھیل کے پاس پہنچے تو دن کا ایک پہر گزر چکا تھا۔ ہم جھیل پار کر گئے۔ یہاں جنگل کے دوسرے ٹکڑے کی سرحد ختم ہو جاتی تھی۔ ڈھائی تین سو گز کے فاصلے پر قدیم گنجان درختوں کے درمیان اُرملا کے پرانے بنگلے کی دیوار نظر آئی تو اُرملا کے شکاری

کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آنے لگیں۔

اُرملا نے مسکرا کر کہا۔ ''انہیں معلوم ہو گیا ہے کہ میں آ گئی ہوں۔''

پھر تینوں شکاری کتے بنگلے کے دروازے میں سے نکل کر دوڑتے ہوئے ہماری طرف آتے دکھائی دیئے۔ اُرملا کہنے لگی۔

''تمہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ تمہاری بو سے واقف ہیں۔''

اُرملا کا کہنا صحیح ثابت ہوا۔ کتے قریب آ کر اُرملا کی ٹانگوں سے لپٹنے لگے۔ وہ میری ٹانگوں سے بھی لپٹے جا رہے تھے۔ پھر اُرملا کا بوڑھا ملازم بھی بنگلے کے گیٹ سے باہر آ گیا۔ اُرملا نے اُسے کہا کہ کتوں کو لے جائے۔ کتے بڑی مشکل سے اُرملا سے جدا ہوئے۔ پرانے بنگلے کا ماحول بالکل ویسے کا ویسا خاموش، پُراسرار اور ویران سا تھا۔ میں نے اُرملا سے کہا۔

''میرا جھیل پر جا کر نہانے کو جی چاہتا ہے۔''

اُرملا بولی۔ ''بے شک جاؤ! مگر انگوٹھی اُنگلی سے نہ اُتارنا۔''

''وہ میں نہیں اُتاروں گا۔''

جھیل پر آ کر میں نے کپڑے اُتارے اور پانی میں اُتر کر نہانے لگا۔ پانی صاف اور ٹھنڈا تھا۔ اُس علاقے میں آسام کے علاقے والی سردی بالکل نہیں تھی۔ اگرچہ اُرملا کی انگوٹھی میری اُنگلی میں تھی پھر بھی کسی وقت چاروں طرف جنگل کی گہری خاموشی دیکھ کر ڈر لگنے لگتا کہ کہیں اچانک کانچی نکل کر میرے سامنے نہ آ جائے۔ اگر وہ میری زندگی اور موت کا مسئلہ بن گئی تھی تو میں بھی اُس کے لئے زندگی اور موت کا مسئلہ بن چکا تھا۔ مجھے ماتا دیوی پر قربان کئے بغیر وہ ترلوک کے دیوتاؤں کی شکتی حاصل نہیں کر سکتی تھی۔ اُس نے ویدک منتروں کے سارے سنسکار مجھ پر پورے کر دیئے تھے اور بقول اُرملا کے دیوتاؤں نے کانچی کی اتم شکتی کے لئے میری قربانی پر مہر لگا دی تھی۔ اس لئے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ اگر کانچی زندہ تھی تو مجھے حاصل کرنے کے لئے وہ میرے پیچھے نہ آتی۔

میں زیادہ دیر جھیل میں نہانا چاہتا تھا مگر کانچی کے خوف کے مارے میں جلدی جلدی نہا کر واپس آ گیا۔ اُرملا اشنان کر کے گیروے رنگ کی سادہ سی ساڑھی پہن کر میرے کمرے کے پرانے بھاری صوفے پر بیٹھی تھی۔ مجھے دیکھ کر کہنے لگی۔

"بابا نے کھانا لگا دیا ہوا ہے...... جا کر کھا لو! میں ابھی نہیں کھاؤں گی۔"

"کیوں......؟"

اُرملا نے کہا۔ "تمہیں کہا تھا نا کہ کانچی کے بارے میں صحیح صورتِ حال معلوم کرنے کے لئے میں سادھی لگا کر گیان دھیان کروں گی۔"

"کیا تمہیں اس طرح سارا کچھ معلوم ہو جائے گا؟" میرے پوچھنے پر اُرملا نے کہا۔

"پورا نہیں تو کم از کم اتنا ضرور پتہ چل جائے گا کہ کانچی ابھی تک زندہ ہے یا مر چکی ہے۔"

اُرملا اپنے چھوٹے سے کمرے میں جہاں مہاویر کی مورتی تھی چلی گئی۔ اور میں دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ کھانا کھا کر واپس پرانے صوفے والے کمرے میں آ کر پلنگ پر لیٹ گیا۔ لیٹتے ہی میری آنکھ لگ گئی۔ جس وقت جاگا تو چھوٹے ٹائم پیس پر وقت دیکھا۔ میں دو گھنٹے تک سویا رہا تھا۔ اُرملا کے پوجا پاٹھ کے کمرے سے اشلوک پڑھنے کی آواز آ رہی تھی۔ اُرملا گیان دھیان میں مصروف تھی۔ میں کمرے میں ہی بیٹھا اُس کا انتظار کرتا رہا۔ اشلوک پڑھنے کی آواز بند ہو گئی۔ دس پندرہ منٹ تک گہرا سکوت طاری رہا۔ اس کے بعد اُرملا کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ چپ چپ تھی۔ میں نے پوچھا۔

"کچھ پتہ چلا؟"

اُرملا نے نفی میں سر ہلایا اور کہا۔

"کچھ پتہ نہیں چل سکا۔ جب بھی میں دھیان میں جاتی تھی میری نگاہوں کے آگے دُھند کا غبار سا چھا جاتا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ کانچی کی نئی شکتی اُس کی حفاظت کر رہی ہو۔ یہاں سے میں نے اندازہ لگایا ہے کہ وہ مری نہیں۔ اگر مری ہوتی تو اُس کی شکتی بھی اُس کے ساتھ ہی مر جاتی۔"

میں نے کہا۔ "اِس کا مطلب ہے وہ زندہ ہے؟"

اُرملا کہنے لگی۔ "میرا اندازہ ہے۔ باقی بھگوان ہی جانتا ہے۔ لیکن ہمیں یہی سمجھنا چاہئے کہ کانچی زندہ ہے اور ہمیں غافل پا کر کسی بھی لمحے حملہ کر سکتی ہے۔ اور اس بار اُس کا حملہ بڑا شدید ہو گا۔"

اُس وقت اُرملا کا خوبصورت چہرہ اُترا ہوا تھا۔ جب سے ہم آسام کے جنگلوں سے

بھاگے تھے اُرملا کو میں نے پہلے کی طرح شگفتہ نہیں دیکھا تھا۔ اس خبر نے کہ کانچی کو نئی طاقت حاصل ہو چکی ہے، اُرملا کو مایوسیوں کی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ رات کو ہم کھانا کھانے بیٹھے تو اُس وقت بھی اُرملا خاموش اور اُداس تھی۔ میں نے اُس کی دل جوئی کرنے کی کوشش کی تو کہنے لگی۔

"مجھے ایسے لگ رہا ہے کہ میرا انجام قریب ہے۔"

میں نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا اور کہا۔ "یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟"

اُرملا بولی۔ "وہی کہہ رہی ہوں جو میں دیکھ رہی ہوں۔" اُس نے ایک ٹھنڈا سانس بھرا اور کہا۔ "یاد رکھو! اگر مجھے کچھ ہو گیا تو تم یہاں سے فوراً نکل جانا اور ہرگز میرے پیچھے مت آنا۔ اپنی جان بچا کر اپنے ماں باپ کے پاس چلے جانا۔ میری انگوٹھی تمہیں کانچی سے بچائے رکھے گی۔ مجھے بچانے میرے پیچھے آؤ گے تو تمہاری جان بھی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ اگر بھگوان نہ کرے تمہیں کچھ ہو گیا تو مجھے جنم جنم کا غم لگ جائے گا۔"

اُس رات اُرملا دیر تک ایسی ہی نا اُمیدی کی باتیں کرتی رہی۔ رات کے گیارہ بجے کا وقت ہو گیا تھا کہ وہ اُٹھی، میرا ماتھا چوما اور سونے کے لئے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اس کے بعد گہری خاموشی چھا گئی۔ یہ دُور دراز گھنے جنگلوں کی رات کی خاموشی تھی جس سے دل پر ہول سا طاری ہو جاتا تھا۔ میرا دھیان اُرملا کی طرف ہی لگا تھا۔ وہ اپنی جان کی دشمن کانچی کے انتقام کی زد میں تھی۔ پہلے وہ اپنا دفاع کر سکتی تھی۔ مگر اب کانچی کی شکتی اُرملا سے دس گنا زیادہ ہو گئی تھی اور وہ اُس کے رحم و کرم پر تھی۔ مجھے تعجب اس بات پر تھا کہ کانچی نے ابھی تک اُرملا پر حملہ کیوں نہیں کیا؟ شاید وہ کوئی ایسا منصوبہ بنا رہی تھی جس سے وہ اُرملا کے ساتھ مجھے بھی اپنے جال میں جکڑ سکے۔ وہ ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہتی تھی۔ سب سے زیادہ پریشانی کانچی کو میری طرف سے لگی ہوئی ہو گی۔ کیونکہ اُرملا کی دی ہوئی انگوٹھی کانچی کو میرے قریب آنے سے روک رہی تھی اور مجھے قابو کرنا کانچی کے لئے زندگی اور موت کا مسئلہ بن چکا تھا۔ میں انہی سوچوں میں اُلجھا ہوا تھا کہ مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ میری پلکیں بوجھل ہو کر اپنے آپ بند ہو رہی تھیں۔ میں نے نیم وا آنکھوں سے تپائی پر رکھے ہوئے چھوٹے ٹائم پیس پر نگاہ ڈالی، رات کے پونے

بارہ کا وقت ہو رہا تھا۔

پھر مجھے نیند نے اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔

میں بڑی گہری نیند میں تھا کہ اچانک ایک آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ یہ اُرملا کے شکاری کتے کی آواز تھی۔ وہ زور زور سے بھونک رہا تھا۔ پھر یکلخت اُس کی آواز بند ہو گئی۔ مجھے پر نیند کا غلبہ تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ اچانک کسی آدمی کے شور مچانے کی آواز بلند ہوئی۔ یہ آواز بھی ایک دم سے بند ہوگئی جیسے کسی نے اُس کا گلا دبا دیا ہو۔ میں جلدی سے اُٹھ بیٹھا۔ اب دوبارہ گہری خاموشی چھا گئی تھی۔ پہلے کتا بھونکا تھا، پھر کسی آدمی نے شور مچایا تھا۔ دونوں آوازیں یکلخت بند ہوگئی تھیں۔ مجھے ایسے لگا جیسے چور بنگلے میں گھس آئے ہیں۔ میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ مجھے اُرملا کی فکر تھی۔ میں پلنگ سے اُتر کر دبے پاؤں اُرملا کے کمرے کی طرف گیا۔ اُرملا کے کمرے کے دروازے کا ایک پٹ کھلا ہوا تھا۔ اندر لالٹین کی دھیمی روشنی ہو رہی تھی۔ میں نے جھانک کر دیکھا۔ اُرملا کا پلنگ خالی تھا۔ وہ کمرے میں نہیں تھی۔ میں نے آہستہ سے اُسے آواز دی۔ کوئی جواب نہ آیا۔ میں پریشان سا ہو کر پوجا پاٹھ والے کمرے میں گیا۔ اُرملا وہاں بھی نہیں تھی۔ باہر سے اب کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ سناٹا چھایا ہوا تھا۔ میں دبے پاؤں کمرے سے نکل کر بنگلے کے عقبی برآمدے میں آ گیا۔

یہاں ایک لالٹین رات بھر جلتی رہا کرتی تھی۔ وہ لالٹین جل رہی تھی۔ اُس کی روشنی میں کوئی آدمی برآمدے کے کونے میں لیٹا ہوا تھا۔ میں سمجھا شاید اُرملا کا بوڑھا ملازم گرمی کی وجہ سے باہر آ کر لیٹ گیا ہے۔ میں دبے پاؤں اُس کے پاس آ گیا۔ یہ اُرملا کا بوڑھا ملازم ہی تھا۔ مگر اُسے دیکھ کر میرا دل دھک سے رہ گیا...... اُس کی آدھی گردن کٹ چکی تھی۔ خون نکل نکل کر اُس کے جسم اور فرش پر جم گیا تھا...... میں گھبرا کر بنگلے کے گیٹ کی طرف دوڑا۔ گیٹ کے پاس اِدھر اُدھر اُرملا کے تینوں شکاری کتوں کی لاشیں پڑی تھیں۔ گیٹ کے باہر جنگل کے درختوں میں اندھیرا چھایا ہوا تھا۔

میں جلدی سے اُرملا کے کمرے میں آ گیا۔ میں دیوانہ وار اُرملا کو آوازیں دینے لگا۔ مگر وہاں اُرملا ہوتی تو مجھے جواب دیتی۔ وہ اُس کمرے میں بھی نہیں تھی اور پوجا والے کمرے میں بھی نہیں تھی۔ میں نے پرانے بنگلے کا کونہ کونہ چھان مارا۔ اُرملا ایسے غائب

ہوگئی تھی جیسے اُسے زمین نے نگل لیا ہو۔ میں سخت گھبرایا ہوا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بوڑھے ملازم اور شکاری کتوں کو کس نے ہلاک کیا ہے اور اُرملا کہاں غائب ہوگئی ہے؟ میں تیز قدم اُٹھاتا دوبارہ برآمدے میں آ گیا۔ دیوار پر لٹکی ہوئی لالٹین اُٹھائی اور بوڑھے ملازم کی لاش کو غور سے دیکھا۔ اُس کی گردن پر کسی تیز دھار تلوار کا وار کیا گیا تھا جس سے آدھی سے زیادہ گردن کٹی ہوئی تھی۔ برآمدے کے آگے گھاس اُگی ہوئی تھی۔ شبنم سے گیلی گھاس پر میں نے لالٹین کی روشنی ڈالی۔ کسی کے قدموں کے نشان وہاں نہیں تھے۔ مجھ پر خوف سا طاری ہو گیا۔ میں نے لالٹین برآمدے میں رکھی اور اپنے کمرے میں آ کر دروازہ بند کر کے اندر سے کنڈی لگا دی۔

یہ کام کانچی کے سوا اور کسی کا نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ اُرملا کو اغوا کرا کے لے گئی تھی۔ اب میری باری تھی۔ میں نے اپنے بائیں ہاتھ کی اُنگلی میں پڑی انگوٹھی پر نگاہ ڈالی۔ انگوٹھی میری اُنگلی میں موجود تھی۔ شاید اُسی نے مجھے کانچی کے خوفناک حملے سے بچا لیا تھا۔

میں وہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا مگر آدھی رات کو جنگل میں نکلتے ہوئے ڈر لگ رہا تھا۔ ٹائم پیس پر رات کے ساڑھے بارہ بجے تھے۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ میں نے باقی رات بستر پر بیٹھ کر کیسے گزاری؟ سحر کی ذرا سی روشنی ہوئی تو بنگلے کے دوسرے گیٹ کی طرف سے نکل کر جنگل میں چلنے لگا۔ بوڑھے ملازم کی خون آلود لاش کو دوبارہ دیکھنے کی مجھے ہمت نہ ہوئی۔ میں فادر فرانسس کے پاس جا رہا تھا۔ اُن کی خانقاہ جنگل کے دو ٹکڑے چھوڑ کر واقع تھی۔ میں نے جلدی جلدی دونوں کو عبور کیا اور خانقاہ میں پہنچ گیا۔ فادر فرانسس وہاں پر نہیں تھے۔ میں نے اُنہیں کئی آوازیں دیں مگر معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی کام سے کسی دوسرے شہر گئے ہوئے ہیں۔ مجھے سرسوتی کا خیال آ گیا۔

سرسوتی کی ویران محل نما حویلی وہاں سے چند قدموں کے فاصلے پر ہی تھی۔ سرسوتی حویلی میں موجود تھی۔ وہ ندی سے اشنان کر کے لوٹی تھی۔ بالوں کا جوڑا بنا رہی تھی۔ مجھے اپنے سامنے دیکھ کر وہ بت بن کر رہ گئی۔ کہنے لگی۔

’’آج تمہیں سرسوتی کی یاد کیسے آ گئی؟‘‘

میں نے کہا۔ ’’سرسوتی! جو کچھ میں تمہیں کہنے جا رہا ہوں پہلے اسے غور سے سن لو! پھر کوئی سوال پوچھنا۔‘‘

اور جو کچھ میں پرانے بنگلے میں دیکھ کر آ رہا تھا وہ میں نے اُسے پوری تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا۔ اُسے یہ بھی بتایا کہ میں اب تک کہاں تھا اور کن کن حالات میں سے گزرا ہوں۔ میں نے اُسے اپنی انگوٹھی بھی دکھائی جو اُرملا نے مجھے دی تھی۔ سرسوتی بڑے غور سے میری باتیں سنتی رہی۔ میرے خاموش ہو جانے کے بعد وہ بولی۔

''صاف ظاہر ہے کانچی اُسے اُٹھا کر لے گئی ہے۔ مگر یہ کام اُس نے خود نہیں کیا، بلکہ اپنے آدمیوں سے کروایا ہے۔''

میں نے فکر مند ہو کر کہا۔ ''وہ اُسے زندہ نہیں چھوڑے گی۔''

سرسوتی بولی۔ ''تمہیں اُس کی اتنی فکر کیوں ہے؟''

میں نے کہا۔ ''تم نہیں جانتیں...... اُرملا نے جو کچھ بھی کیا ہے میری جان بچانے کی خاطر کیا ہے۔ اُس نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر مجھے موت کے منہ سے بچایا ہے۔ مجھے اُس کی سخت فکر لگی ہے۔ خدا کرے کہ وہ زندہ ہو۔''

ہم سرسوتی کے جنگل والے پرانے مکان کے چھوٹے کمرے میں بیٹھے تھے۔ پرانے ٹائپ کی لمبی کھڑکی میں سے دن کی روشنی اندر آ رہی تھی۔ سرسوتی نے میری اُنگلی میں سونے کی انگوٹھی دیکھ کر پوچھا۔ ''یہ انگوٹھی پہلے تو تمہارے پاس نہیں تھی۔''

میں نے گہرا سانس لے کر کہا۔ ''یہ مجھے اُرملا نے دی ہے۔''

''محبت کی نشانی کے طور پر......؟'' سرسوتی کے لہجے میں ہلکا سا طنز شامل تھا۔

میں نے کہا۔ ''ایسی بات نہیں ہے سرسوتی! یہ انگوٹھی اُس نے مجھے میری حفاظت کے لئے دی ہے۔ کانچی صرف اُرملا ہی کی نہیں میری جان کی دشمن بھی بن چکی ہے۔ اُرملا نے کہا تھا کہ جب تک یہ انگوٹھی میری اُنگلی میں رہے گی کانچی کی شکتی مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گی۔''

سرسوتی طنزیہ انداز میں مسکرائی۔ کہنے لگی۔ ''اب تم کیا چاہتے ہو؟''

سرسوتی کا انداز ایک دم بیگانوں جیسا ہو گیا تھا۔ شاید اُسے اُرملا کا مجھ میں اتنی دلچسپی لینا اچھا نہیں لگا تھا۔ میں نے کوئی خیال نہ کیا۔ اُس وقت مجھے صرف اُرملا کے بارے میں معلوم کرنا تھا کہ اگر واقعی اُسے کانچی کے جلاد پجاری اُٹھا کر لے گئے ہیں تو وہ کہاں ہے؟ کس حال میں ہے، وہ اپنے گیان دھیان سے بتا سکتی تھی۔ میں نے سرسوتی سے کہا۔

''سرسوتی! تم میری دوست ہو۔ ہمدرد ہو۔ تم نے مشکل وقت میں ہمیشہ میری مدد کی ہے۔ اس وقت بھی مجھ پر ایک مشکل وقت آن پڑا ہے۔ تمہارے پاس گیان کی شکتی ہے۔ یہ شکتی تم نے جنگل کی اس خاموش تنہائی میں اپنی تپسیا سے حاصل کی ہے۔ مجھے اپنے گیان کی مدد سے صرف اتنا بتا دو کہ اُرملا کہاں ہے اور کس حال میں ہے؟ مجھے پورا وشواس ہے کہ جس طرح تم پہلے بھی میری مدد کرتی رہی ہو اب بھی ضرور کرو گی۔''

سرسوتی ہلکی سی طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

''تم صاف صاف کیوں نہیں کہتے کہ تم یہ سب کچھ اس لئے معلوم کرنا چاہتے ہو کیونکہ تمہیں اُرملا سے محبت ہے؟''

میں ایک پل کے لئے خاموش ہو گیا۔ پھر سچ بولتے ہوئے کہا۔

''ہاں سرسوتی! مجھے اُرملا سے محبت ہے۔ میں اُس کی زندگی کے بارے میں سخت پریشان ہوں۔ لیکن میرا دل کہتا ہے کہ اُرملا ابھی تک زندہ ہے۔ میں صرف تمہارے منہ سے سننا چاہتا ہوں کہ اُرملا کانچی کی قید میں ضرور ہے مگر زندہ ہے۔ بس! مجھے اور کچھ نہیں چاہئے۔''

سرسوتی نے پہلے تو کوئی جواب نہ دیا، پھر میری طرف دیکھ کر کہا۔

''اگر تم یہی چاہتے ہو تو میں آج رات پوجا کے بعد سمادھی لگاؤں گی اور تمہاری اُرملا کے بارے میں معلوم کرنے کی کوشش کروں گی۔''

سرسوتی نے ''تمہاری اُرملا'' جس طنزیہ لہجے میں کہا تھا میں نے اُسے محسوس کر لیا تھا۔ صاف لگتا تھا کہ سرسوتی کے دل میں اُرملا کے لئے حسد کا جذبہ پیدا ہو گیا ہے۔ مگر میں اُرملا کی زندگی کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لئے بے تاب تھا۔ میں نے سرسوتی سے کہا۔ ''میں کس زبان سے تمہارا شکریہ ادا کروں سرسوتی؟''

سرسوتی نے مزید طنز بھرے لہجے میں کہا۔

''جس زبان سے تم اُرملا سے محبت کی باتیں کرتے تھے اُسی زبان سے شکریہ ادا کر لو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔''

سرسوتی ایک دم سے اتنی بدل جائے گی میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ معلوم نہیں وہ یہ سب کچھ میری محبت کی وجہ سے کر رہی تھی یا اُرملا سے نفرت کی وجہ سے......''

سارا دن میں نے سرسوتی کے کمرے میں گزار دیا۔ رات کو وہ میرے پاس آئی۔ وہ اشنان کر کے آئی تھی۔ اُس کے بال کھلے تھے۔ ماتھے پر بندیا لگی تھی، جسم سادھوؤں والی گیروے رنگ کی چادر میں لپٹا ہوا تھا۔ کہنے لگی۔

''میں آدھی رات کے بعد سادھی میں بیٹھوں گی۔ تم صبح مجھ سے کوئی سوال کرنا۔''

اتنا کہہ کر وہ چلی گئی۔ مجھے ساری رات نیند نہ آئی۔ دوسرے دن کا سورج نکل آیا۔ دن کے دس بجے کے قریب سرسوتی کمرے میں آ گئی۔ وہ پُر سکون انداز میں قدم اُٹھاتی میرے سامنے آ کر کرسی پر بیٹھ گئی۔

میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ پوچھا۔ ''کچھ پتہ چلا اُرملا کے متعلق؟''

سرسوتی نے کہا۔ ''مجھے افسوس ہے کہ میں اُرملا کے بارے میں کچھ معلوم نہیں کر سکی۔''

میں اُس کا منہ تکتا رہ گیا۔

''کیوں......؟'' میں نے تھکے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

سرسوتی کہنے لگی۔ ''اس کیوں کا میرے پاس یہی جواب ہے کہ مجھے کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ شاید کانچی کی شکتی کی وجہ سے ایسا ہوا ہو۔ شاید اس لئے بھی کہ کانچی ظاہر نہیں کرنا چاہتی کہ اُس نے تمہاری اُرملا کا کیا حال کیا ہے۔''

سرسوتی کے دل و دماغ پر حسد کے بادل چھا چکے تھے۔ ایسی حالت میں اگر وہ سادھی لگانے میں کامیاب بھی ہو جاتی تو اُس کے گیان نے اُس کے آگے جھوٹ بولنا تھا۔ سرسوتی کی یہی بڑی مہربانی تھی کہ اُس نے میرے آگے جھوٹ نہیں بولا تھا اور صاف بتا دیا تھا کہ وہ صبح گیان نہیں لگا سکی۔ ورنہ وہ حسد میں آ کر مجھے یہ بھی کہہ سکتی تھی کہ کانچی نے اُرملا کو ہلاک کر دیا ہے۔ اب مجھے سرسوتی سے کوئی اُمید نہیں رہی تھی۔ میں نے اُسے کہا کہ میں ایک بار پھر پرانے بنگلے پر جا کر دیکھتا ہوں۔ شاید اُرملا واپس آ گئی ہو۔

سرسوتی عجیب انداز میں مسکرائی۔ کہنے لگی۔

''جاؤ! جا کر دیکھ لو۔ میں نے کب منع کیا ہے تمہیں؟''

چلنے کو تو میں فادر فرانسس کی خانقاہ کی طرف چل پڑا لیکن دل میں یہ ڈر بیٹھ گیا کہ شاید سرسوتی میرے خلاف ہو گئی ہے۔ وہ بھی ویدوں کے منتروں کی ماہر ہے۔ کہیں حسد میں آ کر کوئی انتقامی کارروائی نہ کر بیٹھے۔ پھر سوچا کہ اگر وہ میرے خلاف ہو گئی ہے تو

اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ خدا میرے دل کا حال جانتا ہے اور وہی میری حفاظت کرے گا۔ میں خانقاہ میں پہنچا تو فادر فرانسس موجود تھے۔ مجھے دیکھتے ہی بانہیں پھیلا کر بولے۔ ''میرے بچے! تم کہاں چلے گئے تھے؟''

اُنہوں نے مجھے گلے لگا کر پیار کیا۔ کہنے لگے۔

''میں تو یہی سمجھ رہا تھا کہ تم اپنے وطن واپس جا چکے ہو۔''

میں نے کہا۔ ''کاش ایسا ممکن ہوتا فادر!''

''آؤ...... باغیچے میں بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔'' اُنہوں نے کہا اور مجھے ساتھ لے کر خانقاہ کے پیچھے چھوٹے سے باغیچے میں آ گئے۔ بنچ پر بیٹھتے ہوئے کہنے لگے۔

''اب سناؤ! تم کہاں کہاں پھرتے رہے اور اتنے دن کہاں رہے؟''

میں نے اُنہیں اپنے ساتھ گزرے ہوئے سارے واقعات سنا دیئے۔ فادر فرانسس بڑی توجہ سے سنتے رہے۔ جب پوری داستان سن چکے تو بولے۔

''بیٹا! غیب کا علم تو صرف خداوند کو ہی ہے۔ اُرملا کہاں ہے؟ کس حال میں ہے؟ زندہ ہے یا نہیں؟ یہ صرف خدا ہی جانتا ہے۔ ہاں! اس بارے میں قیاس ضرور لگایا جا سکتا ہے۔ لیکن قیاس سچا بھی ہو سکتا ہے اور جھوٹا بھی ہو سکتا ہے۔''

''پھر میں کیا کروں فادر؟ اُرملا کے بارے میں، میں بہت پریشان ہوں۔ مجھے کوئی راستہ بتائیں کہ میں کیا کروں؟''

فادر فرانسس نے اپنی کلائی کی گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ کہنے لگے۔

''میری عبادت کا وقت ہو گیا ہے۔ ایسا کرو! تم میری کوٹھڑی میں چل کر بیٹھو۔ عبادت کے بعد تم سے بات کروں گا۔''

فادر خانقاہ کے عبادت والے کمرے میں چلے گئے۔ میں اُن کی کوٹھڑی میں آ کر بیٹھ گیا۔ بار بار دل میں یہی خیال آتا کہ کانچی اگر واقعی اُرملا کو اغواء کر کے لے گئی ہے تو اُس نے اُسے ضرور ہلاک کر دیا ہوگا۔ اُرملا کی موت کا سوچ کر میرا دل ڈوبنے لگتا تھا۔ میں کوٹھڑی کی باغ کی طرف کھلنے والی کھڑکی کے نیچے لکڑی کے تخت پر بیٹھا تھا۔

اچانک مجھے سرگوشی کی آواز سنائی دی۔ میں ایک دم چونک پڑا۔ کہیں یہ اُرملا تو نہیں؟ مگر نہیں...... یہ اُرملا نہیں تھی۔ یہ میری دشمن جان کانچی تھی...... وہ مجھ سے مخاطب تھی۔

''میں جانتی ہوں تم سن رہے ہو......غور سے سنو!''

یہاں میں اس بات کی وضاحت کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ کانچی یا اُرملا کی اگر مجھے کئی میل دُور سے آواز آ جاتی تھی تو یہ عورتیں کوئی غیر انسانی مخلوق یعنی چڑیل یا ڈائن یا آسیب وغیرہ نہیں تھیں۔ یہ عورتیں انسان تھیں۔ اُن میں اور عام انسانوں میں صرف اتنا فرق تھا کہ اُنہوں نے اپنی ریاضت اور تپسیا سے اتنی طاقت اپنے اندر پیدا کر لی تھی کہ وہ سینکڑوں میل دُور بیٹھے انسان کا تصور ذہن میں جما کر اُس تک اپنی آواز پہنچا سکتی تھیں۔

اچانک کانچی کی آواز سن کر مجھ پر خوف سا طاری ہو گیا۔ اُس کی آواز ایسے ہو گئی تھی جس طرح انسان کا گلا خراب ہو جائے تو ہو جاتی ہے۔

''تم نے اور اُرملا نے مل کر مجھے سوم رس میں گھول کر جو زہر پلایا تھا اگر میرے پاس شکتی نہ ہوتی تو میں مر گئی ہوتی۔ لیکن میری شکتی نے مجھے بچا لیا۔ اُرملا سے تو میں نے سندھیا کے قتل اور مجھے ہلاک کرنے کی کوشش کا بدلہ لے لیا ہے۔ میں نے اُسے ایسی جگہ پہنچا دیا ہے جہاں سے وہ اگلے جنم میں بھی واپس نہیں آ سکے گی۔ اب تمہاری باری ہے۔ اب تم مرنے کے لئے تیار ہو جاؤ......تم چاہے کچھ کر لو! میں تمہیں نہیں چھوڑوں گی۔''

میں نے طیش اور غصے میں آ کر کہا۔ ''تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔''

کانچی کی زہریلی آواز سنائی دی۔ ''تم نادان ہو۔ میری شکتی سے بے خبر ہو۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تم ایسا کیوں کہہ رہے ہو۔ تمہیں اُرملا کی دی ہوئی انگوٹھی کا مان ہے نا کہ وہ تمہیں بچا لے گی؟ ذرا اپنی وہ اُنگلی تو دیکھو جس میں تم نے اُرملا کی انگوٹھی پہن رکھی ہے۔''

میں نے گھبرا کر اپنے بائیں ہاتھ کی چھوٹی اُنگلی پر نگاہ ڈالی تو میری آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھا گیا......!

○○○

اس کے بعد مجھ پر کیا بیتی؟ مجھے کیسے کیسے جان لیوا مرحلوں اور خطرناک مہمات میں سے گزرنا پڑا۔ یہ اور اس کے علاوہ وسطی بھارت کے ہولناک گنجان جنگلوں اور پراسرار قدیم مندروں کے رونگٹے کھڑے کر دینے والے سچے واقعات اس کتاب کی دوسری اور آخری جلد میں ملاحظہ فرمائیں۔

بلیدان
اے حمید
2

میں حیرت اور خوف کی حالت میں انگوٹھی کو تک رہا تھا۔
انگوٹھی میری اُنگلی میں موجود تھی مگر اُس کا رنگ جو پہلے سنہری تھا اب سیاہ پڑ چکا تھا۔
اچانک مجھے اپنے اِردگرد ایسی آوازیں سنائی دیں جیسے تیز آندھیوں کے جھکڑ چل رہے ہوں۔ میں نے کھڑکی سے باہر درختوں کی طرف دیکھا۔ درختوں کی ٹہنیاں ساکت تھیں۔ دروازے پر پڑا ہوا پردہ بھی اپنی جگہ سے بالکل نہیں ہل رہا تھا مگر آوازیں ایسی آ رہی تھیں جیسے آندھیوں کے طوفان چلنے لگے ہوں۔ تیز ہوائیں چیخ رہی تھیں۔ میں گھبرا کر کھڑکی کے تخت پر سے اُٹھا اور چارپائی پر آ کر بیٹھ گیا۔ مگر طوفانی ہواؤں کا شور پہلے سے بڑھ گیا تھا۔ میں خوفزدہ ہو کر کوٹھڑی سے باہر جانے لگا تو فادر فرانسس دروازے میں نمودار ہوئے۔ کہنے لگے۔
''میرے بیٹے! تمہیں زیادہ انتظار تو نہیں کرنا پڑا؟''
میں جواب دینے کی بجائے اُن کے چہرے کو دیکھنے لگا۔ وہ بولے۔
''کیا بات ہے شیراز؟ تم کچھ گھبرائے ہوئے لگتے ہو۔''
میں نے کہا۔ ''فادر! آپ کو آندھیوں کا شور سنائی نہیں دے رہا؟''
فادر فرانسس نے تعجب کے ساتھ کہا۔ ''کیسی آندھی بیٹا؟ باہر تو کوئی آندھی نہیں چل رہی۔'' اُنہوں نے آگے بڑھ کر میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور بولے۔
''بیٹھ جاؤ بیٹا!''
میں چارپائی پر بیٹھ گیا۔ فادر فرانسس بھی میرے پاس بیٹھ گئے۔ اس کے ساتھ ہی آندھیوں کا شور ختم ہو گیا اور فضا پہلے کی طرح پُرسکون ہو گئی۔ تب میں نے فادر کو ساری بات بیان کر دی۔ وہ کہنے لگے۔
''انگوٹھی دکھاؤ!''

میں نے اپنا ہاتھ آگے کر دیا۔ وہ غور سے انگوٹھی کو دیکھنے لگے۔

''ہاں!'' وہ بولے۔ ''مجھے یاد ہے جب تم آئے تھے تو انگوٹھی کا رنگ سنہری تھا۔''

اُنہوں نے سینے پر صلیب کا نشان بنایا اور کچھ پڑھ کر کھڑکی کی طرف پھونکا اور بولے۔ ''گھبراؤ نہیں۔ تمہاری دشمن کانچی دفع ہو گئی ہے۔''

انگوٹھی کا رنگ بدل جانے کی وجہ سے میں سخت پریشان تھا۔ میں نے کہا۔

''فادر! اُرملا کی دی ہوئی انگوٹھی کا رنگ بدلنے کی وجہ سے اس کی طاقت ختم ہو گئی ہے۔ لگتا ہے اب کانچی مجھ پر ضرور حملہ کرے گی۔''

''میں ایسا نہیں سمجھتا۔'' فادر فرانسس نے کہا۔

''مگر فادر!'' میں نے تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''اس سے پہلے میں نے کبھی طوفانی ہواؤں کا اس قدر ڈراؤنا شور نہیں سنا۔ یہ اس بات کا اشارہ ہے کہ انگوٹھی کی طاقت جاتی رہی ہے اور کانچی مجھ پر حملہ کرنے کی تیاری کر رہی ہے۔''

فادر فرانسس بولے۔ ''اگر وہ ایسا کر سکتی تو اب تک حملہ کر چکی ہوتی اور تم یہاں نہ ہوتے۔ مگر اُس نے ایسا نہیں کیا۔ تمہیں اپنے جادو ٹونے کے زور سے پیدا کئے ہوئے شور کی آوازوں سے ہی ڈرایا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ ایسا نہیں کر سکتی۔''

فادر فرانسس کی دلیل نے مجھے کافی حوصلہ دیا۔ واقعی اگر انگوٹھی کی طاقت ختم ہو گئی ہوتی تو کانچی مجھ پر وار کرنے سے کبھی گریز نہ کرتی اور مجھے چکر آتا اور پھر موت کی آغوش میں پہنچ گیا ہوتا۔ اس کا مطلب تھا کہ انگوٹھی کی طاقت ختم نہیں ہوئی۔ کانچی اپنی شیطانی طاقت سے صرف اُس کا رنگ بدل سکی ہے۔

فادر فرانسس نے کہا۔

''اب وہ تمہیں ڈرائے گی۔ خوفزدہ کرے گی اور اس طرح تمہیں مجبور کر دے گی کہ تم گھبرا کر اس کے پاس چلے جاؤ۔ لیکن تمہیں گھبرانا نہیں۔ ڈرنا نہیں اور خدا پر بھروسہ قائم رکھنا ہے۔ وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی۔''

مگر فادر! میں اُرملا کو کہاں تلاش کروں؟ مجھے تو اُس کے بارے میں یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ کہاں ہے، کس حالت میں ہے۔''

میری بات سن کر فادر فرانسس اُٹھ کر دونوں ہاتھ پشت پر رکھ کر کوٹھڑی میں ٹہلنے

لگے۔ پھر میرے سامنے رُک کر بولے۔

''تم اُرملا کے لئے پریشان کیوں ہوتے ہو؟ مجھے یقین ہے کہ وہ زندہ ہے۔''

میں نے کہا۔ ''لیکن فادر! وہ کانچی کی قید میں ہے۔ وہ زیادہ دیر زندہ نہیں رہے گی۔ کانچی اُسے ضرور قتل کر دے گی۔ کانچی نے خود مجھ سے کہا ہے کہ میں تمہاری اُرملا سے اپنی سہیلی سندھیا کے خون کا بدلہ لوں گی اور اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔''

فادر فرانسس کچھ سوچ رہے تھے۔ میرے پاس بیٹھ گئے اور بولے۔

''ابھی تم اس بارے میں زیادہ سوچ بچار مت کرو۔ خدا جو کرے گا بہتر ہی کرے گا۔ ابھی تم آرام کرو۔ اور کانچی کی طرف سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے دُعائے ربانی پڑھ کر پھونک دی ہے۔ اس کا کوئی بھی وار تم پر نہ چل سکے گا۔''

میں نے سارا دن فادر فرانسس کی کوٹھڑی میں ہی گزار دیا۔ وہیں تھوڑا بہت کچھ کھا لیا۔ شام ہوئی تو فادر فرانسس واپس آ گئے۔ وہ مجھے اپنے ساتھ اپنی کوٹھڑی میں لے آئے۔ میرا حوصلہ بڑھانے کی باتیں کرتے رہے۔ مجھے تسلی دلاتے رہے کہ اُرملا زندہ ہے اور وہ مجھے ایک نہ ایک دن ضرور مل جائے گی۔ رات کا کھانا میں نے فادر فرانسس کے ساتھ ہی کھایا۔ اس کے بعد اپنی کوٹھڑی میں آ کر لیٹ گیا۔ کھڑکی میں نے بند کر دی تھی۔ کوٹھڑی میں صرف لالٹین جل رہی تھی جس کی روشنی دھیمی تھی۔

نیند کہاں آتی تھی، بس سوتے جاگتے کی حالت میں تھا۔

ایک بار آنکھ لگی تو میرے کانوں میں کانچی کی آواز آنے لگی۔ وہ دھیمی دھیمی پراسرار سرگوشیوں میں بول رہی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔

''تم سمجھ رہے ہو گے کہ میں نے تمہاری اُرملا کو قتل کر دیا ہے۔ ماتا دیوی کے چرنوں میں اس کا بلیدان دے دیا ہے۔ نہیں۔ ایسی بات نہیں ہے۔ اگر میں نے ایسا کر دیا تو میرے انتقام کی آگ ٹھنڈی ہو جائے گی۔ اُرملا ایک ہی بار موت کی آغوش میں چلی جائے گی اور زندگی کے عذابوں اور دُکھوں سے نجات حاصل کر لے گی اور تھوڑے دن غم کرنے کے بعد تمہیں بھی صبر آ جائے گا۔ نہیں شیراز نہیں! میں اتنی جلدی تمہیں اور اُرملا کو بخشنے والی نہیں ہوں۔ میں نے اُسے وہاں پہنچا دیا ہے جہاں ہر گھڑی اُس کو موت آئے گی مگر وہ مرے گی نہیں۔ وہ موت کے لئے دُعائیں مانگے گی مگر اُسے موت نہیں آئے

گی۔ نہ اُسے موت آئے گی نہ تمہیں صبر آئے گا۔ اور میرے انتقام کی آگ کے شعلے ہمیشہ بھڑکتے رہیں گے۔ میرے انتقام کی آگ کبھی سرد نہیں ہو گی۔ میں ہر گھڑی اُس سے بدلہ لیتی رہوں گی۔ میں ہر گھڑی اُسے تڑپتا دیکھتی رہوں گی۔ بس...... یہی میں چاہتی ہوں اور یہی میرا انتقام ہے......"

اس کے بعد میرے کانوں میں آندھیوں کا شور بلند ہونے لگا۔ میں ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ کوٹھڑی میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ لالٹین کی لو اور دھیمی ہو گئی تھی۔ کانچی کی آواز ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔ اُس کی زبان سے یہ سن کر کہ اُرملا مری نہیں زندہ ہے ایک بہت بڑا بوجھ میرے سر سے اُتر گیا تھا۔ میرے حوصلے بلند ہو گئے تھے۔ اب میں اُس کی تلاش میں دنیا کے آخری کنارے تک جا سکتا تھا اور ہر قسم کی تکلیفوں اور صعوبتوں کو برداشت کر سکتا تھا۔ اس کے بعد مجھے نیند نہ آئی۔

صبح میں نے یہ سارا ماجرا فادر فرانسس کو بیان کیا تو وہ بولے۔

"یہ میرے لئے بھی ایک خوشخبری ہے کہ اُرملا زندہ ہے۔ اگرچہ کانچی نے اُسے کسی انتہائی تکلیف دہ عذاب میں مبتلا کر دیا ہے۔"

میں نے کہا۔

"فادر! میرے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ اُرملا زندہ ہے۔ خدا نے چاہا تو میں بہت جلد اُسے تلاش کر لوں گا اور کانچی کے لائے ہوئے عذابوں سے نجات دلاؤں گا۔"

فادر فرانسس پوچھنے لگے۔ "کانچی نے اپنی باتوں میں یہ نہیں بتایا یا اس کا تمہیں کوئی اشارہ نہیں ملا کہ اُرملا کہاں ہے؟"

میں نے کہا۔ "بالکل نہیں۔ وہ بتا بھی نہیں سکتی تھی اور اُس کی باتوں سے مجھے ایسا کوئی اشارہ بھی نہیں ملا کہ اُرملا کس جگہ اور کہاں ہو گی۔"

فادر فرانسس خاموش رہے۔ میں نے کہا۔ "اب میرے سامنے یہی ایک مشن ہے کہ اُرملا کا کھوج لگا کر اُسے کانچی کی ستم رانیوں سے نجات دلاؤں اور کانچی کو اُس کے انجام تک بھی پہنچاؤں۔"

"مگر بیٹے!" فادر بولے۔ "تم اُسے کہاں تلاش کرو گے؟ تمہیں تو یہ بھی نہیں پتہ کہ وہ اتنے بڑے ملک ہندوستان کے کس کونے میں ہے؟ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کانچی نے

اُسے کسی دُور دراز ویران جزیرے میں قید کر رکھا ہو۔"

میں نے حالت نیند میں کانچی کی سنی ہوئی باتوں کو یاد کرتے ہوئے کہا۔

"کانچی نے کہا تھا کہ میں نے اُرملا کو اس حالت میں چھوڑ دیا ہے کہ جہاں وہ گھٹ گھٹ کر مرے گی مگر اُسے موت نہیں آئے گی۔ اس کا کیا مطلب ہے؟"

فادر کہنے لگے۔ "کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ایک بات واضح ہے کہ کانچی کوئی جن بھوت یا چڑیل نہیں ہے۔ وہ ہماری تمہاری طرح ایک انسان ہے۔ اُرملا کو وہ کسی چڑیل یا جن بھوت کے حوالے نہیں کر سکتی۔ وہ اُسے چھپکلی بنا کر بھی نہیں چھوڑ سکتی ہے۔ ظاہر ہے اُس نے اُرملا کے ساتھ ایسا ہی کوئی سلوک کیا ہو گا جو ظالم سے ظالم انسان اپنے کسی دشمن کے ساتھ کر سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے اُس نے اُرملا کو جلاد قسم کے بدمعاش پجاریوں کے حوالے کر دیا ہو۔ ہو سکتا ہے کہ اُس نے اُرملا کو بردہ فروشوں کے ہاتھ فروخت کر دیا ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اُرملا کو اُس نے کسی ایسے ویران، گمنام جزیرے میں پھینک دیا ہو جہاں چاروں طرف سمندر ہی سمندر ہو اور کھانے پینے کو سوائے درختوں کے پتوں اور کڑوے سمندری پانی کے اور کچھ نہ ہو۔ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔"

میں فادر فرانسس کی بات بڑی توجہ سے سن رہا تھا۔ جب اُنہوں نے اپنی بات ختم کی تو میں نے کہا۔

"فادر! یہ بات تو طے ہے کہ مجھے اب اُرملا کی تلاش میں نکلنا ہے۔ سارے حالات آپ کے سامنے ہیں۔ آپ ایک روشن ضمیر بزرگ ہیں۔ مجھے مشورہ دیں کہ میں پہلا قدم کس سمت کو اُٹھاؤں؟"

فادر فرانسس کے چہرے پر سوچ کے تاثرات اُبھر آئے۔ کچھ دیر خاموش رہے، پھر میری طرف نگاہیں اُٹھائیں اور بولے۔ "تم ایک کام کرو!"

"فرمایئے۔" میں نے پوچھا۔

اُنہوں نے کہا۔ "ضلع جھانسی میں باندہ کی طرف جاتے ہوئے نرسنگ پور نام کا ایک قصبہ آتا ہے۔ کسی زمانے میں یہ ایک قصبہ تھا مگر اب ایک چھوٹا سا شہر بن گیا ہے۔ وہاں میرا ایک دوست رہتا ہے۔ اُس کا نام جارج ہے۔ جارج اینگلو انڈین ہے اور کسی زمانے میں جھانسی پولیس میں ڈی ایس پی کے عہدے پر تعینات تھا۔ اب وہ ریٹائرڈ ہو

چکا ہے۔ جارج اس علاقے کے تمام جرائم پیشہ لوگوں سے واقف ہے۔ اگر کانچی نے اپنے پجاریوں کے ذریعے اُرملا کو کسی جرائم پیشہ گروہ کے حوالے کر دیا ہوگا تو جارج اس کا کھوج لگانے میں تمہاری بہت مدد کر سکتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ کانچی نے اُرملا کو جرائم پیشہ لوگوں کے سپرد کر دیا ہو، لیکن ایسا ہو بھی سکتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اندھیرے میں بھٹکنے کی بجائے اگر تم جارج سے جا کر مل لو اور اُسے سارا ماجرا مختصر کر کے سنا دو تو وہ کم از کم اتنا ضرور کھوج لگا لے گا کہ اُرملا اس صوبے کے کسی جرائم پیشہ گروہ کے پاس موجود ہے یا نہیں۔ اس کے بعد تم کوئی دوسرا قدم اُٹھا سکتے ہو۔ تمہارا کیا خیال ہے؟''

فادر فرانسس کا مشورہ میرے دل کو لگا۔ میں نے فوراً اُن کے مشورے پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا اور کہا۔ ''میں آپ کے دوست جارج سے ضرور ملوں گا۔ اگر اُرملا کا کوئی سراغ نہ بھی ملا تو کم از کم اتنی تسلی تو ہو جائے گی کہ وہ اس صوبے کے جرائم پیشہ افراد کے قبضے میں نہیں ہے۔ اس کے بعد میں کوئی دوسرا قدم اُٹھانے کے بارے میں سوچوں گا۔''

''ٹھیک ہے۔'' فادر فرانسس بولے۔ ''میں تمہیں جارج کے نام ایک خط لکھ کر دے دوں گا۔ یہ خط اُسے دکھا دینا۔ باقی سارا کام وہ خود ہی سرانجام دے گا۔''

میں نے فادر سے پوچھا۔ ''مجھے نرسنگ پور جانے کے لئے کہاں سے کون سی گاڑی پکڑنی ہوگی؟''

اُنہوں نے کہا۔ ''تم یہاں سے جے پور جاؤ گے۔ وہاں سے آگرہ جانے والی گاڑی پکڑو گے۔ آگرہ سے تمہیں گوالیار جھانسی جانے والی کوئی نہ کوئی گاڑی مل جائے گی۔ جھانسی کے سٹیشن پر اُتر کر تم نرسنگ پور جانے والی ٹرین کے بارے میں پوچھ لینا۔ یہ بانڈہ کی طرف جانے والی برانچ لائن پر واقع ہے۔ نرسنگ پور پہنچ جانے کے بعد وہاں کسی بھی پولیس سٹیشن پر جا کر جارج صاحب کے بارے میں پوچھ لینا کہ ان کا مکان کہاں ہے۔ جارج کو علاقے کے سارے پولیس افسر جانتے ہیں۔ وہ اگرچہ سروس میں نہیں ہے لیکن پولیس والے اُس کا بڑا احترام کرتے ہیں۔''

دوسرے روز فادر فرانسس نے جارج کے نام ایک خط لفافے میں بند کر کے میرے حوالے کیا اور بولے۔

''یہ خط جارج کو دے دینا۔ اور یہ دوسرا لفافہ تمہارے لئے ہیں۔ اس میں کچھ رقم

ہے۔ سفر میں تمہارے کام آئے گی۔''

میں نے دوسرا لفافہ بھی لے لیا اور نیک دل فادر کا شکریہ ادا کرنا چاہا تو وہ بولے۔

''شکریہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں جانتا ہوں تمہیں ان پیسوں کی ضرورت ہے۔''

مجھے سرسوتی کا خیال آ گیا۔ میں نے فادر سے کہا۔

''فادر! سرسوتی میرے بعد ضرور آئے گی اور آپ سے میرے بارے میں پوچھے گی۔ اُسے یہ نہ بتایئے گا کہ میں اُرملا کی تلاش میں نرسنگ پور کی طرف گیا ہوں۔''

فادر فرانسس مسکرائے۔ کہنے لگے۔ ''میں جانتا ہوں سرسوتی کو کیا کہنا ہے اور کیا نہیں کہنا۔ بات یہ ہے کہ وہ بھی تم سے پیار کرنے لگی ہے۔ دل پر تو کسی کو اختیار نہیں ہوتا۔''

میں نے جواب دیا۔ ''فادر! مجھے بھی اپنے دل پر اختیار نہیں ہے۔ میں اُرملا اور صرف اُرملا سے محبت کرتا ہوں۔ سرسوتی میری دوست ہے۔ میری ہمدرد ہے۔ میں اُس کی عزت کرتا ہوں مگر اُس سے محبت نہیں کرتا۔ میں بھی اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہوں۔ وہ آ کر میرا پوچھے تو کہہ دیجئے کہ وہ مجھے کچھ بتائے اور مجھ سے ملے بغیر ہی چلا گیا ہے۔''

فادر فرانسس نے میرے سر پر اپنا شفقت بھرا ہاتھ رکھا اور بولے۔

''خدا تمہاری نگہبانی کرے۔''

اس کے تھوڑی دیر بعد میں اس علاقے کے چھوٹے ریلوے سٹیشن پر جانے کے لئے جنگل میں سے گزر رہا تھا۔ راستہ مجھے معلوم تھا۔ دن کا پہلا پہر تھا۔ موسم بڑا خوشگوار تھا۔ سٹیشن تک پہنچتے پہنچتے دن کے گیارہ بج گئے۔ معمولی سا سٹیشن تھا۔ پلیٹ فارم خالی پڑا تھا۔ معلوم ہوا کہ جے پور کو گاڑی ڈیڑھ بجے جائے گی۔ میں نے سٹیشن کے سامنے ایک دُکان کے باہر بیٹھ کر کھانا کھایا اور وقت گزارنے کے لئے وہیں چائے منگوا کر بیٹھا رہا۔ وہاں سے سٹیشن کی عمارت نظر آ رہی تھی۔ کوئی ایک بجے کے قریب دیہاتی مسافر آنا شروع ہو گئے۔ میں اُٹھ کر سٹیشن پر آیا۔ سٹیشن پر سے مجھے نرسنگ پور کا ٹکٹ مل گیا۔ میں پلیٹ فارم پر آ کر ٹرین کا انتظار کرنے لگا۔

ٹرین دو بجے آئی۔ میں ایک ڈبے میں سوار ہو گیا۔ ٹرین چند منٹ رکنے کے بعد جے پور کی طرف روانہ ہو گئی۔

جے پور سے میں نے آگرہ جانے والی گاڑی پکڑی اور پھر آگرہ کے سٹیشن پر گوالیار جھانسی جانے والی ٹرین کا انتظار شروع ہو گیا۔ آخر ایک پسنجر ٹرین مل گئی اور جب جھانسی پہنچا تو دن غروب ہو چکا تھا اور شام کے سائے آہستہ آہستہ نمودار ہو رہے تھے۔ جانسی سے نرسنگ پور جانے والی گاڑی ایک گھنٹے بعد ملی۔ اس نے ایک سوا ایک گھنٹے میں نرسنگ پور پہنچا دیا۔

اس وقت رات ہو گئی تھی۔ سٹیشن کی بتیاں روشن تھیں۔ کافی بڑا شہر لگ رہا تھا۔ پلیٹ فارم پر سے شہر کی روشنیاں بھی نظر آ رہی تھیں۔ میں نے سٹیشن سے باہر آ کر قریبی پولیس سٹیشن کا پتہ پوچھا اور وہاں پہنچ گیا۔ ایک ہیڈ کانسٹیبل میز پر رجسٹر پھیلائے کچھ لکھ رہا تھا۔ وہ ہندو تھا۔ اُس کے ماتھے پر تلک لگا ہوا تھا۔ میں نے اُسے نمسکار کیا۔ اُس نے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔

”اُدھر بنچ پر بیٹھ جاؤ!“

میں نے کہا۔ ”مہاراج! مجھے ریٹائرڈ ڈی ایس پی جارج صاحب کے مکان کا پتہ پوچھنا ہے۔“

اُس کے ہاتھ لکھتے لکھتے رُک گئے۔ میری طرف دیکھا اور پوچھا۔

”تم جارج صاحب کے رشتہ دار ہو کیا؟“

میں نے کہا۔ ”جی ہاں۔ وہ میرے رشتے کے انکل ہیں۔ مگر میں اُن کے ہاں پہلی بار آ رہا ہوں۔“

ہیڈ کانسٹیبل نے مجھے جارج کے مکان کا پتہ بتایا اور کہا۔ ”باہر سے سائیکل رکشہ لے لینا۔ جارج صاحب کا مکان شہر سے تھوڑا باہر ہے۔“

میں نے ہیڈ کانسٹیبل کا شکریہ ادا کیا اور باہر آ کر ایک خالی سائیکل رکشہ دیکھا تو اُسے جارج صاحب کے مکان کا نمبر اور محلے کا نام بتا کر کہا۔ ”بھائی! مجھے ذرا جلدی پہنچا دو۔“

رکشہ والا بولا۔ ”بیٹھ جاؤ صاحب! دس منٹ میں پہنچا دوں گا۔“

رات ہو چکی تھی۔ جارج صاحب گھر پر ہی مل گئے۔ اُس زمانے کے اینگلو انڈین کی طرح رنگ زردی مائل تھا۔ عمر ساٹھ سے اُوپر ہو چکی ہو گی۔ شانے چوڑے تھے مگر

کندھے جھکے ہوئے تھے۔ کھانے کی میز کے پاس آرام کرسی پر بیٹھے سگار پی رہے تھے۔ نوکر مجھے اُن کے پاس چھوڑ کر چلا گیا تو اُنہوں نے پولیس والوں کی گہری نظروں سے میرا جائزہ لیا۔ میں نے فادر فرانسس کا خط نکال کر دے دیا۔ اُنہوں نے خط پڑھ کر تہہ کر کے میز پر رکھ دیا اور مجھ سے سوال کیا۔

”تمہیں مجھ سے کیا کام ہے؟ فادر فرانسس نے لکھا ہے کہ تم ایک ضروری کام سے میرے پاس آئے ہو۔“

میں نے مختصر کر کے مگر پورے واقعات کے ساتھ اُرملا کا قصہ بیان کر دیا اور کہا۔

”اُرملا میری منگیتر ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اُسے جرائم پیشہ لوگوں نے اغوا کر لیا ہے۔ فادر فرانسس نے کہا تھا کہ آپ اس سلسلے میں میری مدد کر سکتے ہیں۔“

مسٹر جارج نے سگار کا ہلکا سا کش لیا اور بولے۔

”فادر فرانسس میرے دوست بھی ہیں اور میرے مہربان بھی ہیں۔ مجھ سے جو ہو سکا وہ ضرور کروں گا۔ لیکن پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ کیا یہ لڑکی پہلے بھی کبھی گھر سے بھاگی تھی؟“

میں نے کہا۔ ”بالکل نہیں۔ وہ ایک پڑھی لکھی لڑکی ہے اور اپنے مذہب جین دھرم کی بڑی سختی سے پابندی کرتی ہے۔“

جارج نے دوسرا سوال کیا۔ ”کیا علاقے کے کسی تھانے میں اُس کے خلاف کبھی کوئی مقدمہ درج ہوا ہے؟“

میں نے کہا۔ ”بالکل نہیں سر! میں نے کہا ناں اُرملا نہایت شریف لڑکی ہے۔ اُس کی زندگی بے داغ رہی ہے۔“

مسٹر جارج نے سگار کی راکھ جھاڑتے ہوئے میری طرف گھور کر دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”پھر تمہیں یہ کیسے شک پڑا کہ اُرملا کو جرائم پیشہ لوگوں نے اغوا کیا ہے؟“

میں نے مسٹر جارج کو جو واقعات سنائے تھے اُن میں کانچی کا بالکل ذکر نہیں کیا تھا۔ اس کے ذکر کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ اس لئے میں نے یہ بتانے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی تھی کہ یہ سب کچھ مجھے کانچی نے خواب میں آ کر بیان کیا ہے۔ میں بتاتا بھی تو مسٹر جارج کو جس کی ساری زندگی پولیس کے محکمے میں گزری تھی کبھی یقین نہ آتا۔ میں نے کہا۔

''شک نہیں پڑا۔ بس ہمارا خیال ہے کہ کہیں اُسے غلط قسم کے لوگ اغوا کر کے نہ لے گئے ہوں۔''

''تمہارے پاس لڑکی کا کوئی فوٹو ہے؟'' جارج نے پوچھا۔

میں نے کہا۔ ''فوٹو تو نہیں ہے مگر میں آپ کو اُس کا پورا حلیہ بیان کر سکتا ہوں۔''

میں نے اُرملا کا پورا حلیہ بیان کر دیا۔ جارج صاحب بڑی توجہ سے سنتے رہے۔ پھر کہنے لگے۔

''میں اپنے دوست فادر فرانسس کا کہا نہیں ٹال سکتا۔ میں ایک دو آدمی آس پاس کے علاقے میں بھیج دوں گا۔ اگر کسی جگہ سے ایسے حلیے والی لڑکی کا کچھ پتہ چلا تو اُسے یہاں لے آئیں گے۔ مگر اس کے لئے تمہیں دو چار روز یہاں رُکنا پڑے گا۔''

میں نے کہا۔ ''اگر یہاں کوئی ہوٹل وغیرہ ہو تو میں وہاں ٹھہر جاؤں گا۔''

''ہوٹل میں ٹھہرنے کی کیا ضرورت ہے؟'' مسٹر جارج بولے۔ ''تم فادر فرانسس کے آدمی ہو اور فادر میرا دوست ہے۔ تم میرے مکان پر ہی ٹھہرو گے۔''

مسٹر جارج بڑا پریکٹیکل قسم کا آدمی نکلا۔ اُس نے اُسی رات ایک آدمی کو مکان پر بلا کر اس سے کچھ باتیں کیں اور اُرملا کی تلاش کی مہم پر روانہ کر دیا۔ دوسرے دن ایک اور آدمی کو دوسرے علاقے کی طرف بھیج دیا۔ دوسرے دن شام کو پہلے والا آدمی واپس آیا تو اُس نے کہا۔

''سر! میں نے اپنے علاقے کے سارے اڈے چھان مارے ہیں۔ دو نئی عورتیں وہاں ضرور آئی ہیں مگر ان میں سے کسی کا رنگ بھی گورا نہیں ہے۔ دونوں کالے رنگ کی ہیں۔ جبکہ آپ نے اُرملا نام کی عورت کا رنگ گورا بتایا تھا۔''

میں وہیں بیٹھا تھا۔ میں نے کہا۔

''اُرملا کی گال پر بائیں جانب ایک سیاہ تل کا نشان تھا۔ کیا ان میں سے کسی عورت کے گال پر سیاہ تل کا نشان تھا؟''

''بالکل نہیں تھا۔'' وہ آدمی بولا۔ ''میں نے اس نشانی کو خاص طور پر چیک کیا تھا۔''

مسٹر جارج نے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ اب تم ایسا کرو کہ سکھداس پور والے گنگولی کے پاس جاؤ اور اُسے کہو کہ کل صبح آ کر مجھے مل جائے۔''

''بہت اچھا سر!'' یہ کہہ کر وہ آدمی چلا گیا۔

رات کے نو بج رہے تھے کہ جارج صاحب کا دوسرا مخبر بھی آ گیا۔ کہنے لگا۔

''سر! راموتیلی کے علاقے میں پچھلے ماہ سے کوئی عورت اغواء ہو کر نہیں آئی۔''

مسٹر جارج نے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ تم ابھی جاؤ۔ کل تمہیں دوسری جگہ بھیجوں گا۔''

دوسرا آدمی بھی چلا گیا۔ جارج صاحب کی طرف سے مجھے کچھ مایوسی ہونے لگی۔ مجھے اُن کے طریقہ تفتیش نے بالکل متاثر نہ کیا۔ وہ اس طرح تفتیش کر رہے تھے جیسے کسی جرائم پیشہ عورت کا کھوج لگا رہے ہوں جبکہ ایسی بات نہیں تھی۔ پھر بھی میں خاموش رہا کہ شاید اسی طرح اُرملا کا کوئی سراغ مل جائے۔

اگلے روز صبح صبح سکھداس پور والا گنگولی بھی آ گیا۔ دُبلا پتلا کالے رنگ کا چمکیلی آنکھوں والا نوجوان تھا۔ گلے میں لال رنگ کا ریشمی گلو بند تھا۔ آتے ہی اُس نے مسٹر جارج کے قدم چھوئے اور ہاتھ باندھ کر بولا۔

''مہاراج نے یاد کیا گنگولی حاضر ہو گیا۔ حکم کریں۔''

جارج نے مختصر لفظوں میں اُرملا کے بارے میں اُسے بتایا اور کہا۔ ''یہ عورت شریف گھرانے کی ہے۔ ہمیں شک ہے کہ جرائم پیشہ لوگوں کے ہتھے چڑھ گئی ہے۔ تم فوراً اپنے علاقے کو چھان کر اس کا کھوج لگاؤ۔''

میں نے دیکھا کہ شریف عورت کا سن کر گنگولی کی بھنویں سکڑ گئیں اور وہ جیسے کچھ سوچنے لگا تھا۔ جارج صاحب کی بات ختم ہوئی تو وہ کہنے لگا۔

''مہاراج! تین دن پہلے میرے ایک آدمی نے مجھے بتایا تھا کہ رام گوپال کہیں سے ایک گورے رنگ کی عورت لایا ہے جس کو اُس نے ایک دن ڈیرے میں بند رکھا ہے اور پھر مہاراشٹر کی طرف لے گیا ہے۔''

گورے رنگ کا سن کر میرا دل ایک بار زور سے دھڑکا۔ میں نے پوچھا۔

''کیا اُس عورت کے گال پر تل بھی تھا؟''

''یہ تو مجھے معلوم نہیں۔'' گنگولی بولا۔ ''مگر اتنا معلوم ہے کہ وہ عورت جینی تھی اور مہاویر کی دہائی دے رہی تھی۔''

میرا دل ڈوب سا گیا۔ یہ اُرملا کے سوا اور کوئی عورت نہیں ہو سکتی تھی۔ اُرملا جین

دھرم کو ماننے والی تھی اور مہاویر کی پوجا کرتی تھی۔ میں نے بے تاب ہو کر کہا۔

''یہ رام گوپال اُسے کہاں لے گیا ہے؟ کون سے شہر میں لے گیا ہے؟ مہاراشٹر تو بہت بڑا صوبہ ہے۔''

مسٹر جارج نے مجھے ہاتھ سے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور گنگولی سے پوچھا۔

''کیا وہ اُسے پونا لے گیا ہے یا بمبئی؟''

گنگولی بولا۔''صاحب! یہ میں آپ کو پتہ کر کے بتا دُوں گا۔ مجھے دو تین دن کی مہلت دے دیں۔''

مسٹر جارج بولے۔''اور یہ بھی پتہ کرنا کہ اُس لڑکی کا نام کیا ہے؟ اور کیا اُس کے گال پر بائیں جانب کالا تل ہے؟''

''فکر نہ کریں۔ میں پوری پوری خبر لا کر آپ کو دُوں گا۔''

گنگولی چلا گیا لیکن مجھے عجیب ذہنی پریشانی کے عالم میں چھوڑ گیا۔

میرا دل کہہ رہا تھا کہ یہ اُرملا ہی ہو سکتی ہے۔ مگر وہ برے لوگوں کے ہتھے چڑھ چکی تھی۔ میں اسے ان لوگوں کے پنجے سے چھڑانے کے لئے بے چین ہو رہا تھا۔ مگر گنگولی دو تین دن کی مہلت مانگ کر گیا تھا۔ میں بیان نہیں کر سکتا کہ یہ دو تین دن میں نے کس بے چینی اور ذہنی پریشانی کی حالت میں گزارے۔ تیسرے دن گنگولی آ گیا۔ کہنے لگا۔

''مہاراج! اُس لڑکی کا پورا کھوج مل گیا ہے۔ اُس کا نام اُرملا ہی ہے اور اُس کے بائیں گال پر کالے تل کا نشان بھی ہے۔''

میرا دل ڈوبنے لگا۔ مسٹر جارج نے پوچھا۔''وہ لڑکی اس وقت کہاں ہے؟''

گنگولی بولا۔''سر! رام گوپال اس لڑکی کو لے کر بھوپال سے بمبئی جا رہا تھا کہ پولیس کو پتہ چل گیا۔ رام گوپال کے مخبر نے اُسے خبر کر دی کہ پولیس ہوشنگ آباد کے سٹیشن پر اُسے پکڑنے کے لئے تیار کھڑی ہے۔ رام گوپال کے آدمی اُس کے ساتھ تھے۔ وہ لڑکی کو لے کر بھوپال اور ہوشنگ آباد کے درمیان بھیل واڑہ سٹیشن پر اُتر گیا۔ اس کے بعد کچھ پتہ نہیں کہ وہ کہاں چلا گیا ہے۔''

''یہ پکی خبر ہے؟'' جارج نے پوچھا۔

گنگولی بولا۔''ایک دم پکی خبر ہے صاحب!''

جارج پولیس کا آدمی تھا پوری پوری تفتیش کر رہا تھا۔ کہنے لگا۔''یہ پتہ کرو کہ بھیل واڑہ میں رام گوپال کا اگر کوئی خفیہ ٹھکانہ ہے تو وہ کس جگہ پر ہے؟''

گنگولی نے کہا۔''صاحب! بھیل واڑہ چھوٹا سا گاؤں ہے۔ لڑکی کو لے کر وہ گاؤں میں نہیں ٹھہرے گا۔ پولیس پیچھا کرتی وہاں پہنچ سکتی ہے۔''

مسٹر جارج بولا۔''تو پھر وہ آگے اُسے کہاں لے گیا ہو گا؟ بھیل واڑہ سے آگے تو گھنے جنگل شروع ہو جاتے ہیں۔''

گنگولی بولا۔''صاحب! ہو سکتا ہے وہ آگے جھومری تلیا کی طرف نکل گیا ہو۔ اور وہاں سے پونا چلا جائے۔''

''یہ ساری باتیں تم پتہ کرو اور مجھے ایک دن کے اندر اندر آ کر رپورٹ دو۔''

گنگولی کہنے لگا۔''صاحب جی! دو دن دے دیں۔ دو دن تو لگ ہی جائیں گے۔ مجھے خود جا کر معلوم کرنا پڑے گا۔''

''ٹھیک ہے۔ دو دن کے بعد آ جانا۔ مگر خبر پکی لانا۔''

''خبر پکی ہو گی سر! آپ تو جانتے ہیں ہم کچی خبر نہیں لایا کرتے۔''

گنگولی چلا گیا اور مجھ پر اُمید اور نا اُمیدی کے بادل منڈلانے لگے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اُرملا مجھے دوبارہ مل بھی سکے گی یا نہیں؟ اگر ملے گی بھی تو کہاں اور کس حالت میں ملے گی؟ یہ سوچ کر ہی میرا دل گھبرا اُٹھتا تھا۔ مسٹر جارج مجھ سے مخاطب ہو کر بولے۔

''ینگ مین! ڈونٹ وری...... جارج کبھی کسی کیس میں ناکام نہیں ہوا۔ تمہاری منگیتر تمہیں ضرور مل جائے گی۔''

سخت ذہنی انتشار کی حالت میں، میں نے مزید دو دن کاٹے۔ تیسرے دن گنگولی نے آنا تھا مگر وہ نہ آیا۔ چوتھے دن دوپہر کے بعد اچانک آ گیا۔ اُس وقت میں مسٹر جارج کے پاس برآمدے میں بیٹھا اُرملا کی باتیں کر رہا تھا۔ گنگولی نے آ کر جارج کو نمسکار کیا۔ جارج نے اُسے کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔ وہ بیٹھ گیا۔ جارج نے پوچھا۔

''کیا خبر لائے ہو گنگولی؟''

گنگولی بولا۔''صاحب! کوئی اچھی خبر نہیں ہے۔''

جارج نے کہا۔ ''کیا مطلب ہے تمہارا؟ صاف صاف بولو!''

گنگولی نے کہا۔ ''صاحب! رام گوپال نہ بھیل واڑہ میں ہے اور نہ ہی وہ لڑکی کو لے کر پونا گیا ہے۔''

''تو پھر کہاں گیا ہے؟'' جارج نے سوال کیا۔

گنگولی بولا۔ ''مجھے اُس کے اڈے کے ایک مخبر نے بتایا ہے کہ رام گوپال نے لڑکی کو دُلاری ماتا کے پاس بھجوا دیا ہے اور اس کے عوض کافی رقم بھی وصول کر لی ہے۔''

جارج نے پوچھا۔ ''یہ دُلاری ماتا کون ہے؟''

''صاحب! بمبئی شہر سے چھ سات میل جنوب میں ممبا دیوی کا مندر ہے۔ دُلاری ماتا اُس مندر کی بڑی پجارن ہے۔''

جارج نے پوچھا۔

''دُلاری ماتا کے پاس رام گوپال نے لڑکی کو کس لئے فروخت کر دیا؟''

گنگولی نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''صاحب! یہ بات میری سمجھ میں بھی نہیں آئی۔ ہو سکتا ہے دُلاری ماتا اُرملا کو دیوداسی بنانا چاہتی ہو۔ کیونکہ مندروں میں جتنی زیادہ اچھی شکل صورت کی جوان دیوداسیاں ہوتی ہیں، وہاں دکشنا دینے اور پوجا پاٹھ کرنے والے اُتنے زیادہ لوگ آتے ہیں اور مندروں کو اتنی ہی زیادہ آمدن ہوتی ہے۔''

جارج نے پوچھا۔ ''تمہاری اطلاع پکی ہے؟''

''بالکل پکی ہے صاحب!''

جارج بولا۔ ''تو پھر ہم لڑکی کو وہاں سے برآمد کر لیں گے۔''

گنگولی کہنے لگا۔ ''صاحب! یہ بڑا مشکل کام ہے۔''

''کیوں؟'' جارج نے بھنویں اُوپر چڑھاتے ہوئے پوچھا۔

''اس لئے صاحب! کہ ایک تو ممبا دیوی کے مندر میں کوئی عیسائی، مسلمان یا پارسی داخل نہیں ہو سکتا۔ ممبا دیوی کے مندر میں صرف ہندو ہی داخل ہو سکتا ہے۔ اگر کوئی دوسرے مذہب کا آدمی یا عورت داخل ہو جائے تو اُسے اس طریقے سے غائب کر دیا جاتا ہے کہ اس کا کہیں نام و نشان بھی نہیں ملتا۔''

گنگولی کے اس انکشاف پر میں نے جارج کی طرف حیران ہو کر دیکھا۔ جارج

ایک لمحے خاموش رہنے کے بعد کہنے لگا۔ ''مگر پولیس کو کوئی نہیں روک سکتا۔''

گنگولی بولا۔ ''صاحب! پولیس کے چھاپہ مارنے کا کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ کیونکہ اُسے وہاں کچھ نہیں ملے گا۔ جس لڑکی کو دُلاری ماتا خرید کر دیوداسی بناتی ہے اُسے کسی خفیہ جگہ پر چھپا دیا جاتا ہے۔ جب اُسے یقین ہو جاتا ہے کہ اب پولیس وغیرہ لڑکی کے پیچھے نہیں آئے گی تو لڑکی کو دوسری دیوداسیوں میں شامل کر لیا جاتا ہے۔''

جارج نے میری طرف دیکھا اور کہا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے؟''

جارج کے اس سوال کرنے سے پہلے ہی میں نے اپنے دل میں ایک فیصلہ کر لیا ہوا تھا۔ میں نے کہا۔

''سر! چاہے کچھ ہو جائے میں ممبا دیوی کے مندر میں داخل ہو کر وہاں سے اُرملا کو ہر حالت میں نکال کر لے آؤں گا۔''

''مگر تم مسلمان ہو اور ممبا دیوی کے مندر میں کوئی مسلمان داخل نہیں ہو سکتا۔'' جارج نے مجھے متنبہ کرتے ہوئے کہا۔

میں نے کہا۔ ''میں ہندو بن کر مندر میں جاؤں گا۔''

اس کے جواب میں گنگولی بولا۔

''صاحب جی! مندر میں داخل ہونے سے پہلے ہر اجنبی آدمی کا ڈاکٹری معائنہ کیا جاتا ہے۔ آپ کا ڈاکٹری معائنہ کیا گیا تو صاف معلوم ہو جائے گا کہ آپ ہندو نہیں ہیں، مسلمان ہیں۔''

''یہ کیسے ممکن ہے؟'' جارج نے کہا۔ ''مندر میں تو سینکڑوں لوگ پوجا کرنے آتے ہیں۔ کیا ہر آدمی کا ڈاکٹری معائنہ کیا جاتا ہے؟''

گنگولی بولا۔ ''بات یہ ہے صاحب! کہ ایک ماہ پہلے مندر میں ایک مسلمان پکڑا گیا تھا جو ہندو جوگی بن کر داخل ہو گیا تھا۔ جب پتہ چلا کہ جوگی ہندو نہیں مسلمان ہے تو اُس کو وہیں ختم کر کے اُس کی لاش غائب کر دی گئی۔ لیکن اس کے بعد اب احتیاط کے طور پر ہر آنے والے مرد کا ڈاکٹری معائنہ کیا جاتا ہے۔ کیونکہ ممبا دیوی کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ اگر اُس کے مندر میں کوئی غیر ہندو آ جائے گا تو مندر کے پجاری یا بڑی پجارن کا اگلا جنم سورنی کا ہو گا۔''

اب میں پریشان ہو گیا کیونکہ اُرملا کو وہاں سے نکالنے کا مجھے کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ جارج بھی سوچ میں پڑ گیا۔ پھر اُس نے گنگولی سے کہا۔

''میں بمبئی پولیس کے ڈی ایس پی کے نام خط لکھے دیتا ہوں کہ دلاری ماتا نے ایک لڑکی کو اغوا کر کے مندر میں رکھا ہے۔ پولیس اچانک چھاپہ مار کر اُس لڑکی کو ضرور برآمد کر لے گی۔''

گنگولی کہنے لگا۔ ''صاحب! جیسا کہ آپ کو معلوم ہے ہندوستان آزاد ہو گیا ہے۔ پاکستان بن چکا ہے۔ پہلے بمبئی میں ایک اینگلو انڈین ڈی آئی جی تعینات تھا۔ اب اُس کی جگہ ایک ہندو برہمن لگ گیا ہے۔ وہ ممبا دیوی کے شراپ (بددعا) کے ڈر سے کبھی پولیس کو چھاپہ مارنے کی اجازت نہیں دے گا۔ اور اگر پولیس اپنے طور پر چھاپہ مارے گی تو ڈی آئی جی دُلاری ماتا کو بتا دے گا کہ چھاپہ پڑنے والا ہے۔''

میں مایوسی کے عالم میں خاموش بیٹھا اُن کی باتیں سن رہا تھا۔ دل میں بار بار ایک ہی خیال آ رہا تھا کہ شاید اب اُرملا کو میں کبھی حاصل نہ کر سکوں گا۔ جارج نے گنگولی سے پوچھا۔ ''تم بتاؤ! ہمیں کیا کرنا چاہئے؟ تم کیا صلاح دیتے ہو؟ کیونکہ لڑکی کو ہمیں ہر حالت میں برآمد کرنا ہے۔''

گنگولی ایک لمحے کے لئے سوچ میں پڑ گیا۔ پھر میری طرف دیکھ کر کہنے لگا۔

''بمبئی میں میرا ایک مسلمان دوست ہے۔ اُس کا نام عثمان بھائی ہے۔ میں تمہیں اُس کے نام ایک پرچہ لکھ کر دیئے دیتا ہوں۔ اُس کو جا کر ملو۔ اگر کوئی تمہاری مدد کر سکتا ہے تو عثمان بھائی ہی کر سکتا ہے۔''

میرے دل میں اُمید کی ایک کرن جاگ اُٹھی۔ میں نے کہا۔

''مجھے پرچہ لکھ دو! میں اُسے ضرور ملوں گا۔''

جارج بولا۔ ''گنگولی کا مشورہ صحیح ہے۔ ہو سکتا ہے عثمان بھائی سے ملنے کے بعد کوئی راستہ نکل آئے۔''

گنگولی نے وہیں عثمان بھائی کے نام ایک پرچہ لکھ کر میرے حوالے کر دیا۔ میں نے اسے تہہ کر کے جیب میں رکھ لیا۔ اس کے بعد اُس نے مجھے بمبئی میں عثمان بھائی کا پورا پتہ بتایا۔ پھر وہ جارج سے اجازت لے کر چلا گیا۔ جارج میری طرف متوجہ ہو کر بولا۔

''یہ بھی کوشش کر کے دیکھ لو! یہ لوگ بڑے گہرے ہوتے ہیں۔ انہیں بعض ایسے راستے معلوم ہوتے ہیں جن کے بارے میں پولیس کو بھی کچھ علم نہیں ہوتا۔''

اُسی روز میں جارج سے رُخصت لے کر گاڑی میں سوار ہو گیا۔ میں وہاں سے سیدھا فادر فرانسس کے پاس پہنچا۔ اُنہیں ساری صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ اُنہوں نے کہا۔

''جارج کے پاس تمہارا جانا بے فائدہ نہیں رہا۔ میرا دل کہتا ہے کہ عثمان بھائی کی مدد سے تم اپنے مشن میں ضرور کامیاب ہو جاؤ گے۔''

میں نے کہا۔ ''میں آج رات کی گاڑی سے ہی بمبئی روانہ ہو جانا چاہتا ہوں۔ آپ میرے لئے دُعا کیجئے گا۔''

فادر فرانسس بولے۔ ''میں ضرور دُعا کروں گا۔''

اس کے بعد ہم نے اکٹھے کھانا کھایا۔ اُس وقت رات کے نو بج رہے تھے۔ بمبئی کے لئے ایک پسنجر ٹرین رات کے گیارہ بجے روانہ ہوتی تھی۔ جہاں سے مجھے یہ ٹرین پکڑنی تھی وہاں تک پہنچنے کے لئے بھی مجھے ایک گھنٹے کی مسافت طے کرنی تھی۔ چنانچہ میں نے فادر فرانسس سے اجازت چاہی۔ وہ اُٹھ کر اندر گئے۔ واپس آئے تو اُن کے ہاتھ میں ایک بند لفافہ تھا۔ لفافہ مجھے دے کر بولے۔

''اس میں کچھ پیسے ہیں۔ تمہیں ان کی ضرورت پڑے گی۔ انکار نہ کرنا۔ تم مجھے اپنے بچے کی طرح عزیز ہو۔''

میری آنکھیں ممنونیت کے احساس سے بھر آئیں۔ میں نے فادر فرانسس کا ہاتھ چوما اور اجازت لے کر اپنے مشن پر روانہ ہو گیا۔

یہ ایک ایسا مشن تھا جس میں میرے کامیاب ہونے کے امکانات نہ ہونے کے برابر تھے۔ لیکن میرا دل کہتا تھا کہ میں ضرور کامیاب ہوں گا۔ یہ میرا جذبہ محبت تھا جو مجھے اُرملا سے تھی۔ اس معصوم اور پارسا لڑکی کے مجھ پر کچھ ایسے احسانات تھے کہ اُس کی جان بچانا اور اُسے کسی بھی جہنم سے نکالنا میرا انسانی فرض تھا۔ اس کے علاوہ جو چیز مجھے دیوانہ وار اس مشن پر لئے جا رہی تھی وہ اُس کی محبت تھی۔ وہ محبت جو وہ مجھ سے کرتی تھی اور وہ محبت جو مجھے اُس کی شخصیت، اُس کی رُوح اور اُس کے جسم سے ہو گئی تھی۔ کیونکہ اُس کی پاکباز رُوح، اُس کے جسم کے ذریعے ہی مجھ سے ہم کلام ہوئی تھی۔ اُرملا کا جسم وہ حجاب

تھا جس کی چلمن اُٹھا کر ہی میں نے اُس کی رُوح کو دیکھا تھا۔ اگر اُس کا جسم نہ ہوتا تو میں اپنے پانچوں حواس کے ساتھ بھی اُس کی رُوح کو نہ دیکھ سکتا تھا، نہ چھو سکتا تھا۔

میں بمبئی پہنچ گیا۔

میرے محترم اور شفیق فادر فرانسس نے مجھے اتنے روپے لفافے میں ڈال کر دے دیئے تھے جو میرے لئے بہت تھے۔ جس وقت میں بمبئی پہنچا اُس وقت سہ پہر کا وقت تھا۔ موسم ابر آلود تھا اور ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ یہ 1948ء کے شروع کا زمانہ تھا۔ میں اپنے حالات و واقعات میں شہروں سے دُور رہ کر اس قدر اُلجھا رہا تھا کہ مجھے پتہ ہی نہیں چل سکا کہ برصغیر کے مسلمانوں نے قائداعظم کی ولولہ انگیز قیادت میں اپنے لئے ایک الگ ملک پاکستان حاصل کر لیا ہے۔ بمبئی کے ریلوے سٹیشن کے اندر اور باہر جگہ جگہ آزاد ہندوستان کے پرچم لگے ہوئے تھے۔ فسادات ختم ہو چکے تھے۔ فضا پُر امن تھی۔ اس زمانے میں بمبئی کی آبادی بھی دوسرے شہروں کی طرح اتنی زیادہ نہیں تھی۔ سڑکوں پر اتنا رش نہیں تھا جو آج کل ہر شہر میں دیکھا جاتا ہے۔ انگریزی کرنسی بھی ابھی تک چلتی تھی۔ میں نے ایک وکٹوریہ (بگھی) لی اور گنگولی کے بتائے ہوئے ایڈریس پر عثمان بھائی کے ٹھکانے پر پہنچ گیا۔ وہ ایک پرانی بلڈنگ کی دوسری منزل کے ایک کمرے میں رہتا تھا۔ یہ بلڈنگ بمبئی شہر کے علاقے باندرہ میں واقع تھی۔ کمرے کا دروازہ بند تھا اور باہر کنڈی نہیں لگی ہوئی تھی۔ میں نے دروازے کو آہستہ سے کھٹکھٹایا۔ اندر سے کسی نے بھاری آواز اور تیز لہجے میں پوچھا۔

''کون ہے؟''

میں نے دروازے کے پاس منہ لے جا کر کہا۔ ''عثمان بھائی! مجھے گنگولی نے بھیجا ہے۔''

خاموشی چھا گئی۔ پھر دروازہ کھلا اور میرے سامنے ایک پختہ عمر کا دُبلا پتلا سانولے رنگ کا آدمی کھڑا تھا جس کے بال کنپٹیوں پر سفید ہو رہے تھے۔ سیاہ آنکھوں میں بلا کی چمک تھی جو اس آدمی کی ذہانت اور زیرکی کی دلیل تھی۔ اُس نے بنیان اور دھوتی پہن رکھی تھی۔ دروازہ کھول کر اُس نے بڑے غور سے مجھے اُوپر سے نیچے تک دیکھا اور وہیں کھڑے کھڑے پوچھا۔

''تم گنگولی کو کیسے جانتے ہو؟''

میں نے جیب سے گنگولی کا پرچہ نکال کر دے دیا۔ اُس نے پرچے کو بڑی توجہ سے پڑھا۔ ایک بار پھر میرا جائزہ لیا اور پوچھا۔ ''کیا نام ہے تمہارا؟''

میں نے کہا۔ ''شیراز۔''

''کہاں کے رہنے والے ہو؟''

میں نے جواب دیا۔ ''پنجاب کا۔''

''ہوں۔'' وہ دروازے سے ہٹ گیا۔ ''اندر آ جاؤ!''

میں کمرے میں داخل ہو گیا۔ کمرے میں مختصر سا سامان پڑا تھا۔ ایک چارپائی جس پر بستر بچھا تھا۔ دیوار پر اُس کے کپڑے لٹک رہے تھے۔ بمبئی کی عام کھولیوں کی طرح کونے میں ایک دیوار اُونچی کر کے غسل خانہ بنا ہوا تھا۔ ایک بوسیدہ سی چھوٹی میز تھی۔ ایک طرف دو لوہے کی پرانی کرسیاں پڑی تھیں۔

''بیٹھ جاؤ!'' اُس نے مجھے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا اور خود چارپائی پر بیٹھ گیا۔ سرہانے کے نیچے سے کریون اے سگریٹ کا پیکٹ نکالا۔ ایک سگریٹ نکال کر اپنے پاس رکھا اور پیکٹ میری طرف بڑھا دیا۔

''سگریٹ پیتے ہو؟''

میں نے کہا۔ ''کبھی کبھی پی لیتا ہوں۔''

''یہ کبھی کبھی کیا ہوا؟'' اُس نے اکھڑ لہجے میں پوچھا۔ ''آدمی سگریٹ پیتا ہے یا نہیں پیتا۔ لو پیو!'' ماچس کی دیا سلائی جلا کر اُس نے پہلے اپنا سگریٹ سلگایا، پھر میرا سگریٹ سلگا کر بولا۔

''میرا نام عثمان بھائی ہے۔ گنگولی میرا جانی دوست ہے۔ بڑا دلیر آدمی ہے۔ قتل کے کئی مقدموں میں بری ہو چکا ہے۔ قسمت کا دھنی ہے۔ ہر قتل کے بعد ثبوت ایسا غائب کرتا تھا کہ پولیس کو کچھ بھی ہاتھ نہیں آتا تھا۔ اس کی عمر زیادہ نہیں ہے مگر کرتوت بڑے تجربہ کار قاتلوں والے ہیں۔ مجھ پر اُس کے بڑے احسان ہیں۔ اب تو وہ پولیس کا مخبر ہو گیا ہے۔ مگر مخبری صرف بدمعاشوں اور قاتلوں کی کرتا ہے۔ اُس نے آج تک مجھے کبھی کوئی کام کرنے کو نہیں کہا۔ یہ پہلا موقع ہے کہ اُس نے مجھے کہا ہے کہ میں تمہارا کیس غور سے سنوں اور تمہاری ہر طرح سے مدد کروں۔ بولو! تمہارا کیا کام ہے؟ کسی کو قتل کرنا

ہے کیا؟"

عثمان بھائی نے اپنی کھل کر کی ہوئی باتوں سے مجھے اپنی شخصیت کے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ جب اُس نے سرہانے کے نیچے سے کریون اے سگریٹ کا پیکٹ نکالا تھا تو میں وہیں سمجھ گیا تھا کہ اس آدمی کا مزاج اعلیٰ درجے کا ہے۔ کیونکہ کریون اے اُس زمانے میں بڑا مہنگا سگریٹ ہوا کرتا تھا۔ آج کل تو یہ سگریٹ ناپید ہے۔ میں کچھ بولنے لگا تو اُس نے ہاتھ سے رُک جانے کا اشارہ کیا اور بولا۔

"ٹھہرو! پہلے یہ بتاؤ کہ تم نے کھانا کھایا ہے کہ نہیں؟"

میں نے کہا۔" کھانا میں نے دوپہر کو ہی سفر کے دوران کھا لیا تھا۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ چارپائی سے اُٹھتے ہوئے بولا۔"میں چائے کا آرڈر دے دُوں۔"

وہ اُٹھ کر باہر برآمدے میں گیا اور ذرا سا نیچے جھک کر اُس نے آواز دی۔

"بار والا! اُوپر اپن کی کھولی میں دو سپیشل چائے۔ ساتھ بسکٹ پیسٹری بھی لانا۔"

وہ واپس آ کر میرے سامنے چارپائی پر بیٹھ گیا اور سگریٹ کا لمبا کش لگا کر بولا۔

"ہاں! اب بولو کیا کام ہے تمہارا؟ شرمانا بالکل نہیں۔ جھجکنے کی بھی ضرورت نہیں۔ گنگولی نے یونہی تمہیں میرے پاس نہیں بھیجا۔ صاف صاف بتا دو تم کیا چاہتے ہو؟"

میں نے بات شروع کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے ایک لڑکی سے محبت ہے۔ وہ میری منگیتر بھی ہے۔ گنگولی کے علاقے کے ایک بدمعاش رام گوپال نے اُسے اغواء کر کے یہاں بمبئی کے ممبا دیوی کے کسی مندر کی پجارن دُلاری ماتا کے ہاتھ فروخت کر دیا ہے۔ میں اُس کی تلاش کے سلسلے میں تمہارے پاس آیا ہوں۔"

میں نے محسوس کیا کہ دُلاری ماتا کے نام سے عثمان بھائی کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات اُبھر آئے تھے۔ اُس نے پوچھا۔" یہ لڑکی مسلمان ہے کیا؟"

میں نے یہاں جان بوجھ کر جھوٹ بولا اور کہا۔

"نہیں۔ وہ ہندو ہے اور جین مت کی پیروکار ہے۔ مگر وہ اپنی مرضی سے کلمہ پڑھ کر دین اسلام اختیار کر چکی ہے اور ہم ایک دوسرے سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔"

"تو یوں ہوناں کہ لڑکی مسلمان ہے۔" اُس نے سگریٹ کو ایش ٹرے میں بجھاتے

ہوئے کہا۔" لیکن یہ لڑکی تمہیں کیسے اور کہاں مل گئی؟ وہ جینی ہندو لڑکی تم مسلمان...... یہ چکر کیا ہے؟ پہلے مجھے یہ چکر سمجھاؤ پھر میں کچھ آگے کہوں گا۔"

اتنے میں بار والا (بمبئی میں چائے کے ہوٹلوں کو بار کہا جاتا تھا اور چائے لانے والے لڑکے کو بار والا کہہ کر بلایا جاتا تھا) لڑکا چائے لے کر آ گیا۔ ساتھ بسکٹ اور پیسٹری بھی تھی۔ عثمان بھائی نے چائے بنا کر ایک پیالی میرے آگے رکھ دی اور بولا۔

"یہ پیسٹری ضرور کھانا۔ ایسی پیسٹری باندرہ کے علاقے میں اور کہیں نہیں ملتی۔"

میں چائے پینے لگا۔ عثمان بھائی نے چائے کا گھونٹ بھر کر نیا سگریٹ سلگایا اور بولا۔

"اب بتاؤ! اصل کہانی کیا ہے؟"

میں نے مختصر کر کے عثمان بھائی کو اپنی داستان شروع سے آخر تک سنا ڈالی۔ وہ بڑے غور سے سنتا رہا۔ جب میں اپنی بات ختم کر چکا تو وہ سگریٹ کی راکھ چٹکی سے جھاڑ کر بولا۔" تم بہادر لڑکے ہو۔ صحیح پنجابی ہو۔" پھر میری طرف ذرا جھک کر بولا۔" جانتے ہو یہ دُلاری ماتا کیا شے ہے؟"

میں نے اُس کے بارے میں جو سنا تھا اُسے کہہ دیا کہ وہ ممبا دیوی کے مندر کی بڑی پجارن ہے اور نوجوان بے سہارا لڑکیوں کو خرید کر اُنہیں مندر کی دیوداسیاں بنا کر رکھتی ہے۔ اس پر عثمان بھائی کی آنکھوں میں ایک چمک آ گئی۔ کہنے لگا۔

"بس یہی وہ بات ہے جس کی نہ گنگولی کو خبر ہے اور نہ تمہیں کچھ معلوم ہے۔ دُلاری ماتا کے دو رُوپ ہیں۔ اُس کا ایک رُوپ ممبا دیوی کی بڑی پجارن کا ہے۔ مگر اُس کا ایک دوسرا رُوپ بھی ہے جو اُس کا اصل رُوپ ہے اور یہ رُوپ ایک بدمعاش، عیار اور بڑی ہی خطرناک نائیکہ عورت کا ہے جو دیوداسیوں کے نام پر بے آسرا، بے سہارا نوجوان خوبصورت لڑکیوں کو اغواء بھی کرواتی ہے اور انہیں خرید بھی لیتی ہے۔ اور پھر ان کو بمبئی کے اُونچے طبقے کے اُن امیر سیٹھوں کے آگے پیش کرتی ہے جو سوسائٹی میں بظاہر بڑے دھرم آتما اور بگلہ بھگت بن کر رہتے ہیں اور لوگ انہیں شریف سمجھتے ہیں۔ ان میں سیاسی پارٹیوں کے کئی بوڑھے لیڈر بھی شامل ہیں۔ اب تم سمجھ گئے ہو گے کہ میں کیا کہنا چاہتا ہوں۔"

عثمان بھائی کے اس انکشاف پر مجھ پر جیسے بجلی سی گر پڑی تھی۔ میں سناٹے میں آ گیا

تھا اور اُس کا منہ تک رہا تھا۔ کچھ پوچھنے کی ہمت ہی نہیں رہی تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ اُرملا پیشہ ور بدمعاشوں کے ہتھے چڑھ گئی ہے اور اس کی زندگی ایک عبرت ناک انجام کی طرف چل پڑی ہے۔ ایک لمحے کے لئے میرا ذہن بالکل ماؤف ہو گیا۔ اُرملا کی زندگی ایک پاکیزہ عورت کی بے داغ زندگی تھی۔ میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ ایسی عورت کو زبردستی گناہ کی دلدل میں دھکیل دیا جائے گا۔

میں نے عثمان سے کہا۔ ''عثمان بھائی! میں اُرملا کو وہاں سے ہر حالت میں نکالنا چاہتا ہوں۔ تم میری مدد کرو۔''

عثمان چائے کی دوسری پیالی کا آخری گھونٹ حلق میں انڈیل کر بولا۔

''تم کہتے ہو کہ یہ عورت اسلام قبول کر چکی ہے اس اعتبار سے مجھ پر بھی فرض ہو گیا ہے کہ میں ایک شریف اور نومسلم عورت کی زندگی کافروں کے ہاتھوں برباد ہونے سے بچاؤں۔ مجھے تھوڑا وقت دو۔ میں دیکھتا ہوں کہ میں کیا کر سکتا ہوں اور کیا نہیں کر سکتا۔ بہرحال مجھ سے جو کچھ بھی ہو سکا ضرور کروں گا۔ تم کہاں ٹھہرے ہوئے ہو؟''

میں نے جواب دیا۔ ''میں تو ریلوے سٹیشن سے سیدھا تمہارے پاس آ رہا ہوں۔ ابھی میں نے اپنے ٹھہرنے کا کوئی انتظام نہیں کیا۔ کوئی سستا سا ہوٹل دیکھ کر وہاں ایک کمرہ کرائے پر لے لوں گا۔''

اس پر عثمان بولا۔ ''بمبئی میں سستا ہوٹل بھی مہنگا ہوتا ہے۔ ویسے بھی ہوٹل دو ایک دن ٹھہرنے کے لئے ہوتے ہیں اور تمہیں پتہ نہیں کب تک یہاں رہنا پڑ جائے۔''

''دوسری کون سی جگہ ہو سکتی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

وہ بولا۔ ''تم میرے کمرے میں ہی ایک طرف بستر لگا لو۔ کافی جگہ ہے۔ تمہارے لئے ایک چارپائی کہیں سے منگوا لوں گا۔''

چنانچہ میں عثمان بھائی کے پاس ہی ٹھہر گیا۔ وہ شام کو کہیں چلا گیا۔ جاتے ہوئے مجھے کہہ گیا کہ ہو سکتا ہے مجھے دیر ہو جائے۔ تم سامنے والے ہوٹل میں کھانا کھا لینا۔ اُسے گئے ہوئے کافی دیر ہو گئی۔ میں اُس کے کمرے میں ہی بیٹھا اُرملا کے بارے میں سوچتا رہا۔ اُس کی دی ہوئی انگوٹھی میری اُنگلی میں تھی اور اُس کا سنہری رنگ اب سیاہ پڑ چکا تھا۔ جب رات کے دس بج گئے اور عثمان نہ آیا تو میں کھانا کھانے سامنے والے ہوٹل

میں آ گیا۔ کھانا کھا کر میں نے بل ادا کرنا چاہا تو ہوٹل کے مالک نے کہا۔

''تم عثمان بھائی کے مہمان ہو مجھے معلوم ہے۔ عثمان بھائی ہمیں کہہ گیا ہے کہ تم سے ہم بل کے پیسے نہ لیں۔''

میں نے بل ادا کرنے پر اصرار کیا تو ہوٹل کا مالک ہاتھ جوڑ کر بولا۔

''کیوں ہمیں مرواؤ گے عثمان بھائی سے۔ جو چیز چاہے کھاؤ پیو اس کا بل عثمان بھائی کے حساب میں جمع ہو جائے گا۔''

عثمان بھائی رات کو ایک بجے کے قریب آیا۔ میں جاگ رہا تھا۔ آتے ہی بولا۔

''تم نے کھانا کھا لیا؟''

میں نے کہا۔ ''ہاں کھا لیا تھا۔ مگر ہوٹل والے نے بل نہیں لیا۔ یہ اس تکلف کی کیا ضرورت تھی؟''

''تکلف کیسا؟'' عثمان چارپائی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''تم میرے مہمان ہو۔ آئندہ بل کی بات نہ کرنا۔ اور سنو! میں نے کچھ معلومات حاصل کی ہیں۔''

میں پوری طرح متوجہ ہو گیا۔ ''جلدی بتاؤ بھائی۔''

اُس نے سگریٹ سلگا لیا اور کہنے لگا۔

''تمہاری منگیتر دُلاری ماتا کے پاس ہی ہے۔ مگر ممبا دیوی کے مندر میں نہیں ہے۔ دُلاری ماتا نے اُسے سیتا کنڈ والے مندر میں پہنچا دیا ہے۔ مگر یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اُرملا کو دُلاری ماتا نے مندر میں کس جگہ رکھا ہوا ہے؟ جس آدمی نے مجھے یہ ساری باتیں بتائی ہیں وہ سیتا کنڈ والے مندر کا بھیدی ہے۔ اُس کا کہنا ہے کہ میں نے مندر کی ساری گھپائیں چھان ماری ہیں مگر مجھے کوئی ایسی عورت یا لڑکی نہیں ملی جو نئی وہاں آئی ہو۔ سب کی سب پرانی عورتیں ہیں اور وہ ان سب کو جانتا ہے۔''

''پھر اب کیا کریں؟'' میں نے مایوس ہو کر پوچھا۔

عثمان بولا۔ ''سیتا کنڈ مندر کے اس بھیدی نے ایک اور بات بھی بتائی ہے۔ اُس نے بتایا ہے کہ سیتا کنڈ مندر سے چھ کوس کے فاصلے پر رانی کی پاٹھ شالہ ہے۔ راجپوت راجاؤں کے زمانے میں یہاں ایک رانی نے ایک پاٹھ شالہ یعنی سکول بنایا ہوا تھا جہاں ہندو دھرم کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اب یہ حویلی کھنڈر بن چکی ہے۔ میرے آدمی نے بتایا

ہے کہ اُسے پورا یقین ہے کہ دُلاری ماتا نے تمہاری منگیتر اُرملا کو اُس حویلی کے کھنڈر میں رکھا ہوا ہے۔ وہاں دُلاری ماتا خاص خاص لڑکیوں کو رکھتی ہے اور رات کی تاریکی میں بوڑھے، بدمعاش، سیاسی لیڈر اور امیر سیٹھ وہاں عیاشی کرنے آتے ہیں۔ یہ لڑکیاں ناچ گانے سے اُن کا دل بہلاتی ہیں۔''

میں نے کہا۔''یہ حویلی کس جگہ پر واقع ہے؟ میں جان کی بازی لگا کر اُرملا کو وہاں سے نکال لاؤں گا۔''

عثمان بھائی سگریٹ کا کش لگا کر ہنس پڑا۔ بولا۔

''تم ابھی تک سمجھ نہیں سکے کہ دُلاری ماتا کیا شے ہے۔ وہ بمبئی کے ڈی آئی جی پولیس سے کم نہیں ہے۔ بڑے بڑے سرکاری افسر اُس کی مٹھی میں ہیں۔ اوّل تو کوئی غیر آدمی اس طرف کا رُخ ہی نہیں کرتا۔ اگر وہاں جانے کی غلطی کر بیٹھتا ہے تو پھر اُس کی لاش بھی نہیں ملتی۔''

میں نے کہا۔''مجھے اپنی جان کی پرواہ نہیں ہے۔ اگر تمہیں یقین ہے کہ اُرملا اسی حویلی میں ہے تو پھر مجھے وہاں جانے سے کوئی نہیں روک سکتا۔''

عثمان بھائی نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر دو بار تھپتھپایا اور بولا۔''شانتی میرے بھائی شانتی۔ اتنے جوش میں آنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

میں نے کہا۔''لیکن عثمان بھائی! میں یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ میری منگیتر ایک بدمعاش عورت کے اڈے پر تشدد کا شکار ہو رہی ہو اور میں یہاں ہاتھ پر ہاتھ دھرے تمہارے پاس بیٹھا رہوں۔''

''میرے بھائی! تمہیں کہا ناں کہ دُلاری ماتا کے ہاتھ بڑے لمبے ہیں۔ اُس کی پہنچ بڑی دُور تک ہے۔ وہ مجرم کو پھانسی کے تختے پر پہنچا بھی سکتی ہے اور اُسے پھانسی کے تختے سے اُتار بھی سکتی ہے۔ اور اب تو اُس کی اپنی حکومت بن گئی ہے۔ یعنی ہندوستان آزاد ہو چکا ہے۔ انگریز چلا گیا ہے جو انصاف کرتا تھا۔ اُس کی جگہ اب ہندو برہمن کا راج ہے جو مسلمانوں کا ازلی دشمن ہے۔ اس لئے میں تمہیں وہاں جانے کا مشورہ نہیں دُوں گا۔''

میں نے عثمان بھائی کا ہاتھ تھام کر بڑی عاجزی سے کہا۔''میں تمہارا ساری زندگی

احسان مند رہوں گا عثمان بھائی! خدا کے لئے مجھے صرف اتنا بتا دو کہ یہ رانی کی پاٹھ شالہ والی حویلی کس جگہ پر ہے؟''

عثمان بھائی نے مجھے حویلی کا پورا پتہ تو سمجھا دیا مگر ساتھ ہی بولا۔

''میں تمہیں اکیلے وہاں جانے کا مشورہ نہیں دُوں گا۔ مجھے ذرا سوچنے کا موقع دو۔ میں کوئی نہ کوئی راستہ نکال لوں گا۔''

مگر میں اکیلے ہی اُرملا کی تلاش میں نکلنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ صرف عثمان بھائی کا دل رکھنے کے لئے کہا۔''ٹھیک ہے۔ جیسے تمہاری مرضی۔''

اسی لمحے میں نے اُرملا کی تلاش کی مہم کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ اس مہم پر نکل پڑنے کا فیصلہ تو میں کر چکا تھا اب میں صرف یہ جائزہ لے رہا تھا کہ مجھے اس مہم پر کس کس چیز کی ضرورت پڑ سکتی ہے؟ اُرملا بدمعاشوں، جرائم پیشہ لوگوں اور قاتلوں کے قبضے میں تھی۔ بمبئی کی پولیس ان بدمعاشوں کی پشت پناہ تھی۔ دُلاری ماتا ظاہر ہے اکیلی یہ اڈہ نہیں چلاتی ہو گی۔ اُس نے غنڈے بھی ضرور پال رکھے ہوں گے جو وہاں پر موجود عورتوں کی کڑی نگرانی کرتے ہوں گے۔ وہاں جانے کے لئے اسلحہ کی اشد ضرورت تھی۔ اور کچھ نہیں تو کم از کم ایک پستول تو ضرور پاس ہونی چاہئے تھی۔ مگر میرے پاس ایک چھوٹا سا چاقو بھی نہیں تھا۔ عثمان بھائی سے اگر پستول مانگتا ہوں تو وہ سمجھ جائے گا کہ میں دُلاری ماتا کے خطرناک اڈے کا رُخ کرنے والا ہوں اور وہ مجھے ہرگز نہیں جانے دے گا۔

اُس رات بستر پر لیٹا میں یہی کچھ سوچتا رہا۔ آخر میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں بغیر اسلحہ کے ہی جاؤں گا۔ آگے جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ صبح اُٹھ کر میں نے ہوٹل میں بیٹھ کر ناشتہ کیا۔ عثمان بھائی حسبِ معمول اپنے کسی کام پر جا چکا تھا۔ میں باندرہ کے علاقے کی ایک مارکیٹ میں آ گیا۔ فادر فرانسس کے دیئے ہوئے کافی پیسے میری جیب میں تھے۔ میں نے ایک چاقو خرید لیا۔ یہ چاقو اس چاقو سے چھوٹا تھا جو کمانڈو اپنے پاس رکھتے ہیں اور عام چاقوؤں سے ذرا بڑا تھا۔ اس کی ایک طرف باریک دندانے تھے اور دوسری طرف بڑی تیز دھار تھی۔ وہ بند ہو جاتا تھا۔

اُرملا کی محبت نے مجھے کچھ ایسا دیوانہ بنا دیا ہوا تھا کہ میں بغیر سوچے سمجھے، بغیر پیش

آنے والے خطرناک حالات پر غور کئے ڈلاری ماتا کی حویلی کی طرف روانہ ہو گیا۔ عثمان بھائی کا دیا ہوا ایڈریس میں نے ایک کاغذ پر لکھ لیا تھا۔ اس نے سارا محل وقوع مجھے سمجھا دیا تھا۔ اس وقت دن کے نو سوا نو بجے کا وقت تھا۔ بمبئی سے لوکل ٹرینیں ایک علاقے سے دوسرے علاقے تک ہر وقت چلتی رہتی ہیں۔ ڈلاری ماتا کی حویلی (میں اس حویلی کو اسی نام سے پکاروں گا کیونکہ اس پر ڈلاری ماتا کا قبضہ تھا) بمبئی سے جنوب میں پونا کی طرف جاتے ہوئے راستے میں کھیل واڑی کا ایک سٹیشن آتا ہے، وہاں سے چند فرلانگ آگے ایک گنجان جنگل میں واقع تھی۔ میں نے بمبئی کے سنٹرل سٹیشن سے پونا شہر کا ٹکٹ خریدا اور اپنے انجانے اور خطرناک سفر پر روانہ ہو گیا۔ سارا دن ٹرین چلتی رہی۔ رات کا اندھیرا پھیل رہا تھا کہ میں کھیل واڑی کے سٹیشن پر اُتر گیا۔ غیر معمولی سا دیہاتی سٹیشن تھا۔ صرف میں ہی ایک مسافر تھا جو اس سٹیشن پر اُترا۔ مجھے سمجھا دیا گیا تھا کہ سٹیشن سے نکل کر کس طرف جانا ہے؟ میں اندازے سے اُسی طرف چل پڑا۔ دو تین فرلانگ چلا ہوں گا کہ ایک جنگلاتی علاقہ شروع ہو گیا۔

مجھے بتایا گیا تھا کہ اسی جنگل کے اندر کسی جگہ ڈلاری ماتا کی پراسرار حویلی ہے جہاں چند ایک دوسری جوان اور خوبصورت لڑکیوں کے ساتھ اُرملا کو بھی رکھا گیا ہے۔ جنگل اتنا گھنا نہیں تھا۔ اندھیرا گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ میں ان اندھیروں میں چلنے کا عادی ہو گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد مشرق کی طرف سے چاند نمودار ہوا اور اُس کی روشنی میں مجھے جھاڑ جھنکاڑ، جھاڑیاں اور درخت صاف نظر آنے لگے۔ جنگل کا ایک ٹکڑا ختم ہوا تو چٹانی زمین آ گئی۔ بڑی بڑی بھوری چٹانیں بھوتوں کی طرح سر اُٹھائے کھڑی تھیں۔ اس کے بعد پھر جنگل شروع ہو گیا۔ اب میں چلتے چلتے رُک کر دائیں بائیں دیکھ لیتا تھا۔ کیونکہ اسی علاقے میں کہیں ڈلاری ماتا کی پراسرار حویلی تھی۔ چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ جنگل میں ہیبت ناک سناٹا چھایا ہوا تھا۔ مجھے صرف کسی درندے کا ڈر تھا۔ کیونکہ شیر چیتے عام طور پر رات کے وقت شکار کی تلاش میں نکلتے ہیں۔ چلتے چلتے میں تھک گیا۔ ایک چھوٹی سی ندی آ گئی۔ میں وہاں بیٹھ گیا۔ ندی کا پانی پیا اور پھیکی پھیکی مگر صاف چاندنی میں درختوں کا جائزہ لینے لگا۔ ابھی تک مجھے کوئی حویلی وغیرہ دکھائی نہیں دی تھی۔

اچانک مجھے کسی عورت کی چیخوں کی آواز سنائی دی۔ میں ڈر کر ایک درخت کے

پیچھے چھپ گیا اور جدھر سے چیخوں کی آواز آئی تھی اُس طرف آنکھیں پھاڑے دیکھنے لگا۔ پہلا خیال جو مجھے آیا وہ کسی چڑیل کا تھا۔ رات کے وقت جنگل میں چیخیں مارنے والی کوئی چڑیل ہی ہو سکتی تھی۔ مجھے کچھ فاصلے پر دو آدمی نظر آئے جو ایک عورت کو بازوؤں سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے میری جانب لئے آ رہے تھے۔ ضرور یہ ڈاکو ہوں گے اور اس عورت کو کہیں سے اغوا کر کے جنگل میں لائے ہیں۔ اُن کے پاس اسلحہ بھی ہو گا۔ میرے پاس سوائے چاقو کے اور کچھ نہیں تھا۔ اگر میں نے اس عورت کو بچانے کی کوشش کی تو ڈاکو مجھے گولی مار دیں گے۔ میں نے صرف اتنا کیا کہ اپنی جان بچانے کی خاطر اُس درخت سے نکل کر ایک چھوٹی سی چٹان کی اوٹ میں ہو کر بیٹھ گیا۔ دونوں آدمی عورت کو لے کر اُسی درخت کے نیچے آ گئے جہاں تھوڑی دیر پہلے میں چھپا ہوا تھا۔ چاندنی میں مجھے دونوں مرد اور عورت اب صاف نظر آ رہی تھی۔ عورت جوان تھی اور اُس نے ساڑھی پہنی ہوئی تھی۔ بال کھلے تھے۔ مردوں نے سروں پر مفلر لپیٹے ہوئے تھے۔ ایک کے ہاتھ میں پستول تھا۔ عورت چیخ چلا رہی تھی۔ پستول والے مرد نے اُسے زمین پر گرا دیا اور پستول اُس کے سر کے ساتھ لگا کر بولا۔

''اب آواز نکالی تو گولی مار دوں گا۔''

عورت نے چلانا بند کر دیا مگر وہ کانپتی ہوئی آواز میں اُن سے رحم کی بھیک مانگ رہی تھی۔ میرے دل میں اُس عورت کے لئے ایک دم سے ہمدردی کا جذبہ بیدار ہو گیا۔ مگر میں اپنی جان خطرے میں ڈال کر اُسے نہیں بچا سکتا تھا۔ یہ خیال بھی آیا کہ ہو سکتا ہے عورت بھی ان مردوں کی طرح جرائم پیشہ ہو۔ میری نگاہیں دونوں مردوں اور عورت کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھیں۔ جس مرد کے ہاتھ میں پستول تھا وہ عورت کے قریب ہی پستول تانے کھڑا تھا۔ دوسرا آدمی ہاتھ پاؤں چلاتی عورت کو دبوچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ عورت نے روتے ہوئے کہا۔

''خدا کے لئے مجھ پر رحم کرو!''

ایک دم سے میرے اندر جیسے کوئی بہت بڑا پہیہ گردش کرنے لگ پڑا۔ میرا جسم غصے سے کھول اُٹھا۔ یہ عورت مسلمان تھی۔ میں نے جیب سے چاقو نکال کر کھولا اور اُسے ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑ لیا۔ میں انجام سے بے خوف ہو کر اُن بدمعاشوں پر جھپٹنے ہی

والا تھا کہ جو آدمی عورت کو دبوچے ہوئے تھا اُس نے اپنے پستول والے ساتھی سے کہا۔

''اس طرف جا کر خیال رکھو! کوئی آ نہ جائے۔''

پستول والا آدمی یہ سن کر میری طرف آنے لگا۔ میں جلدی سے چٹان سے ہٹ کر جھاڑی کے پیچھے ہو گیا۔ پستول والا آدمی چٹان کی اوٹ میں آ کر بیٹھ گیا۔ وہ مجھ سے اتنا قریب تھا کہ مجھے چاند کی روشنی میں اُس کے ماتھے پر آیا ہوا پسینہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ میرے اندر ایک دھماکہ سا ہوا اور میں لیٹ کر اُس کی طرف رینگنے لگا۔ عورت کے چیخنے چلانے کی آوازیں گونج رہی تھیں اور دوسرا آدمی اُس کا منہ بند کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

پستول والے آدمی کا فاصلہ جب مجھ سے پانچ فٹ کے قریب رہ گیا تو میں نے اُس پر چھلانگ لگا دی اور اس سے پہلے کہ وہ آواز نکالے یا پستول کا فائر کرے میں نے اُس کے گلے پر پوری طاقت سے چاقو پھیر دیا۔ میرے ہاتھ پر اُس کے کٹے ہوئے گلے میں سے اُبلتا ہوا گرم گرم خون گرا۔ میں نے اُس کے دوسرے ہاتھ میں پکڑا ہوا پستول چھین لیا اور جلدی سے جھاڑی کی اوٹ میں ہو گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ گلے پر چھری پھرنے کے بعد اُس آدمی کے حلق سے بڑی ڈراؤنی سی آواز نکل رہی تھی جس کو سن کر دوسرے آدمی نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا تھا۔ اُس نے اپنے ساتھی کا کوئی نام لے کر آواز دی۔ دو تین بار آواز دینے کے بعد جب کوئی جواب نہ ملا تو اُس نے زمین پر پڑی عورت کو کھلے بالوں سے پکڑ کر اُٹھایا اور اُسے گھسیٹتا ہوا اُس چٹان کی طرف آیا جہاں اُس کے ساتھی کی لاش پڑی تھی۔ چاندنی میں سب کچھ نظر آ رہا تھا۔ جیسے ہی اُسے اپنے ساتھی کی خون آلود لاش نظر آئی وہ عورت کو دبوچ کر وہیں بیٹھ گیا۔ صدری کی جیب میں سے پستول نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ لاش کو دیکھ کر عورت کا ڈر کے مارے برا حال ہو رہا تھا۔ دوسرے آدمی نے اُس کی گردن میں بازو ڈال کر دبوچ رکھا تھا۔ میں پستول پکڑے جھاڑی کے پیچھے چھپا اُسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ پھر ایسا ہوا کہ میں جس پتھر پر پاؤں ٹکا کر بیٹھا ہوا تھا اچانک وہ پتھر کھسک گیا۔ اُس کی آواز پر اس آدمی نے چونک کر اس جھاڑی کی طرف دیکھا جس کے پیچھے میں چھپ کر بیٹھا تھا۔ وہ بجلی کی تیزی کے ساتھ عورت کو گھسیٹتا ہوا میری طرف بڑھا۔ اُس کی پستول کا رُخ میری

طرف تھا۔

اب میری موت یقینی تھی۔ لیکن پستول میرے ہاتھ میں بھی تھا۔ جیسے ہی وہ جھاڑی سے تین فٹ کے فاصلے پر آیا، میں نے اُس کے سر کا نشانہ لے کر فائر کر دیا۔ جنگل پستول کے دھماکے سے گونج اُٹھا۔ کچھ پرندے شور مچاتے درختوں پر سے پھڑ پھڑاتے ہوئے اُڑ گئے۔

پستول کی گولی اُس آدمی کی کھوپڑی کو توڑتی ہوئی دوسری طرف نکل گئی تھی۔ وہ دھڑ سے گر پڑا اور ساکت ہو گیا۔ عورت زمین پر بیٹھ گئی اور مٹھیاں بھینچ کر بلبلانے لگی۔ میں جلدی سے جھاڑی میں سے نکل کر اُس کے پاس گیا اور اُسے بازو سے پکڑ کر اپنے ساتھ دوڑاتا ہوا کافی دُور لے گیا اور اُسے اپنے ساتھ زمین پر بٹھا لیا۔ اُس کی گھگھی بندھی ہوئی تھی۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے دو آدمیوں کا خون ہو گیا تھا۔ دہشت کے مارے اُس کا برا حال تھا۔ میں نے اُسے حوصلہ دیا اور کہا۔

''ڈرو نہیں۔ اب تمہیں کوئی کچھ نہیں کہے گا۔''

میں اُسے پیچھے ندی پر لے آیا۔ اُسے اوک سے پانی پلایا۔ خود بھی اپنے ہاتھ پر لگا ہوا خون صاف کیا، پانی کے دو گھونٹ پیئے۔ عورت کی حالت پانی پینے اور میری ہمدردانہ باتوں سے سنبھل گئی تھی۔ مگر وہ ابھی تک کافی ڈری ہوئی تھی۔ میں نے اُس سے پوچھا۔

''تم کون ہو؟ یہ لوگ کون تھے اور تمہیں کہاں سے پکڑ کر لائے تھے؟''

عورت سے ابھی تک بات نہیں ہو رہی تھی۔ بڑی مشکل سے اُس کے منہ سے صرف اتنا نکل سکا۔ ''خدا کے لئے مجھے یہاں سے دُور لے جاؤ۔''

میں نے اُسے سہارا دے کر اُٹھایا اور ندی کے دوسرے کنارے کی طرف چلنے لگا۔ میں نے چلتے چلتے اُس سے پوچھا۔ ''تم مسلمان ہو؟''

''ہاں۔'' اُس نے خشک آواز میں جواب دیا۔

کافی دیر چلنے کے بعد میں نے ایک جگہ بیٹھنے کا خیال ظاہر کیا تو وہ بولی۔

''نہیں نہیں۔ یہاں وہ لوگ آ جائیں گے۔''

''کون لوگ؟'' میں نے پوچھا۔ ''وہ تو دونوں مر چکے ہیں۔''

''اور لوگ بھی ہیں۔ وہ ہم دونوں کو مار ڈالیں گے۔''

میں جس مہم پر آیا تھا مجھے اس کی بھی فکر تھی اور جنگل کے اس حصے سے دُور نہیں جا
چاہتا تھا۔ کیونکہ جس حویلی میں مجھے بتایا گیا تھا کہ اُرملا قید ہے وہ حویلی اس جنگل میر
تھی۔ لیکن اس مسلمان عورت کو میں اکیلی بھی نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ عورت اب مجھ سے ایک
قدم آگے ہو کر چل رہی تھی اور چاند کی پھیکی روشنی میں جنگل کا جائزہ بھی لیتی جا رہی تھی۔
ایسے لگ رہا تھا کہ وہ اس جنگل کے نشیب و فراز سے واقف ہے۔ جب ہم چلتے چلتے
کافی دُور نکل آئے تو میں نے کہا۔

''تم کہاں جانا چاہتی ہو؟ مجھے بتاؤ! میں تمہیں وہاں چھوڑ آؤں گا۔''

عورت رُک گئی اور سہمی ہوئی نظروں سے ایک طرف دیکھنے لگی۔ اُس نے ایک
طرف جہاں کچھ فاصلے پر تین چار اُونچے اُونچے درخت تھے اشارہ کیا اور بولی۔

''اُس طرف چلو!''

میں اُس طرف چل پڑا۔ اس مصیبت زدہ مسلمان عورت کو میں کسی محفوظ جگہ پہنچا کر
ہی واپس اُرملا کی تلاش میں جا سکتا تھا۔ جن درختوں کی طرف اُس نے اشارہ کیا تھا ان
درختوں کے پیچھے ایک دیو ہیکل سیاہ چٹان کھڑی تھی۔ اب وہ مجھ سے آگے آگے چلنے لگی
تھی۔ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ وہ ان راستوں کو جانتی ہے۔

ہم چٹان کے پیچھے آ گئے۔ چٹان کے پیچھے ایک بڑی گہری کھڈ تھی۔ چاندنی میں کھڈ
کے اندر کافی گہرائی میں اُگی ہوئی جھاڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ تین چار فٹ کی چوڑی پتھریلی
پٹی چٹان کی ڈھلان کے ساتھ ساتھ چلی گئی تھی۔ عورت وہاں آ کر رُک گئی اور بولی۔

''میرے پیچھے آ جاؤ!''

وہ چٹان کی ڈھلان کے ساتھ لگ کر تین چار فٹ کی پگڈنڈی پر آہستہ آہستہ سنبھل
سنبھل کر قدم رکھتی چلنے لگی۔ میں بھی چٹان کی دیوار کے ساتھ لگ کر پھونک پھونک کر
قدم رکھتا اُس کے پیچھے چل پڑا۔ میری ایک طرف سیاہ چٹان کی دیوار تھی جو اُوپر چٹان
کی مخروطی چوٹی تک اُٹھتی چلی گئی تھی اور دوسری طرف گہری کھڈ تھی۔ خوف کی سرد لہر
ایک بار تو میرے بدن میں بھی دوڑ گئی۔ مگر میں عورت کے پیچھے چلتا گیا۔

OOO

کچھ دُور تک ہم اسی طرح چٹان کی دیوار کو پکڑ پکڑ کر چلتے رہے۔

آگے ایک جگہ جا کر چٹانی پگڈنڈی نیچے گہرے کھڈ میں اُتر گئی تھی۔ عورت میرے
آگے چل رہی تھی۔ وہ نیچے اُتری تو میں بھی اُس کے ساتھ نیچے اُترنے لگا۔ ہم نیچے کھڈ
میں آ گئے۔ یہاں سرکنڈے اُگے ہوئے تھے۔ لڑکی میرے آگے آگے چلتی کھڈ میں کافی
دُور لے گئی۔ وہاں کھڈ کی دیوار میں ایک راستہ اُوپر کو جاتا تھا۔ وہ اُوپر چڑھنے لگی۔ ہم
کھڈ کی دوسری طرف اُوپر نکل آئے۔ میں تھک گیا تھا۔ وہ عورت یا لڑکی کا سانس بھی
پھول رہا تھا۔ ہم ایک جگہ بیٹھ گئے۔ میں نے اُس سے پوچھا۔

''تم کہاں جا رہی ہو؟''

اُس نے سانس درست کرتے ہوئے کہا۔ ''بس یہ سامنے والے ٹیلے تک جانا ہے۔''

میں چپ ہو گیا۔ وہ کہنے لگی۔ ''تم اُن لوگوں کو نہیں جانتے۔ وہ سب کے سب قاتل
لوگ ہیں۔ پستول کی آواز سن کر وہ ضرور نکل آئے ہوں گے۔ اُنہوں نے اپنے ساتھیوں
کی لاشیں بھی دیکھ لی ہوں گی۔ اُنہیں یہ بھی پتہ چل گیا ہو گا کہ میں سیتا کنڈ کے آشرم
میں نہیں ہوں۔ اُنہوں نے ہمیں پکڑ لیا تو میرے ساتھ وہ تمہیں بھی قتل کر دیں گے۔''

سیتا کنڈ کا نام سن کر میرے کان کھڑے ہو گئے۔ میں نے پوچھا۔

''یہ سیتا کنڈ کس بلا کا نام ہے؟ یہ کس جگہ پر ہے؟''

عورت بولی۔ ''تمہیں کیا بتاؤں یہ کیا بلا ہے اور کہاں ہے۔ ابھی یہاں سے اُٹھ
چلو۔ سامنے والے ٹیلے میں ایک محفوظ جگہ ہے۔ وہاں تک وہ لوگ شاید نہیں آئیں گے۔''

دو سو گز کے فاصلے پر ایک ٹیلہ تھا۔ اُس کے اندر ایک قدرتی غار تھا جس کا دہانہ جنگلی
جھاڑیوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ وہ عورت مجھے اُس غار کے اندر لے گئی۔ ہم غار میں
ایک جگہ بیٹھ گئے۔ میں نے اُس سے سوال کیا۔

''اب بتاؤ! تم کون ہو؟ یہ لوگ کون ہیں اور یہ سیتا کنڈ کہاں پر ہے؟''

میں نے اُسے بالکل نہ بتایا کہ میں کس مہم پر نکلا ہوا ہوں۔ یہ بتانے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ سیتا کنڈ کے نام سے میرے کان ضرور کھڑے ہوئے تھے کیونکہ یہ آواز میرے کان میں پہلے پڑ چکی تھی کہ سیتا کنڈ دُلاری ماتا کی پراسرار حویلی کے کہیں آس پاس ہی ہے۔ اُس نے کہا۔

''میرا نام جمیلہ ہے۔ ہمارا گاؤں گویت ہے جو ہردہ ضلع ہوشنگ آباد سے پچاس میل پر واقع ہے۔ میری شادی کو ڈیڑھ سال ہوا ہے۔ میرا خاوند جنگل میں کٹائی کی مزدوری کرتا ہے۔ میں دوپہر کو اُس کے لئے روٹی لے کر جاتی تھی۔ ایک دن میں اُس کے لئے روٹی لے کر جا رہی تھی کہ اچانک درختوں میں سے تین چار آدمی نکلے۔ اُنہوں نے میرے سر پر چادر ڈال کر مجھے دبوچ لیا اور اُٹھا کر لے گئے۔ چادر کے اندر میری چیخ و پکار کی آواز نہیں نکل رہی تھی۔ ویسے بھی جنگل میں میری چیخ و پکار سننے والا کوئی نہیں تھا۔ مجھے اتنا یاد ہے کہ ان لوگوں نے مجھے ایک موٹر گاڑی میں ڈالا تھا۔ اس کے بعد میں بیہوش ہو گئی تھی۔ ہوش آیا تو معلوم ہوا کہ میں ایک ایسے پنجرے میں قید ہو گئی ہوں کہ جس کی دیواریں لوہے کی ہیں اور جس میں داخل ہونے کا تو راستہ ہے مگر باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ اُس پنجرے میں میرے علاوہ اور بھی چھ سات لڑکیاں تھیں جو سب جوان، صحت مند اور خوش شکل تھیں۔ بعد میں پتہ چلا کہ مجھے بھی اسی واسطے اغوا کر کے وہاں لایا گیا تھا کہ میں بھی جوان، صحت مند اور خوبصورت تھی اور سارے گاؤں میں میرے گورے رنگ اور خوبصورت جسم کے چرچے تھے......''

وہ عورت یا لڑکی...... میں اُسے لڑکی ہی کہوں گا۔ کیونکہ اُس کی عمر اس وقت بھی بیس اکیس سال سے زیادہ نہیں تھی اور وہ واقعی خوبصورت تھی۔ چاندنی رات میں اُس کا گورا رنگ سنگ مرمر کی طرح روشن روشن لگ رہا تھا۔ مگر میں تو اُرملا کے تیر نگاہ کا شکار تھا اور اُرملا کے سوا کوئی دوسری عورت میرے دل پر اثر نہیں کر سکتی تھی۔ میں سیتا کنڈ کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کو بے تاب تھا اور وہ اپنا قصہ لے بیٹھی تھی۔ میں اس حقیقت سے بے خبر تھا کہ اس قصے کی ایک ایک تفصیل میرے لئے کس قدر ضروری تھی۔

وہ ذرا سانس لینے کو رُکی تو میں نے اُس کی بات کاٹ کر پوچھا۔ ''جمیلہ بی بی! مجھے یہ

بتاؤ کہ یہ سیتا کنڈ کوئی تالاب ہے یا کوئی پرانی گپھا یا مندر ہے؟''

اُس نے جواب میں کہا۔ ''میں وہی تمہیں بتانے والی ہوں۔ سیتا کنڈ نہ تو کوئی تالاب ہے نہ ایسا مندر کہ جہاں صبح شام مورتی پوجا ہوتی ہو۔ یہ اُس حویلی کے کھنڈر کی چار دیواری کے اندر بنی ہوئی ایک چار دیواری ہے جس میں چھوٹی چھوٹی کوٹھڑیاں ہیں اور درمیان میں ایک بڑی کوٹھڑی ہے جہاں رات کو باری باری سب لڑکیوں کو ایک نائکہ عورت ناچنے گانے کے گر بھی سکھاتی ہے اور یہ بھی بتاتی ہے کہ ایسے کروڑ پتی بوڑھوں کو، جو کبھی طوائف کے کوٹھے پر نہیں گئے کیسے اس مہارت سے لبھایا جاتا ہے کہ پھر وہ کسی کام کے نہیں رہتے اور عورت کے ابرو کے ایک اشارے پر اپنا سب کچھ لٹا ڈالتے ہیں۔''

وہ دوسری سانس لینے کو رُکی تو میں نے اپنے تجسس کی خاطر پوچھا کہ اس حویلی کے کھنڈر کا نام کیا ہے؟ وہ کہنے لگی۔

''وہ راجوں مہاراجوں کے زمانے کی کسی عمارت کا کھنڈر ہے۔ پرانا نام پتہ نہیں کیا ہوگا؟ اب اُسے دُلاری ماتا کی حویلی کہتے ہیں۔''

میں یوں چونک اُٹھا جیسے میرے اُوپر سے کوئی سانپ گزر گیا ہو۔ میں بے اختیار پکار اُٹھا۔ ''کیا تم دُلاری ماتا کی حویلی میں رہتی تھیں؟''

''ہاں۔'' جمیلہ نے حیران ہو کر میری طرف دیکھا۔ غار میں اتنا اندھیرا نہیں تھا۔ اُس کے دہانے کے اُوپر سے جھاڑیوں کی پتلی شاخوں میں سے چاندنی کی مدھم روشنی اندر آ رہی تھی۔ وہ بولی۔

''کیا تم وہاں گئے ہو؟''

میں نے اُس کے سوال کو نظر انداز کر دیا اور اضطراب کے ساتھ پوچھا۔

''اُس حویلی میں اور کتنی عورتیں ہیں؟''

اُس نے کہا۔ ''پانچ چھ عورتیں ہیں۔ مگر تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟''

میں نے بے چینی سے پوچھا۔ ''کیا وہاں اُرملا نام کی بھی کوئی عورت ہے؟ اُس کا رنگ گورا ہے۔ آنکھیں بڑی بڑی ہیں اور وہ جین مت کی ماننے والی ہے۔''

''ہاں ہے...... تم اُسے کیسے جانتے ہو؟''

میرے وہم میں بھی یہ خیال نہیں تھا کہ جولڑکی اتفاق سے مجھے ایک حادثے کی وجہ سے مل گئی ہے اور جو میرے سامنے بیٹھی اپنی داستانِ غم سنا رہی ہے اور جس کی داستان سے میں سخت بور ہو رہا تھا وہ مجھے اُس گوہر گم گشتہ کا پتہ بتا دے گی جس کی تلاش میں، میں مارا مارا پھر رہا تھا۔ میں نے اصل حقیقت بتانے کی ضرورت نہ سمجھی اور اُسے صرف اتنا ہی کہا۔

''اُرملا میرے ایک دوست کی منگیتر ہے اور وہ بھی تمہاری طرح اغوا ہو گئی تھی۔ میں اُسی کی تلاش میں اس جنگل میں آیا تھا کہ تم سے ملاقات ہو گئی۔''

جمیلہ میری طرف گھور کر دیکھ رہی تھی۔ تھی تو وہ گاؤں کی سیدھی سادی عورت مگر لگتا تھا کہ دُلاری ماتا کی حویلی کے ماحول اور وہاں کی تجربہ کار نائیکہ کی صحبت نے اُسے بہت ہوشیار بنا دیا تھا۔ کہنے لگی۔

''سچ سچ بتاؤ! کیا بات ہے؟ کیا تم اُس سے محبت کرتے ہو؟''

مجھے اُرملا کے بارے میں زیادہ معلومات حاصل کرنے کی بے چینی تھی۔ میں نے کہہ دیا۔ ''چلو تم یہی سمجھ لو۔ مگر یہ بتاؤ کہ اس حویلی میں اُسے کس جگہ رکھا گیا ہے؟ اور کیا کسی وقت اُسے باہر بھی لایا جاتا ہے؟''

جمیلہ نے اُلٹا مجھ سے سوال کر دیا۔ ''کیا تم ہندو ہو؟''

میں نے کہا۔ ''نہیں...... میں ہندو نہیں ہوں۔ میں مسلمان ہوں۔''

''مگر اُرملا تو ہندو ہے۔'' وہ بولی۔

میں نے کہا۔ ''محبت رنگ اور دھرم کو نہیں دیکھتی۔ میرے دوسرے سوال کا جواب تم نے نہیں دیا۔ کیا کسی وقت اُرملا کو حویلی سے باہر بھی لایا جاتا ہے؟''

جمیلہ کہنے لگی۔ ''بالکل نہیں۔ وہاں سے کسی لڑکی کو باہر نکلنے کی اجازت نہیں ہے۔''

میں نے فوراً کہا۔ ''مگر تم کیسے باہر نکل آئی تھیں؟''

اُس نے جواب دیا۔ ''میں خود نہیں آئی تھی۔ مجھے وہ دو آدمی جنگل میں یہ کہہ کر اپنے ساتھ لائے تھے کہ وہ مجھے میرے گھر پہنچا دیں گے۔ لیکن جنگل میں آ کر انہوں نے میری عزت خراب کرنے کی کوشش کی۔ خدا کا شکر ہے کہ تم نے میری آواز سن لی اور میں بے عزت ہونے سے بچ گئی۔''

میں نے پوچھا۔ ''یہ بتاؤ حویلی میں کتنے مرد ہیں اور کہاں کہاں پہرہ دیتے ہیں؟ اور کیا اُن کے پاس اسلحہ وغیرہ میرا مطلب ہے پستول اور بندوقیں بھی ہیں؟''

جمیلہ نے جواب دیا۔

''وہ سب ہٹے کٹے بدمعاش ہیں۔ اُن دو کو تو تم نے خود دیکھ لیا ہے جن کی لاشیں ہم پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔ وہاں پندرہ بیس آدمی ہیں۔ سب قاتل اور شرابی بدمعاش ہیں۔ دیکھنے میں وہ بڑے مسکین پجاری لگتے ہیں لیکن ہر ایک نے اپنے پاس بھرا ہوا پستول رکھا ہوتا ہے۔ دُلاری ماتا اُنہیں بڑی بڑی تنخواہیں دیتی ہے۔ لیکن ایک بات میں وہ بڑی سخت ہے۔ حویلی کی چار دیواری کے اندر کوئی آدمی کسی عورت کی عزت پر ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔ ان آدمیوں میں دُلاری ماتا کے اپنے جاسوس بھی ہیں جو کھسرے یعنی مردانہ صفات سے محروم ہیں اور دُلاری ماتا کو ایک ایک منٹ کی رپورٹ دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے یہ دو بدمعاش پجاری میری عزت پر حملہ کرنے کے لئے مجھے ورغلا کر حویلی سے باہر لائے تھے۔''

میں اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ یہ عورت جمیلہ مصیبت زدہ تو ضرور ہے مگر باتونی بھی بہت ہے۔ مگر میں مجبور تھا مجھے اُس کی الف لیلیٰ کی داستان سننی پڑ رہی تھی۔ میں نے ایک بار پھر اُس کی بات کاٹ کر پوچھا۔

''تم نے یہ نہیں بتایا کہ حویلی کے اندر کہاں کہاں رات کو پہرہ لگا ہوتا ہے؟ اور کیا حویلی کے بڑے دروازے کے علاوہ اس کا اور کوئی دروازہ نہیں ہے جہاں سے اندر جایا یا نکلا جا سکے؟''

جمیلہ نے جواب دیا۔ ''حویلی کا صرف ایک ہی دروازہ ہے جس پر چوبیس گھنٹے پہرہ لگا رہتا ہے اور رات کے وقت یہ دروازہ بند کر دیا جاتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''اگر یہ دروازہ بھی رات کو بند کر دیا جاتا ہے تو وہ کروڑ پتی بڈھے ہندو بدمعاش وہاں کیسے آتے ہیں جن کو احمق بنا کر دُلاری ماتا دولت اکٹھی کر رہی ہے۔''

اُس نے کہا۔ ''ان بڈھے چھٹے ہوئے بدمعاشوں کے واسطے خاص طور پر رات کو دروازہ کھول دیا جاتا ہے۔ یہ بڈھے اپنی اپنی موٹر کاروں میں خاموشی سے رات کی تاریکی میں آتے ہیں اور منہ اندھیرے سورج نکلنے سے پہلے واپس چلے جاتے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''اگر حویلی کے بڑے دروازے کو بھی رات کے وقت بند کر دیا جاتا ہے تو پھر دونوں بدمعاش تمہیں لے کر کیسے رات کے وقت حویلی سے نکل آئے؟''

''دُلاری ماتا کی اس منحوس حویلی کا ایک خفیہ دروازہ بھی ہے جہاں سے یہ دونوں آدمی مجھے نکال کر لائے تھے۔ اس خفیہ راستے کا مجھے بھی آج رات کو ہی پتہ چلا ہے۔''

''کیا تم مجھے یہ خفیہ راستہ دکھا سکتی ہو؟''

میرے سوال پر وہ بولی۔ ''کیا تم وہاں جانے کا سوچ رہے ہو؟ خدا کے لئے ایسا خیال بھی دل میں نہ لانا۔ جنگل میں تو تم حویلی کے دو بدمعاشوں کو ٹھکانے لگانے میں کامیاب ہو گئے تھے لیکن حویلی کے اندر جا کر تمہاری پستول تمہارے کسی کام نہیں آئے گی۔ اور تم ناحق مارے جاؤ گے۔ میں اگر حویلی کے اندر رہی نہ ہوتی اور اس کے بھید نہ جانتی تو تمہیں جانے سے بالکل نہ روکتی۔ لیکن اب جبکہ میں حویلی کے اندر کا خونی ماحول دیکھ آئی ہوں، وہاں میں نے سیتا کنڈ کے استھان پر بلیدان کے واسطے باہر سے پکڑ کر لائی ہوئی شودروں کی لڑکیوں کا خون بہتے اور چاقوؤں خنجروں سے اُن کے جسموں کو چھلنی ہوتے دیکھا ہے۔ اس لئے میں تمہیں یہی کہوں گی کہ اُرملا کو اُس کی تقدیر پر چھوڑ دو اور آئندہ کبھی دُلاری ماتا کی حویلی کے نزدیک بھی نہ پھٹکنا۔''

جمیلہ اپنے خیال کے مطابق ٹھیک کہہ رہی تھی۔ لیکن میں اُرملا سے کتنا پیار کرتا ہوں اور میرے دل میں اُس کی محبت کا سمندر کس شدت سے موجزن ہے، یہ نہ وہ سمجھ سکتی تھی اور نہ ہی اُسے سمجھانے کا وقت تھا۔ میں نے اُس سے کہا۔

''تم مجھے صرف یہ بتا دو کہ دُلاری ماتا کی حویلی سے جس خفیہ راستے سے تمہیں دونوں آدمی جنگل میں لائے تھے وہ حویلی کے باہر جنگل میں کس جگہ پر نکلتا ہے؟ بس اس کے بعد میں سوچوں گا کہ مجھے وہاں جانا چاہئے یا نہیں جانا چاہئے۔''

جمیلہ کہنے لگی۔

''لگتا ہے تمہارے سر پر اُس ہندو لڑکی کا بھوت پوری طرح سوار ہو چکا ہے۔ تم وہاں جانے سے باز نہیں آؤ گے۔ ٹھیک ہے اگر تمہاری یہی مرضی ہے تو میں تمہیں سمجھائے دیتی ہوں۔''

اس کے بعد اُس نے مجھے تفصیل کے ساتھ سمجھایا کہ حویلی کس طرف ہے اور اُس کا

خفیہ راستہ جنگل میں کس جگہ پر نکلتا ہے؟ اُس نے مجھے آس پاس کی ساری نشانیاں بھی سمجھا دیں۔ جب ہر بات میری سمجھ میں آ گئی تو میں نے اُسے کہا۔

''اب میں چاہتا ہوں کہ تمہیں تمہارے گاؤں خود چھوڑ کر آؤں۔ مجھے بتاؤ کہ ہمیں یہاں سے کس طرف کو جانا ہو گا؟''

اُس نے کہا۔ ''مجھے اتنا پتہ ہے کہ یہاں سے پچھّم کی جانب دریا کا پُل آتا ہے۔ اُس پُل کی دوسری طرف بھیل گڑھ کا ریلوے سٹیشن ہے۔ وہاں سے ہوشنگ آباد کی طرف ریل گاڑی جاتی ہے۔ ہمارے گاؤں کا سٹیشن راستے میں آتا ہے۔ اگر تم مجھے بھیل گڑھ کے سٹیشن پر چھوڑ آؤ تو میں ریل گاڑی میں بیٹھ کر اپنے گاؤں چلی جاؤں گی۔''

''دریا کا پُل یہاں سے کتنی دُور ہے؟'' میں نے پوچھا۔

اُس نے بتایا کہ دریا کا پُل کافی دُور ہے۔ اگر ہم گھاٹیوں اور پہاڑیوں کے درمیان سے ہو کر جائیں تو فاصلہ کم رہ جاتا ہے۔

میں نے کہا۔ ''پھر تو میرا خیال ہے کہ ہمیں ابھی چل پڑنا چاہئے تاکہ رات کے اندھیرے میں ہی ہم بھیل گڑھ پہنچ سکیں۔ یہاں وقت ضائع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟''

وہ بولی۔ ''میرا خیال ہے سیتا کنڈ کے بدمعاش مجھے تلاش کرنے میں ناکام ہو کر واپس چلے گئے ہوں گے۔ ہمیں چل پڑنا چاہئے۔''

اس فیصلے کے بعد ہم ٹیلے کی غار سے باہر نکل آئے۔ چاند اس وقت تک مشرق کی طرف کافی نیچے جھک گیا تھا اور چاندنی مدھم ہو چکی تھی۔ لڑکی مجھے لے کر کھائی میں ایک طرف کو چل پڑی۔ کافی دیر تک ہم چلتے رہے۔ چاند پہاڑی کی اوٹ میں ہو گیا تھا جس کی وجہ سے کھائی میں اندھیرا تھا۔ ہم اندھیرے میں ہی کھائی کی دیوار کے ساتھ ساتھ آگے بڑھ رہے تھے۔ ایک جگہ پہنچ کر ہم کھائی سے باہر نکل آئے۔ یہاں زمین پتھریلی تھی۔ دُور دُور تک درختوں کے جھنڈ تھے جو غروب ہوتی چاندنی میں چھوٹے چھوٹے ٹیلوں کی طرح نظر آ رہے تھے۔ لڑکی ایک جگہ رُک کر اِدھر اُدھر تکنے لگی۔ میں نے اُس سے پوچھا کہیں وہ راستہ تو نہیں بھول گئی؟

اُس نے آہستہ سے کہا۔ ''نہیں، ہم ٹھیک راستے پر جا رہے ہیں۔ میں اپنے خاوند

کے ساتھ دو تین بار ان جنگلوں میں آ چکی ہوں۔ جب کبھی اسے گھر سے دُور درختوں کی کٹائی کا کام ملتا ہے تو وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر جاتا ہے۔''

رات گزرتی جا رہی تھی۔ چاند غروب ہو چکا تھا۔ آسمان پر مشرق کی جانب اُس کی دھیمی روشنی ابھی باقی تھی۔ ہم اس روشنی کے سہارے چل رہے تھے۔ میرا خیال ہے ہم تین چار گھنٹوں تک چلتے رہے ہوں گے۔ اس دوران ہم دو ایک جگہ سانس لینے کے لئے بیٹھ بھی گئے تھے۔ لڑکی جوان اور صحت مند تھی اور گاؤں کی کھلی فضاؤں میں پلی بڑھی تھی۔ میرے مقابلے میں وہ بہت کم تھکی تھی۔ جس بدمعاش کو میں نے چاقو مار کر ہلاک کیا تھا اُس کا پستول میری جیب میں تھا جو آگے چل کر میرے کام آ سکتا تھا۔

آخر ہم دریا کے پُل پر پہنچ گئے۔ پُل کافی اُونچا تھا۔ ایک طرف سے ہم ڈھلان چڑھ کر پُل پر آ گئے۔ کافی بڑا پُل تھا۔ درمیان میں ریل گاڑی کی پٹڑی بچھی ہوئی تھی۔ ایک طرف پیدل چلنے والوں کے لئے تنگ سا راستہ بنا ہوا تھا۔ ہم اُسی راستے پر چل رہے تھے۔ چلتے چلتے اچانک مجھے خیال آیا کہ یہ تو میں نے اس عورت سے پوچھا ہی نہیں کہ خفیہ راستے سے حویلی کے اندر جانے کے بعد وہاں کا نقشہ کیا ہے؟ اور خاص طور پر اُرملا کو رات کے وقت میں کہاں تلاش کروں گا اور وہ مجھے کہاں مل سکے گی؟ جب میں نے جمیلہ سے یہ سوال کیا تو اُس نے کہا۔

''اگر تم خفیہ راستے سے ہو کر حویلی کے اندر جانے میں کامیاب ہو گئے تو تم حویلی کے ہی صحن کے باغیچے کی دیوار کے پاس جھاڑیوں میں سے باہر نکلو گے۔ سامنے چالیس قدموں کے فاصلے پر صحن کی دوسری جانب تمہیں ایک خستہ حال برآمدہ دکھائی دے گا۔ برآمدے کے کونے میں ایک زینہ اُوپر کو جاتا ہے۔ یہ زینہ حویلی کی پہلی منزل کے دالان میں نکلتا ہے۔ اس دالان میں ساتھ ساتھ چھوٹی کوٹھڑیاں ہیں۔ ان کوٹھڑیوں میں سے جو سب سے آخری کوٹھڑی ہے اُس میں رات کو اُرملا کو بند کیا جاتا ہے۔''

میں نے جمیلہ کی بتائی ہوئی ساری تفصیل اچھی طرح سے ذہن نشین کر لی۔ جب میں نے پوچھا کہ وہاں رات کو کہاں کہاں پہرہ لگا ہوتا ہے تو اُس نے جواب دیا۔

''رات کو حویلی کے اندر ہر جگہ پہرہ لگا ہوتا ہے۔ مگر پہرے دار آسانی سے نظر نہیں آتا۔ ہر پہرے دار کے پاس پستول وغیرہ ہوتا ہے۔ اُن میں سے کوئی بھی پہرے دار

ایسا نہیں جس نے دو دو تین تین خون نہ کئے ہوں۔ اور میرے فرار کے بعد تو وہاں پہرہ بڑا سخت کر دیا گیا ہو گا۔''

وہ خاموش ہو گئی۔ ہم پُل عبور کر چکے تھے اور اب رات کے دُھندلے دُھندلے اندھیرے میں ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ اُس نے کچھ لمحے خاموش رہنے کے بعد کہا۔

''میں اب بھی تمہیں یہی کہوں گی کہ وہاں جانے کا خیال چھوڑ دو۔ تم بڑے نیک دل انسان ہو۔ میں نہیں چاہتی کہ تم اُن بدمعاشوں کے ہاتھوں قتل ہو جاؤ۔''

میں نے جمیلہ کی اس بات کا کوئی جواب نہ دیا۔

ریلوے لائن پہاڑی ٹیلوں کے چکر کاٹ کر بھیل گڑھ کو جاتی تھی۔ جمیلہ اور میں ایک شارٹ کٹ راستے پر آ گئے۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے تک ہم چھوٹے چھوٹے جنگلی ٹیلوں کے تنگ درّوں اور گھاٹیوں میں سفر کرتے رہے۔ اس کے بعد کہیں دُور سے ریلوے لائن پر سگنل کی سرخ بتی دکھائی دی۔ جمیلہ نے سگنل کی بتی کی طرف اشارہ کیا اور کہا۔

''یہ بھیل گڑھ سٹیشن کی بتی ہے۔''

بھیل گڑھ کا مختصر سٹیشن رات کے سناٹے میں خالی پڑا تھا۔ ہم پیدل سفر کرنے سے کافی تھک چکے تھے۔ پلیٹ فارم کے بنچ پر بیٹھ گئے۔ ایک قلی ٹائپ کا آدمی قریب سے گزرا تو اُس کی زبانی معلوم ہوا کہ ہوشنگ آباد جانے والی گاڑی صبح کے وقت آئے گی۔ ابھی صبح ہونے میں کافی دیر تھی مگر میں نے اس بے سہارا عورت کو ویران سٹیشن پر اکیلی چھوڑنا مناسب نہ سمجھا۔ اگرچہ اُس نے مجھے کہا بھی کہ میں واپس چلا جاؤں وہ خود ہی ٹرین میں سوار ہو جائے گی۔ مگر میں نے اُسے کہا کہ نہیں میں تمہیں ٹرین میں سوار کرانے کے بعد واپس جاؤں گا۔

آخر صبح ہو گئی۔ سفید سفید روشنی چاروں طرف پھیلنے لگی۔ پھر ٹرین بھی آ گئی۔ پتہ چلا کہ یہی ٹرین ہوشنگ آباد جاتی ہے۔ میں نے جمیلہ کو ٹرین میں بٹھا دیا۔ جب ٹرین چل پڑی تو میں نے اُسے خدا حافظ کہا اور سٹیشن سے باہر آ گیا۔ باہر چھوٹی چھوٹی کھوکھا نما دُکانیں تھیں جہاں مسافر بیٹھے کھانا کھا رہے تھے اور چائے پی رہے تھے۔ میں بھی ایک دُکان کے باہر ناشتہ کرنے بیٹھ گیا۔ ناشتہ بھی کر رہا تھا اور یہ بھی سوچ رہا تھا کہ میں جس

مہم پر جا رہا ہوں اس میں کن خطرات کے امکانات زیادہ ہیں؟ جتنا سوچتا ذہن اُتنا ہی
پریشان ہو رہا تھا۔ مجھے خطرات ہی خطرات نظر آ رہے تھے۔ آپ خود اندازہ لگائیں کہ
ایک شخص جس کے پاس صرف ایک چاقو اور ایک پستول جس میں چند ایک گولیاں ہی
ہوں، ساتھ لے کر خونی قاتلوں کے قلعے کے اندر گھس جائے تو اُس کا کیا حشر ہو گا؟ یہ
موت کے منہ میں جانے والی بات تھی۔ لیکن میں رُک بھی نہیں سکتا تھا۔ اُرملا کی محبت
مجھے کھینچے لئے جا رہی تھی۔ محبت کے اندھے جذبات کے ساتھ ہی ساتھ میری عقل بھی
ابھی تک کام کر رہی تھی۔ میں محبت کرنا چاہتا تھا۔ محبت میں یونہی مرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں
زندہ رہنا چاہتا تھا اور اُرملا کو بھی اس جہنم سے زندہ نکال لانا چاہتا تھا۔ عقل کہہ رہی تھی
بیوقوف نہ بنو! مارے جاؤ گے۔ یہیں سے چپ چاپ اپنے وطن کو واپس چلے جاؤ۔ اُر
کا چہرہ سامنے آتا تو دل کہتا تم ایسا نہیں کر سکتے۔ تم اُرملا سے محبت کرتے ہو۔ تم اس کے
بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔ اُسے بدمعاشوں کے پاس چھوڑ کر چلے گئے تو تمہارا ضمیر تمہیں
ساری زندگی ملامت کرتا رہے گا۔ کیسے زندہ رہو گے اُرملا کے بغیر؟

آخر میرے جذبات میری عقل پر غالب آ گئے اور میں ایک طوفانی عزم لے کر وہا
سے اُٹھا اور بھیل گڑھ کے قصبے کے بازار میں آ گیا۔ ایک دُکان سے میں نے کندھے
لٹکانے والا تھیلا خریدا۔ دوسری دکان سے بھنے ہوئے چنے خرید کر تھیلے میں ڈالے ا
اپنی خطرناک مہم پر روانہ ہو گیا۔ جس راستے سے میں جمیلہ کے ساتھ آیا تھا میں اُ
راستے سے ہو کر واپس جا رہا تھا۔ میں نے ایک جگہ رُک کر جیب سے پستول نکال کر کھ
اُس میں سے صرف ایک گولی چلی تھی۔ باقی نو گولیاں اس میں بھری ہوئی تھیں۔ ا
سے مجھے کچھ حوصلہ ہوا۔ کافی لمبا راستہ تھا اور سارا راستہ جنگل کی گھاٹیوں اور پہاڑوں
کھائیوں اور خشک برساتی نالوں میں سے ہو کر گزرتا تھا۔ اس قسم کی سختیوں کا میں عاد
تھا۔ دوپہر کے وقت میں نے ایک جگہ رُک کر آرام بھی کیا۔ مجھے اپنے مشن پر رات
وقت روانہ ہونا تھا جس میں ابھی کافی وقت تھا۔ میں دریا کے پُل پر سے بھی گزر گیا
سورج مغرب کی جانب پہاڑیوں کے پیچھے غروب ہو رہا تھا جب میں اُس چٹان
پاس پہنچ گیا جہاں جمیلہ مجھے لے کر آئی تھی۔ میں اُسی کھوہ میں آ کر لیٹ گیا جہاں بیٹھ
جمیلہ نے مجھے اپنی داستانِ غم سنائی تھی۔

باہر ابھی دن کی روشنی باقی تھی۔ میں نے سوچا کہ دن کی روشنی میں ہی دُلاری ماتا کی
حویلی کا سروے کر لینا چاہئے۔ رات کے اندھیرے میں تو اسے تلاش کرنا مشکل ہو
جائے گا۔ یہ سوچ کر میں فوراً غار سے باہر آ گیا اور اس طرف چل پڑا جس طرف چلنے
کے لئے مجھے جمیلہ نے بتایا تھا۔ میں اُس کے بتائے ہوئے راستے سے ہٹ کر چل رہا تھا
تا کہ اگر دُلاری ماتا کا کوئی بدمعاش پجاری وہاں چل پھر رہا ہو تو میں اُسے نظر نہ آؤں۔
جن راستوں پر چلنے کی مجھے جمیلہ نے ہدایت کی تھی میں اُنہی راستوں پر سے ہوتا ہوا جا
رہا تھا۔ ایک جگہ دو چٹانیں ساتھ ساتھ کھڑی تھیں۔ جمیلہ نے بتایا تھا کہ جب ان
چٹانوں کے پاس پہنچو تو بائیں جانب ہو جانا۔ میں بائیں جانب ہو گیا۔ اب جو سامنے نظر
اُٹھا کر دیکھا تو کچھ فاصلے پر اُونچے اُونچے درختوں کے درمیان ایک پرانے کھنڈر کی
دیوار دکھائی دے رہی تھی۔ یہی دُلاری ماتا کی حویلی ہو سکتی تھی۔

جمیلہ نے اس کھنڈر اور حویلی کی نشانی یہ بتائی تھی کہ اس کی ایک دیوار کے اُوپر ایک
چھوٹی سی بُرجی باہر نکلی ہوئی ہو گی۔ میں جھاڑیوں کے پیچھے بیٹھا تھا۔ غور سے دیکھا تو
حویلی کی دیوار کے ایک کونے میں ایک بُرجی اُوپر کو اُٹھی ہوئی تھی۔ اس بات کی تصدیق
ہو گئی تھی کہ یہی دُلاری ماتا کی حویلی ہے۔ اب مجھے حویلی کے اندر جانے والے خفیہ
راستہ کا سراغ لگانا تھا۔ اس کا نقشہ بھی مجھے جمیلہ نے سمجھا دیا تھا۔ میں پیچھے ہٹ کر چٹان
کی ڈھلان اُتر کر نیچے نالے میں آ گیا اور نالے کی اُونچی دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا
جہاں نالہ باہر کو جاتا تھا اُس کے ساتھ ہی نالے سے باہر نکل آیا اور جلدی سے ایک
درخت کی اوٹ میں ہو کر بیٹھ گیا۔ اب حویلی کی عقبی دیوار مجھ سے زیادہ سے زیادہ
پچاس قدموں کے فاصلے پر تھی۔ اسی دیوار میں کسی جگہ جنگلی جھاڑیوں کے درمیان سے
حویلی کے اندر خفیہ راستہ جاتا تھا۔ میں بڑے غور سے اس دیوار کا جائزہ لے رہا تھا۔
مجھے اس بات پر بڑی حیرانی ہو رہی تھی کہ اس خونی حویلی کی یہ اتنی اہم جگہ تھی اور وہاں
مجھے کوئی پہرے دار چلتا پھرتا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اُسی لمحے میرے ذہن میں جمیلہ
کے الفاظ گونجنے لگے۔ اُس نے کہا تھا کہ حویلی کے اندر باہر تمہیں بظاہر کوئی پہریدار
دکھائی نہیں دے گا مگر وہاں قدم قدم پر پہرے دار اسلحہ لئے موجود ہوتے ہیں اور چھپ
کر اندر داخل ہونے والوں کو بے دریغ قتل کر دیتے ہیں۔ اس کا مطلب یہی نکلتا تھا کہ

پہرے دار یہاں ضرور موجود ہوں گے۔ مگر وہ کہیں گھات لگا کر بیٹھے ہوں گے۔ مجھے
اُن سے بھی خبردار رہنا تھا۔

میں وہیں جھاڑی میں دُبک کر بیٹھا تھا۔ کئی قسم کے خیالات ذہن میں آ رہے تھے۔
اس حویلی کی چار دیواری کے اندر اُرملا موجود تھی۔ خدا جانے وہ کس حالت میں ہو گی
اُس پر کیا بیت رہی ہو گی؟ سوچ سوچ کر پریشان بھی ہو رہا تھا اور اُسے وہاں سے
نکالنے کی ترکیبوں پر بھی غور کر رہا تھا۔ میری دشمن جاں کانچی کی تلوار الگ میرے سر
منڈلا رہی تھی۔ یہی بڑی غنیمت تھی کہ جب سے میں اُس جنگل میں داخل ہوا تھا کانچی
کی طرف سے مجھے کوئی دھمکی نہیں ملی تھی۔ میرا دھیان اپنے آپ اُرملا کی دی ہوئی انگوٹھی
کی طرف چلا گیا۔ میں نے اپنے ہاتھ کی اُنگلی کو دیکھا۔ اُرملا کی انگوٹھی میری اُنگلی میں
موجود تھی۔ اگرچہ اُس کا رنگ سیاہ پڑ چکا تھا اور اس کی آدھی طاقت ختم ہو چکی تھی لیکن پھر
بھی وہ مجھے کانچی کے براہِ راست حملے سے ابھی تک بچائے ہوئے تھی۔ وہاں زیادہ دیر
تک بیٹھے رہنے میں خطرہ تھا۔ گھات لگا کر بیٹھے ہوئے کسی بھی پہرے دار کی مجھ پر نگاہ
سکتی تھی اور کسی طرف سے گولی آ کر میری کھوپڑی میں سے گزر سکتی تھی۔

اس خیال کے آتے ہی میں اُٹھا اور جھاڑیوں کی اوٹ میں جھک کر دبے پاؤں چلتا
ہوئے وہاں سے دُور نکل گیا اور پھر چھوٹی سی ڈھلان اُتر کر خشک نالے میں اُتر کر واپس
چل پڑا۔ چلتے چلتے میں دُلاری ماتا کی خونی حویلی سے کافی فاصلے پر اُس ندی پر آ
جہاں میں نے پہلی بار جمیلہ کی چیخ کی آواز سنی تھی۔ میں نے درختوں اور جھاڑیوں کے
درمیان ایک محفوظ جگہ تلاش کر لی اور وہاں بیٹھ کر رات ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ تھیلے
میں سے کچھ چنے نکال کر پیٹ بھرا۔ ندی پر جا کر پانی پیا اور واپس خفیہ پناہ گاہ میں آ
بیٹھ گیا۔

شام ہوتے ہی درختوں پر بسیرا کرتے پرندوں کی آوازوں سے جنگل کی فضا گونج
اُٹھی۔ میں بہت تھک چکا تھا سوچا کچھ دیر کے لئے سو جاؤں۔ پھر خیال آیا کہ ایسا نہ
کہ میں سویا ہی رہوں اور صبح ہو جائے اور یہ رات ضائع چلی جائے۔ میرا پروگرام
رات حویلی میں جا کر اُرملا کو وہاں سے نکال لانے کا تھا۔ کہنے کو تو یہ بڑی آسان بات
لگتی تھی مگر مجھے احساس تھا کہ یہ کام صرف دُشوار ہی نہیں بلکہ اس میں میری اور اُس

دونوں کی جان جانے کا خطرہ ہے۔

میں نے سونے کا ارادہ ترک کر دیا اور جھاڑیوں میں درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھا
رہا۔ دل میں دُعا مانگ رہا تھا کہ یا اللہ پاک تو میرے دل کا حال جانتا ہے۔ تو جانتا ہے
کہ میری نیت نیک ہے۔ میں اور کچھ نہیں چاہتا۔ صرف ایک معصوم عورت کو ظالموں کے
چنگل سے چھڑانا چاہتا ہوں۔ تو میری مدد کرنا۔ سوائے تمہارے میرا دوسرا کوئی مددگار نہیں۔

رات جیسے جیسے گہری ہو رہی تھی، پرندوں کا شور کم ہوتا جا رہا تھا۔ پھر جنگل میں سناٹا
چھا گیا۔ اس سناٹے سے میرے حواس اچھی طرح سے آشنا تھے۔ رات کے وقت جنگل
کے سناٹے میں ہزاروں خطرے کروٹیں لے رہے ہوتے ہیں۔ جنگلی درندے رات کے
وقت شکار کی تلاش میں نکل آتے ہیں۔ مجھے اُن کی طرف سے بھی خطرہ لگا ہوا تھا۔ لیکن
جنگل کی فضاؤں میں اتنی مدت گزارنے کے بعد مجھے علم ہو گیا تھا کہ جنگل میں سوائے
ریچھ اور لومڑ کے دوسرا کوئی جانور یا درندہ انسان پر اُس وقت تک حملہ نہیں کرتا جب تک
کہ آدمی خود درندے کو تنگ نہ کرے۔ بلکہ میں نے اکثر دیکھا ہے کہ جنگل میں چلتے
پھرتے اگر اچانک کسی جگہ شیر سے آمنا سامنا ہو جائے تو شیر یا تو اپنا راستہ بدل دیتا ہے
اور اگر اُسے وہیں رہنا ہو تو غرا کر آدمی کو وہاں سے چلے جانے کا حکم دیتا ہے۔ جنگل میں
رہنے والے ایک آدمی نے ایک بار مجھے کہا تھا کہ جنگلوں میں چلنا پھرنا بڑے شہروں کی
ٹریفک زدہ سڑکوں پر چلنے پھرنے سے زیادہ محفوظ ہوتا ہے۔

جیسے جیسے رات گہری ہو رہی تھی میری نیند غائب ہوتی جا رہی تھی۔ میرا ذہن ایک
ایسے کمانڈو کی طرح بیدار اور ہوشیار تھا جو کسی خطرناک مہم پر جانے والا ہو۔ ابھی چاند
کے مغربی اُفق کی پہاڑیوں کے اُوپر آنے میں دیر تھی اور اندھیرا جنگل میں پوری طرح
سے چھایا ہوا تھا۔ میں چاند کے پہاڑیوں کے اُوپر آنے اور جنگل میں چاندنی پھیلنے سے
پہلے پہلے حویلی کے خفیہ راستہ سے اندر چلا جانا چاہتا تھا۔ یہ کسی اژدھے کے منہ میں
داخل ہونے والی بات تھی۔ مگر میرا عزم چٹان سے بھی زیادہ مضبوط تھا۔ مجھے اپنے خدا پر
اور اپنی محبت پر پورا بھروسہ تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اگر میں نے سوجھ بوجھ اور بے حد
احتیاط سے کام لیا تو میں اُرملا کو بدمعاشوں کے اڈے سے ضرور نکال لاؤں گا۔ میں نے
اندھیرے میں ہی پستول کو کھول کر دیکھا۔

اُس میں نو گولیاں موجود تھیں۔ اگر چہ میں اس کو یونہی چلانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ اس کا دھماکہ خونی حویلی کے تمام خطروں کو بیدار کر سکتا تھا۔ مجھے پستول صرف اُس وقت چلانا تھا جب میری یا اُرملا کی جان کو خطرہ لاحق ہو۔ بہر حال میں نے اپنی طرف سے پوری تیاری کر لی تھی۔ چنے کا تھیلا میں نے وہیں جھاڑیوں میں ہی رہنے دیا۔ چاقو جیب سے نکال کر اُسے کھولا اور ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑ لیا۔ پھر خدا کا نام لے کر جھاڑیوں میں سے دبے پاؤں باہر نکل آیا۔ ایک جگہ بیٹھ کر اندھیرے میں اردگرد کا جائزہ لیا۔ اندھیرے میں درختوں جھاڑیوں وغیرہ کے دُھندلے خاکے نظر آ رہے تھے لیکن جنگل کے سناٹے اور خاموشی نے ہیبت ناک شکل اختیار کر لی تھی۔ میرے ذرا سے چلنے پر آواز پیدا ہوتی تھی جو صاف سنائی دیتی تھی۔ میں اُٹھ کھڑا ہوا اور بجائے سیدھے حویلی کی عقبی دیوار کی طرف جانے کے بائیں جانب ہو گیا۔ میں دُور دُور رہتے ہوئے جنگل کا نصف دائرے میں چکر لگا کر حویلی کی دیوار تک جانا چاہتا تھا تا کہ اگر کوئی پہرے دار گھات میں بیٹھا ہو تو مجھے پیچھے سے نظر آ جائے۔

یہ میری خوش فہمی ہی تھی۔ ورنہ وہاں گھات لگا کر بیٹھے ہوئے پہرے دار کا دکھائی دے جانا ناممکن سی بات لگتی تھی۔ میری مہم اس قدر اہم تھی کہ مجھے ان خطرات کو ہر حالت میں نظر انداز کرنا پڑ رہا تھا۔ اگر چہ میں ان سے بے خبر بھی نہیں تھا۔ نصف دائرے کے چکر میں پچاس ساٹھ قدم جھک جھک کر دبے پاؤں چلتے رہنے کے بعد میں ایک جگہ بیٹھ گیا۔ میری نگاہیں کچھ فاصلے پر اندھیرے میں دُھندلی دُھندلی نظر آنے والی حویلی کی عقبی دیوار کا بڑے غور سے جائزہ لے رہی تھیں۔ وہاں کسی پہرے دار کا بظاہر نام نشان تک نہیں تھا لیکن یہ ناممکن تھا کہ حویلی کے خفیہ دروازے کے باہر کوئی بدمعاش اسلحہ لئے پہرے پر موجود نہ ہو۔ میں اس خفیہ راستے سے پوری طرح آشنا بھی نہیں تھا۔ کچھ معلوم نہیں تھا یہ راستہ کس قسم کا ہے؟ غار کے دہانے کی طرح ہے یا یونہی اینٹ پتھر جوڑ کر دیوار سی بنا دی گئی ہے؟ اس بارے میں نہ میں نے جمیلہ سے کچھ پوچھا تھا نہ اُس نے مجھے کچھ بتایا تھا۔ ایک جگہ جھاڑیوں کی وجہ سے حویلی کی دیوار کافی چھپ گئی تھی۔ میرا دل کہتا تھا کہ ان جھاڑیوں کے پیچھے ہی خفیہ راستہ ہے۔

جہاں میں بیٹھا تھا وہاں مٹی کی ڈھیری تھی جس پر جنگلی سرکنڈے اُگے ہوئے تھے۔

میں ان سرکنڈوں کے درمیان سے دیوار والی جھاڑیوں کو مسلسل دیکھ رہا تھا اور وہاں تک پہنچنے کے طریقے سوچ رہا تھا۔ میرا ذہن کسی جدید ترین کمپیوٹر سے بھی دس گنا بڑھ کر کام کر رہا تھا۔ ایک سیکنڈ کے وقفے میں میرے ذہن میں دیوار تک پہنچنے کے کئی طریقے آ گئے لیکن ان میں سے صرف ایک طریقہ ایسا تھا جس میں خطرے کم تھے۔ میں نے اسی طریقے پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے نظریں اُٹھا کر پیچھے پہاڑیوں کی طرف دیکھا۔ پہاڑیوں کے اُوپر طلوع ہونے والے چاند کی ہلکی ہلکی گلابی روشنی نمودار ہونا شروع ہو گئی تھی۔ اب مجھے دیر نہیں کرنی چاہئے تھی چنانچہ میں وہیں بیٹھے بیٹھے زمین پر پیٹ کے بل لیٹ گیا اور کہنیوں کے سہارے اس طرح آگے کی طرف رینگنے لگا جس طرح وہ سانپ رینگتا ہے جس نے اپنا شکار دیکھ لیا ہو۔

اس طرح رینگتے رینگتے میں دیوار والی جھاڑیوں کے قریب پہنچ گیا۔ مجھے ایک آہٹ سی سنائی دی۔ میں نے پیٹ کے بل پڑے پڑے اپنا چہرہ زمین کے ساتھ لگا دیا اور جسم کو ایسے بنا لیا جیسے پتھر ہو...... یہ آواز وہاں پر موجود کسی پہرے دار کے قدموں کی چاپ ہی ہو سکتی تھی جس نے اپنی گھات میں سے مجھے رینگتے ہوئے دیکھ لیا ہے اور اب میرے سر پر کھڑا ہے اور مجھ پر فائر کرنے ہی والا ہے۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور خدا کو یاد کرنے لگا۔ جب پندرہ بیس سیکنڈ اسی طرح گزر گئے اور کچھ نہ ہوا تو میں نے آہستہ سے آنکھیں کھول کر سر اُٹھایا اور پیچھے دیکھا۔ پیچھے کوئی نہیں تھا۔ میں نے ایک گہرا سانس لیا اور کہنیوں کی بجائے اپنے پنجوں سے زمین پر اُگی ہوئی گھاس کو پکڑ پکڑ کر آہستہ آہستہ رینگتا ہوا اُس گھنی جھاڑی کے بالکل قریب آ گیا جس کے پیچھے بقول جمیلہ کے حویلی کے اندر جانے کا خفیہ راستہ تھا۔ میں حیران تھا کہ اگر وہاں کوئی پہرے دار گھات لگا کر بیٹھا ہوا ہے تو وہ کہاں ہے؟ کیا کر رہا ہے؟ اُسے میری خبر کیوں نہیں ہوئی؟ شاید وہ بیٹھے بیٹھے سو گیا ہے۔ اس وقت تک چاند بھی پہاڑیوں کے اُوپر سے نکل کر آسمان پر آ گیا تھا اور اس کی چاندنی میں جھاڑیاں، اُونچی گھاس اور حویلی کی دیوار نظر آنے لگی تھی۔ اب مجھے بے حد احتیاط سے آگے بڑھنا تھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے جھاڑی کی شاخوں کو ایک جگہ سے پکڑ کر ذرا سا پیچھے ہٹایا۔ ایسا کرتے وقت میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ جیسے میرے جھاڑیوں کو ہٹاتے ہی کوئی بارودی سرنگ دھماکے سے پھٹ پڑے گی

اور میرے جسم کے پرخچے اُڑ جائیں گے۔

لیکن ایسی کوئی بات نہ ہوئی۔ میں نے ہمت کر کے جھاڑیوں کو اور زیادہ پرے ہٹایا اور اندر جھانک کر دیکھا۔ پھیکی پھیکی چاندنی میں مجھے حویلی کی دیوار میں کوئی تین فٹ اُونچا اور دو فٹ کے قریب چوڑا ایک دوسرے کے اوپر چنی ہوئی اینٹوں کا ٹکڑا نظر پڑا۔ ایسے لگ رہا تھا کہ وہاں کوئی شگاف تھا جسے اینٹیں چن کر بند کر دیا گیا ہے۔ یہی حویلی کا خفیہ راستہ ہو سکتا تھا جو پہلے کھلا ہو گا لیکن جمیلہ کے وہاں سے فرار یا بھگا لے جائے جانے کے بعد اینٹیں جوڑ کر بند کر دیا گیا تھا۔ میں جھاڑی کی اوٹ میں ہو کر دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا۔ پستول میرے ہاتھ میں تھا۔ میں نے اُسے زمین پر رکھ لیا اور اینٹوں کو ذرا سا ہلا کر دیکھا۔ کوئی اینٹ اپنی جگہ سے نہیں ہل رہی تھی۔ میں نے آنکھیں قریب لے جا کر بڑے غور سے دیکھا۔ دائیں جانب ایک جگہ دو تین اینٹوں کے درمیان جگہ خالی تھی۔ میں نے اُس کے اندر اُنگلیاں ڈالیں اور ایک آدھ اینٹ کو باہر نکالنے کی جدوجہد کرنی شروع کر دی۔ تھوڑی سی جدوجہد کے بعد میں ایک اینٹ باہر نکالنے میں کامیاب ہو گیا۔ مجھے یہ بھی ڈر تھا کہ آواز پیدا نہ ہو۔ مجھے کوئی خبر نہیں تھی کہ میرے دائیں بائیں کوئی موجود ہے یا نہیں ہے۔ میں نے مزید کوشش کر کے دوسری اینٹ بھی اپنی جگہ سے باہر نکال دی۔ وہاں ایک مستطیل سوراخ بن گیا۔ میں نے آنکھیں ساتھ لگا کر دوسری طرف دیکھنے کی کوشش کی۔ دوسری طرف اندھیرا تھا مجھے کچھ نظر نہ آیا۔ لیکن اندر سے ٹھنڈی ہوا ضرور آ رہی تھی۔

اس کا مطلب تھا کہ دوسری طرف خالی جگہ ہے اور یہ خفیہ دروازے کا دہانہ ہی ہے۔ میں اس قدر احتیاط اور صبر آزما آہستگی کے ساتھ ایک ایک اینٹ باہر نکال رہا تھا جیسے اینٹ کے پیچھے کوئی بم رکھا ہوا ہو۔ میں نے اتنی جگہ بنا لی کہ میں رینگ کر اس کے اندر داخل ہو سکتا تھا۔ میں نے زمین پر سے اپنا پستول اُٹھا کر ہاتھ میں پکڑ لیا اور سوراخ میں سے خفیہ دروازے کے اندر داخل ہو گیا۔ میں رینگ کر اندر گیا تھا۔ اندر داخل ہونے کے بعد میں کچھ دیر ویسے ہی زمین کے ساتھ لگ کر پڑا رہا، پھر اُٹھ کر بیٹھ گیا اور چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ یہ ایک سرنگ سی تھی جس میں باہر سے آنے والی چاندنی کی مدھم چمک میں مجھے سرنگ کی دونوں جانب دیواریں نظر آئیں۔ میں دیوار کے ساتھ لگ

کر آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ بہت پھونک پھونک کر قدم اُٹھا رہا تھا۔ خفیہ سرنگ کے دہانے کے پاس تو چاندنی کی کچھ روشنی تھی اس سے آگے گھپ اندھیرا تھا۔ لیکن میں مطمئن تھا کہ مجھے خفیہ دروازہ مل گیا ہے اور سب سے زیادہ اطمینان مجھے اس بات کا تھا کہ ابھی تک میں پکڑا نہیں گیا تھا۔ کسی پہرے دار سے مڈبھیڑ نہیں ہوئی تھی۔ یہ بڑی عجیب بات تھی کہ سرنگ کے دہانے کے اندر بھی کوئی پہرے دار نہیں تھا۔ میں ایک ایک قدم آہستہ آہستہ آگے بڑھا رہا تھا۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ وہاں میرے سوا دوسرا کوئی نہیں ہے تو میں قدرے بے خوف ہو کر قدم اُٹھانے لگا۔

پھر میں بمشکل کوئی تین چار قدم مزید چلا ہوں گا کہ ایک جگہ سے زمین میرے پاؤں کے نیچے سے ایک دم بیٹھ گئی اور میں دھڑام سے نیچے ایک گہرے کھڈ میں گر پڑا۔ ایک لمحے کے لئے تو جیسے میرے ہوش و حواس غائب ہو گئے۔ تاریک کھڈ میں بری طرح سے گرا تھا اور میرے سر اور ایک کندھے میں چوٹ لگی تھی۔ لیکن میری کوئی ہڈی نہیں ٹوٹی تھی۔ کچھ دیر تک تو میری سمجھ میں نہ آیا کہ یہ سب کچھ اچانک کیا ہو گیا ہے؟ میں جہاں گرا تھا وہیں پڑا رہا۔ پھر اُٹھ کر کھڈے کی زمین اور دیواروں کو ٹٹولا۔ میرا بایاں کندھا درد کرنے لگا تھا۔ شاید میں اس کندھے کے بل گرا تھا۔ کھڈے کی دیواریں کچی مٹی کی تھیں اور بالکل سیدھ میں اُوپر کو چلی گئی تھیں۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ یہ کھڈا بنایا ہی اس لئے گیا ہے کہ اگر کوئی اندر سے باہر یا باہر سے اندر داخل ہونے کی کوشش کرے تو وہ اس میں گر پڑے۔ میں نے اُوپر کی جانب دیکھا، اُوپر بھی اندھیرا تھا۔ کھڈا کم از کم آٹھ دس فٹ گہرا تھا اور باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ دیواروں میں بھی کوئی ایسی جگہ نہیں تھی کہ جہاں ہاتھ ڈال کر یا پاؤں رکھ کر میں اُوپر چڑھ سکتا۔ تب مجھے یقین ہو گیا کہ میں پھنس گیا ہوں بلکہ پکڑا گیا ہوں۔ اب یہ بات بھی سمجھ میں آ گئی کہ وہاں کوئی پہریدار کیوں نہیں تھا۔

اتنے میں مجھے اُوپر سے دو تین آدمیوں کے اُونچی آواز میں بولنے اور قدموں کی آوازیں آئیں۔ پھر اُوپر سے مجھ پر طاقتور ٹارچ کی روشنی ڈالی گئی۔ میں رنگے ہاتھوں پکڑا گیا تھا۔ یہ بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ میں جنگل میں رات کے وقت راستہ بھول کر ادھر آ گیا ہوں۔ اگر ایسی بات تھی تو پھر مجھے دیوار کی اینٹیں اُکھاڑنے کی کیا ضرورت تھی۔

میں سر جھکائے بیٹھا رہا۔ اوپر سے ایک سیڑھی نیچے لٹکا دی گئی اور دھپ دھپ کرتے دو آدمی جن میں سے ایک کے ہاتھ میں پستول اور دوسرے کے ہاتھ میں لمبا چھرا تھا کھڈے میں اُتر آئے۔ اوپر سے ٹارچ کی روشنی پڑ رہی تھی۔ پستول والے آدمی نے میری کنپٹی کے ساتھ پستول کی نالی لگا دی اور بولا۔

''کون ہو تم؟''

ایک سیکنڈ کے اندر میرے دماغ کے کمپیوٹر نے ایک خیال سجھا دیا۔ میں نے بظاہر بڑے سکون کے ساتھ کہا۔

''مجھ سے بڑی غلطی ہوگئی ہے۔ بات یہ ہے کہ میں پونا شہر میں پرانے تاریخی سکوں، کھنڈروں سے نکلنے والی پرانی مورتیوں اور ٹوٹے پھوٹے برتنوں کا کاروبار کرتا ہوں۔ کسی نے مجھے بتایا تھا کہ اس جنگل میں ایک حویلی ہے جو بکرماجیت راجہ کے زمانے کی ہے۔ وہاں تمہیں کچھ پرانی چیزیں مل سکتی ہیں اور میں یہاں آ گیا۔''

پستول میری کھوپڑی سے ہٹ گئی اور پیچھے سے میری گردن پر کسی نے اتنے زور سے مُکا مارا کہ میں منہ کے بل گر پڑا اور نیم بے ہوش سا ہو گیا۔ وہ لوگ مجھے کھڈے میں سے نکال کر لے گئے اور ایک کوٹھڑی میں ڈال دیا۔ وہ آپس میں ایسی ہندوستانی یا اُردو زبان میں باتیں کر رہے تھے جن میں سنسکرت اور پرانی پراکرت زبان کے لفظ بہت زیادہ تھے۔ ظاہر ہے یہ دُلاری ماتا کے بدمعاش اور قاتل پجاری تھے۔

تھوڑی دیر بعد مجھے کچھ ہوش آیا تو میں اپنی گردن کو سہلاتا ہوا اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ میں زمین پر پڑا تھا۔ کوٹھڑی میں ایک لالٹین جل رہی تھی جس کی چمنی دُھوئیں سے آدھی سیاہ پڑ چکی تھی۔ میرے ہاتھ میں جو پستول تھا اب وہ میرے پاس نہیں تھا۔ میں نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا تو میرا چاقو بھی غائب تھا۔ یہ چیزیں وہ لوگ اپنے ساتھ ہی لے گئے تھے۔ میرا کندھا بھی درد کر رہا تھا۔ کھڈے میں گرنے سے سر میں جہاں چوٹ آئی تھی وہ جگہ بھی درد کر رہی تھی۔ لیکن مجھے سب سے زیادہ پریشانی اس بات کی تھی کہ اب کیا ہو گا؟ آنِ واحد میں میری ساری سکیم فیل ہوگئی تھی۔ کہاں میں اُرملا کو نکالنے جا رہا تھا اور اب خود ہی ان خونی قاتلوں کے چنگل میں پھنس گیا تھا۔

یہ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ رات کتنی گزر گئی ہے، باقی کتنی ہے؟ بے دم اور نڈھال سا

ہو کر ننگی زمین پر پڑا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق دو ڈھائی گھنٹے گزر گئے ہوں گے کہ کوٹھڑی کا دروازہ کھلا اور وہی تین آدمی اندر داخل ہوئے۔ اُن میں سے ایک نے میری آنکھوں پر کس کر پٹی باندھی اور دوسرے نے اُس کے ساتھ مل کر مجھے بازوؤں سے پکڑا اور کوٹھڑی سے باہر لے گئے۔ خدا جانے مجھے کہاں کہاں سے چلاتے ہوئے لے جا رہے تھے۔ کبھی ایک طرف گھوم جاتے کبھی دوسری طرف گھوم جاتے۔ آخر میں وہ ایک جگہ رُک گئے۔ مجھے کسی کمرے کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ اس کے بعد مجھے زور سے اندر دھکیل دیا گیا۔ میں منہ کے بل فرش پر گرتے گرتے بچا۔ کوٹھڑی یا کمرے کا دروازہ زور سے بند کر دیا گیا۔ باہر سے تالا لگانے کی آواز بھی آئی۔ میں نے پہلا کام یہ کیا کہ آنکھوں پر بندھی ہوئی پٹی کھول دی۔ آنکھیں کھلتے ہی مجھے ہلکی ہلکی روشنی نظر آئی۔ یہ روشنی دروازے کے اُوپر جو روشندان تھا اس میں سے آ رہی تھی۔ اور یہ دن کی روشنی تھی۔ باہر دن نکل آیا تھا۔ میں نے کوٹھڑی کا جائزہ لیا۔ یہ ایک چھوٹا سا پرانی پتھریلی دیواروں والا کمرہ تھا جس میں کوئی کھڑکی نہیں تھی۔ صرف ایک روشندان ہی تھا۔ دیوار کے ساتھ بانس کی ایک چارپائی پڑی تھی۔ میں آہستہ سے چارپائی پر بیٹھ گیا۔

سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور سوچنے لگا کہ یہ آناً فاناً کیا سے کیا ہو گیا ہے؟ اور اب آگے کیا ہو سکتا ہے؟ وہ لوگ میرا پستول لے گئے تھے جو میرا نہیں تھا بلکہ اُن کے ایک ساتھی ہی کا تھا جو جمیلہ کو حویلی سے نکال کر دوسرے آدمی کے ساتھ جنگل میں لے گیا تھا اور جس کو میں نے چاقو مار کر ہلاک کر دیا تھا اور اسی پستول کی ایک گولی سے اُس کے ساتھی کو بھی مار ڈالا تھا۔ یہ لوگ اتنے احمق نہیں ہیں، جرائم پیشہ لوگ ہیں پستول انہیں سب کچھ بتا دے گا اور دوسرا آلہ قتل چاقو بھی وہ لے گئے تھے۔ وہ چاقو بھی انہیں ساری کہانی بیان کر دے گا۔

کچھ ہی دیر کے بعد کمرے کا تالہ کھلا، وہی تین آدمی اندر آئے اور مجھے بازوؤں سے پکڑ کر لے گئے۔ میں یہی سمجھ رہا تھا کہ یہ لوگ مجھے اپنے کسی دیوی دیوتا کے آگے قربان کرنے لے جا رہے ہیں۔ لیکن وہ مجھے ایک ایسے کمرے میں لے گئے جو ہر قسم کے سامانِ آرائش سے آراستہ تھا۔ فرش پر لال قالین بچھا تھا، دیواروں پر فلم ایکٹرسوں اور یورپ کی ماڈل گرلز کی نیم عریاں بڑی بڑی تصویریں آویزاں تھیں۔ ایک عورت

شاندار پلنگ پر تکیوں سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ اُس کے ایک ہاتھ میں سگریٹ سلگ رہا تھا۔ اُس عورت نے جامنی رنگ کی ریشمی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ بالوں کا پیچھے جوڑا کیا ہوا تھا جس میں موسمی پھولوں کا گجرا سج رہا تھا۔ اس عورت کی عمر تیس پینتیس کے درمیان ہو گی۔ جسم ذرا بھاری تھا۔ ناک ستواں تھی۔ سیاہ آنکھوں میں ایک عجیب سی طلسمی چمک تھی۔ رنگ کھلتا ہوا گندمی تھا۔ سینے پر سے ساڑھی کا پلو ذرا سا ہٹا ہوا تھا اور اُس کا سیاہ بلاؤز نظر آ رہا تھا۔ چہرہ پُرکشش اور تر و تازہ تھا۔ اُس نے کافی میک اَپ کیا ہوا تھا۔ اُس نے جو پرفیوم لگا رکھا تھا وہ بڑا قیمتی لگتا تھا اور اُس کی خوشبو سارے کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔

مجھے اس عورت کے سامنے پیش کیا گیا۔ وہ عورت مسلسل مجھے دل میں اُتر جانے والی نظروں سے تک رہی تھی۔ اُس نے ہاتھ کا اشارہ کیا۔ جن آدمیوں نے مجھے بازوؤں سے پکڑ رکھا تھا وہ میرے بازو چھوڑ کر الگ ہو کر کھڑے ہو گئے۔ اُن میں سے ایک نے بڑے ادب سے کہا۔

''دُلاری ماں! اس نے ہمارے ان دو آدمیوں کا خون کیا ہے جو سیتا کنڈ کی کنجی کو نکال کر لے جا رہے تھے۔''

اُس آدمی نے جیب سے ایک پستول اور میرا چاقو نکال کر دُلاری ماں کے پلنگ کے پاس تپائی پر رکھ دیا۔ میں پہلی بار اُس بدنام زمانہ نائیکہ کے درشن کر رہا تھا جس نے اُرملا کو بھی اغواء کرایا تھا یا اُرملا اُس کے ہاتھ بیچ دی گئی تھی۔ دُلاری ماں نے سگریٹ کا لمبا سا کش لیا اور دُھواں اُڑاتے ہوئے میری طرف گہری نظروں سے دیکھ کر کہا۔

''اِدھر کیا کرنے آئے تھے؟''

اس سے پہلے کہ میں دُلاری ماتا کے آگے وہی فرضی کہانی دُہراتا جو میں اس سے پہلے دونوں بلکہ تینوں آدمیوں کو سنا چکا تھا، اُس آدمی نے خود ہی میرے بیان کو دہرا دیا۔ دُلاری ماتا بڑے غور سے سنتی رہی۔ اُس نے مجھ سے پوچھا۔

''کیا نام ہے تمہارا؟''

میں نے سوچ لیا تھا کہ ان لوگوں کے سامنے اپنے آپ کو ہندو ظاہر کرنا ٹھیک نہیں ہو گا کیونکہ میرے معائنے کے بعد فوراً یہ جھوٹ کھل جائے گا کہ میں ہندو نہیں مسلمان

ہوں۔ اس لئے یہاں اپنے آپ کو مسلمان بتانا ہی درست ہو گا۔ میں نے اپنا اصلی نام پھر بھی چھپا لیا اور کہا۔

''میرا نام جمال ہے اور میں پونا شہر میں پرانے سکوں اور تاریخی یعنی اتہاسک چیزوں کا کاروبار کرتا ہوں۔ میں ایسی ہی چیزوں کی تلاش میں اس حویلی کو بکرما جیت راجہ کے وقتوں کا کوئی کھنڈر سمجھ کر آ گیا تھا۔''

دُلاری ماتا نے میز پر رکھے پستول کی طرف اشارہ کیا اور مجھ سے پوچھا۔

''یہ پستول ہمارے آدمی کا ہے۔ اس پستول سے تم نے ہمارے ایک آدمی کا خون کیا ہے۔ اُس کے جسم سے اس پستول کی گولی نکلی ہے۔ یہ تمہارے پاس کیسے آ گیا؟''

یہ ایک ایسا سوال تھا جس کی مجھے پہلے ہی سے توقع تھی کہ مجھ سے ضرور پوچھا جائے گا۔ اگر میں وہ پستول حویلی کے باہر ہی کہیں پھینک دیتا تو یہ لوگ شاید میرے فرضی بیان پر یقین کر لیتے۔ لیکن مجھے کیا پتہ تھا کہ یہی پستول جس کو میں نے اپنی جان کی حفاظت کے واسطے اپنے پاس رکھا تھا میری جان کے لئے عذاب بن جائے گا۔ میرے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا سوائے اس کے کہ میں صاف انکار کر دُوں۔ چنانچہ میں نے پستول کو دیکھ کر کہا۔

''یہ میرا پستول نہیں ہے۔ مجھے یہ جنگل میں ایک جگہ پڑا ہوا مل گیا تھا۔ میں نے اسے اپنے پاس رکھ لیا یہ سمجھ کر کہ کسی شکاری کے تھیلے سے گر پڑا ہے۔''

دُلاری ماتا نے چاقو اُٹھا کر مجھے دکھایا اور کہا۔ ''یہ چاقو تو تمہارا ہی ہے ناں؟''

میں نے اثبات میں سر ہلا کر کہا۔ ''ہاں! یہ چاقو ضرور میرا ہے۔ میں جب بھی اپنے کاروبار کے سلسلے میں ویران جگہوں پر پرانے قلعوں کے کھنڈروں میں جاتا ہوں تو یہ چاقو اپنے پاس رکھتا ہوں۔ صرف اپنی حفاظت کے لئے۔''

دُلاری ماتا کہنے لگی۔ ''لیکن اس چاقو سے تم نے ہمارے ایک آدمی کا خون کر دیا ہے۔ اس کی بھی تمہیں سزا ضرور ملے گی۔''

میں نے کہا۔ ''یہ بالکل جھوٹ ہے۔ میں نے کسی کا خون نہیں کیا نہ پستول سے اور نہ اس چاقو سے۔ میں ایک کمزور دل کاروباری نوجوان ہوں۔ مجھے ویسے ہی خون دیکھ کر چکر آ جاتا ہے میں بھلا کسی کا کیسے خون کر سکتا ہوں؟''

ڈلاری ماتا نے اپنا سگریٹ چاندی کے ایش ٹرے میں بجھاتے ہوئے اپنے آدمیوں سے کہا۔ ''اسے لے جا کر بند کر دو!''

مجھے اُسی کوٹھڑی میں لے جا کر بند کر دیا گیا جہاں سے مجھے لا کر ڈلاری ماتا کے سامنے پیش کیا گیا تھا۔ میں اپنی تقدیر کا لکھا صاف پڑھ رہا تھا۔ ان لوگوں کو یقین ہو چکا تھا کہ ان کے دونوں آدمیوں کو میں نے ہی قتل کیا ہے۔ اب میرا انجام کھلی کتاب کی طرح میرے سامنے تھا۔ مجھے اپنی اتنی فکر نہیں تھی۔ فکر تھی تو صرف اُرملا کی تھی کہ اُسے یہاں سے کس طرح نکالا جائے؟ ڈلاری ماتا کی آنکھوں میں مجھے دیکھ کر جو ہلکی سی چمک آئی تھی اس سے مجھے موہوم سا اندازہ ہو گیا تھا کہ اُس نے اپنے پسندیدہ آدمیوں کی نوٹ بُک میں میرا نام درج کر لیا ہے۔ کئی برسوں کی سیر و سیاحت اور اس دوران مختلف لوگوں کے میل ملاپ سے مجھے اتنا تجربہ ہو گیا تھا کہ میں انسان کے چہرے پر اُبھرنے والے ہلکے سے ہلکے تاثر کو بھی پڑھ سکتا تھا۔ ڈلاری ماتا کے بارے میں یہ اندازہ میں نے اپنے انہی تجربوں کی بنا پر لگایا تھا۔ لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ اس کی پسند یا ناپسند میری قسمت کے فیصلے کو نہیں بدل سکتی۔ میں اُس کے دو آدمیوں کا قاتل تھا اور میری سزا موت ہی ہو سکتی تھی۔

لیکن اب ایک عجیب بات ہوئی۔

دوسرے دن مجھے اکیلی ویران کوٹھڑی میں سے نکال کر ایک ایسے کمرے میں پہنچا دیا گیا جہاں ایک پلنگ بھی بچھا ہوا تھا اور جس پر بستر لگا ہوا تھا۔ پرانی کوٹھڑی میں مجھے باسی روٹی کے ٹکڑے کالی چائے کے ساتھ کھانے کو دیئے گئے تھے لیکن اس آرام دہ کمرے میں آتے ہی ایک آدمی میرے لئے باقاعدہ ناشتہ لے کر آیا جس میں دُودھ اور اُبلا ہوا انڈہ بھی تھا۔ میرے اندازے کی تصدیق ہو گئی۔ اب اس کا انکشاف ہونا باقی تھا کہ ڈلاری ماتا نے مجھے کیوں اور کس لئے پسند کیا ہے؟ اور میری یہ خاطر و مدرات کس لئے ہونے لگی ہے؟ مگر یہ ایک دوسرا یعنی ثانوی سوال تھا۔ سب سے اہم مسئلہ اُرملا کا تھا۔ جمیلہ کے بیان کے مطابق اُرملا اسی حویلی کی کسی کوٹھڑی میں بند تھی۔ اُس کا سراغ لگانا بے حد ضروری تھا۔ اس کے بعد ہی میں اُسے وہاں سے بھگانے اور اس کے ساتھ خود بھی فرار ہونے کی کوئی سکیم بنا سکتا تھا۔

مجھے ایک آرام دہ کمرے میں ضرور لایا گیا تھا مگر مجھے اس کمرے سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں تھی۔ جو آدمی میرے لئے ناشتہ یا کھانا لے کر آتا اس کے ساتھ ایک محافظ ہوتا جس کے ہاتھ میں پستول ہوتا تھا۔ جب وہ جاتے تو کمرے کو باہر سے تالا لگا دیا جاتا تھا۔ میں ایک جگہ نشان لگا کر دنوں کا برابر حساب رکھ رہا تھا۔

مجھے وہاں قید میں پڑے تیسرا دن تھا کہ رات کے وقت میں نے طبلے سارنگی کی آواز سنی۔ یہ آواز کسی تیسرے یا چوتھے کمرے سے آ رہی تھی۔ پھر گھنگھرو بھی چھنکنے لگے جیسے کوئی ڈانس کر رہا ہو یا کر رہی ہو۔ مجھے یاد آ گیا کہ جمیلہ کے بقول اس حویلی میں کروڑ پتی بڈھے صنعت کار رات کے وقت عیاشی کرنے آتے ہیں اور ڈلاری ماتا حویلی میں اغوا کر کے لائی گئی لڑکیوں سے اُن کا دل بہلاتی ہے اور اس کے عوض ان بڈھے تاجروں سے منہ مانگی رقمیں وصول کرتی ہے۔ یہ طبلے، سارنگی، گھنگھرو اسی سلسلے میں چھنک رہے تھے۔ اچانک میرے دل میں خیال آیا کہ کہیں ان لوگوں نے اُرملا کو بھی تو اس کام پر نہیں لگا دیا؟ کہیں یہ اُرملا تو ڈانس نہیں کر رہی؟ ساتھ کسی عورت کے گانے کی آواز بھی آنے لگی۔

میں نے اس آواز کو بڑے غور سے کان لگا کر سنا۔ مجھے وہ اُرملا کی آواز نہ لگی۔ محبت میں جہاں بدگمانیاں بہت ہوتی ہیں وہاں خوش فہمیاں بھی بہت ہوتی ہیں۔ میرا دل ماننے کو تیار نہیں تھا کہ اُرملا کسی بڈھے یا جوان کروڑ پتی عیاش صنعت کار کے آگے گا رہی ہے اور ڈانس کر رہی ہے۔ لیکن ایسا ہو بھی سکتا تھا۔ ڈلاری ماتا نے اُسے یونہی تو نہیں خریدا تھا۔ عورت کے گانے کی آواز اور ساتھ گھنگھروؤں کے چھناکے دیر تک سنائی دیتے رہے اور میں دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتا رہا۔ یہ رقص و سرود جاری تھا کہ مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ ایک مدت بعد اچھی اور باقاعدہ خوراک ملی تھی غنودگی تو طاری ہونی ہی تھی۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے ساتھ ہی میں سو گیا۔ پھر مجھے کوئی ہوش نہ رہا۔

اگلے روز میں دیر تک سویا رہا۔ میرا ناشتہ میز پر ویسے ہی پڑا تھا۔ میں اُٹھا۔ کمرے کے ساتھ ہی چھوٹا سا غسل خانہ تھا وہاں جا کر منہ ہاتھ دھویا اور چارپائی پر آ کر بیٹھ گیا۔ اس کمرے میں ایک ہی کھڑکی تھی جو بند تھی۔ میں نے اُٹھ کر اُسے کھولا تو معلوم ہوا کہ کھڑکی میں لوہے کی سلاخیں لگی ہیں۔ باہر کھڑکی کے آگے کوئی دس فٹ کے فاصلے پر

دیوار کھڑی تھی جس کی وجہ سے باہر کا منظر دکھائی نہیں دیتا تھا۔ صرف دن کی روشنی آرہی تھی۔ کوئی آواز بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔ میں نے کھڑکی کی سلاخوں میں سے ایک سلاخ کو پکڑ کر ہلانے کی کوشش کی مگر وہ اپنی جگہ پر مضبوطی سے لگی ہوئی تھی۔ میں واپس آ کر چارپائی پر بیٹھ گیا اور اپنے پریشان خیالات میں غرق ہو گیا۔ دوپہر کو ایک آدمی کھانا لے کر آیا تو میں نے اُس سے کہا۔

''میں دُلاری ماتا سے ملنا چاہتا ہوں۔ مجھے اُس کے پاس لے چلو۔''

وہ بڑی بڑی مونچھوں والا خونخوار قسم کا آدمی تھا۔ اُس نے صرف اپنی انگارہ ایسی سرخ آنکھوں سے مجھے دیکھا، کوئی جواب نہ دیا اور ناشتے کی ٹرے اُٹھا کر چلا گیا۔ محافظ جو اُس کے ساتھ آیا تھا پستول ہاتھ میں لئے دروازے کے پاس ہی کھڑا رہا۔ یہ عجیب قسم کی قید تھی کہ میرے آرام کا بھی ہر طرح سے خیال رکھا جا رہا تھا اور مجھے کمرے سے باہر نکلنے کی بھی اجازت نہیں تھی۔ اس دوران دو ایک بار میرا دھیان اپنی دشمن جاں کانچی کی طرف گیا۔ اُسے مجھ سے قہر آلود آواز میں مخاطب ہوئے کافی دن گزر گئے تھے۔ ابھی تک مجھے اُس کی آواز دوبارہ سنائی نہیں دی تھی۔ اُرملا کی انگوٹھی میری اُنگلی میں موجود تھی۔ اگر یہ انگوٹھی کالی نہ پڑ گئی ہوتی تو حویلی کے بدمعاش میری یہ سونے کی انگوٹھی بھی اُتار کر لے جاتے۔ اس کی سیاہ رنگت نے مجھے اُرملا کی انگوٹھی سے محروم ہونے سے بچا لیا تھا۔ اس لئے کہ اُرملا کی دی ہوئی یہ انگوٹھی ہی تھی جس نے مجھے میری دشمن جاں کانچی کے قاتلانہ حملوں سے بچایا ہوا تھا۔

سارا دن میں نے اُس آرام دہ کمرے میں سخت بے آرامی سے گزار دیا۔ رات ہوئی تو ایک آدمی کمرے میں آ کر لالٹین روشن کر گیا۔ اس کے بعد وہی خونخوار مونچھوں والا ڈریکولا ٹائپ کا آدمی اسلحہ بردار محافظ کے ساتھ آیا اور کھانا رکھ کر چلا گیا۔ میں نے کھانا زہر مار کیا اور چارپائی پر لیٹ گیا۔ اُرملا کے بارے میں پریشان کر دینے والے خیالوں نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہاں سے اُرملا کو کیسے لے کر فرار ہوں گا؟ میرا مشن تو اُرملا کو وہاں سے بھگا لے جانا ہی تھا لیکن یہ مشن ایک جگہ آ کر ساکت ہو گیا تھا۔ رُک گیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد پھر طبلے سارنگی اور گھنگھروؤں کی آوازیں آنے لگیں۔ تیسرے

چوتھے کمرے میں رقص و سرود کا پروگرام شروع ہو گیا تھا۔ نہ جانے کہاں کہاں سے اغوا کر کے لائی گئی مجبور و بے بس غریب مگر جوان اور خوبصورت لڑکیوں کو دولت مند عیاش بڈھوں کے آگے گوایا اور نچوایا جا رہا تھا۔ مجھے پھر وہم ہونے لگا کہ ہو سکتا ہے اُرملا ہی کو گوایا اور نچوایا جا رہا ہو۔ اس وہم نے جیسے میرے جسم میں زہر سا گھول دیا۔ میں بے چین ہو کر پہلو بدلنے لگا۔ گانے اور گھنگھروؤں کی آواز برابر آ رہی تھی۔ میں نے کانوں کو دونوں ہاتھوں سے بند کرنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ نیند کوسوں دُور چلی گئی تھی۔ بار بار خیال اُرملا کی طرف جا رہا تھا۔

آخر یہ ناقابل برداشت گھڑیاں گزر گئیں اور گانے بجانے کی آوازیں بند ہو گئیں۔ اس کے بعد گہری خاموشی چھا گئی۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ نیند بالکل نہیں آ رہی تھی۔ باہر سے کمرے کا تالا کھلنے کی آواز نے میرے کان کھڑے کر دیئے۔ میں لیٹے لیٹے دروازے کو تکنے لگا۔ دروازہ کھلا اور تین خونخوار آدمی اندر آ گئے۔ اُنہوں نے آتے ہی مجھے بازوؤں سے پکڑ کر چارپائی سے اُٹھایا اور کھینچتے ہوئے باہر لے آئے۔ ایک نیم تاریک برآمدے سے گزرنے کے بعد ایک جگہ سیڑھیاں اُوپر جاتی تھیں۔ وہ مجھے اُوپر لے گئے۔ اُوپر ایک چھوٹا سا پرانی وضع کا ستونوں والا دالان تھا جس کے کونے میں ایک دروازہ تھا۔ ایک آدمی نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ جن دو آدمیوں نے مجھے پکڑ رکھا تھا اُنہوں نے مجھے دروازے کے اندر دھکیل کر دروازہ بند کر کے باہر سے تالا لگا دیا۔

میں حیران پریشان نظروں سے کمرے کو دیکھنے لگا۔

اس کمرے میں صرف ایک پلنگ بچھا ہوا تھا۔ پلنگ پر بستر لگا ہوا تھا۔ پلنگ کے پاس ایک سنگ مرمر کی چھوٹی میز رکھی تھی۔ کمرے کے وسط میں ایک ستون تھا جو چھت تک گیا ہوا تھا۔ میں حیرت کے عالم میں کھڑا کمرے کا جائزہ لے رہا تھا کہ کمرے کی دیوار پر گرا ہوا پردہ ایک طرف سے ہٹا اور دُلاری ماتا میرے سامنے کھڑی تھی۔ کمرے میں ایک لالٹین پہلے سے روشن تھی۔ یہ دیکھ کر مجھے بڑا تعجب ہوا کہ دُلاری ماتا نے اپنے ہاتھ میں چمڑے کا ہنٹر لپیٹ کر پکڑ رکھا تھا۔ کیا یہ مجھے ہنٹروں سے مارنے آئی ہے؟ میں نے سوچا۔ مگر اُسے کیا ضرورت پڑی تھی کہ خود مجھے ہنٹروں سے پیٹے؟ وہ یہ کام اپنے کسی

خونخوار آدمی سے لے سکتی تھی۔ میں اسی اُلجھن میں تھا کہ دُلاری ماتا میرے پاس آ گئ
اُس کے بال جوڑے کی شکل میں پیچھے بندھے ہوئے تھے۔ چہرے پر پورا میک اَپ
ہوا تھا۔ اُن کی آنکھوں میں کچھ زیادہ ہی چمک تھی۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔ اُ
کی مسکراہٹ نے مجھے خوفزدہ کر دیا۔ یہ وہ مسکراہٹ تھی جو کسی قصاب کے چہرے پر اُ
وقت آتی ہے جب وہ کسی پلے ہوئے صحت مند بکرے کو اپنی دُکان پر ذبح کرنے ۔
لئے پسند کرتا ہے۔ وہ پلنگ کی طرف گئی، ہنٹر پلنگ پر پھینکا، پلنگ کے گدیلے کے ۔
سے رسّی نکالی اور میرے پاس آ کر کہنے لگی۔

''جو کچھ میں کہوں اسے چپ چاپ کرتے جاؤ۔ اِدھر ستون کے پاس آؤ۔''

میں اُس کے ساتھ ستون کے پاس آ گیا۔ اُس نے رسّی کا ٹکڑا میرے ہاتھ میں
دیا اور میری طرف پشت کر کے حکم دینے کے لہجے میں کہا۔

''میری کمر پر سے ساڑھی ہٹا دو۔''

میں ذرا جھجکا تو اُس نے سخت آواز میں کہا۔ ''جو میں کہتی ہوں وہ کرو!''

میں کیا کرتا جو اُس نے کہا تھا مجھے اس پر عمل کرنا پڑا۔ میں نے دُلاری ماتا کی کمر
سے ساڑھی ہٹا دی۔ اب یہ انکشاف ہوا کہ اُس نے ساڑھی کے نیچے کچھ بھی نہیں پہنا
تھا۔ وہ میری طرف پیٹھ کر کے ستون کے ساتھ جا کر لگ گئی اور بولی۔

''میرے سامنے کی طرف آؤ!''

میں اُس کے سامنے کی طرف آ گیا۔ دُلاری ماتا نے دونوں ہاتھ ستون میں سے با
نکال کر ایک دوسرے سے جوڑ دیئے اور حکم دیا۔

''رسّی سے میرے دونوں ہاتھ باندھ دو!''

میں ایک بار پھر جھجکا تو اُس نے کڑک کر کہا۔ ''جو کہتی ہوں کرو۔''

میں نے اُس کے دونوں ہاتھ کلائیوں پر سے رسّی سے باندھ دیئے۔ کچھ سمجھ میں نہ
آتا تھا کہ یہ عورت کیا کر رہی ہے اور کس لئے کر رہی ہے؟ لالٹین کی روشنی میں اُس
سینہ نیچے تک برہنہ ہو رہا تھا۔ مجھے شرم آ گئی۔ میں نے منہ دوسری طرف کر لیا۔ دُلا
ماتا نے اُسی کڑک دار آواز میں نیا حکم دیا۔

''پلنگ پر سے ہنٹر اُٹھا لاؤ۔ جلدی کرو۔''

میں دوڑ کر پلنگ تک گیا اور ہنٹر اُٹھا کر دُلاری ماتا کے سامنے آ کر اُسے پکڑانا چاہا تو
وہ اپنی طرف سے دل موہ لینے والی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

''اسے اپنے ہاتھ میں رکھو اور میرے پیچھے آ جاؤ!''

میں مشینی آدمی کی طرح اُس کے ہر حکم کی تعمیل کرنے پر مجبور تھا۔ وہ جو حکم دیتی تھی
میں اپنے آپ اُس پر عمل کر رہا تھا۔ چنانچہ میں ہنٹر ہاتھ میں لے کر دُلاری کے پیچھے آ
گیا۔ دُلاری کی کمر برہنہ تھی۔ مجھے بڑی گھن آ رہی تھی مگر وہاں کھڑے رہنے پر مجبور تھا۔
اب دُلاری نے ایک ایسا حکم دیا جس کو سن کر میرے جسم میں خون کی لہر دوڑ گئی۔ اُس
نے حکم دیا۔ ''میری کمر پر ہنٹر مارنے شروع کر دو۔ اور جب تک میں نے روکوں ہنٹر
مارتے جاؤ۔''

اپنی آوارہ گردیوں کے دوران مجھے بڑی بڑی حیرت انگیز اور عجیب و غریب چیزوں
سے واسطہ پڑ چکا تھا مگر ایسی صورتِ حال کبھی پیش نہیں آئی تھی۔ ایک تو کسی عورت کو
ہنٹروں سے پیٹنا اور پھر ایک ایسی عورت کو پیٹنا جو کسی بھی وقت میرے قتل کا حکم صادر کر
سکتی تھی آپ خود سوچ سکتے ہیں کہ یہ کس قدر ہمت طلب اور خوفناک کام تھا جس پر عمل
کرنے کا دُلاری نے مجھے حکم دیا تھا۔

قدرتی طور پر میرا ہنٹر والا ہاتھ نیچے ہی رہا۔ دُلاری ماتا نے ستون کے ساتھ لگے
لگے تیز آواز میں حکم دیا۔ ''مجھے ہنٹر سے پیٹنا شروع کرو۔''

میں ایک بار تو کانپ گیا۔ اس کے باوجود اس عجیب و غریب قسم کی عورت کو ہنٹر
مارنے کے لئے میرا ہاتھ نہیں اُٹھ رہا تھا۔ جب دوسری بار دُلاری ماتا نے چلا کر مجھے حکم
دیا تو میرا ہاتھ اپنے آپ اُوپر کو اُٹھا اور میں نے ہنٹر کی ایک ضرب دُلاری کی برہنہ کمر پر
لگائی۔ ہنٹر کی ضرب لگتے ہی دُلاری کے منہ سے عجیب سی آواز نکلی۔ یہ درد سے بلبلانے
والی آواز نہیں تھی بلکہ ایسی آواز تھی جیسے میں نے اُس کے زخم پر مرہم لگا دیا ہو اور اُسے
تسکین پہنچی ہو۔

قدرتی طور پر میں نے ہاتھ نرم رکھا تھا۔ دُلاری نے حکم دیا۔

''پیٹتے جاؤ! ہاتھ مت روکو۔ زور سے پیٹو۔''

اس کے باوجود میں زور سے نہیں پیٹ رہا تھا۔ لیکن دُلاری کو بے حد تسکین مل رہی

تھی۔ وہ بار بار زور سے پیٹنے کا حکم صادر کر رہی تھی۔ ایک دو ہاتھ میں نے ذرا سخت
لگا دیئے جس پر وہ بے حد خوش ہوئی۔ دُلاری کے گورے جسم پر جہاں جہاں ہنٹر پڑ ر
تھے وہاں سے خون تو نہیں نکلا تھا لیکن نشان پڑتے جا رہے تھے۔ یہ خود اذیتی کا عمل کو
دس منٹ تک جاری رہا۔ اس کے بعد میں نے تھک کر ہاتھ نیچے کر لیا۔ دُلاری کا
شاید نشہ پورا ہو گیا تھا۔ وہ ایک قسم کی سرخوشی کے عالم میں کمزور آواز میں کراہتے ہو
اپنا سر دائیں بائیں کرتی جا رہی تھی۔

میں جلدی سے پلنگ پر جا کر بیٹھ گیا۔ دُلاری ستون کے ساتھ چمٹی اسی حالت میں
دائیں بائیں کرتی چلاتی اور کراہتی رہی۔ اُس کے بال کھل کر اُس کی کمر پر بکھر گئے تھ
اُس نے دھیمی آواز میں مجھے حکم دیا۔

"میرے ہاتھ کھول دو جمال۔"

اُسے میرا فرضی نام یاد تھا۔ میں فوراً اُٹھا اور ستون کے پاس اُس کے سامنے
جانب آ کر اُس کی کلائیوں پر بندھی ہوئی رسّی کھول دی۔ دُلاری ماتا پر جیسے نشہ چڑھا
تھا۔ اُس کے قدم ڈگمگائے۔ دونوں بازو میری طرف کر کے بولی۔

"مجھے سہارا دے کر پلنگ پر لے چلو!"

میں اُسے سہارا دینے کے لئے اُس کے قریب آیا تو اُس نے اپنے بھاری جسم کا
بوجھ مجھ پر ڈال دیا۔ میں کسی نہ کسی طرح اُسے سنبھالتا ہوا پلنگ تک لے آیا اور اُ
پلنگ پر لٹا دیا۔ لیٹتے ہی دُلاری ماتا نے ایک لمبا گہرا سانس لیا اور آنکھیں بند کر لیں
میں احمقوں کی طرح کھڑا اُسے تکتا رہا کہ اب آنکھ کھول کر مجھے کوئی نیا حکم دیتی ہے۔
اُس نے آنکھیں کھولنے کی بجائے بڑے بڑے خوفناک قسم کے خراٹے لینے شروع کر د
اتنے میں کمرے کا دروازہ کھلا، وہی تین خونخوار آدمی اندر آئے، مجھے بازوؤں سے
اور واپس میرے کمرے میں لے جا کر بند کر دیا۔

یہ ڈرامہ دوسری رات کو بھی دُہرایا گیا۔ مجھے پکڑ کر دُلاری ماتا کے کمرے میں
جایا جاتا۔ میں اُسے ہنٹروں سے پیٹتا۔ وہ مار کھا کر پلنگ پر بے سدھ ہو کر پڑ جاتی
مجھے واپس میرے کمرے میں پہنچا دیا جاتا۔ میں اس نتیجے پر پہنچا کہ ہنٹروں کی مار
میں اس عورت کو خاص قسم کی جنسی تسکین ملتی ہے۔ اس قسم کی اذیت پسند عورتوں

بارے میں کہیں ایک مضمون پڑھ چکا تھا۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ اس "نیک کام"
کے لئے اُس کو میرا انتخاب کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اُس کے پاس ہنٹروں سے پیٹنے
والے مجھ سے زیادہ طاقتور لوگ موجود تھے۔ اُس نے خاص طور پر مجھے ہی کیوں چنا؟
لیکن میرے پاس اس قسم کے معمے حل کرنے کا وقت نہیں تھا۔ میری ساری توجہ اپنی محبوبہ
اُرملا کے بارے میں یہ معلوم کرنے پر تھی کہ اگر وہ اس حویلی میں ہے تو کیا وہ اسی جگہ،
اسی کوٹھڑی میں رات کو بند کر دی جاتی ہے جس کے بارے میں جمیلہ نے مجھے بتایا تھا؟
اور اس کے بعد اُسے اپنے ساتھ وہاں سے نکال کر بھگا لے جانے کی کوئی سکیم سوچنی
تھی۔ لیکن کمرے میں بند رہ کر میں یہ معلومات حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ دُلاری ماتا کو
ہنٹروں سے پیٹنے کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ مجھے حویلی کی قید میں اے کلاس مل گئی تھی۔ مجھے
پہننے کو نئی بش شرٹ اور نئی پتلون مل گئی تھی اور رات کو مجھے تھوڑا سا گھی ملا کر گرم دودھ
بھی پلایا جاتا تھا۔ مگر مجھے تو اُرملا کی فکر تھی۔ یہ تو یقینی بات تھی کہ رات کو جو عیاش دولت
مند بڈھے یا ادھیڑ عمر وہاں چھپ کر مجرا سننے آتے ہیں ان کے آگے اُرملا کو بھی ضرور
نچوایا جاتا ہو گا۔ مجھے ڈر یہ لگا ہوا تھا کہ اگر کسی بڈھے بدمعاش کو اُرملا پسند آ گئی تو وہ
دُلاری ماتا کو قیمت چکا کر اُسے اپنے ساتھ ہی نہ لے جائے۔

یہ بات میرے کانوں میں پڑ چکی تھی بلکہ یہ عثمان بھائی نے ہی بتائی تھی کہ اگر کسی
خوبصورت لڑکی کی دُلاری ماتا کو اچھی خاصی رقم مل جائے تو وہ اُسے کسی دولت مند
بڈھے کے ہاتھ فروخت بھی کر دیتی ہے۔ اور اُرملا بھی خوبصورت اور نازک اندام تھی۔
یہ سوچ کر میں کسی وقت بہت زیادہ پریشان ہو جاتا۔

اسی طرح ایک ہفتہ گزر گیا۔

میں دُلاری ماتا کو ہنٹر مار مار کر تنگ آ گیا مگر وہ برابر ہر رات مجھ سے بڑی خوشی اور
عقیدت کے ساتھ ہنٹر کھاتی رہی۔ عقیدت کا لفظ میں نے اس لئے استعمال کیا ہے کیونکہ
ایک رات ہنٹر کھانے کے بعد اُس نے پلنگ پر لیٹنے سے پہلے مجھے پلنگ پر اس طرح بٹھا
لیا کہ میرے پاؤں پلنگ سے نیچے لٹک رہے تھے۔ پھر اُس نے میرے جوتے خود
اُتارے، میرے پیروں پر ایک برتن میں رکھا ہوا کوئی خاص پانی چھڑکا، میرے پیروں
کے درمیان ایک دیا جلایا، اپنے جوڑے میں سے دو پھول اُتار کر دیئے کے پاس رکھے

اور جھک کر میرے پیروں کو چوم لیا۔ میں نے ڈر کر پیر پیچھے کرنے چاہے تو اُس نے چ
کر حکم دیا۔

''خبردار! پیر نہ ہلانا۔''

میں وہیں پتھر بن گیا۔ تب مجھے شک گزرا کہ یہ عورت ہنٹر کھا کر کسی قسم کی جنسی تسکین حاصل نہیں کر رہی بلکہ اپنے دھرم کے مطابق کوئی خاص قسم کی رسم ادا کر رہی ہے۔ ایک بار میں نے اُس سے پوچھنے کی کوشش بھی کی کہ وہ ایسا کیوں کر رہی ہے تو اُس نے میری طرف غضب ناک آنکھوں سے دیکھا اور غرا کر کہا۔

''خبردار! پھر یہ سوال کیا تو میں تمہاری کھال کھنچوا دوں گی۔''

میں نے دوسری بار پوچھنے کی جرأت ہی نہ کی۔

ڈلاری ماتا کو ہنٹروں سے پیٹنے کا ڈرامہ رات گہری ہو جانے پر شروع ہوتا تھا او
تقریباً ایک گھنٹے تک جاری رہتا تھا۔ اس کے بعد ڈلاری سو جاتی تھی اور مجھے میرے کمرے میں پہنچا دیا جاتا تھا۔ اس کے بعد میرے کمرے میں کوئی نہیں آتا تھا۔ میں کمرے میں اکیلا ہوتا تھا۔ ایک دن جب دونوں خونخوار بدمعاش مجھے میرے کمرے میں ڈال کر چلے گئے تو میں کچھ دیر پلنگ پر لیٹا رہا اس کے بعد آہستہ سے اُٹھ کر کھڑکی کے پاس گیا۔ کھڑکی کو بڑی احتیاط سے کھولا کہ آواز پیدا نہ ہو کیونکہ میرا خیال تھا کہ میرے بند کمرے کے باہر کوئی نہ کوئی اسلحہ بردار محافظ ضرور پہرہ دے رہا ہوگا۔ کھڑکی کا ایک پٹ کھول کر میں نے سلاخوں کا کسی اور ہی نظر سے جائزہ لینا شروع کر دیا۔ میں ایک ایک سلاخ کو پکڑ کر ہلکے ہلکے جھٹکے دیتا مگر تمام سلاخیں بڑی مضبوطی سے اپنی اپنی جگہ کھڑکی کی اینٹوں کی پٹی میں دھنسی ہوئی تھیں۔ میں نے ایک سلاخ کو دائیں ہاتھ سے ز
کر جھٹکا دیا تو مجھے محسوس ہوا کہ وہ ذرا سی اپنی جگہ سے ہلی ہوئی ہے۔

اُمید کی یہ ایک ایسی بے نور سی کرن تھی جو مایوسی کے سیاہ بادلوں میں بڑی مشکل سے نظر آ رہی تھی۔ مگر اس اُمید کی ایک موہوم سی کرن نے میرے آہنی عزم کو بیدار کر دیا تھا۔ میں نے اب یہ معمول بنا لیا کہ ہر رات جب مجھے ڈلاری ماتا کے کمرے سے لا کر وہاں ڈال دیا جاتا اور دونوں خونی آدمیوں کو گئے پندرہ بیس منٹ گزر جاتے تو بستر سے اُٹھ کر دبے پاؤں چلتا کھڑکی کے پاس آتا اور اس ذرا سی ہلی ہوئی سلاخ کو پکڑ کر

زور لگا کر ہلکے ہلکے جھٹکے دینے لگتا۔ چوتھی رات سلاخ اپنی جگہ سے اُکھڑ گئی مگر میں نے اُسے کھڑکی کی اینٹوں میں سے باہر نکالنے کی بجائے اسی جگہ رہنے دیا۔ اب میں نے اس کے ساتھ والی سلاخ پر یہی عمل شروع کر دیا۔ تین چار راتوں کے بعد وہ سلاخ بھی اپنی جگہ سے ہل گئی اور پھر اُکھڑ گئی۔ میں نے اُسے بھی اپنی جگہ پر قائم رکھا۔ اس طرح دس پندرہ دنوں بلکہ راتوں میں، میں کھڑکی کی چھ سلاخیں اُکھاڑنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ ایک بہت بڑی کامیابی تھی۔ میں نے سلاخوں کو کھڑکی کی اینٹوں میں اس طرح دوبارہ جما دیا تھا کہ کسی کو شک نہیں پڑ سکتا تھا کہ یہ چھ سلاخیں اپنی جگہ سے اُکھڑی ہوئی ہیں۔

ڈلاری ماتا کی ہنٹر پوجا جاری تھی۔ خطرہ یہی تھا کہ اگر اُس کی پوجا ختم ہو گئی تو وہ مجھے اُکھڑی ہوئی سلاخوں والی کھڑکی کے کمرے سے کسی دوسری جگہ لے جانے کا حکم صادر کر دے گی۔ ایسی صورت میں میرے کئے کرائے پر پانی پھر سکتا تھا۔ لیکن معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہنٹر پوجا کی کوئی لمبی رسم ادا کر رہی ہے۔ میں بھی یہی چاہتا تھا کہ یہ رسم تھوڑی اور دیر تک چلے۔ کھڑکی کی چھ کی چھ سلاخیں نیچے سے اُکھڑ چکی تھیں۔ ایک رات میں اُٹھ کر کھڑکی کے پاس آیا اور بڑی احتیاط کے ساتھ پہلے ایک سلاخ کو ذرا آگے کو کیا۔ سلاخ اُوپر سے بالکل نہ ہلی مگر نیچے سے آگے ہو گئی۔ اسی طرح دوسری، تیسری اور پھر چھٹی سلاخ کو بھی آگے کر دیا۔ میں نے لالٹین کی ہلکی روشنی میں جھک کر دیکھا کہ میں کوشش کر کے ان آگے کو بڑھی ہوئی سلاخوں میں سے گزر کر دوسری طرف اُتر سکتا تھا۔ لیکن میں نے یہ پروگرام اگلی رات تک ملتوی کر دیا۔ سلاخوں کو اپنی اپنی جگہوں پر جمایا اور پلنگ پر لیٹ کر غور کرنا شروع کر دیا کہ مجھے اب کیا حکمت عملی اختیار کرنی ہوگی۔

میری یہ ساری تگ و دو اُرملا کی کوٹھڑی تک پہنچنے کی تھی جس کے بارے میں جمیلہ کی زبانی مجھے معلوم ہوا تھا کہ اُس کی کوٹھڑی حویلی کے عقبی صحن کے برآمدے میں سب سے آخری ہے۔ جس کمرے میں مجھے بند کیا گیا تھا وہ حویلی کی دوسری منزل کے دالان میں تھا۔ اگر میں رات کے اندھیرے میں کھڑکی میں سے اُتر کر باہر جاتا ہوں تو مجھے سب سے پہلے دالان کے برآمدے میں سے گزرنا تھا۔ اس کے بعد دوسری منزل کی سیڑھیوں سے اُترنا تھا۔ اس کے بعد پہلی منزل کے برآمدے کی آخری کوٹھڑی تک پہنچنا تھا۔ اس مختصر سے سفر میں ہزار ہا خطرات چھپے ہوئے تھے۔ باہر محافظوں کے پہرے کے بارے

میں مجھے کوئی علم نہیں تھا کہ وہ کہاں کہاں رات کو پہرہ دیتے ہیں لیکن مجھے ہر حالت
ان خطرات میں سے گزر کر جانا اور بعد میں گزر کر واپس آنا تھا۔ یہ کام محبت کے
دھڑک جذبوں کا تھا۔ عقل کا یہاں کوئی کام نہیں تھا۔

○○○

دوسری رات جب مجھے دُلاری کے کمرے سے لا کر میرے کمرے میں پہنچا دیا گیا تو میں کم از کم آدھ گھنٹے تک پلنگ پر ساکت ہو کر لیٹا رہا۔ میں جائزہ لے رہا تھا کہ باہر سے کسی پہرے دار کی کوئی آواز تو نہیں آ رہی؟ باہر بڑا گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ جب مجھے یقین ہو گیا تھا کہ میدان صاف ہے تو میں آہستہ سے پلنگ پر سے اُتر کر دبے پاؤں کھڑکی کے پاس آ گیا۔ اس کا ایک پٹ رُک رُک کر کھولا تا کہ اُس کی ہلکی سی بھی آواز پیدا نہ ہو۔ میں ننگے پاؤں تھا۔ صرف قمیض پاجامہ پہنا ہوا تھا۔ میں نے بڑی احتیاط سے کھڑکی کی سلاخوں کو کافی آگے کر دیا۔ میں نے اپنا منہ اندر کی طرف کر لیا۔ سب سے پہلے نیچے جھک کر اپنی ایک ٹانگ اُوپر کو اُٹھی ہوئی سلاخوں میں سے نیچے نکالی، اس کے بعد دوسری ٹانگ بھی نیچے لٹکا دی۔ نیچے زمین کے ساتھ میرے دونوں پاؤں لگ گئے۔ اس کے بعد کھڑکی کی دیوار کے ساتھ لگ کر آہستہ آہستہ نیچے سرکتے ہوئے اپنا دھڑ اور پھر سر بھی نیچے سے نکال لیا۔

اب میں کمرے سے باہر کھڑکی کے نیچے دبک کر بیٹھا تھا۔ میری آنکھیں اندھیرے میں بڑے غور سے دائیں بائیں ماحول کا جائزہ لے رہی تھیں۔ میں اُٹھا اور آگے کو بڑھی ہوئی سلاخوں کو دبا کر اندر کی طرف کر دیا اور اُن میں ہاتھ ڈال کر کھڑکی کے پٹ کو بند کر دیا۔ یہ کھڑکی جہاں کھلتی تھی وہاں سامنے ایک اُونچی دیوار تھی۔ درمیان میں ایک گلی سی بنی ہوئی تھی۔ میں دیوار کے ساتھ لگ کر آگے چلنے لگا۔ یہ حویلی کے عقبی کمروں کی دوسری منزل والی تنگ گیلری تھی۔ میرا کمرہ اس گیلری میں اکیلا ہی تھا۔ گیلری کی گلی آگے جا کر دوسری منزل کے برآمدے سے مل گئی تھی۔ میں نے دیوار کے پیچھے سے سر نکال کر دالان پر نظر دوڑائی۔ دالان میں دُور کونے میں ایک لالٹین یا لیمپ جل رہا تھا جس کی روشنی مجھ تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ دالان خالی تھا۔ اُسی کے لالٹین والے کونے میں

ڈلاری ماتا کا کمرہ تھا۔ وہاں بھی کوئی پہرے دار نہیں تھا۔ خوش قسمتی کی بات یہ تھی کہ اس برآمدے یا دالان کی سیڑھیاں جو نیچے جاتی تھیں جہاں میں کھڑا تھا وہیں کونے میں تھیں۔ اچھی طرح سے یقین کر لینے کے بعد کہ وہاں کوئی محافظ یا پہرے دار نہیں ہے میں سیڑھیوں میں آ گیا۔ ننگے پاؤں تھا اس لئے میرے چلنے کی آہٹ تک پیدا نہیں ہو رہی تھی۔

میں دبے پاؤں سیڑھیاں اُتر کر پہلی منزل والے برآمدے میں آ گیا۔ یہ برآمدہ بھی خالی تھا۔ کوئی پہرے دار نظر نہیں آتا تھا۔ حویلی کے اندر پہرے کی ضرورت شاید اس لئے نہیں سمجھی گئی تھی کہ وہاں سے کسی لڑکی کے از خود فرار ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ یہاں کوئی لالٹین بھی نہیں جل رہی تھی۔ تین یا چار کوٹھڑیاں تھیں جن کے دروازے بند تھے۔ خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ میں پھونک پھونک کر قدم رکھتا آہستہ آہستہ چلتا آخری کوٹھڑی کے بند دروازے تک پہنچ گیا۔ دروازے پر تالا پڑا تھا۔ میں نے دروازے سے کان لگا دیا۔ اندر سے کسی قسم کی کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ لگتا تھا کوٹھڑی خالی ہے۔ یہ آخری کوٹھڑی تھی اور اس کے آگے برآمدہ ختم ہو جاتا ہے۔ برآمدے کے پیچھے بھی ایک گلی سی بنی ہوئی تھی۔ میں نے اس گلی میں آ کر کوٹھڑی کی پچھلی دیوار کو غور سے دیکھا یہاں کوٹھڑی کی کھڑکی تھی جو بند تھی اور اس میں بھی لوہے کی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ کھڑکی زمین سے چار فٹ اُونچی ہو گی۔ میں نے بند کھڑکی کے ساتھ کان لگا دیا کہ شاید اندر سے کوئی آواز سنائی دے۔ مگر کوٹھڑی کے اندر سناٹا تھا۔

جمیلہ نے بڑے اعتماد سے بتایا تھا کہ برآمدے کی آخری کوٹھڑی ہی میں اُرملا کو رات کے وقت بند کر دیا جاتا ہے۔ اُسے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی؟ میں نے بند کھڑکی پر اُنگلی سے تین بار آہستگی سے ٹھک ٹھک کیا۔ اندر بدستور خاموشی چھائی رہی۔ میں نے ایک بار آہنی سلاخوں کے درمیان اُنگلی سے ٹھک ٹھک کیا۔ دوسری بار کھڑکی پر دستک دینے کے بعد مجھے کوٹھڑی کے اندر سے ایسی آواز آئی جیسے کوئی چارپائی یا پلنگ سے اُٹھا ہو۔ میں نے کھڑکی کے پٹ سے کان لگا دیا۔ کسی کے قدموں کی چاپ کھڑکی کے قریب ہوتی جا رہی تھی۔ پھر کسی نے جیسے کھڑکی کے پاس منہ لا کر اندر سے پوچھا۔

''کون ہے؟''

یہ عورت کی آواز تھی۔ میں اس آواز کو کیسے بھول سکتا تھا؟ یہ اُرملا کی آواز تھی۔ میں نے کھڑکی کی سلاخوں کے ساتھ منہ لے جا کر کہا۔

''اُرملا! میں ہوں، شیراز۔''

اس کے بعد دو تین سیکنڈ کے لئے اندر خاموشی چھائی رہی۔ پھر کھڑکی کا ایک پٹ آدھا کھل گیا۔ اندر لالٹین جل رہی تھی۔ اُس کی مدھم روشنی میں مجھے میری محبت، میری اُرملا کا اُداس چہرہ دکھائی دیا...... اُس کے چہرے پر خوشی کے تاثرات بھی تھے اور گھبراہٹ بھی تھی۔ اُس نے سرگوشی میں کہا۔ ''مجھے میرے حال پر چھوڑ دو! اپنی جان بچا کر فرار ہو جاؤ۔ تمہاری جان خطرے میں ہے۔''

میں نے سرگوشی میں ہی جواب دیا۔ ''میں تمہیں چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ تم میرے ساتھ جاؤ گی۔''

اُرملا نے بے بسی کے لہجے میں کہا۔ ''بھگوان کے لئے یہاں سے بھاگ جاؤ۔ تمہیں نہیں معلوم ڈلاری ماتا، دیوی کامنی کے چرنوں میں تمہارا سر کاٹ کر پیش کرنے والی ہے۔''

''تمہیں کیسے معلوم ہوا؟''

اُرملا نے دھیمی آواز میں اپنا منہ سلاخوں کے قریب لا کر کہا۔

''مجھے وکرما نے جب بتایا کہ ڈلاری ماتا کو دیوی کامنی کے استھان پر چڑھانے کے لئے ایک مسلمان نوجوان مل گیا ہے تو میں اُسی وقت سمجھ گئی تھی کہ یہ مسلمان نوجوان سوائے تمہارے اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ میں تمہیں بھگوان کا واسطہ دیتی ہوں میرا خیال دل سے نکال دو اور اپنی جان بچاؤ۔ تمہیں کچھ ہو گیا تو میں جیتے جی مر جاؤں گی۔''

اُرملا کے اس محبت بھرے جملے نے میرے دل کو جیسے کاٹ کر رکھ دیا۔ میں نے سلاخوں میں ہاتھ ڈال کر اُرملا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اُسے چوم کر کہا۔

''اُرملا! میں تمہیں اپنے ساتھ لے کر جاؤں گا۔ ہماری محبت ہمیں زندہ رکھے گی۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔ مجھے بتاؤ! تم یہاں سے کیسے باہر نکل سکتی ہو؟''

اُرملا نے ایک لمحے کے لئے گردن موڑ کر اپنے پیچھے دیکھا، پھر میری طرف دیکھ کر سرگوشی میں کہا۔ ''وکرما سے ملو! وہ میری رازدار سہیلی ہے۔ وہ تمہیں سب کچھ بتا دے گی۔''

''وہ کہاں ملے گی؟'' میں نے پوچھا۔

اُرملا نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''کل رات جب تم دُلاری ماتا کے کمرے سے واپس اپنے کمرے میں آؤ گے تو وکرما خود تمہارے کمرے میں آ کر تم سے مل لے گی۔ اب بھگوان کے لئے جاؤ۔ کوئی آ گیا تو میرے ساتھ تم بھی مارے جاؤ گے۔ پلیز! جاؤ۔''

اور اُرملا نے پیچھے ہٹ کر کھڑکی بند کر دی۔ میں بھی جلدی سے پرے ہٹ گیا اور گلی کے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ اب مجھے واپس جانا تھا۔ میں جس مشکل اور جس قدر احتیاط سے کام لیتا ہوا کبھی بیٹھ کر، کبھی دیوار کے ساتھ کھسک کھسک کر اپنے کمرے کی کھڑکی تک آیا وہ میں ہی جانتا ہوں۔ میں نے کھڑکی کی سلاخوں کو اپنی طرف ذرا سا کھینچ کر اندر داخل ہونے کی جگہ بنائی۔ ہاتھ ڈال کر کھلی کھڑکی کے ایک پٹ کو پورا کھول دیا اور پھر جس طرح سے بھی ہو سکا سلاخوں کے نیچے سے ہو کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ کمرے میں آتے ہی میں نے سب سے پہلے سلاخوں کو اندر کر کے انہیں ان کی جگہ پر اچھی طرح سے جمایا اور کھڑکی بند کر کے دبے پاؤں اپنے پلنگ پر آ کر بے دم ہو کر گر پڑا۔

مجھے پتہ نہیں کب نیند آئی اور میں سو گیا۔ رات کو بھی میں یہی سوچتا رہا۔ اور اگلا دن میں اسی اُدھیڑ بن میں رہا کہ اُرملا کی سہیلی کیسے میرے پاس آ جائے گی؟ میرے کمرے میں تو صرف بڑی بڑی مونچھوں والے خونخوار قاتل ہی میرے لئے کھانا وغیرہ لے کر آتے تھے۔ ان کے سوا میں نے کسی کی شکل تک نہیں دیکھی تھی۔ سارا دن یہی کچھ سوچتا رہا۔ رات کو مجھے دُلاری ماتا کے پاس لے جایا گیا اور ہنٹروں کی مار پیٹ کا ڈرامہ شروع ہو گیا۔ ڈرامہ اپنے اختتام کو پہنچا تو مجھے میرے کمرے میں واپس پہنچا دیا گیا۔ اب مجھے وکرما کا انتظار تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ خود ان لوگوں کی قیدی ہے پھر وہ کیسے ساری رُکاوٹیں عبور کر کے میرے پاس پہنچے گی؟ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی اور میں جاگ رہا تھا۔ بار بار نظریں دروازے کی طرف چلی جاتیں جو بند تھا۔

دُلاری ماتا کے کمرے سے واپس آئے قریباً آدھا گھنٹہ گزرا ہو گا کہ مجھے دروازے کا تالا کھلنے کی آواز آئی۔ میری نگاہیں دروازے کی طرف اُٹھ گئیں۔

دروازہ آہستہ سے کھلا اور ایک لڑکی اندر داخل ہوئی۔ اُس نے جلدی سے دروازہ بند

کر دیا اور تیز قدموں سے چلتی میرے پاس پلنگ پر آ کر بیٹھ گئی۔ لالٹین کی روشنی اُس پر پڑ رہی تھی۔ اُس کا رنگ گہرا سانولا تھا۔ ماتھے پر بندیا لگی تھی۔ شکل صورت مناسب تھی لیکن اُس کا جسم حیرت انگیز حد تک متناسب اور پُرکشش تھا۔ شاید اُس کی اسی خوبی کی وجہ سے اُسے کسی جگہ سے اغوا کر کے دُلاری ماتا کے ڈیرے پر لایا گیا تھا۔ اُس نے ہلکے جامنی رنگ کی ساڑھی پہنی ہوئی تھی۔ کہنے لگی۔

''میرا نام وکرما ہے۔ میں اُرملا کی رازدار سہیلی ہوں۔ اُس نے تمہارے بارے میں مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔''

میں نے اُس سے پوچھا۔ ''مجھے یہ بتاؤ کہ تم یہاں تک کیسے پہنچی ہو؟ تمہیں کسی نے دیکھا نہیں؟''

وہ بولی۔ ''تمہارے کمرے تک آنے کے لئے مجھے دو پہرے داروں کو اپنے جسم کا بلیدان دینا پڑا ہے۔ خیر کوئی بات نہیں، ایسا تو ہمارے ساتھ ہوتا ہی رہتا ہے۔ اب میری بات غور سے سنو کیونکہ میرے پاس وقت بہت تھوڑا ہے۔ تین دن بعد شوراتری ہے۔ اُرملا کو ایک سیٹھ نے اپنے لئے پسند کر لیا ہے۔ دُلاری ماتا نے ایک بھاری رقم کے عوض سیٹھ سے معاملہ طے کر لیا ہے اور آدھی رقم ایڈوانس بھی لے لی ہے۔ شوراتری کی رات کو یہ سیٹھ اُرملا کو اپنے ساتھ بمبئی لے جائے گا۔ اس بڈھے سیٹھ کا نام کیشو راؤ ہے اور بمبئی میں اُس کی کپڑے کی مل ہے۔ اگر تم یہ سوچ رہے ہو کہ اس حویلی سے اُرملا کو نکال کر لے جاؤ گے تو اس خیال کو اپنے دماغ سے نکال دو۔ یہاں سے اُرملا کو نکال کر لے جانا ناممکن ہے۔ تم بمبئی پہنچ کر تھوڑی سی کوشش کے بعد اُرملا کو نکال کر لے جانے میں کامیاب ہو سکتے ہو۔''

میں نے پوچھا۔ ''بمبئی میں یہ سیٹھ کیشو راؤ کہاں رہتا ہے؟''

وکرما نے کہا۔ ''یہ مجھے نہیں معلوم۔ لیکن مجھے اتنا معلوم ہے کہ اس سیٹھ کی ایک رکھیل یعنی داشتہ ہے جس کا نام کملا ہے۔ کملا میری سہیلی ہے۔ سیٹھ نے کملا کو اب چھوڑ دیا ہوا ہے۔ تم بمبئی پہنچ کر کملا سے ملو۔ وہ تمہیں سیٹھ کے بنگلے کا سارا پتہ بتا دے گی۔ اُرملا کو سیٹھ کے جال سے نکالنے کے لئے کملا بھی تمہاری مدد کرے گی۔ اُسے کہہ دینا کہ تمہیں وکرما نے بھیجا ہے۔ وہ ضرور تمہاری مدد کرے گی۔''

میں نے کہا۔ ''لیکن میں یہاں سے نکلوں گا تو بمبئی پہنچ سکوں گا۔ مجھے تو یہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا۔''

ورکما کہنے لگی۔ ''اگر تم تھوڑی بہادری سے کام لو تو اس حویلی کا ایک خفیہ دروازہ ہے وہاں سے فرار ہو سکتے ہو۔ میں تمہیں سمجھائے دیتی ہوں کہ وہ خفیہ راستہ کہاں پر ہے۔''

میں نے اُس کی بات کاٹ کر کہا۔ ''وہ راستہ مجھے معلوم ہے۔ میں اُسی راستے سے حویلی کے اندر داخل ہوا تھا کہ پکڑا گیا۔''

''بس یہ ٹھیک ہے۔'' ورکما نے کہا۔ اُس نے اپنی ساڑھی کے اندر سے ایک خنجر نکال کر مجھے دیا اور بولی۔ ''اس خنجر سے تم پہرہ دینے والوں کا کام تمام کر کے خفیہ دروازے تک پہنچ سکتے ہو۔ لیکن اس کے لئے بڑی ہمت کی ضرورت ہوگی۔ کیا تم ایسا کر سکو گے؟''

میں نے کہا۔ ''میں اُرملا کی خاطر سب کچھ کر سکتا ہوں۔''

''یہ بڑی اچھی بات ہے۔'' وہ بولی۔ ''اب میں جاتی ہوں۔ میں اُرملا کو ساری بات بتا دوں گی۔ تم صرف ایک بات یاد رکھنا کہ تمہیں بمبئی پہنچ کر میری سہیلی کملا سے ملنا۔ جس کا پتہ میں تمہیں سمجھائے دیتی ہوں۔''

ورکما نے مجھے کملا کا پورا ایڈریس بڑی اچھی طرح سے سمجھا دیا اور کہا۔

''تین دن بعد اُرملا بمبئی میں ہوگی۔ اس دوران تم کوشش کرنا کہ جتنی جلدی ہو سکے یہاں سے فرار ہو کر بمبئی پہنچ جاؤ۔ اب میں چلتی ہوں۔ میں نے باہر پہرہ دینے والے کو جو اپنے جسم کی رشوت دی ہے اس کا ٹائم ختم ہو رہا ہے۔ اور یاد رکھو! تمہارے پاس بھی اب زیادہ وقت نہیں رہا۔ تمہارا ٹائم بھی ختم ہو رہا ہے۔ دُلاری ماتا بڑی خونی عورت ہے۔ اُس نے پرتگیا کی تھی کامنی دیوی کے آگے کہ دیوی ماں کے چرنوں میں تین جوان مسلمانوں کی قربانی دُوں گی۔ وہ ایک مسلمان نوجوان کو اغوا کرنے کے بعد اس کی گردن کاٹ کر دیوی کامنی کو پیش کر چکی ہے۔ دوسرا مسلمان نوجوان تم ہو۔ اگر تم نے زیادہ دیر کر دی تو تمہارا بھی پہلے بدنصیب نوجوان جیسا انجام ہوگا۔ تم سے اپنے جسم پر ہنٹروں کی مار کھاتی ہے یہ بھی اُس کی پرتگیا میں شامل ہے۔ بہت جلد وہ تمہاری بھی گردن کاٹ کر دیوی کے استھان پر پیش کرنے والی ہے۔ اس لئے تم بھی زیادہ دیر نہ کرو جتنی جلدی ہو سکے یہاں سے نکل جاؤ۔''

اتنا کہہ کر ورکما اُٹھی اور دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ دروازہ اُس کے جاتے ہی بند ہو گیا اور باہر سے تالا لگانے کی آواز آئی۔ میں نے خنجر بستر کے نیچے چھپا دیا۔ اب ساری بات میری سمجھ میں آ گئی تھی کہ دُلاری ماتا مجھ سے ہنٹروں کی مار پیٹ کیوں کرواتی ہے۔ اس خیال سے میرے بدن میں خوف کی سرد لہر دوڑ گئی کہ بہت جلد دُلاری ماتا میرا سر کاٹ کر منحوس دیوی کے آگے پیش کرنے والی ہے۔

میں نے اسی لمحے فرار کی ترکیبوں پر غور کرنا شروع کر دیا۔

میرے کمرے کے باہر رات کو ایک پہرے دار موجود ہوتا تھا۔ اس طرف سے فرار ہونا مشکل تھا۔ میرے سامنے ایک ہی راستہ تھا کہ میں کھڑکی کی اُکھڑی ہوئی سلاخوں میں سے نکل کر حویلی کے خفیہ راستے کو تلاش کروں اور پھر وہاں سے فرار ہو جاؤں۔ دوسرا کوئی راستہ نہیں تھا۔ یہ ترکیب بھی اتنی آسان نہیں تھی لیکن مجھے ہر حال میں اس ترکیب پر عمل کرنا تھا۔ اس کے لئے میں نے دوسری رات کا وقت ذہن میں طے کر لیا۔

دوسری رات جب میں دُلاری ہنٹر والی کو ہنٹروں سے مار پیٹ کر اپنے کمرے میں واپس لایا گیا تو میں وہاں سے فرار ہونے کے لئے بالکل تیار تھا۔ جو محافظ مجھے کمرے میں لا کر ڈال گئے تھے وہ جا چکے تھے۔ دروازے کے باہر تالا بھی لگا دیا گیا تھا۔ میں نے خنجر اپنے کپڑوں کے اندر بڑی احتیاط کے ساتھ چھپا لیا تھا۔ جب رات کافی گزر گئی تو میں آہستہ سے اُٹھ کر کھڑکی کے پاس گیا۔ میں نے چپل وہیں رہنے دی تھی۔ ننگے پاؤں دبے قدموں چل کر کھڑکی کے پاس آ کر میں نے آہستہ سے کھڑکی کے دونوں پٹ کھول دیئے۔ آہنی سلاخوں کو پکڑ کر بڑی احتیاط کے ساتھ ایک ایک کر کے آگے کر کے اتنی جگہ بنا لی کہ میں ان کے نیچے سے گزر سکوں۔ ایک نگاہ بند دروازے پر ڈالی، دو تین لمبے لمبے سانس لئے اور اللہ کا نام لے کر پہلے اپنی ٹانگیں سلاخوں کے نیچے سے باہر نکالیں، پھر سمٹ سمٹا کر خود بھی نیچے سے نکل گیا۔ دوسری طرف آ کر میں وہیں کھڑکی کے نیچے زمین پر بیٹھ گیا۔ باہر اندھیرا تھا۔ سامنے والی دیوار ساکت تھی۔ درمیان میں جو چھوٹی سی گلی بنی ہوئی تھی وہ بھی خالی تھی۔ میں آنکھیں پھاڑ کر اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ حویلی کے خفیہ دروازے تک پہنچنے کے لئے مجھے کس طرف جانا چاہئے۔

اتنا مجھے معلوم تھا کہ یہ کمرے حویلی کی عقبی دیوار کی جانب ہیں اور حویلی کا خفیہ دروازہ بھی اسی جانب مغرب کی سمت ہے۔ چنانچہ میں بائیں طرف جانے کی بجائے دائیں جانب گلی کے اندھیرے میں دیوار کے ساتھ لگ کر دبے پاؤں چل پڑا۔ خنجر نکال کر میں نے ہاتھ میں پکڑ لیا تھا اور اُس پر اپنی گرفت مضبوط کر لی تھی۔ اُرملا کی طرف سے تو مجھے اطمینان ہو گیا تھا کہ اُسے بمبئی لے جایا جا رہا ہے اور بمبئی شہر سے اُسے نکال کر لے جانا میرے لئے کوئی مسئلہ نہیں تھا جبکہ مجھے وکرما کی سہیلی کملا کی مدد بھی حاصل ہو گی۔ اب مجھے اپنی جان بچانے کی فکر تھی کیونکہ چند روز بعد میری گردن پر کلہاڑا چلنے والا تھا۔ میں ایک طرح سے پھانسی کی کوٹھڑی سے فرار ہو رہا تھا۔ لیکن مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ جس طرف جا رہا ہوں کیا وہ راستہ صحیح ہے اور کیا وہ راستہ محفوظ بھی ہے؟ صرف ایک خنجر میرے ہاتھ میں تھا اور یہ صرف ایک محافظ کو ٹھکانے لگانے کے کام آ سکتا تھا وہ بھی اس صورت میں کہ اگر میں محافظ کو اچانک دبوچ کر اُس کی شہ رگ کاٹ سکوں تو۔ ورنہ میری موت یقینی تھی۔

دائیں جانب آگے جا کر گلی کی دیوار ختم ہو گئی اور ایک چھوٹا سا برآمدہ آ گیا۔ میں ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا۔ اندھیرے میں مجھے اتنا نظر آ رہا تھا کہ میں آگے بڑھ سکوں۔ برآمدہ خالی پڑا تھا۔ وہاں کوئی لالٹین بھی نہیں جل رہی تھی۔ جب مجھے اطمینان ہو گیا کہ میں بغیر کسی کی نگاہ میں آئے برآمدے میں سے گزر جاؤں گا تو میں اُٹھ کر برآمدے کی دیوار کے ساتھ ہو کر آگے بڑھنے لگا۔ برآمدے کی دیوار بھی ختم ہو گئی۔ اب سامنے ایک کھلی جگہ تھی جہاں اندھیرے میں جھاڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ جھاڑیوں کے پیچھے حویلی کی عقبی دیوار بھی نظر آ رہی تھی۔ یہی وہ دیوار تھی جس میں کسی جگہ خونی حویلی کا خفیہ دروازہ تھا۔ حویلی کی عقبی دیوار کی طرف کھڑے ہو کر یا جھک کر جانا خطرناک ثابت ہو سکتا تھا چنانچہ میں پیٹ کے بل لیٹ گیا اور دیوار کی سمت آہستہ آہستہ رینگنے لگا۔ میں جھاڑیوں کے درمیان سے رینگتا ہوا جا رہا تھا۔ حویلی کی عقبی دیوار تک پہنچتے پہنچتے مجھے کافی وقت لگ گیا۔ اس دوران کسی جگہ خطرے کا احساس ہوتا تو میں وہیں سانس روک کر زمین کے ساتھ منہ لگا لیتا۔ حویلی کی دیوار کے قریب پہنچا تو وہاں مجھے اینٹوں کا ایک چھوٹا سا ڈھیر دکھائی دیا۔ میں اس ڈھیر کی طرف بڑھنے لگا۔

اینٹوں کے ڈھیر کے پیچھے بھی جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔ میری چھٹی حس نے کہا کہ ان جھاڑیوں کو ہٹا کر دیکھو۔ میں نے اوندھے لیٹے لیٹے دونوں ہاتھوں سے جھاڑیوں کو ہٹایا تو مجھے دیوار میں زمین کے برابر ایک گول شگاف نظر آیا۔ میں تیزی سے سانپ کی طرح رینگ کر شگاف کے اندر گھس گیا۔ معلوم ہوا کہ یہ ایک چھوٹا سا غار ہے۔ یہی حویلی کا خفیہ راستہ ہو سکتا تھا۔ میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ اب سب سے بڑا خطرہ یہ تھا کہ اگر یہ وہی غار ہے جو حویلی کے باہر نکلتا ہے اور اس میں وہ موت کا کنواں بھی ضرور ہو گا جس میں، میں گرا تھا اور جہاں سے حویلی کے خونخوار آدمی مجھے پکڑ کر لے گئے تھے تو مجھے ہر حالت میں اس سے بچنا تھا۔ اُن لوگوں نے اس خونی گڑھے کے اُوپر درختوں کی شاخیں اور گھاس پتے ڈال کر دوبارہ چھپا دیا ہو گا۔ میں دوبارہ اوندھے منہ لیٹ گیا اور اُٹھ کر چلنے کی بجائے رینگ کر آگے بڑھنے لگا۔ میں آگے رینگ بھی رہا تھا اور دونوں ہاتھوں سے زمین کو اچھی طرح سے ٹٹول بھی رہا تھا کہ کہیں سے زمین نیچے تو نہیں ہو جاتی۔ مگر ابھی تک خیریت ہی تھی۔ میں آہستہ آہستہ زخمی سانپ کی طرح رینگ رہا تھا اور دونوں ہاتھوں سے زمین پر دباؤ ڈال کر دیکھتا بھی جا رہا تھا۔

دیر تک میں اندھیرے میں اسی طرح رینگتا چلا گیا۔ ابھی تک زمین سخت ہی تھی۔ مجھے آگے پندرہ بیس گز دُور اندھیرے میں دُھندلی سی پھیکی روشنی دکھائی دی۔ یہ ضرور باہر نکلنے کا راستہ تھا۔ میں نے پورے جوش مگر ہوش کے ساتھ رینگنا شروع کر دیا۔ روشنی کا دائرہ قریب آ رہا تھا۔ یہ باہر جنگل میں کھلی ہوئی آخری تاریخوں کے زرد چاند کی روشنی تھی۔ اس طرف سے تازہ ہوا بھی آنے لگی تھی۔ میرے بدن میں ایک نئی طاقت آ گئی مگر ابھی تک میں نے کھڑے ہو کر چلنے کا خطرہ مول نہیں لیا تھا اور نہ لے سکتا تھا۔ کیونکہ گھاس پھوس سے ڈھکا ہوا موت کا کنواں کسی جگہ بھی موجود ہو سکتا تھا۔ آخر میں اس غار کے دہانے کے پاس پہنچ گیا۔ راستے میں موت کا کنواں کسی جگہ بھی نہیں آیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ یہ حویلی کا کوئی دوسرا خفیہ راستہ تھا۔ وہ خفیہ راستہ نہیں تھا جس راستے سے میں حویلی کے اندر داخل ہوا تھا۔ غار کے دہانے سے سر باہر نکال کر میں نے دونوں جانب غور سے دیکھا۔ اس بات کا امکان تھا کہ ڈُلاری ماتا کا کوئی خونخوار پہریدار اسلحہ لئے وہاں موجود ہو۔ میں رینگ کر غار سے باہر نکل آیا تھا لیکن ابھی تک جھاڑیوں کے

پیچھے ہی سانس روکے اوندھے منہ پڑا تھا۔ آدھا زرد چاند مغربی ٹیلوں کے کافی اُوپر
ہوا تھا اور اُس کی سرخی مائل پھیکی روشنی میں جنگل کے درخت اور جھاڑیاں نظر آ ر
تھیں۔ اس احساس نے میرے اندر چٹانوں ایسی مضبوطی پیدا کر دی تھی کہ میں پھانسی
کوٹھڑی سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔

خنجر ابھی تک میرے ہاتھ میں ہی تھا۔ وہاں اُٹھنے کی بجائے میں کہنیوں کے
مغربی جانب جو درختوں کا ایک جھنڈ تھا رینگنے لگا۔ گھاس اور جھاڑیاں اوس کے گر
سے گیلی ہو رہی تھیں۔ میں رینگتا چلا گیا۔ آخر درختوں کے جھنڈ میں آ گیا۔ یہاں آ
ہی میں اُٹھ کر بیٹھ گیا اور ایک ایسے ہرن کی طرح جس کے پیچھے کوئی درندہ لگا ہوا
چوکس ہو کر آنکھیں اور کان کھول کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ یہ بڑی حیرانی اور خوشی
کی بات تھی کہ میں اپنی جان بچا کر اس خونی حویلی سے نکل آیا تھا۔ رات کے و
وہاں پہریدار کیوں نہیں تھے؟ وہ کہاں گھات لگا کر چھپے ہوئے تھے؟ اب اس سے
کوئی غرض نہیں تھی۔ مجھے اللہ نے بچا لیا تھا میرے لئے یہی کافی تھا۔

میں اُٹھ کر اندھا دُھند درختوں کے نیچے مغرب کی جانب جو ٹیلے تھے اُس طرف
پڑا۔ میری خیر و عافیت اسی میں تھی کہ میں اس خونی حویلی سے جتنی جلدی اور جتنی
نکل سکوں نکل جاؤں کیونکہ مجھ پر پیچھے سے بھی فائر آ سکتا تھا اور میرا خنجر مجھے گولی
نہیں بچا سکتا تھا۔ میں دوڑتا چلا گیا۔ میں ننگے پاؤں تھا۔ میرے پیر کنکریوں
جھاڑیوں کے کانٹوں سے چھیل گئے تھے مگر میں رُکے بغیر دوڑتا چلا جا رہا تھا۔ درختو
جھنڈ کافی پیچھے رہ گیا تھا۔ میرا سانس بھی پھول گیا تھا۔ لیکن میں اُس وقت تک دوڑتا
گیا جب تک میری طاقت نے جواب نہیں دے دیا۔ پھر میں وہیں گیلی گھاس پر جھاڑ
کے درمیان سیدھا ہو کر لیٹ گیا اور لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ جب ذرا دم میں دم آ
سانس بھی نارمل ہوا تو میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ چاروں طرف دیکھا اندازہ لگانے لگا کہ
کہاں آ گیا ہوں اور مجھے آگے کس طرف جانا چاہئے؟ آگے جو اُونچے اُونچے ٹیلے تھے
ابھی کافی دُور تھے مگر یہ ٹیلے ہی میرے لئے محفوظ جگہ ہو سکتے تھے کیونکہ ابھی تک میں ا
آپ کو خطرے سے باہر نہیں سمجھ رہا تھا۔ ہنٹر والی دُلاری ماتا کے خونی غنڈے، فائر
کرتے میرے پیچھے آ سکتے تھے۔ میں جلدی سے اُٹھ کر ٹیلوں کی طرف دوڑنے لگا۔

صبح کی سفیدی آسمان پر جھلکنے لگی تھی جب میں نے ایک ٹیلے کی دوسری طرف پہنچ کر
ایک ندی میں سے پانی پیا، منہ ہاتھ دھویا اور اپنا جائزہ لیا۔ اُس وقت میری حالت یہ تھی
کہ میرے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی۔ پاؤں سے ننگا تھا۔ پیروں میں سے کہیں کہیں
سخت اور کھردرے گھاس والی زمین پر بھاگ بھاگ کر خون رِس رہا تھا۔ بدن پر ایک
قمیض اور پتلون تھی۔ یہ دونوں کپڑے مجھے ہنٹر والی دُلاری ماتا نے کمال مہربانی سے
عنایت کئے تھے تاکہ وہ میری خوشنودی حاصل کر سکے اور میں اُسے اور زور زور سے ہنٹر
برساؤں۔ شیو بڑھی ہوئی تھی۔ جسم کی طاقت کم نہیں ہوئی تھی کیونکہ دُلاری ماتا نے مجھے
آخری دنوں میں خوب کھلایا پلایا تھا تاکہ میری گردن زیادہ موٹی ہو جائے اور وہ میری
موٹی گردن کامنی دیوی کے حضور پیش کرے۔ میرے پاس سوائے ایک خنجر کے جو مجھے
اُرملا کی سہیلی وکرمانے دیا تھا اور کچھ نہیں تھا۔ مجھے یہ بھی علم نہیں تھا کہ میں کہاں ہوں اور
آگے کون سا گاؤں ہے۔ میری منزل بمبئی شہر تھا۔ لیکن میرے پاس ریل کا کرایہ بھی نہیں
تھا۔ لیکن اس کی مجھے زیادہ فکر نہیں تھی کیونکہ مجھے بغیر ٹکٹ سفر کرنے کا کافی تجربہ تھا۔

زیادہ دیر میں وہاں رُکنا نہیں چاہتا تھا۔ میں تھوڑی دیر ستانے کے بعد اُٹھا اور
مغرب کی سمت روانہ ہو گیا۔ دوپہر تک پہاڑیاں اور ٹیلے میری داہنی جانب پیچھے رہ گئے
تھے اور سامنے کچھ فاصلے پر گاؤں کے مکان نظر آ رہے تھے۔ میں گاؤں میں پہنچ گیا۔ یہ
ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ پندرہ بیس ڈھلواں چھتوں والے مکان تھے۔ ایک تالاب کے
کنارے پکے تھڑے پر ایک بوڑھا آدمی بیٹھا ناریل کا حقہ پی رہا تھا۔ میں اُس کے
پاس آ گیا۔ اُس سے پوچھا کہ یہاں سے ریلوے سٹیشن کس طرف ہے؟ اُس نے میری
طرف دیکھے بغیر ایک جانب اشارہ کیا۔ میں نے پوچھا۔

''کتنی دُور ہو گا بابا؟''

اب اُس نے اپنا بوڑھا چہرہ اُٹھا کر مجھے غور سے دیکھا اور پوچھا۔

''کہاں سے آ رہے ہو؟''

''میں نے کہا۔'' جنگل میں ایک دوست کے ساتھ شکار کھیلنے گیا تھا۔ اُس سے بچھڑ کر
راستہ بھول کر اِدھر آ نکلا ہوں۔''

اُس نے کوئی جواب نہ دیا اور حقہ گڑگڑانے لگا۔ میں خاموشی سے آگے چل پڑا۔

مجھے سخت بھوک لگی ہوئی تھی لیکن میرے اندر پردیس کی مشکلیں سہہ سہہ کر فا
برداشت کرنے کی طاقت پیدا ہوگئی تھی۔ ایک دو دن پانی پی کر گزارہ کر سکتا تھا۔
سات میل چلنے کے بعد دُور سے ریلوے کا سگنل دکھائی دیا۔ میرے تن مردہ میں جیـ
جان سی پڑ گئی۔ میں نے اپنی رفتار ذرا تیز کر دی۔ راستے میں ایک چھوٹی سی نہر آ گئی
وہاں میں نے ایک بار پھر منہ ہاتھ دھو کر پانی پیا اور چل پڑا۔ علاقہ جنگل کا تھا۔
درختوں کے جھنڈ کہیں کہیں تھے۔ زمین جنگلی جھاڑیوں اور سرکنڈوں والی تھی۔

میں ریلوے لائن پر آ گیا۔ ریل کی پٹڑی مشرق سے مغرب کی طرف جا رہی تھی
میں نے مغرب کی طرف رُخ کر لیا اور لائن کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ ریلوے کا سگنـ
اس بات کا ثبوت تھا کہ کوئی ریلوے سٹیشن قریب ہی ہے۔

دُھوپ نکل آئی تھی۔ بادل چھٹ گئے تھے۔ میری قمیض پسینے میں بھیگ چکی تھی۔ دُ
سے ریلوے سٹیشن کی چھوٹی سی عمارت نظر پڑی تو میں بڑا خوش ہوا۔ میں سٹیشن پر پہ
گیا۔ یہ معمولی سا سٹیشن تھا۔ کوئی مسافر نظر نہیں آ رہا تھا۔ پلیٹ فارم خالی پڑا تھا۔ پلیـ
فارم پر ایک طرف نلکا لگا ہوا تھا۔ میں نے وہاں بیٹھ کر ایک بار پھر منہ پر پانی کے چھینـ
مارے۔ پانی کے چند گھونٹ پیئے جو خالی معدے میں جا کر درد کرنے لگے۔ میں اُٹھ
بنچ پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک مزدور ٹائپ کا آدمی کندھے پر کدال رکھے سامنے
گزرا تو میں نے اُس سے پوچھا۔

''بمبئی جانے والی گاڑی کس وقت آتی ہے؟''

اُس نے بے نیازی سے کہا۔ ''گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے بعد آئے گی۔ لیٹ ہے۔'' اور آ
گزر گیا۔ میں خوش ہوا کہ میں صحیح رُخ پر جا رہا ہوں اور اب اپنی منزل پر پہنچ جاؤں گا
میں نے سوچ لیا تھا کہ چونکہ میں نے بغیر ٹکٹ کے سفر کرنا ہے اس لئے ٹرین کے آخر
ڈبے میں بیٹھوں گا اور جب ٹرین پلیٹ فارم سے چل پڑے گی تب دوڑ کر اس میں سو
ہوں گا۔ جب مجھے بغیر ٹکٹ سفر کرنا ہوتا تھا تو میں ایسے ہی کرتا تھا۔

میں بنچ پر بیٹھا رہا۔ میرا رُخ جنگل کی طرف تھا۔ تا کہ اگر ہنٹر والی ڈلاری کے آد
اس طرف سے نظر آ جائیں تو میں اپنا بچاؤ کر سکوں۔ ڈیڑھ گھنٹے بعد دُور سے ریل گاڑ
کے انجن کا دُھواں دکھائی دیا۔ تھوڑی دیر بعد ٹرین پلیٹ فارم پر آ کر رُک گئی۔ یہ اُ

زمانے کی لال ڈبوں والی پسنجر ٹرین تھی۔ انجن کے آگے انڈیا کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ یہ
جھنڈا ریلوے سٹیشن کی عمارت پر بھی لہراتا میں نے دیکھا تھا۔ پاکستان جیسا کہ میں پہلے
بیان کر چکا ہوں بن چکا تھا۔ ہندوستان آزاد ہو گیا ہوا تھا۔ گاڑی میں سے چند ایک
مسافر اُتر گئے۔ گارڈ اپنے آخری ڈبے سے نکل کر پلیٹ فارم پر لال سبز جھنڈیاں بغل
میں دبائے کھڑا تھا اُس نے اپنی گھڑی جیب سے نکال کر دیکھی، سیٹی بجائی، پھر سبز
جھنڈی لہرا دی اور اپنے ڈبے میں چڑھ گیا۔ ٹرین پلیٹ فارم پر کھسک رہی تھی۔ میں
نے جائزہ لے لیا تھا کہ ٹرین میں سے کوئی ٹی ٹی نہیں نکلا تھا۔ میں دوڑ کر گاڑی کی آخری
بوگی کے گارڈ والے ڈبے سے اگلے ڈبے میں سوار ہو گیا۔ خدا کا شکر ادا کیا۔ ایک بہت
بڑے مرحلے سے بخیر و عافیت نکل آیا تھا۔ اب دوسرا مرحلہ سامنے تھا لیکن اس میں جان
کا خطرہ نہیں تھا۔ ٹرین چلتی رہی۔ راستے میں کوئی سٹیشن آتا تو تھوڑی دیر کے لئے رُکتی
اور پھر آگے روانہ ہو جاتی۔ دُھوپ ڈھلنے لگی۔ بھوک مجھے کافی پریشان کر رہی تھی مگر میں
صبر شکر کر کے بیٹھا رہا۔ ابھی سورج غروب نہیں ہوا تھا کہ ٹرین ایک ذرا بڑے سٹیشن پر
رُکی۔ میں ڈبے میں ہی بیٹھا رہا۔ بھوک نے میرے جسم میں سنسنی پیدا کر دی تھی۔ ٹرین
تھوڑی دیر رُک کر چل پڑی۔

میری نگاہیں ڈبے کے دروازے پر گئیں تو دیکھا کہ ایک ٹکٹ چیکر ڈبے میں داخل
ہو رہا تھا۔ ٹرین نے رفتار پکڑ لی تھی۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ ٹی ٹی نے مسافروں کے
ٹکٹ چیک کرنے شروع کر دیئے۔ وہ میرے قریب آیا تو میں کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔
اُس نے ٹکٹ مانگا میں نے کہا ٹکٹ نہیں ہے۔ اُس نے کہا کہاں جا رہے ہو؟ ساتھ ہی
اُس نے جرمانے والا ٹکٹ بنانے کے لئے کاپی نکال لی۔ میں نے کہا میں بمبئی جا رہا
ہوں۔ اُس نے حساب لگا کر کہا اتنے پیسے نکالو۔ میں نے کہا میرے پاس کچھ نہیں ہے۔
اُس نے کہا یہیں بیٹھے رہو اور دوسرے مسافروں کے ٹکٹ چیک کرنے لگا۔ اگلے سٹیشن
پر گاڑی رُکی تو اُس نے مجھے ٹرین سے اُتار دیا اور کہا۔

''اب یہاں سے بھاگ جاؤ! میں نے تمہیں پولیس کے حوالے نہیں کیا۔''

وہ آگے چلا گیا۔ میں وہیں پلیٹ فارم پر ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا۔ جب ٹرین چل
پڑی تو میں بھاگ کر گارڈ کے ڈبے میں سوار ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد گارڈ بھی جھنڈی لہراتا

ڈبے میں آ گیا۔ مجھے دیکھ کر بولا۔ ''تم یہاں کیوں آ گئے ہو؟ کون ہو تم؟''

گارڈ کی داڑھی سے میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ مسلمان ہے۔ میں نے اُسے کہا ''میں مسلمان ہوں۔ میرے پاس کوئی پیسہ نہیں ہے کہ ٹکٹ خرید سکتا۔ مجھے بمبئی ج ہے۔''

گارڈ نے مجھے غور سے دیکھا اور پوچھا۔ ''تمہارے جوتے کہاں ہیں؟''

میں نے کہا۔ ''جوتے پھٹ گئے تھے۔ میں نے پھینک دیئے۔''

وہ بولا۔ ''ٹھیک ہے۔ بیٹھ جاؤ!''

وہ لکڑی کے بکس پر بیٹھ کر کاپی میں کچھ لکھنے لگ گیا۔ اس دوران شام ہو گئی تھی گاڑی اگلے سٹیشن پر رُکی تو میں نے اُسے کہا۔ ''میرا بمبئی جانا بہت ضروری ہے۔ آپ بڑی مہربانی ہو گی مجھے کسی طرح بمبئی پہنچا دیں۔''

وہ ایک لمحے کے لئے چپ ہو گیا، پھر بولا۔ ''تم یہیں بیٹھے رہو!''

یہ کوئی بڑا سٹیشن تھا۔ اب یاد نہیں رہا کون سا سٹیشن تھا۔ بہرحال گارڈ کے دل میں ر آ گیا تھا۔ اُس نے مجھے اپنے ڈبے میں ہی رکھا۔ مجھے کھانا بھی کھلایا، چائے بھی پلا اور جب بمبئی سٹیشن قریب آیا تو اُس نے جیب سے دس روپے نکال کر مجھے دیئے اور کہا ''میں تمہاری اتنی ہی مدد کر سکتا ہوں۔''

میں نے گارڈ کا شکریہ ادا کیا۔ اُس نے اپنے ساتھ مجھے بمبئی کے سٹیشن سے باہر نکا دیا۔ دس روپے اُس زمانے میں اچھی خاصی رقم ہوا کرتی تھی۔ مجھے اب وکرما کی سہیلی ک کے فلیٹ پر جانا تھا۔ اُس کا ایڈریس اُسی نے مجھے سمجھا دیا تھا۔ بمبئی شہر سے میری تھوڑ بہت واقفیت ہو چکی تھی۔ عثمان بھائی اسی شہر میں رہتا تھا مگر ابھی اُسے ملنے کی ا ضرورت نہیں تھی۔ سب سے پہلے میں وکرما کی ہدایت کے مطابق کملا سے ملنا چاہتا تھا۔

میں نے ایک وکٹوریا لی اور کملا کے فلیٹ پر پہنچ گیا۔ یہ خوشحال طبقے کی آبادی م واقع ایک بلڈنگ کا فلیٹ تھا۔ باہر ایک گورکھا چوکیدار سٹول پر بیٹھا بیڑی پی رہا تھا۔ م نے اُس سے پوچھا کہ کملا جی کا یہی فلیٹ ہے؟ اُس نے میری طرف گھور کر دیکھا۔ م ننگے پاؤں تھا وہ یہی سمجھا کہ میں کوئی آوارہ گرد ہوں اور بھول کر کسی کملا کی تلاش م گیا ہوں۔ اُس نے بے نیازی سے کہا۔

''یہاں کوئی کملا دیوی نہیں رہتی۔ جاؤ... جاؤ!''

مگر فلیٹ کے باہر کملا دیوی کی نیم پلیٹ لگی تھی۔ انگریزی میں اُس کا نام لکھا ہوا تھا۔ میں نے کہا۔ ''بھائی! مجھے معلوم ہے کملا جی کا یہی فلیٹ ہے۔ تم اُن کو خبر کر دو۔ مجھے اُن سے ضروری بات کرنی ہے۔''

چوکیدار اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس کے ہاتھ میں بید تھا۔ تلخی سے بولا۔ ''تم جاتے ہو کہ ایک لگاؤں؟''

اتنے میں ایک خوبصورت ساڑھی والی خوش شکل سانولی جوان لڑکی کندھے پر پرس لٹکائے کمرے سے باہر نکلی۔ اُس نے چوکیدار سے پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟''

چوکیدار بولا۔ ''بی بی! یہ کوئی آوارہ گرد ہے۔ خواہ مخواہ تنگ کر رہا ہے۔ کہتا ہے مجھے کملا جی سے ملنا ہے۔''

اُس لڑکی نے میری طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''کیا کام ہے تمہیں کملا سے؟''

میں نے کہا۔ ''یہ میں صرف کملا دیوی کو ہی بتا سکتا ہوں۔''

اُس نے کہا۔ ''میں ہی کملا دیوی ہوں۔ بتاؤ کیا کام ہے تمہیں مجھ سے؟''

میں نے کہا۔ ''مجھے وکرما نے آپ کے نام ایک ضروری پیغام دے کر بھیجا ہے۔''

وکرما کا نام سن کر کملا نے چونک کر کہا۔ ''وکرما تمہیں کہاں ملی تھی؟''

میں نے کہا۔ ''دُلاری ماتا کی حویلی میں۔''

کملا کہیں جا رہی تھی۔ دُلاری ماتا کی حویلی کا سن کر اُس نے چوکیدار سے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ اسے اندر آنے دو۔''

اور کملا مجھے اپنے ساتھ فلیٹ کے ڈرائنگ رُوم میں لے آئی۔ مختصر سا ڈرائنگ رُوم تھا مگر بڑے سلیقے سے سجا ہوا تھا۔ اُس نے مجھے صوفے پر بٹھایا، خود میرے سامنے بیٹھ گئی اور بولی۔ ''تمہارا نام کیا ہے؟'' میں نے اُسے اپنا اسلامی نام شیراز ہی بتایا۔ وہ کہنے لگی۔ ''تم مسلمان ہو۔ مگر دُلاری ماتا کی حویلی میں کیسے پہنچ گئے؟ وہاں تو کسی مسلمان کو جانے کی اجازت نہیں ہے۔''

میں نے کہا۔ ''میں وہاں کیوں گیا تھا؟ کیسے گیا تھا؟ اور وکرما سے کیسے ملا؟ یہ ایک لمبی کہانی ہے۔'' میں نے اپنے ننگے پاؤں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میرے

ننگے پیر دیکھ کر تمہیں ضرور حیرانی ہو رہی ہو گی۔ میرے پاؤں میں چپل تھی لیکن دُلاری کی حویلی سے فرار ہونے کے بعد مجھے جنگل میں نہ جانے کتنے کوس تک بھاگنا پڑا۔ یہ چپل راستے میں ہی پھٹ گئی تھی۔ میں نے اُسے پھینک دیا اور ننگے پیر بھاگتا رہا۔''

کملا بڑی حیرت اور دلچسپی سے میری باتیں سن رہی تھی۔ اس کے بعد میں نے اُ اپنی ساری کہانی مختصر کر کے سنا ڈالی۔ کملا بڑی توجہ کے ساتھ سنتی رہی۔ جب میں کہانی ختم کی تو کہنے لگی۔

''وکرما میری بڑی گہری سہیلی ہے۔ اگر وہ میری سہیلی نہ بھی ہوتی تو میں تمہاری کہ سن کر تمہاری ضرور مدد کرتی۔ تم فکر نہ کرو۔ مجھ سے جو ہو سکا کروں گی۔ پہلے تمہارے لئے کھانا منگواتی ہوں۔''

اُس نے نوکرانی کو بائی کہہ کر آواز دی اور اُسے کھانا لگانے کو کہا۔ میں نے کہا۔

''میں سب سے پہلے نہانا چاہتا ہوں۔''

کملا نے مجھے غسل خانے کا دروازہ دکھا کر کہا۔ ''تم نہا لو۔ میں تمہارے لئے دُ ہوئے کپڑے نکالتی ہوں۔''

میں نہا کر باہر نکلا تو صوفے پر ایک قمیض، ایک پتلون اور قریب ہی ایک چپل پ تھی جو مجھے پوری آ گئی۔ بالکل نئی چپل تھی۔ مجھے تعجب ضرور ہوا کہ فلیٹ میں مجھے کوئی تو دکھائی نہیں دیتا پھر یہ مردانہ کپڑے کملا کے پاس کیسے آ گئے؟ مگر ان باتوں پر بچار کرنے کا وقت نہیں تھا۔ میں نے نئی قمیض اور پتلون بھی پہن لی۔ کونے میں کھا کی میز پر بائی نے کھانا لگا دیا تھا۔ کملا دوسرے کمرے سے نکل کر آئی۔ کہنے لگی۔

''میں نے تمہارے آنے سے تھوڑی دیر پہلے کھانا کھا لیا تھا ورنہ تمہارے ساتھ ض شامل ہوتی۔''

وہ میرے پاس ہی ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھ گئی اور میں کھانا کھانے لگا۔ وہ مجھ سے کے بارے میں باتیں کرتی رہی۔ میں نے اپنی کہانی میں سے کانچی کا کردار اور اُس متعلق دہشت ناک واقعات کو نکال دیا تھا اور اُسے بالکل نہیں بتایا تھا کہ ایک دشمن منحوس جادوگرنی قسم کی عورت میرے پیچھے پڑی ہوئی ہے اور میری جان لینا چاہتی۔ اُس نے میری اُنگلی میں انگوٹھی دیکھ لی تھی۔ پوچھنے لگی۔

''یہ انگوٹھی اتنی کالی کیوں ہے؟ کہاں سے لی تھی تم نے؟''

میں نے کہا۔ ''جنگل میں ایک جگہ پڑی ہوئی مل گئی تھی۔ میں نے اُٹھا کر پہن لی۔''

وہ بولی۔ ''جنگل میں گری پڑی چیز خاص طور پر انگوٹھی وغیرہ نہیں اُٹھانی چاہئے۔ اس پر جادوٹونے کا اثر بھی ہو سکتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''میں جادوٹونے کو نہیں مانتا۔''

وہ ہنس پڑی۔ ''تم چاہے نہ مانو مگر میں تو مانتی ہوں۔''

کھانے کے بعد ہم دونوں صوفے پر بیٹھ کر چائے پینے لگے۔ میں نے کملا سے پوچھا۔ ''کیشو رائے سیٹھ کو تم جانتی ہو ناں؟ میرا مطلب ہے تمہیں اُس کے مکان کا پتہ معلوم ہے ناں؟''

وہ مسکرائی۔ ''بمبئی کا کوئی ایسا عیاش مگر بڈھا سیٹھ ایسا نہیں ہے جسے کملا نہ جانتی ہو۔ کیشو رائے کو تو میں بڑی اچھی طرح سے جانتی ہوں۔ اُس کے امراولی والے آشرم میں، میں کئی بار اُس سے مل چکی ہوں۔ میں کل صبح ہی معلوم کرتی ہوں کہ تمہاری اُرملا سیٹھ کیشو کے بنگلے پر پہنچی ہے یا نہیں؟ تم بڑا لمبا سفر کر کے آ رہے ہو۔ تھکے ہوئے بھی ہو۔ اب تم آرام کرو! کل صبح باتیں ہوں گی۔''

دوسرے دن میں دیر تک سویا رہا۔ نوکرانی بائی نے مجھے ناشتہ کرایا اور بتایا مالکن کہہ گئی تھیں میں دیر سے آؤں گی۔ مہمان کو ناشتہ کرا دینا۔ کچھ ہی دیر بعد کملا کی ٹیکسی فلیٹ کے باہر آ کر کھڑی ہوئی اور وہ نکل کر ڈرائنگ رُوم میں آ گئی۔ کہنے لگی۔

''تم نے کھانا وغیرہ کھا لیا تھا؟''

میں نے کہا۔ ''بائی نے کھانا کھلا دیا تھا مجھے۔''

کملا پرس میز پر رکھ کر میرے سامنے صوفے پر بیٹھ گئی اور بائی سے کہا۔

''چائے کے دو کپ بنا کر لاؤ۔''

مجھے معلوم تھا کہ وہ اُرملا کا ہی پتہ کرنے سیٹھ کیشو رائے کے بنگلے پر گئی ہو گی۔ میں تفصیلات معلوم کرنے کے لئے بے چین تھا۔ میرے پوچھنے سے پہلے ہی کملا نے پرس میں سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر سگریٹ سلگایا اور بولی۔

''تمہاری اُرملا ابھی سیٹھ کیشو کے بنگلے پر نہیں آئی۔ لیکن اتنا سراغ مل گیا ہے کہ سیٹھ

نے اُرملا کا ڈُلاری ماتا سے سودا طے کرلیا ہے اور دو ایک دن میں وہ سیٹھ کے بنگلے پر جائے گی۔''

میری اتنی تسلی ضرور ہوگئی کہ اُرملا کو ڈُلاری ماتا کی خونی حویلی سے نجات ملنے وا ہے۔ اس کی بھی تصدیق ہوگئی کہ وہ سیٹھ کیشو رائے کے بنگلے پر ہی آئے گی۔ اب م اُرملا سے مل سکتا تھا اور اُسے سیٹھ کے بنگلے سے نکال کر اپنے ساتھ لے جا سکتا تھا۔ ا اگر اُسے بھگا کر لے جانے میں عثمان بھائی کی مدد کی ضرورت پڑی تو وہ بمبئی میں موج تھا اور مجھے یقین تھا کہ وہ دل و جان سے میری مدد کرے گا۔ مجھے صرف اتنا پتہ لگ ج چاہئے کہ اُرملا سیٹھ کیشو رائے کے بنگلے پر پہنچ گئی ہے۔ نوکرانی چائے لے کر آ گئی۔ م خاموشی سے چائے کے گھونٹ بھرنے لگا۔ مجھے گہری سوچ میں گم دیکھ کر کملا نے کہا۔

''تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھ سے جو ہو سکا تمہارے اور اُر کے لئے کروں گی۔ میں اُس بڈھے کھوسٹ سیٹھ کی قید میں اُرملا کو نہیں رہنے دوں گی۔''

میں نے یہ دیکھنے کے لئے کہ کملا اس سلسلے میں کیا کرسکتی ہے کہا۔

''سیٹھ بھاری رقم خرچ کر کے اُرملا کو یہاں لائے گا۔ وہ یونہی اُسے بنگلے سے با نہیں نکلنے دے گا۔ اور پھر سیٹھ نے غنڈے بھی ضرور پال رکھے ہوں گے۔ وہ ہر وق اُرملا کی نگرانی کریں گے۔''

کملا ہنس پڑی۔ کہنے لگی۔ ''تمہارا کیا خیال ہے میں ان باتوں سے بے خبر ہوں مجھے سیٹھ کا رتی رتی حال معلوم ہے۔ میں اُس کے سارے غنڈوں کو بھی جانتی ہوں۔ کیوں گھبراتے ہو؟ ایک بار اُرملا بمبئی، سیٹھ کے بنگلے پر پہنچ جائے اس کے بعد دیکھنا م کیا کرتی ہوں۔ دو دن کے اندر اندر تمہاری اُرملا تمہارے پاس ہوگی۔''

لیکن کملا آخر عورت ذات تھی۔ مجھے اُس پر اتنا بھروسہ نہیں تھا۔ میری ساری توقعا اُس وقت تک عثمان بھائی سے وابستہ تھیں۔ وہ بمبئی کے سبھی جرائم پیشہ لوگوں کو جانتا اور خود بھی غنڈہ ٹائپ آدمی تھا۔ اس مسئلے میں صرف وہی میرے کام آ سکتا تھا۔ اس دوران میں نے عثمان بھائی سے ملنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ سوچا اُرملا ایک بار سیٹ کے بنگلے پر آجائے اور کملا کی زبانی معلوم ہو جائے کہ وہ بنگلے کے کس کمرے میں نیم قی کی حالت میں ہے اس کے بعد عثمان بھائی سے بات کروں گا۔

میں کملا کے فلیٹ پر ہی رہ رہا تھا۔ میں باہر بہت کم نکلتا۔ زیادہ وقت فلیٹ پر ہی گزارتا۔ کملا کا معمول یہ تھا کہ وہ رات کو فلیٹ سے بن سنور کر ٹیکسی میں سوار چلی جاتی، آدھی رات کے بعد واپس آتی اور صبح دیر تک سوئی رہتی۔ اُس روز بھی وہ رات کو دیر سے آئی تھی اور صبح تک سوئی رہی۔ میں اُس کے بیدار ہونے کا انتظار کرتا رہا۔ کیونکہ دو دن سے اُس نے اُرملا کے بارے میں مجھ سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ میں نے ڈرائنگ رُوم میں ہی ناشتہ کیا اور بیٹھا کچھ دیر اخبار پڑھتا رہا۔ اخبار میں پاکستان کے بارے میں بھی خبریں چھپی تھیں جن سے مجھے معلوم ہوا کہ ہندوستان کی حکومت آزادی حاصل کرنے کے بعد پاکستان کو اس کے حصے کی دولت دینے سے گریز کر رہی ہے۔ اسی اخبار میں یہ بھی خبر تھی کہ ریاست کشمیر کے مسلمانوں نے پاکستان میں شامل ہونے کا اعلان کیا ہے جس سے گھبرا کر ہندوستان کی حکومت نے اپنی فوج کشمیر میں بھیج دی ہے اور وہاں انڈین فوج اور مجاہدین میں زبردست جنگ شروع ہوگئی ہے۔ دن کے بارہ بجے کے قریب کملا ڈرائنگ رُوم میں نمودار ہوئی۔ اُس نے نہا دھو کر نئی ساڑھی پہن رکھی تھی اور میک اپ کیا ہوا تھا۔ میں نے اخبار ایک طرف رکھ دیا۔ وہ میرے سامنے بیٹھ گئی۔

''تم نے ناشتہ کرلیا تھا؟'' اُس نے پوچھا اور پرس میں سے سگریٹ نکال کر سلگا لیا۔

میں نے کہا۔ ''کرلیا تھا۔ مجھے معلوم تھا تم دیر سے اُٹھو گی۔''

''اچھا کیا۔'' اُس نے سگریٹ کا دھواں اُڑاتے ہوئے جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔ ''اُرملا کا کچھ پتہ چلا؟''

اُس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''رات مجھے اسی لئے دیر ہوگئی تھی۔ جو آدمی اُرملا کو ڈُلاری ماتا کی حویلی سے جا کر لایا تھا میں رات اُسی کے پاس گئی تھی۔''

میں نے جلدی سے پوچھا۔ ''کیا وہ بمبئی آگئی ہے؟''

''نہیں۔'' کملا کے اس جواب پر میں حیران رہ گیا۔ میں نے کسی قدر تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''اگر وہ ڈُلاری ماتا کی حویلی سے آگئی ہے تو پھر کہاں ہے؟ کیا وہ سیٹھ کیشو رائے کے بنگلے پر نہیں پہنچی؟''

کملا نے جواب دیا۔ ''بڈھا کھوسٹ سیٹھ اپنی ہی جوان اولاد سے ڈرتا ہے۔ اُن

کے ڈر کے مارے وہ اُرملا کو اپنے بنگلے پر نہیں لایا۔ میرا بھی یہی خیال تھا کہ وہ اُ
بنگلے پر نہیں لائے گا۔''

''تو پھر اُرملا کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

کملا بولی۔ ''اُس عیاش بڈھے نے اُرملا کو اپنی داشتہ یعنی رکھیل بنا کر رکھنا ہے ا
سے بیاہ تو کرنا نہیں۔ چنانچہ اُس نے اُرملا کو شیتل گڑھ پہنچا دیا ہے۔''

میں کملا کا منہ تکنے لگا۔ وہ کہنے لگی۔ ''شیتل گڑھ میں سیٹھ نے اپنی عیاشی کے
جنگل میں ایک آشرم بنا رکھا ہے۔ نام تو اُس کا آشرم ہے مگر وہ بے حد بے شرم جگہ ہے
سیٹھ مہینے میں ایک بار مجھے بھی وہاں لے جاتا ہے۔ وہاں عیش و عشرت کا ہر قسم کا سا
سامان موجود ہے۔ چاروں طرف ویران بیابان جنگل ہے۔ کوئی پوچھنے والا نہیں۔ کو
کسی کی آواز سننے والا نہیں۔ سیٹھ کے پالتو غنڈے ہر وقت آشرم کے اِرد گرد پہرے
موجود رہتے ہیں۔ اُرملا کو بھی اُس نے وہیں پہنچا دیا ہے۔ مجھے گوپل نے یہ سب
ہے۔ وہی بقایا رقم لے کر غنڈوں کے ساتھ اُرملا کو لینے دُلاری ماتا کی حویلی گیا تھا۔''

میں چپ ہو گیا۔ مجھ پر مایوسی سی چھا گئی۔ کملا میرے جذبات کو سمجھتی تھی، کہنے لگی۔

''تم نے پھر منہ لٹکا لیا۔ تم اتنی جلدی نراش کیوں ہو جاتے ہو؟ اُرملا سیٹھ کے آشـ
میں ہے۔ اگر وہ آکاش کے دیوتاؤں کے پاس بھی ہوتی تو میں تمہارے لئے اُسے وہا
سے بھی نکال لاتی۔''

اور وہ سامنے والے صوفے سے اُٹھ کر میرے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ اُس نے اپنا با
میری گردن کے گرد ڈال دیا اور میرے بالوں کو پیار سے سہلانا شروع کر دیا۔ مجھ
ایک عجیب سی گھبراہٹ طاری ہو گئی مگر میں یہ خیال کر کے اپنی جگہ پر سمٹ کر بیٹھا رہا
کملا دوسری قسم کی عورت ہے۔ اس کا سبھاؤ عام گھریلو عورتوں ایسا نہیں ہے۔ وہ ا
عادت کے مطابق ایسا کر رہی ہے۔ نوکرانی نے اندر آ کر پوچھا۔

''کھانا لگا دوں بیگم صاحبہ؟''

کملا اُسے دیکھ کر بھی پیچھے نہ ہٹی اور اپنا بازو صوفے کی پشت پر میری گردن
ڈالے رکھا۔ ویسے ہی بیٹھے بیٹھے نوکرانی بائی سے کہا۔

''ہاں لگا دو!''

بائی چلی گئی تو کملا نے اپنا بازو میری گردن سے الگ کرتے ہوئے کہا۔

''تم بہت شرمیلے ہو۔ ضرور تمہاری اُرملا بھی تمہارے جیسی ہی ہو گی۔ اسی لئے تم
دونوں ایک دوسرے سے محبت کرنے لگے ہو۔ مجھے محبت کرنے والے پریمی بڑے اچھے
لگتے ہیں۔ اب میری طرف ہی دیکھو مجھ میں کیا کمی ہے؟ جوان ہوں۔ لوگ کہتے ہیں کہ
میں خوبصورت بھی ہوں۔ لیکن اس کے باوجود کوئی مجھ سے ایسی محبت نہیں کرتا جیسی محبت
تم اُرملا سے کرتے ہو۔ مجھے کوئی اُٹھا کر لے جائے تو کسی کو کوئی پرواہ نہیں ہو گی۔ کوئی
میرے لئے اتنا اُداس نہیں ہو گا جتنا تم اُرملا کے لئے اُداس اور پریشان ہو۔ خیر کوئی
بات نہیں......'' اُس نے سگریٹ کا ہلکا سا کش لگا کر دُھواں چھوڑتے ہوئے کہا۔ ''میں
دوسروں کی محبت دیکھ کر خوش ہو لیتی ہوں۔ لگتا ہے یہ میں ہی محبت کر رہی ہوں۔''

مجھے اُس کی ذاتی زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں تو یہ سوچ رہا تھا کہ وہ مجھے سیٹھ
کے شیتل گڑھ والے آشرم کا پتہ سمجھا دے اور میں عثمان بھائی کے پاس جا کر اُس سے
مدد طلب کروں۔ کیونکہ وہی ایک آدمی وہاں کے غنڈوں سے نمٹ سکتا تھا اور اُرملا کو نکال
کرلانے میں میری مدد کر سکتا تھا۔ کملا ایک لمحے کے لئے خاموش ہوئی تو میں نے کہا۔

''یہ شیتل گڑھ کس جگہ پر ہے؟ پلیز مجھے اس کا پتہ سمجھا دو! میں اُرملا کو وہاں سے
نکالنے کی پوری کوشش کروں گا۔''

کملا میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔ پھر میرے ہونٹوں پر اپنی سرخ ناخن والی اُنگلی
آہستہ سے پھیرتے ہوئے بولی۔

''تمہیں وہاں جانے کی کیا ضرورت ہے؟ میں کس لئے ہوں؟ اور وہ حرامی گوپل کس
مرض کی دوا ہے؟ آخر وہ کس دن میرے کام آئے گا۔ میں اُسے کہہ کر اُرملا کو سیٹھ کے
آشرم سے فرار کرا دوں گی۔ پھر تم اُسے لے جانا۔''

میں نے کہا۔ ''وہ سیٹھ کا خاص آدمی ہے۔ وہ یہ کام کیوں کرنے لگا؟ سیٹھ تو اُسے
دوسرے غنڈوں سے مروا دے گا۔''

کملا بولی۔ ''مرتا ہے تو مر جائے۔ اُس حرامی کی ذات تو پہچانی جائے گی۔ لیکن تم
شانت رہو۔ ایسا نہیں ہو گا۔ اگر اُس حرامی گوپل نے میری مدد نہ کی تو میں خود اُسے گولی
ماردوں گی۔ وہ جانتا ہے کہ اس سے پہلے میں ایک بدمعاش ٹیکم کو گولی مار چکی ہوں۔''

میں سمجھ گیا تھا کہ کملا اس مشن میں ایک خاص حد تک ہی میری مدد کرسکتی ہے۔ ا
سے آگے اس پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ وہ میرے ساتھ مخلص ضرور تھی لیکن اس میں معا
فہمی اور عقل کی کمی تھی اور جس قسم کے حالات کا مجھے سامنا تھا ان کے لئے معاملہ فہمی ا
عقل کی ساتھ ہی ساتھ ضرورت تھی۔ دوسری مشکل یہ تھی کہ کملا کے تعاون کے بغیر مے
آگے چل بھی نہیں سکتا تھا۔ ایک تو وہ بڈھے کیشو رائے اور اُس کے تمام غنڈوں کو اچھ
طرح سے جانتی تھی دوسرے وہ جنگل والے سیٹھ کے عیاشی کے اڈے سے اور اُس کے
سارے حدود اربعے سے واقف تھی کیونکہ وہ خود وہاں رہ چکی تھی۔ میں نے کہا۔

''تو پھر ہمیں کیا کرنا چاہئے؟''

کملا نے سگریٹ ایش ٹرے میں مسل دیا اور صوفے پر سے اُٹھتے ہوئے بولی۔

''چلو پہلے کھانا کھالیں۔ پھر بات کریں گے۔''

اس دوران ڈرائنگ رُوم کی کونے والی میز پر بائی نے کھانا لگا دیا تھا۔ ہم کھا
کھانے بیٹھ گئے۔ میرا دھیان اُرملا کی طرف ہی لگا ہوا تھا۔ کچھ کھانے کو جی نہیں چاہ
تھا۔ کبھی سوچتا کہ اس عورت کملا سے شیتل گڑھ کا ایڈریس معلوم کروں اور سیدھا عثما
بھائی کی کھولی پر پہنچ جاؤں اور اُسے ساری بات بتا کر اُس سے مدد مانگوں۔ پھر خیال آ
کہ تھوڑا انتظار کرلوں۔ دیکھتا ہوں کملا کیا بتاتی ہے اور اس سلسلے میں وہ کیا سوچ رہ
ہے؟ کھانا کھانے کے دوران کملا میرے ساتھ اُرملا ہی کی باتیں کرتی رہی۔ لیکن اُس
نے اُسے جنگل سے نکالنے کی کوئی بات نہ کی۔ یہی پوچھتی رہی تم دونوں واقعی ایک
دوسرے سے بہت پریم کرتے ہو؟ تم نے پہلی بار اُرملا کو کہاں دیکھا تھا؟ کیا وہ بھی تم
سے اسی طرح پیار کرتی ہے جس طرح تم کرتے ہو؟ اُس کا جسم میری طرح ہی
خوبصورت ہے کیا؟ اُس کے اس قسم کے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے مجھے عجیب قسم کی
جھجک سی محسوس ہورہی تھی۔

جب اُس نے اپنے سینے پر سے ساڑھی کا پلو ذرا سا ہٹاتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔
''کیا وہ بھی میری طرح سیاہ بلاؤز پہنتی ہے؟''

تو میں نے نظریں نیچی کرلیں۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ کملا نے اپنا سر نیچے کر
کے مجھے دیکھا اور مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''شرما گئے ہو؟ کیا تم نے اس سے پہلے کسی عورت کا بلاؤز نہیں دیکھا؟''

کملا کی جگہ کوئی دوسری عورت ہوتی تو میں کھانا چھوڑ کر اُسی لمحے اُٹھ کر چلا جاتا۔ مگر
میں ایسا کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ مجھے ہر حالت میں کملا کے سوال کا کوئی نہ کوئی
جواب دینا ہی تھا۔ میں نے کہا۔ ''نہیں...... ایسی بات نہیں ہے۔ بمبئی شہر میں تو تقریباً
ہر ساڑھی والی عورت کا بلاؤز نظر آجاتا ہے۔''

''تو پھر تم کیوں شرما گئے تھے؟'' اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''بس یونہی شرم سی آگئی تھی۔''

وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔ ''سچ مچ تم بہت شرمیلے ہو۔ مجھے شرمیلے نوجوان بڑے اچھے
لگتے ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ مجھے آج تک بے شرم آدمی ہی ملے ہیں۔''

جب مجھے احساس ہوا کہ وہ کسی اور ہی طرف چل پڑی ہے تو میں نے اُسے اصل
موضوع پر لانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''اُرملا کو آشرم سے نکالنے کے لئے تم نے کیا سوچا ہے؟''

کملا نے سر کرسی کی پشت سے لگا کر آنکھیں بند کرلیں، پھر آنکھیں کھول کر چھت کی
طرف دیکھا اور سیدھی ہو کر بیٹھتے ہوئے بولی۔

''اس کام میں گوپال ہماری بہت مدد کرسکتا ہے۔''

''کیا وہ نیک نیتی سے ایسا کرسکے گا؟''

میرے سوال پر کملا نے گوپال کو ایک موٹی گالی دی اور کہا۔ ''اُس کا باپ بھی کرے
گا۔ میرے پاس اُس کی ایک ایسی کمزوری ہے کہ اگر میں کسی کو بتا دوں تو اُسے پھانسی
ہوسکتی ہے۔''

''پھر ہمیں دیر نہیں کرنی چاہئے۔''

''دیر سویر کی بات ہی نہیں ہے۔ لیکن اگر تمہیں اُرملا بہت یاد آرہی ہے تو میں آج ہی
گوپال سے بات کرتی ہوں۔ وہ بمبئی میں سیٹھ کے بنگلے پر ہی ہے۔''

کملا کے اس فیصلے سے مجھے حوصلہ ملا۔ کھانا کھانے کے بعد اُس نے منہ ہاتھ دھو کر
میک اپ کیا اور یہ کہہ کر نکل گئی کہ شام کو آؤں گی۔ مگر وہ شام کی بجائے رات کو آئی۔ وہ
کچھ تھکی تھکی سی تھی۔ میں ڈرائنگ رُوم میں ہی اُس کے انتظار میں بیٹھا تھا۔ اپنا پرس

صوفے پر پھینک کر وہ کہنے لگی۔

"میں منہ ہاتھ دھو کر آتی ہوں۔"

تھوڑی دیر بعد وہ تازہ دم ہو کر آ گئی اور میرے پاس ہی صوفے پر بیٹھ گئی۔ میں ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ "کیا گومل سے ملاقات ہو گئی تھی؟"

"ہاں۔" اُس نے پُر سکون آواز میں کہا اور پرس کھول کر سگریٹ نکالا، اُسے سلگایا اور آنکھیں بند کر کے اس کا ایک ہلکا کش لگایا اور پھر آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھا وہ مسکرائی۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کر رہی ہے؟ میں اُس کے ناز و ادا برداشت کرنے پر مجبور تھا۔ کہنے لگی۔

"گومل ہماری مدد پر تیار ہو گیا ہے۔ میں نے تمہیں کہا تھا ناں کہ وہ کبھی انکار نہیں کرے گا۔ مجھے انکار کر کے اُسے مرنا نہیں ہے۔ پروگرام یہ بنا ہے کہ تم گومل کے ساتھ بمبئی سے سیٹھ کے شیتل گڑھ والے آشرم میں جاؤ گے۔ وہ تمہیں جنگل میں کسی خفیہ جگہ چھپا دے گا اور خود حالات کا جائزہ لے کر کسی نہ کسی طرح کوئی سکیم بنا کر اُرملا کو سیٹھ کے آشرم سے فرار کروا کر تمہارے پاس پہنچا دے گا اور تم اُسے لے کر نکل جاؤ گے۔ بہتر یہی ہو گا کہ تم وہاں سے رات کے وقت میرے فلیٹ پر آ جاؤ لیکن اگر تم کسی دوسری جگہ جانا چاہو تو چلے جانا۔ کیا تم اس کے لئے تیار ہو؟"

"کیوں نہیں؟" میں نے فوراً جواب دیا۔ "میں تیار ہوں۔ ہم کب شیتل گڑھ روانہ ہوں گے؟"

"یہ گومل مجھے کل شام کو بتائے گا۔"

اب پھر انتظار کا ایک صبر آزما طویل دن میرے سامنے تھا۔ اگلا سارا دن میں نے فلیٹ کے ڈرائنگ رُوم میں بے چین رہ کر گزارا۔ کملا حسبِ معمول رات کو دیر سے آئی تھی اور صبح دیر تک سوئی رہی تھی۔ پھر تیار ہو کر شام کے وقت نکل گئی جاتے ہوئے مجھے تسلی دے گئی کہ میں گومل سے مل کر سارا پروگرام معلوم کر کے جلدی واپس آ جاؤں گی لیکن اُسے پھر رات ہو گئی۔ اُس نے بتایا کہ پروگرام کے مطابق مجھے اور گومل کو منہ اندھیرے کی ٹرین میں شیتل گڑھ کی طرف روانہ ہو جانا ہو گا۔ یہ میرے لئے خوشخبری تھی۔ خدا خدا کر کے حالات کا جمود ٹوٹا تھا اور اُرملا کو بازیاب کرانے کا کوئی راستہ نظر آیا

تھا۔

کملا کہنے لگی۔ "تم بمبئی کے سٹیشن بوری بندر تک میرے ساتھ جاؤ گے۔ وہاں گومل ہمارا انتظار کر رہا ہو گا۔ میں تمہیں اُس کے حوالے کر کے واپس آ جاؤں گی۔ اس کے بعد گومل سب کچھ سنبھال لے گا۔ تمہیں صرف اس کی ہدایت پر عمل کرنا ہو گا۔"

اُس نے پرس کھول کر اس میں سے کچھ کرنسی نوٹ نکال کر مجھے دیئے اور کہا۔

"انہیں اپنے پاس رکھ لو۔ تمہیں ان کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔"

میں نے نوٹ لے کر جیب میں ڈال لئے۔ پھر اُس نے کہا۔ "اور وہ بدمعاشوں والا چاقو جو تم لئے لئے پھرتے تھے یہیں چھوڑ جانا۔ اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

میں چپ رہا۔ میں نے دل میں سوچ لیا تھا کہ چاقو ساتھ ہی لے کر جاؤں گا۔ جنگل میں کسی بھی جگہ اس کی ضرورت پڑ سکتی تھی۔

بمبئی کے سٹیشن بوری بندر سے ٹرین صبح سوا سات بجے چلتی تھی۔ کملا کبھی اتنی سویرے نہیں جاگی تھی لیکن کمال ہے کہ وہ اُس روز صبح چھ بجے ہی تیار ہو گئی تھی۔ ہم ٹیکسی میں بیٹھ کر بوری بندر پہنچ گئے۔ وہاں گومل پہلے سے موجود تھا۔ کملا نے مجھے اُس سے ملایا۔ گومل نے مجھے ایک لمحے کے لئے ٹکٹکی باندھ کر دیکھا اور پھر کملا سے باتیں کرنے لگا۔ گومل کی عمر پچیس تیس سال کے درمیان تھی۔ جسم دُبلا تھا۔ چہرے سے جرائم پیشہ نہیں لگتا تھا۔ مگر کملا نے مجھے بتایا تھا کہ وہ تین آدمیوں کا خون کر چکا ہے۔ اُس نے نسواری بش شرٹ اور پتلون پہنی ہوئی تھی۔ وہ بیڑی پی رہا تھا۔ جانے سے پہلے کملا نے مجھے ایک بار پھر تاکید کی کہ گومل جس طرح کہے اسی طرح کرنا۔ پھر اُس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور چہرہ ذرا سا میرے قریب لا کر کہا۔

"میں تمہیں یاد رکھوں گی۔ تم بھی مجھے یاد رکھنا!"

مسکراتے ہوئے اُس نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا اور چلی گئی۔ گومل ہم دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ جب وہ چلی گئی تو گومل کہنے لگا۔ "ہوشیار رہنا! یہ بڑی نرت کار عورت ہے۔"

شیتل گڑھ بمبئی سے دِلّی جانے والی مین لائن پر نہیں تھا۔ پوڑی نام کے ریلوے سٹیشن سے ایک برانچ لائن نکلتی تھی جو شیتل گڑھ سے ہوتی ہوئی آگے امراولی اور جھومری تلیا کی طرف نکل جاتی تھی۔ اس برانچ لائن پر میں نے پہلے سفر نہیں کیا تھا۔ گومل نے

شیتل گڑھ کے دو ٹکٹ پہلے سے لے رکھے تھے۔ دِلّی جانے والی ٹرین تیار ہوئی تو ہم
اس میں بیٹھ گئے۔ پوڑی تک ٹرین مین ٹریک پر رہی۔ پوڑی کے سٹیشن پر ہم اُتر گئے اور
وہاں سے شیتل گڑھ والی گاڑی میں سوار ہو گئے۔

ہم صبح کے وقت چلے تھے۔ سارا دن سفر میں رہے۔ شیتل گڑھ والی برانچ لائن انڈ
کے وسطی نیم پہاڑی علاقے کے گھنے جنگلوں میں سے ہو کر گزرتی تھی۔ راستے میں د
ایک دریا بھی آئے جن پر ریل کے بڑے شاندار پُل انگریزوں کے زمانے کے ب
ہوئے تھے۔ چاقو میں نے کملا کی آنکھ بچا کر اپنی پتلون کی پچھلی جیب میں رکھ لیا تھا۔
گوپل بڑا باتونی تھا۔ سارا رستہ میرا سر کھاتا رہا۔ اُس نے بھی اُرملا کے بارے میں مجھ
سے کئی سوال کئے۔ ایک دفعہ جب اُس نے مجھ سے پوچھا کہ میں تو مسلمان ہوں او
اُرملا ہندو ہے ہم دونوں کا پیار کیسے نبھ سکے گا؟ تو میں نے کہا۔

''محبت ذات پات اور دھرم نہیں دیکھتی۔''

وہ کہنے لگا۔ ''لیکن یہاں کے ہندو اسے پسند نہیں کریں گے کہ ایک مسلمان لڑکا ہند
لڑکی سے پریم کرتا ہے۔''

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے گوپل کی باتوں سے اندازہ لگا لیا تھا کہ اُسے
ایک مسلمان کا ایک ہندو لڑکی سے محبت کرنا اچھا نہیں لگا۔ اب مجھے یہ فکر بھی پریشا
کرنے لگا کہ کہیں گوپل کی نیت نہ بدل جائے۔ لیکن اس کا میرے پاس کوئی علاج نہیں
تھا۔ یہ سوچ کر خاموش رہا کہ جیسے حالات ہوں گے دیکھ لوں گا۔ ایک بار اُرملا سے
ملاقات ہو جائے پھر میں سب کچھ سنبھال لوں گا۔

سورج غروب ہو رہا تھا جب ٹرین شیتل گڑھ کے چھوٹے سے سٹیشن پر آ کر رُک گئی۔
ہم ٹرین سے اُتر پڑے۔ سٹیشن سے باہر آ کر ہم ایک خستہ حال یکے پر سوار ہو گئے۔ یکہ
ڈیڑھ دو گھنٹے تک ویران بے آباد علاقوں میں اُونچی نیچی پگڈنڈی پر چلتا رہا۔ ایک جگہ
بڑی ندی کے کنارے چھوٹا سا گھاٹ بنا ہوا تھا۔ ہم وہاں اُتر گئے۔ یہاں سے ندی پار
کی اور ایک گھنے جنگل میں داخل ہو گئے۔ میں نے گوپل سے پوچھا۔

''ہمیں کتنی دُور چلنا ہو گا؟''

وہ طنزیہ انداز میں بولا۔ ''اپنی پریمیکا سے ملنے جا رہے ہو، تمہیں تھکنا تو نہیں چاہئے۔''

میں نے کہا۔ ''میں تھکا نہیں ہوں۔ ویسے ہی پوچھ رہا ہوں۔''

وہ بولا۔ ''اس جنگل کے آگے آشرم کی چار دیواری دُور سے نظر آ جائے گی۔''

جنگل ختم ہوا تو ایک چار دیواری دکھائی دی جس کے اُوپر گھنے سیاہ درختوں نے سایہ
ڈال رکھا تھا۔ ہم ایک پگڈنڈی پر چل رہے تھے۔ گوپل نے دُور سے چار دیواری کی
طرف اشارہ کیا اور کہا۔

''وہ سیٹھ کا آشرم ہے۔''

آدھا راستہ چلنے کے بعد گوپل دائیں جانب ہو گیا جدھر بانس کے درختوں کے جھنڈ
کھڑے تھے۔ وہ کہنے لگا۔ ''یہاں آگے جا کر ایک سادھ ہے۔ میں تمہیں وہاں چھوڑ کر
آشرم چلا جاؤں گا اور دیکھوں گا کہ حالات کیسے ہیں۔ سیٹھ آشرم میں نہیں ہے مگر اُس
کے ہٹے کٹے غنڈے آشرم کی نگرانی پر موجود ہیں۔ تم سادھ میں ہی رہنا۔ وہاں سے باہر
مت نکلنا۔ سیٹھ کے آدمی آشرم کے آس پاس بھی گشت لگاتے رہتے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''تم مجھے جہاں بٹھا جاؤ گے میں وہیں بیٹھا رہوں گا۔''

ہم بانس کے جھنڈوں کے درمیان سے گزر کر ایک اُونچے ٹیلے کے قریب سے
ہوتے ہوئے دوسری طرف آ گئے جہاں تاڑ کے اُونچے اُونچے درخت تھے۔ ایک جگہ دو
بڑے تناور درخت ساتھ ساتھ اُگے ہوئے تھے۔ اُن کے نیچے ایک بڑے چبوترے پر کسی
جوگی وغیرہ کی سادھ تھی اور ایک چبوترے کے وسط میں ایک بُرجی بنی ہوئی تھی جہاں اُس
جوگی وغیرہ کی ہڈیاں کسی برتن میں ڈال کر دفن کی گئی تھیں۔ سادھ کے چبوترے کے پیچھے
پتھر کی چار دیواری والی ایک کوٹھڑی تھی۔ گوپل مجھے کوٹھڑی کے اندر لے گیا۔ کوٹھڑی شکستہ
حالت میں تھی۔ فرش پر گھاس اور پتے پڑے ہوئے تھے۔ کہنے لگا۔

''تم اس جگہ ٹھہرو گے۔ ہو سکتا ہے تمہیں دو تین دن تک رُکنا پڑے۔ کھانے پینے کی
فکر نہ کرنا وہ میں تمہیں رات کے اندھیرے میں آ کر دے جایا کروں گا۔ لیکن یہاں سے
باہر مت نکلنا۔ سمجھ گئے ہو ناں؟''

''ہاں سمجھ گیا ہوں۔'' میں نے فوراً جواب دیا۔

گوپل نے کہا۔ ''جنگل کے اس حصے میں شیر، چیتے اور دوسرے درندے نہیں آتے۔
کہتے ہیں یہ جس جوگی بابا کی سادھ ہے اس کی کرامت کی وجہ سے درندے ادھر کا رُخ

نہیں کرتے۔''

ہم کوٹھڑی سے باہر آ گئے۔ گومل بولا۔ ''یہاں سے وہ تاڑ کے جو درخت ہیں ان کے نیچے ایک چھوٹی سی ندی بہتی ہے۔ وہاں تم نہا بھی سکتے ہو اور ندی کے پانی سے پیاس بھی بجھا سکتے ہو۔ اب میں چلتا ہوں۔ ایک گھنٹے تک تمہارے لئے کچھ کھانا لے آؤں گا۔''

گومل چلا گیا اور میں سادھ کے چبوترے کی سیڑھیوں میں بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہیں گومل مجھے دھوکہ تو نہیں دے جائے گا؟ حقیقت یہ ہے کہ جب سے اُس نے یہ کہا تھا کہ بھارت کے ہندو اسے پسند نہیں کریں گے کہ ایک مسلمان ایک ہندو لڑکی سے پیار کرتا ہے، اُس وقت سے گومل پر سے میرا اعتبار اُٹھ گیا تھا۔ صرف اس خیال سے تھوڑا سا حوصلہ ہوتا تھا کہ چونکہ کملا کے پاس گومل کی کوئی زبردست کمزوری ہے جس کی وجہ سے وہ پھانسی کے تختے پر پہنچ سکتا ہے اس لئے شاید وہ میرے ساتھ دھوکہ نہ کرے۔ وہ دھوکہ یہی کر سکتا تھا کہ سیٹھ کے غنڈوں کو میرے عزائم سے آگاہ کر کے مجھے اُن کے ہاتھوں پکڑوا دے۔ وہ مجھے غنڈوں کے ہاتھوں قتل بھی کروا سکتا تھا۔ میرا ذہن اسی کشمکش میں مبتلا تھا۔ کبھی سوچتا کہ گومل، سیٹھ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے ساری بات اس کے کان میں ڈال سکتا ہے اور کہہ سکتا ہے کہ اُرملا کو کہیں اِدھر اُدھر کر دو۔ دوسری طرف کملا سے بھی وہ سیٹھ کو بدظن کر سکتا ہے۔ وہاں کملا کچھ نہیں کر سکتی تھی۔

اب میں پچھتا رہا تھا کہ میں نے کملا سے مدد کیوں لی۔ مجھے اُس کی بجائے اس کے بھائی سے بات کرنی چاہئے تھی۔ اس مہم میں صرف وہی ایک آدمی میرے کام آ سکتا تھا اور میں اُس پر بھروسہ بھی کر سکتا تھا۔ میرے خدشات بے بنیاد نہیں تھے۔ پاکستان بن چکا تھا۔ ہندو مسلم فسادات ابھی ختم ہی ہوئے تھے۔ ہندو کے دل میں مسلمانوں کے خلاف جو شروع سے نفرت تھی وہ پاکستان کے بن جانے کے بعد اور زیادہ گہری ہو گئی تھی کیونکہ ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق مسلمانوں نے پاکستان بنا کر اُن کی بھارت ماتا کے دو ٹکڑے کر دیئے تھے اور یہ کملا، گومل اور سیٹھ کیشو راؤ سب ہندو تھے۔ ان سے اپنے لئے نیکی کی توقع نہیں رکھنی چاہئے تھی۔ صرف اُرملا ایک ایسی لڑکی تھی جس پر بھروسہ کر سکتا تھا۔ ایک تو وہ مجھ سے بے پناہ پیار کرتی تھی اور دوسرے اُس کا

ہندوؤں کے جین مت فرقے سے تھا جو برہمنوں کی طرح بتوں کی پوجا نہیں کرتے تھے بلکہ دیوی دیوتاؤں کی پوجا کے سخت خلاف تھے۔ وہ صرف اپنے دھرم کے راہ نما مہاویر کے بُت کی پوجا کرتے تھے۔ تیسری بات یہ تھی کہ اُرملا ایک پڑھی لکھی لڑکی تھی اور اُس نے کبھی مجھ سے میرے مذہب یا اپنے جین دھرم کے بارے میں کوئی بات نہیں کی تھی۔

حالات کا یہ سارا پس منظر میرے سامنے تھا اور مجھے اسی پس منظر کی روشنی میں آگے کوئی قدم اُٹھانا تھا۔ کملا کی مدد حاصل کر کے اور گومل کو اپنی خطرناک مہم کا رازدار بنا کر میں نے بہت حد تک حماقت کی تھی۔ لیکن اب بلی تھیلے سے اور تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ اس کے باوجود میں نے دل میں سوچ رکھا تھا کہ اگر کہیں کوئی گڑبڑ ہو گئی تو میں جان کی بازی لگا کر اُرملا کو موت کے منہ سے بھی نکال کر لے جاؤں گا۔ وقت کے ساتھ ساتھ اُرملا کی محبت میری رُوح کی گہرائیوں تک اُتر گئی تھی۔ یہ ایک جسم کی دوسرے جسم سے محبت نہیں تھی یہ رُوح کی دوسری رُوح سے محبت تھی۔ اس محبت میں کوئی لالچ، کوئی غرض نہیں تھی۔ صرف محبت ہی محبت تھی۔ یہ نہ جانے کب سے بچھڑی ہوئی دو رُوحوں کا اس دنیا میں پہلا ملاپ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب میں اُرملا کو دیکھتا تھا تو مجھے اُس کے جسم میں اُس کی رُوح دکھائی دیتی تھی۔ جسم غائب ہو جاتا تھا۔

سب سے اہم وجہ جس نے اُرملا سے میری محبت کو آسمان کی بلندیوں تک پہنچا دیا تھا وہ یہ تھی کہ اُرملا دل سے مسلمان ہو چکی تھی۔ جس کا ابھی تک سوائے میرے اور کسی کو علم نہیں تھا۔ سورج غروب ہو گیا تھا اور جنگل میں اندھیرا گہرا ہونے لگا تھا۔ درختوں پر پرندوں نے شور مچانا شروع کیا ہوا تھا جو مجھے معلوم تھا اُس وقت تک جاری رہے گا جب تک کہ شام رات کے پہلے پہر میں داخل نہیں ہو جاتی۔ کچھ ہی دیر گزری ہو گی کہ ایک طرف درختوں کے نیچے مجھے ٹارچ کی روشنی حرکت کرتی نظر آئی۔ یہ گومل تھا۔ وہ میرے لئے کچھ کھانے پینے کو لایا تھا۔ وہ میرے پاس سادھ کے چبوترے کی سیڑھیوں پر بیٹھ گیا۔ کہنے لگا۔

''یہاں تمہیں تکلیف تو ہو گی مگر جیسے بھی ہو آج کی رات گزار دو۔ کل میں تمہیں دوسری جگہ لے جاؤں گا۔ وہاں تمہیں سونے کے لئے کھاٹ اور بستر وغیرہ مل جائے گا۔''

میں خاموشی سے کھانا کھانے لگا۔ ایک برتن میں چاول اور دال ملی ہوئی تھی۔ ساتھ

ہی کٹورے میں پانی تھا۔ گوپل کہنے لگا۔ ''یہ پانی کا کٹورہ تم اپنے پاس ہی رکھ لو۔ رات
پیاس لگی تو پانی پی لینا۔ میں صبح آؤں گا۔''
وہ چلا گیا۔ کچھ دیر میں سادھ کی سیڑھیوں میں ہی بیٹھا سوچتا رہا کہ آگے کیا ہو
والا ہے اور کیا نہیں ہونے والا؟ پھر اُٹھ کر درختوں کے نیچے ٹہلنے لگا۔ جنگلوں میں
یار و مددگار راتیں بسر کرنے کا مجھے کافی تجربہ تھا۔ میرے لئے یہ کوئی انوکھی بات نہ
تھی۔ میرا جسم ان سختیوں کا عادی ہو چکا تھا۔ خطرہ صرف کسی جنگلی درندے کا تھا۔ کیو
یہ جنگل میرے لئے نیا تھا اور مجھے اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہاں کر
کے درندے راتوں کو شکار کے لئے نکلتے ہیں۔ بہرحال اپنی حفاظت کرنا ضروری تھ
چنانچہ میں نے ایک درخت کو رات بسر کرنے کے واسطے چن لیا اور اس پر چڑھ کر ا
کے ایک دو شاخے پر اس طریقے سے نیم دراز ہو گیا کہ سوتے میں اگر دائیں بائیں
بدلوں تو نیچے نہ گر پڑوں۔ ہوا بند تھی۔ مچھر بھی بہت تھے مگر میں کسی نہ کسی طرح وہیں
رہا۔ ذہن پریشان کر دینے والے خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ کسی بھی قسم کے خطرناک
حالات کا سامنا ہو سکتا تھا مگر میں ہر قسم کے حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار تھا۔
رات سوتے جاگتے گزر گئی۔ آدھی رات کے وقت جنگل میں دُور کسی شیر کی ہلکی
دھاڑ سنائی دی تھی اس کے بعد خاموشی چھا گئی تھی۔ شیر کی دھاڑ سے میں سمجھ گیا تھا
اُس نے کوئی شکار مار لیا ہے۔ صبح کے وقت جنگل چڑیوں کی چہکار سے گونج اُٹھا۔
درخت سے نیچے اُتر آیا۔ پانی کا کٹورا میں نے پتوں سے ڈھانپ کر سادھ کی بُرجی
اندر رکھ دیا ہوا تھا اُس میں سے تھوڑا سا پانی پیا اور سادھ کے ننگے چبوترے پر لیٹ گ
رات بے آرامی سے مچھر مارتے اور پہلو بدلتے گزری تھی۔ اب جو سیدھا ہو کر مچھر
کی یلغار سے محفوظ لیٹا تو سو گیا۔ مجھے گوپل نے آکر جگایا۔ کہنے لگا۔
''کیا رات چبوترے پر ہی سوئے تھے؟ کوئی شیر اُٹھا کر لے جاتا تو کیا کرتے؟''
میں نے کہا۔ ''نہیں، میں درخت پر چڑھ کر سو گیا تھا۔''
''اچھا کیا۔ اب ناشتہ کر لو۔ اس کے بعد میرے ساتھ چلو۔ میں تمہیں دوسری
لے جاتا ہوں۔'' وہ میرے لئے ایک بڑی روٹی اور مٹی کے کٹورے میں چائے بھر کر
تھا۔ کہنے لگا۔ ''اس بات کا خیال رکھنا کہ جنگل میں تمہاری موجودگی کا کسی کو علم نہیں

چاہئے۔ نہیں تو پھر میں کچھ نہیں کر سکوں گا۔''
میں نے کہا۔ ''یہاں کون ہے جس کو میں اپنی موجودگی کے بارے میں بتاؤں گا؟''
وہ بولا۔ ''یہ بات نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ تمہیں کھلم کھلا جنگل میں چلنا پھرنا بھی
نہیں چاہئے۔ سیٹھ کے آدمی اس طرف آ سکتے ہیں۔ اور جہاں میں تمہیں لے جا رہا ہوں
وہ لوگ وہاں بھی آ سکتے ہیں۔ کیونکہ یہ جنگل سیٹھ نے کتان کے واسطے ٹھیکے پر لے رکھا
ہے اور اس کے پہرے دار یہ دیکھنے کے لئے بندوقیں لئے پھرتے رہتے ہیں کہ کہیں
کوئی لکڑہارا درخت کاٹ کر تو نہیں لے جا رہا۔''
میں نے کہا۔ ''میں اس کا خیال رکھوں گا۔''
میں نے روٹی چائے کے ساتھ کھا لی تو گوپل نے برتن کوٹھڑی کے اندر لے جا کر رکھ
دیئے اور مجھے ساتھ لے کر جنگل میں ایک طرف چل پڑا۔ ہم دو ایک چھوٹے ٹیلوں اور
بھوری چٹانوں کے قریب سے گزرنے کے بعد ایک تھوڑی سی کھلی جگہ پر آ گئے جہاں
چٹان کے سائے میں ایک جھونپڑی بنی ہوئی تھی۔ جھونپڑی کے اندر بانس کی ایک
چارپائی بچھی ہوئی تھی جس پر ایک میلا سا تکیہ اور دری پڑی تھی۔ جھونپڑی کے کونے میں
دو تین مٹی کے برتن پڑے تھے۔ گوپل نے کہا۔
''یہاں جھونپڑی کے پیچھے ایک چشمہ بہتا ہے۔ اُس کا پانی تم پینے کے لئے استعمال
کر سکتے ہو۔ ویسے تو میں کوشش کروں گا کہ کسی نہ کسی وقت تمہارے لئے کچھ نہ کچھ
کھانے کو لے آیا کروں۔ لیکن اگر کسی وجہ سے میں نہ آ سکا تو میں تمہارے لئے یہ بھنے
ہوئے چنے لایا ہوں ان سے گزارہ کر لینا۔''
اور اُس نے تھیلے میں سے بھنے ہوئے چنوں کا ایک لفافہ نکال کر مجھے دیا جو میں نے
چارپائی پر اپنے پاس رکھ لیا۔ میں نے اُس سے پوچھا۔
''تمہارے خیال میں یہاں کتنے دنوں تک مجھے رُکنا پڑے گا؟''
وہ بولا۔ ''بات یہ ہے کہ میں تمہاری اُرملا کو خود یہاں سیٹھ کے آشرم میں چھوڑ کر بمبئی
سیٹھ کو اطلاع دینے گیا تھا اور بمبئی سے روانہ ہونے سے پہلے بھی مجھے یہی معلوم تھا کہ
تمہاری اُرملا آشرم میں ہی ہے۔ مگر یہاں آ کر پتہ چلا کہ سیٹھ نے اُرملا کو کچھ دنوں کے
لئے اپنے فارم پر بھیج دیا ہے جو دریا پار ہے۔''

میرے دل نے کہا گومل جھوٹ بول رہا ہے لیکن میں اُسے کیسے کہتا کہ تم جھوٹ بول رہے ہو۔ مجھے اُس کے جھوٹ پر بھی اعتبار کرنا پڑ رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔

"کیا وہ آشرم میں واپس آئے گی یا فارم میں ہی رہے گی؟"

گومل بولا۔ "دونوں صورتوں میں مجھے خبر ہو جائے گی۔ اس کے بعد کوئی دوسری ترکیب سوچنی پڑے گی۔"

میں نے گومل سے براہِ راست سوال کر دیا۔ "گومل بھائی! تمہارے ذہن میں اگر کوئی ترکیب ہے تو مجھے بھی بتا دو۔ ہوسکتا ہے میں بھی تمہاری کوئی مدد کرسکوں۔"

گومل نے تیز نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور بولا۔ "تم میری کیا مدد کرو گے تمہیں تو خود میری مدد کی ضرورت ہے۔" اُس نے سر کو آہستہ سے جھٹک دیا اور پھر کہنے لگا۔ "کملا نے مجھے جس مصیبت میں ڈالا ہے اب تو وہ مجھے کاٹنی ہی پڑے گی۔ میری مشکل یہ ہے کہ میں کملا کی بات کو ٹال نہیں سکتا۔"

مجھے معلوم تھا کہ وہ کملا کی بات کو کیوں نہیں ٹال سکتا تھا۔ اُسے اپنے سامنے پھانسی کا تختہ نظر آ رہا تھا۔ میں اُس سے بحث نہیں کرسکتا تھا۔ میں نے فوراً معذرت کے انداز میں کہا۔ "گومل بھائی! تم جس طرح میری مدد کر رہے ہو اس کے لئے میں تمہارا بہت بہت شکریہ ادا کرتا ہوں۔"

گومل نے کوئی جواب نہیں دیا اور جیب سے بیڑی کا بنڈل نکال کر ایک بیڑی سلگائی اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ "میں چلتا ہوں۔ میری بات یاد رکھنا۔ جنگل میں زیادہ اِدھر اُدھر گھومنا پھرنا۔ اور اگر دُور سے کوئی آدمی آتا دکھائی دے تو چھپ جانا۔"

وہ چلا گیا اور مجھے جنگل کی ویران خاموشی نے اپنی آغوش میں لے لیا۔ دل یہی چاہتا تھا کہ ابھی کسی طرح چھپتا چھپاتا آشرم میں جاؤں اور اُرملا سے جا کر ملاقات کروں اُس کا معصوم اُداس چہرہ ایک نظر دیکھ آؤں۔ اُس کا خوبصورت معصوم چہرہ تو اب زیادہ اُداس ہو گیا ہوگا۔ نہ جانے دُلاری ماتا کی خونی حویلی میں اُس پر کیا کچھ نہ گزری ہوگی اور سیٹھ کے آشرم پر کیا کچھ نہ گزری ہوگی؟ یہ سب کچھ صرف اسی وجہ سے ہوا کہ کانچی جادوگرنی پجارن میری جان کی دشمن بنی ہوئی تھی اور مجھے قتل کرنے کے طریقے تلاش کر رہی تھی۔ اگر میرے پاس اُرملا کی دی ہوئی انگوٹھی نہ ہوتی تو اب تک کانچی

قصہ ختم کر چکی ہوتی۔

میں چارپائی پر لیٹ گیا اور بہت کچھ سوچنے لگا۔ کبھی خیال آتا کہ گومل نے جھوٹ بولا ہے۔ اُرملا کہیں نہیں گئی آشرم میں ہی ہے۔ گومل مجھے آشرم کے غنڈوں کے ہاتھوں مروانے کے لئے کوئی منصوبہ بنا رہا ہے۔ کبھی خیال آتا کہ میں یونہی گومل پر شک کرنے لگا ہوں۔ مجھے قتل کروانے کے بعد وہ کملا کو کیا جواب دے گا؟ اُس کی اپنی جان بھی تو کملا کے قبضے میں ہے۔ وہ اُرملا کو میرے پاس لانے کے لئے ضرور کسی محفوظ اور مناسب موقعے کی تلاش میں ہے۔ غرض کہ میری عجیب حالت تھی۔ کبھی خیالات کی ایک لہر آتی اور مجھے پریشان کر کے نکل جاتی۔ کبھی دوسری لہر آتی اور مجھے تھوڑا بہت حوصلہ دلا کر گزر جاتی۔

دوپہر ہوگئی۔ میں نے تھوڑے سے چنے کھائے اور جھونپڑی سے نکل کر اُس چشمے کی طرف چلا جس کے بارے میں گومل نے بتایا تھا کہ وہ جھونپڑی کے قریب ہی ایک چٹان کے پیچھے ہے۔ چشمہ وہاں پر موجود تھا۔ ایک اُونچی جگہ سے پانی کی ایک چھوٹی سی دھار نیچے پتھروں پر گر رہی تھی جہاں ایک چھوٹا سا تالاب بن گیا تھا۔ پانی صاف تھا اور میں نے پیا تو معلوم ہوا کہ کھارا ہے، مگر اتنا زیادہ کھارا نہیں ہے کہ پی نہ سکوں۔ گرمی بہت تھی۔ میں نے کپڑے اُتارے اور چشمے میں بیٹھ کر نہانے لگا۔ نہانے سے مجھے فرحت محسوس ہوئی اور ذہن بھی جیسے تازہ ہو گیا۔ میں کپڑے پہن کر اپنی جھونپڑی کی طرف واپس جا رہا تھا کہ مجھے دُور سے ایک آدمی آتا دکھائی دیا۔ گومل کی ہدایت کے مطابق میں جلدی سے ایک طرف چھپ گیا اور چھپ کر اُس آدمی کو دیکھنے لگا۔ اُس نے مٹیالی سی چادر لے رکھی تھی اور آہستہ آہستہ چلا آ رہا تھا۔ پھر وہ درختوں کے درمیان ایک طرف کو جا کر میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ میں کچھ دیر وہیں چھپ کر بیٹھا رہا۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ وہ اجنبی شخص کافی دُور چلا گیا ہوگا تو میں بھی جھاڑیوں اور درختوں کی اوٹ سے نکل کر جھونپڑی کی طرف چلنے لگا۔

جھونپڑی میں آ کر میں چارپائی پر لیٹ گیا۔ نہانے سے جسم ہلکا پھلکا ہو گیا تھا۔ مجھے نیند آ گئی۔ ایسی گہری نیند سویا کہ آنکھ پرندوں کے شور سے کھلی جو شام ہو جانے پر درختوں میں حسب معمول شور مچا رہے تھے۔ میں اُٹھ کر چشمے پر گیا، منہ ہاتھ دھو کر وہیں

بیٹھ کر رات کا کھانا یعنی تھوڑے سے چنے کھا کر پانی پیا اور واپس آ کر چارپائی پر
گیا۔ جھونپڑی کے باہر مچھروں سے بچنے کے لئے میں نے آگ جلا کر اور پھر اُ
تھوڑی سی مٹی ڈال کر اُس کی دھونی لگا دی تھی۔ دھوئیں کی وجہ سے مچھر جھونپڑی کا
نہیں کر رہے تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ گوول اب نہیں آئے گا۔ کچھ دیر چارپائی پر پہلو
اور اُرملا کے بارے میں سوچتا رہا، پھر مجھے نیند نے اپنی آغوش میں لے لیا۔

مجھے نہیں معلوم میں کب تک سوتا رہا تھا کہ اچانک ایک آواز نے مجھے جگا دیا۔
ایسی تھی جیسے کوئی درندہ میری جھونپڑی کے قریب ہی بولا ہو۔ کچھ دیر تو میں وہیں چا
پر ساکت ہو کر کان لگائے پڑا رہا کہ شاید درندے کی آواز دوبارہ آئے۔ جنگل
جھونپڑی کے باہر ہیبت ناک خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ پتا کھڑکنے کی بھی آواز نہیں آ
تھی۔ اس خاموشی سے میں آشنا تھا۔ اتنے میں مجھے کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی
میں نے جلدی سے بستر کے نیچے چھپایا ہوا چاقو ہاتھ میں لے لیا اور چارپائی سے اُ
دبے پاؤں جھونپڑی کے دروازے پر آ کر ایک طرف ہو کر کھڑا ہو گیا۔ مگر قدمو
آہٹ کی آواز دوبارہ سنائی نہ دی۔ گہری خاموشی چھائی رہی۔ آہٹ کی آواز سے
نے پہچان لیا تھا کہ یہ کسی آدمی کے قدموں کی آہٹ ہے۔ اب میں یہ معلوم کرنا چا
کہ یہ کون ہے؟ مجھے یہی ڈر تھا کہ کہیں گوول نے مجھے مروانے کے لئے آشرم کے غنڈ
نہ بھیجے ہوں۔ چاقو پر میں نے اپنے ہاتھ کی گرفت مضبوط کی اور ایک دم سے جھو
سے باہر آ گیا۔ باہر آتے ہی میری چیخ نکل گئی...... ایک عجیب و غریب ڈراونی
میرے سامنے کھڑی تھی......!!

○○○

اُس کی آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔
سر پر بالوں کی جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔ آدھا چہرہ بے ترتیب پھیلی ہوئی داڑھی اور
مونچھوں میں چھپا ہوا تھا۔ وہ انسان ہی تھا مگر اُس کی شکل دیکھ کر خوف آتا تھا۔ اُس کا
آدھا جسم میلی چادر میں لپٹا ہوا تھا۔ میں نے چادر سے اُسے پہچان لیا۔ یہ وہی شخص تھا
جسے میں نے چشمے سے واپس آتے ہوئے درختوں میں سے گزرتے دیکھا تھا۔ میں
سانس روکے اُس کے سامنے کھڑا تھا اور وہ انگارہ ایسی آنکھوں سے مجھے ٹکٹکی باندھے
دیکھ رہا تھا۔ پھر اپنی بھاری آواز میں بولا۔

''بھاگ جاؤ یہاں سے......!''

اتنا کہہ کر وہ واپس پلٹ کر درختوں کے اندھیرے میں میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔
میں اپنی جگہ پر ابھی تک اسی دہشت زدگی کے عالم میں کھڑا تھا۔ پھر میں اپنے ہوش
وحواس میں آیا اور غور کرنے لگا کہ یہ شخص کون تھا اور مجھے یہاں سے بھاگ جانے کے
لئے کیوں کہہ رہا تھا؟ میں نے اُسے کوئی مجذوب فقیر سمجھ کر اُس کی بات پر غور کرنے کی
ضرورت محسوس نہ کی اور واپس چارپائی پر آ کر لیٹ گیا۔ مگر نیند غائب ہو چکی تھی۔ سوچ
کی ایک لہر یہ بھی آئی کہ ہو سکتا ہے قدرت کی طرف سے کسی آنے والے خطرے کا یہ غیبی
اشارہ ہو۔ یہ اگر کوئی غیبی اشارہ تھا تو بھی میں اُرملا کو آشرم کے غنڈوں کے رحم و کرم پر
چھوڑ کر وہاں سے کیسے جا سکتا تھا؟ جھونپڑی کے آگے جو میں نے آگ جلائی تھی وہ بجھ
چکی تھی اور مچھر بے دریغ جھونپڑی میں داخل ہو کر مجھ پر حملہ آور ہو رہے تھے۔ میں اُٹھ
کر باہر آ گیا اور لکڑی سے آگ کریدنے لگا۔ نیچے ابھی آگ موجود تھی۔ میں نے کچھ
خشک پتے اُٹھا کر سلگتی ہوئی آگ پر ڈال دیئے۔ ہلکا ہلکا دھواں اُٹھنے لگا۔ میں ابھی وہیں
بیٹھا تھا کہ جنگل کی تاریکی میں مجھے دُور سے ٹارچ کی روشنی حرکت کرتی نظر آئی۔ یہ گوول

ہی ہو سکتا تھا۔ روشنی بڑی تیزی سے میری جھونپڑی کی طرف بڑھ رہی تھی۔ میں اُٹھ
کھڑا ہو گیا۔ چاقو ابھی تک میرے ہاتھ میں ہی تھا۔ تھوڑی دیر بعد کوئی دوڑتا ہوا ٹار
کی روشنی ڈالتا میری طرف آیا۔ میں جلدی سے ایک طرف ہو گیا۔ مگر یہ گوپل تھا۔

وہ بڑا گھبرایا ہوا تھا۔ اُس کا سانس پھول رہا تھا۔ آتے ہی بولا۔

''جلدی کرو! یہاں سے نکل چلو۔ اُن لوگوں کو تمہارا پتہ چل گیا ہے۔ وہ تمہار
تلاش میں نکل پڑے ہیں۔ جلدی سے میرے ساتھ آ جاؤ۔''

اور وہ ٹارچ کی روشنی بجھا کر ایک طرف کو دوڑ پڑا۔ میں بھی اُس کے پیچھے دوڑ پڑ
وہ آگے آگے دوڑ رہا تھا، میں اُس کے پیچھے پیچھے دوڑ رہا تھا۔ درختوں کے اندھیر
میں ہم جھاڑیوں سے اُلجھتے دوڑے جا رہے تھے۔ مجھے نہیں پتہ تھا گوپل مجھے کہاں لے
رہا ہے۔ ایک جگہ میں درخت کی زمین سے باہر نکلی ہوئی جڑوں سے ٹھوکر کھا کر گر پڑ
گوپل نے رُک کر مجھے غصے سے کہا۔

''کیا کر رہے ہو؟ مارے جاؤ گے۔ بھاگو!''

اور میں اُٹھ کر دوبارہ دوڑنے لگا۔ چاقو ویسے کا ویسا میرے ہاتھ میں تھا۔ اُسے
کر کے جیب میں ڈالنے کی فرصت ہی نہیں ملی تھی۔ گوپل مجھ سے کوئی پندرہ بیس فٹ
فاصلے پر آگے آگے دوڑ رہا تھا۔ اندھیرے میں مجھے اُس کا ہیولہ ہی نظر آ رہا تھا۔ آ
ایک بہت بڑی چٹان تھی۔ وہ اس کی اوٹ میں ہو کر رُک گیا اور مجھے اشارے
بلانے لگا۔ میں دوڑ کر اُس کے پاس گیا۔ چٹان کی دوسری طرف تھوڑی سی ڈھلان تھ
ڈھلان پر ایک جگہ چھوٹی سی چار دیواری بنی ہوئی تھی۔ گوپل نے کہا۔

''اس میں چھپ کر بیٹھ جاؤ! اور خبردار ہرگز ہرگز باہر مت نکلنا۔ مجھے اُمید ہے کہ
لوگ اس طرف نہیں آئیں گے۔ تم یہیں چھپے رہو۔ میں صبح آؤں گا اور بتاؤں گا
صورتِ حال کیا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ تیزی سے واپس چلا گیا۔

عین وقت پر یہ ایک نئی مصیبت آن پڑی تھی۔ پہلے مجھے گوپل پر شک ہوا کہ اُس
مجھے وہاں سے بھگانے کی کوئی سکیم بنائی ہے کیونکہ وہ نہیں چاہتا کہ میں ایک ہندو لڑ
بھگا کر لے جاؤں۔ پھر سوچا کہ گوپل کملا کی حکم عدولی نہیں کر سکتا۔ کملا کی زبان کی
جنبش اُسے موت کے منہ میں پہنچا دے گی۔ اصل حقیقت کیا تھی؟ مجھے کچھ معلوم

تھا۔ لیکن میں اس نئی صورتِ حال میں اُرملا سے ملتے ملتے ایک بار پھر جدا ہو گیا تھا یا جدا
کر دیا گیا تھا۔ میں چار دیواری کے اندر چھپ کر بیٹھ گیا۔ کان باہر کی خاموشی پر لگے
تھے کہ کوئی اس طرف تو نہیں آ رہا؟ چاقو میرے ہاتھ میں ہی تھا۔ لیکن اگر واقعی سیٹھ کے
غنڈے میری تلاش میں نکل چکے تھے تو اُن کے پاس بھاری اسلحہ ضرور ہو گا اور میں اُن
کے اسلحہ کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔

میں نے نظریں اُوپر اُٹھا کر دیکھا۔ اس چار دیواری کی چھت غائب تھی۔ آسمان پر
چمکتے ستارے نظر آ رہے تھے۔ دیواریں چھ سات فٹ اُونچی تھیں۔ اتنے میں باہر کچھ
آوازیں سنائی دیں۔ میں ہمہ تن گوش ہو گیا۔ آوازیں ایک بار سنائی دے کر خاموش ہو
گئیں۔ پہلے ایسے لگا کہ جیسے دو آدمی باتیں کرتے چلے آ رہے ہوں۔ پھر خیال آیا کہ نہیں
یہ دُور کسی پرندے کے بولنے کی آواز تھی۔ جنگل میں پہلے جیسی خاموشی چھا گئی۔ پھر کسی
کے دوڑنے کی آواز سنائی دی۔ میں اُٹھ کر دیوار کے ساتھ لگ گیا۔ یہ کسی جنگلی بھینسے کے
دوڑنے کی آواز بھی ہو سکتی تھی۔ اس کے فوراً بعد کسی آدمی نے اُونچی آواز میں کہا۔

''وہ یہیں کہیں ہو گا۔ یہ سامنے والی کوٹھڑی دیکھو۔''

ایک بار تو خوف کی وجہ سے میرا جسم پتھر ہو گیا۔ سیٹھ کے درندے میرے سر پر آن
پہنچے تھے۔ پھر فائر کے دھماکے سے جنگل کی فضا گونج اُٹھی۔ یہ پستول کا دھماکہ تھا۔ میں
چار دیواری کے دروازے سے باہر نہیں جا سکتا تھا۔ چار دیواری کے دروازے کے کواڑ
نہیں تھے۔ باہر نکلتے ہی میں سیٹھ کے غنڈوں کی فائرنگ کی زد میں آ سکتا تھا۔ مجھے اور تو
کچھ نہ سوجھا میں نے چاقو جیب میں ڈالا اور اُچھل کر دیوار کی منڈیر کو پکڑا اور دیوار کے
اُوپر چڑھ کر دوسری طرف چھلانگ لگا دی۔ اُوپر تلے تین فائروں کے دھماکے ہوئے۔
ان غنڈوں نے شاید مجھے دیوار سے چھلانگ لگاتے دیکھ لیا تھا۔ میں چٹان کی ڈھلان پر
گرا تھا اور لڑھکتا ہوا نیچے تک چلا گیا تھا۔ نیچے ایک کھائی تھی جس میں سرکنڈے اُگے
ہوئے تھے۔ میں اُن سرکنڈوں میں گرا تھا۔ گرتے ہی اُٹھا اور مخالف سمت کو دوڑ پڑا۔
ڈھلان کے اُوپر سے مجھ پر اندھا دُھند فائرنگ شروع ہو گئی۔ میری زندگی ابھی باقی تھی
مجھے کوئی گولی نہ لگی۔ گولیاں میرے دائیں بائیں یا اُوپر سے ہو کر گزرتی رہیں۔ میں اندھا
دُھند بھاگ رہا تھا۔ غنڈوں کی آوازیں اور فائرنگ کے دھماکے برابر میرا پیچھا کر رہے

تھے۔ کھائی کبھی دائیں طرف گھوم جاتی، کبھی بائیں طرف گھوم جاتی تھی۔ اس بھول بھلیا
نے مجھے بچا لیا۔ آدمیوں کی آوازیں اور فائرنگ کے دھماکے اب دُور سے سنائی د
رہے تھے اور پھر یہ سب کچھ جنگل کی رات کے سکوت میں ڈوب گیا۔

کھائی ایک جھیل پر جا کر نکلتی تھی۔ یہ چھوٹی سی جھیل چاروں طرف اُونچے پہاڑو
سے گھری ہوئی تھی۔ میں اُس کے کنارے کنارے اب دوڑنے کی بجائے تیز تیز ق
اُٹھاتا چلا جا رہا تھا۔ کافی آگے جا کر جھیل میں سے ایک ندی نکل کر پہاڑی کی دوسر
جانب چلی گئی تھی۔ میں ندی کے ساتھ ساتھ چلتا پہاڑی کی دوسری جانب آیا تو دیکھا
سامنے ایک کھلا میدان تھا۔ رات کے اندھیرے میں کہیں کہیں درختوں کے سیاہ جھنڈ
تھے۔ میں خطرے سے نکلا نہیں تھا مگر خطرے سے کافی دُور ضرور ہو گیا تھا۔ میں سان
لینے کے لئے ایک جگہ بیٹھ گیا۔ سوچنے لگا مجھے کیا کرنا چاہئے؟ ایک بات واضح تھی کہ م
اُرملا کے پاس نہیں جا سکتا تھا۔ وہاں موت میرا انتظار کر رہی تھی۔ درختوں کے جھنڈ
پیچھے کسی گاؤں کی دو تین بتیاں جھلملا رہی تھیں۔ میں اُسی طرف چل پڑا۔ یہ ایک چھوٹا
گاؤں تھا۔ گاؤں کے باہر ایک چوکیدار لالٹین اور بانس لئے میرے سامنے آ گیا۔

''کون ہو تم؟ کہاں سے آ رہے ہو؟'' اُس نے رُعب دار آواز میں پوچھا۔

میں نے کہا۔ ''بھائی! میں راستہ بھول گیا ہوں۔ مجھے اتنا بتا دو کہ شیتل گڑھ کے سٹیش
کو کون سا راستہ جاتا ہے؟''

اُس نے مجھے راستہ بتا دیا اور میں چل پڑا۔ سٹیشن وہاں سے دو تین کوس کے فاصلے
ہی تھا۔ دُور سے سٹیشن کے سگنل کی لال بتی دکھائی دی تو میری جان میں جان آئی۔ تیز
چلتا میں سٹیشن پر پہنچ گیا۔ رات کافی ہو چکی تھی۔ سٹیشن ویران پڑا تھا۔ میں خالی پلیٹ فا
پر ایک طرف اندھیرے میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ کافی دیر وہیں بیٹھا رہا، پھر آہستہ آہستہ
آسمان کے مشرقی اُفق پر صبح کا اُجالا پھیلنا شروع ہو گیا۔ پلیٹ فارم پر ایک دو آدمی چل
پھرتے نظر آئے۔ میں نے اُٹھ کر ایک آدمی سے بمبئی جانے والی گاڑی کا پوچھا تو اُس
نے بتایا کہ امراولی سے ایک پسنجر ٹرین ایک گھنٹے بعد آئے گی۔ سٹیشن کی ڈیوڑھی میں
چھوٹا سا بکنگ آفس تھا جو کھل چکا تھا۔ میں نے بمبئی کا تھرڈ کلاس کا ٹکٹ خریدا اور پلیٹ
فارم پر آ کر ٹرین کا انتظار کرنے لگا۔

ٹرین آئی تو میں اُس میں سوار ہو کر بمبئی روانہ ہو گیا۔

ٹرین دوسرے دن شام کے قریب بمبئی پہنچی۔ میں سٹیشن سے نکل کر سیدھا کملا کے
فلیٹ پر آ گیا۔ وہ مجھے فلیٹ پر ہی مل گئی۔ مجھے اکیلا دیکھ کر بولی۔

''تمہاری اُرملا کہاں ہے؟ وہ نہیں آئی تمہارے ساتھ؟''

میں اُس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا اور اُسے شروع سے لے کر آخر تک
ساری کہانی بیان کر دی۔ اُس کی بھنویں اُوپر کو اُٹھ گئیں۔ کہنے لگی۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟''

میں نے کہا۔ ''کہیں گوپل کی نیت تو نہیں بدل گئی؟''

کملا نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میرا نہیں خیال کہ وہ ایسا کرے گا۔ وہ مجھے دھوکہ
نہیں دے سکتا۔ اُسے معلوم ہے میری ذرا سی گواہی اُسے پھانسی کی کوٹھڑی میں لے
جائے گی۔ وہ ایسی حماقت نہیں کر سکتا۔''

میں نے کہا۔ ''پھر سیٹھ کے غنڈوں کو کیسے پتہ چل گیا کہ میں اُرملا کو بھگا کر لے
جانے کے واسطے جنگل میں موجود ہوں؟''

کملا نے کہا۔ ''سیٹھ کے جاسوس بھی اُڑتی چڑیا کے پر گن لیتے ہیں۔ اُنہیں آشرم
کے بارے میں ایک ایک پل کی خبر رہتی ہے۔ ہو سکتا ہے اُنہیں اپنے ذریعے سے پتہ
چل گیا ہو کہ تم گوپل کے ساتھ آشرم کے باہر جنگل میں موجود ہو۔''

میں نے کہا۔ ''ایسی صورت میں تو اُنہیں گوپل کو بھی وہیں قابو کر لینا چاہئے تھا کیونکہ
میں اُس کے ساتھ آیا تھا۔ وہ بھی سیٹھ سے غداری کا مرتکب ہوا تھا۔''

کملا سوچنے لگی، پھر بولی۔ ''یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ گوپل نے آشرم کے غنڈوں کو اپنی
جان بچانے کے لئے بھاری رشوت دے دی ہو۔ اور تمہاری جان بچانے کے واسطے وہ
رات کے اندھیرے میں کسی طریقے سے نکل کر تمہارے پاس پہنچ گیا ہو اور تمہیں خبردار
کر دیا ہو کہ اپنی جان بچا کر بھاگ جاؤ۔''

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ ایسا ہو بھی سکتا تھا۔ لیکن میرا دل کہتا تھا کہ یہ ساری سکیم
گوپل نے آشرم کے غنڈوں کے ساتھ مل کر تیار کی تھی۔ وہ مجھے آشرم کے غنڈوں کے
ہاتھوں قتل کروا دینا چاہتا تھا تاکہ میں ایک ہندو عورت کو بھگا کر لے جانے میں کامیاب

نہ ہوسکوں۔ مگر میں نے اپنے اس شک شبے کو کملا پر ظاہر نہ کیا۔ صرف اُس کی ہاں میں
ہاں ملاتے ہوئے اتنا ہی کہا۔

''ہاں! ایسا بھی ہوسکتا ہے۔''

کملا کہنے لگی۔ ''مجھے تو اس بات کی خوشی ہے کہ تم آشرم کے غنڈوں کے ہاتھوں قتل
ہونے سے بچ گئے۔ وہ بڑے قاتل غنڈے ہیں۔ میں اُنہیں اچھی طرح سے جانتی
ہوں۔ کسی آدمی کو قتل کر دینا اُن کے لئے ایسا ہی ہے جیسے کسی چیونٹی کو مسل دینا۔ بہرحال
اب گومل کے آنے پر پتہ چلے گا کہ اصل واقعہ کیا ہوا تھا۔ تم نہا کر فریش ہو جاؤ۔ باقی
باتیں کھانے پر ہوں گی۔''

میں نے غسل خانے میں جا کر غسل کیا، کپڑے تبدیل کئے اور ڈرائنگ رُوم میں آ کر
بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد کملا آ گئی۔ بائی نے میز پر کھانا رکھ دیا تھا۔ ہم بیٹھ کر کھانا کھانے
لگے۔ کھانے کے دوران بھی یہی باتیں ہوتی رہیں۔ میں زیادہ وقت خاموش رہا۔ کملا ہی
باتیں کر رہی تھی۔ کہنے لگی۔

''گومل کبھی مجھے دھوکہ نہیں دے سکتا۔ اُسے معلوم ہے کہ اگر اُس نے آشرم کے
غنڈوں سے مل کر کوئی سکیم بنائی تو مجھے فوراً پتہ چل جائے گا۔''

میں نے کہا۔ ''یہ بھی تو ممکن ہے کہ گومل نے رشوت دے کر غنڈوں کو اپنے ساتھ ملا
لیا ہو۔''

کملا ہنس پڑی۔ کہنے لگی۔ ''وہ کیا رشوت دے سکتا ہے؟ وہ خود سیٹھ کے ٹکڑوں پر
زندہ ہے۔ ان غنڈوں کو تو کوئی میرے جیسی عورت ہی رشوت دے سکتی ہے۔ ایسی بات
نہیں ہوئی ہوگی۔ میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ سارا کام سیٹھ کے کسی جاسوس نے خراب
کیا ہے۔ سیٹھ کیشو رائے کے جاسوس ہٹلر کے جاسوسوں سے دو قدم آگے ہیں۔ سیٹھ
اُنہیں اپنی عیاشی کے آشرم کی حفاظت کے لئے اتنے پیسے دیتا ہے کہ اتنے پیسے یہ لوگ
ساری زندگی نہیں کما سکتے۔ لیکن میں گومل کو چھوڑوں گی نہیں۔ تم ذرا اُسے آ لینے دو۔
تمہارے سامنے اُس کی خبر لوں گی۔''

دوسرے دن شام کے وقت گومل بھی آ گیا۔ آتے ہی ہاتھ جوڑ کر کملا کے سامنے کھڑا
ہو گیا اور بولا۔ ''دیوی! مجھے معاف کر دو۔ میں تمہارے حکم کی پالنا نہیں کر سکا۔ مگر اس

میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ میں تو تمہارے آدمی کو آشرم تک لے گیا تھا اور اُرملا کو
آشرم سے نکال کر اُس کے حوالے کر دینے کا سارا بندوبست میں نے کر لیا ہوا تھا۔''

''پھر کس نے حرامی پن کیا؟'' کملا نے اُسے گالی دے کر پوچھا۔

گومل کہنے لگا۔ ''یہ سارا حرامی پن سیٹھ کے کسی خفیہ جاسوس کا ہے۔ تم سیٹھ کے
جاسوسوں سے اچھی طرح واقف ہو۔ وہ رات کے اندھیرے میں بھی دن کی طرح دیکھ
لیتے ہیں اور بند کمروں کے راز بھی پکڑ لیتے ہیں۔ بس ان جاسوسوں میں سے کسی جاسوس
کو ہماری سکیم کا پتہ چل گیا اور اُس نے ہمارے کئے کرائے پر پانی پھیر دیا۔

کملا نے اُسے ایک اور موٹی گالی دے کر پوچھا۔ ''اُن غنڈوں نے تمہیں کیسے چھوڑ
دیا؟ تمہیں کیوں نہیں پکڑا؟''

گومل قالین پر بیٹھ گیا اور بولا۔ ''کملا بائی! یہ میں ہی جانتا ہوں کہ میں نے اُنہیں
کتنی بھاری رشوت دے کر اپنی جان بچائی ہے۔ لیکن اس کے باوجود مجھے تمہارے آدمی
کی جان کی بھی فکر تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ ان غنڈوں کو سراغ مل گیا ہے کہ تمہارا آدمی یعنی
یہ نوجوان جس کا نام شیراز ہے جنگل میں کسی جگہ پر چھپا ہوا ہے۔ میں اپنی جان کا خطرہ
مول لے کر رات کی تاریکی میں آشرم سے نکل کر اس کی طرف دوڑ پڑا اور اسے اپنے
ساتھ لے جا کر ایک دوسری جگہ پر چھپا دیا۔ لیکن آشرم کے غنڈے اس کو تلاش کرتے
کرتے وہاں بھی پہنچ گئے۔ بھگوان کا شکر ہے کہ یہ نوجوان وہاں سے بھاگنے میں
کامیاب ہو گیا۔ ورنہ میں تمہیں کیا منہ دکھاتا؟''

کملا بولی۔ ''تمہارا منہ تو اب بھی دیکھنے کے لائق نہیں رہا۔ لیکن یہ بتاؤ کہ اُرملا کو وہ
لوگ کسی دوسری جگہ تو نہیں لے گئے؟ اور کیا سیٹھ کو اس واقعے کی اطلاع مل گئی ہے؟''

گومل کہنے لگا۔ ''کملا بائی! تم اچھی طرح جانتی ہو کہ جس جاسوس نے اس نوجوان کا
سراغ لگایا ہے وہ سیٹھ کا جاسوس ہے اور سیٹھ کا جاسوس سیٹھ سے کبھی غداری نہیں کر سکتا۔
اُس نے سیٹھ کو سب کچھ بتا دیا ہوگا۔ لیکن میری رشوت کا اتنا اثر ضرور ہوا ہوگا کہ اُس
جاسوس نے بھی سیٹھ کے آگے میرا نام نہیں لیا ہوگا۔''

اُس نے ایک بار پھر کملا کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے اور بولا۔ ''بھگوان کے لئے مجھ پر
شک نہ کرنا۔ میں تو تمہارا غلام ہوں۔ تمہیں دھوکہ دینے کا تو میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ کیا

مجھے زندہ نہیں رہنا؟''

کملا کہنے لگی۔ ''اب تم ایک کام کرو!''

''حکم کرو۔'' گومل نے بڑی عاجزی سے کہا۔

کملا بولی۔ ''تم یہ معلوم کر کے مجھے بتاؤ کہ اس واقعے کے بعد سیٹھ نے اُرملا کو آ
میں ہی رہنے دیا ہے یا اُسے کسی دوسری جگہ پہنچا دیا ہے؟ اور یہ سراغ تمہیں ایک
کے اندر اندر لگا کر مجھے دینا ہے۔''

گومل نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے، ہاتھ اُوپر کرتے ہوئے کہا۔ ''میں ایک دن
اندر اندر یہ سب کچھ معلوم کر کے تمہیں بتا دوں گا۔ بے فکر رہو۔ اب میں چلا جاؤں؟

کملا نے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے...... جاؤ!''

گومل چلا گیا۔ کملا نے میری طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''کیا خیال ہے تمہارا؟''

میں جو کچھ سوچ رہا تھا کملا کو نہیں بتانا چاہتا تھا۔ میں نے کہا۔ ''کس بارے میں؟

وہ بولی۔ 'گومل کے بارے میں اور کس کے بارے میں پوچھ رہی ہوں؟''

''پہلے تم اپنا خیال بتاؤ۔'' میں نے اُلٹا اُس سے سوال کر دیا۔

وہ کہنے لگی۔ ''پہلے مجھے اس پر شک تھا مگر اب لگتا ہے کہ وہ جھوٹ نہیں بول ر
تمہاری کسی نے جاسوسی کر دی ہے۔''

میں نے گردن ایک طرف جھکاتے ہوئے کہا۔ ''ممکن ہے ایسا ہی ہوا ہو۔''

کملا کہنے لگی۔ ''میں آج رات سیٹھ کیشو کے ہاں جاؤں گی۔ اُس سے ساری با
معلوم ہو جائے گی۔''

رات کو بن سنور کر وہ سیٹھ کیشو راؤ کے بنگلے پر چلی گئی اور حسبِ عادت رات
واپس آئی۔ میں اُس وقت سو رہا تھا۔ صبح ناشتے پر اُس سے ملاقات ہوئی تو کہنے لگی۔

''شیراز! میری جان تم خوش نصیب ہو کہ سیٹھ کے غنڈوں کے ہاتھوں قتل ہونے
بچ گئے۔ گومل ٹھیک کہہ رہا تھا۔ سیٹھ کے کسی جاسوس نے اُسے بتا دیا تھا کہ اُرملا کو آ
سے اغوا کر کے لے جانے دُلاری ماتا کے ڈیرے سے ایک آدمی بمبئی پہنچ گیا ہے
چنانچہ اس نے آشرم کے سارے آدمیوں کو خبردار کر دیا تھا۔ میں نہ کہتی تھی کہ گومل
مجھے دھوکہ نہیں دے سکتا۔''

لیکن میرا دل اور میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ یہ سب کچھ گومل کی سوچی سمجھی سکیم کے
تحت ہوا ہے۔ اگر کچھ ہوا ہے تو صرف اتنا ہوا ہے کہ مکار گومل نے اپنے آپ کو کملا کے
آگے سچا ثابت کرنے کے لئے سیٹھ کیشو تک صرف اتنی بات ضرور پہنچا دی تھی کہ جس
اُرملا نام کی عورت کو وہ دُلاری ماتا کے اڈے سے خرید کر لایا ہے اُس کے پیچھے کچھ
بدمعاش لگے ہوئے ہیں جو اُسے اُٹھا کر لے جانا چاہتے ہیں۔ باقی سارا کام گومل نے
آشرم کے غنڈوں سے مل کر خود ہی کیا تھا۔ اُس نے اس مسئلے کو ہندو دھرم کی آن مریادہ
کا مسئلہ بنا کر انہیں پیش کیا تھا اور کہا ہو گا کہ ہم یہ کیسے گوارا کر سکتے ہیں کہ ایک مسلمان
ہماری ایک ہندو جاتی کی عورت کو بھگا کر لے جائے۔ اُس نے آشرم کے غنڈوں کو منع
کر دیا ہو گا کہ اس راز کو راز ہی رکھا جائے۔ گومل ایک متعصب ہندو ہونے کے ساتھ
ساتھ ایک مکار اور بے حد عیار شخص بھی تھا۔ اُس نے کملا کے پاس آ کر اپنی من گھڑی
کہانی ایسی فنکارانہ اداکاری کے ساتھ سنائی کہ کملا کو بھی اُس کی باتوں کا یقین کرنا پڑا۔
بعد میں میرا اندازہ بالکل درست نکلا اور اس کا ثبوت مل گیا کہ یہ سارا ڈرامہ گومل نے کیا
تھا۔

ان تمام واقعات کا نتیجہ یہ نکلا کہ سیٹھ نے اُرملا کو شیتل گڑھ والے آشرم سے نکال کر
کسی دوسری جگہ پہنچا دیا۔ اس کا انکشاف کملا نے سیٹھ کے بنگلے پر رات گزارنے کے
بعد آ کر کیا۔ میرے دل میں یہ سن کر مایوسی کی لہر دوڑ گئی۔ اُرملا میرے بالکل قریب آ کر
مجھ سے خدا جانے کتنی دُور چلی گئی تھی۔ کملا نے میرے اُداس اور مایوس چہرے کو دیکھ کر
مجھے حوصلہ دیا۔

''تم کیوں نراش ہوتے ہو؟ اُرملا مری نہیں، زندہ ہے۔ اگر میں نے سیٹھ سے یہ
معلوم کر لیا ہے کہ اُرملا آشرم سے کسی دوسری جگہ پہنچا دی گئی ہے تو اُس سے یہ راز بھی
اُگلوا سکتی ہوں کہ اُسے کس جگہ رکھا گیا ہے۔''

اس میں کوئی مبالغہ نہیں تھا کہ کملا ایسا کر سکتی تھی۔ اُس میں اتنی صلاحیت تھی کہ بڈھے
سیٹھ کو لبھا کر اُس کے دل کی بات اُگلوا سکے۔ مگر مجھے ڈر تھا کہ اگر اور دیر ہو گئی یا دیر کر
دی گئی تو گومل ہندو جاتی کی ''عزت'' کی خاطر اُرملا کو ضرور قتل کر دے گا یا اُسے قتل کروا
دے گا۔ آشرم کے سارے غنڈے اُس کے ساتھ مل چکے تھے۔ میں نے کملا سے کہا۔

"اور اگر سیٹھ نے تمہیں بھی کچھ نہ بتایا تو......؟"

میں نے ایسا کملا کو بھڑکانے کے لئے کہا تھا۔ وہ سچ مچ بھڑک اُٹھی۔ وہ دو
ہاتھوں میں میرا چہرہ لے کر بولی۔ "تم بدھو ہو۔ تم مرد نہیں ہو۔ تمہیں کیا معلوم عورت
کچھ کرنے پر آئے تو وہ کیا کچھ نہیں کر سکتی۔ تمہیں ایک مٹی کی دیوی اُرملا مل گئی۔
تمہیں کیا پتہ عورتوں کے چرتر کیا ہوتے ہیں۔"

اُس کا چہرہ جوش کے عالم میں جیسے دہکنے لگا تھا۔ میں نے کسی قدر اُس کی د
کرتے ہوئے کہا۔ "میرا مطلب ہرگز یہ نہیں تھا جو تم سمجھی ہو۔ میں اپنی بات پوری
نہیں کر سکا۔ میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ سیٹھ کیشو راؤ بڑا تجربہ کار عیاش بڈھا معلوم ہوتا۔
ہو سکتا ہے وہ تمہاری بات ٹال دے یا پھر تمہارے آگے غلط بیانی سے کام لے۔"

کملا پیچھے ہٹ گئی۔ اُس نے میز پر رکھی ڈبی میں سے سگریٹ نکال کر سلگایا اور ا
کش لے کر بولی۔ "تم کیا سمجھتے ہو کہ تم جو کچھ مجھ سے پوچھ رہے ہو میں اس سے ۔
ہوں؟ کیا مجھے معلوم نہیں کہ سیٹھ کیشو راؤ یہ راز مجھے کبھی نہیں بتائے گا؟ یہ راز مجھے
سے پوچھنا نہیں، اُس سے اُگلوانا ہے۔ اور ایک بڈھے عیاش سے کوئی راز کیسے اُ
جاتا ہے اس کا گر مجھے بڑی اچھی طرح سے آتا ہے۔ مجھے صرف تین دن کی مہلت
دو۔ اس کے بعد میں تمہیں بتا دوں گی کہ تمہاری اُرملا کہاں ہے۔"

مجھے کملا کی اس خاص صلاحیت پر کوئی شک نہیں تھا۔ لیکن میں یہ بھی جانتا تھا ک
ایک مرد عورت سے کوئی راز چھپانا چاہے تو عورت چاہے کچھ کر لے وہ اس مرد ک
کا راز معلوم کرنے میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ جوان آدمی تو جذبات کے طوفان
بہہ سکتا ہے مگر ایک عیاش بڈھا جس کے جذبات سرد پڑ چکے ہوں اُس کا جذبات
بہہ جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور سیٹھ کیشو راؤ ایک ایسا ہی عیاش بڈھا تھا۔
میں نے کملا کی دل آزاری اُس وقت مناسب نہ سمجھی اور اُس کی تعریف بھی کی او
کی حکمت عملی پر پورے اعتماد کا اظہار کیا۔ اب میں اس لائن پر سوچنے لگا کہ ک
حالات میں مجھے عثمان بھائی سے مدد لینی چاہئے یا نہیں؟ اس میں کوئی شک نہیں
عثمان بھائی ایک سچا اور مخلص مسلمان تھا اور میری خاطر اپنی جان بھی لڑا سکتا تھا۔
اس میں ایک کمزوری تھی کہ وہ اپنے دل کی بات زیادہ وقت تک چھپا کر نہیں ر

تھا۔ اور اس معاملے میں رازداری کی اشد ضرورت تھی۔ بلکہ رازداری پہلی شرط تھی۔
بات اگر ذرا سی باہر نکل گئی تو سیٹھ کیشو راؤ اُرملا کو کسی ایسے اندھے کنوئیں میں ڈال سکتا
تھا جہاں سے وہ ساری زندگی باہر نہیں نکل سکتی تھی۔ سیٹھ بے حد دولت مند آدمی تھا۔ اُس
کے ذرائع بے شمار تھے۔ وہ ایسا کر سکتا تھا۔

چنانچہ یہ سوچ کر میں نے کچھ وقت کے لئے عثمان بھائی سے بات کرنے کا خیال دل
سے نکال دیا۔ اس دوران میری ساری توجہ کملا کی طرف ہی رہی۔ دو دن گزر گئے۔
معلوم ہوا کہ گزشتہ دونوں راتوں کو وہ سیٹھ کے بنگلے پر ہی تھی۔ تیسرے دن رات کو تیار
ہو کر وہ جانے لگی تو تھوڑی دیر کے لئے میرے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ اُس نے کوئی ایسا پرفیوم
لگایا ہوا تھا جس کی خوشبو مجھ پر جادو کر رہی تھی۔ میری طرف ذرا سا جھک کر کہنے لگی۔

"اگر آج کی رات بھی میں اپنے مشن میں کامیاب نہ ہو سکی تو میں سمجھوں گی کہ کملا
یونہی دنیا میں آ گئی ہے۔ اسے پیدا ہی نہیں ہونا چاہئے تھا۔"

میں چپ رہا اور اُس کی طرف دیکھ کر تھوڑا تھوڑا مسکراتا رہا۔ اُس نے میرے گال پر
اپنی اُنگلی رکھتے ہوئے کہا۔ "تم اس طرح میری طرف دیکھ کر نہ مسکرایا کرو۔ میرا دل
تمہاری طرف پھر گیا تو تم ایک اُرملا تو کیا ہر دوسری عورت سے محروم ہو جاؤ گے۔"

وہ قہقہہ لگا کر پرے ہٹ گئی اور سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر اپنے پرس میں ڈالتے
ہوئے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ "میں جاتی ہوں...... کل ملاقات ہوگی۔"

اور وہ چلی گئی۔ اُس کے جانے کے بعد اُس کے لباس سے آنے والی طلسمی خوشبو کچھ
دیر تک ڈرائنگ رُوم میں موجود رہی، پھر سمندر سے آنے والی بمبئی کی ہوا اسے آہستہ
آہستہ اُڑا کر لے گئی۔ ساری رات میں اُرملا کے خیالوں میں کھویا بستر پر بے چینی سے
پہلو بدلتا رہا اور دیر تک جاگتا رہا۔ پھر مجھے نیند آ گئی۔

صبح اُٹھا تو معلوم ہوا کہ کملا تھوڑی دیر پہلے آ کر سوئی ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ اُس
نے ساری رات سیٹھ کے بنگلے پر گزار دی تھی۔ وہ شام کے وقت بیدار ہوئی۔ نہا دھو کر
اُس نے دوسرے کپڑے بدلے اور ڈرائنگ رُوم میں آ گئی۔ میں وہاں پہلے سے اُس
کے انتظار میں بیٹھا تھا۔ وہ مسکرا رہی تھی کہنے لگی۔

"آج یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ کملا نے یونہی اس دنیا میں جنم نہیں لیا۔ وہ ایک

بہت بڑی شکتی لے کر اس دنیا میں آئی ہے اور اس شکتی کی مدد سے وہ اس سنسار میں ہر مقصد حاصل کر سکتی ہے۔''

شکتی کے نام سے مجھے بے اختیار کانچی کا خیال آ گیا اور اُس کا خیال آتے میرے جسم میں ایک سنسناہٹ سی دوڑ گئی میری نگاہیں اپنے ہاتھ کی طرف اُٹھ گئیں اُرملا کی انگوٹھی میرے ہاتھ کی اُنگلی میں باقاعدہ موجود تھی۔ مجھے حوصلہ ہو گیا۔ کانچی؛ مجھے کسی دیوی ماتا پر قربان کر کے اپنی شکتی میں دس گنا اضافہ کرنا چاہتی تھی لیکن اس انگو کے ہوتے ہوئے وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھی۔ میں نے کملا سے کہا۔

''معلوم ہوتا ہے تم اپنے مشن میں کامیاب ہو کر لوٹی ہو۔''

اُس نے خاص انداز سے میری طرف گردن ذرا سی جھکا کر دیکھا اور کہا۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کملا اپنے ترکش کا آخری تیر بھی چلا دے اور شکار اس کے ہاتھ سے نکل جائے۔ میں اپنے مشن میں کامیاب ہو گئی ہوں۔ مجھے اُرملا کے خفیہ ٹھکا کا پتہ چل گیا ہے۔ بلکہ یہ ٹھکانہ خود بڈھے سیٹھ کیشو رائے نے مجھے بتایا ہے اور میں اُسے اپنی آنکھوں سے دیکھا بھی ہے۔''

میں خوش بھی ہوا اور مجھے حیرانی بھی ہوئی کہ کملا نے اُرملا کے نئے ٹھکانے کو کہا سے دیکھ لیا؟ میں نے اُس سے جب پوچھا کہ کیا وہ اس جگہ خود گئی تھی جہاں سیٹھ اُرملا کو چھپایا ہے تو اس کے جواب میں وہ کہنے لگی۔

''میں نے اس کی ایک ویڈیو فلم دیکھی ہے۔ سیٹھ نے اس جگہ کی پوری فلم بنوا کر ا پاس رکھی ہوئی ہے۔ اس فلم میں تمہاری اُرملا کو بھی میں نے چلتے پھرتے دیکھا ہے۔''

اب مجھے یقین ہو گیا کہ کملا جھوٹ نہیں کہہ رہی۔ میں نے پوچھا۔

''یہ نیا ٹھکانہ کس جگہ پر ہے؟''

تب اُس نے مجھے وہ سب کچھ بتا دیا جو بڈھے عیاش سیٹھ نے اُسے عیاشی کے کس بڑے کمزور لمحے بتا دیا تھا۔ کملا نے کہا۔ ''ویسے تمہاری اُرملا مجھے اچھی لگی ہے۔ لیکن و اُداس اُداس تھی۔ اُداس تو اُسے ہونا ہی چاہئے۔''

میں نے اُس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

''وہ کہاں ہے؟ پلیز مجھے بتاؤ تو سہی۔''

کملا نے کہا۔ ''لگتا ہے سیٹھ کو تمہاری اُرملا کی کوئی ادا پسند آ گئی ہے یا پھر اُرملا نے اُسے کوئی ایسا چمتکار دکھایا ہے کہ وہ اُس کا دیوانہ ہو کر رہ گیا ہے۔ جبھی تو اُس کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لئے لئے پھر رہا ہے۔ ورنہ سیٹھ کسی بھی عورت کی کبھی اتنی پرواہ نہیں کیا کرتا۔ اب میں تمہیں بتاتی ہوں کہ اُرملا کس جگہ پر ہے۔ سیٹھ نے ہندوستان کے دکھن یعنی جنوب میں منگاپلم کے مقام پر ایک مندر بنوا رکھا ہے جہاں وہ مہینے میں ایک بار شِو جی کی پوجا کرنے جاتا ہے۔ یہ جگہ ہندوستان کے نیچے جہاں ہمارے دیش کے دونوں ساحل ایک دوسرے سے آ کر مل جاتے ہیں سمندر کے ایک ٹاپو کے اندر ہے۔ تم کبھی ہندوستان کے دکھن میں گئے ہو؟''

میں نے اُسے بتایا کہ میں انڈیا کی جنوبی تکون میں دھنش کوڑی تک گیا ہوں۔ وہ بولی۔ ''پھر تو تم فوراً سمجھ جاؤ گے۔ دھنش کوڑی انڈیا کی جنوبی تکون کے بالکل کنارے پر واقع ہے۔ اس کے آگے سمندر ہے اور وہاں سے پچیس میل کے فاصلے پر سیلون (سری لنکا) کا ساحل شروع ہو جاتا ہے۔ دھنش کوڑی سے بائیں جانب اگر ہم رامیشورم کے مندروں کی یاترا کو جائیں تو سب سے پہلے سمندر کا ایک بہت بڑا ٹاپو آتا ہے۔ اُسی ٹاپو میں سیٹھ کا مندر ہے۔ اُوپر سے تو یہ شِو جی کا مندر ہے لیکن اس کے تہہ خانوں میں عیاشی کا ہر قسم کا سامان موجود ہے۔ جو دیوداسیاں مندر میں شِو جی کی مورتی کے آگے رقص کرتی ہیں وہی دیوداسیاں رات کے وقت تہہ خانوں میں پہنچ جاتی ہیں اور مندر کے عیاش پجاریوں اور سیٹھ کیشو راؤ کے خریدے ہوئے غنڈوں کے ساتھ دادِ عیش دیتی ہیں۔ اُرملا بھی انہی دیوداسیوں میں شامل ہے۔ مگر چونکہ وہ خاص سیٹھ کیشو راؤ کی داشتہ ہے اس لئے اُس کی سخت نگرانی کی جاتی ہے کہ کوئی پجاری یا کوئی دوسرا آدمی اُس پر بری نگاہ نہ ڈال سکے۔ یہ ساری باتیں مجھے سیٹھ خود فلم دکھاتے ہوئے ساتھ ساتھ بتائے جا رہا تھا۔ اب تم سمجھ گئے ہو گے کہ تمہاری اُرملا کہاں ہے اور کس حال میں ہے۔ بتاؤ! اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟''

میں نے کملا کی زبان سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ بڑے غور سے سنا تھا۔ اُس نے سیٹھ کے مندر کا جو حدودِ اربعہ بتایا تھا میں نے اُسے اپنے ذہن میں اچھی طرح سے بٹھا لیا تھا۔ جب اُس نے مجھ سے میرے ارادے کے بارے میں دریافت کیا تو میں نے

جواب دیا۔

''میں ہر حالت میں وہاں جاؤں گا اور چاہے کچھ بھی ہو جائے میں اُرملا کو ا
دوزخ سے نکال لاؤں گا۔''

کملا مسکرا رہی تھی۔ کہنے لگی۔ ''یہ کام اتنا آسان نہیں جتنا تم سمجھ رہے ہو۔ وہ مند
جس ٹاپو میں ہے وہاں سیٹھ کیشو راؤ کی حکومت ہے۔ پولیس اُس کی غلام ہے۔ حکوم
کے افسروں کو اُس نے خرید رکھا ہے۔ اُس کے خونی غنڈے پجاریوں کے بھیس میں د
رات مندر کے اِرد گرد موجود رہتے ہیں تاکہ کوئی دیوداسی وہاں کے گناہ آلود ماحول
تنگ آ کر فرار نہ ہو جائے یا کوئی باہر کا آدم کسی دیوداسی کو بھگا کر نہ لے جائے۔ اور اُ
کی نگرانی تو خاص طور پر کی جاتی ہو گی۔ کیونکہ وہ سیٹھ کیشو راؤ کی خاص داشتہ ہے۔ ب
تو تمہیں یہی صلاح دُوں گی کہ اُرملا کو بھول جاؤ۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم اُرملا کی مدد کر
وہاں جاؤ اور خود قتل ہو جاؤ۔ یہ جگہ اتنی دُور دراز ہے کہ وہاں کسی کو خبر بھی نہیں ہو گی ک
قتل کر دیئے گئے ہو۔''

وہ میرے قریب ہو گئی اور میرے بالوں میں اُنگلیاں پھیرتے ہوئے بولی۔

''بھگوان نہ کرے کہ ایسا ہو۔ مرنے کی یہ تمہاری عمر نہیں ہے۔ تمہاری یہ عمر عورتو
سے محبت کرنے کی ہے۔ تم جوان ہو، خوبصورت ہو۔ ایک اُرملا کیا تم جس اُرملا کو چا
تمہیں مل سکتی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''مگر میں صرف اپنی اُرملا کو چاہتا ہوں۔ اُسی سے پیار کرتا ہوں ا
اُسی کے ساتھ اپنی زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔''

کملا پیچھے ہٹ گئی اور سگریٹ ایش ٹرے میں مسل کر بولی۔

''لگتا ہے تمہاری اُرملا نے تم پر جادو ٹونہ کر دیا ہے۔ وہ جس دھرم سے تعلق رکھتی
اس میں جادو ٹونہ بہت ہوتا ہے۔''

''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' میں نے اُسے جھٹلاتے ہوئے کہا۔ ''میں جادو ٹونے
یقین نہیں رکھتا اور اُرملا کو مجھ پر جادو ٹونہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں تو اُس کی شخصیت
اس کے کردار اور اعلیٰ خیالات سے متاثر ہوا تھا اور اُس سے پیار کرنے لگا تھا۔ ا
باتوں کا جادو ٹونے سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔''

کملا میری طرف آنکھیں سکیڑے دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ کہنے لگی۔

''اس کے بارے میں، میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ کیونکہ اعلیٰ کردار اور اعلیٰ خیالات کا
میرا کوئی تجربہ نہیں ہے۔ ایسی باتیں میری سمجھ سے باہر ہیں۔ ان باتوں کو چھوڑو مجھے یہ
بتاؤ کیا تم نے اُرملا کے پاس جانے کا پکا ارادہ کر لیا ہے؟''

میں نے جواب دیا۔ ''میرا ارادہ بالکل پکا ہے اور میں کسی بھی وقت یہاں سے نکل
سکتا ہوں۔''

کملا نے ٹھنڈا سانس بھر کر کہا۔ ''کاش مجھ سے بھی کوئی ایسا پریم کرتا...... اُرملا خوش
قسمت ہے کہ اُسے تمہارے جیسے بیوقوف آدمی کا سچا پریم ملا ہے۔ یہ بالکل ایسی بات
ہے کہ گورو جھوٹا ہے مگر چیلا سچا ہے۔''

اور وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔ اُس کا ہلکا قہقہہ مجھے بڑا اچھا لگتا تھا۔ وہ عورت بھی اپنی
دنیا کے ماحول میں بڑی دلیر اور سچی اور صاف ذہن کی عورت تھی۔ میرے دل میں اُس
کی بڑی قدر پیدا ہو گئی تھی۔ میں نے اُس سے کہا۔

''کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ میں وہ فلم ایک نظر دیکھ لوں جو سیٹھ نے اپنے شِو مندر کی بنائی
ہوئی ہے اور جس میں مندر کو اندر اور باہر سے دکھایا گیا ہے۔ اس سے مجھے اس مندر کو
پہچان لینے میں کوئی دقت نہیں ہو گی۔''

کملا نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''نہیں...... یہ ناممکن ہے۔ سیٹھ نے وہ فلم اپنی خاص تجوری میں بند کر کے تالا لگا کر
رکھی ہوئی ہے۔ وہ کسی کو نہیں دکھائے گا۔ اور میں وہ فلم لا بھی نہیں سکتی۔ اسے تم بھول
جاؤ۔ میں تمہیں مندر کا سارا نقشہ بتائے دیتی ہوں۔ اور پھر وہاں میرا ایک پجاری پرانا
دوست ہے۔ اُس کا نام نندی پالا ہے۔ میں تمہیں اُس کے نام ایک خط لکھ دُوں گی۔ وہ
اُسے جا کر دے دینا۔ وہ جہاں تک ممکن ہو سکے گا تمہاری مدد کرے گا۔ وہ تمہارے کسی
جگہ ٹھہرنے کا بندوبست بھی کر دے گا۔''

''یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔'' میں نے کملا کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

وہ کہنے لگی۔ ''شکریہ ادا کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اور پھر شکریہ ہوتا کیا ہے؟ میں
تمہیں پسند کرتی ہوں۔ تم پر ایک مشکل آن پڑی ہے میں تمہاری مدد کر سکتی ہوں اور میں

مدد کر رہی ہوں بس اتنی سی بات ہے۔''

اس کے بعد کملا نے مجھے سب کچھ پوری تفصیل کے ساتھ سمجھایا کہ مجھے کون سی ٹرین بمبئی سے پکڑنی ہو گی۔ آگے جا کر کہاں سے کون سی دوسری ٹرین پکڑنی ہو گی وغیرہ وغیرہ۔ مجھے سمجھانے کی اتنی ضرورت بھی نہیں تھی۔ کیونکہ میں ہندوستان کے جنوب میں دو تین بار آخری تکون تک سفر کر چکا تھا۔

چنانچہ ایک دن میں پنجاب ایکسپریس میں سوار ہو کر اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔ کملا مجھے خود ٹرین پر چڑھانے بمبئی کے سینٹرل سٹیشن پر آئی تھی۔ حالانکہ اس بات کا خطرہ تھا کہ اگر سیٹھ کیشو راؤ کا کوئی جاسوس اُسے میرے ساتھ دیکھ لیتا تو وہ سیٹھ کو جا کر بتا سکتا تھا کہ کملا اس آدمی سے ملتی ہے جو سیٹھ کی خاص داشتہ یعنی اُرملا کو بھگا کر لے جانا چاہتا تھا۔ لیکن جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں کملا بڑی دلیر عورت تھی۔ اُس نے اس کی کوئی پرواہ نہیں کی تھی۔ میں ٹرین کے ڈبے میں بیٹھا تھا اور وہ کھڑکی کے باہر پلیٹ فارم پر کھڑی مجھ سے باتیں کر رہی تھی۔ اُس نے پرس میں سے ایک لفافہ نکال کر مجھے دیا اور کہا۔ ''اس میں کچھ پیسے ہیں۔ تمہارے کام آئیں گے۔''

میں نے لفافہ رکھ لیا۔ اُس روز سٹیشن پر بڑی رونق تھی۔ کانگریسی کھدر پوش اور والنٹیر بھاری تعداد میں موجود تھے۔ جگہ جگہ ہندوستان کے پرچم لہرا رہے تھے۔ شاید پنڈت نہرو یا حکومت کا کوئی مرکزی وزیر بمبئی آنے والا تھا۔ اُس وقت مجھے پاکستان بہت یاد آیا۔ پاکستان ایک آزاد اسلامی ملک بن چکا تھا مگر میں ابھی تک اسے نہیں دیکھ سکا تھا۔ مجھے بڑا فخر محسوس ہو رہا تھا کہ اب میں انگریز یا ہندو کی حکومت کا غلام نہیں ہوں بلکہ ایک آزاد اسلامی ملک پاکستان کا آزاد شہری ہوں۔ لیکن ایک پاکستانی مسلمان ہونے کے ناطے میری زندگی کو وہاں کئی خطرات لاحق ہو گئے تھے۔ یہ بات میرے علم میں آ چکی تھی کہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان سفارتی تعلقات قائم ہو گئے ہیں اور اب ویزے کے بغیر کوئی ایک ملک سے دوسرے ملک میں سفر نہیں کر سکتا۔ لیکن ابھی دونوں ملک نئے نئے آزاد ہوئے تھے اس وجہ سے لوگوں کو کچھ چھوٹ مل جاتی تھی۔ لیکن ہندو کے دل میں مسلمانوں اور خاص طور پر پاکستانی مسلمانوں کے خلاف نفرت اور گہری ہو چکی تھی۔

ٹرین نے سیٹی دی تو کملا نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور کہنے لگی۔

''میرا خط سنبھال کر رکھنا اور تندی پالا کو جا کر دے دینا۔ میں نے تمہیں اُس کے مکان کا ایڈریس سمجھا دیا ہے۔''

ٹرین پلیٹ فارم پر کھسکنے لگی۔ وہ پیچھے ہٹ کر ہاتھ ہلانے لگی۔ میں نے بھی کھڑکی سے باہر سر نکال لیا اور ہاتھ ہلا کر اُس کو الوداع کہنے لگا۔ جب تک ٹرین پلیٹ فارم سے نکل نہیں گئی کملا مجھے برابر ہاتھ ہلاتی دکھائی دیتی رہی۔ کملا واقعی میری بڑی مخلص دوست تھی آج بھی جب وہ مجھے یاد آتی ہے تو میرا دل اُس کے لئے نیک جذبات سے لبریز ہو جاتا ہے۔

ٹرین بمبئی کے مضافات میں سے گزر رہی تھی۔

جو لوگ قیام پاکستان سے پہلے بمبئی سے مدراس اور پھر وہاں سے ہندوستان کی آخری جنوبی تکون کے ساحلی شہر دھنش کوڑی تک سفر کر چکے ہیں اُنہیں معلوم ہو گا کہ یہ سفر کتنا طویل اور تھکا دینے والا ہے۔ بمبئی سے دِلّی، دِلّی سے ناگ پور، ناگ پور سے مدراس اور مدراس سے دھنش کوڑی تک جاتے جاتے پانچ دن لگ جاتے تھے۔ انڈیا کے کئی صوبوں میں سے ٹرین گزرتی تھی۔ آب و ہوا بدل جاتی تھی۔ آدمیوں کے رنگ بدل جاتے تھے۔ موسم بدل جاتا تھا۔ زبان بدل جاتی تھی۔ کھانے پینے کی چیزیں بدل جاتی تھیں۔ دو دن تو ٹرین کو دِلّی پہنچتے ہوئے لگ گئے۔ دِلّی سے میں گاڑی بدل کر مدراس ایکسپریس میں سوار ہو گیا۔ اس ٹرین کو مدراس تک جانا تھا۔ مدراس وہاں سے تین دن کی مسافت پر تھا۔ کوئلے کے انجنوں والی ریل گاڑیاں چلتی تھیں اور ٹرینوں کی رفتار ابھی اتنی تیز نہیں ہوئی تھی۔

بمبئی میں موسم خوشگوار تھا۔ اگرچہ دسمبر کا مہینہ تھا۔ دِلّی ٹرین پہنچی تو سردی شباب پر تھی۔ دِلّی سے ناگ پور کی طرف جیسے جیسے ٹرین آگے بڑھتی گئی سردی آہستہ آہستہ جدا ہوتی گئی۔ ابھی لوگ اُردو ہی بولتے تھے اور اُردو میں ہندی اور سنسکرت کے الفاظ اتنے زیادہ شامل نہیں ہوئے تھے جتنے آج کل سننے میں آتے ہیں۔

ناگ پور سے تامل اور تیلگو زبانیں شروع ہو گئیں۔ لوگوں کے رنگ بھی کالے ہو گئے۔ قد چھوٹے اور جسم دُبلے پتلے ہو گئے۔ دہی اور دُودھ اور آٹے کی روٹی کا استعمال

کم ہو گیا اور سٹیشنوں پر اُبلے ہوئے چاول اور چائے زیادہ نظر آنے لگی۔ ناگ پور سے آگے آندھرا پردیش شروع ہو جاتا ہے جہاں تامل اور تیلگو زبانیں بولی جاتی ہیں۔ حیدر آباد دکن مشرق کی جانب رہ جاتا ہے جہاں اُس وقت تک بڑی ادبی قسم کی اُردو بولی جاتی تھی۔ اگرچہ لوگوں کا تلفظ یو پی والوں کی اُردو سے مختلف تھا۔ حیدر آباد دکن کی مسلم ریاستیں ختم ہو چکی تھیں اور انڈیا کی حکومت نے فوج کی چڑھائی کر کے انڈیا کی اُس سب سے بڑی مسلمان ریاست پر قبضہ کر لیا ہوا تھا۔ آج کل وہاں تیلگو دیشم کی تحریک بڑے زور پر چل رہی تھی۔ اس نام کی ایک سیاسی جماعت بھی ہے جو آندھرا پردیش میں تامل کی بجائے تیلگو زبان کا مطالبہ کر رہی ہے۔

بہر حال آندھرا پردیش سے نیچے جائیں تو تامل ناڈو کا صوبہ شروع ہو جاتا ہے جو تامل لوگوں کا صوبہ ہے۔ یہاں بھی مسلمان کثرت سے آباد ہیں اور مغلوں کے زمانے کی بڑی یادگار، مساجد اور مقبرے آج بھی اپنے شاندار ماضی کی یاد دلا رہے ہیں۔ مدراس تامل ناڈو صوبے کا صدر مقام ہے جو انڈیا کے جنوب مشرقی ساحل پر واقع ہے۔ آج کل اس کا نام چنائی رکھ دیا گیا ہے۔ مدراس میں تامل زبان بولی جاتی ہے۔ یہاں کا موسم گرم تھا۔ سردی نام کو نہیں تھا۔ آسمان پر بادل ضرور تھے مگر سخت حبس تھا۔ مدراس سے میں ٹرین بدل کر دھنش کوڑی جانے والی گاڑی میں سوار ہو گیا۔ دھنش کوڑی تک پہنچتے پہنچتے بھی ایک دن اور ایک رات سفر میں گزر گئی۔ مدراس سے ایک دن کی مسافت پر جنوب کی طرف انڈیا کے دونوں ساحل ایک دوسرے کے بہت قریب آ جاتے ہیں۔ جنگل تقریباً ختم ہو جاتے ہیں۔ ریتلا علاقہ کثرت سے آنے لگتا ہے اور ناریل اور تاڑ کے درختوں کے جھنڈ دُور دُور دکھائی دیتے ہیں۔ ناریل کے درختوں کی لمبی لمبی جھالر دار شاخیں نیچے کو جھکی ہوئی ہوتی ہیں جبکہ تاڑ کا درخت بجلی کے لمبے کھمبے کی طرح بالکل سیدھا اُوپر تک گیا ہوتا ہے اور اُوپر جا کر اس کی ٹہنیاں اُوپر کو اُٹھی ہوئی ہوتی ہیں۔ تاڑ کے درخت کی ٹہنی کو کاٹیں تو اس میں سے دودھ کی طرح کا سفید اور میٹھا رس ٹپکنے لگتا ہے۔ گاؤں کے لوگ رات کو تاڑ کی دو تین ٹہنیاں کاٹ کر اس کے آگے مٹی کے مٹکے باندھ دیتے ہیں۔ صبح آ کر مٹکے اُتارتے ہیں تو وہ دودھ جیسے رس سے بھرے ہوتے ہیں۔ اس کو تاڑی کہتے ہیں۔ تاڑی جنوب کی ایک دیسی شراب بھی ہے جسے عام طور پر رکشا

چلانے والے اور مزدور لوگ پیتے ہیں۔ لیکن جب یہ تاڑ کے درخت سے اُتاری جاتی ہے تو اس میں نشہ نہیں ہوتا۔ اس کا ذائقہ ہمارے ہاں کی دہی کی لسی کی طرح ہوتا ہے۔ مٹکے کی تاڑی لوگ صبح صبح سورج نکلنے سے پہلے پیتے ہیں۔ سورج نکلنے کے بعد اس میں نشہ پیدا ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ میں نے ایک بار جنگل میں صبح صبح درخت سے تازہ تازہ اُتاری ہوئی تاڑی پی تھی۔ مجھے ایسے لگا تھا جیسے میں بہت میٹھے دہی کی لسی پی رہا ہوں۔ یہ تاڑی کہا جاتا ہے کہ جگر اور مثانے کی ساری گرمی دُور کر دیتی ہے۔ اس کے بعد اس کی شراب بنائی جاتی ہے۔ خدا جانے اس میں کیا کیا الا بلا ڈالی جاتی ہے کہ وہ بڑی تیز نشہ آور شراب بن جاتی ہے۔ جنوب کے شہروں میں اُس زمانے میں بھی تاڑی خانے عام تھے۔ ایک بہت بڑے مٹکے میں تاڑی کی شراب بھری ہوتی تھی۔ غریب محنت کش تاڑی خانے کے اندر اور باہر سڑک پر مٹی کے آب خوروں میں تاڑی کی شراب لے کر ساتھ اُبلے ہوئے نمک مرچ والے چنے پتھروں پر ڈال کر بیٹھ جاتے تھے اور تاڑی پیتے تھے اور اُونچی اُونچی آواز میں تامل زبان بولتے جاتے تھے۔ میں نے اُن میں عورتوں کو بھی تاڑی پیتے اور تاڑی پی کر تاڑی خانے کے باہر نشے میں دُھت بیہوش پڑے دیکھا ہے۔

ایک بار میں نے بھی تاڑی پی لی تھی۔ بہت برا حال ہوا تھا میرا۔ اس کے بعد کم سے کم تاڑی سے میں نے توبہ کر لی تھی۔

ٹرین ایک رات اور ایک دن کے سفر کے بعد آخر دھنش کوڑی پہنچ گئی۔ یہ انڈیا کی جنوبی تکون کا آخری ساحلی شہر تھا۔ اس کے آگے آبنائے کولمبو تھی۔ یہ پچیس میل کا سمندر تھا جس کے بعد سری لنکا کا ملک تھا جس کا نام اُس وقت تک ابھی سیلون ہی تھا۔ دھنش کوڑی کا سٹیشن بھی چھوٹا سا تھا اور شہر کی آبادی بھی بڑی مختصر تھی۔ جگہ جگہ مندروں کے مینار نظر آ رہے تھے جو چوکور تھے اور نیچے سے بہت چوڑے تھے۔ مگر جیسے جیسے اُوپر جاتے تھے چھوٹے ہوتے جاتے تھے۔ یہاں شِو دیوتا کے مندر کم تھے اور وشنو دیوتا کے مندر زیادہ تھے۔ یہیں کسی جگہ شِو دیوتا کا وہ مندر بھی تھا جو بڈھے سیٹھ کیشو راؤ نے بنوایا تھا اور جہاں اُرملا قید و بند کی زندگی گزار رہی تھی۔ مگر یہ مندر بقول کملا شہر کی آبادی سے ہٹ کر کسی سمندری ٹاپو میں تھا۔ ٹاپو ساحل کے قریب وہ جگہ ہوتی ہے جس کے تین

طرف سمندر ہوتا ہے۔ کسی کسی ٹاپو کے چاروں طرف سمندر ہوتا ہے اور آبادی تک پہنچ
کے لئے بانس کا پُل بنا دیا جاتا ہے۔ سٹیشن پر اُترنے کے بعد میں نے ایک سٹال
کھڑے ہوکر بریانی کھائی۔

آپ کو سن کر حیرت ہوگی کہ انڈیا کے اس دُور دراز ساحل کے تقریباً ہر سٹیشن پر آ
کو کافی اور بریانی ضرور مل جائے گی۔ آپ ٹرین میں بیٹھے ہوں تو یہ بریانی آپ کو
کے پتوں میں لپٹی ہوئی بنڈل کی شکل میں ملے گی جس کو وہاں کے لوگ بریانی کا پار
کہتے ہیں۔ مثلاً اگر آپ کو بریانی کھانی ہے تو آپ پلیٹ فارم پر سے گزرتے اور پار
بریانی پارسل کی آواز لگاتے لڑکے کو آواز دے کر بلائیں گے۔

''لڑکے! ایک بریانی پارسل دینا۔''

میں جب پہلی بار ٹرین میں جنوبی تکون کا سفر کر رہا تھا تو منڈاپم نالہ کا ایک بالکل
ویران سٹیشن آیا۔ مجھے بھوک لگ رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ یہاں تو کھانے کو کچھ ن
ملے گا آگے کوئی بڑا شہر آیا تو اُتر کر کچھ کھا لوں گا۔ میں نے ایک کالے سیاہ دُبلے
لڑکے کو دیکھا جس نے ایک ٹوکری کندھے پر لٹکائی ہوئی تھی اور بریانی پارسل کی آ
لگاتا ٹرین کے ڈبوں کے ساتھ ساتھ چلا آ رہا تھا۔ بریانی کا نام سن کر میرے
کھڑے ہوئے کہ یہ تامل لوگ تو موٹے موٹے اُبلے ہوئے چاول مٹھیوں میں بھر بھ
نیم وحشی انسانوں کی طرح کھاتے ہیں ان کے پاس بریانی کہاں سے آ گئی؟ بہر
بھوک لگی تھی یہ سوچ کر بریانی کا ایک پارسل لے لیا کہ اور کچھ نہیں تو کم از کم اس
اُبلے ہوئے چاول تو ضرور ہوں گے۔

بریانی کا پارسل کیلے کے پتوں میں بند بنڈل کی طرح بندھا تھا اور اُس کے
دھاگہ لپٹا ہوا تھا۔ میں نے پارسل پکڑا تو وہ گرم تھا۔ دھاگہ توڑ کر اُسے کھولا تو م
آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ کیلے کے پتوں میں لمبے باسمتی چاولوں
بریانی ابھی تک گرم تھی۔ اُس میں گوشت کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بھی تھے۔ لونگ
دار چینی بھی تھی اور ٹماٹر بھی کاٹ کر ڈالے گئے تھے۔ ایسی خوشبو اُٹھ رہی تھی کہ جیسے لا
میں اعلیٰ ترین خاندانی باورچی کے ہاتھوں کی پکائی ہوئی کسی دیگ کا منہ کھل گیا
بریانی بے حد لذیذ، مصالحے دار اور خوشبو دار تھی۔ مجھے ایک لمحے کے لئے ایسے لگا

میں اندرون لاہور شہر کے کسی مشہور ہوٹل میں بیٹھا تازہ پکی ہوئی بریانی کھا رہا ہوں۔
اُس وقت میری سمجھ میں یہ بات بالکل نہ آسکی کہ ان لوگوں کو اتنی لذیذ بریانی پکانی کس
نے سکھائی ہے اور سب سے تعجب خیز بات یہ تھی کہ ان کے پاس بریانی کی ڈش کہاں
سے آگئی؟ یہ بھید بہت بعد میں جا کر کھلا جب میں نے ہندوستان میں مسلمانوں کی قدیم
تاریخ کا مطالعہ کیا۔ تب معلوم ہوا کہ بریانی کی یہ ڈش ان مسلمان عرب سوداگروں کی
عنایت کی ہوئی تھی جو اپنے تجارتی سامان سے لدے ہوئے جہاز لے کر آج سے
سینکڑوں برس پہلے جزیرہ نمائے عرب سے نکل کر جاوا، ساٹرا، ملائشیا اور فلپائن کی طرف
جاتے ہوئے ہندوستان کے جنوب مغربی ساحل پر لنگر انداز ہوتے تھے۔ یہاں مسلمان
عرب سوداگروں کی تجارتی کوٹھیاں تھیں۔ وہ یہاں رہتے تھے اور بریانی اور پلاؤ اُن
عرب مسلمانوں میں عام تھا۔ چنانچہ ان کی طفیل جنوبی ہندوستان کے لوگ عربوں کی
تہذیب اور کلچر کے ساتھ ساتھ بریانی سے بھی آشنا ہوئے۔ چنانچہ بریانی کا لفظ بھی اُسی
زمانے سے تامل زبان میں رائج ہوا۔ مسلمان عرب تاجر اس دور دراز سفر پر نکلتے تھے تو
اُن کے ساتھ دین اسلام کے بزرگ اور مبلغ بھی سفر کرتے تھے۔ جہاں عرب سوداگر لنگر
انداز ہوتے تھے ان بستیوں میں دینی مبلغ اسلام کی روشنی پھیلاتے تھے۔ جنوبی ہند میں
چنانچہ آپ کو اُس زمانے کی کئی تاریخی مساجد بھی ملیں گی۔ بعض بزرگوں کے مزار بھی
یہاں ہیں۔ اور آج جنوبی ہند اور جزائر انڈیمان، نکوبار، فلپائن اور انڈونیشیا میں جو نورِ
اسلام جگمگاتا نظر آتا ہے یہ اُن ہی مسلمان بزرگ مبلغوں کی تبلیغ کا ثمر ہے جنھوں نے
اپنی زندگیاں تبلیغ اسلام کے لئے وقف کر رکھی تھیں اور اپنے وطن سے ہزاروں میل دُور آ
کر سمندری سفر کی سختیاں خندہ پیشانی سے برداشت کرتے ہوئے ان گمنام اور جہالت
کی تاریکی میں ڈوبی ہوئی بستیوں کو دین اسلام کے نور سے منور کرتے تھے۔

ابھی سورج غروب نہیں ہوا تھا۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے کملا نے مجھے ایک
ہوٹل کا پتہ بتایا تھا جہاں سے مجھے نندی پالا کے مکان کا پتہ مل سکتا تھا۔ ایک بات اُس
زمانے میں بھی میں نے نوٹ کی تھی کہ جنوب میں انگریزی کا بڑا رواج تھا۔ پڑھے
لکھوں کو تو چھوڑو وہاں کے مزدور بھی تھوڑی بہت انگریزی سمجھ اور بول لیتے تھے۔
چنانچہ جب میں نے ہوٹل کے تامل مالک سے جو شکل سے کورا ان پڑھ لگتا تھا نندی پالا

کے مکان کا پتہ انگریزی میں پوچھا تو اُس نے انگریزی میں ہی مجھ سے سوال کیا کہ میں
کہاں سے آیا ہوں۔

میں نے جواب دیا۔ ''میں پنجاب سے آیا ہوں اور نندی پالا کے نام اُس کے ایک
دوست کا پیغام لایا ہوں۔''

وہاں اُردو بھی بولی جاتی تھی۔ مگر یہ اُردو ایسی تھی کہ جس سے صرف مطلب نکالا
سکتا تھا۔ اسے ہندوستانی کہا جاتا تھا۔ آج کل اسے ہندی کہتے ہیں۔ ہوٹل کے مالک
نے مجھے جو پتہ بتایا تھا میں اس کے مطابق دھنش کوڑی شہر نما قصبے کے جنوبی علاقے میں
آ گیا۔ وہاں سمندر میں ایک ٹاپو دکھائی دیا جس تک پہنچنے کے لئے سمندر میں ہی ایک
چھوٹا سا پُل بنا دیا گیا تھا۔ پُل پر سے کچھ لوگ آ جا رہے تھے۔ ان میں عورتیں بھی تھیں
اور مرد بھی تھے۔ عورتوں نے ساڑھیاں پہن رکھی تھیں اور تقریباً ہر عورت نے اپ
جوڑے میں موتیے کے پھولوں کا گجرا باندھ رکھا تھا۔ جن کے بالوں میں گجرا نہیں
اُنہوں نے موتیے کے تین چار ہار بالوں میں لٹکا رکھے تھے۔ بیشتر عورتیں اور مرد پاؤ
سے ننگے تھے۔ بعض مردوں نے صرف بنیان اور دھوتی پہن رکھی تھی اور دھوتی کو
سے گھٹنوں تک اُونچا کر کے اُس کے پلو اُوپر سے اُڑسے ہوئے تھے۔ سبھی کالے رنگ
کے دُبلے پتلے تھے مگر بال اُن کے اپنے رنگ سے بھی زیادہ کالے اور گھنگریالے
اور تیل سے چمک رہے تھے۔ میں بھی اُن میں شامل ہو گیا اور بانس کے پُل پر سے
گزرنے لگا۔

سب مجھے حیرانی سے ایک نظر ضرور دیکھ لیتے تھے اس لئے کہ میں اپنے قد کاٹھ
مضبوط بدن اور گورے رنگ کی وجہ سے ان سب سے الگ لگ رہا تھا۔ ایک دُبلا
آدمی میرے برابر ہی چل رہا تھا۔ وہ میرے قریب آ گیا اور اُس نے مسکراتے ہو
مجھ سے ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی یا اُردو میں پوچھا کہ کیا میں پنجاب سے آیا ہوں؟ میں نے
اُسے جواب دیا۔

''ہاں میں پنجاب کے شہر لاہور سے آیا ہوں۔''

لاہور کا نام سن کر وہ بڑا خوش ہوا۔ لاہور اُس زمانے میں بھی سارے ہندوستان میں
اس طرح مشہور تھا جس طرح یورپ میں پیرس کا شہر مشہور ہے۔ بمبئی میں تو عام طور

مشہور تھا کہ ہندوستان کی عورتوں میں لباس کا جو نیا فیشن رائج ہوتا ہے وہ سب سے پہلے
لاہور ہی سے آتا ہے۔ اور پنجابیوں سے تو ہندوستان کے لوگ ویسے ہی ڈرتے تھے۔
ان میں پنجابیوں کے بارے میں مشہور تھا کہ پنجابی ایک دم مرنے مارنے پر اُتر آتے
ہیں اور بڑے نڈر ہوتے ہیں۔

اُس مدراسی تامل آدمی نے پوچھا کہ میں کسی مندر کی یاترا کرنے آیا ہوں؟

میں نے یونہی کہہ دیا کہ ہاں میں جنوبی ہندوستان کے مندروں اور خاص طور پر
رامیشورم کے مندروں کی یاترا کرنے آیا ہوں۔ مگر اس وقت میں اپنے ایک دوست
نندی پالا سے ملنے جا رہا ہوں جو یہاں کے شو جی کے مندر کا پجاری ہے۔

وہ بڑا خوش ہو کر بولا۔ ''ہاں ہاں، نندی پالا کو میں جانتا ہوں۔ میرے ساتھ آؤ۔ میں
تمہیں اُس کے مکان پر لئے چلتا ہوں۔ شو جی کے مندر کے پاس ہی اُس کا مکان ہے۔''

وہ مجھے ٹاپو میں نندی پالا کے مکان کے پاس لے گیا اور مجھے نمسکار کر کے چلا گیا۔
نندی پالا کا مکان ایک منزلہ تھا۔ پرانا خستہ حال سا مکان تھا۔ دیواریں پتھر کی تھیں اور
کھپریلوں کی چھت وہاں کے مکانوں کے رواج کے مطابق ڈھلوان تھی۔ مکان کے
آگے چھوٹا سا صحن تھا جہاں کونے میں ایک گائے بندھی ہوئی تھی۔ اور ایک کالی بوڑھی
عورت اُس کے پاس ہی بیٹھی کپڑے دھو رہی تھی۔ میں مکان کے بانس کے چھوٹے سے
گیٹ کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ اس کالی بوڑھی مدراسی عورت نے میری طرف دیکھا
اور وہیں سے تیز آواز میں تامل زبان میں مجھ سے کچھ پوچھا۔

ہندوستان کے صوبوں میں صرف تامل ایک ایسی زبان ہے جس میں ایک لفظ بھی
ہندی زبان کا نہیں ہے۔ اب شاید ہندی کے الفاظ تامل زبان میں شامل ہو گئے ہوں۔
دوسرے صوبوں کی زبانوں مثلاً بنگالی، گجراتی، مراٹھی، اُڑیسہ، راجستھانی وغیرہ کے کچھ
الفاظ ضرور سمجھ میں آ جاتے ہیں۔ گجراتی میں تو بے شمار اُردو، فارسی اور عربی کے الفاظ مل
جائیں گے۔ مگر تامل اور ملیالم ایسی زبانیں ہیں کہ جن کا کوئی لفظ بھی آپ کی سمجھ میں نہیں
آئے گا۔ ملیالم ہندوستان کے جنوب مشرقی صوبے کیرالہ میں بولی جاتی ہے۔ چنانچہ
مجھے کچھ پتہ نہ چلا کہ اُس بڈھی تامل عورت نے مجھ سے کیا پوچھا ہے۔ میں نے انگریزی
میں کہہ دیا۔

''کیا نندی پالا کا یہی مکان ہے؟''

انگریزی اُس کی سمجھ میں نہ آئی۔ وہ گیلے کپڑے ایک طرف رکھ کر ساڑھی کا پلو
کے گرد کستی ہوئی میرے پاس آ گئی۔ اُس نے پھر تامل زبان میں مجھ سے کوئی بات
اور میں اُس کا منہ تکتا رہا۔ اتنے میں مکان کے کمرے کے اندر سے کسی نے تامل ز
میں ہی بوڑھی عورت سے کچھ پوچھا۔ عورت نے کمرے کی طرف منہ کر کے کچھ کہا۔
کے جواب میں خاموشی چھا گئی۔ پھر کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک اکہرے بدن کا آ
جس نے دھوتی بنیان پہنی ہوئی تھی نکل کر میری طرف آیا۔ اُس کی عمر پینتیس سال
قریب ہو گی۔ چمکیلے بال سارے سیاہ تھے۔ وہ سگریٹ پی رہا تھا۔ اُس نے مجھے
انگریزی میں پوچھا کہ مجھے کس سے ملنا ہے۔ میں نے انگریزی میں ہی جواب دیا۔

''میں بمبئی سے آیا ہوں۔ مجھے نندی پالا سے ملنا ہے۔''

وہ بولا۔ ''میں ہی نندی پالا ہوں۔ آپ کو مجھ سے کیا کام ہے؟''

میں نے جواب میں کہا۔ ''مجھے کملا دیوی نے بھیجا ہے۔''

کملا کا نام سن کر اُس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی۔ میں نے جیب سے کم
خط نکال کر اُس کو دیا۔ خط پڑھ کر اُس نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور مجھے اپنے کمرے
لے گیا۔ جاتے جاتے اُس نے تامل زبان میں بوڑھی عورت سے کچھ کہا۔ کمرہ مختـ
تھا۔ ایک طرف پلنگ بچھا تھا جس پر مچھر دانی لپیٹ کر اُوپر کی ہوئی تھی۔ بانس کی تیلـ
کی چھوٹی سی چٹائی ایک طرف بچھی تھی جس پر ایک تکیہ رکھا تھا۔ دیوار پر دو تین کھونٹـ
لگی تھیں جس پر کچھ مردانہ کپڑے لٹک رہے تھے۔ پلنگ کے سرہانے کارنس پر اُو
کے شِو جی کی فریم کی ہوئی تصویر لگی تھی جس کے نیچے چوکھی تھالی میں گیندے کے دو
باسی پھول پڑے تھے۔ دیوار کے ساتھ ایک کرسی کے آگے چھوٹی میز لگی تھی۔ میز پ
کتابیں پڑی تھیں۔ اُس نے مجھے کرسی پیش کی مگر میں چٹائی پر ہی بیٹھ گیا۔ وہ بھی میر
پاس چٹائی پر بیٹھ گیا۔ اُس نے تکیے کے نیچے سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر مجھے سگر
پیش کیا۔ میں نے کہا۔

''شکریہ ...... میں سگریٹ بہت کم پیتا ہوں۔''

یہ جملہ میں نے اُردو میں کہا تھا۔ تب وہ اُردو میں ہی مجھ سے باتیں کرنے لگا۔

نے محسوس کیا کہ اُس کی اُردو اچھی خاصی صاف تھی۔ میں نے اُس سے پوچھا۔

''تم تامل ہو کر اتنی اچھی اُردو کیسے بول لیتے ہو؟''

وہ ہنس کر کہنے لگا۔ ''میں بنارس کے ایک مندر میں چھ برس تک رہا ہوں۔ وہاں سے
میں نے اُردو بولنا سیکھ لیا تھا۔'' پھر اُس نے کملا کے بارے میں پوچھا۔ ''کملا دیوی کیسی
ہے؟ اُس سے ملے بڑی دیر ہو گئی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''وہ بالکل ٹھیک ہے۔ میں یہاں آنے لگا تو اُس نے خاص طور پر مجھے
کہا تھا کہ میں تمہیں جا کر ملوں۔ اسی لئے اُس نے مجھے خط بھی لکھ کر دے دیا تھا۔''

وہ بولا۔ ''کملا دیوی بڑی اچھی دوست ہے میری۔ کسی زمانے میں ہم تبخواد کے
ایک مندر میں اکٹھے رہا کرتے تھے۔''

ہم ابھی اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہے تھے کہ بوڑھی تامل عورت چائے کے دو گلاس
لے کر آ گئی۔ نندی پالا نے کہا۔ ''پہلے چائے پی لیتے ہیں۔ تمہاری سفر کی تھکان دُور ہو
جائے گی۔ اتنی دیر میں کھانا تیار ہو جائے گا۔''

تامل عورت چائے دے کر چلی گئی۔ نندی پالا نے مجھ سے پوچھا۔

''تم کس سلسلے میں دھنش کوڑی آئے ہو؟ کیا یہاں کی یاترا کا ارادہ تھا؟ مگر کملا کے
خط سے معلوم ہوا ہے کہ تم مسلمان ہو۔ مسلمان تو مندروں کی یاترا کرنے نہیں آتے۔ کیا
کاروباری سلسلے میں آنا ہوا ہے؟''

میں نے کہا۔ ''چائے پی لوں، پھر پوری بات بتاؤں گا۔''

وہ ذرا سا مسکرا کر چپ ہو گیا اور ہم دونوں خاموشی سے چائے پینے لگے۔ چائے
کے چند ایک گھونٹ پینے کے بعد میں نے گلاس چٹائی پر رکھ دیا اور اپنی ساری کہانی
آہستہ آہستہ مختصر کر کے اُسے بیان کر دی۔ وہ بڑے غور سے سنتا رہا۔ جب میں ساری
داستان بیان کر چکا تو نندی پالا نے نیا سگریٹ سلگا کر ہلکا سا کش لیا اور کسی گہری سوچ
میں ڈوب گیا۔ میں سمجھ گیا کہ نندی پالا کو اس مسئلے میں مشکلات کا سامنا ہے۔ میں نے
اُسے بتا دیا تھا کہ میں اُرملا کو سیٹھ کے شِو مندر سے نکال کر اپنے ساتھ لے جانے آیا
ہوں اور اس سلسلے میں مجھے اُس کی مدد درکار ہے جس کی سفارش کملا نے بھی نندی پالا کو
کی تھی۔ کچھ دیر تک وہ خاموشی سے کچھ سوچتا رہا۔ پھر اُس نے سر اُٹھا کر میری طرف

دیکھا اور کہا۔

"کملا دیوی کا کہا میں نہیں ٹال سکتا۔ لیکن یہ کام جس کی اُس نے بھی سفارش کی۔ کم از کم میرے لئے کرنا ناممکن ہے۔"

اُس کے ان واضح الفاظ سے مجھے بڑی مایوسی ہوئی۔ میں اتنا لمبا سفر طے کر کے اُ کے پاس اسی اُمید پر آیا تھا کہ وہ میری مدد کرے گا لیکن اُس نے اپنی مجبوری کا اظہار دیا تھا۔ میں اُسے مجبور کرنے کی پوزیشن میں بھی نہیں تھا۔ اب میرے سامنے ایک صورت باقی رہ گئی تھی کہ میں اپنے طور پر کچھ کروں۔ میں نے اُسے کہا۔

"اگر میں اپنے طور پر اُرملا کو اُس مندر سے نکالنا چاہوں تو تم میری کیا مدد کر سکتے ہو"

وہ بولا۔ "بات ایک ہی ہے۔ چاہے میں اُسے وہاں سے نکالوں چاہے تم اُ وہاں سے نکالنے کی کوشش کرو۔ لیکن دونوں صورتوں میں ایسا ہونا ناممکن ہے۔"

"ایسی کون سی بات ہے؟" میں نے پوچھا۔ "کیا اُرملا کو کسی اندھے کنویں میں ڈ کر بند کر دیا گیا ہے کہ اُس تک کوئی پہنچ ہی نہیں سکتا؟"

نندی پالا نے گلاس میں سے چائے کا آخری گھونٹ حلق میں انڈیلا، گلاس چٹائی رکھا اور نیا سگریٹ سلگا کر بولا۔

"یوں سمجھ لو کہ اسے اندھے کنویں میں ہی بند کیا گیا ہے۔ یہاں کے حالات سے اور کملا دونوں بے خبر ہوں۔ ایک مندر کی اُوپر کی ظاہری دنیا ہے جہاں پوجا پاٹھ ہ ہے، آرتی اُترتی ہے، پوجا کرنے والوں میں پرشاد بانٹا جاتا ہے۔ ایک مندر کے نیچے پراسرار دنیا ہے۔ یہ دنیا اتنی خفیہ اور خوفناک ہے کہ اگر انسان اس کی ایک جھلک ہی د لے تو ہندو دھرم کے سارے دیوی دیوتاؤں کے خلاف باغی ہو جائے۔"

میں نے پوچھا۔ "ایسی کون سی بات ہے؟ کیا مندر کے تہہ خانوں میں زندہ انسا کو دیوتاؤں کے آگے قربان کیا جاتا ہے؟"

نندی پالا نے کہا۔ "اس سے بھی آگے بہت کچھ ہوتا ہے۔ اتنا کچھ کہ تم تو مسلم ہو، ایک ہندو بھی اس کا تصور نہیں کر سکتا۔"

"لیکن......" میں نے کہا۔ "لیکن اس سے اُرملا کا کیا تعلق ہے؟ کیا اُسے بھی د دیوتاؤں پر قربان کیا جانے والا ہے؟"

"نہیں۔" نندی پالا نے میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"تو پھر اُسے ایسی جگہ پر کیوں رکھا گیا ہے؟" میں نے پوچھا۔ "سیٹھ کو اگر اُس کی نظر بندی ہی مطلوب تھی تو یہ کام تو تہہ خانے کے باہر مندر کی کسی کوٹھڑی میں ڈال کر بھی ہو سکتا تھا۔ آخر وہاں بھی تو سیٹھ کیشو راؤ کے آدمی اُس کی کڑی نگرانی کر سکتے تھے۔"

نندی پالا میری بات بڑے غور سے سن رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"مندر کے اُوپر کی دنیا میں جو پجاری اور سیٹھ کے خریدے ہوئے آدمی پجاریوں کے بھیس میں مندر میں آنے جانے والوں کی نگرانی کرتے ہیں اُرملا کے معاملے میں سیٹھ اُن کو بھی بھروسے کے لائق نہیں سمجھتا۔ لیکن مندر کے تہہ خانوں میں جو گناہ کی دنیا آباد ہے وہاں سیٹھ پر جان قربان کر دینے والے اُس کے وہ آدمی پہرہ دیتے ہیں جو سیٹھ کیشو راؤ کو دیوتا شِو جی کا اوتار سمجھتے ہیں اور اُس کے ذرا سے اشارے پر دوسرے کی جان لینے اور اپنی جان دینے پر ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ اُرملا انہی درندوں ایسی خصلت والے آدمیوں کی نگرانی میں ہے۔ وہ خود مر جائیں گے یا دوسرے کو مار دیں گے مگر سیٹھ کے کسی حکم سے پیچھے نہیں ہٹیں گے۔"

نندی پالا سگریٹ پینے کے لئے ایک دو سیکنڈ کے لئے رُک گیا۔ اس کے بعد کہنے لگا۔ "یہاں سیٹھ کی ایک سے بڑھ کر ایک رکھیل دیوداسی موجود ہے۔ مگر بھگوان ہی جانتا ہے کہ اُرملا نے اُس پر ایسا کون سا جادو کر دیا ہے کہ وہ اُس کی اتنی حفاظت کر رہا ہے کہ جتنی حفاظت شاید شِو جی مہاراج نے اپنی پتنی پاروتی کی بھی نہیں کی ہو گی۔"

مجھے اُس کے شِو جی مہاراج اور اُس کی پتنی پاروتی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں تو صرف اتنا چاہتا تھا کہ نندی پالا مجھے کوئی ایسی ترکیب بتا دے جس سے میں اُرملا کو اس گناہ کے جہنم سے نجات دلا سکوں۔ لیکن مجھے وہ خود بے بس اور مجبور دکھائی دیتا تھا۔ میں نے اُس سے کہا۔

"بھائی نندی پالا! پھر مجھے کیا کرنا چاہئے؟ یہ تو میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ میں اُرملا کے بغیر یہاں سے نہیں جاؤں گا۔ خواہ اس کے لئے مجھے اپنی جان کی قربانی ہی کیوں نہ دینی پڑے۔ اسی بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے بتاؤ کہ مجھے کیا کرنا چاہئے؟"

نندی پالا بولا۔ "اس کے لئے مجھے سوچنے کی مہلت دو۔ اور اس نگاہ سے مجھے شِو جی

کے مندر کے حالات اور موقع کا جائزہ لینے دو کہ وہاں سے اُرملا کے باہر نکلنے کے کیا امکانات ہو سکتے ہیں؟ اس کے بعد ہی میں کچھ بتا سکوں گا۔''

میں نندی پالا کے مکان پر ہی ٹھہر گیا تھا۔ وہ دن کو مندر کے پجاریوں والا لمبا چ پہن کر، ماتھے پر تلک لگا کر، گلے میں مالا ڈال کر مندر کو چلا جاتا اور رات کے وقت وا آتا۔ اُس نے مجھے ہدایت کر دی تھی کہ میں اُس کی عدم موجودگی میں مکان کے اندر رہوں اور یونہی بے مقصد باہر نہ پھرتا رہوں۔ میری اُس کی ملاقات مکان میں دن وقت ہی ہوتی کیونکہ رات کو وہ اکثر دیر سے آتا تھا۔ اسی طرح تین دن گزر گئے۔

تیسرے دن وہ مندر پوجا پاٹھ کے لئے نہ گیا۔ صبح ناشتہ ہم دونوں نے اکٹھے کی ایک کالی کلوٹی مدراسی عورت اُس کے گھر کا کام کاج کرنے اور کھانا پکانے آ جاتی تھ نندی پالا نے شادی نہیں کی تھی۔ ناشتے کے بعد وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔

''میں نے تمام حالات کا پورا پورا جائزہ لیا ہے اور میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں ک کچھ میں نے تمہیں کہا تھا وہ صحیح تھا۔ میرا مطلب ہے کہ میں تمہاری مدد نہ کرنے پر مج ہوں۔''

میں نے خاموشی سے سر جھکا لیا اور سوچنے لگا کہ اس شخص نے بھی کورا جواب دے ہے۔ اب مجھے ہی کچھ کرنا پڑے گا۔ لیکن اس کے لئے بھی مجھے نند پالا کی تھوڑی بہت کی ضرورت تھی۔ میں اسی سوچ میں تھا کہ وہ کہنے لگا۔

''تمہیں شاید یقین نہ آئے لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں نے اُرملا کو صرف ایک بار دیکھا ہے جب اُسے مندر میں لایا گیا تھا۔ اس کے بعد اُسے مندر کے خفیہ تہہ خانے پہنچا دیا گیا اور اس دن کے بعد سے آج تک میں نے اُس کی شکل نہیں دیکھی۔''

میں نے کہا۔ ''اگر میں مندر میں جا کر کسی طریقے سے اپنے طور پر اُرملا سے ملنے کوشش کروں تو کیا ایسا ممکن ہے؟''

وہ بولا۔ ''سیٹھ کے مندر میں صرف ہندو ہی جا سکتے ہیں۔ کسی مسلمان کو جانے اجازت نہیں ہے۔ اگر کوئی مسلمان ہندوؤں کا حلیہ بنا کر مندر میں گھس جائے تو اُ کے اجنبی چہرے سے پجاریوں کو شک پڑ سکتا ہے اور یہ پتہ چلنے پر کہ وہ مسلمان ہے ا ہندو کا بھیس بدل کر مندر میں آیا تھا اُسے اُسی وقت موت کے گھاٹ اُتار دیا جائے۔

تم ایسی غلطی ہرگز نہ کرنا۔ اس مندر میں دھنش کوڑی کی بستی کے لوگ ہی پوجا کرنے آتے ہیں اور پجاری اُن سب کے چہروں سے آشنا ہے۔''

کچھ لمحے خاموش رہنے کے بعد نندی پالا کہنے لگا۔ ''لیکن ایک بات ہو سکتی ہے۔''

''وہ کیا؟'' میں نے بے تابی سے پوچھا۔

وہ بولا۔ ''اس منگل وار کو بنارس سے شو جی کے ماننے والے پجاریوں کا ایک جتھہ ہمارے مندر کی یاترا اور شو جی کو شردھا کے پھول ارپن کرنے آ رہا ہے۔ پجاریوں کا گروپ اُتر پردیش کے ہر شہر سے مہینے میں ایک بار آتا ہے۔ اس دفعہ یہ جتھہ بنارس سے آ رہا ہے۔ ان یاتریوں کے سر منڈے ہوئے ہوتے ہیں۔ داڑھی مونچھ اور ابرو بھی صاف ہوتے ہیں۔ جسم پر جوگیا رنگ کی صرف ایک چادر ہوتی ہے۔ ماتھے پر وشنو اور شو جی دونوں کے تلک لگے ہوتے ہیں اور مندر کے احاطے میں ہی قیام کرتے ہیں۔ یہ جتھہ پندرہ بیس پجاریوں کا ہوتا ہے اور بعد میں ایک دو پجاری اسی شہر سے آ کر ان میں شامل ہو جاتے ہیں۔ ان سب کے چہرے ہمارے مندر کے پجاریوں کے لئے اجنبی ہوتے ہیں۔ اگر کسی طرح تم پجاریوں کے اس جتھے میں شامل ہو جاؤ تو کم از کم ہمارے مندر میں داخل ہو سکو گے اور تمہیں کوئی پوچھے گا بھی نہیں کہ تم کون ہو؟ سب یہی سمجھیں گے کہ تم بنارس سے جتھے کے ساتھ آئے ہو۔''

مجھے اُمید کی ایک کرن نظر آئی۔ میں نے پوچھا۔ ''یہ جتھہ مندر میں کتنے دن تک قیام کرتا ہے؟''

''دس پندرہ دن تو ضرور پوجا پاٹھ اور مختلف رسمیں ادا کرنے میں لگ جاتے ہیں۔''

میں نے کچھ سوچ کر کہا۔ ''لیکن اس سے کیا فائدہ ہو گا؟ اُرملا سے ملنے تو میں پھر بھی مندر کے خفیہ تہہ خانے میں نہیں جا سکوں گا۔''

نندی پالا بولا۔ ''ٹھیک ہے، تم تہہ خانے میں نہیں جا سکو گے۔ لیکن تم ایک کام کر سکو گے اور اسی کام کے لئے میں نے تمہیں ان یاتریوں میں شامل ہونے کا مشورہ دیا ہے۔ بات یہ ہے کہ ایک دن چھوڑ کر ہر دوسری رات کو اُرملا کو خفیہ تہہ خانے سے نکال کر مندر کی چھت پر ٹہلوانے لے جایا جاتا ہے۔ اس وقت تہہ خانے کا صرف ایک چھٹا ہوا بدمعاش محافظ اُرملا کے ساتھ ہوتا ہے۔ میں تو مندر میں موجود ہی ہوں گا، اُرملا کو چھت

پر ٹھلوانے کے لئے لے جانے سے پہلے کچھ دیر پہلے میں تمہیں بتا دوں گا۔ تم اُسی وقت
مندر کی چھت پر جا کر بیٹھ جانا۔ مندر کی چھت کافی بڑی ہے۔ تم کسی کونے میں بیٹھنا
آسن جما کر اس طرح بیٹھنا جیسے تم گیان دھیان میں ہو۔ اگر کوئی پوچھے تو کہہ دینا
میں پاروتی جی کا منگل جاپ کر رہا ہوں۔ اُرملا کو چھت پر چھوڑ کر پہرے دار محافظ ایک
طرف بیٹھ کر اُس کی نگرانی کرتا ہے اور چونکہ اُسے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں کوئی خطرہ نہیں
ہے اس لئے کبھی کبھی اونگھنے بھی لگ جاتا ہے۔ یہ مت بھولنا کہ اُس کے پاس پستول
بھری ہوئی مشین گن موجود ہوتی ہے۔ اور اس کا نشانہ کبھی خطا نہیں جاتا۔ وہاں تم اُرملا
دیکھ بھی سکتے ہو اور موقع پا کر اُس سے ایک دو باتیں بھی کر سکتے ہو۔ لیکن اس کے لئے
تمہیں بے حد احتیاط سے کام لینا ہوگا۔ تمہاری ذرا سی غفلت اور اُس کے گارڈ کی ذرا سی
ہوشیاری تمہیں موت کے گھاٹ اُتار سکتی ہے۔''

اگرچہ اس مشن میں خطرات ہی خطرات تھے اور کامیابی کی اُمید نہ ہونے کے برابر
تھی لیکن کم از کم اُرملا سے ملاقات تو ہو سکتی تھی۔ اور اگر میں کسی طرح پہرے دار پر قابو
پا لوں تو میں اُرملا کو لے کر وہاں سے فرار ہونے کی کوشش بھی کر سکتا تھا۔ یہی ایک
صورت باقی رہ گئی تھی۔ دوسری کوئی صورت اُرملا سے ملنے اور اُسے وہاں سے نکال لے
جانے کی نہیں تھی۔ میں نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ میں اس موقع سے پورا فائدہ اُٹھانے
کی کوشش کروں گا۔ میں نے نندی پالا سے کہا۔

''میں تیار ہوں۔''

''ایک بار پھر سوچ لو...... یہ کام اتنا آسان نہیں ہے۔ پکڑے جانے کے سو فیصد
امکانات ہیں۔ اور اگر تم پکڑے گئے تو تمہاری موت یقینی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''میں اُرملا کی خاطر ہر قسم کا خطرہ مول لینے کو تیار ہوں۔''

وہ کہنے لگا۔ ''لیکن ایک بات یاد رکھنا۔ اگر تم پکڑے گئے تو میرا نام مت لینا۔ نہیں
تمہارے ساتھ میں بھی مارا جاؤں گا۔ اس کا وعدہ تمہیں اپنے خدا کو حاضر ناظر جان کر
اُس کی قسم کھا کر کرنا ہوگا۔''

میں نے اُسی وقت کہا۔ ''میں خدا کو حاضر ناضر جان کر اور اُس کی قسم کھا کر تم سے
وعدہ کرتا ہوں اگر میں پکڑا گیا تو تمہارا نام نہیں لوں گا۔''

نندی پالا خوش ہو گیا۔ پھر ایک دم سنجیدہ ہو کر بولا۔ ''کہیں تم کچھ اور تو نہیں سوچ
رہے؟''

مجھے محسوس ہوا کہ اُس نے میرے دل کی بات پا لی ہے۔ میں نے کہا۔ ''کچھ اور
سوچنے سے تمہاری کیا مراد ہے؟''

''میرا مطلب ہے......'' وہ بولا۔ ''اگر تم یہ سوچ رہے ہو کہ تم اُرملا کے محافظ کو قتل کر
کے اُرملا کو وہاں سے بھگا کر لے جاؤ گے تو اس خیال کو ابھی اپنے دماغ سے نکال دو۔
یہ غلطی ہرگز ہرگز نہ کرنا۔ خفیہ تہہ خانے کے محافظوں میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں ہے
کہ جس نے دو تین قتل نہ کئے ہوں۔ وہ سارے کے سارے چوٹی کے خونی اور قاتل
ہیں۔ یہ میں صرف اس لئے کہہ رہا ہوں کہ میں نہیں چاہتا کہ جس آدمی کو کملا جی نے
میرے پاس بھیجا ہے وہ مندر میں بے دردی سے قتل کر دیا جائے۔''

میں نے نندی پالا کے اس انتباہ کو کوئی اہمیت نہ دی اور جو فیصلہ میں اپنے دل میں کر
چکا تھا اُس پر قائم رہا لیکن اُوپر سے کہا۔ ''میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں کہ ان حالات
میں ایسی سنگین غلطی کروں۔ تم اطمینان رکھو! میں ایسی حرکت کے بارے میں سوچ بھی
نہیں سکتا۔''

''تمہاری، میری اور اُرملا کی بھلائی بھی اسی میں ہے۔'' اُس نے کہا۔ ''اب تمہیں
میرے مکان سے نہ تو باہر نکلنا ہوگا اور نہ اپنی شکل کسی کو دکھانی ہوگی تاکہ کسی کو یہ معلوم نہ
ہو کہ بنارس سے آنے والے یاتریوں میں سے ایک یاتری پہلے ہی سے نند پالا کے مکان
پر دیکھا گیا تھا۔ تم سمجھ گئے ہو گے میں کیا کہنا چاہتا ہوں۔''

یہ بات اُس نے حالات کی نزاکت کے مطابق بالکل صحیح کہی تھی۔ میں نے اسے فوراً
تسلیم کر لیا۔ اس کے بعد نندی پالا نے پاروتی کی منگل پوجا کے بارے میں مجھے کچھ
سنسکرت کے اشلوک بتائے جو مجھے مندر کی چھت پر کھلے آسمان کے نیچے بیٹھ کر گیان
دھیان کے وقت اچھی طرح سے یاد رکھنے ہوں گے تاکہ اگر مندر کا کوئی آدمی مجھ سے
ان کے بارے میں سوال کر بیٹھے تو میں جواب دے سکوں۔

○○○

بنارس سے یاتریوں کی ٹولی کو منگل کے دن آنا تھا۔

اس سے ایک دن پہلے نندی پالا نے اُسترے سے میرے سر کے بال، آنکھوں کی بھنویں اور میری چھوٹی چھوٹی مونچھیں صفاچٹ کر دیں۔ داڑھی پہلے سے منڈی ہوئی تھی۔ اُس نے میرے لئے یاتریوں کا گیروے رنگ کا چولا اور کچھ سادھوؤں والی مالائیں صبح لا کر رکھ دی تھیں۔ منگل کے دن وہ مجھے یہ کہہ کر مندر چلا گیا کہ میں یہ پتہ کر کے آؤں گا کہ یاتری کس وقت مندر پہنچ رہے ہیں۔ تم تیار رہنا۔ میں اُس کے مکان میں ہی بند رہا۔ اب وہ باہر سے مکان کو تالا لگا کر جاتا تھا۔ نوکرانی کو اُس نے دو دن کی چھٹی پر بھیج دیا تھا۔ میرے لئے کھانے پینے کا سامان وہ کمرے میں رکھ گیا تھا۔ دن غروب ہو رہا تھا کہ نندی پالا آ گیا۔ آتے ہی بولا۔

''جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ یاتری دھنش کوڑی کے سٹیشن پر پہنچ گئے ہیں۔''

اُس نے مجھے سادھوؤں والا چولا پہنایا۔ میرے ماتھے پر وِیشنو دیوتا اور شِو دیوتا کے تلک لگائے۔ میں نے مالائیں گلے میں ڈال کر چپل پہن لی۔ شِو دیوتا کا تلک گول بندیا کی شکل میں ہوتا ہے اور ویشنو دیوتا کا تلک ماتھے پر دائیں سے بائیں لکیریں کھینچ کر لگایا جاتا ہے۔ اس وقت شام کا اندھیرا چھا رہا تھا۔ نندی پالا نے شام کے اندھیرے میں مجھے ریلوے سٹیشن کی طرف چلنے کو کہا۔

''میں سٹیشن کے باہر پانی کی جو اُونچی ٹینکی ہے اُس کے پاس ہوں گا۔ تم وہاں آ جانا۔ اور یہ لو تالا۔ مکان کو تالا لگاتے آنا۔ میں تمہارے ساتھ نہیں جا سکتا۔''

مجھے تالا دے کر وہ چلا گیا۔

اُس کے جانے کے دس پندرہ منٹ بعد میں نے مکان کو تالا لگایا اور دھنش کوڑی کے ریلوے سٹیشن کی طرف چل پڑا۔ اندھیرا ہو رہا تھا۔ میں جوگیوں والے حلیے میں تھا۔

یہ لباس وہاں عام دیکھا جاتا ہے اس لئے کسی نے میرے منڈے ہوئے سر اور منڈی ہوئی ابروؤں پر دھیان نہ دیا۔ جنوبی انڈیا میں اس قسم کے سادھو اکثر پھرتے رہتے ہیں۔ میں ٹاپو کے بانس کے پُل پر سے گزر گیا۔ ریلوے سٹیشن وہاں سے زیادہ دُور نہیں تھا۔ سٹیشن کے قریب پہنچ کر میں نے دیکھا کہ سٹیشن کے باہر خوب روشنیاں ہو رہی تھیں اور شہنائی بج رہی تھی۔ شہنائی جنوبی ہند کا بڑا مشہور ساز ہے اور اسے ہر قسم کے گانے کے ساتھ اور خوشی اور غمی دونوں موقعوں پر بجایا جاتا ہے۔ یہ رونق بنارس کے یاتریوں کے آنے کی خوشی میں ہو رہی تھی۔

میں سٹیشن کی دائیں جانب ایک بہت اُونچی ٹینکی کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ ایک طرف اندھیرے میں سے نکل کر نندی پالا جو پہلے سے وہاں میرا انتظار کر رہا تھا میرے پاس آ گیا اور کہنے لگا۔

''وہ سامنے تمبو لگا ہوا دیکھ رہے ہو جہاں روشنی ہے؟''

میں نے جواب دیا۔ ''ہاں...... دیکھ رہا ہوں۔''

وہ بولا۔ ''وہاں یاتری ٹھہرے ہوئے ہیں۔ تم بھی اُن کے پاس جا کر ذرا فاصلے پر ہو کر بیٹھ جاؤ۔ اگر کوئی پوچھ بیٹھے تو یہی کہنا کہ تم ایک دن پہلے دھنش کوڑی آ گئے تھے اور اب یاتریوں کے ساتھ ہی شِو جی کے مندر کی یاترا کو جاؤ گے۔ دوسری بات یہ بھی یاد رکھنا کہ میں بھی مندر میں ہوں گا۔ تم بھی یاتریوں کے ساتھ مندر میں ہی ٹھہرو گے۔ ہو سکتا ہے یاتری مندر میں ایک ہفتے تک ٹھہریں۔ اس دوران اگر کسی جگہ میرا تمہارا آمنا سامنا ہو جائے تو آنکھیں چرا کر دوسری طرف ہو جانا۔ خبردار! مجھے بلانے کی حماقت نہ کر بیٹھنا۔ ہاں! اگر مجھے کچھ کہنا ہوا تو میں خود تم سے رابطہ پیدا کر لوں گا۔ اب جاؤ اور میری ساری باتوں کو ذہن میں رکھنا۔''

میں ریلوے سٹیشن کی اُونچی ٹینکی سے اُن روشنیوں کی طرف چل دیا جہاں شہنائی بج رہی تھی اور تمبو لگا ہوا تھا۔ وہاں کافی لوگ موجود تھے۔ اُن میں سر منڈے گیروے کپڑوں والے یاتری بھی تھے جو بنارس سے آئے تھے۔ یہ پندرہ بیس یاتری تھے اور ایک طرف زمین پر بیٹھے تھے۔ عقیدت مند اُن میں کیلے کے پتوں پر رکھی ہوئی مٹھائیاں بانٹ رہے تھے۔ میں بھی اُن کے پیچھے جا کر زمین پر بیٹھ گیا۔ ایک مدراسی عقیدت مند

نے کیلے کے پتوں پر رکھے ہوئے تین بڑے بڑے لڈو مجھے بھی دے دیئے اور م
انہیں کھانے لگا۔ میری عمر کا ہی ایک نوجوان یاتری میرے قریب ہی ذرا پیچھے کی طرف
بیٹھا مٹھائی کھا رہا تھا۔ وہ میرے پاس آ کر بیٹھ گیا اور بنارس والوں کی صاف اُردو زبا
میں پوچھنے لگا۔

''مہاراج! آپ بنارس کے کس محلے سے آئے ہیں؟''

مجھے بنارس کے صرف ایک محلے کا نام یاد تھا۔ میں نے وہی نام لے دیا۔ وہ خوش
کر بولا۔ ''اُس محلے میں تو میری بڑی بہن جی رہتی ہیں۔''

اور پھر وہ مجھے اپنی بڑی بہن جی کے خاوند کے بارے میں بتانے لگا کہ وہ بنا
میں کپڑے کا بہت بڑا بزنس مین ہے اور بنارس کے بڑے بڑے سرکاری افسر اُس
دوست ہیں۔ میرے لئے یہ اچھا اتفاق ہوا تھا کہ بات کرنے کو ایک ساتھی مل گیا تھ
چنانچہ مجھے اُس کی اُکتا دینے والی ساری باتیں توجہ سے سُننی پڑ رہی تھیں۔ اُس نوجو
یاتری نے اپنا نام جے دیو بتایا۔ میں نے اُسے اپنا نام دیوداس بتایا۔ اس وقت میر
ذہن میں یہی ہندوانہ نام آیا تھا۔ اتنی دیر میں وہاں شہنائی کے ساتھ مردنگ بھی زور
سے بجنے لگی۔ مردنگ ایک قسم کی ڈھولک ہوتی ہے جو جنوبی ہند میں بجائی جاتی ہے اور ا
کے بجانے والے بڑے ماہر لوگ ہوتے ہیں۔

یاتریوں کے ساتھ دوسرے لوگ بھی اُٹھ کھڑے ہوئے۔ میں اور جے دیو بھی
بیٹھے۔ دھنش کوڑی کے عقیدت مند، بنارس کے یاتریوں کو جن میں، میں بھی شامل
ایک جلوس کی شکل میں لے کر سیٹھ کیشو راؤ کے شِو جی کے مندر کی طرف چل پڑے۔
آگے آگے دو آدمی شہنائیاں بجا رہے تھے۔ ایک آدمی گلے میں مردنگ ڈالے زور
سے بجا رہا تھا۔ دو آدمی روشن گیس اُٹھائے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ یہ جلوس جب
جی کے مندر پہنچا تو وہاں کے بڑے پجاری نے جس کا نام رنگا پلم تھا اور اُس
ساتھیوں نے بڑی گرمجوشی سے یاتریوں کا سواگت کیا اور اُن پر پھول نچھاور کئے۔
بھی یاتریوں میں شامل تھا اور مندر کے در و دیوار کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ کا
مندر تھا۔ دیواروں پر پتھر کی رنگین مورتیاں لگی تھیں۔ ہمیں مندر کے بڑے کمرے
بٹھا کر کھانا کھلایا گیا۔ اس کے بعد بھجن کیرتن شروع ہو گیا۔ سارے یاتری جو بول

رہے تھے، میں بھی وہی بول ساتھ ساتھ بولتا جا رہا تھا۔ بھجن کیرتن ختم ہوا تو مندر کی
دیوداسیاں شِو جی کی مورتی کے آگے رقص کرنے کے لئے آ گئیں۔

انہوں نے رقص کرنا شروع کر دیا۔ میں نے سب کو غور سے دیکھا۔ اُن میں اُرملا
نہیں تھی۔ وہ ہو بھی نہیں سکتی تھی۔ نندی پالا کے بیان کے مطابق اُسے تو مندر کے تہہ
خانے میں بند کیا گیا تھا۔ میں نے نندی پالا کو بھی دیکھا وہ بڑے پجاری رنگا پلم کے پہلو
میں ہار پہنے بیٹھا تھا۔ اُس نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا مگر ہم ایک دوسرے کے لئے اجنبی
بنے ہوئے تھے۔ بنارس کا نوجوان یاتری جے دیو میرے پاس ہی بیٹھا تھا۔ دیوداسیاں
بھارت نایٹم ڈانس کر رہی تھیں۔ جے دیو نے میرے کان کے قریب ہو کر کہا۔

''مدراس والوں کا یہ ڈانس مجھے اچھا نہیں لگتا۔ اس کے مقابلے میں ہمارے بنارس
کے مندروں میں دیوداسیاں جو ڈانس کرتی ہیں وہ بڑا اچھا ہوتا ہے۔''

میں نے دبی زبان میں اُسے خاموش رہنے کو کہا اور دیوداسیوں کا رقص دیکھنے لگا۔
میری آنکھیں اُن کے رقص کے نرت پر لگی تھیں مگر ذہن کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔ اس
مندر کے تہہ خانے میں میری محبت اُرملا قید تھی جس کو قید سے چھڑا کر لے جانے کا مشن
لے کر میں یاتری کے بھیس میں وہاں آیا تھا۔ یہ بڑا مشکل اور بظاہر ناممکن مشن لگتا تھا۔
لیکن میں نے اس مشن میں کامیاب ہونے کا عزم کر رکھا تھا۔

دیوداسیوں کا رقص ختم ہوا تو تمام یاتریوں کو مندر کے پچھلے صحن میں ساتھ ساتھ بنے
ہوئے کمروں میں پہنچا دیا گیا۔ یہاں اُن کی رہائش کا بندوبست کیا گیا تھا۔ مجھے بھی
ایک کمرہ مل گیا۔ چھوٹا سا کمرہ تھا جس میں ایک چارپائی پر بستر لگا ہوا تھا۔ ایک پانی کا
مٹکا اور مٹی کا کٹورا پڑا تھا۔ کمرے میں صرف ایک روشندان ہی تھا کھڑکی کوئی نہیں تھی۔
چھت پر پنکھا چل رہا تھا۔ میں بستر پر لیٹ گیا۔ اُس وقت رات کے ساڑھے دس بجے کا
وقت تھا۔ مجھے نند پالا کے اشارے کا انتظار تھا۔ اُس نے کہا تھا کہ وہ مجھے خود ہی مل کر بتا
دے گا کہ اُرملا کو مندر کی چھت پر لے گئے ہیں۔ اُسے ہر رات چھت پر ٹہلوانے نہیں
لے جایا جاتا تھا۔ بقول نندی پالا بیچ میں کبھی کبھی دو ایک دن کا وقفہ پڑ جاتا تھا۔

ساری رات مندر میں وقفے وقفے سے بھجن کیرتن ہوتا رہا مگر میں سو گیا۔ صبح ایک
پجاری نے آ کر باری باری سب یاتریوں کو جگا دیا کہ منگل پوجا کا وقت ہو گیا ہے، اُٹھو۔

ابھی دن پوری طرح سے نہیں نکلا تھا۔ ہم سب نے مندر کے تالاب پر اشنان کیا۔ پجاری نے ہمارے ماتھوں پر نئے تلک لگائے۔ ہمارے گلوں میں ہار ڈالے گئے۔ ہم چھوٹی تھالیوں میں پھول لے کر شو جی کی مورتی والے بڑے کمرے میں قطار بنا کر گئے اور بڑے پجاری کے آگے شردھا نجلی پیش کی اور بیٹھ کر بھجن کیرتن کرنے لگے۔ منگل پوجا کا سن کر مجھے یقین ہو گیا کہ آج شو دیوتا کی پتنی پاروتی کا دن ہے اور اسی دن پاروتی کی منگل پوجا ہوتی ہے۔ ممکن ہے آج رات اُرملا کو تہہ خانے سے نکال کر چھت پر ٹہلوانے کے لئے لے جایا جائے۔ میں نے دل میں ترکیبیں سوچنی شروع کر دیں کہ میں اُرملا کے ساتھ آئے ہوئے اُس کے محافظ پر کیسے قابو پا سکتا ہوں؟ میرے پاس کوئی اسلحہ یا چاقو وغیرہ تک نہیں تھا اور اُرملا کے محافظوں کے بارے میں مجھے بتایا گیا تھا کہ وہ بڑے خطرناک قسم کے خونی اور قاتل لوگ ہیں۔ اصل صورت حال موقع پر ہی جا کر واضح ہو سکتی تھی۔

سیٹھ کیشو راؤ کے مندر کے احاطے کے اندر کئی جگہوں پر دیوی دیوتاؤں کی چھوٹی بڑی مورتیاں رکھی تھیں۔ یاتری ہر مورتی کے آگے جا کر اُس پر پھول چڑھاتے اور تھوڑی بہت پوجا کرتے تھے۔ مجھے بھی ایسا کرنا پڑ رہا تھا۔ لیکن میں نے اپنا سر کسی مورتی کے آگے نہیں جھکایا تھا۔ میرا سر صرف اللہ تعالیٰ کے حضور ہی جھکنے کے لئے بنایا گیا تھا۔

دوپہر کو ایک ہال کمرے میں سارے یاتریوں کو کھانا کھلایا گیا۔ میری نگاہیں نندی پالا کو تلاش کر رہی تھیں۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ آج ضرور وہ مجھ سے آ کر ملے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ کھانا کھانے کے بعد سارے یاتری مندر کے احاطے میں پیچھے جو باغیچہ تھا وہاں جا کر بیٹھ گئے اور ایک دوسرے سے باتیں کرنے لگے۔ میں بھی ایک طرف سب سے الگ ہو کر بیٹھ گیا۔ میں جان بوجھ کر ایک چبوترے کی اوٹ میں ہو کر بیٹھا تھا تاکہ اگر نندی پالا وہاں آئے تو وہ دوسروں کی نظروں سے چھپ کر مجھ سے بات کر سکے۔

مجھے وہاں بیٹھے پندرہ بیس منٹ ہی گزرے تھے کہ ایک طرف سے نندی پالا آتا نظر آیا۔ میں جلدی سے چبوترے کے اور پیچھے ہو گیا۔ میرے قریب ہی پودے تھے جن کی شاخوں میں پھول کھلے ہوئے تھے۔ نندی پالا میرے پاس آ کر ان پودوں پر جھک کر پھول توڑ توڑ کر جھولی میں ڈالنے لگا۔ اُس نے دھیمی آواز میں مجھے کہا۔

''آج آدھی رات کو مندر کی چھت پر پہنچ جانا۔''

اتنا کہہ کر وہ جلدی سے آگے نکل گیا۔

میرے لئے اتنا پیغام ہی کافی تھا۔ میرا ذہن تیزی سے کام کرنے لگا۔ میں نے اُسی وقت اپنے ذہن میں آدھی رات والے مشن کی منصوبہ بندی شروع کر دی۔ نندی پالا نے مجھے اپنی کلائی سے گھڑی اُتار کر دے دی تھی۔ میں نے اُس پر نگاہ ڈالی۔ ابھی نصف رات ہونے میں کافی وقت تھا۔ آدھا دن پڑا تھا۔ میں اُٹھ کر اپنے کمرے میں آ کر بستر پر لیٹ گیا۔ پھر سوچا کہ چھت پر جا کر موقع محل تو دیکھنا چاہئے۔ یہ مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ عقبی صحن کے کونے سے چھت کو زینہ جاتا ہے۔ میں اُسی وقت اُٹھا اور کمرے سے نکل کر ٹہلتا ٹہلتا کونے والے زینے کی سیڑھیاں چڑھ کر مندر کی چھت پر آ گیا۔ چھت کافی لمبی چوڑی تھی۔ دونوں جانب اُونچی منڈیریں تھیں۔ میں چھت کی عقبی دیوار کی طرف آ گیا۔ میں نے دیکھا کہ دوسری طرف نیچے سمندر کی موجیں مندر کی پتھریلی دیوار سے ٹکرا رہی تھیں۔ مجھے پہلی بار علم ہوا کہ اس مندر کے پیچھے سمندر ہے۔ سمندر میں جگہ جگہ سیاہ چٹانیں پانی سے باہر نکلی ہوئی تھیں اور یہ سلسلہ دُور تک چلا گیا تھا۔

میں دیر تک اُسی جگہ کھڑا دُور تک پھیلے ہوئے سمندر اور سیاہ چٹانوں کو دیکھتا رہا۔ مجھے ایک سٹیمر دکھائی دیا جو کافی فاصلے پر سے گزر رہا تھا۔ اتنے میں کسی نے پیچھے سے آواز دی۔ ''دیوداس جی! کیا دیکھ رہے ہو؟''

میں نے پلٹ کر دیکھا یہ نوجوان یاتری جے دیو تھا۔ اُس وقت مجھے اُس کا آنا بہت برا لگا۔ وہ میرے پاس آ کر کھڑا ہو گیا اور سمندر پر نگاہ ڈال کر بولا۔

''عجیب سا لگتا ہے کہ ہم اس وقت بھارت ورش کے نیچے اس کی آخری تکون پر کھڑے ہیں۔ جانتے ہو اس سمندر کی دوسری طرف کون سا ملک ہے؟''

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ بولا۔ ''یہاں سے آگے سمندر کے دوسرے کنارے پر سیلون کا ملک آ جاتا ہے جس کو پہلے زمانے میں لنکا کہا جاتا تھا۔ یہ وہی لنکا ہے جس پر رام جی نے چڑھائی کر کے راون کی قید سے سیتا میا کو آزاد کرایا تھا اور ہنومان جی نے ساری لنکا میں آگ لگا دی تھی۔''

خدا جانے وہ کیا کتھا کہانی کہہ رہا تھا۔ میں کچھ بھی نہیں سن رہا تھا۔ میں کچھ اور ہی

سوچ رہا تھا۔ میں نے جے دیو کو اپنے اعتماد میں لینے کے لئے بتایا کہ میں آج رات چھت پر پاورتی جی کی منگل پوجا کروں گا۔ یہ بڑا ضروری تھا اس لئے کہ بالفرض اگر میں اس رات اُرملا کو نکال کر لے جانے میں کامیاب نہیں ہوتا یا اُسے چھت پر لایا ہی نہیں جاتا اور کوئی پجاری مجھے دیکھ لیتا ہے تو میرے لئے یہ جواز پیدا ہو سکے کہ میں چھت پر پاروتی کی منگل پوجا کو گیا تھا اور میں نے اپنے ساتھی جے دیو کو بتا دیا تھا۔

جے دیو بولا۔ ''منگل پوجا تو مجھے بھی چھت پر یا باہر سمندر کے کنارے بیٹھ کر کرلینی چاہئے۔''

میں نے کہا۔ ''تم کل رات سمندر کنارے جا کر پوجا کر لینا۔''

وہ کہنے لگا۔ ''اگر یہ پوجا مندر کی چھت پر کی جائے تو پاروتی جی بڑی جلدی درشن دے دیتی ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''تو پھر تم کسی اور رات یہ رسم پوری کر لینا۔''

وہ بولا۔ ''ہاں...... میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔''

مجھے مندروں کی خاک چھانتے، پجاریوں اور دیوداسیوں میں رہتے اتنی مدت گزر گئی تھی کہ مجھے ہندوؤں کی دیو مالا کا زیادہ حصہ زبانی یاد ہو گیا تھا۔ مجھے تقریباً سبھی دیوی دیوتاؤں کی کہانی معلوم تھی اور ویدوں کے کچھ اشلوک بھی میں نے زبانی یاد کر رکھے تھے۔ اس کا فائدہ یہ تھا کہ دوسرے ہندو یا مندر کے کسی پجاری کو ایک لمحے کے لئے بھی شک نہیں ہوتا تھا کہ میں ہندو نہیں ہوں۔ میں نے جے دیو کو بھی بغیر موقع محل کے اس پر اثر ڈالنے کے لئے ویدوں کے دو تین سنسکرت اشلوک سنا دیئے تھے۔

دن گزر گیا، شام آ گئی۔ مندر میں روشنیاں ہو گئیں۔ گھنٹیاں بجنے لگیں۔ شہنائیوں اور ڈھولک کی گونج میں آرتی اُتاری جانے لگی۔ میں اپنے کمرے میں ہی چارپائی پر بیٹھا رات کو چھت پر جانے کے پروگرام پر مزید غور وفکر کر رہا تھا۔ راتیں چاندنی نہیں تھیں۔ رات کو آسمان پر تارے ہی تارے ہوتے تھے۔ ان کی روشنی عقبی کھلے سمندر میں پڑتی تو سمندر بھی روشن نظر آنے لگتا تھا۔ اگر رات کو آسمان پر بادل ہوتے تو تارے بادلوں میں چھپے ہوتے تھے اور سمندر بھی اندھیرے کی پتلی چادر میں لپٹا ہوا ہوتا تھا۔ مندر کے احاطے میں تو خوب روشنیاں ہوتی تھیں۔ بجلی کے فانوس ساری رات جلتے رہتے تھے۔

اُس رات صورت حال موسم کی یہ تھی کہ آسمان پر بادلوں کے ٹکڑے بڑی سست رفتاری کے ساتھ تیر رہے تھے۔ مجھے ایک ہی فکر تھی کہ اگر یہ بادل جمع ہو کر برسنے لگے تو اس رات اُرملا کو چھت پر نہیں لایا جائے گا۔ لیکن ایسی بات نہ ہوئی۔ حالانکہ جنوب کے علاقے میں بہت بارشیں ہوتی ہیں اور جب پنجاب میں سردیوں کا موسم ہوتا ہے تو مدراس اور جنوبی انڈیا کے علاقوں میں گرمی ہوتی ہے اور بارش ہوتی رہتی ہے۔

نندی پالا نے مجھے بتا دیا تھا کہ اُرملا کو آج آدھی رات کے بعد چھت پر لایا جا رہا ہے اور میں یہ سنہری موقع ہاتھ سے نہیں گنوانا چاہتا تھا۔ میں صرف اس پوائنٹ پر غور کر رہا تھا کہ میرے پاس چاقو تک نہیں ہے اور اُرملا کے ساتھ جو قاتل قسم کا محافظ اور پہرے دار یا گارڈ آئے گا وہ بقول نندی پالا کے سٹین گن یا ریوالور سے مسلح ہو گا۔ میں اُسے کیسے قابو کر سکوں گا؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ جنوبی اور وسطی ہند کے جنگلوں میں آوارہ گردیوں کے دوران مجھے بڑے بڑے خونی قاتلوں اور ڈاکوؤں سے پالا پڑ چکا تھا اور میرے اندر کسی تربیت یافتہ کمانڈو کی آدھی مہارت ضرور پیدا ہو گئی تھی اور مجھے دشمن کو اچانک قابو کرنے کے داؤ پیچ آ گئے تھے لیکن پھر بھی میں کوئی باقاعدہ تربیت یافتہ فوجی یا کمانڈو نہیں تھا۔ میری ذرا سی غلطی یا بھول مجھے دشمن کے ہاتھوں موت کی نیند سلا سکتی تھی۔ میں نے صرف اتنا ہی کیا اور یہی میں کر سکتا تھا کہ کسی ذریعے سے تانبے کی ایک باریک تار میں نے حاصل کر لی اور اپنے لمبے چولے کی جیب میں اُس کا چھلا بنا کر رکھ لیا۔ یہ بڑا کارگر ہتھیار تھا لیکن اس کے لئے کسی ماہر کمانڈو کی پھرتی کی ضرورت تھی جو میرے اندر ابھی پیدا نہیں ہوئی تھی۔

لیکن مجھے یقین تھا کہ میں اپنے مشن میں ضرور کامیاب ہو جاؤں گا۔ میرے اندر یہ ناقابل شکست عزم صرف اُرملا کی محبت نے پیدا کیا تھا۔ واقعی محبت بہت بڑی طاقت ہوتی ہے۔ اگر ایک بار یہ انسان کے دل میں پیدا ہو جائے تو پھر اسے برائی کی بڑی سے بڑی طاقت بھی شکست نہیں دے سکتی۔ مصیبت یہ ہے کہ یہ محبت جنگل کے خودرو پودے کی طرح اپنے آپ پیدا ہوتی ہے۔ اسے اپنی مرضی سے پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ عام طور پر انسان کے دل میں خصوصاً مخالف جنس کے لئے ہوس پیدا ہوتی ہے جس کو وہ محبت سمجھ بیٹھتا ہے اور ہوس بڑی جلدی ختم ہو جاتی ہے۔ جبکہ از خود پیدا ہونے والی محبت ایک بار

انسان کے دل میں پیدا ہو جائے تو وہ کبھی فنا نہیں ہوتی۔ میں یہ بات پورے اعتماد سے
اس لئے کہہ رہا ہوں کہ میں اس تجربے سے گزر چکا ہوں اور اس وقت گزر رہا تھا۔ اُرملا
سے مجھے جو محبت تھی وہ میں نے خود پیدا نہیں کی تھی بلکہ یہ از خود میرے دل میں پیدا ہو
گئی تھی۔ محبت کا یہ آئینہ بالکل شفاف تھا اور اس پر ہوس کا ہلکا سا سایہ بھی نہیں پڑ سکا تھا
اس پاکیزہ محبت نے میرے اندر فولادی طاقت پیدا کر دی تھی۔ اب میں اپنی کسی غلطی کی
وجہ سے ہی اپنے مشن میں ناکام ہو سکتا تھا۔ اس ناکامی کا الزام میں اپنے جذبہ محبت کی
فولادی طاقت پر نہیں لگا سکتا تھا۔

آدھی رات سے کچھ وقت پہلے ہی میں کمرے سے نکل آیا۔ مندر کی عمارت کی
طرف خوب روشنیاں تھیں اور بھجن کیرتن کی دھیمی دھیمی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔
میں سر جھکائے آہستہ آہستہ چلتا چھت کے زینے کے پاس آیا۔ وہاں ہلکا اندھیرا تھا۔
میں نے گردن موڑ کر پیچھے ایک نظر ڈالی، وہاں اس وقت کوئی یاتری یا مندر کا پجاری
نہیں تھا۔ میں سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر آ گیا۔ سمندر کی طرف سے مرطوب ہوا آ رہی
تھی۔ سمندر کی جو لہریں نیچے مندر کی چٹانی دیوار سے ٹکرا ٹکرا کر واپس جاتی تھیں اُن کا
ہلکا ہلکا شور بھی سنائی دے رہا تھا۔ چھت پر بیٹھنے کی ایک خاص جگہ کا انتخاب میں نے دن
کے وقت ہی کر لیا تھا۔ چنانچہ میں اس جگہ منڈیر کے ساتھ چھت کے فرش پر آلتی پالتی مار
کر بیٹھ گیا۔ آسمان پر بدستور بادلوں کے ٹکڑے تیر رہے تھے۔ کبھی ستارے بادلوں کی
اوٹ میں آ جاتے اور کبھی بادلوں کے غلاف سے نکل کر چمکنے لگتے۔ ان کی روشنی بڑی
دُھندلی دُھندلی تھی۔ لیکن اس دُھندلی روشنی میں چھت کے زینے کا دروازہ برابر نظر آ
رہا تھا۔

نندی پالا کی گھڑی میری کلائی پر بندھی ہوئی تھی۔ کسی کسی وقت میں گھڑی کے قریب
آنکھیں لے جا کر اس کی سوئیوں کو دیکھ لیتا تھا۔ ابھی رات کے بارہ نہیں بجے تھے۔
مجھے پاروتی دیوی کی کوئی پوجا وجا نہیں کرنی تھی۔ مجھے تو صرف اور صرف اپنی اُرملا کا
انتظار کرنا تھا۔ میں اپنے ذہن میں یہ نقشہ بنانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اُرملا کے ساتھ جو
گارڈ آئے گا وہ کہاں کہاں کھڑا ہو سکتا ہے اور کہاں اور کس جگہ پر بیٹھ سکتا ہے؟ نندی
پالا نے کہا تھا کہ گارڈ کو چونکہ اطمینان ہوتا ہے کہ وہاں کوئی نہیں آ سکتا اس لئے وہ قدرتی

طور پر اُرملا کی طرف سے تھوڑا سا غافل ہو سکتا ہے اور کسی جگہ بیٹھ کر اونگھ بھی سکتا ہے۔
لیکن میں اپنے مشن کے آسان پہلوؤں کو چھوڑ کر اس کے مشکل پہلوؤں کے لئے اپنے
آپ کو تیار کر رہا تھا۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ میں چھت پر ٹہلتے اور چلتے پھرتے مسلح محافظ
کو کس طرح قابو کر سکتا ہوں؟

مجھے نندی پالا نے زور دے کر خبردار کیا تھا کہ میں اُرملا کے محافظ پر حملہ کر کے اسے
قابو کرنے کی غلطی نہ کروں بلکہ انتظار کروں۔ اور اگر محافظ اتفاق سے چھت پر کسی جگہ
بیٹھ کر اونگھنے لگے اور اُرملا سے غافل ہو جائے تو میں چھت پر ٹہلتی اُرملا کو مل کر اُسے اپنے
پاس ہی بٹھا لوں اور جتنی جلدی ہو سکے سرگوشیوں میں اُس سے خفیہ تہہ خانے کے
حالات پوچھوں اور اُس سے معلوم کرنے کی کوشش کروں کہ کیا کوئی ایسی صورت ہو سکتی
ہے کہ وہ کسی وقت اکیلی تہہ خانے سے کسی جگہ باہر آ سکے؟ کیونکہ جب وہ اکیلی تہہ خانے
سے باہر آئے گی تو پھر اُسے وہاں سے اپنے ساتھ بھگا کر لے جایا جا سکتا ہے۔ مسلح گارڈ
کے ہوتے ہوئے گارڈ پر حملہ کرنا یا اُرملا کو وہاں سے نکال لے جانے کی کوشش خودکشی
کے برابر ہو گی، خاص طور پر جب میں نہتا ہوں گا۔

میں نے نندی پالا کی اس نصیحت کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی اور اُسی رات کو مسلح محافظ کو
قابو کر کے بلکہ اُسے ہلاک کر کے اُرملا کو نکال لے جانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ میں یہ سنہری
موقع نہیں گنوانا چاہتا تھا۔ ہو سکتا تھا کہ اس کے بعد مجھے اتنا موقع بھی نہ مل سکے۔ مجھے
چھت پر آلتی پالتی مار کر بیٹھے کافی دیر ہو گئی۔ اُرملا کو لے کر محافظ ابھی تک چھت پر نہیں
آیا تھا۔

میں نے گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ رات کا ایک بجنے میں پندرہ منٹ رہ گئے تھے۔ اتنے
میں کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ کوئی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔ میں چوکس ہو کر بیٹھ
گیا۔ میں چھت کے جس کونے میں بیٹھا تھا وہاں اندھیرا تھا۔ میری آنکھیں چھت کے
دروازے پر لگی تھیں۔ دروازے میں ایک آدمی نمودار ہوا۔ اُس نے دروازے میں ہی
کھڑے کھڑے چاروں طرف نگاہ ڈالی اور پیچھے دیکھ کر کچھ کہا اور خود چھت پر آ کر چھت
کے دروازے کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو گیا۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ اُس کے ایک ہاتھ
میں سٹین گن تھی۔ رات کے اندھیرے اور ستاروں کی دُھندلی روشنی میں وہ آدمی جو یقیناً

اُرملا کا گارڈ تھا پوری طرح سے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد چھت کے
دروازے میں ایک عورت کا ہیولہ نمودار ہوا۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ میں نے
دل سے کہا۔ ''خبردار! یہ ہوش و حواس قائم رکھنے کا وقت ہے۔''

دروازے میں نمودار ہونے والا ہیولہ اُرملا کا تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ میں اُسے
پہچان لیتا؟ میں تو اُرملا کو رات کی تاریکیوں میں بھی پہچان سکتا تھا۔ وہ سر جھکائے ہوئے
تھی۔ گارڈ نے ایک بار پھر اُسے کچھ کہا جو میری سمجھ میں نہ آ سکا۔ ابھی تک گارڈ کی مجھ پر
نظر نہیں پڑی تھی۔ اُس نے اُرملا کو اپنے ساتھ لیا اور چھت پر ٹہلنے کے لئے ابھی دو قدم
ہی اُٹھائے تھے کہ اُس نے مجھے دیکھ لیا۔ اُس کے قدم وہیں رُک گئے اور سٹین گن کا رُخ
میری طرف ہو گیا۔ میں اطمینان سے آلتی پالتی مارے دونوں ہاتھ گھٹنوں پر رکھے بیٹھا
رہا۔ گارڈ نے اُرملا کو وہیں رُکنے کے لئے کہا اور سٹین گن تانے آہستہ آہستہ میرے پاس
آ گیا۔ اُس نے تامل زبان میں مجھ سے کچھ کہا۔

میں خاموش آنکھیں آدھی بند کئے بیٹھا رہا۔ اُس نے ہندی اُردو میں پوچھا۔

''کون ہو تم؟ یہاں کیوں بیٹھے ہو؟''

میں نے آنکھیں کھول کر اُس کی طرف دیکھا اور خاص ہندو جوگیوں والے لہجے میں
کہا۔ ''اوم! اوم نم شِوا اوم ہری اوم! بچہ ہم بنارس سے شِو جی مہاراج کے مندر کی یاترا پر
آئے ہیں اور چھت پر بیٹھ کر پاروتی ماتا جی کی منگل پوجا کر رہے ہیں۔''

گارڈ ایک لمحے کے لئے ٹھٹک سا گیا۔ پھر ذرا نرم لہجے میں کہنے لگا۔

''یاتری مہاراج! منگل پوجا آپ نیچے مندر میں جا کر کریں۔''

میں نے اپنی آواز میں جوگیوں سادھوؤں والا جلال پیدا کرتے ہوئے کہا۔

''بچہ! تم کیسے ہندو ہو کہ تمہیں یہ بھی نہیں پتہ کہ پاروتی جی کی منگل پوجا آدھی رات
کو شِو جی کے مندر کی چھت پر بیٹھ کر کی جاتی ہے۔ ہماری منگل پوجا کو بھنگ نہ کرو۔
ہم نے تمہیں شراپ (بددُعا) دے دی تو یہیں بھسم ہو جاؤ گے۔''

وہ ڈر گیا۔ میں نے یہ دیکھا ہے اور اسے میں اکثر اپنے ایڈونچرز کی داستانوں میں
بیان کر چکا ہوں کہ ہندو خواہ کتنا ہی پڑھا لکھا کیوں نہ ہو، خواہ کسی یونیورسٹی کا پروفیسر
کیوں نہ ہو وہ جوگی اور سادھو کے شراپ یعنی اُس کی بددُعا سے بے حد گھبرا جاتا

فوراً اُس کے پاؤں پکڑ لیتا ہے کہ بھگوان کے لئے مجھے شراپ نہ دیں۔ مجھے معاف کر
دیں۔ ہندو عورتیں تو جوگی سادھو کی زبان سے شراپ کا لفظ سن کر لرز اُٹھتی ہیں اور اُس
کی ہر اچھی بری مرضی کے آگے ہاتھ جوڑ کر سر جھکا دیتی ہیں۔ یہ تو ہم پرستی اور جہالت
کی انتہا ہے۔ مسلمان ان باتوں کو بالکل نہیں مانتے بلکہ وہ ان باتوں کا مذاق اُڑاتے
ہیں اور مذاق اُڑانا بھی چاہئے۔ اس دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے وہ اللہ کی رضا اور اس کے
بنائے ہوئے اٹل اصولوں اور ضابطوں کی روشنی میں وقوع پذیر ہوتا ہے۔ کوئی فانی
انسان خدا کے بنائے ہوئے ضابطوں میں دخل نہیں دے سکتا۔ مجھے ایک مسلمان بزرگ
کی بات اس وقت یاد آ رہی ہے۔ یہ بزرگ مجھے بھوپال کے ایک گاؤں کی مسجد میں ملے
تھے۔ اُنہوں نے مجھے کہا تھا۔

''میرے عزیز! اللہ تعالیٰ نے انسانی معاشرے میں امن اور سلامتی کو قائم رکھنے کے
لئے ہمیں جو سیدھا راستہ دکھایا ہے اور جس پر عمل کر کے سرکارِ دو عالم نبی آخر الزماں صلی
اللہ علیہ وسلم نے ہمارے لئے ایک مثال بنا دی ہے ہمارا فرض ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ
وسلم کی سنت پاک پر چل کر انسانی معاشرے کے امن اور اپنی سلامتی کو قائم رکھیں اور دنیا
اور آخرت دونوں جہانوں میں فلاح پائیں۔ انسان جب اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے
ضابطہ حیات سے ہٹ جاتا ہے تو اس کی قسمت میں سوائے بربادی کے اور کچھ باقی نہیں
رہتا۔ اسی ضابطہ حیات کے اصولوں پر قدرت کا نظام چل رہا ہے۔ سیارے اسی اصول
کے تحت بے کراں خلاؤں میں ایک دوسرے کے گرد گردش کر رہے ہیں۔ اگر کوئی چھوٹا یا
بڑا سیارہ اس ضابطے کے نظام سے بغاوت کرتا ہے اور دائرہ کشش کے اصول کا دامن
چھوڑ دیتا ہے تو وہ خلا کی وسعتوں میں جل کر راکھ ہو جاتا ہے۔ ہماری سوسائٹی کا نظام
بھی انہی اصولوں اور ضابطہ اخلاق پر چل رہا ہے۔ جو چیز اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے
اصولوں کا ساتھ دے رہی ہے وہ ہمارے لئے حلال ہے۔ جو ان اصولوں کے خلاف
جاتی ہے وہ ہمارے لئے حرام قرار دے دی گئی ہے۔ تمہارے لئے تمہاری بیوی ہی
حلال ہے کسی دوسری عورت پر بری نگاہ ڈالنا حرام شے کھانے کے مترادف ہے اور حرام
شے ہمارے جسم میں اور ہماری نفسیات میں داخل ہو کر کس قسم کا زہر پھیلاتی ہے اور ہمیں
کیسی تباہی کے گڑھے میں گرا دیتی ہے اس کا بہت کم لوگوں کو اندازہ ہے۔ حرام شے

کے زہر کے اثرات صرف ایک نسل تک نہیں رہتے بلکہ وہ نسل درنسل آنے والی نسلوں تک چلتے ہیں۔ بس میرے عزیز! اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں ہمارے لئے حرام کر دی ہیں ان کے قریب بھی نہ جانا۔ ان کا کبھی ذہن میں خیال تک بھی نہ لانا۔ ہمیشہ رزق حلال کما کر رُوکھی سوکھی کھالینا۔ رزق حلال کی رُوکھی سوکھی روٹی تمہارے ضمیر کو روشن کر دے گی۔ تمہیں وہ سکھ، وہ صحت، وہ خوشی اور وہ رُوحانی طاقت عطا کرے گی جو تمہاری آنے والی نسلوں کو بھی روشن ضمیر، خوبصورت، صحت مند اور نورِ رُوحانی سے منور کر دے گی۔ یاد رکھو! تمہاری بیوی تمہارا رزق حلال ہے۔ غیر عورت تمہارے لئے رزق حرام ہے۔ کبھی کسی عورت پر بری نظر نہ ڈالنا۔ اپنی نگاہ کو پاک رکھنا۔ پھر انشاء اللہ تم دنیا میں بھی سرخرو ہو گے اور خدا کے دربار میں بھی سرخرو ہو گے۔''

معذرت چاہوں گا کہ میں اصل کہانی سے کچھ دیر کے لئے ہٹ گیا ہوں۔ بات یہ ہے کہ جب اس قسم کے موضوع پر بات شروع ہو جاتی ہے تو میرا دل بے اختیار چاہنے لگتا ہے کہ میں پاکستان کی نوجوان نسل سے خاص طور پر کچھ باتیں کروں۔ وہ باتیں اُن تک پہنچاؤں جو اچھی ہیں۔ جو میں نے اپنے بزرگوں سے سنی تھیں اور میرا فرض بن جاتا ہے کہ میں یہ اچھی باتیں پاکستان کے نوجوانوں تک پہنچاؤں تاکہ وہ اپنی جوانی کو برے خیالات، بری سوسائٹی اور برے گناہ آلود خیالات کی آلائشوں سے بچا کر رکھیں اور ہمیشہ سب سے بڑھ کر بلند کردار، باعمل، باہمت اور سب سے زیادہ فولادی عزم و ہمت والے انسان بن کر رہیں۔ میں نوجوانوں کو کوئی نصیحت نہیں کر رہا بلکہ میں جو حقیقت ہے وہ بیان کر رہا ہوں اس لئے کہ مجھے ان باتوں کا ذاتی تجربہ ہے اور میں ان حقیقتوں میں سے گزر چکا ہوں۔ اللہ کے نزدیک کوئی چھوٹا بڑا، کوئی غریب امیر نہیں ہے۔ اگر ایک کروڑ پتی کوئی نیک کام کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُسے اُس کا ہزار گنا اجر عطا کرتا ہے اور اگر کسی بازار میں بیٹھ کر جوتیاں مرمت کرنے والا کوئی نیک عمل کرتا ہے تو اُسے بھی اپنی نیکی کا بدلہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہزار گنا اجر کی صورت میں ملتا ہے۔ ایک نیک عمل ہوتا ہے، ایک نیک خیال ہوتا ہے۔ ہمیں چاہئے کہ نیک عمل کرتے رہیں اور اپنے ذہن میں ہمیشہ نیک خیال رکھیں۔ برے خیال نہ آنے دیں۔ کسی کے بارے میں برا نہ سوچیں۔ کسی کے بارے میں بلاسوچے سمجھے بدگمانی نہ کریں۔ اسی میں رُوح کی بچی

خوشی ہے۔

اب میں اپنی اصل کہانی کی طرف آتا ہوں۔

جب میں نے اُرملا کے محافظ سے کہا کہ اگر اُس نے مجھے وہاں سے اُٹھایا یا کوئی ایسی ویسی بات کی تو میں اُسے شراپ یعنی بد دُعا دُوں گا تو وہ بہت ڈرا۔ اسی لمحے اُس کا لہجہ بدل گیا۔ اُس نے سٹین گن کی نالی اُوپر اُٹھالی اور عاجزی سے بولا۔

''نہیں نہیں مہاراج! آپ بے شک یہاں بیٹھ کر پاروتی جی کی منگل پوجا کریں۔ میں دوبارہ اس طرف نہیں آؤں گا۔'' اور وہ فوراً وہاں سے چلا گیا۔ میرا تیر ٹھیک نشانے پر ہی نہیں بیٹھا تھا بلکہ اُس نے میرا راستہ صاف کر دیا تھا۔ اب میں اُس چھٹے ہوئے بدمعاش اور اُرملا کے محافظ کو بڑی آسانی کے ساتھ راستے سے ہٹا سکتا تھا۔ اس دوران اُرملا دُور کھڑی رہی تھی اور منڈیر کے ساتھ لگ کر سمندر کی طرف دیکھتی رہی تھی۔ اُس نے ہماری طرف کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ میں اُس کی طرف مسلسل دیکھ رہا تھا۔ اب میں چاہتا تھا کہ گارڈ ایک طرف ہو کر بیٹھ جائے اور بے فکر ہو کر آنکھیں بند کر کے اونگھنے لگے تو میں اُرملا کے پاس جا کر اُس سے کوئی بات کروں۔ لیکن اُس نے اُرملا کو اپنے ساتھ لیا اور اُس کے ساتھ چھت پر ٹہلنے لگا۔ اُرملا اُس کے پیچھے تھی اور وہ اُس کے آگے آگے چل رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ ٹہلنے کے انداز میں چل رہے تھے۔

اُس گارڈ کو میں نے پاروتی کی منگل پوجا اور شراپ دینے کا رُعب ڈال کر کسی حد تک اپنا مطیع تو کر لیا تھا مگر اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں تھا کہ وہ آسانی سے اُرملا کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دے گا اور میں اسے ساتھ لے کر وہاں سے بھاگ جاؤں گا۔ نندی پالا کے کہنے کے مطابق خفیہ تہہ خانے کے پہرے دار اور کارکن سارے کے سارے نہ صرف یہ کہ خونی اور قاتل قسم کے آدمی تھے بلکہ بڈھے سیٹھ کیشو راؤ پر اپنی جان تک قربان کرنے کو تیار رہتے تھے۔ اگر میں نے اُس گارڈ کے جاگتے ہوئے اُرملا کو لے جانے کی کوشش کی تو وہ بھرپور مزاحمت کرے گا اور مجھ پر فائرنگ بھی کر سکتا تھا۔ اس کا کوئی اعتبار نہیں تھا۔ معاملہ ایک دم بگڑ سکتا تھا۔ فائرنگ کی آواز سے سارے مندر میں سنسنی پھیل جانے کی صورت میں لوگ اُوپر بھی آ سکتے تھے اور بڑی آسانی سے مجھے قابو کیا جا سکتا تھا۔

مجھے ہر حالت میں اُس کے غافل ہونے کا انتظار کرنا تھا تاکہ وہ ذرا غافل ہو
چھت پر کسی جگہ بیٹھ کر سو جائے تو میں اُس پر حملہ کر کے اُسے ہلاک کر ڈالوں۔ تانبے
باریک مگر مضبوط تار میرے لمبے سادھوؤں والے چولے کی جیب میں تھی۔ مگر وہ کمبخت
برابر اُرملا کو ساتھ لئے ٹہل رہا تھا اور اُسے بھی ٹہلوا رہا تھا۔ ایک تو چھت کافی لمبی چوڑی
تھی دوسرے گارڈ سٹین گن ہاتھ میں لئے مجھ سے دُور دُور رہ کر اُرملا کو سیر کرا رہا تھا
میں نے ایک سیکنڈ میں اُرملا کو پہچان لیا تھا۔ مگر اُس نے ابھی تک میری طرف نہیں دیکھا
تھا۔ وہ یہی سمجھی تھی کہ میں کوئی جوگی وغیرہ ہوں اور چھت پر گیان دھیان میں بیٹھا
ہوں۔ شاید گارڈ یعنی محافظ نے بھی اُسے یہی بتا دیا تھا۔ اور اگر اُرملا مجھے دیکھ بھی لیتی
شاید مجھے آسانی سے نہیں پہچان سکتی تھی۔ ایک تو چھت پر اندھیرا تھا، دوسرے میرا سر
آنکھوں کے ابرو اور مونچھیں تک منڈی ہوئی تھیں۔ اس حلیے میں وہ ایک نظر میں مجھے
نہیں پہچان سکتی تھی۔

وقت ہاتھ سے نکلا جا رہا تھا۔ اگر گارڈ اُرملا کو چھت کی سیر کروا کر اُسے واپس لے
جاتا ہے تو پھر پتہ نہیں مجھے کب تک اس کے اُرملا کو دوسری بار لے کر آنے کا انتظار کر
پڑ سکتا تھا۔ طرح طرح کی ترکیبیں میرے ذہن میں آ رہی تھیں مگر کوئی ترکیب مجھے ا
زیادہ کارآمد نہیں لگ رہی تھی۔ دوسری بات شاید یہ تھی کہ اُرملا کا محافظ چھت پر ایک
اجنبی جوگی کو دیکھ کر اپنے آپ کو وہاں زیادہ محفوظ محسوس نہیں کر رہا تھا چنانچہ کوئی آد
گھنٹے بعد ہی اُس نے اُرملا سے کہا۔

''چلو...... واپس چلو! بہت سیر کر لی۔''

میرے جسم میں بجلی کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ مجھے لگا جیسے اُرملا ہمیشہ کے لئے مجھ
جدا ہو رہی ہے۔ مجھے جو کچھ بھی کرنا تھا اسی وقت کر لینا چاہئے تھا۔ مجھے اور تو کچھ نہ
میں نے محافظ کو آواز دے دی۔

''بچہ! ادھر آؤ میرے پاس۔ ہم تمہیں آشیرباد دینا چاہتے ہیں۔''

گارڈ نے یہ سنا تو اُرملا کو وہیں ٹھہرا کر میری طرف بڑھا۔ میں نے رُعب دار آ
میں کہا۔ ''اُس لڑکی کو بھی میرے پاس لے آؤ۔''

اندھیرے میں مجھے اُرملا کا دُھندلا سا خاکہ ہی نظر آ رہا تھا۔ مگر میں نے دیکھا

میرے دوسری بار آواز دینے پر اُرملا نے گردن موڑ کر میری طرف دیکھا تھا۔ گارڈ نے
اُرملا کا بازو پکڑا اور اُسے بھی میرے پاس لے آیا۔ خود ہاتھ باندھ لئے اور اُرملا سے کہا۔

''تم بھی گورو جی کو پرنام کرو!''

اُرملا اُس وقت مجھ سے بمشکل تین فٹ کے فاصلے پر کھڑی تھی۔ میں بھی اُسے دیکھ
سکتا تھا اور وہ بھی مجھے دیکھ رہی تھی۔ اُس کے بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ چہرے
پر بڑی اُداسی تھی لیکن اُس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک آ گئی ہوئی تھی۔ صاف لگ رہا
تھا کہ اُس نے مجھے پہچان لیا ہے۔ ہوشیار اور پڑھی لکھی لڑکی تھی، فوراً سمجھ گئی کہ میں اُس
کی مدد کو آن پہنچا ہوں اور یہ سارا ڈرامہ صرف اُسے وہاں سے نکال لے جانے کے لئے
کر رہا ہوں۔

میں نے ایک ہاتھ اُوپر اُٹھا کر گارڈ سے کہا۔ ''بیٹھ جاؤ!''

وہ میرے سامنے ہاتھ باندھ کر بیٹھ گیا۔ سٹین گن اُس نے کندھے پر ڈال رکھی تھی۔
میں نے اُرملا کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''کنیا! تم بھی بیٹھ جاؤ۔''

اُرملا بھی ہاتھ باندھ کر میرے سامنے بیٹھ گئی۔ اتنی مدت بعد اپنی گم شدہ محبت کو
اچانک اپنے سامنے بیٹھے دیکھ کر میرے دل کی عجیب حالت ہو رہی تھی۔ جذبات میں
ایک طوفان سا برپا تھا۔ حلق بار بار خشک ہو رہا تھا۔ دل معمول سے زیادہ دھڑکنے لگا تھا
لیکن میں نے بڑی جلدی اپنے اُوپر قابو پایا۔ اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ اس لئے کہ اُس
وقت میری ذرا سی غلطی اب تک کے سارے کئے کرائے پر پانی پھیر سکتی تھی۔ ایک بات
طے تھی کہ میں اُس رات کو اُرملا کو اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتا تھا۔ گارڈ پوری طرح سے
ہوشیار تھا۔ میری ذرا سی حرکت پر شبہ پڑ جانے سے وہ میری طرف سنگین تان سکتا تھا اور
جتنی دیر میں، میں جیب سے اپنا معمولی سا ہتھیار یعنی تانبے کا تار نکالتا وہ فائر کر کے
مجھے ختم کر سکتا تھا۔ اُس کو تو وہاں کوئی پوچھنے والا بھی نہیں تھا۔

میرے دماغ میں اسی لمحے ایک دوسری سکیم آ گئی۔ اس توہم پرست ہندو گارڈ کو مجھ
سے جو عقیدت ہو گئی تھی یا میں نے اُس کے نیم وحشی دماغ میں اپنے جوگی ہونے کا جو اثر
ڈال دیا تھا اب مجھے اس سے فائدہ اُٹھانا تھا۔ میں نے گارڈ سے مخاطب ہو کر کہا۔

''بچہ! میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے بھاگیہ (قسمت) کے گرہ (ستارے) کو راہو

اور کیتو دونوں منحوس ستاروں نے گھیر رکھا ہے اور بہت جلد تم پر ایک بھاری مصیبت آ
والی ہے۔''

اس قسم کی باتیں کرنی مجھے بہت آ گئی ہوئی تھیں۔ وہ تو گھبرا گیا۔ بڑی عاجزی
ساتھ بولا۔''مہاراج! آپ دلوں کا بھید جانتے ہیں مجھ پر کرپا کریں۔ مجھے آنے وا
مصیبت سے بچالیں۔ میں پہلے ہی مصیبتوں میں پھنسا ہوا ہوں۔''

میں نے باقاعدہ ڈرامہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ میں نے ایک بازو اُٹھا کر آنکھیں
کر کے ذرا بلند آواز میں پڑھا۔

''اوم! برہم ے ام جگتے۔''

یہ اشلوک میں نے یونہی نہیں بول دیا تھا۔ یہ مہاتما بدھ کے زمانے کا ایک قد
ویدک اشلوک ہے اور سنسکرت میں ہے۔ اسے میں نے انگریزی مصنف سر آرنلڈ
انگریزی کتاب ''دی لائٹ آف ایشیا'' میں ایک جگہ پڑھا تھا اور اس کا مطلب ہے
جگت یعنی جگ یعنی دنیا برہما دیوتا کا مظہر یا پیداوار ہے۔ جو سچ تو نہیں ہے بلکہ جھو
ہے۔ مگر میں نے اسے اسی طرح لکھا ہوا پڑھا تھا اور ہندو برہمن برہما دیوتا کی پو
کرتے ہوئے اس اشلوک کو اسی طرح دُہرایا کرتے ہیں۔ اس نیم وحشی جاہل اور تو
پرست ہندو نے تو میرے پاؤں پکڑ لئے اور بولا۔

''مہاراج! بھگوان کے لئے میرے لئے کچھ کریں۔ آپ جو کہیں گے میں کروں گا۔''

اور اُس نے اپنی جیب میں سے چاندی کے چھ سات روپے نکال کر میرے قدمو
کے پاس رکھ دیئے۔ اس وقت اُرملا میری اداکاری پر دل ہی دل میں ضرور حیران ہ
رہی ہو گی۔ میں نے اپنے ایک پاؤں سے اُس کے روپے پرے ہٹا دیئے اور پہلے
زیادہ جلالی آواز میں کہا۔

''ہم جوگی لوگ ہیں۔ دنیا کی دولت کو ہم ٹھوکر مارتے ہیں۔ یہ روپے ہمار
سامنے سے اُٹھا لو۔''

اُس نے جلدی سے روپے اُٹھا کر جیب میں رکھ لئے اور ہاتھ باندھ کر بولا۔

''شما کر دیں مہاراج! مجھ سے بھول ہو گئی۔ مجھے حکم کریں میں آپ کی خاطر کیا ک
سکتا ہوں کہ میرے بھاگیہ کے گرہ راہو اور کیتو سے مکتی پالیں۔''

میرے ذہن میں پہلے سے ایک سوچی سمجھی سکیم آ چکی تھی۔ میں نے کہا۔

''پاروتی دیوی کو تمہاری حالت پر ترس آ گیا ہے۔ اُس نے مجھے کہہ دیا ہے کہ اس
مورکھ انسان کی مدد کرو۔''

وہ بڑا خوش ہوا اور بولا۔''مہاراج! میں آپ کا سیوک ہوں۔ جو حکم کریں گے
مانوں گا۔''

میں نے اُسے حکم دینے کے لہجے میں کہا۔''کل پاروتی جی نے آدھی رات کو کیلاش
پربت کے کنڈ میں اشنان کیا تھا۔ کل کی رات بڑی سو بھاگیہ وتی رات ہے۔ کل اسی
رات تم گیندے کے سات پھول اور لوبان لے کر اسی جگہ آ جانا۔ ہم تم سے پاروتی جی
کی پوجا کروائیں گے۔ تم یہ گیندے کے پھول اپنے ہاتھوں سے پاروتی جی کے چرنوں
میں ارپن کرو گے۔ پھر ہم تمہارے لئے پرارتھنا کریں گے اور تمہارے آنے والے
سارے کشٹ دُور ہو جائیں گے۔ جاؤ...... اب ہمیں منگل پوجا کرنے دو۔ جاؤ!''

میں نے اُسے ڈانٹ کر کہا۔ وہ جلدی سے اُٹھ کر کھڑا ہوا۔ اُرملا بھی اُس کے ساتھ
اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ جب وہ جانے لگا تو میں نے جلالی آواز میں اُسے حکم دیا۔

''اس عورت کو بھی اپنے ساتھ لانا۔ پاروتی جی نے اس کنیا کو بھی پسند کر لیا ہے۔ ہم
اس عورت سے بھی پاروتی جی کے آگے تمہاری سفارش کروائیں گے۔ اور سنو! اس بات
کی خبر کسی کو نہ ہونے پائے۔ اگر کسی کو خبر ہو گئی تو تمہیں پاروتی جی اور شو جی مہاراج
دونوں کا شراپ لگے گا۔''

وہ ہاتھ باندھ کر سر جھکا کر بولا۔''مہاراج! میں کسی کو نہیں بتاؤں گا۔ میں کل اس
عورت کے ساتھ آپ کے چرنوں میں حاضر ہو جاؤں گا۔''

اور وہ اُرملا کو ساتھ لے کر مجھے جھک کر پرنام کر کے چلا گیا۔ میں اُسے اور اُرملا کو
اُس وقت تک دیکھتا رہا جب تک کہ وہ چھت کی سیڑھیوں میں نہ اُتر گئے۔ اُن کے
جانے کے بعد میں نے اطمینان کا گہرا سانس لیا اور اپنا منڈا ہوا سر کھجلانے لگا۔ میرے
منڈے ہوئے سر میں بڑی دیر سے کھجلی ہو رہی تھی مگر میں اُسے کھجلا نہیں رہا تھا کہ اس کا
میرے عقیدت مند اور اُرملا کے گارڈ پر برا اثر پڑ سکتا تھا۔ میں تو ہم پرست ہندوؤں کے
جاہلانہ توہمات کو اچھی طرح جانتا تھا۔ کچھ دیر میں وہیں بیٹھا رہا، پھر اُٹھا اور آہستہ آہستہ

چل کر چھت کی سیڑھیاں اُترنے کے بعد بڑے ناپ تول کر جوگی سادھوؤں والی چال چلتا اپنے کمرے میں آ کر دھڑام سے اپنی چارپائی پر گر گیا اور خدا کا شکر ادا کیا کہ نہ صرف میری سوچی ہوئی سکیم صحیح سمت کو چل پڑی تھی بلکہ یہ کہ میں نے اپنے ڈرامے کی اداکاری بھی بڑی کامیابی سے کی تھی۔

دوسرے روز دوپہر کا کھانا میں نے یاتریوں کے ساتھ مل کر کھایا۔ میرا ساتھی جے دیو میرے ساتھ ہی بیٹھا تھا۔ مجھ سے رات والی منگل پوجا کے بارے میں پوچھنے لگا۔ میں نے اُسے بتایا کہ آج رات پھر منگل پوجا کے لئے چھت پر گیان دھیان کروں گا۔ کھانا کھانے کے بعد میں اُٹھ کر مندر کے باغیچے میں آ کر کونے میں بیٹھ گیا۔ میری نگاہیں نندی پالا کو تلاش کر رہی تھیں۔ اُس نے بھی کسی جگہ سے مجھے اکیلے بیٹھے دیکھ لیا تھا۔ وہ موقع پا کر میرے پاس آ گیا اور مجھے وہاں سے اُٹھا کر ایک جگہ جھاڑیوں کے پیچھے لے گیا اور بولا۔

''رات کو اُرملا سے ملاقات ہوئی؟''

میں نے کہا۔ ''نندی پالا! میں تمہارے احسان کو ساری عمر یاد رکھوں گا کہ تمہاری وجہ سے میں نے اپنی اُرملا کے درشن کر لئے۔''

اُس نے پوچھا۔ ''اُس سے کوئی بات کی یا نہیں؟''

میں نے کہا۔ ''پہرے دار اُس کے ساتھ ساتھ تھا۔ کوئی بات تو نہیں ہوئی لیکن ہم نے دُور سے ایک دوسرے کو دیکھ لیا تھا۔ میرے لئے اتنا ہی کافی ہے۔''

میں نے اُسے بالکل نہ بتایا کہ میں نے اُرملا کے پہرے دار کے ساتھ کیا ڈرامہ کیا ہے اور یہ کہ میں آج رات پھر مندر کی چھت پر جا رہا ہوں۔ نندی پالا نے بھی خوشی کا اظہار کیا کہ میں نے اپنی پریمیکا (محبوبہ) کے درشن کر لئے ہیں۔ کہنے لگا۔

''واپس بمبئی جا کر کملا سے کہنا کہ نندی پالا اتنا ہی کر سکتا تھا۔ اگر اس سے زیادہ کچھ کرنا میرے اختیار میں ہوتا تو ضرور کرتا۔''

میں نے ایک بار پھر اُس کا شکریہ ادا کیا اور کہا۔ ''کاش! میں اُرملا کو اپنے ساتھ لے جا سکتا۔''

وہ بولا۔ ''ایسا ممکن نہیں ہے۔ ممکن ہوتا تو سب سے پہلے میں تمہاری مدد کرتا۔''

میں نے اُسے کریدتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا مندر کے خفیہ تہہ خانے میں سے کوئی بھی عورت باہر نہیں آ سکتی؟''

اُس نے نفی میں سر ہلا کر کہا۔ ''نہیں...... ہاں، کیشو راؤ سیٹھ جب یہاں آتا ہے اور وہ کسی عورت کو اپنے دھنش کوڑی والے بنگلے میں طلب کرتا ہے تو اس خاص عورت کو رات کے اندھیرے میں سیٹھ کے پاس پہنچا دیا جاتا ہے۔ ورنہ تہہ خانے سے کوئی عورت باہر نہیں آ سکتی۔

''تہہ خانے کی بند فضا میں ان خوبصورت دیوداسیوں کا دم نہیں گھٹتا؟'' میں نے پوچھا۔

وہ مسکرایا۔ کہنے لگا۔ ''تہہ خانہ تم نے دیکھا نہیں۔ کہنے کو تو وہ تہہ خانہ ہی ہے۔ مگر وہ اتنا ہی لمبا چوڑا ہے جتنا یہ مندر ہے۔ تہہ خانے میں کئی چھوٹے بڑے کمرے ہیں، دالان ہیں۔ بند کمروں میں اُگنے والے پودے لگا کر ایک باغیچہ بھی بنایا ہوا ہے۔ دیوداسیوں کے دل بہلانے کو وہاں ہر شے موجود ہے۔ انہیں اعلیٰ سے اعلیٰ خوراک دی جاتی ہے اور تجربہ کار عورتیں اُن کے جسموں پر تیل مل کر روزانہ مالش کرتی ہیں اور خوشبودار صابن سے اُن کو نہلاتی ہیں۔ اور اُرملا چونکہ سیٹھ کیشو راؤ کی چہیتی دیوداسی ہے اس لئے اُس کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے اُسے ہفتے میں دو تین بار رات کو چھت پر ٹہلایا بھی جاتا ہے تاکہ وہ تازہ ہوا میں چل پھر سکے۔''

نندی پالا سے میں یہ ساری معلومات اپنی ایک سکیم اور منصوبے کے تحت پوچھ رہا تھا۔ میں نے مزید معلومات حاصل کرنے کے لئے اُس سے کہا۔

''ایسا بھی تو ہو سکتا ہے ناکہ تہہ خانے کا کوئی پہرے دار کسی لالچ یا کسی اور وجہ سے کسی عورت کو رات کے وقت تہہ خانے سے باہر لا کر اُسے فرار ہونے کا موقع دیدے؟''

اُس نے جھاڑیوں کے پیچھے ایک نظر ڈالی اور میری طرف متوجہ ہو کر بولا۔

''ہاں...... ایسا ہو سکتا ہے۔ اور ایک بار ایسا ہوا بھی تھا۔ ایک پہرے دار نے بھاری رقم کے عوض ایک نائیکہ سے تہہ خانے کی بڑی خوبصورت دیوداسی کا سودا کر لیا تھا اور اُس سے پیشگی رقم بھی وصول کر لی تھی۔''

وہ چپ ہو گیا۔ میں نے پوچھا۔ ''پھر کیا ہوا؟''

''پھر؟'' وہ بھنوئیں چڑھاتے ہوئے بولا۔ ''پھر یہ ہوا تھا کہ تہہ خانے کے پہریداروں

میں جو سیٹھ کے جاسوس ہیں اُنہوں نے تہہ خانے کے بڑے محافظ پجاری کو خبر کر دی۔ اُسی وقت اُس دیوداسی اور اُس پہریدار کو سب کے سامنے شِو جی کی مورتی کے آگے پتھر کی سل پر لٹا دیا گیا۔ چار آدمیوں نے اُن کے ہاتھ پاؤں پکڑ لئے اور بڑے پجاری نے خود خنجر سے باری باری دونوں کے پیٹ چاک کر کے اپنے ہاتھ سے اُن کے کلیجے نکال کر تہہ خانے کی بلیوں کے آگے ڈال دیئے۔ اس بات کو دو سال ہو گئے ہیں۔ اس کے بعد دوبارہ ایسا واقعہ کبھی نہیں ہوا۔ اب جو پہریدار کسی دیوداسی کو چھت پر ٹہلوانے لے جاتے ہیں وہ اپنی جان کا خطرہ مول لے کر جاتے ہیں۔ اور اپنی جان سے بڑھ کر دیوداسی کا خیال رکھتے ہیں کہ کہیں وہ آنکھ بچا کر بھاگ نہ جائے یا مندر کی دیوار سے سمندر میں چھلانگ نہ لگا دے۔''

دو یاتری دُور سے باتیں کرتے ہوئے اس طرف چلے آ رہے تھے جہاں ہم بیٹھے تھے۔ نند پالا جلدی سے اُٹھ کر ایک طرف کو چل دیا۔ میں وہیں بیٹھا رہا۔ اصل میں، میں نے یہ پروگرام بنایا تھا کہ آج رات جب اُرملا کا پہریدار محافظ اُرملا کو لے کر مندر کی چھت پر آئے گا تو میں اُسے کہوں گا کہ پاروتی دیوی رات میرے خواب میں آئی تھی۔ اُس نے مجھے حکم دیا ہے کہ تم اس عورت کو لے کر مندر سے دُور ایک جگہ پہنچ کر اپنے گرد دائرہ کھینچ کر شِو جی کے خاص اشلوک ایک سو مرتبہ پڑھو۔ اس کے بعد تمہارے سر پر منڈلاتی ہوئی سب بلائیں دُور ہو جائیں گی۔ یوں جب پہریدار اُرملا کو لے کر رات کے وقت بجائے چھت پر لانے کے جنگل میں یا سمندر کے کنارے آئے گا تو میں وہیں موقع پا کر اُس کا کام تمام کر دُوں گا۔ اس کام کے واسطے میں نے مندر کے پچھواڑے سمندر کے ایک کنارے ایک ویران جگہ کا انتخاب بھی کر لیا تھا۔ لیکن جب نندی پالا کی زبانی معلوم ہوا کہ تہہ خانے کا کوئی بھی پہریدار محافظ کسی دیوداسی کو لے کر مندر کی چار دیواری سے باہر نکلنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ اگر ایسا کرے گا تو فوراً پکڑا جائے گا اور سب کے سامنے اُسے پتھر کی سل پر لٹا کر اُس کا اور اُس کے ساتھ جانے والی دیوداسی کا پیٹ چاک کر کے اُس کا کلیجہ نکال کر تہہ خانے کی موٹی سیاہ بلیوں کے آگے ڈال دیا جائے گا، تب میں نے اُرملا کو مندر سے باہر لے جانے والی ترکیب کو ترک کر دیا اور کسی دوسرے منصوبے پر غور شروع کر دیا۔

مجھے اب جو کچھ بھی کرنا تھا مندر کی چھت کے اُوپر ہی کرنا تھا۔ میرے ہر منصوبے کا دائرہ عمل مندر کی چھت تک محدود تھا۔ چنانچہ میں اسی نہج پر غور کرنے لگا۔ مندر کی چھت پر سے میں اُرملا کو چھت کی سیڑھیوں سے لے کر فرار نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ نیچے مندر کی چار دیواری میں ہر وقت محافظ پہریداروں کا پہرہ لگا ہوتا تھا اور رات کے وقت مندر کا بڑا دروازہ بند کر دیا جاتا تھا۔ اس وقت آنے جانے والوں کی پوری پڑتال کی جاتی تھی۔ میرے سامنے اب ایک ہی راستہ تھا کہ میں اُرملا کو لے کر چھت کی سمندر والی دیوار پر سے کسی طرح نیچے اُتر کر وہاں سے فرار ہو جاؤں۔ میں نے دو دن پہلے دوپہر کے وقت مندر کی سمندر والی دیوار کا بخوبی جائزہ لیا تھا۔ یہ دیوار سمندری چٹانوں سے ایک منزل اُونچی تھی۔ دیوار کے نیچے چھوٹی بڑی پتھریلی چٹانیں پھیلی ہوئی تھیں جن سے سمندر کی موجیں ٹکراتی تھیں۔ اگر محض سمندر ہوتا تو ہم اس پر چھلانگ لگا سکتے تھے۔ لیکن ایک منزل کی بلندی سے چٹانوں پر کودنا بے حد خطرناک تھا۔ یہی ایک طریقہ تھا کہ کوئی مضبوط رسّی دیوار کی منڈیر سے باندھ کر نیچے لٹکا دی جائے اور وقت آنے پر اس رسّی کے ذریعے نیچے اُتر جائیں۔ ایک منزل کی اُونچائی کی رسّی وہاں ملنی محال تھی۔ اور اگر بالفرض محال مل بھی جاتی تو اتنا وقت نہیں تھا کہ میں اسے چھت کی منڈیر پر جا کر پہلے سے باندھ آؤں۔

سورج غروب ہو رہا تھا۔ شام کی سرخی پھیلنے لگی تھی اور رات کو مجھے چھت پر جا کر اپنے کمانڈو ایکشن پر ہر حالت میں عمل پیرا ہونا تھا۔ اس پروگرام کو ملتوی نہیں کیا جا سکتا تھا کیونکہ اُرملا کا محافظ پہریدار اُس وقت پوری طرح میرے قبضے میں تھا۔ میری ذرا سی غفلت اور تاخیر میرے سارے منصوبے کو خاک میں ملا کر اُرملا کو مجھ سے شاید ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دُور لے جا سکتی تھی جو مجھے گوارا نہیں تھا۔ اپنی کوٹھڑی میں آ کر میں نے چارپائی کی دری ایک طرف کر کے چارپائی کا جائزہ لیا۔ میرا خیال تھا کہ میں پائینتی کی رسّی کھول کر اُسے اپنی کمر کے ساتھ لپیٹ کر لے جاؤں گا۔ لیکن دری ہٹانے کے بعد پہلی بار یہ انکشاف ہوا کہ چارپائی میں لکڑی کے تختے جڑے ہوئے تھے۔ گویا وہ ایک طرف سے تخت پوش تھی۔ میں دری بچھا کر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ کیا کروں۔ کوئی ترکیب ذہن میں نہیں آ رہی تھی۔

اچانک میری نگاہ اس گیروے رنگ کی چادر پر پڑی جس کو اوڑھ کر میں مچھروں
سے محفوظ ہو کر سوتا تھا۔ میں نے چادر کو کھول کر دیکھا۔ چادر کوئی ڈھائی گز چوڑی اور
تقریباً چھ گز لمبی ہوگی۔ ساری ترکیب میرے ذہن میں آ چکی تھی۔ میں نے چوڑائی کے
رُخ سے چادر کو چار ٹکڑوں میں اُوپر سے نیچے تک پھاڑ دیا پھر ان سب ٹکڑوں کو ایک
دوسرے کے ساتھ مضبوط گرہیں دے کر اُس کا ایک رسہ سا بنا لیا۔ یہ رسہ بیس اکیس گز
لمبا ضرور ہو گیا تھا۔ اب میں نے اُسے رسّی کی طرح بل دے کر بانٹ کر اور زیادہ مضبوط
بنا دیا۔ چادر کی یہ رسّی اب اس قابل ہو گئی تھی کہ باری باری میرا اور اُرملا کا بوجھ
برداشت کر سکے۔ میں نے رسّی کو تخت پوش کے نیچے کر کے چھپا دیا۔

رات کو مندر کے لنگر پر دوسرے یاتریوں کے ساتھ کھانا کھایا، پھر اپنی کوٹھڑی میں آ
کر تخت پوش کی چارپائی پر لیٹ گیا اور آدھی رات ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ مجھے پورا
یقین تھا کہ محافظ پہریدار آدھی رات کو اُرملا کو لے کر چھت پر ضرور آئے گا۔ کیونکہ یہ
اُس کی زندگی اور موت کا معاملہ تھا۔ جس قدر یہ محافظ پہرے دار ضعیف الاعتقاد اور توہم
پرست تھا میں نے اُسی قدر بلکہ اس سے بھی زیادہ اُسے ڈرا دیا ہوا تھا۔ اپنی کلائی پر
بندھی ہوئی نندی پالا کی گھڑی کو تھوڑی تھوڑی دیر بعد دیکھ لیتا۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے
رات بھی میرے صبر کا امتحان لے رہی ہے اور بڑی سست رفتاری سے گزر رہی ہے۔

آخر گھڑی کی سوئیوں نے رات کے بارہ بجائے تو میں نے چارپائی کے نیچے سے چادر
کی بٹی ہوئی رسّی نکال کر اُسے بڑی احتیاط کے ساتھ اپنے سادھوؤں والے لمبے کرتے
کے نیچے کمر کے ساتھ اچھی طرح سے لپیٹا۔ تانبے کی باریک تار کی گچھی کرتے کی بغلی
جیب میں ڈالی۔ چپل پہنی اور چپکے سے کوٹھڑی میں سے نکل کر بڑے سکون اور شانتی
سے سادھوؤں کی طرح چلتا چھت کی سیڑھیوں والے دروازے میں آیا اور پھر
اندھیرے میں جلدی جلدی سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر آ گیا اور کونے والی اپنی خاص جگہ
پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ کر محافظ پہریدار کا انتظار کرنے لگا۔

آسمان بادلوں سے خالی ہو گیا تھا اور ستارے چمک رہے تھے جن کی دُھندلی روشنی
میں مجھے اپنی سہولت کے مطابق ہر شے نظر آ رہی تھی۔ میری نگاہیں چھت کے دروازے
پر لگی تھیں۔ تھوڑی ہی دیر بعد کسی کے سیڑھیاں چڑھنے کی آواز سنائی دی۔ پھر چھت کے

دروازے میں سے ایک انسانی ہیولا باہر آ گیا۔ یہ اُرملا تھی۔ اُس کے ساتھ ہی محافظ پہرے
دار ہاتھ میں سٹین گن لئے نمودار ہوا۔ محافظ پہرے دار نے چھت پر آتے ہی اُس طرف
دیکھا جہاں میں نقلی گیان دھیان میں بیٹھا اُسے دیکھ رہا تھا۔ اُس نے اُرملا سے کچھ کہا
اور دونوں آہستہ آہستہ میری طرف بڑھے۔ میں ذرا اُونچی آواز میں سنسکرت کے اشلوک
پڑھنے لگا۔ محافظ پہرے دار اور اُرملا میرے پاس آ کر ادب سے کھڑے ہو گئے۔
دونوں کے ہاتھوں میں گیندے کے پھولوں کے ہار تھے۔ محافظ پہریدار نے گیندے کے
ہار ایک چھوٹی سی طشتری میں رکھے ہوئے تھے جس میں لوبان بھی سلگ رہا تھا۔

میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے آنکھیں کھول کر محافظ پہریدار سے کہا۔

''سیوک! ماتا پاروتی تم سے بڑی خوش ہے۔ اب تم دونوں پوجا کے پھول اُس کے
چرنوں میں ارپن کرو گے۔ یہ پھول میرے سامنے رکھ کر بیٹھ جاؤ۔''

اُرملا مجھے پہچان چکی تھی۔ اُس نے پہلے دن ہی مجھے پہچان لیا تھا اور سمجھ گئی تھی کہ میں
یہ ڈرامہ اُسے وہاں سے نکال کر لے جانے کے واسطے کر رہا ہوں۔ چنانچہ وہ میری
ہدایت پر برابر عمل کر رہی تھی۔ دونوں میرے سامنے دو زانو ہو کر بیٹھ گئے۔ محافظ
پہریدار نے گیندے کے پھولوں اور سلگتے لوبان والی طشتری میرے سامنے فرش پر رکھ
دی اور ہاتھ باندھ کر بولا۔

''مہاراج! پاروتی ماتا سے کہیں مجھے راہو کیتو سے بچا لیں۔''

میں نے اپنی آواز میں جلال کی گھن گرج پیدا کرتے ہوئے کہا۔

''تمہیں کہہ دیا ہے کہ تمہاری سفارش ماتا جی تک پہنچ گئی ہے۔ اب تم اکیلے میری
جگہ پر بیٹھ کر پاروتی ماتا کی سنگل پوجا کرو گے۔''

میں اُٹھ کر ایک طرف ہو گیا۔ محافظ پہریدار میری جگہ پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔
اُس نے اپنی سٹین گن میرے قریب ہی رکھ دی۔ میں نے کہا۔

''اس بندوق کو اپنے سے دُور کر دو۔ پاروتی ماتا کو شانتی پسند ہے۔''

محافظ پہریدار نے سٹین گن اپنے پیچھے رکھ دی۔ اُس کے پیچھے چھت کی منڈیر تھی۔
منڈیر اور پہریدار کی پشت کے درمیان جو تھوڑی سی جگہ تھی سٹین گن وہاں پڑی تھی۔
صاف ظاہر تھا کہ پہریدار سٹین گن اپنے سے جدا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ سٹین گن اُس سے

لے کر میں اُسے کسی شک میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ ویسے بھی سٹین گن میرے لئے بیکار تھی
کیونکہ اس کی فائر کی آواز سے سارا مندر بیدار ہو جاتا۔ میرے پاس تانبے کی باریک
تار موجود تھی۔ میں نے اس سے کام لینا تھا اور یہ بڑا کاری ہتھیار ثابت ہو سکتا تھا۔
صرف اس میں تیزی اور ہوشیاری کی ضرورت تھی۔ میں نے اُرملا سے کہا۔

''بالکا! تو دس گز پرے ہو کر بیٹھ جا۔''

اُرملا نے ایسا ہی کیا۔ پھر میں نے پہریدار سے مخاطب ہو کر کہا۔

''غور سے سنو! جیسے جیسے میں کہوں ویسے ویسے کرنا۔ اگر کہیں تم سے بھول چوک
گئی تو پاروتی ماتا ناراض ہو کر تمہیں شراپ دے گی۔''

محافظ پہریدار گڑگڑا کر بولا۔ ''مہاراج! میں آپ کی آگیا کا پالن کروں گا۔''

میں نے کہا۔ ''تین قدم آگے ہو کر بیٹھ جاؤ۔''

محافظ پہریدار بیٹھے بیٹھے تین قدم آگے ہو گیا۔ میں نے کہا۔

''میں پاروتی دیوی کے منگل سوتر کے اشلوک پڑھتا ہوا تمہارے اِردگرد پھیرے
لگاؤں گا۔ تم آنکھیں بند کر کے شِو مہاراج کو اوم نمی شِوا پڑھ کر اپنی شردھانجلی ارپن کرو
گے۔ تم آنکھیں بند رکھو گے اور جب تک میں نہ کہوں ہرگز ہرگز آنکھیں نہیں کھولو گے۔''

''جی مہاراج!''

اور یہ کہہ کر محافظ پہریدار آنکھیں بند کر کے دونوں بازو گھٹنوں پر پھیلا کر مہاتما بدھ
کی طرح ساکت ہو کر بیٹھ گیا۔ میں ایک غلط سلط سنسکرت کا اشلوک پڑھتے ہوئے اُس
کے گرد آہستہ آہستہ چکر لگانے لگا۔ میں نے ہاتھ سے اُرملا کو سامنے چھت کی منڈیر کی
طرف جانے کا اشارہ کیا۔ میرے دوسرے تیسرے اشارے پر وہ سمجھ گئی کہ میں کیا کہہ
رہا ہوں اور وہ آہستہ آہستہ چل کر چھت کی سمندر والی دیوار کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔

اب آخری وار کرنے کے واسطے میدان صاف تھا۔ شکار جال میں پھانسنے میں میرا
کوئی کمال نہیں تھا۔ اس توہم پرست نیم وحشی ہندو نے خود میری مدد کی تھی۔ اگر دیوی
دیوتاؤں کے شراپ (بددعاؤں) پر اُس کا اندھا عقیدہ نہ ہوتا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا
تھا کہ میں اُسے چھت پر مٹی کا مادھو بنا کر بٹھا دیتا۔ وہ ایک درندہ صفت خونی قاتل تھا اور
اپنی جان پر کھیل کر مجھے بڑی آسانی سے قتل کر سکتا تھا۔ اُس کے پاس سٹین گن تھی اور

سارا مندر اُس کا حمایتی تھا۔ لیکن اُس کے جاہلانہ عقیدے نے اُسے بے جان بت بنا کر
میرے سامنے بٹھا دیا تھا کہ آؤ اور میرے ساتھ جو چاہو سلوک کرو۔ میں اُس کے گرد
آہستہ آہستہ چکر لگا رہا تھا اور بے معنی قسم کے اشلوک پڑھتا جا رہا تھا۔ چھٹے پھیرے پر
جب میں اُس کے پیچھے آیا تو میں نے جیب سے تانبے کی باریک تار نکال کر اپنے
ہاتھوں میں مضبوطی سے پکڑ لی تھی۔ ساتویں پھیرے پر میں جونہی محافظ پہرے دار کے
پیچھے آیا، میں نے جھک کر تانبے کی تار اُس کی گردن میں ڈالی اور اُسے پوری طاقت
سے ایک زبردست جھٹکا لگا دیا۔ باریک تار یقیناً اُس کی شہ رگ کو کاٹتی ہوئی اندر گھس
گئی تھی کیونکہ مجھے اپنے ہاتھوں پر اُس کا گرم خون گرتا محسوس ہوا تھا۔ میں اُسے جھٹکے
دیے جا رہا تھا۔ اُس کے منہ سے آواز تک نہ نکل سکی اور اُس کی گردن ڈھلک گئی۔ میں
نے اُس کی سٹین گن اُٹھا کر اس کا دستہ پیچھے سے زور سے اُس کی گردن پر مارا۔ وہ ایک
طرف لڑھک گیا۔

اُرملا دُور سے یہ سارا منظر دیکھ رہی تھی۔

میں نے اتنی تیزی اور مہارت سے یہ حملہ کیا تھا کہ مجھے خود اپنی مہارت پر یقین نہیں
آ رہا تھا۔ میں نے محافظ پہریدار کی لاش کو وہیں چھوڑا اور دوڑ کر اُرملا کے پاس آ گیا۔
وہ چھت کی منڈیر سے لگی میری طرف حیرت سے تک رہی تھی۔ میں نے اپنی کمر سے
جلدی جلدی چادر پھاڑ کر بنائی ہوئی رسّی کھولی۔ اُس کے ایک سرے کو چھت کی منڈیر کی
ایک پتھر کی بُرجی سے کس کر باندھا اور رسّی دوسری طرف لٹکا دی اور جھک کر نیچے دیکھا۔
اندھیرے میں سفید رسّی کافی نیچے تک چلی گئی تھی۔ میں نے اُرملا سے کہا۔

''پہلے میں نیچے اُترتا ہوں، اس کے بعد میں رسّی ہلاؤں تو تم نیچے اُتر آنا۔''

میں رسّی کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر دیوار کے ساتھ دونوں پیر لگا کر آہستہ آہستہ نیچے
اُترنے لگا۔ رسّی نیچے ایک چٹان سے کوئی پانچ فٹ اُوپر ہی ختم ہو گئی تھی۔ میں نے نیچے
چھلانگ لگا دی اور ایک پتھر پر کھڑے ہو کر رسّی کو زور سے ہلایا۔ اُرملا چھت کی منڈیر
سے نیچے جھانک رہی تھی۔ جیسے ہی میں نے رسّی ہلائی وہ منڈیر پر چڑھ کر بیٹھ گئی۔

میں دل میں ڈر رہا تھا کہ اُرملا کا پاؤں کسی جگہ غلط نہ پڑ جائے۔ سخت خطرہ تھا۔ مگر وہ
ایک مجھدار عورت تھی۔ اُس نے سب سے پہلے دونوں ہاتھوں سے رسّی کو پکڑا، پھر اُس کا

ایک بل اپنی کمر کے گرد ڈالا اور سمندر کی طرف پیٹھ کر کے دونوں پاؤں دیوار کے ساتھ ٹکا کر آہستہ آہستہ نیچے اُترنے لگی۔ اس طرح میں بھی نہیں اُترا تھا۔ یہ اُترنے کا بڑا اور محفوظ طریقہ تھا۔ میں نیچے کھڑا اُسے آنکھیں پھاڑے دیکھ رہا تھا۔ جب وہ مجھ پانچ فٹ کی اونچائی پر رہ گئی تو اُس نے گردن جھکا کر نیچے دیکھا۔

میں نے آہستہ سے کہا۔ ''نیچے چھلانگ لگا دو!''

اور اُرملا نے رسّی چھوڑ دی اور میں نے اُسے اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ اُرملا جلد سے الگ ہوگئی۔ میں نے کہا۔ ''اب رُکنا نہیں۔ جتنی تیز چل سکتی ہو، میرے پیچھے چلتی آؤ۔''

اور میں مندر کی دیوار سے ہٹ کر اُس طرف تیز تیز چلنے لگا جس طرف چھوٹی چھ چٹانوں کا سلسلہ سمندر کے ساحل کے ساتھ ساتھ دُور تک چلا گیا تھا۔ اُرملا میرے تیز قدم اُٹھاتی چلی آرہی تھی۔ زمین چٹانی تھی اور چلنے میں دُشواری پیش آرہی تھی۔ ہم رُک نہیں سکتے تھے۔ ایک لمحے کے لئے رُکنا ہمیں موت کے قریب لے جا سکتا ظاہر ہے مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ آگے کیا ہے؟ ساحل سمندر کا یہ سارا علاقہ میرے اجنبی تھا۔ صرف اتنا معلوم تھا کہ یہ انڈیا اور سری لنکا یعنی اُس زمانے کے سیلو درمیانی سمندر ہے۔ اور چونکہ دونوں ملک انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہو چکے ہیں لئے دونوں ملکوں کے ساحلی محافظوں یعنی کوسٹ گارڈ کی پٹرولنگ کشتیاں اپنے ساحلوں پر گشت لگاتی رہتی تھیں اور غیر قانونی طور پر اپنے سمندر کی سرحد میں د ہونے والوں کو فوراً پکڑ لیا جاتا تھا۔ اس طرح سے ہم دونوں انڈین کوسٹ گارڈ پٹرولنگ کشتیوں کی زد میں آ سکتے تھے۔ ہم سمندر سے ہٹ کر جا رہے تھے۔ سمند موجیں دُور دُور سے آکر ساحلی چٹانوں سے ٹکرا رہی تھیں اور ان کا شور بلند ہو رہا چلتے چلتے میں سمندر سے ساحل کی طرف بھی ہٹتا جا رہا تھا۔ میں نے دل میں سوچا کہ مجھے کہاں جانا ہے؟

مندر کی چھت پر پڑی ہوئی محافظ پہرے دار کی لاش کسی بھی وقت اُرملا کے فر راز فاش کر سکتی تھی اور اس کے بعد وہاں جو قیامت برپا ہونے والی تھی اس کی مجھے پورا احساس تھا۔ چنانچہ میں جتنی جلدی ہو سکے ایک محفوظ مقام پر اُرملا کو لے

جانا چاہتا تھا۔ دھنش کوڑی شہر کی ساری آبادی میں ہمارے لئے سوائے نندی پالا کے مکان کے دوسری کوئی محفوظ جگہ نہیں تھی۔ نندی پالا رات کے وقت اپنے مکان میں واپس آجاتا تھا۔ وہ مکان میں رات کے وقت اکیلا ہوتا تھا۔ نوکرانی بھی جا چکی تھی۔ اس افراتفری کی حالت میں صرف نندی پالا کا مکان ہی ہمارے لئے ایک جائے پناہ تھی۔ اگرچہ خطرہ وہاں بھی تھا لیکن ہم وہاں کچھ دیر چھپ ضرور سکتے تھے اور ہمیں اتنا وقت مل سکتا تھا کہ آگے کہیں جانے کا منصوبہ بنا سکیں۔ نندی پالا کے مکان کے علاوہ ہر جگہ ہمارے پکڑے جانے کا زبردست خطرہ تھا۔ یہ سارا شہر سیٹھ کیشو راؤ کے زیر اثر تھا اور میں سیٹھ کی من پسند دیوداسی کو بھگا کر لے جا رہا تھا۔ وہ مجھے کیسے چھوڑ سکتا تھا؟ بلکہ مجھے یہ بھی ڈر لگا تھا کہ کہیں نندی پالا ہمیں پناہ دینے سے انکار نہ کر دے۔ لیکن مجھے ہر حالت میں اُرملا کو لے کر اُس کے مکان پر جانا تھا۔

رات کافی گزر چکی تھی۔ ہم شہر کی حدود میں داخل ہو گئے۔ تب اُرملا نے مجھ سے پوچھا۔ ''ہم کہاں جا رہے ہیں؟''

میں نے جواب دیا۔ ''یہاں ہمارا ایک خیر خواہ ہے۔ ہم اُس کے مکان پر جا رہے ہیں۔ بس تم خاموشی سے میرے ساتھ چلتی جاؤ۔''

شہر کے بازار سنسان پڑے تھے۔ نندی پالا کے گھر کا راستہ مجھے معلوم تھا۔ میں ایک بڑے بازار میں سے گزر کر ایک چھوٹے بغلی بازار میں آگیا۔ اس بازار میں بھی ساری دُکانیں بند تھیں اور سناٹا چھایا ہوا تھا۔ بازار ختم ہو گیا۔ آگے کھلے کھیت تھے اور تاڑ کے لمبے لمبے درخت اپنی چھتریاں کھولے کھڑے تھے۔ سمندر کی طرف سے آنے والی ہوا میں اُن کی شاخیں لہرا رہی تھیں۔ یہاں کھیتوں کے پار بائیں جانب تین چار کوارٹر نما مکان تھے۔ یہاں پہلا مکان نندی پالا کا تھا۔ مکان پر اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ مکان کے دروازے پر آکر میں نے اُرملا کو ایک طرف اندھیرے میں کھڑا کر دیا اور خود بند دروازے پر آہستہ سے دستک دی۔ تین چار بار دروازے پر دستک دینے کے بعد دروازہ کھلا اور سامنے نندی پالا کھڑا تھا۔ وہ دھوتی اور بنیان میں تھا اور چہرہ نیند سے بوجھل ہو رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی حیران سا ہو کر بولا۔

''تم...... اس وقت؟''

میں نے کہا۔ ''ہاں۔ مجھے آنا پڑ گیا ہے۔''
وہ بولا۔ ''اندر آ جاؤ!''
میں اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔ وہ بولا۔ ''اندر کیوں نہیں آتے؟''
تب میں نے اُس سے کہا۔ ''میرے ساتھ اُرملا بھی ہے۔''
جس طرح زوردار دھماکے سے آدمی اپنی جگہ سے ہل جاتا ہے نندی پالا اُرملا کا نا
سن کر اپنی جگہ سے ہل گیا۔ اُس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ بولا۔
''یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟''
میں نے جواب دیا۔ ''سچ کہہ رہا ہوں۔ میں اُسے مندر سے بھگا کر لے آیا ہوں۔''
نندی پالا نے گردن باہر نکال کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ میں نے اُرملا کو اشارہ کیا۔ و
اندھیرے میں سے نکل کر سامنے آ گئی۔ نندی پالا نے گھبراہٹ میں جلدی سے کہا۔
''اندر آ جاؤ...... اندر آ جاؤ!''
میں اُرملا کو لے کر جیسے ہی مکان میں داخل ہوا، نندی پالا نے جلدی سے دروازہ ب
کر دیا اور کنڈی لگا دی۔ وہ سخت گھبرا گیا تھا۔ اُس کا گھبرا جانا صحیح تھا۔ اگر کسی کو پتہ چل
جاتا ہے کہ سیٹھ کیشو راؤ کی چہیتی دیوداسی اُرملا مندر کے تہہ خانے سے بھاگ کر اور ایک
پہریدار کو قتل کر کے مندر کے اپنے پجاری نندی پالا کے مکان میں چھپی ہوئی ہے تو نندی
پالا کا جو انجام ہوتا اُسے دیکھ کر مندر کے تہہ خانے کے خونی قاتل بھی ایک بار لرز اُٹھتے۔
نندی پالا جلدی سے ہمیں مکان کی پچھلی کوٹھڑی میں لے گیا۔ وہاں ایک خالی چارپائی
بچھی تھی۔ ہمیں چارپائی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ کھڑکی میں سے ستاروں کی پھیکی روشنی اند
آ رہی تھی۔ نندی پالا نے جلدی سے لالٹین روشن کر دی اور کھڑکی فوراً بند کر کے ہمارے
سامنے سٹول پر بیٹھ گیا۔ اس وقت نندی پالا اس قدر حواس باختہ سا ہو گیا تھا کہ اُس سے
بات نہیں ہو رہی تھی۔ میں نے اُس سے کہا۔
''نندی پالا! میں جانتا ہوں میں نے تمہیں مصیبت میں ڈال دیا ہے۔ لیکن یقین کرو
اس وقت صرف تم ہی ہم دونوں کی جان بچا سکتے ہو۔ اگر تم نے ہمیں پناہ نہ دی تو میرا جو
انجام ہوگا اس کی مجھے فکر نہیں، مگر اُرملا بھی زندہ نہیں بچے گی۔''
نندی پالا ہونٹوں پر دو تین بار زبان پھیر کر بولا۔ ''زندہ تو اب میں بھی نہیں بچوں

گا۔''
اُس کے اس جملے سے کوٹھڑی میں سناٹا چھا گیا۔ میں چپ ہو گیا تھا۔ نندی پالا ایسا سوچنے میں حق بجانب تھا۔ اُس نے کوٹھڑی کے بند دروازے کی طرف دیکھا، اُٹھ کر جلدی سے دروازے کے پاس گیا۔ اُسے کھولا، باہر جھانک کر دیکھا اور جلدی سے دروازہ بند کر کے سٹول پر آ کر بیٹھ گیا۔ اب اُس نے اپنے حواس کو کافی حد تک سنبھال لیا تھا۔ کہنے لگا۔ ''یہ سب کچھ کیسے ہو گیا؟ تم نے ایسا کیوں کیا؟ تمہیں معلوم نہیں تھا اس کا انجام کیا ہو گا؟''

اُس نے بیک وقت کئی سوال کر دیئے تھے اور میرے پاس اُس کے کسی سوال کا اُس کی مرضی کے مطابق جواب نہیں تھا۔ اُرملا پریشان سی ہو کر سر جھکائے چارپائی پر میرے پہلو میں بیٹھی تھی۔ میں نے کہا۔

''نندی پالا! میں نے جو کچھ بھی کیا مجھے ہر حالت میں یہی کرنا تھا۔ غلطی مجھ سے صرف اتنی ہوئی ہے کہ میں اُرملا کو لے کر تمہارے مکان پر آ گیا ہوں۔ لیکن یہ میری مجبوری تھی۔ ان حالات میں خواہ ایک دن کے لئے ہی سہی صرف تمہارا گھر ہی ہمیں پناہ دے سکتا تھا۔ اس کے لئے میں تم سے معافی مانگتا ہوں۔ لیکن وعدہ کرتا ہوں کہ آج کی رات اور کل کا دن گزارنے کے بعد میں کل رات کی تاریکی میں اُرملا کو لے کر یہاں سے چلا جاؤں گا۔ پھر میرے ساتھ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔''

نندی پالا سر جھکائے کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ اُس نے چہرہ اُٹھا کر میری طرف دیکھا اور بولا۔ ''اُرملا اکیلی چھت پر نہیں آ سکتی تھی۔ اس کے ساتھ پہریدار ضرور ہو گا۔ وہ کہاں چلا گیا تھا؟''

میں نے جواب دیا۔ ''وہ وہیں تھا۔ کہیں نہیں گیا تھا۔''

نندی پالا نے بھنویں سکیڑتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔

''اُس نے تمہیں کیسے جانے دیا؟''

میں نے جواب دیا۔ ''میں نے اُسے قتل کر دیا تھا۔''

یہ میرا دوسرا جملہ تھا جو ایک بم کی طرح نندی پالا کے اُوپر گرا۔ وہ جیسے سکتے میں آ گیا۔ اُس کے منہ سے صرف اتنا ہی نکل سکا۔ ''ہے رام......!''

پھر وہ جلدی سے اُٹھا اور بولا۔ ''یہیں بیٹھے رہنا۔ ایک دوسرے سے باتیں نہ کرنا۔'' اور وہ تیز تیز قدموں سے کوٹھڑی سے نکل گیا۔ دروازہ بند کر کے کوٹھڑی کو باہر سے کنڈی لگا تا گیا۔ اُس کے جانے کے بعد اُرملا نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔

''کہیں یہ ہمیں بڑے پجاری کے حوالے تو نہیں کر دے گا؟''

اس بات کا خطرہ مجھے بھی تھا۔ نندی پالا کملا کا دوست ضرور تھا اور اُس کی وجہ سے اُس نے میری مدد ضرور کی تھی لیکن میں نے اُس کے سر پر موت کی تلوار لٹکا دی تھی۔ اس صورتِ حال میں اپنی جان بچانے اور مندر میں اپنی دیرینہ اور معتبر حیثیت کو بچانے کے لئے وہ کچھ بھی کر سکتا تھا۔ میں نے اُس سادہ مزاج اور ڈرپوک سے مدراسی کو اُس کی زندگی کی شاید سب سے بڑی مصیبت میں مبتلا کر دیا تھا۔ میں نے اُسے زمین سے ایک ہزار فٹ بلند تنی ہوئی رسّی پر کھڑا کر کے چھوڑ دیا تھا۔ ذرا سا اُٹھا ہوا غلط قدم اُسے موت کی کھائی میں گرا سکتا تھا۔ مگر میں نے اُرملا کو حوصلہ دینے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''نندی پالا بڑا قابل اعتماد دوست ہے۔ وہ ہم دونوں کا خیر خواہ ہے۔ وہ ایسا نہیں کرے گا۔''

اتنے میں دروازہ کھول کر نندی پالا اندر آ گیا۔ کہنے لگا۔ ''تم دونوں کو یہاں آتے ہوئے کسی نے دیکھا تو نہیں؟''

''نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''رات کا اندھیرا تھا۔ کسی نے نہیں دیکھا۔''

پھر میں نے اُسے سارا واقعہ بیان کر دیا۔ جب میں نے ساری کہانی بیان کر دی اُس نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور کچھ نہ بولا۔ دس پندرہ سیکنڈ وہ اسی حالت میں بیٹھا رہا، پھر چہرہ اُٹھا کر مجھ سے کہا۔

''اب تم لوگ کیا چاہتے ہو؟''

میں نے کہا۔ ''ہم کسی طرح یہاں سے نکل جانا چاہتے ہیں۔''

وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ کہنے لگا۔ ''ابھی تم اسی کوٹھڑی میں چھپے رہو۔ اس کھڑکی کو مت کھولنا۔ کھڑکی سے باہر مت نکلنا۔ میں صبح آؤں گا۔ اور یہ لالٹین بجھا دینا۔''

وہ کوٹھڑی سے چلا گیا۔ اُرملا نے مجھ سے کہا۔ ''میں اپنی جے پور والی پرانی حویلی میں جانا چاہتی ہوں۔ تم بھی میرے ساتھ ہی وہاں چلے چلو۔ وہاں یہ لوگ ہمارا کچھ نہیں

بگاڑ سکیں گے۔''

مجھے اُرملا کی یہ تجویز بڑی مناسب معلوم ہوئی۔ کم از کم اُرملا کے لئے اُس کی جے پور والی حویلی بڑی محفوظ جگہ تھی۔ وہ اُس کا آبائی گھر تھا اور وہاں اُس کی حفاظت کرنے والے چار چھ ملازم موجود تھے۔ میں نے کہا۔ ''میرا بھی یہی خیال ہے۔''

میں اُٹھ کر لالٹین بجھانے لگا تو اُس نے مجھے روک دیا۔ کہنے لگی۔

''لالٹین مت بجھانا۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''یہاں میں تمہارے پاس ہوں۔ تمہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

وہ بولی۔ ''اُس بڈھے راکھشش سیٹھ کے غنڈے بڑے خونی لوگ ہیں۔ تم اُنہیں نہیں جانتے۔ اُن کے چہرے سامنے آتے ہیں تو میرا بدن خوف سے سن ہو جاتا ہے۔''

''مگر اب تو تم اُن میں نہیں ہو۔'' میں نے کہا۔ ''اور یہاں وہ آ بھی نہیں سکتے۔''

وہ بولی۔ ''تمہیں کچھ معلوم نہیں ہے۔ وہ کہیں بھی پہنچ سکتے ہیں۔ بڈھے سیٹھ کیشو راؤ نے اُن پر یم راج بن کر ٹونہ کیا ہوا ہے۔ وہ اُس کی خاطر اپنے سگے بہن بھائیوں کو بھی قتل کر سکتے ہیں۔''

نند پالا نے بھی مجھے مندر کے تہہ خانے والے غنڈوں کے بارے میں اسی قسم کی باتیں بتائی تھیں۔ لیکن میں اُن سے خوفزدہ نہیں تھا۔ اُن میں سے ایک کو میں اپنے ہاتھوں قتل کر چکا تھا۔ ڈر اگر تھا تو صرف اُرملا کا تھا کہ یہ خونخوار دشمن کہیں اُسے مجھ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نہ چھین لیں۔ میں نے لالٹین بجھانے کی بجائے اُس کی لو دھیمی کر دی۔ کوٹھڑی میں اب اتنی ہی روشنی تھی کہ ہم بمشکل ایک دوسرے کا چہرہ دیکھ سکتے تھے۔ میں نے اُرملا سے کہا۔

''تم آرام کرو۔ میں یہاں زمین پر لیٹ جاتا ہوں۔''

وہ بولی۔ ''مجھے نیند نہیں آ رہی۔ تم چارپائی پر سو جاؤ۔ میں سٹول پر بیٹھ کر رات گزار سکتی ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''مجھے بھی نیند نہیں آ رہی۔''

میں نے اپنا ہاتھ لالٹین کے قریب لے جا کر وقت دیکھا۔ رات کے تین بجنے والے تھے۔ میں نے کہا۔ ''تھوڑی سی رات رہ گئی ہے۔ ہم اسی طرح بیٹھے رہتے ہیں۔''

میں چارپائی پر اُرملا کے پاس ہی آ کر بیٹھ گیا۔ وہ کہنے لگی۔

''یہ آدمی نندی پالا تمہیں کہاں سے مل گیا تھا؟ کیا یہ شِو مندر کا پجاری ہی ہے؟''

''ہاں'' میں نے جواب دیا۔ ''یہ شِو مندر کا پجاری بھی ہے اور اُس شیطان صفت سیٹھ کی بمبئی کی ایک دوست کملا کا دوست بھی ہے۔''

وہ بولی۔ ''ہاں...... میں نے کملا کا نام سن رکھا ہے۔ مگر اُسے دیکھا کبھی نہیں۔ تمہیں وہ کہاں مل گئی تھی؟''

تب میں نے اُسے وہ سارے واقعات بیان کئے جو اُس کے اغواء کئے جانے کے بعد میرے ساتھ گزرے تھے۔ وہ بڑی حیرت کے ساتھ ان واقعات کو سنتی رہی۔ میں نے آخر میں اُرملا کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور کہا۔

''ان حالات میں صرف ایک طاقت تھی جس نے مجھے حوصلہ مند رکھا ہوا تھا اور جس کی وجہ سے مجھے یقین تھا کہ میں ایک نہ ایک دن تمہیں پالوں گا۔ اور وہ تھی تمہاری محبت۔''

لالٹین کی دھیمی اور دُھندلی روشنی میں مجھے اُرملا کا چہرہ خواب میں دیکھا ہوا چہرہ لگ رہا تھا۔ اُس نے شرما کر چہرہ جھکا لیا۔ میں نے ہاتھ سے اُس کا چہرہ آہستہ سے اُوپر اُٹھایا اور کہا۔

''ہاں اُرملا...... یہ تمہاری محبت ہی تھی جو مجھے صحراؤں، جنگلوں اور ویرانوں میں تمہاری تلاش میں لئے لئے پھرتی رہی۔ اس وقت جبکہ تم میرے سامنے بیٹھی ہو تو مجھے یقین نہیں آ رہا کہ میں اپنی محبت کو اپنے اتنا قریب دیکھ رہا ہوں۔''

اُرملا نے اپنا سر میرے سینے سے لگا دیا۔

OOO

جو تھوڑی سی رات باقی رہ گئی وہ میں نے اور اُرملا نے باتیں کرتے ہوئے گزار دی۔

ان باتوں کے علاوہ میں نے شدت سے محسوس کیا کہ سیٹھ کے خونخوار غنڈوں کی دہشت اُس کے دل میں بری طرح سے جاگزیں ہو چکی تھی۔ باتیں کرتے کرتے وہ کبھی کوٹھڑی کے بند دروازے کی طرف دیکھتی اور کبھی کھڑکی کی طرف۔ ایک بار اُس نے مجھے کہا بھی کہ میں اُٹھ کر دیکھ آؤں کہ کوٹھڑی کے باہر تو کوئی نہیں ہے؟ اس دوران میں اُرملا نے مجھے سیٹھ کے مندر کے پراسرار تہہ خانے میں گزری ہوئی اپنی زندگی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ میں نے بھی اُس کے زخموں کو کریدنا مناسب خیال نہیں کیا تھا۔ صرف ایک بار وہ اتنا کہہ کر چپ ہو گئی تھی کہ۔

''اگر میں دوزخ میں بھی ڈال دی جاؤں گی تو وہاں مجھے وہ اذیت نہیں ملے گی جو میں نے شِو مندر کے تہہ خانے میں برداشت کی ہے......''

اور اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ جب بند کھڑکی کی جھریوں میں سے دن کا اُجالا جھانکنے لگا تو میں نے اُٹھ کر لالٹین بجھا دی۔ اب نند پالا کسی بھی وقت آ سکتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ باقی کی رات وہ بھی نہیں سو سکا ہو گا۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ نند پالا دروازہ کھول کر کوٹھڑی میں داخل ہوا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک ٹرے تھی جس میں ہمارے ناشتے کا کچھ سامان تھا۔ اُس نے ٹرے چارپائی پر رکھ دی اور بولا۔

''نوکرانی صبح صبح میرے لئے ناشتہ بنانے آئی تھی۔ میں نے اُسے یہ کہہ کر واپس بھیج دیا ہے کہ میں آج ناشتہ مندر میں ہی کروں گا۔ یہ چائے اور توسٹ میں نے بنائے ہیں۔''

نند پالا کی طبیعت میں کچھ ٹھہراؤ سا آ چکا تھا۔ وہ رات والی گھبراہٹ اور اضطراب باقی نہیں تھا۔ وہ ہمارے سامنے سٹول پر بیٹھ گیا۔ میں نے پیالی میں چائے ڈال کر اُرملا کو دی۔ نند پالا کہنے لگا۔

''مندر کے حالات وہاں جانے کے بعد ہی معلوم سکیں گے۔ اس کے بعد ہی یہ
فیصلہ ہوگا کہ تمہیں یہاں سے کیسے نکالا جائے۔ تم بمبئی جاؤ گے؟''

میں نے اُرملا کی طرف دیکھا۔ اُرملا نے آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھے جے پور کا نام
لینے سے منع کر دیا۔ میں نے نند پالا سے کہا۔''ہاں...... ہم بمبئی ہی جائیں گے۔''

وہ کہنے لگا۔''بمبئی جانا تمہارے لئے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ بمبئی سیٹھ کا گھر
ہے اور اُس کے غنڈوں کا گڑھ ہے۔''

میں نے یونہی کہہ دیا۔''تو ہم برہان پور چلے جائیں گے۔ وہاں میرے ایک رشتے
دار پولیس کے محکمے میں ہیں۔''

نند پالا خاموش رہا، پھر کہنے لگا۔''برہان پور جانے کے لئے بھی تمہیں بمبئی جانے
والی گاڑی ہی پکڑنی ہوگی۔ برہان پور بمبئی کے راستے میں آتا ہے۔''

''کیا یہاں سے کوئی گاڑی سیدھی بمبئی جاتی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

نند پالا کہنے لگا۔''نہیں۔ یہاں سے تم لوگوں کو مدراس جانا ہوگا۔ مدراس سے ناگ
پور ایکسپریس پکڑنی ہوگی، پھر ناگ پور سے تمہیں بمبئی جانے والی ٹرین مل جائے گی۔
بس یہاں سے نکلنا ہی مشکل ہے۔ لیکن صحیح صورت حال کا پتہ مندر جانے کے بعد ہی
مجھے لگے گا۔ تم ناشتہ کر کے ساتھ والی کوٹھڑی کے برآمدے میں جا کر غسل خانے میں
ہاتھ منہ دھو لینا۔ میں تھوڑی دیر بعد مندر چلا جاؤں گا۔ مگر یاد رکھنا! برآمدے میں رُکنا
نہیں۔ سیدھا غسل خانے میں جانا اور غسل خانے سے نکل کر سیدھا اسی کوٹھڑی میں آ
جانا۔ میں مکان کو باہر سے تالا لگا کر جاؤں گا۔ باہر سے کسی کی تم پر نظر نہیں پڑنی
چاہئے۔'' یہ کہہ کر نند پالا چلا گیا۔

اُس کے جانے کے بعد میں نے اور اُرملا نے باری باری غسل خانے میں جا کر منہ
ہاتھ دھویا۔ میں نے ابھی تک سادھوؤں والا لمبا چولا ہی پہنا ہوا تھا۔ اُرملا گیرے کتھئی
رنگ کی ساڑھی میں تھی۔ ہم اسی بند کوٹھڑی میں بیٹھے رہے۔ دوپہر ہو چکی تھی کہ نند پالا
مندر سے واپس آیا۔ وہ سیدھا ہماری کوٹھڑی میں آ گیا۔ چہرے سے وہ پریشان لگتا تھا۔
کہنے لگا۔

''مندر میں ایک بھونچال سا آیا ہوا لگتا ہے۔ بڑے پجاری نے تہہ خانے میں آنے

جانے کے تمام راستے بند کرا دیئے ہیں۔ اُس کے خونی غنڈے تم دونوں کی تلاش میں
سارے دھنش کوڑی شہر بلکہ پورے صوبے میں نکل پڑے ہیں۔ سیٹھ کیشو کو بھی ٹیلی فون
پر اطلاع کر دی گئی ہے۔ اُس نے وہیں سے تم دونوں کو موت کے گھاٹ اُتار دینے کا
حکم دے دیا ہے۔''

ہمارے لئے یہ کوئی انوکھی خبر نہیں تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ یہی کچھ ہونے والا ہے۔ مگر
نند پالا بڑا پریشان تھا۔ اُس پر وہی رات والی گھبراہٹ طاری ہو چکی تھی۔ کہنے لگا۔

''اگر ذرا سا بھی شک پڑ گیا کہ تم دونوں میرے مکان میں چھپے ہوئے ہو تو سیٹھ اور
اُس کا بدمعاش پجاری مجھے اور میرے سارے خاندان کو قتل کرا دے گا۔''

میں نے نند پالا سے اظہارِ ہمدردی کرتے ہوئے کہا۔''نند پالا! مجھے معاف کر دینا۔
میری وجہ سے تم اتنی بڑی مصیبت میں پھنس گئے ہو۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ ہم
صرف آج کی رات ہی تمہارے پاس رہیں گے۔ بلکہ آج رات کو ہی اندھیرے میں کسی
طرف نکل جائیں گے۔''

نند پالا نے فوراً ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔''نہ نہ...... بھگوان کے لئے یونہی یہاں
سے نہ نکل جانا۔ یونہی نکل گئے تو کسی نہ کسی جگہ ضرور پکڑے جاؤ گے۔ اور پھر مندر کے
بڑے پجاری اور سیٹھ کو فوراً پتہ چل جائے گا کہ میں نے ہی تم دونوں کو اپنے مکان میں
چھپا رکھا ہے۔ اب تو میرے لئے یہ بہت ضروری ہو گیا ہے کہ میں تمہیں اپنی حفاظت
میں یہاں سے اس طرح کسی طرف کو نکال دوں کہ کم از کم مدراس شہر تک سیٹھ کے
غنڈوں کو تمہارا سراغ نہ مل سکے۔'' پھر خود ہی سر ہلا کر کہنے لگا۔''مگر تم لوگ اُن خونی
بھیڑیوں کو نہیں جانتے۔ یہ یم راج کی طرح ہر جگہ پہنچ جانے کی طاقت رکھتے ہیں۔ ان
کے ساتھی ہر صوبے میں جگہ جگہ موجود ہیں۔ اُنہیں صرف تمہارا حلیہ اور نام بتانے کی
ضرورت ہوگی اور وہ تمہاری تلاش میں خونی بھیڑیوں کی طرح اپنے اپنے بھٹ سے نکل
پڑیں گے۔''

میں نے نند پالا سے کہا۔''تم صرف یہ پتہ کرا دو کہ یہاں سے مدراس جانے والی
گاڑی کب روانہ ہوتی ہے؟ ہم کسی نہ کسی طرح اُس گاڑی میں بیٹھ جائیں گے۔''

''پھر وہی بات؟'' نند پالا نے ہمیں ڈانٹنے کے لہجے میں کہا۔''تم اس طرح یونہی

میرے مکان سے نکل کر مجھے بھی اپنے ساتھ مروانا چاہتے ہو؟ تم دونوں اسی کوٹھڑی میں رہو گے۔ میں خود تمہیں لے کر جہاں بھی جانا ہوگا جاؤں گا۔"

وہ اُٹھ کر باہر جانے لگا اور جاتے جاتے رُک گیا۔ ہماری طرف دیکھ کر بولا۔" ایک بات یاد رکھنا! بمبئی جانے کی غلطی ہرگز نہ کرنا۔ اگر گئے تو سیٹھ کے درندے تم دونوں کو قتل کر کے لاشیں ایسی غائب کر دیں گے کہ تمہارا نام ونشان تک نہیں ملے گا۔"

بمبئی جانے کا خیال تو ہم پہلے ہی دل سے نکال چکے تھے اس لئے ہمیں اُس کی ہدایت پر عمل کرنے کی حاجت ہی نہیں تھی۔ میرے دل میں ایک خیال آیا۔ میں نے اُرملا سے کہا۔

"اس شخص نے جو یہ بتایا ہے کہ سیٹھ کے درندے ہر صوبے میں موجود ہیں تمہارے خیال میں کیا ہم جے پور والی تمہاری حویلی میں محفوظ ہوں گے؟"

اُرملا بولی۔" حویلی میں ہمارے پرانے ملازم ہوتے ہیں۔ اُن کے ہوتے ہوئے کوئی غیر آدمی حویلی میں داخل نہیں ہوسکتا۔"

میں تھوڑا سا مطمئن ہوگیا۔ اُرملا نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر میری اُنگلی میں پڑی ہوئی اپنی انگوٹھی دیکھی اور کہنے لگی۔" اگرچہ کانچی کے خاص ٹونے سے اس کا رنگ سیاہ پڑ گیا ہے۔ لیکن اس میں ابھی وہ طاقت موجود ہے جو تمہیں اُس کے حملے سے بچا لے گی۔"

میں نے کہا۔" مجھے اس انگوٹھی پر نہیں، اپنے خدا کی طاقت پر بھروسہ ہے۔ مجھے یقین ہے جب تک میری نیت نیک ہے اور میں سچائی کے ساتھ ہوں، کانچی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی۔"

اُرملا نے ایک گہرا سانس لیا اور پوچھا۔" لیکن یہ بدخصلت بدروح عورت تمہاری جان لینا چاہتی ہے۔ تمہیں اُس سے خبردار ہو کر رہنا ہوگا۔ یہ بتاؤ اس دوران اُس نے تم پر کوئی حملہ تو نہیں کیا؟"

میں نے کہا۔" بہت دیر ہوئی ایک بار اُس نے اپنی منحوس آواز میں مجھ سے کہا تھا کہ شیراز! تم چاہے کچھ اُپائے کرو۔ میں تمہاری جان لے کر رہوں گی۔ اس لئے کہ تمہاری جان لئے بغیر مجھے دیوتاؤں کی جانب سے وہ شکتی نہیں مل سکتی جس کی مجھے جنم جنم سے

تلاش رہی ہے۔"

اُرملا کچھ اُداس سی ہوگئی۔ کہنے لگی۔" بھگوان ہی جانتا ہے کہ یہ عورت کب ہمارا پیچھا چھوڑے گی۔"

میں نے موضوع بدلنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔" اُس ڈائن کا ذکر چھوڑو۔ تم یہ بتاؤ! کہ کیا ہمیں نند پالا کی ہدایات پر عمل کرنا چاہئے یا ہم اپنے طور پر یہاں سے نکل کر دھنش کوڑی کے ریلوے سٹیشن پر پہنچ کر مدراس جانے والی کسی گاڑی میں بیٹھ جائیں؟"

اُرملا نے کہا۔" بالکل نہیں۔ نند پالا ٹھیک کہہ رہا تھا کہ مندر کے درندے ہماری تلاش میں نکل کھڑے ہوئے ہیں۔ میں اُن درندوں کی خصلت کو اچھی طرح سے جانتی ہوں۔ وہ سٹیشن کے آس پاس بھی ضرور منڈلا رہے ہوں گے۔ ہم وہاں پہنچتے ہی پکڑے جائیں گے۔ اس لئے اس مکان سے اکیلے باہر جانے کا خیال ہمیں دل سے نکال دینا چاہئے۔ جس طرح نند پالا کہتا ہے ہمیں اسی طرح کرنا چاہئے۔"

تین چار دن نند پالا نے ہمیں اپنے مکان میں ہی چھپا کر رکھا۔ پھر ایک شام مندر سے آیا تو کہنے لگا۔" آج رات تمہیں مدراس جانے والی گاڑی میں سوار ہو کر یہاں سے نکل جانا ہوگا۔ میں ٹکٹ لے آیا ہوں۔"

میں بڑا خوش ہوا۔ نند پالا نے مجھے دھنش کوڑی سے مدراس تک کے ریل گاڑی کے سیکنڈ کلاس کے دو ٹکٹ نکال کر دیئے۔

"سیکنڈ کلاس کے ٹکٹ میں نے اس لئے خریدے ہیں کہ تھرڈ کے ڈبوں میں پولیس بے دریغ داخل ہو جاتی ہے اور مندر کے آدمی بھی بلا جھجک آ سکتے ہیں مگر سیکنڈ کلاس میں تم اُن سے کافی حد تک محفوظ رہو گے۔ اُرملا کو تو وہ فوراً پہچان لیں گے۔ اس لئے جب تک ٹرین پلیٹ فارم پر کھڑی رہے گی، اُرملا کو باتھ رُوم میں چھپے رہنا ہوگا۔ بہتر یہی ہو گا کہ تم بھی گاڑی کے چلنے تک ڈبے سے باہر ہی پلیٹ فارم پر کہیں چھپ کر بیٹھے رہو۔ کیونکہ تم بنارس کے یاتریوں میں شامل تھے۔ ممکن ہے تمہیں دیکھ کر مندر کا کوئی بھیڑیا تمہارے پاس بھی پوچھ گچھ کرنے آ جائے۔"

میں نے کہا۔" میں تمہاری ہدایت پر پورا عمل کروں گا۔"

ٹرین دھنش کوڑی کے سٹیشن سے رات کے سوا گیارہ بجے چھوٹتی تھی۔ مدراس تک کا

سفر کافی لمبا تھا۔ ایک دن اور ایک رات ٹرین میں سفر کرتے گزر جاتی تھی۔ مدراس تک کا یہ سارے کا سارا علاقہ ہمارے لئے بہت خطرناک تھا اور ہمیں بے حد محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔ لیکن وہاں سے نکلنے کا دوسرا کوئی راستہ بھی نہیں تھا۔ نند پالا نے مجھے ایک پتلون اور بش شرٹ پہننے کے لئے دی کیونکہ اب مجھے سادھوؤں والا بہروپ بدلنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میرے پرانے کپڑے بے حد بوسیدہ ہو چکے تھے۔ اُس نے مجھے ساٹھ روپے کے کرنسی نوٹ بھی دیئے۔ سفر لمبا تھا اور ہمارے پاس پھوٹی کوڑی تک نہیں تھی۔ ساٹھ ستر روپے اُس زمانے میں بہت ہوتے تھے۔

نند پالا کے مکان سے ریلوے سٹیشن تک پہنچنے کا مرحلہ بڑا نازک تھا۔

نند پالا ہمارے ساتھ نہیں جا سکتا تھا۔ رات کے دس بج چکے تھے۔ میں نے اور اُرملا نے وہاں سے نکلنے کی پوری تیاری کر لی تھی۔ نند پالا کی ہدایت اور اُس کے پروگرام کے مطابق ہم رات کے اندھیرے میں اُس کے مکان کے پچھلے دروازے سے نکل گئے۔

اُس زمانے میں جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں دھنش کوڑی کا شہر چھوٹا سا تھا۔ آبادی زیادہ نہیں تھی۔ سرِ شام ہی بازار خالی ہو جاتے تھے اور سڑکوں بازاروں میں اتنی روشنی بھی نہیں ہوتی تھی۔ نند پالا نے ہمارے لئے ایک بیل گاڑی کا بندوبست کر دیا تھا جو اُس کے مکان سے کچھ فاصلے پر شہر کے کنارے ایک درخت کے نیچے کھڑی تھی۔ اُس زمانے میں لوگ شہروں میں بھی بیل گاڑیوں پر سفر کیا کرتے تھے۔ میں خود ایک بار بیل گاڑی میں بیٹھ کر مدراس کے ریلوے سٹیشن ایگمور تک گیا تھا کیونکہ مجھے اتفاق سے کوئی رکشہ ٹیکسی نہیں مل رہی تھی۔ یہ بیل گاڑیاں اُوپر سے ڈھکی ہوتی تھیں اور آگے پیچھے پردہ گرا ہوتا تھا جو ضرورت کے وقت اُٹھا بھی دیا جاتا تھا۔ آگے دو بیل جُتے ہوتے تھے۔

ہم جس بیل گاڑی میں بیٹھے اُس کے آگے پیچھے پردہ گرا ہوا تھا۔ گاڑی بان مدراسی کورنگی تھا۔ اُسے بتا دیا گیا تھا کہ ہمیں دھنش کوڑی کے ریلوے سٹیشن سے دو میل پیچھے پانی کی بڑی ٹینکی کے پاس پہنچانا ہے۔ وہاں سے ہمیں پیدل سٹیشن تک جانا تھا۔

بیل گاڑی آہستہ آہستہ چل پڑی۔ سٹیشن وہاں سے زیادہ دُور نہیں تھا۔ دس پندرہ منٹ میں ہم پانی کی بڑی ٹینکی کے پاس پہنچ گئے۔ گاڑی بان واپس چلا گیا۔ میں اور اُرملا اندھیرے میں کچھ دیر کھڑے ماحول کا جائزہ لیتے رہے۔ جب ہمیں یقین ہو گیا کہ

ہمارا پیچھا نہیں کیا جا رہا تو ہم دھان کے کھیتوں کے کنارے کنارے چل پڑے۔ دھنش کوڑی کے چھوٹے سے سٹیشن کی چند ایک روشنیاں ہمیں دُور سے دکھائی دے رہی تھیں۔ سٹیشن جب سو گز کے فاصلے پر رہ گیا تو میں نے گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ گاڑی سوا گیارہ بجے چلتی تھی اور ابھی آدھا گھنٹہ باقی تھا۔ اُرملا کہنے لگی۔

''مدراس جانے والی گاڑی سٹیشن سے ہی تیار ہوتی ہے۔ اس وقت گاڑی پلیٹ فارم پر لگ گئی ہو گی۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں ٹرین کے آس پاس ہی رہنا چاہئے۔''

اُرملا نے صحیح مشورہ دیا تھا۔ دھنش کوڑی کا سٹیشن میرا دیکھا ہوا تھا۔ میں نے اُرملا کو ساتھ لیا اور ہم دوسری طرف سے ہو کر پلیٹ فارم سے تھوڑے فاصلے پر آ کر ایک جگہ ریلوے لائن کے پاس اندھیرے میں بیٹھ گئے۔ سٹیشن کے پلیٹ فارم پر ایک گاڑی کھڑی تھی۔ یہ مدراس جانے والی گاڑی ہی ہو سکتی تھی۔ مسافروں کی مدھم مدھم آوازیں آ رہی تھیں۔ جب گاڑی کے چلنے میں دس منٹ رہ گئے تو میں نے اُرملا سے کہا۔

''پہلے تم سیکنڈ کلاس کے ڈبے میں سوار ہو گی۔ میں ٹرین چلنے کے وقت آ جاؤں گا۔''

ٹکٹ ہمارے پاس ہی تھے۔ ہم ایک دوسرے کے درمیان بیس پچیس فٹ کا فاصلہ ڈال کر چل پڑے۔ جب پلیٹ فارم قریب آ گیا تو اُرملا ٹرین کے آخری ڈبے کے پاس پہنچ کر پلیٹ فارم پر چڑھ گئی۔ میں بھی پلیٹ فارم سے دُور رہ کر ایک جگہ چھپ گیا۔ اُرملا کو میں دیکھ رہا تھا۔ وہاں چند ایک مسافر ہی تھے۔ ڈبوں میں روشنی ہو رہی تھی اور مسافر بھی نظر آ رہے تھے۔ اُرملا سیکنڈ کلاس کے ایک ڈبے میں داخل ہو گئی۔ میری نگاہیں اُس پر جمی ہوئی تھیں۔ میں نے دیکھا کہ وہ نند پالا کی ہدایت کے مطابق ڈبے کے باتھ رُوم میں چلی گئی۔ سیکنڈ کلاس کا ڈبہ بالکل خالی تھا۔

پلیٹ فارم پر اب کوئی مسافر نہیں تھا۔ گارڈ ہاتھ میں لالٹین لئے ٹہل رہا تھا اور بار بار اپنی گھڑی پر نگاہ ڈال لیتا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد اُس نے سیٹی بجائی۔ سیٹی کے بجتے ہی ٹرین کے انجن نے وِسل دیا۔ میں اپنی جگہ سے اُٹھ کر پلیٹ فارم پر آ گیا اور خاموشی سے سیکنڈ کلاس کے ڈبے میں گھس کر دوسرے کونے والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ گارڈ نے ایک بار پھر سیٹی بجائی۔ انجن نے دو بار وِسل دیا اور ٹرین پلیٹ فارم سے کھسکنے لگی۔ جب ٹرین پلیٹ فارم سے نکل گئی اور ریلوے یارڈ میں سے گزر رہی تھی کہ اُرملا باتھ رُوم سے نکل آئی۔

اُس نے مجھے دیکھا اور میرے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ کہنے لگی۔
''کسی نے ہمیں دیکھا تو نہیں؟''
میں نے جواب دیا۔ ''میرا خیال ہے کسی نے نہیں دیکھا۔ اگر دیکھا ہوتا تو ہم اِس وقت یہاں ٹرین کے ڈبے میں نہ بیٹھے ہوتے۔''
اُرملا کو اطمینان سا ہو گیا۔ کہنے لگی۔ ''خدا کرے ہم مدراس خیریت سے پہنچ جائیں۔''
میں نے کہا۔ ''مدراس پہنچ گئے تو خطرہ آدھے سے زیادہ ختم ہو جائے گا۔''
اُس نے کہا۔ ''خدا کرے ایسا ہی ہو۔ مجھے تو لگتا ہے کہ شِو مندر کے بھیڑیے جے پور بھی پہنچ جائیں گے۔''

اُرملا پر اگرچہ اسلامی تعلیمات کا گہرا اثر ہو چکا تھا۔ لیکن چونکہ وہ پیدائشی ہندو تھی اس لئے اُس کی زبان سے کبھی خدا کرے اور کبھی بھگوان کرے کے الفاظ نکل جاتے تھے۔

ٹرین دھنش کوڑی کو پیچھے چھوڑ کر مجورا یا مدورا کی جانب تیز رفتاری سے رات کے اندھیرے میں چلی جا رہی تھی۔ جو لوگ قیامِ پاکستان سے پہلے اس علاقے میں سفر کر چکے ہیں وہ جانتے ہوں گے کہ دھنش کوڑی کا سٹیشن انڈیا کی جنوبی تکون کے مشرق کی جانب سمندر کے ساحل پر واقع ہے۔ وہاں سے آگے بحری جہاز میں 25 میل کا سمندری سفر عبور کر کے سری لنکا کے ساحلی شہر تالی منار پر پہنچتے ہیں۔ انگریزوں کے زمانے میں تو دونوں ملکوں کے درمیان کسی پاسپورٹ ویزے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ آپ لاہور سے لنکا کے دارالحکومت کولمبو تک کا ریل کا ٹکٹ لے سکتے تھے۔ اتنا ضرور ہے کہ مدراس شہر میں ایک ہیلتھ سرٹیفکیٹ لینا پڑتا تھا۔ اور دھنش کوڑی شہر کے سول ہسپتال میں دو چار انجکشن لگوانے پڑتے تھے۔ میں اُس لائن پر ایک دو بار سفر کر چکا تھا۔ ٹرین خاصی رفتار سے رواں دواں تھی۔ ساری رات اور اگلا سارا دن سفر میں گزر گیا۔ راستے میں جنوبی انڈیا کے صرف تین بڑے شہر آئے۔ پہلا شہر مدورا یا مدورائی تھا جسے مندروں کا شہر بھی کہا جاتا تھا۔ اس کے بعد ترچنا پلی آیا جہاں کا بھارت ٹائم ڈانس اور سگار بڑے مشہور تھے۔ اس کے بعد کرشنا یا کرچنا پلم کا شہر آیا اور پھر گاڑی مدراس پہنچ گئی۔

مدراس شہر کا نام اب بھارت کی حکومت نے چنائی رکھ دیا ہے جو بڑا غیر رومانٹک نام ہے۔ جس زمانے کے میں اپنے ایڈونچرس سفر کی داستان بیان کر رہا ہوں اُس

زمانے میں بھی مدراس کے دو بڑے ریلوے سٹیشن تھے۔ ایک سٹیشن کا نام ایگمور تھا اور دوسرے کا نام غالباً مدراس سینٹرل ہی تھا۔ دونوں بڑے اژدھام قسم کے سٹیشن تھے۔ مدراس کے سینٹرل سٹیشن پر گاڑی ٹھہری تھی۔ ہم ٹرین سے اُتر کر سیدھے سیکنڈ کلاس کے ویٹنگ رُوم میں چلے آئے۔ پلیٹ فارم پر زیادہ دیر چلنا پھرنا ہمارے لئے مضر ثابت ہو سکتا تھا اور ہم کسی کی نگاہ میں آ سکتے تھے۔ میں نے اُرملا کو ویٹنگ رُوم میں ہی بیٹھنے کو کہا اور خود باہر نکل کر ریلوے کے ایک کنڈکٹر سے جے پور جانے والی گاڑی کے بارے میں پوچھا۔ اُس نے بتایا کہ مدراس سے سیدھی جے پور کوئی گاڑی نہیں جاتی۔ ہمیں مدراس سے ناگ پور جانا پڑے گا۔ ناگ پور سے ہمیں بھوپال جانے والی گاڑی بدلنی ہو گی۔ بھوپال سے ہمیں جے پور جانے والی گاڑی مل جائے گی۔ یہ بھی بڑا لمبا سفر تھا۔ انڈیا کے سارے جنوبی اور وسطی جنگلوں، پہاڑی علاقوں اور دریاؤں اور شہروں میں سے گزرنا تھا۔ یہ سفر بھی تین دن کا تھا۔ میں نے ناگ پور جانے والی گاڑی کا وقت معلوم کیا اور جے پور تک کے دو ٹکٹ مدراس سٹیشن سے ہی خرید لئے۔ ہم غروبِ آفتاب کے وقت مدراس پہنچے تھے۔ ناگپور جانے والی گاڑی رات کے دس بجے چلتی تھی۔ اتنی دیر ہم ویٹنگ رُوم میں ہی بیٹھے رہے۔ وہیں ہم نے کھانا وغیرہ کھایا۔ اُرملا پریشان تھی کہ شِو مندر کے درندے ضرور ہمارے پیچھے لگے ہوں گے۔ میں اُسے تسلی دیتا کہ اگر وہ ہمارے پیچھے لگے ہوتے تو اب تک ہم پر وار کر چکے ہوتے۔ چونکہ ایسا نہیں ہوا اس لئے اسے فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

دس بجے رات ہم ناگ پور والی گاڑی میں سوار ہو گئے۔ مدراس سے گاڑی چلی تو ناگ پور تک راستے میں جو بڑے شہر آئے وہ میں آپ کو بتاتا ہوں۔ مجھے وہ سارے شہر یاد ہیں۔ مدراس سے آگے پہلا بڑا شہر نیلور آیا۔ اس کے بعد گنٹور کا شہر آیا۔ پھر ٹرین بیجواڑہ کے بہت بڑے سٹیشن پر رُکی۔ یہ بھی بہت وسیع و عریض اور دُور دُور تک پھیلا ہوا شہر تھا۔ یہاں سے ٹرین انڈیا کے مشرقی ساحل سے ہٹ کر حیدر آباد کی طرف ہو گئی۔ اس وقت حیدر آباد دکن انڈیا کی سب سے بڑی اور سب سے امیر ترین اور مشہور مسلم ریاست تھی۔ حیدر آباد میں بھی ٹرین کافی دیر رُکی رہی۔ یہاں ریاستی پولیس کے اہلکار پلیٹ فارم پر موجود تھے جنہوں نے سرخ ترکی ٹوپیاں پہن رکھی تھیں۔ میں اور اُرملا اب

ایک ہی ڈبے میں بیٹھے ہوئے تھے جو انٹر کلاس کا ڈبہ تھا۔ حیدر آباد (دکن) سے گاڑ
چلی تو ٹرین نظام آباد آ کر رُکی ۔ یہ شہر بھی ریاست حیدر آباد دکن کا ایک خوبصورت او
مشہور شہر تھا۔ یہاں سے آگے ٹرین واردہ سے ہوتی ہوئی آخر ناگ پور پہنچ گئی۔

دو ڈھائی دن سفر میں لگ گئے۔ پو پھٹ رہی تھی جب ٹرین ناگ پور پہنچی۔ ناگ پ
بھی بہت بڑا جنکشن تھا۔ اس شہر میں سانپوں کے ناگ دیوتا کا مشہور مندر تھا جہا
سانپوں کی پوجا ہوتی تھی۔ میں ان مندروں میں گھوم پھر چکا تھا اور وہاں میں نے ہن
دیو مالا کے کئی خون آشام اور انسانیت سوز پہلوؤں کو بے نقاب دیکھا تھا۔ پرانی نسل ک
یاد ہو گا، نئی نسل کو شاید علم نہ ہو کہ اُس زمانے میں ناگ پور کے سنگترے بڑے مشہ
تھے۔ ایک تو پٹھانکوٹ کے سنگترے مشہور تھے جو پھولے ہوتے تھے اور اُن کے اند
سنگترے کی پھاڑیاں سمٹ کر بیٹھی ہوتی تھیں۔ پٹھانکوٹ کے سنگترے ترش ہوتے تھے
اس کے مقابلے میں ناگ پوری سنگترے خوب جمے ہوئے ہوتے تھے۔ باہر سے اُن
رنگ سبز ہوتا تھا اور اندر سے کیسری رنگ کے ہوتے تھے اور بے حد میٹھے ہوتے تھے
انڈیا کے ہر شہر میں ان کا جوس بڑے شوق سے پیا جاتا تھا۔ اور انگریز، گرے فروٹ
بعد ناگ پوری سنگتروں کو بے حد پسند کرتے تھے اور ان کے ڈنر اور ہر سرکاری اور
سرکاری پارٹی میں یہ سنگترے موجود ہوتے تھے۔ پاکستان بن جانے کے بعد ہمار
مسلمان زرعی ماہرین نے شب و روز کی محنت اور اپنی خداداد صلاحیتوں سے ناگ پو
سنگترے کے مقابلے میں کینو پیدا کیا جس نے ناگ پوری سنگترے کی اجارہ دار
ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔ چنانچہ آج تک انڈیا سے جو لوگ پاکستان آتے ہیں
واپس جاتے ہوئے سوغات کے طور پر کھیوڑے کے نمک اور دوسری پاکستانی مصنوعا
کے علاوہ کینوؤں کا ایک آدھ ٹوکرا ضرور بھر کر لے جاتے ہیں۔ پاکستان آنے وا
ہندو سکھ زائرین کو وہاں کے لوگ فرمائشیں کر کے بھیجتے ہیں کہ واپسی پر ہمارے لئے
کچھ نہ لائیں مگر پاکستانی کینو ضرور لیتے آئیں۔ یوں ہمارے پاکستانی ماہرین نے اس
پر بھی بھارت کو شکست دی ہے۔ کینو کے علاوہ انڈیا کے لوگ پاکستان کے سبز رنگ
بڑے انگور اور خاص طور پر سندر خانی انگوروں کو تو اب تک ترستے ہیں۔ انڈیا نے سر
کوشش کی کہ کسی طرح پاکستانی انگور کے مقابلے میں سندر خانی انگور اور لمبوترا سبز موٹا

پیدا کیا جائے مگر وہ کامیاب نہیں ہو سکا۔ انڈیا میں جگہ جگہ انگور کے باغات لگائے گئے
ہیں اور انگور کی فصل بھی بہت ہوتی ہے مگر انڈیا کا انگور گول ہوتا ہے اُس کا چھلکا موٹا ہوتا
ہے اور وہ ترش ہوتا ہے۔ پاکستان کا سندر خانی انہیں پھر بھی نصیب نہیں ہو سکا۔ خیر، یہ تو
بعد کے زمانے کی باتیں ہیں اور میں قیامِ پاکستان کے دو ایک سال بعد کے زمانے کی
کہانی بیان کر رہا ہوں۔

ناگ پور انڈیا کے بالکل وسط میں واقع ہے۔ بہت بڑا جنکشن ہے۔ یہاں سے کلکتہ،
بمبئی اور شمال میں دِلّی، جبل پور اور نیچے مدراس کو گاڑیاں جاتی ہیں۔ ناگ پور سے ہم
وایا، ہوشنگ آباد، بھوپال، بمبئی جانے والی ٹرین میں بیٹھ گئے۔ ناگ پور سے بھوپال
جانے والی ریلوے لائن انڈیا کے وسطی گھنے اور تاریک جنگلوں میں سے ہو کر گزرتی
ہے۔ یہ سارے کا سارا راستہ بھیانک گنجان جنگلوں، دلدلی میدانوں، ندی نالوں،
دریاؤں اور چھوٹی بڑی سرسبز پہاڑیوں سے بھرا پڑا ہے۔ ان جنگلوں میں ہر قسم کے
حشرات الارض، جانور اور درندے پائے جاتے ہیں۔ ایسے ایسے جنگلی ریچھ ہیں کہ ایک
بار آدمی کے پیچھے پڑ جائیں تو جب تک اُسے ہلاک نہ کر ڈالیں یا خود ہلاک نہ ہو جائیں
اُس کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ راتوں کو شیروں کے دھاڑنے کی آوازیں جنگل کی ہولناک
خاموشی میں گونجتی رہتی ہیں۔

میں امرتسر سے لاہور اور کلکتے سے بمبئی جاتے ہوئے کئی بار ان جنگلوں میں سے گزر
چکا تھا اور ایک دو بار تو بھوپال کے قرب و جوار کے ایک خوفناک جنگل میں بغیر ٹکٹ سفر
کرنے کے جرم میں رات کے وقت ٹرین سے اُتار بھی دیا گیا تھا۔ اور پھر مجھ پر اُس
بھیانک خونی جنگل میں کیا گزری یہ ایک الگ داستان ہے۔ خونخوار ڈاکوؤں کے چھپنے
کے لئے یہ جنگل محفوظ پناہ گاہوں کا کام دیتے ہیں۔ اُس زمانے میں یہ جنگل مشہور زمانہ
ڈاکو، سلطانہ ڈاکو اور اُس کے گروہ کی آماجگاہ تھے۔ جس زمانے کا میں ذکر کر رہا ہوں
اُس زمانے میں بھی سنا گیا تھا کہ سلطانہ ڈاکو کا ایک مسلمان ساتھی رنگا ڈاکو انہی جنگلوں
میں دندناتا پھر رہا ہے۔ رنگے ڈاکو کا پورا نام اورنگزیب تھا اور رنگا ڈاکو کے نام سے
مشہور تھا۔ اُس کے بارے میں مشہور تھا کہ بھوپت ڈاکو کی طرح وہ بھی کھدر پوش کانگریسی
ٹوپی والے بگلا بھگت لیڈروں کا جانی دشمن ہے۔ اور جہاں کسی کھدر پوش گاندھی کیپ

والے کانگریسی کو دیکھتا ہے اُسے گولی مار کر ٹھنڈا کر دیتا ہے۔ خدا جانے اس میں سچائی کا عنصر کہاں تک تھا یا یہ بات کانگریسی ہندوؤں نے ایک مسلمان ڈاکو کو مزید بدنام کرنے کے واسطے مشہور کر رکھی تھی۔

ناگ پور سے میں اور اُرملا بھوپال جانے والی ٹرین کے انٹر کلاس والے ڈبے میں سوار ہو گئے۔ ڈبے میں دوسرے مرد اور مسافر عورتیں بھی بیٹھی تھیں۔ ٹرین چل پڑی۔ ہوشنگ آباد، ناگ پور اور بھوپال کے آدھے راستے میں ہے۔ ہوشنگ آباد ٹرین پہنچی تو ڈبے میں سے کافی مسافر اُتر گئے۔ اُس وقت آسمان پر سیاہ بادل چھا رہے تھے۔ لگتا تھا کہ بارش ضرور ہو گی۔ اب ہم اپنے آپ کو خونی مندر کے پجاری غنڈوں سے کافی محفوظ سمجھنے لگے تھے۔ ویسے بھی ہم دھنش کوڑی سے شمال مغرب کی جانب کافی دُور بلکہ بہت دُور نکل آئے تھے۔ صوبے بدل گئے تھے، زبان بدل گئی تھی، لوگوں کے رنگ رُوپ بدل گئے تھے۔ اُرملا بھی اب کسی وقت مجھ سے مسکرا کر بات کر لیتی تھی۔

ہوشنگ آباد اور بھوپال کے درمیان ایک چھوٹا سا سٹیشن سونی گام نام کا آتا ہے۔ یہ کوئی اہم سٹیشن آبادی کے اعتبار سے نہیں ہے۔ مگر یہاں پر آنے جانے والی گاڑیاں پانی اور کوئلہ انجن میں بھرنے کے لئے ضرور رُکتی ہیں۔ ہوشنگ آباد سے گاڑی چلی تو ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہو گئی۔ اگرچہ برسات کا موسم گزر چکا تھا مگر ان جنگلوں میں تقریباً سارا سال بارشیں ہوتی رہتی ہیں جس کی وجہ سے یہ جنگل گھنے اور سرسبز ہو گئے ہیں اور بانس اور ناگ پھنی کے درخت اور پودے تو اپنے آپ زمین سے نکل کر پھیل جاتے ہیں۔ بارشوں کا پانی آبشاروں کی شکل میں نشیبی علاقوں میں گر کر اُنہیں جھیلوں میں تبدیل کر دیتا ہے۔ اگرچہ ہمیں بھوپال پہنچ کر جے پور کے لئے پھر ایک ٹرین پکڑنی تھی اور جے پور ابھی خاصی دُور تھا لیکن اُرملا بڑی خوش تھی کہ وہ اپنے شہر کے قریب پہنچ گئی ہے یا پہنچ رہی ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد بوندا باندی نے موسلا دھار بارش کی شکل اختیار کر لی۔ بارش کی بوچھاڑیں ٹرین کے ڈبے کے اندر آنے لگیں۔ ہم نے کھڑکیوں کے شیشے چڑھا دیئے۔ ہم دونوں کھڑکی کے شیشے کے ساتھ لگ کر باہر جنگل میں ہوتی موسلا دھار بارش سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

شہروں کی بارش خواہ کتنی ہی موسلا دھار کیوں نہ ہو، وہ جنگل کی بارشوں کے مقابلے

میں بڑی نازک اندام ہوتی ہیں۔ شہروں کی بارشوں سے انسان پر ایک رومانٹک سی کیفیت طاری ہوتی ہے جبکہ گھنے جنگلوں اور خاص طور پر افریقہ اور وسطی ہند یعنی بندھیا چل اور کوہ ست پڑا کے زیریں جنگلوں میں ہونے والی موسلا دھار بارشوں کو دیکھ کر آدمی پر ایک ہیبت طاری ہو جاتی ہے۔ خاص طور پر رات کی تاریکی میں تو ان طوفانی بارشوں کی آواز اور زیادہ ڈراؤنی اور لرزہ طاری کر دینے والی ہو جاتی ہے۔ جو لوگ جنگلوں کی ان ہیبت ناک بارشوں کو پہلی بار دیکھتے ہیں اُن پر تو واقعی لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔ میرا ان بارشوں سے کئی بار آمنا سامنا ہو چکا تھا اس لئے میں ان بارشوں سے ایک قسم کا رُومانی لطف اُٹھاتا تھا اور خاص طور پر اُس وقت تو یہ بارشیں بہت زیادہ رومانٹک لگنے لگتی ہیں جب کوئی ایسی لڑکی آپ کے ساتھ ہو جس سے آپ دل و جان سے محبت کرتے ہوں۔

یہ دن کے تیسرے پہر کا وقت تھا۔ یعنی سہ پہر کے تین بجنے والے تھے لیکن سیاہ گھنے بادلوں نے دن کے اُجالے کو کافی دُھندلا دیا ہوا تھا جو کم از کم مجھے تو اچھا لگ رہا تھا۔ ٹرین کی رفتار آہستہ ہونے لگی تو اُرملا نے کہا۔

''شاید بھوپال آ گیا ہے۔''

مجھے معلوم تھا ٹرین کیوں آہستہ ہوئی ہے۔ میں نے کہا۔ ''بھوپال ابھی کافی دُور ہے۔ یہ سونی گام کا سٹیشن آ رہا ہے۔ یہاں انجن میں کوئلہ اور پانی بھرا جائے گا۔''

ٹرین سونی گام کے سٹیشن پر ٹھہر گئی۔ جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں یہ جنگل کے درمیان ایک ویران سا سٹیشن تھا۔ بارش اُس وقت اچانک رُک گئی تھی اور ہوا چلنے لگی تھی۔ کچھ مسافر اُتر کر باہر ٹہلنے لگے۔ ہمارے ڈبے میں بھوپال کی ایک فیملی بیٹھی ہوئی تھی اور دو چار اور مسافر تھے جن میں سے ایک سردار جی اخبار پڑھ رہے تھے اور ایک مسافر اُوپر کی برتھ پر سو رہا تھا۔ میں اور اُرملا کھڑکی کے پاس بیٹھے تھے۔ پلیٹ فارم بارش میں بھیگا ہوا تھا۔ اُرملا نے پوچھا۔

''یہاں گاڑی کتنی دیر کھڑی ہو گی؟''

میں نے کہا۔ ''آدھا گھنٹہ تو لگ ہی جائے گا۔''

اُس کا منہ لٹک گیا۔ کہنے لگی۔ ''میں جلدی جے پور پہنچنا چاہتی ہوں۔ جانے کیوں

مجھے ڈر لگنے لگا ہے۔''

میں نے ہنس کر کہا۔ ''اب کس بات کا ڈر؟ ہم خطرے والے علاقے سے کوسوں دُور نکل آئے ہیں۔ اور پھر آدھا گھنٹہ یونہی گزر جائے گا باتیں کرتے ہوئے۔''

نہ جانے کیوں اُس پر اچانک خوف سا طاری ہو گیا تھا۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ اُس کی چھٹی حِس اُسے آنے والے کسی خطرے سے آگاہ کر رہی تھی۔ اُرملا اگرچہ ہندو گھرانے میں پیدا ہوئی تھی مگر بتوں کی پوجا نہیں کرتی تھی۔ کیونکہ اُس کا تعلق جین دھرم سے تھا۔ وہ صرف ایک برہما ایک پالن ہار اور ایک خدا کو مانتی تھی اور دوسرے جینیوں کی طرح جین مت کے بانی مہاویر کے بُت کی بھی پوجا اب نہیں کرتی تھی بلکہ وہ ایک طرح سے مورتی پوجا سے بالکل تائب ہو چکی تھی۔ اس کے علاوہ اُس کے دل پر اسلامی تعلیمات کا بھی گہرا اثر تھا اور اسلامی تعلیمات نے بھی اُس کے دل کو پاک صاف کر دیا تھا۔ ایک اور وجہ یہ تھی کہ اُرملا نے اپنے دل و دماغ کو برے خیالات سے پاک رکھا ہوا تھا۔ انسان کی شخصیت پر جب یہ رنگ چڑھ جاتا ہے اور دل کی تختی برے اور فاسد خیالات سے پاک ہو جاتی ہے تو قدرت ایسے آدمی کو آنے والے اچھے برے واقعات کا ایک آدھ بار اشارہ ضرور کر دیتی ہے۔ یہ قدرت کی طرف سے آنے والے خطرے کا اشارہ تھا جس کو اُرملا پڑھ تو نہ سکی، سمجھ تو نہ سکی لیکن اُس کا دل کسی آنے والے خطرے کے نا معلوم احساس سے بوجھل ضرور ہو گیا تھا۔

میں نے اُرملا کی اس قسم کی وجدانی کیفیت کو ہمیشہ بڑی اہمیت دی تھی۔ اُس وقت بھی جب اُس نے اچانک کہا کہ مجھے ڈر سا لگنے لگا ہے تو میں سوچنے لگا اگر اُرملا ایسا کہہ رہی ہے تو کچھ نہ کچھ ضرور ہونے والا ہو گا اور ہمیں احتیاط سے کام لینا چاہئے۔ میں نے اُرملا سے کہا۔

''تم ایسا کرو، کھڑکی کے پاس سے ہٹ کر کونے والی سیٹ پر یا اُوپر برتھ پر جا کر لیٹ جاؤ۔''

اُرملا جیسے پہلے ہی سے تیار تھی۔ اُوپر والی برتھ خالی پڑی تھی۔ وہ اُٹھی اور اُوپر برتھ پر چڑھ کر لیٹ گئی۔ کہنے لگی۔ ''اگر میں سو گئی تو مجھے بھوپال پہنچنے پر ہی اُٹھانا۔''

''نو پرابلم! تم آرام کرو۔ میں جاگ رہا ہوں۔''

یہ کہہ کر میں یونہی خوشگوار ہوا میں ٹہلنے کی خاطر ڈبے سے اُتر آیا۔ دُور انجن کے پچھلے حصے میں مزدور عورتیں اور مرد کوئلے کی بھری ہوئی ٹوکریاں لا لا کر اُلٹ رہے تھے۔ میں ٹرین سے ذرا ہٹ کر ٹہلتے ٹہلتے انجن کے قریب چلا گیا۔ ایک نگاہ انجن پر ڈالی اور واپس مُڑنے لگا تو مجھے محسوس ہوا کہ میں کسی کی نگاہوں میں آ گیا ہوں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جب میں انجن کے قریب پہنچ کر مُڑا تھا تو میری نگاہ ایک آدمی پر پڑ گئی تھی جو پلیٹ فارم کے جنگلے سے ٹیک لگا کر کھڑا سگریٹ پی رہا تھا۔ اُس نے تنگ پتلون کے اُوپر صرف ایک نیلے پیلے رنگ کی بنیان پہنی ہوئی تھی اور سر پر ریشمی مفلر لپیٹ رکھا تھا۔ شکل اور حلیے ہی سے وہ کوئی جرائم پیشہ لگ رہا تھا۔ وہ مجھے گھور کر دیکھ رہا تھا اور اُس وقت تک میری طرف گھور گھور کر تکتا رہا جب تک کہ میں نے آنکھیں دوسری طرف نہیں کر لیں۔

اب میری چھٹی حِس بھی بیدار ہو گئی تھی اور اس نے مجھے خبردار کر دیا تھا کہ شیراز! خطرہ تمہارے سر پر منڈلانے لگا ہے۔ میں سوائے اس کے اور کچھ نہیں کر سکتا تھا کہ سر جھکائے خاموشی سے چل کر اپنے ڈبے میں آیا اور کھڑکی کے پاس بیٹھنے کی بجائے ڈبے کی درمیان والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ میں نے چہرہ اُوپر کر کے دیکھا، اُرملا دُوسری طرف منہ کئے برتھ پر لیٹی ہوئی تھی۔ میرے دل میں شک پڑ چکا تھا کہ ہو نہ ہو یہ آدمی جو مجھے گھور کر دیکھ رہا تھا وہ مندر کے پجاری یا سیٹھ کیشو راؤ کے خونی گروہ کا آدمی ہے اور وہ مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا یا اُس نے مجھے پہچان لیا تھا۔ اتنے میں وہی آدمی ڈبے کے آگے سے گزرا۔ اب اُس کے ساتھ ویسے ہی حلیے کا اور جرائم پیشہ شکل والا ایک اور آدمی بھی تھا۔ میرے ڈبے کے سامنے آ کر وہ بہت آہستہ آہستہ قدم اُٹھانے لگے اور دونوں مجھے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے تھے۔ اب تو مجھے یقین ہو گیا کہ شِو مندر کے بدمعاش یا سیٹھ کیشو راؤ کے زرخرید قاتل غنڈے ہم تک پہنچ گئے ہیں۔ معلوم نہیں اُنہوں نے اُرملا کو بھی دیکھا تھا یا نہیں؟ اگر نہ بھی دیکھا ہو تو اُنہوں نے کم از کم مجھے پہچان لیا تھا کہ یہی وہ آدمی ہے جو شِو مندر کے پہرے دار کو قتل کر کے سیٹھ کی خاص الخاص دیو داسی کو دھنش کوڑی سے اغواء کر کے لے گیا ہے۔ اگر میرا اندازہ درست تھا تو پھر اب میری اور اُرملا کی خیر نہیں تھی۔

ہمیں اپنے سروں پر لٹکتی ہوئی تلوار کے گرنے سے پہلے پہلے جان بچانے کا فوری

بندوبست کرنا تھا۔ میرے ذہن نے تیزی سے کام کرنا شروع کر دیا۔ میں اس وقت کیا کرسکتا تھا؟ اُرملا کو ٹرین سے اُتار کر اُس کے وہاں سے بھگا کر نہیں لے جا سکتا تھا۔ میں اُن غنڈوں کی نظر میں تھا اور یہ بات یقینی تھی کہ وہ دونوں مسلح تھے۔ اُن کے پاس پستول ضرور تھے۔ جبکہ میرے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ اگر ٹرین میں ہی بیٹھا رہتا ہوں تو اس بات کا بھی امکان تھا کہ ٹرین کے چلتے ہی وہ دونوں ہمارے ڈبے میں سوار ہو جاتے اور جب ٹرین ذرا آگے جاتی تو مجھے اور اُرملا کو گولیوں کا نشانہ بنا کر چلتی ٹرین سے باہر کود جاتے۔ کیونکہ نند پالا نے مجھے خبردار کر دیا تھا کہ سیٹھ نے اپنے آدمیوں کو یہ حکم دے دیا ہے کہ میں اور اُرملا جہاں نظر آئیں ہم دونوں کو اسی وقت قتل کر دیا جائے۔ ہمیں پکڑ کر سیٹھ کے پاس لانے کی ضرورت نہیں ہے۔

میں سوچ میں پڑ گیا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ اتنے میں گارڈ کی سیٹی کی آواز آئی۔ ٹرین چلنے والی تھی۔ مجھے اور تو کچھ نہ سوجھا، میں نے جلدی سے اُرملا کو جگایا اور کہا۔

''فوراً میرے ساتھ ڈبے کی دوسری طرف اُتر جاؤ۔''

یہ کہہ کر میں ڈبے کے دوسرے دروازے میں سے ریلوے لائن کے پاس اُتر گیا۔ اُرملا کو پہلے سے خطرے کا احساس ہو چکا تھا۔ اُس نے ایک سیکنڈ کی بھی دیر نہ لگائی اور وہ بھی میرے پیچھے ڈبے کے دوسرے دروازے میں سے نیچے اُتر آئی۔ ہم دوڑ کر ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ جو جنگلی جھاڑیاں تھیں اُن کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گئے۔ اُرملا نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ اُس کا ہاتھ خوف کی وجہ سے ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ وہ گہری سانس لے کر گھبرائی ہوئی آواز میں بولی۔

''کیا بات ہوئی تھی؟''

میں نے سرگوشی میں اُسے کہا۔ ''مجھے شک ہے کہ سیٹھ کیشو راؤ کے دو بھیڑیئے ہمارا پیچھا کرتے یہاں تک پہنچ گئے ہیں اور اس وقت سٹیشن پر موجود ہیں۔'' پھر میں نے سرگوشی میں اُسے ساری بات بیان کر دی۔ وہ سہم کر میرے ساتھ لگ گئی۔

تھوڑی دیر پہلے کی بارش میں جھاڑیاں بھیگی ہوئی تھیں۔ گارڈ نے دوسری سیٹی دی۔ انجن نے وسل دیا اور ٹرین پلیٹ فارم سے کھسکنا شروع ہو گئی۔ میری آنکھیں اُسی ڈبے پر لگی تھیں جس کے پچھلے دروازے سے ہم نے باہر چھلانگیں لگائی تھیں۔ گاڑی نے ابھی

آدھا پلیٹ فارم ہی طے کیا تھا کہ ہمارے والے ڈبے کے پچھلے دروازے میں سے دو آدمی آگے پیچھے نیچے کودے۔ میں نے اُنہیں پہچان لیا۔ یہ وہی دو آدمی تھے۔ وہ مجھے قتل کرنے کی نیت سے چلتی ٹرین میں میرے ڈبے میں گھسے ہوں گے اور مجھے وہاں نہ پا کر وہ بھی ڈبے سے باہر کود گئے۔ اُنہیں یقین ہو گیا ہو گا کہ میں نے ڈبے سے باہر چھلانگ لگا دی ہے۔

دونوں آدمی اسی طرح ڈبے میں سے کودے تھے جس طرح میں نے اور اُرملا نے چھلانگیں لگائی تھیں۔ ٹرین سونی گام سٹیشن سے نکل گئی تھی۔ پلیٹ فارم خالی ہو گیا تھا۔ دونوں آدمی ایک جگہ کھڑے اپنے دائیں بائیں دیکھ رہے تھے جیسے مجھے تلاش کر رہے ہوں۔ میں نے اُرملا کے کان میں سرگوشی کی۔

''یہی وہ آدمی ہیں۔ خاموش رہنا۔''

دونوں اِدھر اُدھر دیکھتے جہاں ہم چھپے ہوئے تھے وہاں آ کر کھڑے ہو گئے۔ میں سانس روک کر بالکل بُت بن گیا۔ میری ذرا سی حرکت اُن لوگوں کو بتا سکتی تھی کہ میں ان جھاڑیوں کے پیچھے چھپا ہوا ہوں۔ ابھی اُنہیں یہ علم نہیں تھا کہ میرے ساتھ اُرملا بھی ہے جس کو قتل کرنا مجھ سے بھی زیادہ ضروری تھا۔ اُرملا بھی بالکل ساکت میرے ساتھ لگ کر بیٹھی تھی۔ اُن میں سے ایک نے کہا۔

''کہاں جا سکتا ہے وہ؟''

دوسرے نے کہا۔ ''کہیں وہ دوسری طرف سے نکل نہ گیا ہو۔''

پہلا آدمی جس نے سر پر مفلر لپیٹ رکھا تھا، بولا۔ ''دوسری طرف تو ہم کھڑے تھے اس طرف سے نکلتا تو ہمیں نظر آ جاتا۔''

دوسرا بولا۔ ''اب کیا کریں؟''

پہلے نے کہا۔ ''اُسے تلاش کر کے ٹھکانے لگانا ہے۔ وہ یہیں کہیں چھپا ہوا ہو گا۔''

دوسرا آدمی بھی نوجوان تھا اور اُس نے گلے میں سرخ رُومال باندھا ہوا تھا۔ وہ کہنے لگا۔ ''وہ جنگل میں نکل گیا ہو گا۔''

''وہ جہاں بھی ہو گا ہم اُسے پکڑ لیں گے۔ آؤ میرے ساتھ۔'' پہلے نے یہ کہا اور اپنے ساتھی کو لے کر ہماری جھاڑیوں کے بالکل قریب سے ہو کر نیچے ڈھلان اُتر کر

جنگل کے درختوں کی طرف اُتر گیا۔ میں گردن موڑ کر جھاڑیوں کے درمیان میں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ جب دونوں درختوں میں جا کر نظروں سے اوجھل ہو گئے تو میں نے لمبا سانس لیا اور اُرملا سے کہا۔

''اب تمہیں یقین ہو گیا ہو گا کہ مجھے بالکل ٹھیک شک پڑا تھا۔''

''اب ہم کہاں جائیں گے؟'' اُرملا نے مایوسی کے لہجے میں مجھ سے پوچھا۔

میرا ذہن بھی تیزی سے یہی سوچ رہا تھا کہ ان دونوں قاتلوں سے جان بچانے کے لئے ہمیں کیا کرنا ہو گا؟ اور کیا کرنا چاہئے۔ سٹیشن پر بھوپال کی طرف جانے والی گاڑی خدا جانے کب آتی۔ اتنی دیر تک ہم سٹیشن پر بھی نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ اُوپر سے دن تیزی سے ڈھلنا شروع ہو گیا تھا۔ شام ہونے والی تھی اور درندہ صفت قاتل ہماری تلاش میں تھے۔ ہمارے چاروں طرف انڈیا کے سب سے زیادہ گنجان اور سب سے زیادہ خطرناک جنگل پھیلے ہوئے تھے۔ اکیلا ہوتا تو کہیں بھی، کسی بھی درخت پر چڑھ کر بھوپال کو جانے والی کسی دوسری ٹرین کا انتظار کر سکتا تھا۔ لیکن اُرملا میرے ساتھ تھی۔ اُس کی زندگی مجھے اپنی زندگی سے زیادہ عزیز تھی۔ ہم ابھی تک جھاڑیوں کے پیچھے چھپ کر بیٹھے تھے۔ میں نے آہستہ سے کہا۔ ''میرا خیال ہے ہمیں یہاں سے اُٹھ کر سٹیشن کی دوسری طرف جنگل میں نکل جانا چاہئے اور رات ہونے سے پہلے پہلے جنگل میں جتنی دُور نکل سکتے ہیں ہمیں نکل جانا چاہئے۔''

اُرملا نے تھکی ہوئی آواز میں کہا۔ ''جیسے تمہاری مرضی۔''

میں نے جھاڑیوں کی شاخیں ہٹا کر باہر کی فضا کا جائزہ لیا۔ ہر طرف خاموشی اور ویرانی تھی۔ سٹیشن کا پلیٹ فارم اس طرح ویران ہو گیا تھا جیسے وہاں کبھی کوئی گاڑی نہ آئی ہو۔ میں نے اُرملا سے کہا۔

''آ جاؤ!''

ہم اُٹھ کر تیز قدموں سے چلتے ہوئے ریلوے لائن کراس کر کے پلیٹ فارم کی دوسری طرف جھاڑیوں میں اُتر گئے۔ اُس جانب بھی آگے جنگل شروع ہو جاتا تھا۔ اُرملا نے میرے ساتھ کافی مصیبتیں اُٹھائی ہوئی تھیں اور جنگلوں میں ماری ماری پھرتی رہی تھی۔ لیکن اب مجھے ایسے لگ رہا تھا جیسے وہ تھک گئی ہو۔ مندر کے تہہ خانے کی زندگی

نے اُسے نڈھال اور بے حوصلہ سا کر دیا تھا۔ سامنے کچھ فاصلے پر گھنے جنگل منہ پھاڑے کھڑے تھے۔ یہ بات میرے علم میں تھی کہ ان جنگلوں کا شمار انڈیا کے سب سے گنجان اور خطرناک جنگلوں میں ہوتا ہے۔ اور خاص طور پر سورج غروب ہو جانے کے بعد ان جنگلوں میں جانا اپنی موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ مگر مجبوری تھی۔ سورج غروب ہو چکا تھا اور مجھے اُرملا کے ساتھ ان جنگلوں میں جانا پڑ رہا تھا۔ کیشو راؤ کے خونی درندوں سے بچنے کی اور کوئی جگہ دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ یہی جنگل ہمیں کسی حد تک پناہ دے سکتے تھے۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ جنگل میں اُرملا کو لے کر زیادہ دُور تک جانے کا خطرہ مول نہیں لوں گا۔ شروع میں کسی درخت کی شاخوں میں چھپ کر بیٹھ جائیں گے اور رات گزار دیں گے۔ دن نکلنے پر سٹیشن پر آ جائیں گے۔ دن کے وقت کوئی نہ کوئی گاڑی تو آ ہی جائے گی۔ خواہ وہ بھوپال جانے والی ہو، خواہ ناگ پور جانے والی ہو۔ ہم اُس میں سوار ہو کر اس علاقے سے نکل جائیں گے۔

اُرملا کو میں نے بالکل اپنے ساتھ رکھا ہوا تھا۔ ہم جنگل میں داخل ہو گئے۔ گنجان اور ایک دوسرے کی شاخوں میں اُلجھے ہوئے درختوں کی وجہ سے جنگل میں رات ہونے سے قبل ہی اندھیرا سا چھا رہا تھا۔ ایک ڈرا دینے والا سناٹا چاروں طرف چھایا ہوا تھا۔ اگرچہ اُرملا جنگل کے شب و روز سے آشنا تھی مگر اس جنگل میں داخل ہونے کے بعد وہ بھی گھبرا سی گئی تھی۔ کہنے لگی۔

''یہاں تو ابھی سے اندھیرا ہو رہا ہے۔ رات کو تو کچھ بھی نظر نہیں آئے گا۔''

میں نے کہا۔ ''ہم رات ہونے سے پہلے ہی کوئی اچھی سی جگہ دیکھ کر چھپ جائیں گے۔ رات گزارنے کے بعد سٹیشن پر واپس آ جائیں گے اور جس طرف سے بھی کوئی گاڑی آئے گی، اُس میں بیٹھ کر یہاں سے نکل جائیں گے۔''

اُرملا خاموش رہی اور میرا بازو تھامے میرے ساتھ آہستہ آہستہ چلتی رہی۔ نہ کوئی چلنے کا راستہ تھا نہ کوئی پگ ڈنڈی تھی۔ ہمیں جھاڑیوں کو اِدھر اُدھر ہٹا کر چلنا پڑ رہا تھا۔ اتنے بڑے بڑے درخت تھے کہ اُن کی جڑیں زمین سے باہر نکل کر پھیلی ہوئی تھیں۔ ہم اُن سے بچ کر قدم اُٹھاتے ہوئے چل رہے تھے۔ اُرملا بولی۔

''یہاں تو درختوں کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے۔ ہم کہاں چھپ سکیں گے؟''

میں نے جواب دیا۔ ''میرا خیال ہے کہ ہمیں کسی درخت پر اچھی سی جگہ تلاش کرنی چاہئے۔''

جن درختوں کے درمیان سے ہم گزر رہے تھے وہ ایسے درخت تھے کہ عظیم الشان ستونوں کی طرح اُن کے تنے بالکل سیدھے کئی فٹ کی بلندی تک چلے گئے تھے۔ اُوپر اُن کی شاخیں بڑی بڑی چھتریوں کی طرح ایک دوسری میں اُلجھ گئی تھیں اور جنگل میں ایک چھت سی بن گئی تھی۔ ہم آہستہ آہستہ راستہ بناتے چل بھی رہے تھے اور چوکنے بھی تھے کہ کسی طرف سے سیٹھ کے آدمی اچانک نکل کر ہم پر فائرنگ نہ شروع کر دیں۔ اطمینان اگر تھا تو صرف اتنا ہی تھا کہ دونوں آدمی جنگل کی دوسری طرف گئے تھے۔ لیکن وہ ہمیں تلاش کرتے کرتے اس طرف بھی آ سکتے تھے۔

میں بڑے غور سے اِردگرد کے درختوں کا جائزہ لے رہا تھا۔ اُونچے اُونچے تنوں والے درختوں کا سلسلہ ختم ہو گیا تھا۔ اب جو درخت شروع ہوئے تھے اُن میں سے کوئی بھی درخت ایسا نظر نہیں آ رہا تھا کہ جس کی شاخیں کم بلندی سے شروع ہوتی ہوں۔ ہر درخت کی شاخ زمین سے دس پندرہ فٹ سے کم اُونچائی پر نہیں تھی۔ اور ایسے درختوں پر چڑھنا مشکل تھا۔ دونوں قاتل غنڈوں کا خطرہ بھی برابر لگا ہوا تھا۔ وہ کسی بھی وقت کسی طرف سے نمودار ہو کر ہم پر فائر کھول سکتے تھے۔ اندھیرا گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ ابھی تک تو درخت دس پندرہ فٹ کے فاصلے سے دکھائی دے رہے تھے لیکن رات کی تاریکی پھیلتے ہی ان درختوں کا نظر آنا بھی محال تھا۔ جنگلی درندوں کا بھی ڈر تھا۔ جنگل کے درندے رات ہوتے ہی پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے شکار کی تلاش میں نکل پڑتے ہیں اور ان کے نکلنے کا وقت ہو رہا تھا۔ اندھیرے میں ایک چھوٹی سی ندی دکھائی دی۔ یہ کوئی تین چار گز چوڑی نہر تھی جو درختوں کے نیچے سے گزر رہی تھی۔

اُرملا نے ندی کو دیکھ کر مجھے آہستہ سے کہا۔ ''تم دوسری طرف چلے جاؤ۔ مجھے گرمی لگ رہی ہے۔ میں اشنان کرنا چاہتی ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''دیر نہ لگانا۔''

''نہیں۔'' اُس نے مختصر سا جواب دیا۔

اور میں وہاں سے ہٹ کر دوسری طرف کچھ فاصلے پر جا کر ندی کی طرف پشت کر

کے جھاڑیوں کے درمیان بیٹھ گیا۔ اس وقت مجھے چاروں طرف سے ہوشیار رہنے کی ضرورت تھی۔ لیکن اس وقت صورت حال ایسی تھی کہ میں دائیں بائیں ہی دیکھ سکتا تھا۔ پیچھے مُڑ کر نگاہ نہیں ڈال سکتا تھا۔ دل میں دُعا مانگتا رہا کہ یہ وقت خیریت سے گزر جائے۔ میں اُرملا کو آواز دے کر بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ جلدی جلدی اشنان کرو۔ لیکن چونکہ اُرملا کو خود بھی صورت حال کی سنگینی کا احساس تھا اس لئے وہ جلدی فارغ ہو گئی اور دبے پاؤں چل کر جہاں میں بیٹھا ہوا تھا وہاں میرے پیچھے آ کر بولی۔

''اب چلو۔'' وہ اپنے گیلے بالوں کو نچوڑ رہی تھی۔

جنگل میں ہو کا عالم طاری تھا۔ کسی طرف سے پتا کھڑکنے کی بھی آواز نہیں آتی تھی۔ میری نگاہیں بڑی تیزی سے کسی محفوظ جگہ کی تلاش میں تھیں۔ اندھیرا اور زیادہ گہرا ہو گیا تھا اور چند گزوں کے فاصلے پر سوائے اندھیرے کے کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ تاریکی میں سمت کا بھی اندازہ نہیں رہا تھا۔ وہاں کوئی سیدھی پگڈنڈی تو تھی نہیں۔ جھاڑیوں میں جس طرف سے تھوڑا آگے نکلنے کا راستہ مل جاتا، ہم اُسی طرف کو مُڑ جاتے تھے۔ مجھے یہ بھی احساس تھا کہ کہیں گھوم پھر کر ہم جنگل میں پھر اُسی جگہ پر نہ آ جائیں جہاں سے چلے تھے۔

اچانک ایک آواز نے جنگل کی موت ایسی خاموشی کو تہہ و بالا کر دیا..... اُرملا میرے ساتھ لگ گئی۔ اُس کا جسم کانپ رہا تھا۔ یہ شیر کی دھاڑ تھی۔ میں اُرملا کے ساتھ وہیں بیٹھ گیا۔ شیر کی دھاڑ سے میں سمجھ گیا تھا کہ شیر نے اپنے شکار پر حملہ کیا ہے۔ اس کے بعد شیر کی دو چار ایسی آوازیں آئیں جیسے وہ اپنے شکار کو گرا کر اُسے دبوچ رہا ہو۔ اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ مجھے اتنا اطمینان ہو گیا کہ شیر اب اِدھر نہیں آئے گا۔ اُس نے شکار مار لیا ہے۔ اب وہ وہیں اُس کی گردن دبوچ کر، اُسے جھٹکے دے کر اُس کا تھوڑا بہت خون پی کر اپنی پیاس بجھائے گا اور پھر اُسے گھسیٹ کر جھاڑیوں میں کسی محفوظ جگہ پر لے جا کر اپنی بھوک کے مطابق تھوڑا بہت گوشت کھائے گا اور پھر اگلی رات کے واسطے مرے ہوئے جانور کو وہیں کسی جگہ چھپا کر اپنے ٹھکانے پر واپس چلا جائے گا اور دوسرے دن شام تک سوتا رہے گا۔ شام کو اُٹھ کر کسی تالاب پر پانی پینے جائے گا اور رات کو دوبارہ اپنے شکار کی لاش کی ضیافت اُڑانے پہنچ جائے گا۔

میں نے اُرملا سے کہا۔ ''فکر نہ کرو۔ شیر اس طرف نہیں آئے گا۔''

مگر اُس کا خوف دُور نہیں ہوا تھا۔ وہ میرے ساتھ لگی سہمی ہوئی بیٹھی تھی۔ دھیمی آواز میں کہنے لگی۔ ''یہیں بیٹھے رہتے ہیں۔ میں آگے نہیں جاؤں گی۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔''

میں نے اُسے سمجھایا کہ جہاں ہم بیٹھے ہیں وہ کوئی محفوظ جگہ نہیں ہے۔ ہمیں آگے چل کر رات گزارنے کے لئے کوئی مناسب جگہ تلاش کرنی چاہئے۔ اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے اُسے بازو سے پکڑ کر آہستہ سے اُٹھایا اور سرگوشی میں کہا۔

''آگے کوئی اچھی سی جگہ ضرور مل جائے گی چھپنے کے لئے......''

اب میں نے اپنا رُخ بدل لیا تھا اور اس طرف نہیں جا رہا تھا جس طرف سے شیر کی دھاڑ کی آواز آئی تھی۔ جنگل کے گھپ اندھیرے سے میری آنکھیں عادی ہو گئی تھیں۔ میں اب اس اندھیرے میں بھی دیکھ سکتا تھا۔ اُرملا یا تو تھک گئی تھی یا شیر کے خوف کی وجہ سے آہستہ چل رہی تھی۔ وہ مجھ سے ایک قدم بار بار پیچھے رہ جاتی تھی۔ میں رُک کر اُسے پھر اپنے ساتھ کر لیتا تھا۔ جنگل کا گھنا پن کسی حد تک کم ہو گیا تھا اور تھوڑی تھوڑی کھلی جگہ آنے لگی تھی۔ یہاں درخت اتنے ساتھ ساتھ نہیں کھڑے تھے۔ آگے ایک چٹان آ گئی۔ ہم چٹان کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔

اچانک آدمیوں کے باتیں کرنے کی آواز سنائی دی۔ میرے قدم وہیں رُک گئے۔ میں نے اُرملا کو بازو سے پکڑ کر اپنے دائیں جانب کر لیا۔ پھر قدموں کے دوڑنے کی آواز آئی۔ اُرملا کچھ کہنے لگی۔ اُس کے منہ سے ابھی ایک لفظ ہی نکلا تھا کہ میں نے اُس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ دوڑنے کی آواز رُک گئی۔ باتیں کرنے کی آواز دوبارہ سنائی دینے لگی۔ یہ دو آدمی تھے جو ایک دوسرے سے باتیں کرتے آ رہے تھے۔ آواز ہماری طرف آ رہی تھی۔ میں اُرملا کو پکڑ کر جلدی سے چٹان کی ڈھلان پر ایک جھاڑی میں بیٹھ گیا۔ آدمیوں کے باتیں کرنے کی آوازیں ہمارے بالکل قریب آ کر رُک گئیں۔

میرے دل کی دھڑکن تیز ہو رہی تھی۔ یہ دونوں آدمی سیٹھ کیشو راؤ کے قاتل غنڈوں کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتے تھے۔ ایک دو سیکنڈ کی خاموشی کے بعد کسی نے کہا۔

''وہ یہیں کہیں چھپے ہیں۔''

دوسرے کی آواز آئی۔ ''اندھیرے میں کچھ نظر نہیں آ رہا۔''

پہلا بولا۔ ''یہاں تیرے باپ نے بجلی کے انڈے نہیں لگائے ہوئے۔ الّا

اندھیروں میں ہی اُنہیں تلاش کرنا ہو گا۔''

دوسرا کہنے لگا۔ ''میرا تو خیال ہے کہ وہ پیچھے ندی کے کنارے ہی کسی درخت پر چڑھ کر بیٹھے ہیں۔ چلو یہاں وہاں دیکھتے ہیں، پھر یہاں آ کر ایک ایک جھاڑی کی تلاشی لیں گے۔ پستول میں گولیاں کتنی ہیں؟''

پہلے نے کہا۔ ''پستول بھرا ہوا ہے۔ تمہارے پستول میں کتنی ہیں؟''

''بہت ہیں۔'' دوسرے نے کہا۔ ''شیر کے گرجنے کی آواز آئی تھی۔ کہیں اُن دونوں کو شیر نے تو نہیں پکڑ لیا؟''

پہلا بولا۔ ''شیر کے دھاڑنے کی آواز لکڑی کے گودام کی طرف سے آئی تھی۔ پہلے اس علاقے کی تلاشی لے لیں، پھر اُدھر جا کر بھی دیکھ لیں گے۔ چلو!''

پھر اُن کے باتیں کرنے کی آواز دُور ہوتے ہوتے غائب ہو گئی۔ اب ہمارا وہاں رُکنا ہمیں موت کے منہ میں دھکیل سکتا تھا۔ میں نے اُرملا سے کہا۔

''وہ پیچھے ندی پر گئے ہیں۔ تھوڑی دیر میں ادھر آ جائیں گے۔ ہمیں یہاں نہیں رکنا چاہئے۔'' اُرملا اور میں چٹان کی ڈھلان سے اُتر کر چٹان کی دوسری طرف چل پڑے۔ چند قدم چلے ہوں گے کہ اندھیرے میں ایک چھوٹا سا تالاب آ گیا۔ تالاب کی ایک جانب ایک بہت گھنا درخت تھا جس کی گھنی شاخیں آدھے تالاب کے اُوپر تک پھیلی ہوئی تھیں۔ میں نے اُرملا کو مدھم آواز میں کہا۔

''ہمیں اس درخت پر چڑھ کر چھپ جانا چاہئے۔ تم درخت پر چڑھ سکو گی؟''

''ہاں۔'' اُرملا نے آہستہ سے جواب دیا۔

درخت شاید برگد کا تھا جسے ہمارے پنجاب میں بوڑھ کا درخت کہتے ہیں۔ اُس کی شاخیں زمین سے کوئی پانچ فٹ اُوپر جا کر شروع ہو جاتی تھیں۔ میں نے پہلے اُرملا کو دونوں ہاتھوں سے سہارا دے کر درخت کے ایک بڑے ٹہن پر چڑھا دیا، پھر خود اُسی ٹہن پر چڑھ گیا۔ اس ٹہن کے اُوپر بھی ایک گھنا ٹہن تھا۔ میں اُس کے اُوپر چڑھ گیا۔ میں نے اُرملا کو بھی پکڑ کر اُس پر چڑھا لیا اور کہا۔ ''میرے پیچھے کھسکتی چلی آؤ۔''

درخت کی یہ موٹی شاخ نیچے جھکنے کی بجائے آگے جا کر اُوپر کو ہو گئی تھی اور دوسری ٹہنیوں کی شاخوں کے پتوں میں گھل مل گئی تھی۔ میں کھسکتے کھسکتے کوئی دس بارہ فٹ آگے

چلا گیا۔ یہاں گھنی شاخوں اور پتوں نے چھپنے کے لئے بڑی اچھی جگہ بنائی ہوئی تھی۔ اُرملا بھی کھسکتی ہوئی میرے پاس آ گئی۔ یہاں موٹی ٹہنیوں کا دو شاخہ بنا ہوا تھا، بالکل غلیل کی طرح کا۔ ہم دونوں اُس دو شاخے پر ٹانگیں سمیٹ کر بیٹھ گئے۔ اب ہم ایک دوسرے کے کان کے پاس منہ لے جا کر سرگوشیوں میں بات کرنے لگے۔ میں نے کہا۔

''وہ لوگ اس طرف ضرور آئیں گے۔ کم از کم اس وقت تک ہمیں ضرور اسی جگہ بیٹھے رہنا ہوگا۔ جب وہ اُدھر کی تلاشی وغیرہ لے کر آگے چلے جائیں گے تو پھر نیچے اُتر کر کوئی دوسری جگہ تلاش کریں گے۔''

اُرملا نے کوئی جواب نہ دیا، صرف آہستہ سے ''ہوں'' کہہ دیا۔ میں خود بھی زیادہ بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میرے کان جنگل کی خاموشی پر لگے ہوئے تھے۔ میں اس انتظار میں تھا کہ دونوں غنڈے اس طرف کب واپس آتے ہیں۔ مجھے یقین تھا کہ اگر وہ اس طرف آ گئے تو ہم اُنہیں نظر نہیں آئیں گے۔ اور اگر اُنہوں نے درخت کی شاخوں کو نیچے سے دیکھا بھی تو ہم اُنہیں دکھائی نہیں دے سکیں گے۔

آسمان تو صبح ہی سے بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ دن کے وقت موسلا دھار بارش بھی ہوئی تھی۔ ہمیں درخت میں چھپ کر بیٹھے کوئی آدھا گھنٹہ گزرا ہوگا کہ بادلوں میں ہلکی ہلکی گرج سنائی دی اور بارش شروع ہو گئی۔ پہلے بونداباندی ہوتی رہی، پھر تیز بارش ہونے لگی۔ ہمارے اُوپر درخت کی گھنی شاخوں اور پتوں کی اتنی گنجان چھت پڑی ہوئی تھی کہ تیز بارش کا شور تو بہت زیادہ تھا مگر بارش کی کسی وقت صرف دو چار بوندیں ہی گرتی تھیں۔ تیز بارش کا درختوں کے پتوں پر گرنے کا شور اس قدر زیادہ تھا کہ ہم ایک دوسرے سے سرگوشی میں بھی بات نہیں کر سکتے تھے۔ ہمیں بات کرنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ بارش سے صرف اتنا نقصان ضرور ہوا تھا کہ مجھے اپنے دشمنوں کی وہاں تک پہنچنے کی آواز سنائی نہیں دے سکتی تھی۔ ساتھ ہی اس خیال سے تھوڑا اطمینان بھی ہوتا تھا کہ اتنی تیز بارش میں دونوں خونی غنڈے شاید اس طرف نہ آئیں۔

موسم برسات کی بارشیں تو ان جنگلوں میں ایک بار شروع ہوتی ہیں تو ایک ایک پہر دو دو پہر تک ہوتی ہی رہتی ہیں۔ درمیان میں ایک پل کے لئے بھی نہیں رُکتیں۔ لیکن برسات کے موسم کے گزر جانے کے بعد جو بارشیں ہوتی ہیں وہ زیادہ دیر تک نہیں

برتیں۔ چنانچہ یہ موسلا دھار بارش بھی کوئی دس پندرہ منٹ کے بعد ایک دم رُک گئی۔ اب جنگل میں صرف درختوں پر سے بارش کے رُکے ہوئے قطروں کے ٹپکنے کی آوازیں ہی سنائی دے رہی تھیں۔ ان کے سوا وہاں کوئی اور آواز نہیں تھی۔ اُرملا کو اس دوران کچھ تھکاوٹ اور کچھ تھوڑا سا سکون ملنے کی وجہ سے نیند آ گئی تھی اور وہ اپنا سر میرے کندھے کے ساتھ لگا کر سو گئی تھی۔ میں اس خیال سے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کر رہا تھا کہ میرے ہلنے جلنے سے اُرملا جاگ پڑے گی۔ میں چاہتا تھا کہ وہ جتنی دیر آرام کر سکتی ہے آرام کرے۔ آگے معلوم نہیں ہمارے ساتھ کیا کچھ گزرنے والی تھی۔

میں نے اپنی کلائی پر بندھی ہوئی نند پالا کی گھڑی پر پوری آنکھیں کھول کر وقت دیکھنے کی کوشش کی مگر اندھیرے میں مجھے گھڑی کی سوئیاں نظر نہ آئیں۔ اُس زمانے میں ابھی اندھیرے میں چمکنے والی سوئیوں کا اتنا رواج نہیں ہوا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ رات کافی گزر چکی ہے۔ جنگل میں ایک بار پھر ڈراؤنی خاموشی کا عالم طاری ہو گیا تھا۔ قریب ہی کسی جگہ بارش کے پانی کے کسی نالے یا کھائی میں گرنے کی آواز اس خاموشی کے طلسم کو توڑنے کی کوشش کر رہی تھی۔

اُرملا جاگ پڑی۔ اُس نے اپنا سر میرے بازو سے ہٹا دیا اور آہستہ سے پوچھا۔

''وہ لوگ نہیں آئے؟''

میں نے کہا۔ ''ابھی تک تو وہ بلائیں ہم سے دُور ہی ہیں۔ بارش رُک گئی ہے۔ تم سو جاؤ! لگتا ہے ساری رات اسی درخت پر گزارنی پڑے گی۔''

اُرملا نے بڑی مشکل سے پہلو بدلا اور نقاہت سے کہا۔ ''مجھ سے بیٹھا نہیں جا رہا۔ نیچے اُتر چلو۔''

پہلے میں نے اُرملا کے خیال سے سوچا کہ نیچے اُتر چلتے ہیں۔ وہ لوگ شاید اب نہیں آئیں گے۔ پھر خیال آیا کہ نیچے اُترنے میں خطرہ ہے۔ اُن لوگوں کا کوئی اعتبار نہیں۔ وہ ہماری تلاش میں اسی جنگل میں ہیں اور بھوکے بھیڑیوں کی طرح ہمیں ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔ کوئی پتہ نہیں کس وقت اِدھر آ جائیں۔ میں نے اُرملا سے کہا۔

''نیچے اُترنا ٹھیک نہیں۔ تھوڑی سی رات رہ گئی ہے۔ دن نکلنے پر اُتر کر جتنی جلدی ہو سکے گا سونی گام سٹیشن پر پہنچنے کی کوشش کریں گے۔ رات کے اندھیرے میں ہم چل بھی

پڑے تو بھٹک جائیں گے۔ اور پھر جنگلی درندوں کا بھی خطرہ ہے۔''

اُرملا چپ ہوگئی۔ مگر وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد پہلو بدلنے لگی۔ اس طرح درختوں پر چڑھ کر بیٹھنے کا شاید اُس کی زندگی کا پہلا موقع تھا۔ اُوپر سے ایک اور عذاب نازل ہو گیا۔ بارش کے رُکتے ہی مچھروں نے تنگ کرنا شروع کر دیا۔ مچھر بھی بڑے موٹے اور صحت مند تھے۔ اُرملا بے چین ہو کر بولی۔

''اب مجھ سے نہیں بیٹھا جاتا۔''

میں سوچنے لگا، دونوں غنڈوں کو وہاں سے گئے کافی دیر ہوگئی تھی۔ بارش بھی کافی دیر سے رُکی ہوئی تھی۔ اگر اُنہیں اس طرف آنا ہوتا تو اب تک آ گئے ہوتے۔ شاید اب وہ اس طرف نہیں آئیں گے۔ یہ سوچ کر میں نے اُرملا سے کہا۔

''ٹھیک ہے...... نیچے اُتر جاتے ہیں۔'' اور ہم درخت سے نیچے اُتر آئے۔ نیچے اُترتے ہی میں نے کہا۔ ''اب ہمیں یہاں ایک سیکنڈ کے لئے بھی رُکنا نہیں چاہئے۔ آگے چلتے ہیں۔''

اور ہم آگے چل پڑے۔ بارش کی وجہ سے زمین گیلی ہو رہی تھی۔ کہیں کہیں نشیب میں پانی بھی کھڑا تھا۔ تالاب کے کنارے کنارے ہو کر ہم ذرا ہی آگے گئے تھے کہ اچانک ایک طرف سے ہم پر بڑی طاقتور ٹارچ کی روشنی پڑی۔ ساتھ ہی ایک رُعب دار آواز بلند ہوئی۔ ''کون ہو تم؟ کہاں جا رہے ہو؟''

اُرملا ڈر کر میرے پیچھے ہوگئی۔ ٹارچ کی روشنی میں میری آنکھیں چندھیا رہی تھیں اور سامنے کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ اتنا مجھے یقین ہوگیا تھا کہ یہ سیٹھ کیشو راؤ کے خونی غنڈے نہیں ہیں۔ کیونکہ اُن غنڈوں کے پاس ٹارچ نہیں تھی۔ اگر ہوتی تو جب ہم جھاڑیوں میں چھپے ہوئے تھے اور وہ ہمیں تلاش کرتے آئے تھے تو جھاڑیوں پر ٹارچ کی روشنی ضرور ڈالتے۔ یہ کوئی اور ہی لوگ تھے۔ میں نے کہا۔

''جنگل میں راستہ بھول گئے تھے۔ ہمیں سونی گام سٹیشن پر جانا ہے۔''

یہ بھی دو آدمی تھے۔ ابھی تک اُن کی شکلیں نظر نہیں آئی تھیں۔ اُس کے ساتھی نے ہنس کر کہا۔ ''ابے ادھر تیرے باپ کا کون سا سونی گام کا سٹیشن ہے۔''

میں نے کہا۔ ''راستہ بھول کر ادھر آ گیا ہوں دادا!''

پہلے آدمی نے رُعب سے پوچھا۔ ''یہ تمہارے ساتھ عورت کون ہے؟''

میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ ''میری بیوی ہے۔''

وہ ہنس پڑا اور بولا۔ ''ابے تیری پتنی ہے یا کسی کی پتنی کو بھگا کر لئے جا رہے ہو؟''

دوسرے آدمی کی آواز آئی۔ ''ارے شامو! ان کو ٹھاکر کے پاس لے چلو۔ مجھے تو پلیس کے جاسوس لگتے ہیں۔''

اب ٹارچ کی روشنی میرے چہرے سے ہٹ کر میرے دائیں جانب آ گئی۔ اُس کی روشنی میں دو آدمی ہماری طرف بڑھے۔ دونوں شکل ہی سے ڈاکو لگتے تھے۔ اندھیرے میں اُن کی سرخ آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔ وہ ہمیں درختوں کے ایک جھنڈ میں لے گئے جہاں دو تین جھونپڑیاں تھیں۔ ایک جھونپڑی کے باہر خالی چارپائی پڑی تھی۔ درخت کی ٹہنی پر لالٹین روشن تھی۔ ہمیں دیکھ کر دو تین اور آدمی جھونپڑیوں میں سے نکل آئے۔

''ارے! یہ کس کو پکڑ لائے ہو رامو؟''

جن دو آدمیوں نے ہمیں حراست میں لے رکھا تھا اُن میں سے ایک کا نام شامو اور دوسرے کا رامو تھا۔ اُن میں سے ایک بولا۔ ''ارے مانجریا! یہ پولیس کے جاسوس ہیں۔''

جو دو آدمی ہمیں پکڑ کر لائے تھے اُن کے پاس رائفلیں تھیں۔ وہ سب ہندو تھے۔ آوازیں سن کر جس جھونپڑی کے باہر چارپائی بچھی تھی اُس میں سے ایک درمیانے قد کا بڑی بڑی مونچھوں والا آدمی باہر نکل آیا اور بولا۔

''کیوں بے؟ کہاں ہیں پولیس کے جاسوس؟ اُنہیں یہاں کیوں لائے ہو؟ وہیں گولی مار دینی تھی۔''

شامو بولا۔ ''ٹھاکر! ایک عورت بھی ہے۔ حکم دو، ابھی دونوں کو ڈھیر کر دیتا ہوں۔''

یہ آدمی جسے ٹھاکر کہہ کر بلایا گیا تھا اُن ڈاکوؤں کا سردار لگتا تھا۔ اُس نے کمر کے گرد میگزین کی پیٹی باندھ رکھی تھی۔ سر پر سیندوری رُومال بندھا تھا اور ماتھے پر تلک بھی لگا تھا۔ اُس نے ایک ڈاکو کے ہاتھ سے رائفل لے لی اور ہمارے قریب آ کر مجھے اور اُرملا کو اپنی خونی آنکھوں سے گھور کر دیکھا اور بولا۔

''کیوں بے؟ ہماری جاسوسی کرتے ہو؟ کیا نام ہے تمہارا؟''

میں نے جواب دیا۔ ''شیراز۔''
اُس کی بھنویں تن گئیں۔ ''اچھا تو تم مُسلے ہو مُسلے! مسلمان ہو تو یہاں کیا کر رہے
ہو؟ پاکستان کیوں نہیں جاتے؟'' اُس نے رائفل کی نالی کا رُخ اُرملا کی طرف کر دیا اور
پوچھا۔ ''یہ کون ہے؟''
میں نے جواب دیا۔ ''میری بیوی ہے۔''
ٹھاکر نے رائفل کی نالی سے اُرملا کی ٹھوڑی کو ذرا سا اُونچا کرتے ہوئے پوچھا
''کیا نام ہے تمہارا؟''
اُرملا نے ڈری ہوئی آواز میں جواب دیا۔ ''اُرملا۔''
ٹھاکر کی بھنویں اور زیادہ تن گئیں۔ ناک سے سانپ کی شوکر ایسی آواز نکلی ا
میرے سینے کے ساتھ رائفل کی نالی لگا دی۔ ''کیوں بے مُسلے! اس ہندو عورت کو بھگا
لائے ہو اور کہتے ہو یہ میری پتنی ہے؟''
میں نے کہا۔ ''اس سے پوچھ لو۔ ہم نے اپنی مرضی سے شادی کی ہے۔''
ٹھاکر نے بڑے زور سے رائفل کا بٹ میرے کندھے پر دے مارا۔ میں دُہرا
گیا۔ اُس نے مجھے گالی دی۔ ''ملیچھ! ہندو عورت سے زبردستی بیاہ رچانے کا ابھی
چکھاتا ہوں۔''
اب وہ اُرملا کی طرف متوجہ ہوا۔ ''کیوں ری؟ تم ہندو ہو کر ایک ملیچھ مسلمان کی
بن گئی ہو۔ تمہیں تو چتا کی آگ میں ڈال دینا چاہئے۔ اور پھر ایک مسلمان کے ساتھ
کر ہماری جاسوسی کر رہی ہو؟''
میں نے کہا۔ ''میں سچ کہہ رہا ہوں۔ ہم پولیس کے جاسوس نہیں ہیں۔ ہم جنگل
راستہ بھول گئے تھے۔ ہمیں سونی گام کے سٹیشن پر جانا تھا۔''
ڈاکوؤں کا سردار ٹھاکر مجھے گالیاں دینے لگا۔ پھر رائفل کی نالی میرے سینے پر رکھ
غضبناک ہو کر بولا۔ ''تمہیں تو میں ابھی ختم کر دیتا۔ مگر پہلے تم سے پوچھ لوں کہ پولیس
نے اور کون کون سے جاسوس ہماری جاسوسی کو جنگل میں بھیجے ہیں۔ لے جاؤ ان کو
الگ الگ جھونپڑوں میں بند کر کے پہرہ لگا دو۔ صبح ان کا تیا پانچہ کر دیا جائے گا۔''
مجھے الگ ایک جھونپڑی میں اور اُرملا کو الگ دوسری جھونپڑی میں بند کر کے با

پہرہ لگا دیا تھا۔ یہ ایک نئی مصیبت آن پڑی تھی۔ اس وقت آسمان پر بادلوں کے پیچھے صبح
کی ڈھندلی ڈھندلی کافوری روشنی جھلکنا شروع ہو گئی تھی۔ مجھے ناشتے کے لئے چائے کا
گلاس اور دو روٹی کے ٹکڑے دیئے گئے۔ اس کے بعد ٹھاکر کے جھونپڑے پر لے جایا
گیا۔ ٹھاکر جھونپڑی کے باہر چارپائی پر بڑی شان سے نیم دراز سگریٹ پی رہا تھا۔ پستول
اس کے پاس ہی پڑا تھا۔ اب مجھ سے پوچھ گچھ شروع ہو گئی۔ میں نے ٹھاکر سے کہا۔
''ٹھاکر! میں مسلمان ہوں۔ میں بڑی آسانی سے اپنے آپ کو ہندو ظاہر کر سکتا تھا
لیکن میں نے جھوٹ نہیں بولا۔ ہمارے مذہب اسلام کی تعلیم ہمیں سچ بولنا سکھاتی ہے۔
میں اب بھی تم سے سچ ہی بولوں گا۔ میری بات کا یقین کرو کہ ہم پولیس کے جاسوس نہیں
ہیں۔ ہمیں تو یہ بھی نہیں معلوم کہ یہاں پولیس چوکی کس طرف ہے؟''
ٹھاکر کا چہرہ بتا رہا تھا کہ اُسے میری بات پر کچھ کچھ یقین ہو رہا ہے۔ وہ بولا۔
''چلو میں مان لیتا ہوں کہ تم پولیس کے ٹاؤٹ نہیں ہو۔ مگر تم نے ایک ہندو دیوی
سے بیاہ رچا کر ہمارے دھرم کو بھرشٹ کیا ہے۔ ساری ہندو جاتی کے منہ پر تھپڑ مارا ہے۔
تمہیں اس کی سزا ضرور ملے گی۔''
اُرملا اتنی دیر تک خاموش تھی۔ جب ٹھاکر نے مجھے سزا دینے کی بات کی تو اُس نے کہا۔
''ٹھاکر! میں نے اپنی مرضی سے شادی کی ہے۔ اس میں اس کا کوئی قصور نہیں ہے۔''
ٹھاکر کا سانولا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ آنکھوں سے شعلے سے نکلنے لگے۔ اُس نے
اُرملا کو بھی گالی دی اور گرج کر بولا۔ ''تم نے جو پاپ کیا ہے تمہیں بھی اس کی سزا ملے گی۔''
تین چار ڈاکو بھی رائفلیں لئے وہاں کھڑے تھے۔ اُن میں شامو بھی تھا جو ہمیں پکڑ
کر لایا تھا۔ وہ بولا۔ ''ٹھاکر! اپنا خون کیوں جلاتے ہو؟ اشارہ کرو میں ابھی دونوں کو
ٹھنڈا کر دیتا ہوں۔''
ٹھاکر نے ایک دم رائفل کی نالی نیچے کی اور اُوپر تلے دو فائر کر دیئے۔ ایک گولی
میرے پاؤں کے قریب لگی اور دوسری گولی اُرملا کے پاؤں کے آگے زمین میں دھنس
گئی۔ ٹھاکر گالی دے کر بولا۔
''میں خود ان دونوں کو قتل کروں گا۔ انہیں بند کر کے پہرہ لگا دو۔''
رائفل کا دھماکہ بڑا زبردست ہوتا ہے۔ اُوپر تلے دو دھماکوں نے ہمیں اپنی جگہ سے

ہلا کر رکھ دیا۔ پہلے تو میں سمجھا کہ گولی میری ران پر لگی ہے۔ اُرملا تو دہشت کے مارے گر
پڑی تھی۔

دو آدمیوں نے آگے بڑھ کر ہمیں بازوؤں سے پکڑا اور کھینچتے ہوئے لے گئے او
الگ الگ جھونپڑیوں میں بند کر دیا۔ مجھے اُرملا کی خبر نہیں تھی اور اُرملا کو میری خبر نہیں
تھی۔ سارا دن میں جھونپڑی میں بند رہا۔ میرے دونوں پاؤں میں رسّی اس طرح
باندھ دی گئی تھی کہ میں قدم قدم بڑی مشکل سے چل ہی سکتا تھا۔ دوڑنے کا سوال ہ
پیدا نہیں ہوتا تھا۔ شاید اُرملا کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا گیا تھا۔ مجھے یہ دُکھ کھائے جار
تھا کہ میرے ساتھ اس نازک اندام پڑھی لکھی اچھے خاندان کی عورت کو بھی یہ عذا
جھیلنا پڑ رہا تھا۔ سب سے زیادہ پریشانی اس بات کی تھی کہ کہیں یہ خر دماغ وحشی ڈا
ٹھاکر سچ مچ ہم دونوں کو موت کے گھاٹ ہی نہ اُتار دے۔ وہاں سے بھاگنے کی کو
تدبیر ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ چاروں طرف وحشی خونخوار قسم کے ڈاکو ہی ڈاکو تھے اور ہمار
پاؤں رسیوں سے بندھے ہوئے تھے۔ خدا کی طرف سے کوئی غیبی امداد ہی ہمیں ا
عذاب سے نجات دلا سکتی تھی۔

تین دن اسی قید کی حالت میں گزر گئے۔ ایک آدمی دن میں دو بار آ کر مجھے تھو
بہت کچھ کھانے کو دے جاتا۔ رات کے وقت دو ڈاکو رائفلوں کے پہرے میں مج
تالاب پر لے جاتے اور جب تک میں وہاں ہاتھ منہ وغیرہ دھوتا وہ قریب ہی رائفلی
تانے کھڑے رہتے۔ شاید اُرملا کے ساتھ بھی یہی کچھ ہو رہا تھا۔ چوتھے روز سور
غروب ہونے کے بعد جب جنگل میں ذرا اندھیرا ہوا تو جھونپڑی کے باہر ہلچل سی
گئی۔ میں بندھے ہوئے پاؤں کے ساتھ رُک رُک کر چلتا جھونپڑی کی بانس کی دیو
کے ساتھ لگ کر ایک جھری میں سے باہر دیکھنے لگا۔ درختوں کے نیچے چھ سات گھوڑ
کھڑے تھے۔ ڈاکو رائفلیں لے کر جھونپڑیوں سے نکل نکل کر گھوڑوں پر سوار ہو ر
تھے۔ پھر میں نے لالٹینوں کی روشنی میں ڈاکوؤں کے سردار ٹھاکر کو دیکھا۔ اُس
کندھے پر پستول لٹک رہا تھا۔ کمر کے گرد کارتوس کی پیٹی بندھی ہوئی تھی۔ ایک ہا
میں رائفل تھی۔ وہ بھی اُچھل کر ایک گھوڑے پر سوار ہو گیا اور یہ سارے ڈاکو جنگل
اندھیرے میں ایک طرف کو نکل گئے۔ میں سمجھ گیا کہ ڈاکوؤں کا گروہ کہیں ڈاکہ ڈالنے

رہا ہے۔ مگر سارے کے سارے ڈاکو واردات کرنے نہیں گئے تھے۔ تین چار ڈاکو پیچھے
رہ گئے تھے جو لالٹینوں کی دھیمی روشنی میں اِدھر اُدھر چلتے پھرتے کچھ دیر تک دکھائی دیتے
رہے، پھر وہ بھی رائفلیں لے کر اپنے اپنے ناکوں پر شاید پہرہ دینے چلے گئے۔ چاروں
طرف گہری خاموشی چھا گئی۔ اگر میرے پاؤں کھلے ہوتے تو فرار ہونے کی کوشش کی جا
سکتی تھی کیونکہ اس وقت میری جھونپڑی کے باہر کوئی ڈاکو پہرے پر موجود نہیں تھا۔ لیکن
میرے دونوں پاؤں میں رسّی اتنی مضبوطی سے باندھی گئی تھی کہ ان کی گرہیں ایک دوسری
میں پیوست ہو گئی تھیں۔ میں نے کئی بار اُنہیں کھولنے کی کوشش کی تھی مگر ناکام رہا تھا۔
میری گھڑی ڈاکوؤں نے اُتار لی تھی۔ مجھے وقت کا کوئی اندازہ نہیں رہا تھا۔

جھونپڑی میں پرانی دری کا ایک ٹکڑا ہی بچھا ہوا تھا۔ اُسی پر بیٹھتا تھا اور اُسی پر رات
کو لیٹ کر سونے کی کوشش کرتا تھا۔ باہر خاموشی تھی۔ اتنے میں دو آدمیوں کے قدموں
کی آواز آئی۔ میں سمجھ گیا کہ معمول کے مطابق دو ڈاکو مجھے تالاب پر لے جانے کے
لئے آئے ہیں۔ جھونپڑی کا دروازہ کھلا اور دونوں ڈاکو رائفلیں تانے اندر آ گئے۔
جھونپڑی اگرچہ بانس کی بنی ہوئی تھی مگر اُس کی دیواریں اینٹ پتھر کی دیواروں سے
زیادہ مضبوط لگتی تھیں۔ بڑے سخت بانس بالکل ساتھ ساتھ کر کے جوڑ دیئے گئے تھے۔
دروازہ بھی بڑے موٹے اور مضبوط بانسوں کا بنا ہوا تھا اور باہر سے ایک بانس گرا کر
اُسے اس طرح بند کیا جاتا تھا کہ اندر سے لاکھ کوشش کے باوجود دروازہ ذرا سا بھی نہیں
ہلتا تھا۔ ایک ڈاکو دروازے کے پاس رائفل لئے کھڑا ہو گیا۔ دوسرے نے روز کی طرح
ایک رسّی میری گردن میں باندھی اور اُس کا سرا اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا اور مجھے قدم قدم
چلاتا تالاب پر لے گیا۔ جب تک میں تالاب پر منہ ہاتھ وغیرہ دھوتا رہا وہ رسّی کا سرا
پکڑے دوسرے ڈاکو کے ساتھ مجھ سے چند گز کے فاصلے پر کھڑا رہا۔

اس کے بعد اُسی طرح مجھے قدم قدم چلا کر جھونپڑی میں لا کر بند کر دیا گیا۔
جھونپڑی کے قید خانے میں داخل ہونے سے پہلے میری گردن کی رسّی کھول دی گئی تھی۔
میں دری پر دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ اس مصیبت سے نجات
حاصل کرنے کے لئے کیا کیا جا سکتا ہے؟ بار بار اُرملا کی طرف دھیان چلا جاتا تھا۔ اُس
کی جھونپڑی جہاں وہ میری طرح قید تھی میری جھونپڑی سے کوئی پچاس گز کے فاصلے پر

تھی۔ مجھے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ اُرملا اپنی جھونپڑی میں ہی ہے یا ٹھاکر اُسے اپنے ساتھ ہی واردات کرنے لے گیا ہے۔ ذہن میں طرح طرح کے پریشان کرنے والے خیالات آ رہے تھے۔ جو دو ڈاکو مجھے تالاب پر لے کر گئے تھے وہ میرے جھونپڑے کے باہر ہی بیٹھے تھے۔ اُن کی باتیں کرنے کی آواز مجھے آ رہی تھی۔ وہ کچھ اُونچی آواز میں باتیں کر رہے تھے اور ایک دو قہقہے بھی اُنہوں نے لگائے۔ اس سے پہلے مجھے تالاب سے واپس لانے کے بعد باہر صرف ایک ڈاکو ہی پہرہ دیا کرتا تھا۔ مگر اُس رات دونوں ڈاکو جھونپڑے کے باہر موجود تھے اور کھل کر باتیں کر رہے تھے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اُن کا سردار اور دوسرے ڈاکو وہاں نہیں تھے اور اُنہیں بے تکلفی سے باتیں کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ میں دری پر سر جھکائے کچھ دیر بیٹھا رہا، پھر لیٹ گیا۔ مگر نیند نہیں آ رہی تھی۔ مچھر بھی تنگ کر رہے تھے۔ باہر ڈاکوؤں کے باتیں کرنے کی آواز زیادہ اُونچی ہو گئی تھی اور اُن میں سے ایک نے دوسرے کو گالی بھی دی جس پر دوسرے نے قہقہہ لگایا تھا۔ میں فوراً سمجھ گیا کہ دونوں شراب پی رہے تھے۔ میں اُٹھ کر دروازے کے پاس گیا۔ ایک جگہ بانسوں کے بیچ میں تھوڑی سی درز تھی جس میں سے باہر کا منظر تھوڑا تھوڑا نظر آ جاتا تھا۔ میں نے درز کے ساتھ آنکھ لگا کر باہر دیکھا، دونوں ڈاکو زمین پر بیٹھے تھے۔ شراب کی بوتل اُن کے درمیان پڑی تھی اور گلاس اُن کے ہاتھ میں تھے۔ وہ بے فکر ہو کر شراب پی رہے تھے۔

○○○

میں دری پر واپس آ کر لیٹ گیا۔

مجھے اُن کی شراب نوشی سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد اُنہیں شراب خانہ خراب چڑھ گئی اور واہی تباہی بکنے لگے۔ پھر اُٹھ کر وہاں سے چلے گئے۔ ایک بار پھر وہی بھیانک خاموشی چھا گئی۔ مجھ پر بھی نیند کا عالم طاری ہونے لگا۔ سوچ سوچ کر دماغ تھک گیا تھا۔ آنکھیں اپنے آپ بند ہو رہی تھیں۔ مجھے کسی کے قدموں کی آواز سنائی دی۔ آواز جیسے خواب میں آتی محسوس ہوئی تھی۔ میں عالم غنودگی میں ہی رہا۔ اب ایسی آواز آئی جیسے کوئی باہر سے جھونپڑے کے دروازے پر لگا ہوا بانس کا کھٹکا الگ کر رہا ہو۔ میں نے لیٹے لیٹے آنکھیں کھول دیں۔ جب مجھے رات کو تالاب سے واپس جھونپڑی میں لایا جا چکا ہوتا تھا تو اس کے بعد کوئی ڈاکو وغیرہ میری جھونپڑی میں نہیں آتا تھا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہیں کوئی جلاد میرے لئے موت کا پروانہ لے کر تو نہیں آ گیا؟ میں جلدی سے اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ کونے میں بانس کے ساتھ لٹکی ہوئی لالٹین دھیمی روشنی دے رہی تھی۔

میری نگاہیں جھونپڑی کے دروازے پر لگی تھیں۔ دروازہ آہستہ سے کھلا اور ایک عورت اندر آ گئی۔ اُس نے اندر آتے ہی دروازہ بند کر دیا۔ میں نے اُسے پہچان لیا۔ یہ وہ ادھیڑ عمر کی عورت تھی جو ڈاکوؤں کے ڈیرے پر اُن کے برتن وغیرہ دھوتی تھی، کھانا پکاتی تھی اور میلے کپڑے ندی پر لے جا کر دھو کر سکھاتی تھی۔ میں بڑا حیران ہوا کہ آدھی رات کو میرے پاس یوں چوری چھپے آنے کی اس عورت کو کیا ضرورت پڑ گئی ہے؟ وہ تقریباً دوڑ کر میرے پاس آ کر بیٹھ گئی اور سانس لے کر بولی۔

''تم مسلمان ہو ناں؟''

میں نے جواب دیا۔ ''اللہ کا شکر ہے کہ میں مسلمان ہوں۔''

وہ بولی۔ ’’مجھے کلمہ پڑھ کر سناؤ!‘‘

میں حیرت سے اُس کو تک رہا تھا کہ یہ اچانک اسے کیا ہو گیا ہے؟ بہرحال میں نے کلمہ پاک پڑھ کر سنایا۔ کلمہ پاک سنتے ہی اُس نے اپنی ساڑھی کے اندر چھپی ہوئی چھری نکالی اور جلدی جلدی میرے پاؤں کی رسّی کاٹنے لگی۔ میں اور زیادہ حیران ہوا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ مجھے وہاں سے فرار کرانے آئی ہے۔ میں کچھ نہ بولا۔ رسّی بڑی مضبوط تھی۔ اُس عورت نے چھری مجھے پکڑا دی اور کہا۔

’’تم خود کاٹو...... دیر نہ لگانا۔‘‘

میں جلدی جلدی رسّی کاٹنے لگا۔ میں نے کہا۔ ’’تمہاری مہربانی ہے کہ تم میرے لئے اتنا خطرہ مول لے رہی ہو۔ مگر تمہیں معلوم ہی ہے کہ میرے ساتھ میری ہندو بیوی بھی یہاں قید ہے۔ میں اُس کے بغیر کیسے بھاگ سکتا ہوں؟‘‘

وہ بولی۔ ’’اُس کا بھی بندوبست ہو جائے گا۔ جلدی جلدی کاٹو۔ اتنا وقت نہیں ہے۔ شرابی دُھت پڑے ہیں۔ اُن میں سے کسی کو بھی ہوش آ گیا تو تمہارے ساتھ میں بھی قتل کر دی جاؤں گی۔‘‘

میں نے رسّی کاٹ ڈالی اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ بھی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ چھری میرے ہاتھ میں ہی تھی۔ اُس نے مجھے جھونپڑی کے اندر دروازے کے پاس ہی کھڑے رہنے کا اشارہ کیا اور چھری میرے ہاتھ سے لے کر باہر نکل گئی۔ میں نے ذرا سا دروازہ کھول کر باہر دیکھا۔ اندھیرے میں وہ نیک دل عورت مجھے اُس طرف جاتی نظر آئی جس طرف اُرملا قید تھی۔

میں خدا سے دُعائیں مانگنے لگا کہ کوئی ڈاکو پہرے پر گشت لگاتا اس طرف نہ آ نکلے۔ سردار سمیت ڈاکوؤں کے واردات کرنے جانے کی وجہ سے پیچھے جو چند ایک ڈاکو رہ گئے تھے اُنہیں کھلی چھٹی ضرور مل گئی تھی اور وہ خوب شرابیں پی کر دُھت ہو چکے تھے۔ اس کے باوجود مجھے ڈر تھا کہ ایک آدھ ڈاکو ڈیرے کے آس پاس پہرہ ضرور دے رہا ہو گا۔ یہ پہرے دار گشت لگاتا اس طرف آ سکتا تھا۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو رہی تھیں۔ میں بار بار اُس طرف اندھیرے میں دیکھتا جس طرف وہ عورت گئی تھی۔

پھر مجھے درختوں کے نیچے اندھیرے میں سے دو انسانی سائے باہر نکلتے نظر آئے۔ اُن میں ایک تو وہی نیک دل عورت تھی اور دوسری اُرملا۔ میری جھونپڑی سے کوئی پچاس قدم پیچھے ہی اُس نے اُرملا کو ایک درخت کے پیچھے وہیں کھڑا رہنے دیا اور خود دوڑ کر میرے پاس آ کر بولی۔ ’’جلدی سے میرے ساتھ آ جاؤ!‘‘

ہم اُس درخت کے پاس آ گئے جہاں اُرملا کھڑی تھی۔ وہ عورت ہمیں تیز تیز چلاتی ڈاکوؤں کے ڈیرے سے بہت دُور لے گئی۔ آگے وہی ندی آ گئی جہاں اُرملا نے غسل کیا تھا۔ ہم ندی میں سے گزر گئے۔ دوسرے کنارے پر سے گھنا جنگل شروع ہو جاتا تھا جو رات کی دہشت ناک تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔

عورت رُک گئی۔ اُس نے جیب سے ایک پوٹلی نکالی۔ اُس میں کچھ روپے اور ریزگاری بندھی ہوئی تھی۔ پندرہ بیس روپے ہوں گے۔ اُس نے وہ روپے مجھے دے کر کہا۔ ’’میرے پاس محنت کی کمائی اس وقت یہی ہے۔ اسے رکھ لو! میں بھی مسلمان ہوں۔ مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ تم بھی مسلمان ہو اور ظالم ٹھاکر تم دونوں کو قتل کرنے والا ہے۔ خدا نے میری سن لی اور آج مجھے موقع مل گیا کہ میں تمہیں یہاں سے بھگا دُوں۔ اب سنو! یہ جنگل پہلے پہلے بڑا گنجان ہے، آگے کھل جائے گا۔ جنگل میں بائیں ہاتھ کو چلتے جانا۔ دائیں ہاتھ کو مت ہونا۔ صبح تک تم جنگل سے نکل جاؤ گے۔ آگے چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں شروع ہو جائیں گی۔ ان کے بعد پھر جنگل آ جائے گا۔ اگر تم اُس جنگل سے نکل گئے تو تمہیں دریا کا پُل نظر آئے گا۔ اُس پُل کے اس جانب ایک ریلوے سٹیشن ہے۔ وہاں سے ریل گاڑی میں بیٹھ کر اپنے شہر چلے جانا۔‘‘

اس کے بعد اُس نیک دل مسلمان عورت نے باری باری میرا اور اُرملا کا ماتھا چوما اور واپس چلی گئی۔ ہم بھی بڑی تیزی سے سامنے والے جنگل میں داخل ہو گئے۔ پھر وہی جنگل تھا اور جنگل کی ڈراؤنی تاریکیاں تھیں۔ لیکن مسلمانوں کے دشمن ٹھاکر ڈاکو کے ڈیرے سے جان بچا کر نکل آنے کی ہمیں بڑی خوشی تھی۔ یہ قدرت کا ایک معجزہ ہی ہوا تھا۔ ورنہ اُن ظالم جابر ہندوؤں کی قید سے نکلنا اتنا آسان کام نہیں تھا۔ اب ہمارے سروں پر دو تلواریں لٹک رہی تھیں۔ ایک تو یہ خطرہ لگا تھا کہ ٹھاکر ڈاکو اپنے خونی گروہ کے ساتھ اسی طرف وارداتیں کرنے گیا ہوا ہے۔ کہیں اُس سے آمنا سامنا نہ ہو جائے۔

دوسرے سیٹھ کیشو کے اُن دو خونی بھیڑیوں کا خطرہ تھا کہ وہ اچانک کسی طرف سے نمودار نہ ہو جائیں۔ وہ انہی جنگلوں میں ہمیں تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ تیسرا خطرہ جنگل کے درندوں کا تھا۔ شیر، چیتے عام طور پر رات کے اندھیرے میں ہی اپنے پیٹ کی آگ بجھانے کو نکلتے ہیں۔ اگر وہ ہم پر حملہ کر دیتے تو ہمارے پاس اپنے بچاؤ کے لئے ایک چاقو تک نہیں تھا۔ ہم ان ہلاکت خیز خطرات سے چشم پوشی نہیں کر سکتے تھے۔

ہمیں ان کے تمام امکانات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اور ان کے سدباب کی تدبیریں کرتے ہوئے اس تاریک جنگل سے باہر نکلنا تھا جہاں موت ہر قدم پر ہمارا پیچھا کر رہی تھی۔ ڈاکوؤں کی نیک دل مسلمان نوکرانی نے بتایا تھا کہ جنگل ختم ہو گا تو آگے دریا کا پُل آئے گا۔ اُس پُل کی دوسری طرف کوئی ریلوے سٹیشن ہے جہاں سے ہمیں کسی بھی طرف جاتی ہوئی گاڑی مل جائے گی۔ ہماری منزل دریا کا پُل تھا۔ بارش کی وجہ سے جنگل میں کئی جگہوں پر زمین دلدلی بنی ہوئی تھی۔ جہاں زمین نشیبی تھی وہاں بارش کا پانی بھر گیا تھا۔ اُرملا بہت تھک چکی تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ کسی جگہ بے دم ہو کر نہ بیٹھ جائے۔ لیکن وہ ایک سمجھدار اور مضبوط قوتِ ارادی والی عورت تھی اور محض اپنی قوتِ ارادی کے بل پر چلی جا رہی تھی۔ جنگل کا اندھیرا ہمارے راستے کی رُکاوٹ نہیں بن رہا تھا۔ جتنا نظر آنے کی ہمیں ضرورت تھی اتنا ہمیں نظر آ رہا تھا۔ پریشانی صرف اس بات کی تھی کہ ہم سیدھ میں نہیں چل رہے تھے۔ گھنی خاردار جھاڑیاں اور گنجان درختوں کے جھنڈ جس طرف ہمیں راستہ دیتے تھے ہمیں اُسی طرف جانا پڑتا تھا۔ جس کی وجہ سے ہم اصل سمت سے ہٹ کر بار بار اِدھر اُدھر ہو جاتے تھے۔

ایک جگہ اُرملا تھک کر بیٹھ گئی۔ میں اندھیرے میں جنگل میں کان لگا کر سننے کی کوشش کرنے لگا کہ کوئی درندہ موقع کی تلاش میں ہمارا پیچھا تو نہیں کر رہا؟ یا کوئی ڈاکو یا سیٹھ کیشو راؤ کا کوئی خونخوار بھیڑیا تو ہماری تاک میں نہیں ہے؟ جنگل میں اتنی گہری خاموشی تھی کہ پتا کھڑکنے کی آواز بھی سنائی دے سکتی تھی۔ پھر میں بھی اُرملا کے پاس دم لینے کو بیٹھ گیا۔ اُس سے ایسی باتیں کرنے لگا جس سے اُس کا حوصلہ بڑھے۔ میں نے اُسے کہا۔

’’مجھے معلوم ہے اُرملا کہ تمہیں اس قسم کے حالات سے کبھی واسطہ نہیں پڑا۔ لیکن اب کیا، کیا جائے؟ کچھ باتیں مقدر میں لکھی جا چکی ہوتی ہیں اور وہ ضرور ہو کر رہتی ہیں۔

آدمی کا کام یہ ہے کہ اس قسم کی تکلیفوں کا صبر شکر سے مقابلہ کرے۔‘‘

اُرملا نے ایک درخت سے ٹیک لگا رکھی تھی۔ اندھیرے میں اُس کا چہرہ نیچے کو جھکا ہوا تھا۔ اُس نے چہرہ اُوپر اُٹھایا، میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور بولی۔

’’یہ سب کچھ میری وجہ سے ہوا ہے۔ میں جانتی ہوں تم پر یہ مصیبتیں صرف میری وجہ سے آئی ہیں۔ مجھے معاف کر دینا۔‘‘

اور اُس پر رقت سی طاری ہونے لگی۔ میں نے اُسے اپنے ساتھ لگا لیا اور اُس کا سر چوم کر کہا۔ ’’ایسی باتیں کیوں کرتی ہو؟ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں کہ یہ سب کچھ تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔ میں تو اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھتا ہوں کہ قدرت نے میری مدد کی اور میں تمہیں موت کے منہ سے نکال کر لے آیا۔ ذرا سوچو! مصیبتیں تو اب ختم ہو چکی ہیں۔ اس جنگل کے بعد دریا کا پُل آئے گا۔ پُل پار کرنے کی دیر ہے کہ ہم ریلوے سٹیشن پر ہوں گے۔ اور وہاں سے کسی نہ کسی گاڑی میں بیٹھ کر جے پور پہنچ جائیں گے۔‘‘

’’ہاں۔‘‘ اُرملا کی آواز میں کچھ توانائی آ گئی تھی۔ ’’خدا کرے کہ ہم خیریت کے ساتھ سٹیشن پر پہنچ جائیں۔‘‘

’’ضرور پہنچ جائیں گے۔‘‘ میں نے اُرملا کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ’’ہمیں زیادہ دیر نہیں رُکنا چاہئے۔ مجھے ڈاکوؤں کا اور جنگلی درندوں کا اتنا خوف نہیں ہے جتنا خوف اُس راکھشش سیٹھ کے خونخوار غنڈوں کا ہے۔‘‘

میں نے اُسے مزید حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔ ’’جب تک میں تمہارے ساتھ ہوں تمہاری طرف کوئی بری نگاہ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا۔‘‘

چلتے چلتے اُرملا میرے ساتھ لگ گئی۔ میں نے اندھیرے میں اُرملا کو ایک نظر دیکھا، اُس کے چہرے پر بڑی دُھندلی سی مسکراہٹ تھی۔ یہ مسکراہٹ ایک مدت کے بعد میں نے اُس کے چہرے پر دیکھی تھی۔ یہ جنگل ایسے تھے کہ جہاں دن کے وقت بھی شکاری لوگ اپنے بچاؤ کا بڑا بندوبست کر کے آتے تھے اور رات کے وقت تو کوئی تجربہ کار شکاری ہی ان جنگلوں میں آنے کی جرأت کرتا تھا۔ مجھے اگر ان جنگلوں میں گھومنے پھرنے کا تجربہ نہ ہوتا اور ان جنگلوں کے خطرات سے آگاہ نہ ہوتا تو شاید میں بھی حوصلہ ہار دیتا۔ لیکن میں اس قسم کے جنگلوں کی بڑی خاک چھان چکا تھا۔ اور پھر جب ایک

ایسی ہستی ساتھ ہو جس سے آپ دل و جان سے محبت کرتے ہوں اور جس کی زندگی آپ کو اپنی زندگی سے زیادہ عزیز ہو تو پھر آدمی کسی خطرے کو خاطر میں نہیں لاتا۔

چلتے چلتے ہم جنگل میں کافی دُور نکل چکے تھے۔ جنگل کا گہرا اندھیرا کچھ کچھ چھٹنے لگا تھا۔ درختوں کا گھنا پن کم ہو گیا تھا اور ہم اندھیرے میں زیادہ دُور تک دیکھ سکتے تھے۔ میں نے اُرملا سے کہا۔ ''لگتا ہے جنگل ختم ہو رہا ہے۔''

جنگل کے گنجان ماحول کی اس تبدیلی کو وہ بھی محسوس کر رہی تھی۔ کہنے لگی۔ ''ہاں...... مجھے بھی ایسا لگتا ہے۔''

پھر ایسا ہوا کہ پہلے جو درخت بالکل ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ کھڑے تھے، اب وہ دُور ہٹ گئے تھے اور دُور دُور جھنڈوں کی شکل میں نظر آنے لگے تھے۔ اب آسمان بھی نظر آنے لگا تھا جس کو بادلوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ ہم ایک جگہ رُک گئے۔ میں نے بڑے غور سے اِردگرد کا جائزہ لیا۔ سمت کا کوئی اندازہ نہیں رہا تھا۔ کسی دریا کا کوئی پُل دُور دُور تک نظر نہیں آ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد بادلوں میں مشرق کی جانب ہلکی ہلکی سفیدی نمودار ہونے لگی۔ میں نے اُرملا سے کہا۔

''دن نکلنے والا ہے اُرملا! وہ دیکھو! مشرقی اُفق پر روشنی سی ہو رہی ہے۔ میرا خیال ہے ہمیں مشرق کی طرف جانے کی بجائے اس سے ہٹ کر تھوڑا مغرب کی طرف چلنا چاہئے۔ کیونکہ جے پور اور بمبئی کا علاقہ مغرب کی سمت ہی ہے۔''

چنانچہ ہم وہاں سے اُٹھے اور مشرقی اُفق سے بائیں طرف ہٹ کر چلنے لگے۔ چونکہ علاقہ میدانی شروع ہو گیا تھا اور درختوں کا گھنا پن ختم ہو گیا تھا اور جنگلی جھاڑیاں بھی ہماری راہ میں رُکاوٹ نہیں بن رہی تھیں اس لئے ہم نسبتاً زیادہ آسانی سے چل رہے تھے اور ہماری رفتار بھی تھوڑی تیز ہو گئی تھی۔

ہم کوئی ایک ڈیڑھ میل چلے ہوں گے کہ بادلوں میں صبح کا اُجالا چاروں طرف پھیل گیا۔ ہم نے خدا کا شکر ادا کیا اور چلتے چلے گئے۔ چلتے چلتے درختوں کے ایک جھنڈ کے قریب سے گزر کر دوسری طرف آئے تو زمین سے اُونچی ایک سیاہ لکیر سی دکھائی دی۔ میں نے لکیر اُرملا کو دکھائی اور کہا۔ ''میرا خیال ہے یہ دریا کا پُل ہی ہے۔''

''خدا کرے ایسا ہی ہو۔'' اُرملا نے تھکی ہوئی آواز میں کہا۔

میرا اندازہ صحیح نکلا۔ وہ دریا کا پُل ہی تھا۔ کافی بڑا پُل تھا۔ آخر ہم دریا پر پہنچ گئے۔ ہم وہیں بیٹھ گئے۔ دریا زیادہ چوڑا نہیں تھا۔ دوسرے کنارے کے درخت صاف نظر آ رہے تھے۔ پُل جو دریا کے اُوپر ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک چلا گیا تھا آہنی جنگلے کی طرح کا تھا۔ ہم ابھی پُل سے کچھ فاصلے پر تھے۔ ہم نے دریا پر منہ ہاتھ دھویا، پانی پی کر پیاس بجھائی اور اُس طرف چل پڑے جہاں سے دریا کا پُل شروع ہوتا تھا۔ ریل کی پٹڑی پُل کے آہنی جنگلے کی سرنگ میں سے گزرتی تھی۔ اُرملا کہنے لگی۔

''اُس عورت نے صحیح کہا تھا۔ آگے ضرور کوئی ریلوے سٹیشن ہو گا۔''

''میرا تو خیال ہے کہ پُل کی دوسری طرف ہی سٹیشن ہے۔''

ہم ریلوے لائن کے اُوپر چڑھ گئے۔ دن کی روشنی اگرچہ بادلوں کی وجہ سے پھیکی پھیکی تھی مگر چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ ریلوے لائن کی دونوں جانب پیدل چلنے کا تنگ سا راستہ بنا ہوا تھا۔ ہماری بائیں جانب اُونچے اُونچے سرکنڈوں کی اتنی گھنی جھاڑیاں تھیں کہ ان کے پار کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ سرکنڈوں کی یہ دیوار پُل جہاں شروع ہوتا تھا وہاں تک چلی گئی تھی۔ ہم ان سرکنڈوں کی دیوار کے بالکل ساتھ ساتھ چل رہے تھے اور باتیں بھی کرتے جا رہے تھے۔ میں اُرملا سے کچھ کہنے کے بعد چپ ہوا تو اُرملا مجھے اُس کے جواب میں کچھ کہہ رہی تھی کہ اچانک مجھے ایک تیسری آواز سنائی دی۔ میں اُرملا کو خاموش رہنے کا اشارہ کر کے وہیں رُک گیا۔ آواز ایسی تھی جیسے کوئی درندہ سرکنڈوں میں سے ہماری طرف بڑھ رہا ہو۔ میں نے سرگوشی میں اُرملا سے کہا۔

''لائن کی دوسری طرف ہو جاؤ!''

وہ جلدی سے ریل کی پٹڑی کے دوسری طرف چلی گئی۔ میں نے اُس کے پیچھے جانے کے لئے قدم اُٹھایا ہی تھ کہ فائر کے دھماکے سے خاموش فضا گونج اُٹھی۔ میں نے چیخ کر اُرملا سے کہا۔ ''پُل کی طرف دوڑو۔''

دھماکے کی آواز پستول کے فائر کی تھی۔ یہ آواز اُرملا نے بھی سن لی تھی اور میں نے دیکھا کہ وہ گھبرا کر پُل کی سرنگ کی طرف دوڑ پڑی۔ میں ریلوے لائن کے اس طرف تھا۔ میں بھی دوڑا۔ چند قدم گیا ہوں گا کہ پیچھے سے ایک اور فائر ہوا...... گولی سنسناتی ہوئی میرے قریب سے نکل گئی۔ میں جھک کر دوڑنے لگا۔ میری نگاہیں اُرملا پر تھیں جو

بڑی مشکل سے بھاگ رہی تھی۔ اتنے میں ایک آدمی اُرملا کے پیچھے دوسری جھاڑیوں میں سے نکلا اور اُس نے اُرملا کو دبوچ لیا۔ میں چھلانگ لگا کر لائن کی دوسری طرف ہو گیا اور دوڑ کر اُس آدمی کو پیچھے سے دبوچ کر نیچے گرا لیا۔ اُس آدمی کے ہاتھ میں پستول تھا۔ میں اُس کے پستول والے ہاتھ کو اُوپر کی طرف رکھنے کی جدوجہد کرنے لگا۔ اُس نے ایک اور فائر کر دیا۔ میں نے پوری طاقت سے جھٹکا دے کر اُس کے ہاتھ سے پستول گرا دیا۔ پستول لائن کی دوسری طرف جھاڑیوں میں گرا۔ اَب میں اور وہ آدمی ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو گئے۔ اتنے میں پیچھے سے ایک اور فائر کا دھماکہ ہوا اور کسی نے چلا کر کہا۔

''میں آ رہا ہوں...... اسے چھوڑنا مت۔''

دوسرا آدمی دوڑ کر ہمارے قریب سے آگے نکل گیا اور اُرملا کو پکڑنے کے لئے اُس کے پیچھے دوڑا تھا۔ میں نے اُن دونوں آدمیوں کو شکل اور لباس سے پہچان لیا تھا۔ یہ وہی دو آدمی تھے جنہیں میں نے سونی گام کے سٹیشن پر دیکھا تھا اور جو سیٹھ کیشو راؤ کے آدمی تھے اور جو ہماری تلاش میں تھے۔ میں اُس زمانے میں کافی طاقتور تھا۔ میں نے بڑی جلدی مار مار کر اُس آدمی کو ادھ مؤا کر دیا جو مجھ سے گتھم گتھا تھا۔ اُسے وہیں چھوڑ کر میں اُرملا کو بچانے کے لئے پُل کی سرنگ کی طرف بھاگا۔

میں نے دُور سے دیکھا کہ اُرملا پل کی سرنگ کے اندر ریلوے لائن کے ساتھ پیدل چلنے کے لئے بنی ہوئی پگڈنڈی پر دیوانہ وار دوڑتی جا رہی تھی اور غنڈہ اُس کے پیچھے پیچھے دوڑ رہا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں پستول تھا مگر وہ اُرملا پر فائر نہیں کر رہا تھا۔ شاید وہ اُسے زندہ پکڑنا چاہتا تھا۔ غنڈہ اُرملا کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا۔ میں ابھی اُس سے فاصلے پر تھا۔ مگر پوری طاقت سے دوڑتا جا رہا تھا۔ اب ایک خوفناک بات ہو گئی۔ ایسی بات جس کا مجھے وہم و گمان تک نہیں تھا۔ غنڈہ، اُرملا کے بالکل قریب پہنچ گیا تھا۔ اُس نے لپک کر اُرملا کو پیچھے سے دبوچنا چاہا تو اُرملا اچانک بائیں طرف ہوئی اور اُس نے پُل کے جنگلے میں سے نیچے دریا میں چھلانگ لگا دی...... اُرملا کو دریا میں چھلانگ لگاتے دیکھ کر میرا دماغ گھوم گیا۔ میں نے اُس آدمی کی بھی پرواہ نہ کی جس کے ہاتھ میں پستول تھا اور جس نے اُرملا کو دبوچنے کی کوشش کی تھی۔ وہ مجھ پر بڑی آسانی سے فائر کر سکتا تھا۔ میں

نے اُسے دھکا دے کر گرایا اور جہاں سے اُرملا دریا میں کودی تھی میں نے بھی وہیں سے دریا میں چھلانگ لگا دی۔

پُل کافی اُونچا تھا۔ میں دریا میں گرتے ہی پانی میں نیچے تک چلا گیا۔ ہاتھ پاؤں چلاتا تیزی سے دریا کی سطح پر آیا اور سامنے دیکھا۔ اُرملا نے ایک بار مجھے بتایا تھا کہ اُسے تیرنا آتا ہے۔ کچھ فاصلے پر میں نے اُرملا کے سر کو دیکھا جو پانی سے باہر نکلا ہوا تھا۔ وہ بری طرح ہاتھ پاؤں چلا رہی تھی۔ صاف لگ رہا تھا کہ اپنے آپ کو ڈوبنے سے بچا رہی ہے۔ یا تو وہ تیرنا بھول گئی تھی اور یا پھر موت کے خوف اور دریا کی دہشت کی وجہ سے اُس سے تیرا نہیں جاتا تھا۔ میں پوری طاقت سے پورا زور لگا کر اُس کی طرف بڑھا۔ دریا کا بہاؤ کافی تیز تھا اور میں بہاؤ کی طرف ہی جا رہا تھا۔ لیکن مصیبت یہ آن پڑی تھی کہ جتنی تیزی سے لہریں مجھے اُرملا کے قریب لے جا رہی تھیں اُتنی تیزی سے ہی دریا کی تیز رفتار موجیں اُسے مجھ سے دُور کرتی جا رہی تھیں۔ میں جلدی جلدی تیرنے لگا۔ اس دوران مجھے اُرملا کا سر دو تین بار دریا کی لہروں میں گم ہوتا نظر آیا۔ ایک بار صرف اُس کے دونوں بازو دریا کی سطح سے باہر آئے۔ وہ بری طرح لہروں پر ہاتھ چلا رہی تھی۔ میں نے پوری طاقت سے چلا کر اُسے آواز دی۔

''اُرملا! میں آ رہا ہوں۔ فکر نہ کرنا۔''

مگر اس وقت اُرملا کا سر پانی کے اندر تھا۔ وہ میری آواز نہیں سن سکتی تھی۔ ایک بار پھر اُس کا سر پانی سے باہر اُبھرا۔ اُبھرنے کے ساتھ ہی سر پانی کے اندر چلا گیا جیسے کسی نے اُسے نیچے کھینچ لیا ہو۔ میں دیوانوں کی طرح تیرتا اُس جگہ پہنچ گیا جہاں اُرملا کا سر پانی میں ڈوبا تھا۔ میں غوطہ لگا کر نیچے چلا گیا۔ مگر دریا کا پانی اس قدر گدلا اور ریتلا تھا کہ مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں پاگلوں کی طرح پانی کے اندر کبھی ایک طرف کو جاتا، کبھی دوسری طرف کو جاتا۔ میرا سانس بھی ختم ہو گیا تھا۔ مجھے سانس لینے کے لئے دریا کی سطح پر آنا پڑا۔ پھر سر باہر نکالتے ہی میں نے ایک لمبا سانس لیا اور پھر ڈبکی لگا دی۔ ایک بار پھر میں گدلے پانی کے اندر دائیں بائیں ہاتھ پاؤں چلاتے ہوئے اُرملا کو تلاش کرنے لگا۔ جب تک میرے رُکے ہوئے سانس نے میرا ساتھ دیا میں اُرملا کو پانی کے اندر تلاش کرتا رہا۔ جب میرا سانس ختم ہو گیا اور منہ کے اندر پانی جانے لگا تو میں دریا

ی سطح پر آ گیا۔

کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ آن کی آن کیا ہو گیا ہے۔ مجھ پر اس خیال سے لرز
طاری ہو رہا تھا کہ اُرملا دریا میں ڈوب چکی ہے اور اب اُس کی تلاش بیکار ہے میں اُس
جگہ رہ کر دائرے کی شکل میں تیرنے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن اتنے بڑے دریا کی وسیع و
عریض لہروں کا دباؤ اور اُن کا زبردست بہاؤ مجھے ایک جگہ ٹکنے نہیں دے رہا تھا۔ میں
گھوم کر پیچھے کی طرف تیرنے لگا۔ لیکن دریا کے اُلٹے رُخ تیز رفتار زبردست دباؤ وال
لہریں مجھے پیچھے کی طرف دھکیل رہی تھیں۔ میں ایک بار پھر ڈبکی لگا کر دریا کے اندر چلا
گیا۔ میں پوری آنکھیں کھول کر دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا مگر پانی میں ملی ہوئی ریت کے
ذرّے میری آنکھوں میں چبھ رہے تھے اور مجھے بار بار آنکھیں بند کرنی پڑ رہی تھیں۔
دوسرے میرا سانس بھی ختم ہو رہا تھا۔ میں تیراکی تو جانتا تھا مگر پانی کے اندر سانس روک
کر زیادہ دیر رہنے کا مجھے زیادہ تجربہ نہیں تھا۔ مجبوراً مجھے دریا کی سطح پر اُبھرنا پڑا۔ میں
آنکھیں پھاڑے دریا کے دُور تک پھیلے ہوئے پاٹ کو دیکھنے لگا۔ دریا کی سطح دُور تک خال
تھی۔ کہیں کسی جگہ اُرملا نظر نہیں آ رہی تھی۔

اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہ رہا کہ میں کب اور کیسے دریا کے دوسرے کنارے
آیا۔ جب میں نے آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ میں دریا کے کنارے جھاڑیوں میں اس
طرح اوندھا ہو کر پڑا تھا کہ میری پنڈلیاں پانی کے ایک گڑھے میں ڈوبی ہوئی تھیں۔
پہلے تو مجھے لگا کہ میں کوئی خواب دیکھ رہا تھا جو اچانک ٹوٹ گیا ہے۔ لیکن جب میں
سر اُٹھا کر دریا کے وسیع پاٹ کو دیکھا تو مجھے سب کچھ یاد آ گیا۔ میں جلدی سے گڑھے
میں سے باہر نکلا اور دریا پر ایک حسرت بھری نگاہ ڈالی اور میری آنکھوں سے اپنے آپ
آنسو بہنا شروع ہو گئے۔ میں نے اپنا چہرہ گھٹنوں میں چھپا لیا اور بچوں کی طرح ہچکیاں
لے لے کر رونے لگا۔ اُرملا کی موت نے میرے دل کو ریزہ ریزہ کر دیا تھا۔ میں
کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ عورت جس کو میں اپنی زندگی سے زیادہ پیار کرتا تھا یوں
اچانک مجھے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر چلی جائے گی۔ اُس کی المناک موت پر م
دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ میں جانے کب تک سر گھٹنوں میں دیئے روتا رہا۔ جب دل
کا غبار ذرا ہلکا ہوا تو آنسو پونچھے اور لمبا سانس لے کر دریا کو ایک بار پھر دیکھا۔ دریا

ں شاید میری نیم بے ہوشی کی حالت میں بہا کر مجھے بہت دُور لے آئی تھیں۔ کیونکہ
یا کا ریلوے پُل کہیں بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔

آس پاس کے ماحول کا نقشہ بھی بدل چکا تھا۔ جنگل اور اس کے گنجان درخت ایک
اہ دیوار کی شکل میں دریا کے دوسرے کنارے سے کافی دُور نظر آ رہے تھے۔ یقین نہیں
رہا تھا کہ اُرملا دریا میں ڈوب گئی تھی۔ کبھی دل میں خیال آتا کہ وہ ڈوبی نہیں تھی۔ وہ تو
رنا جانتی تھی۔ میری طرح اُسے بھی دریا کی تیز رفتار لہریں بہا کر دُور لے گئی ہوں گی۔
سکتا ہے یہاں سے آگے وہ بھی کسی جگہ جھاڑیوں میں بے ہوش پڑی ہو۔ اس خیال
ے ساتھ ہی میں اُٹھ کر دریا کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ آسمان پر بادل جھکے ہوئے تھے۔
ور دُور تک یا تو ویران غیر آباد میدان تھے یا جھاڑیاں تھیں۔ نہ کہیں کھیت تھے نہ آبادی
کا کہیں کوئی نشان تھا۔ دریا کے کنارے کوئی جھاڑی آتی تو میں اُس کے قریب جا کر اُس
کی شاخیں ہٹا ہٹا کر دیکھتا کہ کہیں اُرملا بے ہوش تو نہیں پڑی ہوئی؟ مجھ پر سخت تھکاوٹ
طاری تھی۔ بھوک بھی سخت لگی ہوئی تھی۔ پھر بھی میں اُرملا کی تلاش میں آگے ہی آگے
چلا جا رہا تھا۔ ہوا چل رہی تھی۔ میری پتلون جو پنڈلیوں سے اُوپر تک بھیگی ہوئی تھی اب
سوکھ چکی تھی۔ مجھے پیاس محسوس ہوئی۔ میں ایک جگہ مٹی کے تودوں میں سے نیچے اُتر
گیا۔ دریا کی لہریں کنارے کی اُونچی گھاس تک آ رہی تھیں۔ میں ہاتھ سے پانی کو پیچھے
ہٹانے لگا اور پھر پانی پیا۔ ابھی پیاس نہیں بجھی تھی۔ میں نے ایک بار پھر پانی کے اُوپر
آئے ہوئے تنکوں اور پتوں کو پیچھے ہٹایا تو میری آنکھیں ایک جگہ جم کر رہ گئیں۔ پانی کی
تہہ میں ایک چپل پڑی تھی۔ میں نے جلدی سے ہاتھ ڈال کر اُسے باہر نکالا اور مجھ پر
سکتہ سا طاری ہو گیا۔ میں نے اُرملا کی چپل کو پہچان لیا۔ چمڑے کی یہ چپل اُرملا کی ہی
تھی۔ یہ چپل کا ایک پاؤں تھا جو تیرتا ہوا کسی طرح کنارے کے ساتھ آ کر لگ گیا تھا۔
میں نے اسے اپنے سینے سے لگا لیا اور میری آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب اُمڈ پڑا۔
دیر تک اسی جگہ بیٹھا اُرملا کی یاد میں آنسو بہاتا رہا۔

اب کوئی شک شبہ نہیں رہا تھا کہ اُرملا کو دریا کی بے رحم لہروں نے نگل لیا ہے۔ جب
میرے دل کا غبار ذرا ہلکا ہوا تو میں وہاں سے اُٹھ کر آگے چلا کہ اگر اُرملا کی چپل یہاں
ملی ہے تو اُس کی لاش بھی یہیں کہیں ہوگی۔ میں دریا کے ساتھ کافی دُور تک نکل گیا لیکن

ارملا کی لاش دریا کے کنارے کہیں بھی دکھائی نہ دی۔ میں نے اُرملا کی چپل کے ایک
پاؤں کو اپنی پتلون کی جیب میں رکھ لیا۔ اس خیال سے کہ جے پور جا کر اُس کے
عزیزوں کو وہ چپل دے دُوں گا۔ کیونکہ ان لوگوں کا عقیدہ تھا کہ اگر مرنے کے بعد اُن
کی لاش کا پوری رسومات کے ساتھ کریا کرم کر کے نذر آتش نہ کیا جائے اور جلانے کے
بعد لاش کی ہڈیوں اور راکھ کو دریائے گنگا کی لہروں میں نہ بہایا جائے یا کسی دوسرے دریا
کی لہروں کے سپرد نہ کیا جائے یا اسے فضا میں نہ بکھیر دیا جائے اور ہڈیوں کو کسی برتن
میں ڈال کر زمین میں کسی جگہ دفن نہ کیا جائے تو مرنے والے کی آتما جنم جنم تک بھٹکتی
رہتی ہے اور اسے سکون نصیب نہیں ہوتا۔

یہ ساری باتیں مجھے خود اُرملا نے ایک بار بتائی تھیں۔ اُس نے یہ بھی بتایا تھا کہ اُن
کے دھرم کے کسی آدمی کو جنگل میں اگر شیر کھا جائے تو وہ اُس جگہ سے اُس کی بچی کچی
ہڈیاں اُٹھا کر لے آتے ہیں اور انہیں آگ میں جلا کر دفن کر دیتے ہیں۔ اگر ہڈیاں نہ
ملیں اور اس کے بدن کا کوئی کپڑا، کپڑے کا کوئی ٹکڑا یا پاؤں کا جوتا ہی مل جائے تو اسے
بھی پوری رسم کے ساتھ جلا کر اُس کی راکھ دریا میں بہا دی جاتی ہے۔ اس طرح سے
مرنے والے کی رُوح کو شانتی مل جاتی ہے۔ اسی خیال سے میں نے اُرملا کے چپل کا
ایک پیر اپنی جیب میں رکھ لیا تھا۔ میں نے اپنے ہاتھ کو دیکھا، میرے ہاتھ کی اُنگلی میں
اُرملا کی دی ہوئی انگوٹھی اسی طرح پڑی ہوئی تھی۔ میری آنکھیں بھر آئیں۔ کتنا خیال تھا
اُرملا کو میرا۔ جادو ٹونہ کرنے والی میری جان کی دشمن کانچی سے مجھے محفوظ رکھنے کے لئے
اُرملا نے کیا کچھ نہیں کیا؟ اُس میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ مجھے کانچی سے نجات دلا سکے
یہ اُس کی پہنچ سے باہر تھا۔ لیکن یہ انگوٹھی دے کر اُس نے مجھے کانچی کے کسی بھی ہلاکت
خیز وار سے بچا لیا تھا۔ مجھ پر کیا گیا اُس نیک دل، خاموش طبع، پاک صاف اور بلند
خیالات رکھنے والی عورت کا ایک ایک احسان یاد آ رہا تھا۔ اُس نے کبھی بھی فلمی
ہیروئنوں کی طرح مجھ سے اپنی محبت کا اظہار نہیں کیا تھا لیکن میرے ساتھ اُس کا ایک
ایک عمل اُس کی محبت کی نشاندہی کرتا تھا جو اُسے مجھ سے تھی۔

اُرملا کی اچانک اور المناک موت نے میرے دل پر شدید اثر کیا تھا۔ مجھے لگ رہا
تھا کہ میں آدھا رہ گیا ہوں۔ بے یار و مددگار رہ گیا ہوں۔ میرے سر پر سے اُس کی

محبتوں اور ایثار کا سایہ اُٹھ گیا ہے۔ اگر خودکشی دین میں حرام نہ ہوتی تو میں اسی وقت
دریا میں ڈوب کر مر جاتا۔ لیکن مجھے بہرحال صبر شکر کے ساتھ زندہ رہنا تھا۔ اُرملا میرے
پاس نہیں تھی لیکن اُس کی بے پناہ محبت کی یاد میرے پاس تھی۔ یہ وہ قیمتی نشانی تھی، یہ وہ
توانائی تھی جس کے سہارے میں اپنی باقی زندگی گزار سکتا تھا۔ اگر آپ نے کبھی کسی سے
سچی محبت کی ہے اور اس محبت کا زخم کھایا ہے تو آپ میرے دلی جذبات کا اندازہ کر سکتے
ہیں۔ میں نے اپنی پتلون کی پچھلی پاکٹ میں سے وہ کرنسی نوٹ اور تھوڑی سی جو ریزگاری
تھی وہ باہر نکال کر گنی۔ اتنی رقم تھی کہ میں اس کی مدد سے جے پور بھی پہنچ سکتا تھا اور کچھ
کھا پی کر بھوک بھی مٹا سکتا تھا۔

مجھے سب سے پہلے یہ دیکھنا تھا کہ میں کہاں ہوں؟ اور جہاں بھی ہوں وہاں سے
کوئی ریلوے سٹیشن کس طرف ہے اور کتنے فاصلے پر ہے؟ میں نے اُرملا کے غم کو اپنے
سینے سے لگا کر اپنے دماغ سے کام لینا شروع کر دیا تھا۔ میں دریا سے ہٹ کر اُس طرف
چلنے لگا جس طرف کچھ فاصلے پر مجھے درختوں کا ایک چھوٹا سا جھنڈ دکھائی دے رہا تھا۔
مجھے یقین تھا کہ وہاں ضرور کوئی گاؤں یا بستی وغیرہ ہوگی۔ بادل بدستور چھائے ہوئے
تھے مگر بارش رُکی ہوئی تھی۔ یہی بڑی غنیمت تھی۔ چلتے چلتے میں درختوں کے جھنڈ کے
پاس آیا تو دیکھا وہاں ایک چھوٹی سی پہاڑی کے دامن میں کچھ جھونپڑی نما مکان بنے
ہوئے تھے۔ ایک طرف درخت کے نیچے گائے بندھی ہوئی تھی اور ایک بوڑھا بانس کی
چارپائی پر بیٹھا ناریل کی گڑگڑی پی رہا تھا۔ شکل ہی سے معلوم ہو گیا کہ وہ ہندو ہے۔ یہ
سارا علاقہ واکثریت کا تھا۔ مجھے اتنا تجربہ ہو گیا تھا کہ میں شکل دیکھ کر ہی بتا سکتا تھا
کہ یہ ہندو ہے۔ میں نے اُس کے پاس جا کر اُسے رام رام کہا۔ اُس نے گڑگڑی منہ
کے آگے سے ہٹا کر میری طرف دیکھا۔ یہ میں آپ کو بتاتا چلوں کہ یہ دیہاتی لوگ اُردو
ضرور بولتے تھے مگر اُن کی اُردو میں ننانوے فیصد الفاظ ہندی زبان کے اور وہ بھی
دیہاتی ہندی بولی کے ہوتے تھے۔ میں اُن کی زبان کو آسانی سے سمجھنے لگا تھا اور اسی
زبان میں بات بھی کر سکتا تھا۔ میں اُن کی زبان کو یہاں لکھوں تو ہو سکتا ہے آپ آسانی
سے مفہوم تک نہ پہنچ سکیں اس لئے میں نے ہمیشہ اُن کی زبان کے مکالموں کو آسان
اُردو زبان میں ہی لکھا ہے۔ یہ دیہاتی لوگ پڑھے لکھے نہیں ہوتے۔ بڑے کٹر توہم

پرست ہندو ہوتے ہیں مگر بڑے مہمان نواز ہوتے ہیں۔ جب اسے پتہ چلا کہ مجھے بھوک لگی ہے تو اُس نے مجھے چارپائی پر بٹھایا اور خود میرے لئے کھانا وغیرہ لینے ایک جھونپڑی نما مکان میں چلا گیا۔

وہ میرے لئے ایک تھالی میں اُبلے ہوئے نمکین چاول اور ایک طرف رکھی ہوئی سبزی لے کر آیا۔ یہ بینگن کی سبزی تھی۔ مجھے سخت بھوک لگی تھی۔ میں نے خاموشی سے چاول کھا کر پانی پیا۔ یہ میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ اگر کبھی آپ کو ان دیہات میں جانے کا اتفاق ہو اور یہ لوگ آپ کے لئے کھانا پانی لائیں تو پہلی بات یہ ہے کہ کھانا کھا کر تھالی کو چارپائی پر مت رکھیں۔ اسے نیچے زمین پر رکھ دیں اور پانی گلاس کو منہ لگا کر نہ پئیں، بلکہ ایک ہاتھ میں گلاس تھام کر اسے منہ کے اُوپر لے جائیں۔ اُوپر کی طرف منہ کر کے منہ کھول کر گلاس میں سے پانی حلق میں انڈیل کر پئیں۔ شروع شروع میں اس طرح پانی پینے سے اچھو آ جاتا تھا لیکن پھر میں بڑے آرام سے پانی پی جاتا تھا۔ ہندوؤں میں چھوت چھات حد سے زیادہ بڑھی ہوئی ہے۔ وہ ہندو کا جھوٹا پانی نہیں پیتے اور اُس کی جھوٹی تھالی کو خود زمین سے نہیں اُٹھاتے۔ اور مسلمان جس گلاس میں پانی پی لے اور جس تھالی میں کھانا کھالے وہ اُس تھالی اور اُس گلاس کو پھینک دیتے ہیں یا کسی شودر کو دے دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شہروں میں جو ہندوؤں کے ڈھابے یعنی کھانے پینے کے تنور ہیں وہاں چونکہ کبھی کبھار مجبوری کی حالت میں مسلمان بھی آ جاتے ہیں تو وہ مسلمانوں کو مٹی کی رکابیوں اور مٹی کے آبخوروں میں کھانا پانی دیتے ہیں جنہیں مسلمان بعد میں خود ہی توڑ دیتے ہیں۔ اب ہماری نئی پاکستانی نسل کی سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ قائد اعظم نے فرمایا تھا کہ مسلمان ایک علیحدہ قوم ہیں اور وہ ہندوؤں کے ساتھ مل کر نہیں رہ سکتے۔ کیونکہ مسلمانوں کا رہن سہن، ان کا کھانا پینا، ان کا مذہب، ان کا کلچر اور ان کی ثقافت ہندوؤں سے بالکل الگ ہے۔

اُس ہندو بزرگ دیہاتی نے اس علاقے کے بارے میں جو کچھ بتایا اس کے مطابق میں ضلع ہوشنگ آباد سے نکل کر شمال مغرب کی طرف کافی اُوپر نکل آیا تھا۔ دریا کی تیز رفتار لہروں نے مجھے کہیں سے کہیں پہنچا دیا تھا۔ ہندو بزرگ کے کہنے کے مطابق میں فادر فرانسس کی خانقاہ کے علاقے میں آ چکا تھا اور کالی گھاٹ کا سٹیشن وہاں سے ڈھائی

بل کے فاصلے پر تھا۔ اس انکشاف نے مجھے حوصلہ دیا کہ اب مجھے زیادہ دربدری نہیں رنی پڑے گی اور میں شام ہونے تک یا رات کے وقت فادر فرانسس کی خانقاہ میں پہنچ اؤں گا۔ میں نے بوڑھے ہندو دیہاتی کا شکریہ ادا کیا اور اُس سے جدا ہو کر اُس طرف ل پڑا جس طرف اُس دیہاتی نے بتایا تھا کہ کالی گھاٹ کا ریلوے سٹیشن ہے۔ دن ھلنا شروع ہو گیا تھا۔ دُھوپ تو تھی نہیں، دن کی جتنی بھی روشنی تھی وہ بھی کم ہونا شروع وگئی تھی۔

دن کی روشنی بادلوں کے پیچھے اور بھی مدھم پڑ چکی تھی جب میں کالی گھاٹ کے سٹیشن پہنچ گیا۔ یہ سٹیشن بھوپال اور رتلام کے شہروں کے درمیان واقع تھا اور یہ بھی سرسبز اور ارشوں والے جنگلوں سے بھرا ہوا تھا۔ میں اس سٹیشن سے واقف تھا۔ فادر فرانسس کی خانقاہ میں جاتے ہوئے میں اور اُرملا اس سٹیشن سے گزرے تھے۔ یہاں سے مجھے رتلام جانے والی گاڑی مل گئی جس نے رات ہونے سے پہلے پہلے مجھے رتلام پہنچا دیا۔ رتلام کے ایک گھنٹے تک ویران جنگلاتی علاقے میں سے گزرنے کے بعد فادر فرانسس کی خانقاہ مجھے اندھیرے میں دُور سے نظر آ گئی۔ خانقاہ پر گہری خاموشی طاری تھی۔ اندھیرا ابھی تھا۔ مگر ایک کھڑکی میں ہلکی سی روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ فادر فرانسس کی کوٹھڑی ہے جہاں وہ رات کو عبادت کرتے ہیں۔ وہ مجھے اپنی کوٹھڑی میں ہی مل گئے۔ مجھے دیکھ کر خوش بھی ہوئے اور حیران بھی ہوئے۔ کہنے لگے۔

''میرے بچے! تم اتنے دن کہاں رہے؟''

کوٹھڑی میں لیمپ روشن تھا۔ اُس کی روشنی میں میری خستہ حالی کا جائزہ لیا اور بولے۔ ''معلوم ہوتا ہے تم کسی بھاری مصیبت سے نکل کر آ رہے ہو۔ اُرملا کہاں ہے؟''

میں لکڑی کے سٹول پر بے دم سا ہو کر بیٹھ گیا اور غمزدہ آواز میں فادر فرانسس کو سارے واقعات سنا دیئے۔ وہ میری زبان سے نکلے ہوئے ایک ایک لفظ کو بڑے غور سے سنتے رہے۔ جب میں اپنی داستانِ غم بیان کر چکا تو اُنہوں نے افسوس کے انداز میں اپنا سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''مجھے اُرملا کی موت کا سخت صدمہ ہوا ہے۔'' پھر میری طرف دیکھا اور بولے۔

''کیا تمہیں یقین ہے کہ اُرملا دریا میں ڈوب کر مر گئی ہے؟ میرا مطلب ہے تم نے اُس

کی لاش تو دیکھی نہیں، پھر ہم کیسے کہہ سکتے ہیں کہ وہ زندہ نہیں ہے؟''

میں نے پتلون کی جیب سے اُرملا کی ایک چپل نکال کر اُنہیں دکھائی اور کہا۔ ''یہ اُرملا کی چپل ہے جو مجھے دریا کے کنارے کافی آگے جا کر جھاڑیوں میں اُلجھی ہوئی ملی تھی۔

فادر فرانسس چپل کو غور سے دیکھنے لگے۔ ''کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ یہ بات بھی غور طلب ہے کہ اُرملا تیرنا جانتی تھی۔ جو شخص تیرنا جانتا ہو، وہ اتنی آسانی سے نہیں ڈوبا کرتا۔''

میں نے کہا۔ ''لیکن فادر! میں نے خود اُرملا کو دریا میں غوطے کھاتے دیکھا تھا۔ اُس کا سر ڈوب ڈوب کر اُبھر رہا تھا۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ اُس کا سانس ٹوٹ چکا ہے اور وہ ڈوب رہی ہے۔ اگر وہ دریا میں تیر رہی ہوتی تو میں بھی یہی سمجھتا جو آپ سمجھ رہے ہیں۔''

فادر نے سینے پر صلیب کا نشان بنایا اور بولے۔ ''اگر ایسا ہی ہوا ہے تو یہ خداوند کی مرضی تھی۔ جس کے آگے کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ خداوند اُس کی رُوح کو سکون بخشے۔''

پھر اُنہوں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ''تم بیٹھو! میں تمہارے لئے کچھ کھانے کو لاتا ہوں۔''

فادر مجھے کوٹھڑی میں چھوڑ کر چلے گئے۔ کبھی اس کوٹھڑی میں اُرملا بھی میرے ساتھ آئی تھی۔ کوٹھڑی کے در و دیوار مجھے اُس کی یاد دلا رہے تھے۔ میں سر جھکائے غمزدہ ہو کر اُرملا کی یاد میں کھویا رہا۔ فادر کھانا لے کر آ گئے۔ اُنہوں نے بھی رات کا کھانا میرے ساتھ ہی کھایا۔ کھانے کے دوران وہ اُرملا ہی کی باتیں کرتے رہے۔ میں نے اُن سے سرسوتی کے بارے میں پوچھا کہ اُس کا کیا حال ہے اور کیا وہ بھی اُن کی خدمت میں حاضر ہوتی رہتی ہے؟ اس کے جواب میں فادر نے کہا۔

''سرسوتی جب یہاں اپنی آبائی حویلی میں آتی ہے تو کبھی کبھار مجھ سے ملنے ضرور آ جاتی ہے۔ آج کل وہ اپنے شہر والے گھر گئی ہوئی ہے۔ تم بتاؤ اب تمہارا کیا پروگرام ہے؟''

میں نے فادر کو بتایا کہ میں اُرملا کی لاش تلاش نہیں کر سکا۔ صرف اُس کے ایک پیر کی چپل ہی ملی ہے جو میں جے پور اُس کے خاندان والوں تک پہنچانا اپنا فرض سمجھتا ہوں تاکہ وہ مرنے والی کی کریا کرم کی رسم پوری کر سکیں اور یوں اُن کے عقیدے کے مطابق اُرملا کی آتما کو سکون مل جائے۔

فادر فرانسس نے میرے اس جذبے کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔ ''تم نے ٹھیک سوچا

ہے۔ ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق اگر مرنے والے کی لاش کی کوئی ہڈی، کوئی پہنے ہوئے کپڑے وغیرہ کا ہی کریا کرم کر دیا جائے تو مرنے والے کی آتما جنم جنم بھٹکنے سے بچ جاتی ہے۔''

میں سر جھکائے بڑی آزردگی کے ساتھ فادر فرانسس کی باتیں سن رہا تھا۔ آنکھوں کے آگے اُرملا کی شکل بار بار آ جاتی تھی۔ کھانے کے بعد فادر قہوہ لے آئے۔ ہم خاموشی سے قہوہ پینے لگے۔ فادر فرانسس کو اچانک اُرملا کی انگوٹھی کا خیال آیا جو اُس نے خاص طور پر کانچی کے قاتلانہ حملے سے محفوظ رہنے کے لئے مجھے دی تھی۔ میری اُنگلی پر نگاہ ڈالی اور بولے۔ ''یہ انگوٹھی تمہارے پاس ہی رہی ہے ناں؟''

''ہاں فادر!'' میں نے کہا۔ ''میں اس انگوٹھی کو اپنے سے کبھی جدا نہیں ہونے دیتا۔''

فادر نے قہوے کا پیالہ تپائی پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''ذرا اپنا ہاتھ اِدھر کرنا۔''

میں نے انگوٹھی والا ہاتھ اُن کے آگے کر دیا۔ وہ میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بڑے غور سے اُرملا کی انگوٹھی کو دیکھنے لگے۔ میں نے کہا۔

''فادر! یہ تو آپ کو معلوم ہی ہو گا کہ پہلے اس انگوٹھی کا رنگ گولڈن تھا۔ لیکن کانچی نے جب آخری بار مجھ پر اپنے جادو ٹونے کا حملہ کیا تھا تو اس انگوٹھی نے مجھے اُس کے حملے سے بچا تو ضرور لیا تھا مگر انگوٹھی کا رنگ سیاہ پڑ گیا تھا۔

''ہاں۔'' فادر فرانسس بولے۔ ''یہ تو مجھے معلوم ہے۔''

فادر میری انگوٹھی کو چاروں طرف سے دیکھ رہے تھے۔ کہنے لگے۔ ''میں نے ہندوؤں کی کتاب سام وید کا مطالعہ کیا ہوا ہے۔ خاص طور پر اس باب کو میں نے بڑی توجہ سے پڑھا تھا جس میں جادو ٹونے کا ذکر ہے اور دشمن پر جادو ٹونہ کرنے کے مختلف فارمولے اور طریقے بیان کئے گئے ہیں۔ وہاں بڑے واضح الفاظ میں لکھا ہے کہ اگر جادو ٹونہ کرنے والا یا کرنے والی کسی انگوٹھی پر عمل کر کے کسی کو دے اور اس دوران جادو کرنے والی یا جادو کرنے والے کی موت واقع ہو جائے تو اُس کی عمل کر کے دی ہوئی انگوٹھی کے نگینے میں تریڑ (شگاف) پڑ جائے گی۔ لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ اُرملا کی دی ہوئی انگوٹھی کا نگینہ بالکل صحیح سالم ہے۔ اس میں ذرا سی شکن یا تریڑ نہیں ہے۔''

میں بھی انگوٹھی کے نگینے کو غور سے دیکھنے لگا۔ نگینہ بالکل صحیح سلامت اور صاف تھا۔

فادر فرانسس غلط بیانی نہیں کر سکتے تھے۔ وہ بولے۔ ''اگر سام وید کا بیان صحیح ہے تو اس کا یہی مطلب نکلتا ہے کہ اُرملا دریا میں ڈوبی نہیں۔ وہ زندہ ہے۔''

میرے دل میں اُمید کی ایک کرن جاگ پڑی۔ میں نے کہا۔ ''کاش! ایسا ہی ہو۔''

فادر فرانسس نے کہا۔ ''ہندوؤں کے جو چار وید ہیں اُن کو بڑے دانا اور جتی ستی رشیوں نے لکھا ہے۔ اُن کی بعض باتوں سے ہمیں اختلاف ہو سکتا ہے اور ہے۔ لیکن اُن کی بعض باتیں سچی بھی نکلتی ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''لیکن فادر! ہمارے دین اسلام میں جادو ٹونے کو حرام قرار دیا گیا ہے اور میں بھی اسے حرام ہی سمجھتا ہوں اور اسے نہیں مانتا۔''

فادر بولے۔ ''میں کہاں مانتا ہوں؟ میں بھی جادو ٹونے کے خلاف ہوں۔ میں نے یونہی اس کا ذکر کر دیا تھا۔ اچھا اب تم آرام کرو۔ خدا جانے کب سے تمہیں سکون کی نیند نصیب نہیں ہوئی ہوگی۔''

میں نے کہا۔ ''نیند تو جیسے مجھ سے روٹھ چکی ہے فادر!''

فادر فرانسس نے میرا ماتھا چوما اور کہا۔ ''خداوند تمہارے دل کو سکون عطا فرمائے۔ میری چارپائی پر ہی لیٹ جاؤ!''

فادر فرانسس کا بستر ہمیشہ بڑا سادہ اور درویشوں والا بستر ہوتا تھا۔ ایک دری بچھی ہوتی تھی۔ ایک سرہانہ اور مچھروں سے بچنے کے واسطے ایک سفید چادر۔ میں بستر پر لیٹ گیا۔ خدا جانے یہ میری تھکاوٹوں اور کئی راتوں سے جاگنے کا اثر تھا یا فادر فرانسس کی دُعاؤں کا اثر تھا کہ میں تھوڑی ہی دیر بعد گہری نیند سو گیا۔

ایسی گہری نیند آئی کہ دوسرے دن دوپہر کے وقت آنکھ کھلی۔ میں اپنے آپ کو تازہ دم محسوس کر رہا تھا۔ اُرملا کی یاد سے دل بوجھل ضرور تھا۔ وہ تو ایک قدرتی بات تھی۔ اُرملا کی موت کو میں کیسے بھلا سکتا تھا؟ فادر فرانسس کوٹھڑی میں آ گئے۔ کہنے لگے۔

''کیسے ہو میرے بچے؟''

میں نے کہا۔ ''بالکل تازہ دم ہو گیا ہوں فادر!''

وہ مسکرائے۔ کہنے لگے۔ ''یہ بڑی اچھی بات ہے۔ تمہیں تازہ دم ہی رہنا چاہئے میرے بچے! موت تو زندگی کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔ اس سے کوئی نہیں بچ سکتا۔ پھر

اس کا غم کیوں؟ ہاں یہ ضرور ہے کہ جب کوئی اپنا پیارا اور محبت کرنے والا بچھڑ جاتا ہے تو دُکھ ضرور ہوتا ہے۔ تمہیں ایک خبر سنانی تھی۔''

''کون سی خبر فادر؟'' میں نے پوچھا۔

وہ بولے۔ ''سرسوتی آ گئی ہے۔ آج صبح ہی مجھے معلوم ہوا ہے۔ میں نے اُسے پیغام بھجوا دیا ہے کہ شیراز بھی خانقاہ میں پہنچ گیا ہے اور اُرملا کے بارے میں بھی میں نے بتا دیا ہے۔'' پھر فادر نے تھوڑے سے توقف کے بعد پوچھا۔ ''سرسوتی کو اُرملا کی موت کا بتا کر میں نے غلطی تو نہیں کی بیٹے؟''

میں نے کہا۔ ''ایسی کوئی بات نہیں ہے فادر! ایک نہ ایک دن اسے بھی پتہ لگنا ہی تھا۔ اچھا کیا جو آپ نے اُسے بتا دیا۔''

فادر بولے۔ ''میرا خیال ہے وہ اُرملا کا افسوس کرنے تمہارے پاس ضرور آئے گی۔ تم جلدی سے کھانا کھا لو۔''

دوسرے کمرے میں جا کر میں نے غسل خانے میں غسل کیا، کپڑے صاف کر کے پہنے، فادر کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا۔ اتنے میں سرسوتی کا بوڑھا ملازم آ گیا۔ کہنے لگا۔

''سرسوتی دیوی نے پیغام بھیجا ہے کہ اگر شیراز جاگ گیا ہو تو اُسے میرے پاس بھیج دیں۔''

کھانا کھانے کے بعد میں سرسوتی کی پرانی حویلی میں چلا آیا۔ وہ حویلی کے چھوٹے سے برآمدے میں بانس کی پرانی آرام کرسی پر بیٹھی تھی۔ اُس نے سر پر پٹی باندھ رکھی تھی۔ مجھے دیکھ کر اُس کی آنکھوں میں ایک چمک سی آ گئی جسے میں نے خاص طور پر محسوس کر لیا۔ کہنے لگی۔

''شیراز! اُرملا کی موت کا مجھے بہت دُکھ ہوا ہے۔ یہ سب کچھ کیسے ہو گیا؟''

ظاہر ہے سرسوتی کو بھی مجھے ساری رُوداد بیان کرنی پڑی وہ بڑی دلچسپی سے سنتی رہی۔ میں نے اپنی داستانِ غم ختم کی تو بولی۔ ''اُرملا کی موت سے تمہیں جو صدمہ ہوا ہے مجھے اس کا پورا احساس ہے۔ مگر آدمی کا جب وقت آ جاتا ہے تو اس کی موت کا کوئی نہ کوئی بہانہ بن جاتا ہے۔''

میں سرسوتی کے پاس ہی دوسری پرانی اور شکستہ حال سی آرام کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس

دوران بوڑھا ملازم چائے لے کر آ گیا۔ ہم چائے پینے لگے۔ سرسوتی کہنے لگی۔

''میں افسوس کرنے خود تمہارے پاس آتی لیکن کل سے میرے سر میں درد رہنے لگا ہے۔ اس وجہ سے میں نہیں آ سکی۔''

میں نے کہا۔ ''شہر سے کوئی دوائی منگوا لینی تھی۔''

وہ بولی۔ ''منگوالی تھی۔ مگر اس سے بھی کوئی خاص فرق نہیں پڑا۔''

ہم خاموشی سے چائے پینے لگے۔ اس دوران میں نے محسوس کیا کہ سرسوتی نے چائے پیتے ہوئے دو ایک بار میری طرف بڑے غور سے دیکھا تھا۔ کہنے لگی۔

''اب تم نے کیا سوچا ہے؟ میرا مطلب ہے تمہارا پروگرام کیا ہے؟ ہندوستان کا بٹوارہ ہو چکا ہے یہ تو تمہیں معلوم ہی ہو گا۔ مسلمانوں نے اپنا ایک الگ ملک بنا لیا ہے۔ میرا خیال ہے اب تم بھی پاکستان چلے جاؤ گے۔''

سرسوتی نے ٹھیک کہا تھا۔ میرا ارادہ اب پاکستان جانے کا ہی تھا۔ اُرملا کی موت کے بعد میرے لئے ہندوستان میں کوئی کشش باقی نہیں رہی تھی۔ لیکن جانے سے پہلے میں جے پور جا کر اُرملا کی آخری نشانی اُس کی چپل اُس کے رشتے داروں تک ضرور پہنچا دینا چاہتا تھا۔ جب میں نے اس کا ذکر سرسوتی سے کیا تو اُس نے کہا۔

''تمہیں شاید علم نہیں ہے کہ ہندو فرقے جین مت کے مطابق مرنے والے کے جوتوں کا کریا کرم نہیں کیا جاتا۔ ایسا کرنا جینی دھرم والے مہا پاپ سمجھتے ہیں۔''

یہ بات واقعی میرے علم میں نہیں تھی۔ میں نے اُس سے کہا۔ ''کیا تم صحیح کہہ رہی ہو؟''

وہ بولی۔ ''مجھے اس معاملے میں جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے؟ جینی دھرم کی کتابوں میں جو کچھ لکھا ہے میں نے وہی تمہیں بتایا ہے۔ تم بے شک اُرملا کی چپل اُس کے گھر والوں کو جا کر دے دو۔ وہ اس کا کبھی کریا کرم نہیں کریں گے۔''

میں نے تعجب کے ساتھ کہا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ اُرملا کی آتما جنم جنم میں بھٹکتی رہے گی اور اُس کی رُوح کو کبھی شانتی نہیں ملے گی؟''

وہ بولی۔ ''جین مت کے عقیدے کے مطابق تو ایسا ہی ہو گا۔ اُن کے دھرم شاستروں میں یہی لکھا ہے۔ تم بے شک جین مت کے کسی گیانی سے پوچھ کر اپنی تسلی کر لو۔ بلکہ جین مت کے شاستروں میں لکھا ہے کہ اگر مرنے والے کو جوتوں سمیت جلایا

جائے گا تو اُس کی آتما کو سخت تکلیف ہو گی اور اگنی دیوی کی آگ اسے ہمیشہ جلاتی رہے گی۔ ہاں اگر اُرملا کے کپڑے کا کوئی ٹکڑا، اُس کی ساڑھی وغیرہ مل جاتی تو اس کا کریا کرم ہو سکتا تھا اور اُرملا کی آتما کو شانتی نصیب ہو سکتی تھی۔ اب تو وہ بے چاری ہر جنم میں اشانت رہے گی۔ بھٹکتی رہے گی اور اُسے کسی جنم میں بھی شانتی نہیں مل سکے گی۔''

سرسوتی نے مجھے ایک نئی پریشانی میں ڈال دیا تھا۔ میں اس نئی اُلجھن میں پھنس گیا تھا کہ اُرملا کی رُوح کی شانتی اور سکون کے لئے کیا کروں؟ مجھے یہ ہرگز گوارا نہیں تھا کہ میری وجہ سے اُرملا کی آتما مرنے کے بعد جنم جنم میں بھٹکتی پھرے، بے چین اور بے قرار رہے۔ میں نے سرسوتی سے کہا۔

''سرسوتی! تم ہندو مت اور جین مت دونوں کا علم رکھتی ہو۔ کیا اس کا کوئی اُپائے نہیں ہے؟ تمہارے شاستروں میں کہیں نہ کہیں یہ ضرور لکھا ہو گا کہ اگر کسی جینی مرد یا عورت کی لاش نہ ملے تو اُس کی آتما کی شانتی کے لئے فلاں فلاں منتروں کا جاپ کیا جائے تو اُس کی آتما کو شانتی مل سکتی ہے۔''

سرسوتی کچھ سوچ رہی تھی۔ چند لمحوں تک وہ آنکھیں بند کئے خاموش رہی، پھر آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھا اور بولی۔

''میرے پاس جینی دھرم پر سنسکرت زبان میں لکھی ہوئی ایک پرانی پُستک (کتاب) ہے۔ اس میں جین مت کے ماننے والوں کے انتم سنسکاروں (آخری رسومات) کے بارے میں بھی لکھا ہوا ہے۔ اسے پڑھ کر ہی میں تمہیں کچھ بتا سکوں گی۔ ہو سکتا ہے اس میں لکھا ہو کہ اگر کسی حادثے میں کوئی جینی جوتوں سمیت آگ میں جل کر مر جائے تو اُس کی آتما کی شانتی کے لئے کیا اُپائے کرنا چاہئے۔''

سرسوتی نے بڑے پتے کی بات کی تھی۔ جین مت کی کتاب میں کوئی نہ کوئی اُپائے ضرور دیا ہوا ہو گا۔ کیونکہ زندگی میں آگ لگنے کے واقعات ہوتے ہی رہتے ہیں اور اس آگ میں جین مت کے ماننے والے جوتوں سمیت بھی جل کر مر سکتے ہیں۔ اگر اتفاق سے کسی عمارت میں آگ لگ جاتی ہے جہاں جین مت کے ماننے والے جمع ہوں تو وہ آگ سے جان بچانے کے لئے بھاگ دوڑ کریں گے یا اس وقت جوتے اُتارنے شروع کر دیں گے کہ ہم جوتے اُتار کر مریں۔ یہ ایک قدرتی بات ہے کہ آگ لگنے کی

صورت میں آدمی اپنی جان بچانے کو بھاگتا ہے۔ اُسے اپنے جوتوں کی اتنی فکر نہیں ہو
جتنی اپنی جان کی فکر ہوتی ہے۔''

میں نے سرسوتی سے کہا۔ ''تم ابھی وہ کتاب نکال کر کیوں نہیں دیکھ لیتیں؟''

وہ کہنے لگی۔ ''یہ دھرم کی کتابیں ہیں۔ بعض کتابیں ہر وقت نکال کر پڑھی جا
ہیں۔ لیکن بعض کتابوں کو پڑھنے کے لئے خاص وقت مقرر ہوتا ہے اور اس کے لـ
خاص رسم ادا کرنی پڑتی ہے۔ جین مت کی جس کتاب کا میں نے ذکر کیا ہے اس کے
لئے مجھے سورج نکلنے سے پہلے اُٹھ کر اشنان کرنا ہوگا، پھر ایک خاص اشلوک کا جا
کرنے کے بعد اسے پڑھوں گی۔''

ہندو برہمنوں نے اپنی دُکانداری چلانے اور دھرم پر اپنی اجارہ داری قائم رکھنے کے
لئے کیا کیا ڈرامے نہیں رچائے ہوئے تھے۔ میں نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم آج صبح اس کتاب کو ضرور پڑھو۔ شاید اس
سے اُرملا کی آتما کی شانتی کا کوئی طریقہ، کوئی منتر نکل آئے۔''

''میں آج ہی سورج نکلنے سے پہلے یہ کام کروں گی۔ تم مجھے کوئی کام کہو اور میں
کروں، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟'' سرسوتی نے یہ جملہ بڑے خاص شیریں لہجے میں میر
طرف دُزدیدہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ مگر میں نے اسے زیادہ اہمیت نہ د
اس وقت میرے دل و دماغ پر صرف یہی ایک دُھن سوار تھی کہ کسی نہ کسی طرح اُرملا
رُوح کو شانتی مل جائے۔ مجھے ہر لحظہ یہی محسوس ہو رہا تھا کہ اُرملا کی موت اور اُس
رُوح کے اس عذاب کا میں ہی ذمہ دار ہوں۔ اگر میں اسے شِو مندر سے نکال کر نہ لا
تو شاید وہ اس المیے سے دوچار ہونے سے بچ جاتی۔

میں اُٹھ کر آنے لگا تو سرسوتی بولی۔ ''اس کام میں ہو سکتا ہے کچھ دن لگ جائیں
کیونکہ ممکن ہے اُرملا کی آتما کی شانتی کے لئے پُستک میں کوئی ایسا اُپائے لکھا ہوا ہو جس
کے لئے کوئی خاص رسم ادا کرنی پڑ جائے۔''

میں نے کہا۔ ''کوئی بات نہیں۔ میں فادر فرانسس کے ہاں ٹھہروں گا۔''

وہ کہنے لگی۔ ''تمہیں فادر فرانسس کو زحمت دینے کی کیا ضرورت ہے؟ میری اتنی بڑ
حویلی پڑی ہے۔ تم یہاں کیوں نہیں ٹھہر جاتے؟''

مجھے سرسوتی کی یہ تجویز بڑی معقول لگی۔ کیونکہ فادر فرانسس راتوں کو اکثر عبادت کیا
کرتے تھے اور اُن کی عبادات میں مخل ہونا مجھے اچھا نہیں لگتا تھا۔ میں نے سرسوتی سے
کہا۔ ''جیسے تمہاری مرضی۔''

وہ بولی۔ ''میں تمہارے کپڑے وغیرہ فادر کی خانقاہ سے ابھی منگوائے لیتی ہوں۔
تالاب کی جانب والا کمرہ حویلی میں خالی پڑا رہتا ہے۔ تمہیں وہاں کوئی تکلیف نہیں ہو
گی۔''

میں نے کہا۔ ''میرے پاس سوائے ان تین کپڑوں کے جو میں نے پہنے ہوئے ہیں
اور کوئی کپڑا نہیں ہے۔''

وہ کہنے لگی۔ ''میں تمہارے لئے شہر آدمی بھیج کر ریڈی میڈ کپڑے منگوا لوں گی۔
تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔''

میں نے فادر فرانسس کو جا کر بتا دیا کہ میں سرسوتی کے ہاں ٹھہروں گا اور اُس نے
مجھے اُرملا کی شانتی کے لئے یہ باتیں بتائی ہیں۔ فادر فرانسس نے سینے پر صلیب کا نشان
بنایا اور بولے۔

''خداوند اُرملا کی رُوح کو سکون عطا فرمائے۔ سرسوتی ٹھیک کہہ رہی ہے۔ ہندو دھرم
کے ان فرقوں کی بڑی عجیب عجیب رسمیں اور عقیدے ہوتے ہیں۔ اور ان کے ماننے
والے ان باتوں پر پورا یقین رکھتے ہیں۔ اس لئے سرسوتی جیسے کہتی ہے تمہیں ویسے ہی
کرنا چاہئے۔''

میں نے رات کا کھانا فادر فرانسس کے ساتھ کھایا اور اس کے بعد سرسوتی کی پرانی
جنگل والی حویلی میں آ گیا۔ اس حویلی کے بارے میں پچھلے صفحوں پر تفصیل سے لکھ چکا
ہوں کہ یہ سرسوتی کے آباؤ اجداد کی خاندانی حویلی تھی جو گردشِ زمانہ کے ساتھ ویران ہو
چکی تھی۔ اور سرسوتی چونکہ ایک دیوداسی قسم کی کرشن دیوتا کی پجارن تھی اور اُس نے کرشن
بھگوان سے اپنی محبت کی وجہ سے شادی بھی نہیں کی تھی اس لئے وہ مہینے میں دس دن اگر
اپنے شہر والی حویلی میں گزارتی تھی تو بیس دن اس جنگل والی ویران حویلی میں گزارتی
تھی۔ فادر فرانسس کے قریب ہونے کی وجہ سے اُسے ہر طرح کا آرام تھا۔ ایک بوڑھا
ملازم اُس کے لئے کھانا وغیرہ پکا دیتا تھا اور شہر سے اس کی ضرورت کی چیزیں لے آتا

تھا۔ سرسوتی کا خاندان بڑا خوشحال تھا۔ اُن کی تھوڑی بہت زمینداری بھی تھی اور مکانوں کا کرایہ بھی آ جاتا تھا۔ سرسوتی نے بنگلور یونیورسٹی سے سنسکرت میں اعلیٰ ڈگری حاصل کر رکھی تھی اور ہندی ادب اور ہندو دیو مالا کے علاوہ اُسے انگریزی ادب اور انگریزی زبان پر بھی کافی عبور حاصل تھا۔ جیسا کہ میں نے اکثر تذکرہ کیا ہے، ہندوستان کے جنوبی علاقوں میں تعلیم اور خاص طور پر انگریزی تعلیم کا تقسیم ملک سے پہلے بھی بہت چرچا تھا اور تعلیم کا معیار بہت بلند تھا۔ اور مدراس کے بعد کرناٹک میں تو تعلیم کا تناسب اُس زمانے میں بھی نوے پچانوے فیصد تھا۔ آپ شاید اسے مبالغہ سمجھیں لیکن میں حقیقت بیان کر رہا ہوں۔ میں ان علاقوں میں دشت نوردی کرتا رہا ہوں اور میں نے کرناٹک کے دیہات میں بھی کچھ لوگوں کو انگریزی میں باتیں کرتے دیکھا ہے۔ اور پھر آج ڈش اور کیبل میڈیا کے زمانے میں آپ نے خود بھی مشاہدہ کیا ہوگا کہ بمبئی یا مدراس یا بنگلور وغیرہ شہروں میں جب کوئی فلمی رپورٹر کسی رکشے والے یا دُکاندار سے کسی فلم کے بارے میں ریویو حاصل کرنے کے لئے کوئی سوال کرتا ہے تو وہ لوگ اکثر انگریزی زبان میں ہی جواب دیتے ہیں۔ میں آپ کو 1942ء کے زمانے کی اپنی بات بتاتا ہوں۔ سری لنکا جاتے ہوئے جب میں مدراس کے سٹیشن پر اُترا تو مجھے مدراس کے آگے سری لنکا یعنی سیلون جانے کے لئے دھنش کوڑی تک جانے والی ٹرین پکڑنی تھی اور وہاں سے بحری جہاز میں سوار ہو کر سری لنکا کے ساحل پر پہنچنا تھا۔ میں نے نیا نیا میٹرک پاس کیا تھا میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ دھنش کوڑی کی طرف جانے والی گاڑی مجھے کس پلیٹ فارم پر ملے گی؟ ایک دُبلا پتلا لڑکا میرے قریب سے گزرا۔ شکل صورت سے وہ پلیٹ فارم پر چائے بیچنے والا لڑکا لگتا تھا۔ میں نے اُردو میں پوچھا کہ دھنش کوڑی کی گاڑی کون سے پلیٹ فارم سے چلتی ہے۔ وہ رُک گیا اور اُس نے انگریزی میں مجھے بتایا کہ یہ گاڑی فلاں نمبر سے روانہ ہوتی ہے۔ پھر وہ انگریزی میں ہی مجھ سے باتیں کرنے لگا۔ ہم وہیں پلیٹ فارم کے بنچ پر بیٹھ گئے۔ وہ میرا دوست بن گیا اور سیلون جا کر بھی ہم ایک دوسرے کو خط لکھتے رہے اور یہ سلسلہ قیامِ پاکستان تک جاری رہا تھا۔

بہرحال بات میں سرسوتی کی کر رہا تھا کہ سنسکرت کے علاوہ اُسے انگریزی زبان پر بھی مکمل عبور حاصل تھا۔ اس وجہ سے مجھے سرسوتی پر یقین تھا کہ وہ سنسکرت میں لکھی گئی

جین مت کی پرانی کتاب میں سے اس مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل ضرور ڈھونڈ نکالے گی۔ رات کو ہم نے حویلی کی پرانی بالکونی میں بیٹھ کر چائے پی اور کچھ دیر باتیں کرتے رہے۔ اس کے بعد سرسوتی بولی۔

''اب تم بھی جا کر آرام کرو۔ مجھے بھی صبح صبح اُٹھ کر جینی پُستک میں سے کوئی اُپائے تلاش کرنا ہے۔''

میں اُٹھ کر حویلی کے اُس کمرے میں آ گیا جس کی کھڑکی حویلی کے تالاب والی بغیچی کی طرف کھلتی تھی۔ مختصر سا کمرہ تھا۔ اس میں ملازم نے لیمپ پہلے سے جلا دیا ہوا تھا۔ کھلی کھڑکی میں سے جنگل کی طرف سے تازہ ہوا آ رہی تھی۔ میں چارپائی پر لیٹ گیا۔ دیر تک اُرملا کو یاد کرتا رہا۔ اُس کے ساتھ بسر کیا ہوا سارا زمانہ، اُس زمانے کی ایک ایک تصویر آنکھوں کے سامنے سے گزر رہی تھی۔ آنکھیں بار بار آبدیدہ ہو رہی تھیں۔ اس کے بعد رات کے نہ جانے کس لمحے نیند نے مجھے اپنی آغوش میں لے لیا۔

صبح اُٹھا تو کافی دن نکل آیا تھا۔ بوڑھا ملازم میرے لئے چائے ناشتہ لے کر آ گیا۔ معلوم ہوا کہ سرسوتی ابھی سو رہی ہے۔ میں نے اکیلے ہی ناشتہ کیا اور سرسوتی کے بیدار ہونے کا انتظار کرتا رہا۔ یہی سوچ پریشان کر رہی تھی کہ سرسوتی نے سنسکرت کی کتاب میں سے اُرملا کی شانتی کا کوئی راستہ نکال لیا ہوگا یا نہیں؟ کافی دیر بعد ملازم نے آ کر اطلاع دی کہ سرسوتی جی تھوڑی دیر میں آ رہی ہیں۔

میں اپنے کمرے میں ہی بیٹھا رہا۔ پھر نوکر مجھے بلا کر لے گیا۔ سرسوتی اپنے کمرے میں ہلکے سرمئی رنگ کی ساڑھی پہنے بیٹھی تھی۔ اُس نے کوئی پرفیوم بھی لگا رکھی تھی جس کی خوشبو کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ بالوں میں بڑے سلیقے سے کنگھی کر کے انہیں شانوں پر کھلا چھوڑ رکھا تھا۔ ماتھے پر سرخ بندیا چمک رہی تھی۔ میں اُس کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ میں اُس سے کچھ پوچھتے ہوئے جھجک رہا تھا کہ کہیں یہ نہ کہہ دے کہ سنسکرت کی کتاب میں سے کوئی حل نہیں نکل سکا۔ وہ خود ہی بول پڑی۔ کہنے لگی۔

''میں آدھی رات کو ہی اشنان کر کے پُستک لے کر بیٹھ گئی تھی۔ ساری کتاب دیکھنی تھی۔'' وہ چپ ہو گئی۔ مجھ سے اُس کی خاموشی برداشت نہ ہو سکی۔ میں نے پوچھا۔

''پھر کوئی حل نکلا؟''

کہنے لگی۔ ''ہندو دھرم کے نیم (اصول) اور خاص طور پر انتم سنسکاروں کے نیم
بڑے سخت ہوتے ہیں۔ ان میں ذرا سی بھی لچک کی گنجائش نہیں ہوتی۔ جین مت کا دھرم
بھی ہندو دھرم کا ہی ایک حصہ ہے۔ جین مت کے سنسکار بھی بڑے بے لچک ہوتے
ہیں۔ مجھے ڈر تھا کہ اس پرانی پُستک میں بھی کوئی حل، کوئی اُپائے نہیں لکھا ہوگا۔ لیکن
اُرملا بڑی خوش قسمت تھی۔ کتاب میں ایک اُپائے درج تھا۔''

میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ ''وہ کیا اُپائے ہے؟'' میں نے پوچھا۔

سرسوتی کہنے لگی۔ ''کتاب میں لکھا ہے کہ جین مت کو ماننے والی جو عورت سمندر
دریا میں ڈوب کر مر جائے اور اُس کے انتم سنسکار اور کریا کرم کے لئے جوتی کے
اُس کے جسم کا کوئی کپڑا لتا، اُس کے سر کے بالوں کا کوئی گچھا یا اُس کے جسم کا کوئی عضو
نہ مل سکے تو اُس عورت کے خاوند کا فرض ہے کہ وہ گلابی رنگ کا کوئی چولا پہن کر سات
دن تک پاوا شہر کے بڑے مہاویر مندر میں بیٹھ کر گیان دھیان کرے۔ آٹھویں روز
پہنا ہوا چولا اُتار کر جین مت کے بڑے پجاری کے حوالے کر دے جو اس چولے کو اُس
طرح آگ میں جلا کر اس کا کریا کرم کرے گا جس طرح ڈوبی ہوئی عورت کے کسی اپنے
کپڑے کا کریا کرم کیا جاتا ہے جو ڈوبنے کے بعد دریا میں سے ملا ہو۔''

میں پہلے سے زیادہ پریشان ہوگیا۔ میں نے سرسوتی سے کہا۔ ''اس کا مطلب تو یہ ہوا
کہ اُرملا کی آتما کو کبھی شانتی نصیب نہیں ہو سکے گی۔ کیونکہ اُس کا تو کوئی خاوند ہی نہیں
تھا۔ اُس کی ابھی شادی ہی نہیں ہوئی تھی۔''

سرسوتی نے کہا۔ ''اس مشکل کا حل بھی کتاب میں آگے چل کر لکھ دیا گیا ہے۔''

''وہ کیا ہے؟''

کہنے لگی۔ ''اس کا حل یہ درج ہے کہ اگر ڈوب کر مری ہوئی یہ عورت شادی شدہ نہ
ہو تو کسی ایسے آدمی کو تلاش کیا جائے جو اُس عورت سے محبت کرتا ہو یا جس آدمی کے
ساتھ اُس عورت کی منگنی ہوئی ہو۔ اُس مرد پر لازم ہو جاتا ہے کہ وہ کسی ہندو دھرم کی
عورت سے بیاہ کرے اور اُس عورت کے ساتھ تین دن گزارنے کے بعد اس عورت
یعنی اپنی تین دن کی بیاہتا بیوی کی اُتری ہوئی ساڑھی کا جینی پروہت سے کریا کرم
کرائے۔ اس طرح سے ڈوبی ہوئی عورت کی آتما کو جنم جنم کی مکتی مل جائے گی۔''

پہلے تو یہ گورکھ دھندا بالکل میری سمجھ میں نہ آیا۔ جب سرسوتی نے پوری تفصیل کے
بتایا تو میں نے اُس سے کہا۔ ''اُرملا سے تو میں ہی محبت کرتا تھا۔''

سرسوتی بولی۔ ''بس پھر یہ سب کچھ تم ہی کو کرنا ہوگا۔ میں اسے بھی اُرملا کی خوش قسمتی
تی ہوں کہ اس سے محبت کرنے والا ہماری آنکھوں کے سامنے موجود ہے۔ ورنہ ہم
پور جا کر کس کس سے پوچھتے پھرتے کہ یہاں اُرملا سے محبت کرنے والا کون ہے؟
مجھے بھی معلوم ہے کہ اُرملا کی نہ تو کسی سے منگنی ہوئی تھی اور نہ تمہارے سوا اُس کا کوئی
تھا۔''

میں نے مزید حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''میں اُرملا کی شانتی کی خاطر یہ سب
کرنے کو تیار ہوں۔ مگر سوال یہ ہے کہ میں مسلمان ہوں۔ کوئی ہندو عورت مجھ سے
ی کرنے پر راضی نہیں ہوگی۔''

تب سرسوتی نے مجھ پر ایک محبت بھری نگاہ ڈالی اور کہا۔ ''اُرملا کی خاطر اور تمہاری
ر میں یہ قربانی دینے کے لئے تیار ہوں۔ میں تم شادی کروں گی۔''

ایک لمحے کے لئے میں منہ کھولے سرسوتی کو تکتا رہ گیا۔ ایسی بات نہیں تھی کہ میں
شادی کے لئے تیار نہیں تھا۔ اُرملا کی رُوح کے سکون کی خاطر میں بڑی سے بڑی
نی دینے کے لئے تیار تھا۔ لیکن سرسوتی کے ساتھ شادی کرنا مجھے عجیب سا لگتا تھا۔ یہ
بھی اپنی جگہ پر بڑی اہم تھی کہ میں کسی ایسی ہندو عورت کو کہاں تلاش کرتا پھرتا جو مجھ
شادی کرنے پر راضی ہو جاتی۔ کوئی بھی ہندو عورت کسی مسلمان سے شادی کرنے پر
نہیں ہوتی۔ ہاں محبت ہو جائے تو وہ الگ بات ہے اور محبت تو صرف ایک ہی ہندو
ت نے مجھ سے کی تھی اور وہ اُرملا تھی۔ اچانک میرے ذہن میں ایک خیال آ گیا۔
انے سرسوتی سے کہا۔

''ایک بات میں تمہیں بتانی بھول گیا ہوں۔ بات یہ ہے کہ ہم دونوں نے ایک
رے کو بطور میاں بیوی کے قبول کر لیا ہوا تھا اور اُرملا اسلام قبول کرنے پر بھی تیار تھی۔''

سرسوتی نے جواب میں کہا۔ ''مگر تم دونوں کی باقاعدہ شادی تو نہیں ہوئی تھی ناں...
دونوں کے درمیان میاں بیوی والے تعلقات قائم نہیں ہوئے تھے۔ جبکہ شاستر میں
ف طور پر لکھا ہے کہ اُس مرد کا جو ڈوب کر مرنے والی عورت کا پریمی یا منگیتر ہو کسی

ہندو عورت سے بیاہ کر کے اُس کے ساتھ میاں بیوی والے تعلقات قائم کرنا ضروری
ہے۔ اگر ایسا نہیں ہوگا تو ڈوبنے والی عورت کی آتما کو مکتی نہیں ملے گی۔''

اب میرے سامنے دوسرا کوئی راستہ نہیں تھا سوائے اس کے کہ میں سرسوتی سے بیاہ
کرلوں۔ سرسوتی نے کہا۔

''میں بھی یہ سب کچھ اپنی سہیلی اُرملا کی آتما کی شانتی کی خاطر کر رہی ہوں۔ ورنہ
میں کسی مسلمان سے شادی کرنے پر کبھی راضی نہ ہوتی۔ اس لئے میں تمہارے سامنے
ایک شرط رکھ رہی ہوں۔ شرط یہ ہے کہ اس بیاہ کی خبر سوائے تمہارے، میرے اور اُس
پجاری یا پروہت کے جو بیاہ کے تین چار دن بعد میری اُتری ہوئی کسی ساڑھی کا کریا
کرم کرے گا چوتھے کسی شخص کو نہیں ہونی چاہئے۔ اگر تمہیں یہ شرط منظور ہے تو میں تم سے
شادی کرلوں گی۔ اگر تم سمجھتے ہو کہ تم اس شادی کی رازداری نہیں کرسکو گے تو مجھے ابھی
بتادو۔''

میں نے کہا۔ ''سرسوتی! تم خود سوچو کہ جب ہماری شادی ہو جائے گی اور ہم دونوں
میاں بیوی، پتی پتنی بن جائیں گے تو آخر اس خبر کو کس کس سے چھپاتے پھریں گے اور
کب تک چھپا سکیں گے؟ ایک نہ ایک دن تو سب کو پتہ چل جائے گا۔''

سرسوتی نے ہلکا سا تبسم ہونٹوں پر لاتے ہوئے کہا۔ ''اس کا حل بھی میرے پاس
ہے۔ حل یہ ہے کہ ہماری شادی صرف سات دنوں کے لئے ہوگی۔ اس کے بعد ہم ایک
دوسرے سے الگ ہو جائیں گے۔ اگر یہ شرط تمہیں منظور نہ ہو تو مجھے ابھی بتادو۔ میں
پیچھے ہٹ جاؤں گی اور تم اس کام کے لئے کوئی دوسری ہندو عورت تلاش کر لینا۔''

میں نے فوراً ہامی بھر لی اور کہا۔ ''مجھے تمہاری یہ شرط بھی منظور ہے۔''

اُس وقت میں نے سرسوتی کے چہرے پر ایک ایسی چمک دیکھی جو اس سے پہلے کبھی
نہیں دیکھی تھی۔ مجھے محسوس ہوا کہ جیسے اُس نے کسی بڑے اہم معرکے میں فتح حاصل کی
ہو۔ لیکن اُس وقت میں نے سرسوتی کی اس کیفیت کی طرف زیادہ دھیان نہ دیا۔ میرے
تمام خیالات اور جذبے صرف اور صرف اُرملا کی رُوح کی نجات اور شانتی پر مرکوز تھے۔

سرسوتی کہنے لگی۔ ''تم اُرملا کی محبت میں بہت بڑی قربانی دے رہے ہو۔ حالانکہ
اُرملا اب تمہیں کبھی نہیں مل سکے گی۔ تمہیں پھر بھی اُس کا اس قدر خیال ہے۔ میں

ہارے اس جذبے سے بڑی متاثر ہوئی ہوں۔ اب ایسا ہے کہ میری تمہاری شادی
ک ہفتے کے بعد ہوگی۔ اس دوران مجھے اس شادی پر دیوتاؤں کو راضی کرنے کے لئے
ک خاص تپسیا کرنی پڑے گی۔ یہ تپسیا سات دن تک جاری رہے گی۔ آٹھویں دن ہم
ادی کرلیں گے۔ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں؟''

مجھے کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ میں تو اُرملا کی خاطر اندھے کنویں میں بھی کودنے کو تیار
ا۔ میں نے کہا۔ ''نہیں...... مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ لیکن میں یہ سات دن فادر
انس کی خانقاہ میں گزارنا چاہتا ہوں۔''

''بڑی اچھی بات ہے۔'' سرسوتی نے کہا۔ ''میں خود بھی یہی چاہتی ہوں کہ تنہائی میں
کر میں پورے دھیان سے تپسیا کرسکوں۔''

میں اُسی روز سرسوتی کی ویران حویلی کو چھوڑ کر فادر فرانس کی خانقاہ میں آ گیا۔ میں
نے فادر فرانس کو ان تمام باتوں سے آگاہ کر دیا جو میرے اور سرسوتی کے درمیان ہوئی
یں۔ فادر فرانس نے میرے علاوہ سرسوتی کے جذبۂ ایثار کو بھی بہت سراہا۔ کہنے لگے۔
''تمہاری محبت اپنی جگہ پر مگر سرسوتی بھی اُرملا سے اپنی دوستی کو بڑے خلوص کے
تھ نبھا رہی ہے۔''

پھر اُنہوں نے مجھ سے پوچھا۔ ''یہ شادی کہاں ہوگی؟ سرسوتی نے اس بارے میں
ھ بتایا ہے؟''

میں نے کہا۔ ''اُس نے اس بارے میں کوئی بات نہیں کی۔''

فادر فرانس بولے۔ ''میرا خیال ہے سرسوتی چونکہ اس شادی کو راز میں رکھنا چاہتی
ہے اس لئے وہ شہر سے خفیہ طور پر کوئی پجاری بلا کر اپنی حویلی میں ہی شادی کی رسم ادا
رے گی۔''

سرسوتی کی اس شرط سے میرا بوجھ آدھے سے زیادہ ہلکا ہو گیا تھا کہ یہ شادی صرف
ت دن کے لئے ہوگی اور آٹھویں دن میں آزاد ہو جاؤں گا۔ اور ہم ایک دوسرے
ے الگ ہو جائیں گے۔ لیکن حقیقت میں کیا ہونے والا تھا؟ اس کی مجھے خبر نہیں تھی......!

○○○

سرسوتی نے شادی کی تیاری کے سلسلے میں اپنی پرانی حویلی میں تپسیا شروع کر دی اور میں نے فادر فرانسس کی خانقاہ میں ڈیرہ جما لیا۔ اس دوران ہم دونوں ایک دوسرے سے بالکل الگ رہے۔ نہ اُس نے مجھ سے ملاقات کی اور نہ میں نے اُسے دیکھا۔

ساتویں روز شام کے وقت سرسوتی کا بوڑھا ملازم آیا اور کہنے لگا۔

''دیوی جی نے آپ کو بلایا ہے۔''

میں اسی وقت پرانی حویلی میں پہنچ گیا۔ سرسوتی جوگنوں والا لباس پہنے صوفے پر بیٹھی تھی۔ اُس کے کھلے بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ ماتھے پر لال سرخ بندیا انگارے کی طرح چمک رہی تھی۔ میں اُس کے سامنے بیٹھ گیا۔ اُس کے چہرے پر نامعلوم سا تبسم تھا۔ کہنے لگی۔

''میں نے اپنی تپسیا پوری کر لی ہے اور دیوتاؤں نے مجھے اجازت دے دی ہے کہ میں سات دنوں کے لئے ایک مسلمان نوجوان سے بیاہ کر سکتی ہوں۔''

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ بولی۔ ''کیا تمہیں یہ سن کر خوشی نہیں ہوئی؟''

مجھے مجبوراً کہنا پڑا۔ ''خوشی کیوں نہیں ہوئی؟ میں خوش ہوں کہ دیوتاؤں نے تمہیں اجازت دے دی ہے۔ میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ شادی ایک ہفتے کے لئے ہی ہو۔ کیونکہ اسی میں ہم دونوں کی بھلائی ہے۔''

سرسوتی کے چہرے پر ایک پراسرار سا تبسم جھلکنے لگا۔ بولی۔ ''دیکھیں، کیا ہوتا ہے۔''

اُس کا یہ جملہ بالکل میری سمجھ میں نہ آیا۔ اُس نے بھی فوراً موضوع بدل دیا اور بولی۔ ''شادی کے لئے کل کی رات میں نے رکھی ہے۔ کل کی رات بڑی پوتر اور سنجوگی والی رات ہے۔ کیونکہ شاستروں کے مطابق شِو جی اور پاروتی کی شادی بھی کل کی رات کو ہی ہوئی تھی۔''

مجھے شِو جی اور پاروتی کی شادی سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ مجھے تو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی خونخوار عفریت میرے سامنے منہ کھولے بیٹھا ہے اور میں اپنے آپ اس کی طرف پھسلتا چلا جا رہا ہوں۔ سرسوتی بولی۔

''کل رات کے دس بجے چاند نکلے گا۔ ہم اُسی لمحے شادی کے بندھن میں بندھ جائیں گے۔ تم کل شام کو ہی یہاں آ جانا۔''

دوسرے دن شام کو ہی میں سرسوتی کی آبائی حویلی میں آ گیا۔ ایک کمرے کے وسط میں دو چوکیاں رکھی ہوئی تھیں۔ اُوپر پھولوں کا سہرا لٹک رہا تھا۔ چوکیوں کے آگے تانبے کی ایک تھالی میں پھول رکھے تھے اور لوبان بھی سلگ رہا تھا۔ سرسوتی دُلہنوں کی طرح بنی سنوری ایک طرف صوفے پر بیٹھی تھی۔ میں اُس کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ کہنے لگی۔

''پجاری جی چاند نکلنے سے ذرا پہلے پہنچیں گے۔''

سرسوتی نے اپنے گلے میں سے ایک ہار اُتار کر میرے گلے میں ڈال دیا۔ کہنے لگی۔

''تم اس شادی سے خوش ہو ناں؟''

''ہاں.....'' میں نے اپنے چہرے پر زبردستی کی مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔

تھوڑی دیر بعد فادر فرانسس بھی آ گئے۔ ہم تینوں کے سوا اور کوئی وہاں نہیں تھا۔ ہم نے اُسی کمرے میں بیٹھ کر کھانا کھایا۔ فادر فرانسس نے مجھے اور سرسوتی کو اس شادی کی مبارک دی اور کہنے لگے۔

''اس شادی سے دو مختلف مذہبوں کے ماننے والوں کے درمیان محبت کے جذبات پیدا ہوں گے۔ مجھے اس شادی سے خوشی ہو رہی ہے۔''

ٹھیک دس بجے پجاری شہر سے آ گیا۔ اُسے سرسوتی کا بوڑھا ملازم جا کر لایا تھا۔ اس وقت آسمان کے مشرقی اُفق پر چاند نمودار ہو رہا تھا۔ ہماری شادی ہو گئی۔ فادر فرانسس اور پجاری نے ہم دونوں کو مبارکباد دی۔ مٹھائی کا تھال آ گیا۔ سرسوتی نے ایک لڈو میرے منہ میں ڈالا اور ایک لڈو میں نے سرسوتی کو کھلایا۔ اس کے بعد پجاری اپنی دکھشنا لے کر چلا گیا۔ چائے آ گئی۔ میں، سرسوتی اور فادر فرانسس اکٹھے بیٹھ کر چائے پینے اور باتیں کرنے لگے۔ دس پندرہ منٹ بعد فادر فرانسس بھی اجازت لے کر چلے گئے۔ کمرے میں، میں اور سرسوتی اکیلے رہ گئے۔ اب وہ میری بیوی تھی۔ اُس نے میرا

ہاتھ پکڑ کر مجھے اُٹھایا اور اپنے ساتھ خواب گاہ میں لے گئی۔

میری اور سرسوتی کی شادی ہوگئی۔ ایک دن گزر گیا۔ دو دن گزر گئے۔ پھر ایک ایک کر کے سات دن گزر گئے۔ یہ شادی سات دنوں تک کے لئے تھی۔ آٹھویں دن میں نے سرسوتی سے کہا۔

''سرسوتی! اب میں چاہتا ہوں کہ اُرملا کی آتما کی شانتی کے واسطے وہ رسم بھی ادا کر دُوں جس کی خاطر ہم نے ایک دوسرے سے بیاہ رچایا تھا۔ مجھے اپنی کوئی اُتری ہوئی ساڑھی دے دو تا کہ میں جین دھرم کے مطابق پاوا شہر کے مہاویر کے بڑے مندر میں جا کر اُرملا کی آتما کی شانتی کی آخری رسم بھی پوری کر دُوں۔''

سرسوتی نے بے دِلی سے کہا۔ ''ہاں...... یہ رسم تو پوری کرنی ہی ہے۔ لیکن میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گی۔ میرا ساتھ جانا کوئی ضروری بھی نہیں ہے۔ تم اکیلے ہی وہاں جانا۔ میں تمہیں وہ اشلوک بتا دُوں گی جس کا تم مندر میں کسی بھی جگہ بیٹھ کر تین دن تک صرف ایک ایک گھنٹے کے لئے جاپ کرنا۔ اس کے بعد مندر کے پجاری کو میری ساڑھی دے دینا اور اُسے ساری بات سمجھا دینا۔ وہ سمجھ جائے گا اور خود ہی ساڑھی کو جلا کر اُرملا کے کریا کرم کی رسم پوری کر دے گا۔''

میں نے کہا۔ ''مجھے اس کے بعد گنگا دریا پر جا کر ساڑھی کی راکھ بھی تو دریا میں ڈالنی ہوگی۔''

اُس نے بے نیازی سے جواب دیا۔ ''اس کی اب ضرورت نہیں ہے۔ بڑے جین مندر کے پاس ہی ایک ندی بہتی ہے۔ تم پجاری سے کہہ کر ساڑھی کی راکھ اس ندی میں بہا دینا۔ اُرملا کے انتم سنسکار کی رسم پوری ہو جائے گی اور اُس کی آتما کو شانتی نصیب ہو جائے گی۔''

یہ بات میری سمجھ میں نہ آسکی کہ جس انتم سنسکار کے واسطے سرسوتی شادی سے پہلے اتنا جوش و خروش دکھا رہی تھی اور مجھ پر اتنی کڑی شرطیں عائد کر رہی تھی اب اس سے اتنی لاتعلقی کا اظہار کیوں کرنے لگی ہے؟ مجھے صرف ایک بات کی فکر تھی کہ کوئی رسم رہ نہ جائے۔ تمام رسومات پوری ہوں تا کہ اُرملا کی آتما کو اس کے عقیدے کے مطابق مکتی مل جائے۔ جب میں نے اس سلسلہ میں سرسوتی سے یقین دہانی کرانی چاہی تو وہ بولی۔

''تم کو میری زبان پر اعتبار نہیں ہے؟ اگر نہیں ہے تو بے شک مندر کے پجاری سے پوچھ لینا۔ وہ بھی تمہیں یہی کہے گا جو میں نے کہا ہے۔''

میں نے بات کو بڑھانا مناسب خیال نہ کیا اور پاوا شہر جانے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ سرسوتی نے شہر سے میرے لئے گیروے رنگ کا جوگیوں والا ایک چولا منگوا لیا تھا۔ اُس نے مجھے رقم دی اور کہا۔

''وہاں تم مندر میں ہی تین دن رہنا۔ وہاں تمہارا کوئی خرچ نہیں ہوگا۔ باقی کی رقم تمہارے آنے جانے وغیرہ کے لئے کافی ہے۔''

میں کبھی اُس سے پیسے نہ لیتا۔ مگر مجبور تھا۔ میرے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی اور نادر فرانس سے مانگتے ہوئے مجھے شرم محسوس ہوتی تھی۔ بہر حال میں نے سادھوؤں والا چولا تہہ کر کے تھیلے میں ڈالا اور اپنے سفر پر روانہ ہوگیا۔ کالی گھاٹ کے سٹیشن سے مجھے دِلّی جانے والی گاڑی مل گئی۔ دِلّی سے میں کلکتے جانے والی گاڑی میں سوار ہوگیا۔ پاوا کا شہر کلکتے کے راستے میں آتا تھا۔ یہ صوبہ بہار میں واقع تھا اور جین مت کے بانی مہاویر کا جنم استھان تھا۔ اس جگہ بہت بڑا جین مندر تھا۔ آخر میں اپنی منزل مقصود پر پہنچ گیا۔ مندر میں جاتے ہی میں بڑے پجاری سے ملا اور اُسے ساری بات بیان کر دی۔ جین مت کے پجاریوں کو میں نے ہندو جاتی کے متعصب برہمنوں کے مقابلے میں بہت با اخلاق اور انسانی ہمدردی والا پایا۔

بڑے پجاری نے میری ساری بات بڑی توجہ سے سنی اور کہنے لگا۔

''سرسوتی جی یعنی تمہاری پتنی نے تمہیں بالکل درست مشورہ دیا ہے۔ اور اُس کا مشورہ ہمارے شاستروں کے عین مطابق ہے۔ تمہیں تین دن تک گیان دھیان کرنا ہے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔''

بڑے پجاری نے مجھے مندر کے احاطے میں ایک جگہ بتا دی۔ میں نے گیان دھیان کے لئے شام کا وقت چن لیا اور چولا پہن کر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا اور سرسوتی نے مجھے جو اشلوک پڑھنے کے واسطے دیا تھا وہ مجھے ازبر ہوگیا ہوا تھا، میں نے وہ اشلوک دل ہی دل میں پڑھنا شروع کر دیا۔ میں پوری توجہ اور نیک نیتی سے تین گھنٹے تک اشلوک کی گردان کرتا رہا۔ جب تین گھنٹے گزر گئے تو میں اپنی جگہ سے اُٹھ کر مندر کے احاطے میں

دوسرے شہروں سے آنے والے یاتریوں کے واسطے بنائے گئے مسافر خانے میں آ کر لیٹ گیا۔ میرا ذہن ایک ہی اشلوک کی گردان کرتے کرتے تھک گیا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں اور دیر تک اسی طرح لیٹا رہا۔ اس سے مجھے کافی سکون ملا۔ کھانا میں نے لنگر میں ہی کھا لیا۔ دوسرے دن پھر شام کے وقت گیان دھیان کرنے بیٹھ گیا۔

یہ بڑی مشقت کا کام تھا میرے لئے۔ مگر اُرملا کی خاطر مجھے کرنا پڑ رہا تھا۔ اور میں بڑی محبت اور توجہ سے اس رسم کو نبھاہ رہا تھا۔ اس طرح میں نے تین دن کا گیان دھیان پورا کرلیا۔ تیسرے دن رات کو جب میں فارغ ہوا تو میں نے سرسوتی کی اُتری ہوئی ساڑھی جس کو میں سامنے رکھ کر اشلوک پڑھتا تھا بڑے پجاری کے حوالے کردی۔

وہ کہنے لگا۔ ''صبح سورج کے نکلتے ہی مندر کے پیچھے جو ندی ہے وہاں آ جانا۔ وہاں ساڑھی کا کریا کرم کردیا جائے گا۔''

رات میں نے سوتے جاگتے بسر کی۔ سورج نکلنے سے کافی پہلے میں مندر کے پچھواڑے ندی کے کنارے جا کر بیٹھ گیا۔ کچھ ہی دیر بعد مندر کا بڑا پجاری بھی آ گیا۔ اُس نے مجھ سے ساڑھی لے لی اور ایک جگہ ساڑھی سامنے رکھ کر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا اور منتروں کا جاپ شروع کردیا۔ دیر تک وہ منتر پڑھتا رہا۔ میں اُس کے قریب ہی ایک طرف ہو کر بیٹھا تھا۔

منتروں کا جاپ ختم ہوا تو پجاری نے جیب سے ماچس نکال کر سرسوتی کی ساڑھی کو آگ لگادی۔ جب ساڑھی جل کر راکھ ہوگئی تو پجاری نے منتروں کا جاپ کرتے ہوئے ساڑھی کی راکھ کو سمیٹ کر مجھے کہا۔ ''دونوں ہاتھ آگے کرو۔''

میں نے دونوں ہاتھ آگے کردیئے۔ پجاری نے راکھ میری ہتھیلی پر رکھ دی اور کہا۔ ''اب ندی کے کنارے کھڑے ہو کر اس راکھ کو آہستہ آہستہ ندی کی لہروں پر بکھیر دو۔''

میں ندی کنارے کھڑا ہوگیا۔ پجاری میرے پیچھے کھڑا مسلسل منتروں کا جاپ کرتا رہا اور میں نے آہستہ آہستہ ساری راکھ ندی کی لہروں پر بکھیر دی۔ پجاری نے کہا۔

''وہ ہندو عورت جس کا نام تم نے اُرملا بتایا ہے اور جو دریا میں ڈوب کر مرگئی تھی اس کا انتم سنسکار پورا ہوگیا ہے۔ اب اُس کی آتما کو شانتی مل گئی ہے۔''

میں نے پجاری کا شکریہ ادا کیا اور پوچھا۔ ''پجاری جی! میں کیا دکھشنا پیش کروں؟''

بڑے پجاری نے بڑی شفقت بھری مسکراہٹ سے مجھے دیکھا اور میرے سر پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ''بچہ! یہ آتماؤں کی شانتی اور بھٹکتی آتماؤں کی مکتی کا معاملہ ہے اور تم ایک مسلمان ہو۔ تم نے اپنی مرجانے والی پریمکا کے واسطے بڑا بلیدان دیا ہے۔ ہم تم سے کوئی دکھشنا نہیں لیں گے۔ مہاویر جی کی آتما تمہارے اس بلیدان سے خوش ہوگئی ہوگی۔''

پجاری یہ کہہ کر واپس چلا گیا۔ میرا فرض پورا ہوگیا تھا۔ میں نے اُرملا کو تصور میں لا کر دھیمی آواز میں کہا۔ ''اُرملا! تم نے میری وجہ سے بہت مصیبتیں جھیلی ہیں۔ میں تمہیں کبھی کوئی سکھ نہیں دے سکا اور اب تمہاری آتما کی شانتی کے لئے میں نے جو تمہاری معمولی سی خدمت کی ہے اسے قبول کرلینا اور میری غلطیوں اور دل آزاریوں کو معاف کردینا۔''

میری آنکھیں بھیگ گئیں۔ میں نے آنکھوں میں آئے ہوئے آنسوؤں کو ہاتھ سے پونچھا اور وہاں سے سیدھا ریلوے سٹیشن کی طرف روانہ ہوگیا۔ سٹیشن پر ہی میں نے تھوڑا سا ناشتہ کیا۔ دِلّی جانے والی گاڑی آئی تو اُس میں بیٹھ کر دِلّی پہنچ گیا۔ اس وقت دن ڈھلنا شروع ہو گیا تھا۔ وہاں سے بمبئی جانے والی گاڑی پکڑ کر مجھے راستے میں کالی گھاٹ کے سٹیشن پر اُترنا تھا۔ معلوم ہوا کہ بمبئی جانے والی گاڑی شام کو آئے گی اور کالی گھاٹ آدھی رات کو پہنچتی تھی۔ رات کے وقت کالی گھاٹ سے جنگل میں آگے سفر کرنا خطرناک تھا۔ میں نے رات دِلّی کے سٹیشن پر ہی گزاری۔ دوسرے دن صبح والی گاڑی پکڑ لی۔ اس نے مجھے تیسرے پہر کالی گھاٹ پہنچا دیا۔ وہاں سے میں پیدل ہی سرسوتی کی پرانی حویلی کی جانب چل پڑا۔ سارا راستہ جنگل میں سے ہو کر گزرتا تھا۔ اس جنگل کے نشیب و فراز سے میں کافی آشنا ہو چکا تھا۔ دو گھنٹے کی مسافت کے بعد میں اپنی منزل پر پہنچ گیا۔

سرسوتی اس وقت سو رہی تھی۔ مجھے بڑا تعجب ہوا۔ کیونکہ یہ اُس کے سونے کا وقت نہیں تھا۔ وہ ہمیشہ رات گہری ہو جانے پر سویا کرتی تھی۔ بوڑھے ملازم نے بتایا کہ دیوی جی کے سر میں درد تھا۔ گولی پانی کے ساتھ کھا کر سوگئی ہیں۔ میں نہا دھو کر فادر فرانسس کی خانقاہ میں آ گیا اور انہیں بتایا کہ میں نے سرسوتی کی ہدایت کے مطابق تمام رسومات پوری کردی ہیں۔ وہ بڑے خوش ہوئے۔ کہنے لگے۔

''تم نے بڑا اچھا کیا کہ یہ فرض پورا کر دیا۔ تم نے اپنی محبت کا جو تمہیں اُرملا سے تھی، پورا پورا حق ادا کر دیا ہے۔''

تھوڑی دیر فادر کے پاس ٹھہر کر میں حویلی میں واپس آیا تو سرسوتی جاگ چکی تھی اور بستر پر ہی نیم دراز چائے پی رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر بولی۔

''تم کب آئے؟''

میں نے کہا۔ ''تھوڑی دیر پہلے آیا تھا۔ تم سو رہی تھیں۔ میں فادر فرانسس کے ہاں چلا گیا۔ اب کیسی ہے طبیعت؟''

سرسوتی نے پیالی تپائی پر رکھ دی اور ذرا سا اُٹھ کر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی اور بولی۔ ''سر میں درد تھا۔ اب ٹھیک ہوں۔ تم نے اُرملا کی کریا کرم کر دی تھی؟''

میں نے اُسے اُرملا کے کریا کرم کے بارے میں جین مندر کی ساری رُوداد سنا دی۔ وہ خاموشی سے سنتی رہی۔ بوڑھا ملازم میرے لئے چائے لے کر آ گیا۔ میں خاموشی سے چائے پینے لگا۔ سرسوتی بھی خاموش رہی۔ مجھے ایسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اپنے دل میں بہت کچھ سوچ رہی ہے۔ میں نے تھوڑی سی چائے پی کر پیالی ایک طرف رکھ دی اور سرسوتی سے کہا۔ ''ہماری شادی کو سات دن پورے ہو گئے ہیں۔ میں نے اُرملا کی جانب سے جو مجھ پر فرض تھا وہ بھی ادا کر دیا ہے۔ اب میں سوچ رہا ہوں کہ واپس اپنے ملک پاکستان چلا جاؤں۔''

سرسوتی جس پلنگ پر لیٹی تھی اُس کے بائیں طرف کارنس کے اُوپر ایک گول چمنی والا لیمپ روشن تھا جس کی روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ میرے واپس جانے کا سن کر سرسوتی کے چہرے پر ناگوار سے تاثرات اُبھر آئے تھے۔ گردن ایک طرف ذرا سی جھکا کر اُس نے مجھے تیز نظروں سے دیکھا اور بولی۔

''تم ضرور پاکستان جانا چاہتے ہو؟''

میں نے کہا۔ ''اپنے گھر والوں، بہن بھائیوں سے جدا ہوئے ایک مدت ہو گئی ہے۔ اب ہمارا نیا وطن پاکستان بھی بن چکا ہے۔ اُرملا بھی مجھے چھوڑ کر چلی گئی ہے۔ اب میں یہاں رہ کر کیا کروں گا؟''

سرسوتی نے کہا۔ ''مگر میں تمہاری پتنی، تمہاری بیوی تو یہیں ہوں۔ کیا مجھے بھی چھوڑ

کر چلے جاؤ گے؟''

میں ٹھٹھک سا گیا۔ ایک لمحہ توقف کے بعد کہا۔ ''تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ ہماری شادی صرف سات دنوں کے لئے تھی اور سات دن گزر چکے ہیں۔ تم نے خود کہا تھا کہ سات دن گزر جانے کے بعد ہم دونوں ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں گے۔ اس میں حیرانی کی کون سی بات ہے؟''

وہ بڑے معنی خیز انداز میں مسکرائی اور سر ہلاتے ہوئے بولی۔

''مگر میں نے اب یہ شرط اُٹھا لی ہے اور باقی زندگی تمہارے ساتھ ہی رہنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اگر تم پاکستان جاؤ گے تو میں بھی تمہارے ساتھ ہی جاؤں گی۔''

میں حیرت زدہ ہو کر رہ گیا کہ یہ عورت کیا کہہ رہی ہے۔ میں نے کہا۔

''لیکن سرسوتی! ہمارے معاشرے میں اس قسم کی شادی قبول نہیں کی جائے گی۔ اگر تم میری بیوی بن کر میرے ساتھ پاکستان جانا چاہتی ہو تو تمہیں اپنا ہندو دھرم چھوڑ کر سلام قبول کرنا ہو گا۔''

مجھے ہرگز ہرگز اس جواب کی توقع نہیں تھی جو سرسوتی نے مجھے دیا۔ بڑے آرام سے بولی۔ ''میں تمہاری خاطر ہندو دھرم بھی چھوڑ دُوں گی۔ میں اسلام قبول کر لوں گی۔''

ایک لمحے کے لئے ایسے محسوس ہوا جیسے اچانک کسی نے میرے چاروں طرف اُونچی اُونچی دیواریں کھڑی کر دی ہیں اور میں ان میں بند ہو کر رہ گیا ہوں۔ اب میں اُسے کیا جواب دیتا؟ صرف ایک ہی جواب دے سکتا تھا اور وہی جواب میں نے اُسے دے دیا۔ میں نے صاف صاف لفظوں میں اُسے کہہ دیا۔

''لیکن سرسوتی! میں تمہارے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتا۔ اس لئے میں واپس اپنے وطن پاکستان اکیلا ہی جاؤں گا۔ تمہاری شرط میں نے پوری کر دی ہے۔ اب تمہیں مجھے روکنے کا کوئی حق نہیں۔''

اُس نے ذرا تیز لہجے میں کہا۔ ''اگر تم مجھے چھوڑ کر چلے گئے تو تم پر میرے ان دیوتاؤں کا عذاب پڑے گا جن کی مرضی سے میں نے یہ شادی کی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ میں پہلے بھی تمہارے منحوس دیوتاؤں کا عذاب دیکھ چکا ہوں۔ وہ پہلے بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکے اور اب بھی میرا کچھ

نہیں بگاڑ سکیں گے۔"

وہ بولی۔ "تم میرے پتی دیو ہو۔ کوئی ہندو عورت اپنے پتی دیو سے الگ ہونے کا نہیں سوچ سکتی۔ اگر تم اس طرح نہ مانے تو میں پولیس کو یہ کہہ کر گرفتار کرا دوں گی کہ تم پاکستان کے جاسوس ہو اور ہمارے ملک میں جاسوسی کرتے پھرتے ہو۔"

مجھے غصہ تو بہت آیا۔ مگر یہ وقت زیادہ غصہ کھانے کا نہیں تھا۔ وہ مجھے گرفتار نہ بھی کروا سکتی تو کم از کم مجھ پر پاکستان کے جاسوس ہونے کا الزام لگا کر مجھے ایک ایسی مصیبت میں ضرور پھنسا سکتی تھی جس سے چھٹکارا پانا میرے لئے شاید ناممکن ہو جاتا۔ میں نے سرسوتی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور منافقت سے کام لیتے ہوئے لہجے میں محبت کے جذبات پیدا کر کے کہا۔

"سرسوتی! تم نے یہ دھمکی دے کر اپنے آپ کو میری نظروں میں بہت بلند کر دیا ہے۔ تم نے ثابت کر دیا ہے کہ تم اُرملا سے بھی بڑھ کر مجھے پیار کرتی ہو۔" میں نے اُس کا ہاتھ چوم لیا اور کہا۔ "اگر ایسی بات ہے تو میں تمہیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔ دنیا میں کون عورت مجھ سے اتنا پیار کرے گی؟ میں تمہارے پاس ہی رہوں گا۔ اور اگر کبھی پاکستان جانے کو دل چاہا تو تمہیں اپنے ساتھ لے کر جاؤں گا۔"

کم از کم میرا یہ تجربہ کہ عورت خواہ کتنی ہی تیز اور چالاک کیوں نہ ہو، اس سے محبت کی جھوٹی سچی باتیں کرو تو وہ ضرور اس جال میں پھنس جاتی ہے۔ سرسوتی پر بھی میری ان جھوٹی باتوں نے ایک دم اثر دکھا دیا۔ اُس نے مجھے اپنی بانہوں میں لے لیا اور میرے کندھے پر اپنا سر رکھ کر بولی۔

"شیراز! وعدہ کرو کہ آئندہ کبھی مجھے چھوڑ کر جانے کی باتیں نہیں کرو گے۔ میں تو تم سے جدا ہونے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔ بھگوان نے مجھے تمہارے ساتھ زندگی بسر کرنے کا جو سنہری انعام دیا ہے میں اسے اپنی جان سے لگا کر رکھوں گی۔ ساری زندگی تمہاری سیوا کروں گی۔ لیکن اسکے باوجود اگر تم نے مجھے دھوکہ دیا تو......"

سرسوتی نے میرے کندھے پر سے سر اُٹھا کر میری طرف تیز نگاہوں سے دیکھا اور بولی۔ "تو پھر میں تم سے ایسا انتقام لوں گی کہ تم کانچی کے انتقام کو بھی بھول جاؤ گے۔"

میں ڈر گیا۔ اس وقت سرسوتی مجھے سچ مچ کوئی چڑیل لگ رہی تھی جو خوبصورت عورت

کا روپ بدل کر آ گئی ہو۔ ہندوؤں کے چار ویدوں میں سے تیسرے وید یعنی اتھروید کی وہ بڑی ماہر عورت تھی اور اتھروید میں ہر قسم کے جادو ٹونے کا طریقہ بتایا گیا ہے۔ میں جادو ٹونے سے ڈرتا تو نہیں تھا لیکن یہ عورت شروع ہی سے حاسد تھی۔ اُسے اس بات کا بڑا صدمہ تھا کہ میں اُرملا سے پیار کرتا ہوں اور اسے خاطر میں نہیں لاتا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ وہ اگر مجھ سے بدلہ لینے پر اُتر آئے تو مجھے کانچی سے زیادہ پریشان کر سکتی تھی۔ اس وقت سیاست سے کام لینا ضروری تھا۔ چنانچہ میں نے کہا۔

"میری نیک نیتی پر شک کرو گی تو پھر مجھے بھی غصہ آ جائے گا۔ اور تمہیں خوب معلوم ہے کہ غصے کا میں بھی بڑا زہری ہوں۔ جب تمہیں کہہ دیا ہے کہ میں تمہیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا تو پھر زیادہ باتیں کیوں بناتی ہو؟"

سرسوتی نرم پڑ گئی۔ یہ بات میرے تجربے میں آ چکی تھی اور میں نے نہ صرف اس کا مشاہدہ کیا تھا بلکہ اسے آزما کر دیکھا تھا کہ ہندوستان کے شمال، جنوب اور مشرق و مغرب کے تمام صوبوں کے لوگ پنجابیوں سے بڑا ڈرتے تھے۔ اگر جھگڑا ہو جائے تو پہلے خوب بولتے تھے لیکن جب اُنہیں پتہ چلتا کہ مدمقابل پنجابی ہے تو فوراً نرم پڑ جاتے اور اُن کا لہجہ معذرت خواہانہ ہو جاتا۔ پنجابی سارے ہندوستان میں "ہتھ چھٹ" مشہور تھے۔ سرسوتی نے مجھے جو دھمکی دی تھی اس نے میرا بھی دماغ اُلٹ دیا تھا اور مجھے غصہ آ گیا تھا اور میرا پنجابی پن باہر نکل آیا تھا۔ چنانچہ میں نے اُسے حقیقی معنوں میں ڈانٹ دیا تھا اور ایک دو جملے پنجابی میں بھی بول دیئے تھے جس کی وجہ سے سرسوتی نرم پڑ گئی تھی۔ اگرچہ میں نے دل میں فیصلہ کر لیا ہوا تھا کہ میں سرسوتی کہ چھوڑ کر پاکستان چلا جاؤں گا۔ لیکن جب تک میں پاکستان نہیں چلا جاتا مجھے بڑی حکمت عملی سے کام لینے کی ضرورت تھی۔ سرسوتی اگر جادو ٹونہ نہ بھی کرے اور صرف نزدیکی پولیس سٹیشن جا کر پولیس کو میرے بارے میں صرف اتنا بتا دے کہ میں پاکستان کا جاسوس ہوں تو وہ مجھے بہت بڑی مصیبت میں ڈال سکتی تھی۔ پاکستان اور ہندوستان کی سرحدیں بین الاقوامی سرحدیں بن گئی تھیں۔ دونوں ملکوں کے بارڈروں پر سکیورٹی کا انتظام فوجوں نے سنبھال لیا تھا۔ دونوں ملکوں کے درمیان ویزا سسٹم رائج ہو چکا تھا۔ دونوں ملکوں کے ہائی کمشنر ایک دوسرے کے دارالحکومت میں متعین ہو گئے تھے اور اگر کسی کے پاس ضروری کاغذات نہ

ہوں اور وہ ویزے کے بغیر اس ملک میں داخل ہو گیا ہو تو اُسے گرفتار کر لیا جاتا تھا۔
بھارت ماتا کی تقسیم کا ہندو کو بڑا صدمہ تھا۔ پاکستان بن جانے کے بعد ہندو کی مسلم دشمنی کھل کر سامنے آ گئی تھی۔ اور اگر کوئی پاکستانی بغیر ویزے کے پکڑا جاتا تھا تو ہندو پولیس اور سی آئی ڈی اُس پر اس قدر تشدد کرتی تھی کہ وہ پاکستانی زندہ نہیں بچتا تھا۔ ان حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے میں نے عیاری سے کام لیتے ہوئے سرسوتی کو یقین دلا دیا کہ میں اسے چھوڑ کر پاکستان کبھی نہیں جاؤں گا۔

اس معاملے میں، میں نے بڑی رازداری سے کام لیا تھا اور فادر فرانسس کو بھی نہیں بتایا تھا کہ میں پاکستان جانے کا فیصلہ کر چکا ہوں۔ میرے سامنے صرف ایک ہی مسئلہ تھا کہ انڈیا کا بارڈر کیسے کراس کروں گا؟ کیونکہ میرے پاس ویزہ پاسپورٹ وغیرہ کچھ بھی نہیں تھا اور میں بارڈر پر پکڑا جا سکتا تھا۔ کسی سے مشورہ بھی نہیں لے سکتا تھا۔ سوچ سوچ کر میں نے یہی ایک حل نکالا کہ سیدھا مقبوضہ کشمیر چلا جاؤں گا اور وہاں کے پہاڑی علاقوں میں سے چھپ کر پاکستان جانے کا کوئی راستہ تلاش کر لوں گا۔ یہ بڑا اُلجھا ہوا اور کافی حد تک دُشوار منصوبہ تھا اور اس پر کافی غور و فکر اور پلاننگ کی ضرورت تھی۔ مقبوضہ کشمیر میں بھی انڈیا نے کشمیری مسلمانوں کی واضح اکثریت کی مرضی کے خلاف ریاست جموں و کشمیر میں فوج داخل کر دی تھی اور وہاں ہندو فوج مسلمانوں کی آزادی کو کچلنے کی کوشش میں بڑا ظلم و ستم کر رہی تھی اور ذرا ذرا سی بات پر مسلمانوں کو پکڑ کر ٹارچر کیا جاتا تھا۔ مجھے بہت سوچ سمجھ کر مقبوضہ کشمیر میں داخل ہونا تھا۔

اسی سوچ بچار میں مزید ایک ہفتہ گزر گیا۔

میرے دن فادر فرانسس کی خانقاہ اور راتیں سرسوتی کی حویلی میں گزرتی تھیں۔ میرا ذہن وہاں سے فرار ہونے کے لئے بڑی تیزی سے منصوبہ بندی کرنے میں مصروف تھا۔ دن کے وقت میں کچھ وقت فادر فرانسس کے ساتھ گزارتا اور پھر خانقاہ کے عقب میں جنگل کا جو سرسبز و شاداب علاقہ تھا وہاں چہل قدمی کرنے چلا جاتا۔ میرے دماغ میں ایک ہی حل طلب مسئلہ تھا کہ انڈیا کا بارڈر کہاں سے اور کیسے کراس کیا جائے؟ ذہن کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پایا تھا۔ کبھی خیال آتا کہ مقبوضہ کشمیر میں تو انڈیا نے بھاری تعداد میں فوج اُتار رکھی ہے اور ساری وادی میں اور جموں شہر میں سی آئی ڈی کے آدمی پھر

ہے ہوں گے۔ کیوں نہ پنجاب میں کسی جگہ سے بارڈر کراس کرنے کی کوشش کی ئے۔ کبھی سوچتا گاڑی میں بیٹھ کر بمبئی چلا جاؤں اور وہاں عثمان بھائی سے مل کر کسی ں بردار بحری جہاز میں سوار ہو کر اگر کراچی نہیں پہنچ سکتا تو دُبئی پہنچ جاؤں۔ اور وہاں ے کراچی پاکستان آ جاؤں۔ میں اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ ایک ایسا واقعہ رونما ہوا کہ ں نے مجھے سر سے پاؤں تک ہلا کر رکھ دیا۔ اس روز میں دیر تک فادر فرانسس کی خانقاہ ں بیٹھا اپنی سوچوں میں گم رہا۔ جب شام کا اندھیرا چھانے لگا تو سرسوتی نے ملازم بھیج مجھے بلوانا چاہا تو میں نے اُسے کہلوا بھیجا کہ میں کچھ دیر بعد آ جاؤں گا۔ پتہ نہیں کیوں ا دل کچھ عجیب طرح سے پریشان سا ہو رہا تھا۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے کچھ ہونے والا ہ۔ کیا ہونے والا ہے؟ اس کا مجھے کچھ علم نہیں تھا۔ طبیعت میں بے چینی سی تھی۔ سرسوتی ں پاس جانے کو بالکل جی نہیں مانتا تھا۔ یہاں تک کہ شام کا جھٹپٹا رات کے اندھیروں ں گم ہو گیا۔ میں فادر فرانسس کی خانقاہ سے نکل کر پہلے پیچھے جنگل کے درختوں میں آ ا۔ پیچھے ایک چھوٹا سا تالاب تھا۔ میں وہاں ایک درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ ت میں عجیب بے چینی سی لگی ہوئی تھی۔ رات ہو جانے کی وجہ سے شام کے وقت توں پر چڑیوں کی جو چہکار گونج رہی تھی وہ بھی خاموشی میں ڈوب چکی تھی۔ ہر طرف ے سکوت کی حالت طاری تھی۔ میں اپنے خیالوں میں گم آنکھیں بند کئے بیٹھا تھا۔

اچانک مجھے ایک آہٹ سی سنائی دی۔ میں نے آنکھیں کھول کر اِردگرد اندھیرے ا دیکھا، وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں ایک بار پھر اپنی پریشان سوچوں میں ڈوب گیا۔ وہی ٹ ایک بار پھر سنائی دی۔ میں نے آنکھیں کھول کر سانس ایک لمحے کے لئے روک آواز ایسی تھی جیسے کوئی پتوں پر بڑی احتیاط سے قدم رکھ کر چل رہا ہو۔ مجھے فوراً کسی ا درندے کا خیال آ گیا۔ میں جلدی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ اردگرد دیکھنے لگا۔ آہٹ کی آواز غائب ہو چکی تھی اور وہی سکوت طاری ہو گیا تھا۔ وہاں بیٹھنا مناسب نہیں تھا۔ میں چل کر تالاب کنارے آ کر پتھر کی سیڑھیوں کے ا بنے ہوئے چھوٹے سے گول چبوترے پر آ کر بیٹھ گیا۔ حالات کا تقاضا تھا کہ میں ا سے واپس سرسوتی کے پاس یا فادر فرانسس کی خانقاہ میں چلا جاؤں۔ لیکن نہ جانے ل وہاں سے جانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ میں چبوترے پر چوکڑی مار کر بیٹھا تھا۔

سامنے تالاب کی سطح اندھیرے میں پھیکی اور دُھندلی دکھائی دے رہی تھی۔

مجھے اس طرح بیٹھے چند لمحے ہی گزرے تھے کہ اچانک مجھے ایک اور آواز سنائی دی۔ یہ آواز ایسی تھی جیسے کسی نے کچھ فاصلے پر سے بڑی کمزور سی آواز میں میرا نام لے کر مجھے آواز دی ہو۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ جسم میں خوف و دہشت کی سرد لہر دوڑ گئی۔ اُٹھ کر بھاگنا چاہا مگر ٹانگیں جیسے من من بھاری ہو گئی تھیں۔ مجھے پسینہ آ گیا۔ یہ کسی چڑیل کی آواز ہی ہو سکتی تھی۔ اتنے میں وہی آواز ایک بار پھر سنائی دی۔ اس دفعہ آواز قریب سے آئی تھی اور کسی عورت کی آواز تھی...... اور اُس عورت نے میرا پورا نام لیا تھا۔ آواز میں نقاہت غالب تھی جیسے عورت سینکڑوں میل پیدل چل کر وہاں تک پہنچی ہو۔

مجھے اب پورا پورا یقین ہو گیا کہ یہ چڑیل کے سوا اور کوئی عورت نہیں ہو سکتی۔ میں نے ایک جھٹکے سے اپنے آپ کو اُٹھایا اور چبوترے سے اُتر کر تالاب کے ساتھ ساتھ فادر فرانسس کی خانقاہ کی طرف تیز قدموں سے چلنے لگا۔ ابھی میں دس پندرہ قدم ہی چلا تھا کہ ایک عورت کا ہیولا سا ایک درخت سے نکل کر میرے سامنے آ گیا...... میں جہاں تھا، ایک لمحے کے لئے وہیں پتھر بن گیا۔ عورت کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ اندھیرے میں اُس کی شکل پوری دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ اُس نے ساڑھی پہنی ہوئی تھی۔ میرا حلق خشک ہو گیا...... یہ جنگل کی کوئی بدرُوح یا چڑیل ہی ہو سکتی تھی۔ میں نے دل میں کلمہ پاک کا ورد کیا، میری طاقت واپس آ گئی۔ میں نے بلند آواز میں کہا۔

"کون ہو تم؟"

عورت نے کمزور آواز میں کہا۔ "شیراز......!"

میرا پورا جسم لرز گیا۔ میں نے اُس آواز کو پہچان لیا تھا۔ اتنے میں عورت کا ہیولہ دوڑ کر میری طرف آیا اور میرے قدموں میں آ کر گر گیا۔ اگر میں نے اُس کی آواز نہ پہچانی ہوتی تو شاید میں خوف کے مارے بے ہوش ہو گیا ہوتا۔ لیکن اُس کی آواز نے مجھے شک میں ڈال دیا تھا۔

اس سے پہلے کہ میں وہاں سے بھاگوں یا اس عورت کو اُٹھاؤں، اُس عورت نے کہا۔ "مجھے پہچانا نہیں؟ میں اُرملا ہوں۔"

اُس کی آواز نے مجھے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ یہ اُرملا کی آواز ہے۔ میں سمجھ گیا کہ یہ اُرملا کی رُوح ہے جو مرنے کے بعد بھٹکتی ہوئی مجھ تک پہنچ گئی ہے۔ میں جلدی سے دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ میرا چڑیل والا خوف تو دُور ہو چکا تھا۔ اس کی جگہ اس خوف نے لے لی کہ اُرملا کی آتما بدرُوح کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ اور ہندو عورت کی آتما جب بدرُوح کی شکل اختیار کر لیتی ہے تو پھر وہ اپنے پرائے سبھی کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتی ہے۔ میں نے اپنے خوف پر قابو پاتے ہوئے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔

"اُرملا! میں نے تو تمہارے دھرم کے مطابق تمہاری کریا کرم کر دی تھی۔ تمہارے م سنسکار پورے کر دیئے تھے۔ اس کے بعد بھی تمہاری آتما اس طرح کیوں بھٹک رہی ہے؟"

اُرملا اُٹھ کر کھڑی ہو گئی اور حسرت بھرے لہجے میں بولی۔ "شیراز! تم بھی مجھ سے ڈرنے لگے ہو؟ میں مری نہیں، زندہ ہوں۔"

اُس نے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھایا۔ "مجھے ہاتھ لگا کر دیکھ لو۔ میں زندہ ہوں۔ اگر نیک دل مچھیرا مجھے دریا سے نہ نکالتا تو میں ڈوب چکی ہوتی۔ پھر تم کہہ سکتے تھے کہ میری آتما تم سے ملنے کے لئے آئی ہے۔"

میرا ذہن شک اور یقین کے دائروں میں اُلجھ گیا۔ اُرملا نے آگے بڑھ کر میرا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔ اُس کے ہاتھ ٹھنڈے نہیں تھے۔ ان میں گرم خون گردش کر رہا تھا۔ چڑیلوں اور بدرُوحوں کے ہاتھ برف کی طرح ٹھنڈے ہوتے ہیں۔ مجھے کچھ حوصلہ ہوا۔ میں نے اُس سے کہا۔

"تم سچ مچ اُرملا ہو ناں؟"

اُرملا نے میرے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور اپنا سر میرے سینے پر رکھ کر بچوں کی طرح رونے لگی اور گلوگیر آواز میں بولی۔ "تم نے بھی مجھے نہیں پہچانا؟ پھر مجھے کون پہچانے گا؟ میں کہاں جاؤں گی؟ میں اُرملا ہی ہوں۔ زندہ ہوں، مری نہیں تھی۔ دریا میں بہتے بہتے نیم بے ہوشی کی حالت میں جانے کہاں سے کہاں نکل گئی تھی۔ مجھے کچھ نہیں پتہ کیا ہوا۔ ہوش میں آئی تو ایک بوڑھے مچھیرے کی جھونپڑی میں پڑی تھی۔"

اُرملا نے سسکیوں کے درمیان دریا میں چھلانگ لگانے کے بعد کی ساری کہانی سنا ڈالی۔ میں نے اُسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ اُس کے جسم کی خوشبو نے اس حقیقت کی تصدیق

کر دی کہ وہ اُرملا ہی ہے اور زندہ ہے۔ وہ اُرملا کی بدرُوح نہیں ہے۔ ایک لمحے کے
لئے مجھے کچھ ہوش نہ رہا کہ میں کہاں ہوں؟ میری آنکھیں بند تھیں اور اُرملا میرے سینے
سے لگی ہوئی تھی۔ مجھے ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے میں خود مر کر زندہ ہو گیا ہوں۔ آسمانی
مسرتوں کی ایک جاودانی لہر تھی جس نے مجھے اپنی آغوش میں لے لیا تھا۔ میرے ذہن
کے تمام شکوک و شبہات دُھل گئے تھے۔ ذہن آئینے کی طرح شفاف ہو گیا تھا اور اس
آئینے میں اُرملا کا حسین اور معصوم چہرہ میری طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ میں نے اُرملا کا
ہاتھ چوم لیا اور کہا۔

''تم زندہ ہو، یہ مجھے پورا یقین ہے۔ لیکن قدرت مجھ پر اتنی مہربان بھی ہو سکتی ہے۔
قدرت مجھے اتنی لازوال خوشی بھی عطا کر سکتی ہے اس کا یقین نہیں آ رہا۔''

اُرملا میرے سینے سے الگ ہو گئی۔ ہم وہیں گھاس پر بیٹھ گئے۔ اُرملا نے پوری
تفصیل سے وہ تمام واقعات سنائے جو اُس پر گزر چکے تھے۔ اُس نے بتایا کہ جب سیٹھ
کیشو راؤ کے غنڈے نے اُسے دبوچنا چاہا تو اُس نے گھبرا کر پُل پر سے دریا میں
چھلانگ لگا دی۔ وہ تیرنا جانتی تھی۔ اُس نے سوچا کہ وہ دریا میں آگے جا کر کنارے پر آ
جائے گی اور پھر میرے پاس آ جائے گی۔

''لیکن دریا کی تیز لہروں نے مجھے کنارے کی طرف نہ آنے دیا اور میں تیرتی ہوئی
لہروں کے تیز بہاؤ میں دُور سے دُور ہوتی چلی گئی۔''

میں نے کہا۔ ''تمہیں دریا میں کودتے دیکھ کر تمہارے پیچھے میں نے بھی چھلانگ لگا
دی تھی اور تمہیں آوازیں بھی دی تھیں۔''

اُرملا بولی۔ ''مجھے کچھ نہیں پتہ۔ میں نے تمہیں دریا میں کودتے نہیں دیکھا۔ تمہاری
آواز بھی نہیں سنی تھی۔ میں دیوانہ وار کوشش کر رہی تھی کہ کسی طرح دریا کے کنارے پر
پہنچ جاؤں۔ لیکن ایک تو پانی کا دباؤ بڑا زبردست تھا، دوسرے اُس کا بہاؤ بڑا تیز تھا۔
موجیں مجھے رُکنے نہیں دیتی تھیں۔ پھر ایسا ہوا کہ لہریں مجھے پانی کے اندر کھینچنے لگیں۔
نیچے شاید کوئی بھنور تھا جس میں، میں پھنس گئی تھی۔ میں تیزی سے ہاتھ پاؤں چلا کر اُوپر
آنے کی کوشش کرتی رہی مگر لہریں مجھے واپس نیچے کھینچ لیتی تھیں۔ مجھے ڈر لگا کہ میں
ڈوب رہی ہوں۔ اس کے بعد مجھ پر نیم بے ہوشی سی طاری ہو گئی۔ کبھی دریا کی سطح پر

رتی اور کبھی دریا میں نیچے چلی جاتی۔ بس اس کے بعد مجھے کوئی ہوش نہ رہا......''
اُرملا نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر چوم لیا۔ کہنے لگی۔ ''اگر تمہیں یقین نہیں آ
کہ میں زندہ ہوں تو مجھے بھی یقین نہیں آ رہا کہ میں ایک بار پھر شیراز کے پاس پہنچ
ا ہوں۔''

''پھر تم مچھیرے کی جھونپڑی سے کہاں گئیں؟''

''کہاں جانا تھا؟'' وہ بولی۔ ''میں بالکل ادھ موئی ہو چکی تھی۔ جسم میں جان نہیں
تھی۔ سوڑھے مچھیرے کی بیوی نے میری بڑی تیمارداری کی۔ میں تین دن اُن کے
رہی۔ چوتھے دن جسم میں ذرا سی طاقت بحال ہوئی۔ بار بار تمہاری طرف خیال
تا کہ بھگوان جانے، خدا جانے تم پر پیچھے کیا گزری ہو گی؟ یہی خیال دل کو تڑپا رہا تھا
تم نہتے تھے۔ اُن لوگوں کے پاس پستول تھے۔ کہیں تمہیں کچھ ہو نہ گیا ہو۔''

اُرملا نے ایک بار پھر میرے ہاتھ کو چوم لیا اور آہ بھر کر بولی۔ ''چوتھے دن جب مجھے
ی طرح سے ہوش آیا تو معلوم ہوا کہ میں دریا کے پُل والے علاقے سے بہت دُور
گے آ چکی ہوں۔''

وہ رُک گئی۔ اندھیرے میں اُس نے میرے چہرے پر آہستہ سے ہاتھ پھیرتے
ئے کہا۔ ''تم بھی میرے پیچھے دریا میں کود گئے تھے؟ پھر تم کیسے باہر نکلے؟''

تب میں نے اُسے اپنے سارے واقعات سنا دیئے۔ لیکن ابھی تک اُسے یہ نہیں بتایا
کہ مجھے اُس کی جوتی دریا کنارے جھاڑیوں میں پڑی ہوئی ملی تھی اور میں نے اس کا
یا کرم کرنا چاہا تا کہ اس کی آتما کو شانتی نصیب ہو سکے۔ لیکن سرسوتی نے شاستروں کو
کر کچھ اور ہی بتایا جس کے بعد مجھے سرسوتی سے بیاہ کرنا پڑا اور یہ کہ اب سرسوتی
ی بیوی بن چکی ہے۔ یہ خطرناک انکشاف میں اس حالت میں اُرملا کے آگے نہیں کر
تھا۔ میں نے آخر میں اُسے یہی بتایا کہ میں اُسے دریا کے کنارے دُور تک تلاش
تا چلا گیا۔

''جب تم مجھے کہیں نظر نہ آئیں تو میں یہی سمجھا کہ دریا کی لہریں ہمیشہ کے لئے تمہیں
سے دُور لے گئی ہیں۔ میں دیر تک دریا کنارے بیٹھا تمہاری یاد میں آنسو بہاتا رہا۔
کے بعد کسی نہ کسی طرح فادر فرانسس کی خانقاہ میں آ گیا۔''

اس کے بعد جن حالات سے مجھے گزرنا پڑا تھا اُن کا ایک لفظ بھی میں نے اُرملا کو نہیں بتایا میں نے اُسے بازوؤں سے پکڑ کر آہستہ سے اُٹھاتے ہوئے کہا۔

''خانقاہ میں چلو...... فادر فرانسس کو جب معلوم ہو گا کہ تم زندہ ہو تو وہ بے حد خوش ہوں گے۔''

اُرملا تھکی ہوئی آواز میں بولی۔ ''شیراز! میں کئی روز سے ان جنگلوں میں بھٹکتی پھر رہی تھی۔ مجھے فادر فرانسس کی خانقاہ کا راستہ یاد نہیں آ رہا تھا۔ دن کے وقت جنگل میں تھوڑا سا راستہ طے کرتی اور رات جنگلی درندوں سے جان بچا کر کسی درخت پر چڑھ کر گزار دیتی۔ آخر آج دُور سے مجھے فادر فرانسس کی خانقاہ کا منارہ نظر آ گیا اور میں گرتے پڑتے یہاں تک آ گئی۔ اور پھر تمہیں ایک درخت کے نیچے بیٹھے دیکھا۔ میں نے اندھیرے میں بھی تمہیں پہچان لیا تھا۔ مگر تمہارے قریب جاتے ڈرتی تھی کہ تم تو مجھے مُردہ سمجھ چکے ہو۔ مجھے زندہ دیکھ کر کہیں تم پر سکتہ نہ طاری ہو جائے۔ دو تین بار تمہارے قریب آ کر واپس چلی گئی۔ جب تم اُٹھ کر تالاب کے چبوترے پر چلے آئے تو میں نے تمہارے قریب آنے کی بجائے دُور سے تمہارا نام لے کر تمہیں آواز دی۔ اور پھر......''

میں نے اُرملا کا ماتھا چوم لیا اور کہا۔ ''اور پھر میری رُوٹھی ہوئی خوشیاں مجھے واپس مل گئیں۔ چلو! فادر فرانسس کے پاس چلتے ہیں۔''

اُرملا نے ایک بازو میرے کندھے پر رکھ دیا۔ میں نے اپنا بازو اُس کی کمر میں ڈال دیا اور اُسے سہارا دے کر قدم قدم اپنے ساتھ چلانے لگا۔

فادر کی خانقاہ کے قریب پہنچ کر اُرملا نے سرسوتی کے بارے میں پوچھا۔ میں نے اُسے سرسری طور پر بتایا کہ وہ اپنی حویلی میں ہی ہے۔ کبھی کبھی اُس سے ملاقات ہو جاتی ہے اور اُسے بھی تمہارا سن کر بڑا صدمہ ہوا تھا۔

''آج رات تم فادر کی خانقاہ میں ہی آرام کرنا۔ کل میں اُسے بتاؤں گا کہ تم زندہ سلامت ہو۔ اُسے بھی بڑی خوشی ہو گی۔''

اُرملا میری توقع کے بالکل خلاف کہنے لگی۔ ''اُسے بتاؤ یا نہ بتاؤ، ایک ہی بات ہے۔ میں جانتی ہوں اُسے کوئی خوشی نہیں ہو گی۔''

میں نے متعجب سا ہو کر کہا۔ ''ایسی بات نہیں ہے اُرملا! وہ تمہیں پسند کرتی ہے۔''

حالانکہ ایسی بات نہیں تھی۔ اور میں خود چاہتا تھا کہ اُرملا، سرسوتی سے نہ ملے۔ لیکن ں یہ کریدنا چاہتا تھا کہ اُرملا ایک دم سے اُس کے خلاف کیوں ہو گئی ہے۔ اس کا واب اُس نے یہ کہہ کر دیا۔

''میں مر کر دوبارہ زندہ ہوئی ہوں شیراز! مجھ پر کچھ ایسے بھید کھل گئے ہیں جن کا ندگی میں مجھے بالکل علم نہیں تھا۔ یہ بات بھی مجھے موت کے منہ سے نکل آنے کے بعد علوم ہوئی ہے کہ سرسوتی میری اور تمہاری محبت سے جلتی تھی۔ حسد کرتی تھی۔ میں اُس سے نہیں ملوں گی۔''

اُرملا نے یہ کہہ کر میرا کام آسان کر دیا تھا۔ میں خود بھی نہیں چاہتا تھا کہ سرسوتی کو رملا کے دوبارہ واپس آ جانے کا پتہ چلے۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ایسا کس رح ممکن ہو گا؟ اُرملا نے میرا راستہ صاف کر دیا تھا۔

ہم فادر فرانسس کی خانقاہ میں آ گئے۔ اُرملا کو دیکھ کر فادر کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ میں نے جلدی سے کہا۔ ''فادر! اُرملا دریا میں ڈوبی نہیں تھی۔ دریا کی لہریں سے بہت دُور بہا کر لے گئی تھیں جہاں ایک مچھیرے نے اسے دریا سے نکال کر اس کی یکھ بھال کی اور اب یہ رات کے اندھیرے میں آپ کی خانقاہ کی طرف آ رہی تھی کہ ں نے اسے پہچان لیا۔''

فادر نے سینے پر صلیب کا نشان بنایا اور اُرملا کے ماتھے پر بوسہ دے کر کہا۔ ''خداوند جسے بچانا چاہے اُسے کوئی نہیں مار سکتا۔ میری بچی! تم خوش نصیب ہو کہ تمہیں خداوند نے ئی زندگی عطا کی۔''

اُرملا نے فادر کے ہاتھ کو چوم کر سر جھکا دیا۔ فادر فرانسس نے اُس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اُسے دُعا دی اور کہا۔ ''بیٹی! تم بے حد تھکی ہوئی اور خستہ حالت میں ہو۔ غسل کر کے تازہ دم ہو جاؤ اور لباس بھی بدل لو۔''

اُرملا غسل خانے میں چلی گئی تو فادر فرانسس کہنے لگے۔ ''یہ بڑی حیرت انگیز بات ہوئی ہے۔ لیکن خدا نے ابھی اُرملا کی زندگی لکھی ہوئی تھی۔ تم بڑے خوش قسمت ہو۔ تم نے اُرملا سے ذکر کیا ہے کہ تمہاری سرسوتی سے شادی ہو چکی ہے؟''

میں نے جواب دیا۔ ''فادر! آپ تو جانتے ہی ہیں کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے

محبت کرتے ہیں۔ میں اُرملا کو یہ بتاتے ہوئے ڈرتا ہوں کہ اسے بڑا صدمہ ہوگا۔ میں نے اسے یہ بھی نہیں بتایا کہ اسے مُردہ سمجھ کر میں نے جین مندر میں جا کر سرسوتی کے کہنے کے مطابق سرسوتی کی اُتری ہوئی ساڑھی کو جلا کر اس کا کریا کرم بھی کر دیا تھا۔''

''لیکن میرے بچے! یہ بات تم چھپاؤ گے کیسے؟'' فادر نے کہا۔''اُرملا کی واپسی کا سن کر سرسوتی تو اسے ضرور ملنے آئے گی۔ یا پھر اُرملا خود سرسوتی سے ملنے جا سکتی ہے۔''

میں نے فادر فرانسس کو وہ ساری باتیں بتا دیں جو راستے میں میرے اور اُرملا کے درمیان سرسوتی کے بارے میں ہوئی تھیں۔ میں نے کہا۔

''اُرملا خود سرسوتی سے نہیں ملنا چاہتی۔ وہ کہتی ہے کہ سرسوتی ہماری محبت سے جلتی ہے اور اسے میرے زندہ واپس آ جانے کی کوئی خوشی نہیں ہوگی۔''

فادر کہنے لگے۔''اور اگر سرسوتی کو پتہ چل گیا اور وہ خود اس سے ملنے یہاں آ گئی تو؟''

میں نے کہا۔''ہم اُرملا کی خبر کسی کو نہیں بتائیں گے۔ ہم اسے خانقاہ کی باغیچے والی کوٹھڑی میں ہی ابھی رکھیں گے۔''

''مگر اُسے کب تک وہاں بند رکھو گے؟'' فادر نے پوچھا۔

میں نے کہا۔''میں اب سوچ رہا ہوں کہ مجھے اُرملا کو لے کر یہاں سے چلے جانا چاہئے۔''

فادر بولے۔''لیکن سرسوتی تمہاری پتنی ہے۔ اُسے چھوڑ کر کیسے جاؤ گے؟ وہ بڑی منتقم مزاج عورت ہے۔ جب اسے پتہ چلے گا کہ تم اسے چھوڑ کر اُرملا کے ساتھ بھاگ گئے ہو تو وہ تمہارے خلاف کچھ بھی کر سکتی ہے۔''

مجھے سرسوتی کے الفاظ یاد آ گئے۔ اُس نے کہا تھا۔ شیراز! اگر تم مجھے چھوڑ کر چلے گئے تو میں پولیس کو خبر کر دوں گی کہ تم پاکستان کے جاسوس ہو۔

میں نے فادر سے کہا۔''پھر آپ ہی مشورہ دیں مجھے کیا کرنا چاہئے؟''

میں نے فادر کو یہ بھی کھول کر بتا دیا کہ سرسوتی نے شادی سے پہلے یہ شرط رکھی تھی کہ یہ شادی سات دن کے لئے ہوگی اور سات دن کے بعد ہم ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں گے۔ لیکن اب وہ اس سے پھر گئی ہے اور کسی صورت مجھے چھوڑنے پر تیار نہیں ہے۔ میں نے فادر سے کہا۔

''جب میں نے اُسے کہا کہ میں واپس پاکستان چلا جانا چاہتا ہوں تو اُس نے مجھے دھمکی دی تھی کہ اگر میں نے ایسا کیا تو وہ پولیس میں رپورٹ کر کے مجھے پاکستانی جاسوس ہونے کے الزام میں گرفتار کروا دے گی۔''

فادر فرانسس نے متفکر سا ہو کر سر ہلایا اور بولے۔''میں نے تمہیں کہا تھا نا کہ وہ ایک انتقامی مزاج والی عورت ہے اور وہ ایسا کر سکتی ہے۔ آج کل کے سیاسی حالات ایسے ہیں کہ پاکستانی مجاہدوں نے آدھے کشمیر کو بھارتی قبضے سے آزاد کرا لیا ہے اور وہاں صبح شام فوجی جھڑپیں ہوتی رہتی ہیں اور دونوں ملکوں میں آزاد ہوتے ہی دشمنی شروع ہو گئی ہے۔ پولیس کو ذرا خبر ملی تو وہ اسی وقت تمہیں گرفتار کر لے گی۔ پھر کیا کرو گے؟''

میں نے کہا۔''میں گرفتار ہونے سے پہلے ہی غائب ہو جاؤں گا۔ کشمیر کی طرف نکل جاؤں گا۔''

فادر بولے۔''مگر اُرملا کو کہاں ساتھ لئے پھرتے رہو گے؟''

میں نے جواب دیا۔''اُسے میں جے پور اُس کے آبائی گھر پہنچا دوں گا۔''

فادر نے نفی میں سر ہلایا اور بولے۔''سوچ لو میرے بیٹے! کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔ بھارت کی خفیہ پولیس اس وقت ملک کے چپے چپے میں خبردار ہو چکی ہے۔ اگر راستے میں نہیں تو بارڈر کراس کرتے وقت پکڑے جاؤ گے۔''

''پھر میں کیا کروں فادر؟'' میں نے فادر فرانسس سے کہا۔

اُرملا غسل خانے سے باہر آ رہی تھی۔ فادر نے مجھے آہستہ سے کہا۔''ابھی خاموش رہو۔ سوچ لیں گے۔''

اُرملا نے ایک چادر کو ساڑھی کی طرح اپنے جسم کے گرد باندھ رکھا تھا۔ فادر یہ کہہ کر چلے گئے کہ میں تمہارے لئے کھانا بھجواتا ہوں۔ اُرملا کو میں نے اپنی کنگھی دی۔ وہ بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے تخت پوش پر بچھے ہوئے بستر پر بیٹھ گئی۔ لیمپ روشن تھا۔ اُرملا اس کی روشنی میں مجھے پہلے جیسی تر و تازہ لگ رہی تھی۔ میں نے اُسے بتایا کہ مجھے دریا کنارے اُس کی چپل کا ایک پاؤں ملا تھا۔ پھر میں نے اُسے وہ چپل نکال کر دکھائی۔ وہ ٹھنڈا سانس بھر کر بولی۔

''کاش تمہیں چپل کا دوسرا پیر بھی مل جاتا۔ پتہ نہیں یہ کیسے بہتے بہتے دریا کے

کنارے جا لگی۔"

میں نے کہا۔"میں شہر سے تمہارے لئے نئی چپل منگوالوں گا۔"

وہ بولی۔"تمہیں تکلیف کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ میں چاہتی ہوں بمبئی چلی جاؤں۔ وہاں جا کر میں خود ہی نئی چپل خریدلوں گی۔"

بمبئی کا نام سن کر مجھے حیرت بھی ہوئی اور تشویش بھی۔ میں نے کہا۔"مگر اُرملا! بمبئی میں تو سیٹھ کیشو راؤ کے غنڈے پہلے ہی ہم دونوں کی تلاش میں خونخوار بھیڑیوں کی طرح پہرہ دے رہے ہیں۔ وہاں تمہارا جانا سخت خطرناک ہوگا۔"

وہ بولی۔"بمبئی میں، میں صرف تین دن ہی ٹھہروں گی۔ دوبارہ زندگی ملنے پر میں بمبئی کی کوشل دیوی کے مندر میں پرارتھنا کی ایک رسم پوری کرنا چاہتی ہوں۔ کوشل دیوی ہمارے گورومہاویر جی کی بیٹی تھی جس کا مندر بمبئی میں ہی ہے۔"

"اور اگر ہمیں سیٹھ کے غنڈوں نے پکڑ لیا تو؟" میں نے پوچھا۔

اُرملا بولی۔"اُن کی تم فکر نہ کرو۔ ہم ایسی جگہ جا کر رہیں گے جہاں ہمیں کوئی نہیں دیکھ سکے گا۔"

میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اُرملا کو بمبئی جانے سے کیسے روکوں۔ تھوڑی سی حیرانی مجھے اس بات پر ضرور ہوئی کہ اُرملا نے اسلام کی تعلیمات سے متاثر ہونے کے بعد جب طے کر لیا تھا کہ وہ دین اسلام قبول کر لے گی تو اس کے بعد وہ اپنے جین مت فرقے کے عقیدوں کے بارے میں کبھی اتنی پابند نہیں رہی تھی۔ بلکہ اُس نے پوجا پاٹھ اور اشلوک وغیرہ کا جاپ کرنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ یہ ایک نئی تبدیلی میں اُس میں دیکھ رہا تھا۔ پھر یہ خیال آیا کہ اُرملا آخر ہندو گھرانے میں پیدا ہوئی ہے اور ابھی ابھی وہ موت کے تجربے سے گزر کر آئی ہے۔ ہوسکتا ہے اسی وجہ سے اُسے کچھ پرانی رسموں کو نبھانے کا خیال آگیا ہو۔ میں نے کہا۔

"کیا یہ بہتر نہیں کہ ہم جے پور والی حویلی میں چلے جاتے ہیں۔ وہاں بھی تو ایک جین مندر ہے۔ تم وہاں پرارتھنا کی رسم پوری کرسکتی ہو۔"

وہ بالوں کو اپنے سر کے پیچھے جوڑے کی شکل میں باندھتے ہوئے بولی۔"نہیں یہ رسم پوری کرنے کے واسطے کوشل دیوی کے مندر میں ہی تین دن پرارتھنا کرنا ضروری

ہے۔"

میں خاموش ہو گیا۔ فادر فرانس ہمارے لئے ملازم کے ہاتھوں کھانا لے کر آ گئے۔ کہنے لگے۔"اُرملا کے واپس آنے کی خوشی میں آج میں بھی اس کے ساتھ ہی کھانا کھاؤں گا۔"

اور ہم کھانا کھانے لگے۔ اُرملا خاموش تھی۔ میں بھی خاموشی سے کھانا کھا رہا تھا۔ فادر فرانس نے کچھ دیر تو ہماری خاموشی برداشت کی، پھر بولے۔"بھئی تم ایک دوسرے سے کوئی بات کیوں نہیں کرتے؟ تمہیں تو بہت باتیں کرنی چاہئیں۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔"فادر! اُرملا بہت تھکی ماندی ہے۔ آج رات آرام کر لے گی تو بالکل پہلے جیسی ہنس مکھ ہو جائے گی۔ پھر ہم بہت باتیں کریں گے۔"

کھانے کے بعد اُرملا باغیچے والی کوٹھڑی میں سو گئی۔ میں اُسے سلا کر لیمپ کی بتی بجھا کر کے فادر فرانس کے پاس آ گیا اور اُنہیں کہا کہ مجھے اب سرسوتی کے پاس جانا چاہئے۔ وہ میرا انتظار کر رہی ہوگی۔ فادر بولے۔

"جاؤ...... لیکن محتاط رہنا۔ اُس سے اُرملا کا ذکر بھی نہ کرنا۔"

میں خدا حافظ کہہ کر فادر سے رُخصت ہوا۔

سرسوتی میرا انتظار کر رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی برس پڑی۔"اگر تمہیں اتنی اتنی دیر تک فادر فرانس کی خانقاہ میں رہنا تھا تو مجھ سے شادی کیوں کی تھی؟"

مجھے بڑے تحمل اور بردباری سے کام لینا تھا۔ میں نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔ "فادر فرانس کے پاس ایک شکاری آیا ہوا تھا۔ وہ شکار کی بڑی دلچسپ باتیں کر رہا تھا۔ بس دیر ہو گئی۔ آئندہ جلدی آ جایا کروں گا۔"

رات خیریت سے گزر گئی۔ صبح ہم نے اکٹھے ناشتہ کیا۔ اس کے بعد سرسوتی اپنے دھرم شاستر لے کر بھجن کیرتن میں مصروف ہو گئی۔ میں فادر فرانس کے ہاں آ گیا۔ اُرملا ابھی تک کوٹھڑی میں سو رہی تھی۔ فادر مجھے دیکھ کر میرے پاس آ گئے۔ کہنے لگے۔

"سرسوتی کو اُرملا کا پتہ تو نہیں چلا؟"

میں نے کہا۔"ابھی تک تو اسے پتہ نہیں چلا۔"

فادر فرانس تخت پر بیٹھ گئے۔ کہنے لگے۔"اُرملا یہاں رہے گی تو سرسوتی کو یقینی طور

پر پتہ لگ جائے گا۔ اُرملا کے ہوتے ہوئے ہم اس راز کو زیادہ دیر تک نہیں چھپا سکیں گے۔ بہتر یہی ہوگا کہ تم اُرملا کو لے کر جے پور چلے جاؤ۔ مگر سرسوتی کو یہی بتاؤ کہ تم ایک ضروری کام سے بمبئی جا رہے ہو۔''

میں نے فادر کو بتایا کہ اُرملا جے پور نہیں جانا چاہتی۔ وہ پہلے بمبئی جا کر کسی مندر میں اپنے زندہ بچ جانے کے شکرانے کے طور پر ایک خاص پرارتھنا کی رسم ادا کرنا چاہتی ہے۔ فادر بولے۔

''یہ تو اور بھی اچھا ہے۔ تم دونوں بمبئی چلے جاؤ۔ سرسوتی کو یہی کہہ دو کہ تم ایک ضروری کام سے جا رہے ہو، دو ایک دن میں واپس آ جاؤ گے۔''

ان حالات میں یہی تجویز کارگر نظر آئی۔ میں نے سوچ لیا کہ بمبئی میں پرارتھنا کی رسم پوری کرنے کے بعد میں بمبئی میں عثمان بھائی سے مل کر بذریعہ بحری جہاز بمبئی سے پاکستان جانے کی کوشش کروں گا۔

اتنی دیر میں اُرملا بھی جاگ پڑی تھی۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ وہ کب بمبئی جانا چاہتی ہے؟ اُس نے کہا۔

''میں تو آج ہی جانے کو تیار ہوں۔ مگر تمہارا میرے ساتھ جانا ضروری ہے۔ میں اکیلی نہیں جا سکوں گی۔''

''میں تمہارے ساتھ ہی جاؤں گا'' میں نے اُسے تسلی دی۔ وہ مطمئن ہو گئی۔ میں نے کہا۔ ''کالی گھاٹ سے صبح صبح ایک ٹرین بمبئی کی طرف جاتی ہے۔ آج کی رات گزر جانے دو۔ کل منہ اندھیرے ہم یہاں سے نکل پڑیں گے۔''

اُرملا نے خوش ہو کر میرے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ میں ٹھٹھک سا گیا۔ اس سے پہلے اُرملا نے محبت کے شدید لمحوں میں بھی کبھی اس بے تکلفی سے میرے گلے میں بانہیں نہیں ڈالی تھیں۔ پھر میں نے سوچا کہ یہ عورت تازہ تازہ موت کے منہ سے نکل کر آئی ہے۔ یہ قدرتی بات ہے کہ موت اگر آدمی کے بالکل قریب سے ہو کر گزر جائے تو اسے زندگی سے بڑا پیار ہو جاتا ہے اور ایسا انسان محبت اور خوشی کے ہر لمحے سے لذت اندوز ہونے کی کوشش کرتا ہے۔

میں اور اُرملا خانقاہ کے برآمدے میں بیٹھے بمبئی جانے کے پروگرام پر غور کر رہے

تھے۔ فادر فرانسس اپنی کوٹھڑی میں عبادات میں مصروف تھے کہ اچانک سرسوتی کا بوڑھا ملازم سامنے والے دروازے میں سے گزر کر برآمدے میں آ گیا۔ ایک لمحے کے لئے تو وہ اُرملا کو دیکھ کر وہیں رُک گیا۔ وہ اُرملا کو جانتا تھا۔ پھر اُس نے ایسے ظاہر کیا جیسے اُرملا کی موجودگی کا اُس پر کوئی اثر نہیں ہوا اور مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔

''دیوی جی نے آپ کو یاد کیا ہے۔''

میں اُسے دیکھتے ہی جیسے سکتے میں آ گیا تھا۔ میں نے اُسے کہا کہ میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔ جب وہ چلا گیا تو میں نے اُرملا سے کہا۔ ''بڑا غضب ہوا ہے۔ یہ سرسوتی کو جا کر بتا دے گا کہ تم میرے پاس بیٹھی ہوئی تھیں۔''

اُرملا بولی۔ ''یہ کون تھا؟''

میں نے حیران ہو کر اُس کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''کیا تم نے اُسے نہیں پہچانا؟ وہ سرسوتی کا پرانا خادم ہے۔ تم نے سرسوتی کی حویلی میں اسے ضرور دیکھا ہوگا۔''

اُرملا نے ایک دم جیسے چونک کر کہا۔ ''ہاں ہاں...... یاد آ گیا۔ یہ سرسوتی کا نوکر ہی تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ اب سرسوتی کے آگے یہ راز کھول دینا پڑے گا کہ میں زندہ واپس آ گئی ہوں۔''

''اس میں کوئی حرج بھی نہیں ہے۔''

اُرملا کے نزدیک واقعی اس میں کوئی حرج نہیں تھا۔ لیکن اُسے کیا پتہ تھا کہ میں اور سرسوتی شادی کر چکے ہیں اور ہم دونوں میاں بیوی ہیں۔ میں نے بظاہر بے نیازی سے کہا۔ ''ٹھیک ہے...... اُسے بتا دیں گے۔''

لیکن اندر سے مجھے سخت بے چینی لگ گئی تھی۔ سرسوتی کسی بھی وقت وہاں آ سکتی تھی اور اُرملا کو ضرور یہ بتا دے گی کہ شیراز نے میرے ساتھ شادی کی ہوئی ہے۔ آخر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ سرسوتی کی حویلی فادر کی خانقاہ سے زیادہ دُور نہیں تھی۔ بوڑھے ملازم کو گئے مشکل سے دس پندرہ منٹ ہی گزر رہے ہوں گے کہ سرسوتی خانقاہ میں پہنچ گئی۔ میں اُسے دیکھتے ہی سہم سا گیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ ہم دونوں پر برس پڑے گی۔ اُرملا کو زندہ دیکھ کر وہ خوش ہو ہی نہیں سکتی تھی اور اُسے میرے پاس بیٹھی دیکھ کر سرسوتی کے غصے کا پارہ تو سوڈگری سے بھی اُوپر پہنچ سکتا تھا۔ لیکن مجھے بڑی خوشگوار حیرت ہوئی جب سرسوتی نے

اُرملا کو دیکھتے ہی اُس کی طرف بانہیں پھیلا دیں اور کہا۔

''بھگوان کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تم زندہ ہو۔ شیراز کی زبانی جب مجھے پتہ چلا کہ تم دریا میں ڈوب کر سورگباش ہوگئی ہو تو مجھے زندگی کا سب سے بڑا صدمہ ہوا تھا۔''

اُرملا نے کسی قسم کی گرمجوشی کا اظہار نہ کیا۔ کہنے لگی۔ ''میں تو سورگباش ہو چکی تھی۔ مگر بھگوان نے مجھ پر بڑی کرپا کی اور ایک مچھیرے کو میری مدد کے لئے بھیج دیا۔ اُس نے مجھے ڈوبنے سے بچالیا۔''

سرسوتی میرے پاس صوفے پر آ کر بیٹھ گئی۔ اُرملا سامنے والے صوفے پر بیٹھی تھی۔

سرسوتی کہنے لگی۔ ''میں نے تو تمہارے جین دھرم کے شاستروں کے مطابق تمہارا کریا کرم بھی کرا دیا تھا۔''

''وہ کیسے؟'' اُرملا نے تعجب کے ساتھ پوچھا۔ ''تمہیں میری لاش تو ملی نہیں۔ پھر کریا کرم کیسے ہوگیا؟''

سرسوتی نے اپنی اُتری ہوئی ساڑھی اور جین دھرم کے شاستروں میں جو لکھا تھا، وہ اور میرے صوبہ بہار میں مہاویر کے مندر میں جا کر اُتری ہوئی ساڑھی کو نذر آتش کرنے کا سارا قصہ بیان کر دیا اور یہ بھی بتا دیا کہ اُس نے یعنی سرسوتی نے مجھ سے شادی کر لی ہے۔

میرا خیال تھا کہ یہ خبر اُرملا پر بجلی بن کر گرے گی۔ لیکن مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ اُرملا نے اس خبر پر کسی ردِعمل کا اظہار نہ کیا، بلکہ کہا۔

''تمہیں بدھائی ہو۔ مگر شیراز نے تو مجھے یہ اچھی خبر بتائی ہی نہیں۔''

میں نے جلدی سے کہا۔ ''میں نے سوچا تھا کہ تمہیں سرسوتی کے پاس لے جا کر اچانک یہ خوشی کی خبر سناؤں گا۔''

اُرملا کے چہرے پر سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔ وہ مسکرائی۔ کہنے لگی۔ ''یہ تو اچھی خبر تھی۔ تمہیں پہلے ہی بتا دینی چاہئے تھی۔''

میں نے کھسیانا سا ہو کر کہا۔ ''بس بھول ہوگئی۔''

لیکن میں ذہنی طور ابھی تک عالم حیرت میں تھا کہ اُرملا نے یہ خبر سن کر شدید ردِعمل کا اظہار کیوں نہیں کیا؟ پھر خیال آیا کہ اُرملا کو اس خبر سے زندگی کا سب سے بڑا صدمہ ہوا ہوگا۔ وہ اندر سے ٹوٹ گئی ہوگی۔ لیکن وہ پڑھی لکھی سنجیدہ مزاج عورت ہے۔ وہ اس

ے کو سہہ گئی ہے۔ اور یہ بات بھی تھی کہ سرسوتی اور میری شادی ہو چکی تھی اور اب لا کچھ نہیں کر سکتی تھی۔

دوسری طرف میں اُرملا کے ساتھ سرسوتی کے خوشگوار رویئے پر بھی حیران ہو رہا تھا۔ ب اُرملا نے سرسوتی کو یہ بتایا کہ وہ اپنے زندہ بچ جانے کے بعد شکرانے کے طور پر ئی کے کوشل جین مندر میں مہاویر بھگوان کی پوجا کی خاص رسم ادا کرنے جا رہی ہے شیراز یعنی میں اُس کے ساتھ جاؤں گا تو سرسوتی بولی۔

''مگر اس پوجا کی رسم تو شِوراتری کو ادا کرنی ضروری ہوتی ہے۔ شِوراتری سے پہلے بعد میں رسم ادا کرو گی تو اس کا کوئی اثر نہیں ہوگا اور شِوراتری میں ابھی پورے دس دن تے ہیں۔ جین دھرم کے شاستروں میں یہی لکھا ہے۔ تم خود جین دھرم کے شاستروں کی ہوان ہو۔ تم نے شِوراتری کی رات سے پہلے پوجا کرنے کا فیصلہ کیسے کرلیا؟''

''تم ٹھیک کہتی ہو۔ اصل میں مہاویر بھگوان کا جلدی سے جلدی شکرانہ ادا کرنا چاہتی ی۔ لیکن اب میں دس دن انتظار کرلوں گی۔''

سرسوتی کہنے لگی۔ ''مگر میں تمہیں یہاں نہیں رہنے دوں گی۔ تم میری پیاری سہیلی بھی ہ۔ میری اتنی بڑی حویلی پڑی ہے۔ تم میرے ساتھ حویلی میں رہوگی۔ اور یہ تم نے کیا ار جسم پر لپیٹ رکھی ہے۔ ابھی میرے ساتھ چلو۔ میں تمہیں اپنی نئی ساڑھی خود وں گی۔''

سرسوتی کے ذہن میں کیا سکیم تھی؟ کیا منصوبہ تھا؟ اور وہ یہ ڈرامہ کس لئے کر رہی ؟ اس کی گہرائی تک میرا ذہن نہیں پہنچ سکتا تھا۔ لیکن میں نے یہ دیکھ کر اطمینان کا ں ضرور لیا تھا کہ سرسوتی نے اُرملا کو ہنسی خوشی، خوش آمدید کہا تھا۔ اور جس طوفان کا ڈر تھا وہ خیریت سے گزر گیا تھا۔ دس دن کی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ تو گزر ہی جائیں ۔ اس کے بعد میں اُرملا کو ساتھ لے کر پہلے بمبئی جاؤں گا اور اس کے بعد اگر اس کہا تو جے پور چلے جائیں گے۔ ورنہ بمبئی میں عثمان بھائی کی مدد سے میں اُرملا کو ھ ہی لے کر پاکستان چلا جاؤں گا اور پاکستان جا کر ہم شادی کر لیں گے۔ مجھے پورا ن تھا کہ اُرملا بڑی خوشی سے میرے ساتھ پاکستان جانے پر رضامند ہو جائے گی۔ جن حالات میں سرسوتی سے مجھے شادی کرنی پڑی تھی اس کے بارے میں خود

سرسوتی نے اُسے بتا دیا تھا کہ اس کی آتما کی شانتی کے لئے یہ شادی ضروری تھی۔

فادر فرانسس کو جب پتہ چلا کہ سب خیر خیریت ہے اور طوفان آتے آتے رہ گیا ہے تو اُنہیں بھی بڑی خوشی ہوئی۔ میں نے اُنہیں بتا دیا تھا کہ جب میں اُرملا کو لے کر بمبئی پرارتھنا کے لئے جاؤں گا تو وہیں سے پاکستان جانے کی کوشش کروں گا۔ اگر کامیاب نہ ہوا تو ہم مقبوضہ کشمیر کی طرف جا کر وہاں سے انڈیا کا بارڈر کراس کر کے کسی نہ کسی طرح پاکستان پہنچ جائیں گے۔ اور یہ کہ پاکستان جاتے ہی میں اُرملا سے شادی کر لوں گا۔ فادر نے ہمارے لئے نیک تمناؤں کا اظہار کیا تھا اور ہمیں دُعا دی تھی۔

اُرملا میرے ساتھ سرسوتی کی حویلی میں آ کر رہنے لگی۔ سرسوتی نے کئی ساڑھیاں اور دوسرے ضروری کپڑے اُرملا کو پہننے کو دیئے۔ سرسوتی نے ایک لمحے کے لئے بھی اُرملا کے ساتھ ایسا رویہ اختیار نہیں کیا تھا کہ جس سے یہ ظاہر ہوتا کہ وہ اُرملا کو کبھی بھی زندہ نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ دوسری طرف اُرملا بھی اُس سے بظاہر مسکرا کر بات کرتی تھی۔ مگر سرسوتی کی منتقم مزاجی اور اُس کی حاسدانہ نفسیات سے میں اچھی طرح واقف ہو چکا تھا۔ میری چھٹی حس مجھے بتا رہی تھی کہ سرسوتی کے ذہن میں کوئی بڑا ہی خطرناک منصوبہ پرورش پا رہا ہے۔ میرے سامنے صرف دس دن تھے جن میں سے ایک دن گزر گیا تھا۔ اب نو دن مجھے اور اُرملا کو کسی نہ کسی طرح سرسوتی کی حویلی میں گزارنے تھے۔ اس کے بعد ہم دونوں کو وہاں سے فرار ہو جانا تھا۔

ایک دن میں اور اُرملا حویلی کے عقبی صحن کے برآمدے میں بیٹھے تھے۔ اُرملا نے میری اُنگلی میں پڑی ہوئی اپنی انگوٹھی کو غور سے دیکھا اور کہنے لگی۔

''اس کا رنگ کیوں سیاہ پڑ گیا ہے؟''

میں نے حیران ہو کر کہا۔ ''تمہیں تو میں نے بتایا تھا کہ کانچی نے ایک بار مجھ پر بڑا کاری وار کیا تھا جس کی زد سے مجھے تمہاری اس انگوٹھی نے بچا تو لیا تھا مگر اس کا رنگ سیاہ پڑ گیا تھا۔''

اُرملا کو جیسے سب کچھ یاد آ گیا ہو۔ کہنے لگی۔ ''ہاں ہاں...... اب مجھے یاد آ گیا ہے۔ اصل میں موت کے اس بھیانک تجربے سے گزرنے کے بعد میری پرانی یادیں کچھ دُھندلا سی گئی ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''کوئی بات نہیں۔ ایسا کچھ دیر کے لئے ہے۔ جیسے جیسے وقت گزرے گا ہماری یادیں بھی نارمل ہو جائیں گی۔''

شام ہوئی تو سرسوتی نے اُرملا سے کہا۔ ''چلو ندی پر جا کر اشنان کرتے ہیں۔ تمہارے جانے کے بعد میں بھی ندی پر اشنان کرنے نہیں گئی۔''

اُرملا نے پہلے تو انکار کیا لیکن میرے کہنے پر وہ راضی ہو گئی۔ وہ دونوں نہانے کے لئے ندی پر چلی گئیں۔ میں نے ملازم سے چائے منگوائی اور برآمدے میں آرام کرسی پر بیٹھ کر چائے پینے اور مستقبل کے منصوبے پر غور و فکر کرنے لگا۔ مجھے سب سے زیادہ اُمید بمبئی کے موالی عثمان بھائی سے تھی۔ وہ بمبئی کی انڈر گراؤنڈ دنیا سے پوری طرح واقف تھا اور بمبئی کے بڑے بڑے جرائم پیشہ لوگ اُس کے دوست تھے۔ مجھے یقین تھا کہ وہ اُن کی مدد سے کوئی نہ کوئی ایسا راستہ نکال لے گا کہ میں اور اُرملا خفیہ طور پر کسی مال بردار جہاز میں سوار ہو کر پاکستان پہنچ جائیں۔ کوئی ایک گھنٹے کے بعد سرسوتی اور اُرملا ندی سے نہا کر واپس آ گئیں۔ اُرملا کپڑے بدلنے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ سرسوتی میرے پاس آئی اور کہنے لگی۔

''ذرا میرے ساتھ آنا۔''

میں ڈر گیا کہ ضرور کوئی بم پھٹنے والا ہے۔ وہ مجھے بیڈ رُوم میں لے گئی۔ مجھے اپنے پاس پلنگ پر بٹھایا اور بڑی رازداری سے بولی۔

''تم سے ایک بات کرنی ہے۔ غور سے سننا! تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ میں اور اُرملا آج سے پہلے بھی اس حویلی میں رہا کرتی تھیں۔ ہماری بڑی دوستی تھی اور ہم دونوں اکثر ندی پر اشنان کرنے جایا کرتی تھیں۔''

میرا ذہن طرح طرح کے ناخوشگوار خیالات میں اُلجھ رہا تھا۔ خدا جانے یہ عورت مجھے کیا کہنے والی تھی۔ لیکن اُس کا لہجہ دھیما تھا اور اُس کی شومہ مزاجی کی غمازی نہیں کر رہا تھا۔ اس سے مجھے کچھ حوصلہ ہوا۔ میں نے کہا۔

''ہاں ہاں...... مجھے معلوم ہے۔''

میں اُس سے یہ پوچھتے ہوئے گھبرا رہا تھا کہ بات کیا ہے۔ وہ مجھ سے کیا کہنا چاہتی تھی جس کے واسطے وہ مجھے برآمدے سے اُٹھا کر بڑی رازداری کے ساتھ بیڈ رُوم میں

لے کر آئی ہے۔ وہ کہنے لگی۔

''آج میں نے ایک عجیب بات دیکھی ہے۔''

میں نے بے چینی سے پوچھا۔ ''کون سی بات؟''

سرسوتی نے کہا۔ ''جب بھی ہم دونوں ندی پر نہانے جاتی تھیں تو سارے کپڑے اُتار کر اشنان کرتی تھیں آج بھی ہم کپڑے اُتار کر نہا رہی تھیں کہ میں نے اُرملا سے کہا ٹھہرو میں تمہاری پیٹھ پر صابن ملتی ہوں۔ اُرملا میرے آگے ہو کر ندی میں بیٹھ گئی۔ ندی کا پانی اُس کی کمر سے بھی نیچے تھا۔ جب میں اُس کی پیٹھ پر صابن لگانے لگی تو اچانک میری نظر اُس کی پیٹھ پر بائیں جانب شانے کے نیچے پڑی۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ اُرملا کی پیٹھ پر شانے کے ذرا نیچے چاند گرہن کا ایک گول نشان ہوا کرتا تھا۔ میں یہ دیکھ کر حیران سی ہو کر رہ گئی کہ وہ گرہن کا نشان اب اُرملا کی پیٹھ پر نہیں تھا۔''

میں نے کہا۔ ''ہو سکتا ہے تمہیں غلط فہمی ہوئی ہو۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ نشان وقت کے ساتھ مِٹ گیا ہو۔''

وہ بولی۔ ''مجھے غلط فہمی نہیں ہو سکتی۔ میں نے چاند گرہن کا یہ نشان اُرملا کی پیٹھ پر کئی مرتبہ دیکھا ہے اور گرہن کا نشان وقت کے ساتھ مٹتا نہیں ہے بلکہ عمر کے گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ بھی بڑا ہوتا جاتا ہے۔''

میں اُلجھن میں پڑ گیا۔ میں نے کہا۔ ''تم کیا کہنا چاہتی ہو؟''

وہ بولی۔ ''میں یہی کہنا چاہتی ہوں، بلکہ تم سے پوچھنا چاہتی ہوں کہ وہ نشان کہاں غائب ہو گیا؟ گرہن کا نشان پیدائشی ہوتا ہے۔ آدمی پیدا ہوتے وقت یہ نشان ساتھ لے کر آتا ہے اور مرتے دم تک یہ نشان اُس کے ساتھ رہتا ہے۔ آدمی اگر یہ نشان مٹانا چاہئے تو صرف تیزاب ہی اس نشان کو مٹا سکتا ہے۔ مگر تیزاب سے اس جگہ کی جلد جل کر پہلے سے زیادہ سیاہ ہو جاتی ہے۔ مگر اُرملا کو نشان مٹانے کی کیا ضرورت تھی؟ اور اگر اُس نے اسے مٹا دیا ہے تو پھر وہاں زخم یا جلی ہوئی جلد کا سیاہ نشان ہونا چاہئے تھا جو بالکل نہیں تھا۔ اُرملا کی پیٹھ کی ساری جلد بالکل صاف شفاف تھی۔''

میں نے پھر اپنا سوال دُہرایا۔ ''تم کہنا کیا چاہتی ہو سرسوتی؟''

سرسوتی میری طرف ذرا سا جھک کر بولی۔ ''میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ مجھے لگتا ہے کہ

ورت اُرملا نہیں ہے، کوئی اور ہی عورت ہے جس نے اُرملا کا رُوپ اختیار کیا ہوا ہے۔''

میں ششدر سا ہو کر رہ گیا اور سرسوتی کا منہ تکنے لگا۔ اُس نے ایک ایسی بات کہہ ی تھی جس پر میں کبھی یقین نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے کہا۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اگر یہ اُرملا نہ ہوتی تو سب سے پہلے مجھے علم ہو جاتا۔ کیونکہ میں ں کے بہت قریب رہا ہوں۔ مگر میں نے تو اس میں کوئی ایسی تبدیلی نہیں دیکھی جس ے یہ ظاہر ہو کہ یہ اصلی اُرملا نہیں ہے۔ وہی بال ہیں اُس کے، وہی آواز ہے، وہی ئیں ہیں اُس کی، آنکھیں، ناک، چہرہ، ہونٹ، اُس کا چلنا، اُس کا بولنا اور سب سے ھ کر یہ کہ اُس کے خیالات اور اُس کی یادیں بھی بالکل اصلی اُرملا کی ہیں۔''

''تو پھر اُس کی پیٹھ کا گرہن کا نشان کہاں غائب ہو گیا؟'' سرسوتی نے کہا اور میں وچ کے سمندر میں جیسے اُتر گیا۔

○○○

اچانک مجھے خیال آیا کہ یہ بھی تو ممکن ہے کہ اُرملا کی پیٹھ پر حقیقت میں چاند گرہن کا کوئی نشان پہلے سے موجود ہی نہ ہو۔ اور سرسوتی نے یہ سارا ڈرامہ اپنے کسی خطرناک منصوبے پر عمل کرتے ہوئے مجھے اُرملا سے بدظن کرنے کے لئے رچایا ہو۔ سرسوتی سے اس قسم کی حرکت کی اُمید کی جاسکتی تھی۔ میں نے اُرملا کو کبھی عریاں حالت میں اتنے قریب سے نہیں دیکھا تھا اس لئے یقینی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ میں نے سوچا کہ کیوں نہ خود اُرملا سے اس بارے میں پوچھ لیا جائے کہ اُس کی پیٹھ پر چاند گرہن کا نشان ہوا کرتا تھا یا نہیں؟ پھر خیال آیا کہ پتہ نہیں میرے اس سوال پر اُرملا کیا سوچے؟ وہ یہ بھی سوچ سکتی تھی کہ شاید مجھے اس پر کسی قسم کا شک پڑ گیا ہے۔ لیکن اصل حقیقت معلوم کرنا بھی ضروری تھا تاکہ میرے ذہن میں کوئی شک شبہ باقی نہ رہے۔ چنانچہ میں نے چھپ کر اُرملا کے جسم کا جائزہ لینے کا فیصلہ کرلیا۔

فادر فرانسس کی خانقاہ کا جو واحد غسل خانہ تھا اُرملا اُسی غسل خانے میں روز غسل کرتی تھی۔ میں بھی اسی غسل خانے میں نہاتا تھا۔ یہ چھوٹا سا غسل خانہ تھا جس میں ایک بڑا ٹب پانی سے بھرا رہتا تھا۔ ٹب کے پاس ہی ایک لکڑی کی چوکی پڑی ہوئی تھی۔ غسل خانے میں ایک کھڑکی تھی جو جنگل کی طرف کھلتی تھی جس میں لوہے کی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ دن کے وقت یہ کھڑکی کھلی رکھی جاتی تھی جس سے دن کی روشنی اندر آتی تھی۔ جب کوئی اس غسل خانے میں چوکی پر بیٹھ کر نہاتا تھا تو اُس کی پیٹھ غسل خانے کے دروازے کی طرف ہوتی تھی اور چوکی سے دروازے تک کا فاصلہ پانچ چھ فٹ سے زیادہ نہیں تھا۔ اور دروازے کے کسی سوراخ میں سے نہانے والے کی پیٹھ صاف طور پر دیکھی جاسکتی تھی۔

میں اُٹھ کر غسل خانے کے پاس آیا۔ اُس کے دروازے کو اُوپر سے لے کر نیچے تک

سے دیکھا۔ اس میں کافی تلاش کے بعد میں نے ایک سوراخ تلاش کرلیا۔ اس کے
ہ آنکھ لگائی تو اندر غسل خانے کا منظر پورے کا پورا نظر آرہا تھا۔

اُرملا صبح کے وقت جب دُھوپ نکل آتی تھی تو غسل خانے میں نہانے جاتی تھی۔
رے روز جب وہ نہانے کے لئے غسل خانے کی طرف گئی تو میری نظریں اُس کا
ب کررہی تھیں۔ جب مجھے غسل خانے کا دروازے بند کرکے اندر سے کنڈی لگانے
آواز آئی تو میں دبے پاؤں غسل خانے کے دروازے پر آیا اور سوراخ میں سے
ک کر اندر دیکھا۔ اُرملا ساڑھی اُتار کر اُسے دیوار کے ساتھ کیل پر لٹکا رہی تھی۔ وہ
ں برہنہ تھی۔ پھر وہ دروازے کی طرف پیٹھ کرکے چوکی پر بیٹھ گئی۔ کھڑکی میں سے
ی سفید روشنی اندر آرہی تھی جس میں اُرملا کی گوری پیٹھ گردن سے لے کر نیچے تک
ی نظر آرہی تھی۔ میں نے اُس کی عریاں کمر کو اُوپر سے لے کر نیچے تک دیکھا اور
چاند گرہن کا چھوٹے بتاشے جیسا سیاہی مائل قرمزی دھبہ بالکل واضح طور پر نظر آ
۔ میں نے ایک بار نہیں، دو بار بلکہ بار بار اُس نشان کو دیکھا۔ اُرملا اپنے بالوں کا
اگردن کے پیچھے بنا رہی تھی اور اُس کی کمر بالکل برہنہ تھی اور چاند گرہن کا دھبہ اُس
مر کی بائیں جانب شانے کے نیچے صاف نظر آرہا تھا۔ میں جلدی سے پیچھے ہٹ گیا
وچنے لگا چاند گرہن کا نشان تو اُرملا کی پیٹھ پر موجود ہے۔ پھر سرسوتی نے کیسے کہہ دیا
یہ نشان نہیں ہے؟

یہ معمہ پہلے تو میری سمجھ میں نہ آیا۔ پھر خیال پیدا ہوا کہ ممکن ہے سرسوتی نے مجھے اُرملا
فلاف کرنے کے واسطے یہ جھوٹ گھڑا ہو۔ مگر سوال یہ تھا کہ کیا اُسے معلوم نہیں تھا کہ
اس حیرت انگیز انکشاف کے بعد اُرملا کی کمر کا مشاہدہ کرسکتا ہوں؟ میں نے اس
وع پر سوچنا بند کردیا اور سیدھا سرسوتی کے پاس چلا آیا۔ یہ بتانا میں بھول گیا تھا کہ
رات اُرملا، فادر فرانسس کی خانقاہ میں آئی ہوئی تھی۔ جب میں نے سرسوتی کو بتایا
چاند گرہن کا نشان اُرملا کی پیٹھ پر موجود ہے اور میں نے خود اپنی آنکھوں سے اس کا
ا مشاہدہ کیا ہے تو میری نظریں سرسوتی کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں تاکہ میں اُس
چہرے پر اُبھرنے والے تاثرات کو دیکھ سکوں۔ سرسوتی کے چہرے پر حقیقی معنوں
حیرت کے تاثرات تھے۔ کہنے لگی۔

’’یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ میں نے خود دیکھا ہے کہ اُرملا کی پیٹھ پر کوئی نشان نہیں تھا۔‘‘
میں نے کہا۔ ’’لیکن میں نے وہ نشان واضح طور پر دیکھا ہے۔‘‘
سرسوتی کے چہرے پر سوائے حیرت اور تجسس کے اور کچھ نہیں تھا۔ سر کو دو تین بار ہلاتے ہوئے بڑبڑائی۔ ’’مگر یہ کیسے ہوگیا؟‘‘
پھر کہنے لگی۔ ’’میں آج شام کو ایک بار پھر دیکھوں گی۔ تم ایسا کرنا اُرملا کو لے کر دوپہر کو ہی میری حویلی میں آ جانا۔ دوپہر کے بعد میں اُسے لے کر ندی پر اشنان کرنے جاؤں گی۔‘‘
وہ بار بار سر کو انکار کی صورت میں ہلا رہی تھی اور کہہ رہی تھی۔ ’’ایسا نہیں ہوسکتا۔ میری نگاہ دھوکہ نہیں کھا سکتی۔‘‘
میں نے کہا۔ ’’دوپہر کے بعد پتہ چل جائے گا کہ اصل حقیقت کیا ہے۔ میں خود اس راز کو حل کرنا چاہتا ہوں۔‘‘
دوپہر کو میں پروگرام کے مطابق کسی بہانے اُرملا کو سرسوتی کی حویلی میں لے آیا اور سوچی سمجھی سکیم کے مطابق سرسوتی اصرار کر کے اُرملا کو نہانے کے لئے اپنے ساتھ ندی پر لے گئی۔ جب تک دونوں عورتیں ندی پر رہیں، میں حویلی کے برآمدے میں بے چینی سے ٹہلتا رہا۔ جب دونوں نہا دھو کر واپس آئیں تو میں نے سرسوتی کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ وہ کسی گہری سوچ میں گم تھی۔ اُس وقت تو اُس نے مجھ سے کوئی بات نہ کی۔ جب اُرملا دوسرے کمرے میں چلی گئی تو میرا ہاتھ تھام کر مجھے ایک طرف لے گئی اور بولی۔
’’میں پہلے سے بھی زیادہ حیران ہوئی ہوں شیراز!‘‘
’’کیا اُرملا کی پیٹھ پر چاند گرہن کا نشان تھا؟‘‘
میرے سوال پر اُس نے اثبات میں سر ہلایا اور کہا۔ ’’نشان موجود تھا۔ مگر یہ کیسے ہو گیا؟ میں نے اپنی آنکھوں سے اُرملا کی کمر بالکل صاف دیکھی تھی۔ اور اب دیکھا تو گرہن کا نشان اُس کی کمر پر اپنی جگہ موجود تھا۔‘‘
میں نے کہا۔ ’’ایسی کوئی بات نہیں ہے سرسوتی! انسان کی نگاہ کبھی کبھی دھوکہ کھا جاتی ہے۔‘‘ لیکن سرسوتی کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ پہلے سے زیادہ حیران نظر آ رہی تھی۔
جب شوراتری کو تین دن باقی رہ گئے تو اُرملا نے سرسوتی سے کہا۔

’’اب ہمیں کوشل دیوی کی یاترا اور مہاویر بھگوان کی پرارتھنا کی رسم پوری کرنے چل پڑنا چاہئے۔ کیونکہ بمبئی پہنچتے پہنچتے ایک رات سفر میں گزر جائے گی۔ بمبئی سے بھی آگے جانا ہے۔ اور پرارتھنا کی تیاریاں بھی کرنی ہے۔ اس لئے میں چاہتی ہوں کہ میں شیراز کو لے کر کل صبح بمبئی کے لئے روانہ ہو جاؤں۔‘‘
سرسوتی نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ صرف اتنا کہا۔ ’’جلدی واپس آنے کی کوشش کرنا۔‘‘ پھر ہنس کر بولی۔ ’’مجھ سے اپنے پتی شیراز کی زیادہ دن کی جدائی برداشت نہیں ہوگی۔‘‘
اُرملا بھی اُس کے جواب میں ہنس کر بولی۔ ’’فکر نہ کرو۔ تمہارے پتی دیو کو جیسے میں لے جا رہی ہوں ویسے کا ویسا تمہارے حوالے کروں گی۔‘‘
اُس وقت مجھے خیال آیا کہ اگر سرسوتی کو معلوم ہو جائے کہ میں کبھی واپس نہ آنے کے لئے جا رہا ہوں اور اس کے سارے منصوبے جو اس نے اپنے دماغ میں بنا رکھے ہیں خاک میں ملنے والے ہیں تو وہ میرے راستے میں ایک ایسی دیوار بن کر کھڑی ہو جائے جس کو میں اور اُرملا مل کر بھی نہ گرا سکیں۔ میں دل میں خدا کا شکر ادا کر رہا تھا کہ سرسوتی ایسی منتقم مزاج زہریلی عورت سے مجھے ہمیشہ کے لئے نجات ملنے والی ہے۔
پروگرام کے مطابق ہم اگلے دن صبح صبح کالی گھاٹ کے ریلوے سٹیشن کی طرف چل پڑے۔ ہماری منزل بمبئی تھی۔ بمبئی میں ایک ہی خطرہ تھا کہ اگر سیٹھ کیشو راؤ کے آدمیوں میں سے کسی کی ہم پر نظر پڑ گئی تو ہماری جان ہلاکت میں پڑ سکتی تھی۔ میں نے اُرملا کو اس خطرے سے ایک بار پھر آگاہ کیا تو وہ بولی۔
’’مجھے ان کی پرواہ نہیں ہے۔ وہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔‘‘
اُرملا نے اُن خونخوار غنڈوں کے بارے میں اس قسم کی دلیری کا پہلے کبھی اظہار نہیں کیا تھا۔ وہ ہمیشہ اُن کے ذکر ہی سے سہم جاتی تھی۔ یہ ایک نئی تبدیلی میں اُس میں دیکھ رہا تھا۔ میں یہی سمجھا کہ موت کے منہ سے بچ کر نکل آنے کے بعد اُرملا کی شخصیت میں جو دوسری تبدیلیاں رُونما ہوئی ہیں یہ بھی ان میں سے ایک ہوگی۔ ہم دن کے وقت کالی گھاٹ کے سٹیشن سے چلے تھے۔ پورا دن اور رات سفر میں گزر گئی۔ بمبئی دن کے وقت پہنچے۔ بمبئی کے سٹیشن پر اُترتے ہی میری نظریں چاروں طرف جائزہ لینے لگی تھیں۔ مسافروں کی کافی بھیڑ تھی۔ مگر اُرملا بے خوف ہو کر میرے ساتھ چل رہی تھی۔ میرا

پروگرام یہ تھا کہ ہم سیدھا عثمان بھائی کی کھولی میں جائیں گے۔ وہاں میں اُس سے پاکستان جانے کے بارے میں مشورہ بھی کرلوں گا اور وہاں سے ہم سیٹھ کے غنڈوں سے محفوظ بھی ہوں گے۔ جب میں نے اُرملا کو اس پروگرام کے بارے میں بتایا تو وہ بولی۔

''ہم وہاں نہیں جائیں گے۔''

میں نے کہا۔''تو پھر ایسا کرتے ہیں کملا کے پاس چلتے ہیں۔ تم وہاں بیٹھنا، اتنی دیر میں، میں عثمان بھائی کے ہاں جا کر اُس سے پاکستان جانے کے مسئلے پر بات کرلوں گا۔''

اُرملا بولی۔''کون کملا؟''

مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ کیونکہ جب اُرملا بمبئی میں سیٹھ کیشو راؤ کے بنگلے میں تھی تو وہاں وہ کملا سے کئی بار مل چکی تھی۔ میں نے تعجب کے ساتھ پوچھا۔''تم کملا کو کیسے بھول گئیں؟ اُس بدمعاش سیٹھ کے بنگلے میں وہ کئی بار تمہیں ملی تھی۔ بلکہ ایک بار تو تم نے کملا کے ہاتھ مجھے ایک پیغام بھی بھیجا تھا۔ تمہیں یاد نہیں؟''

''ہاں ہاں......'' اُرملا نے اچانک جیسے کچھ یاد کرتے ہوئے کہا۔''اب یاد آ گیا۔ لیکن اُس کے ہاں بھی جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم یہاں سے گالگا کے کوشل مندر کی طرف جانے والی گاڑی پکڑیں گے۔ مجھے سب سے پہلے وہاں پہنچ کر کوشل دیوی کی پوجا کی رسم ادا کرنی ہے۔ کل شِوراتری کی رات ہے۔ میں کسی دوسری جگہ نہیں جانا چاہتی۔''

اُرملا کا لہجہ سخت ہو گیا تھا۔ وہ حکم دینے کے انداز میں بات کرنے لگی تھی۔ مجھے اُس کی خوشی منظور تھی چنانچہ میں نے اعتراض کرنا مناسب خیال نہ کیا اور ہم ایک گھنٹے بعد ایک پسنجر ٹرین میں بیٹھے گالگا مندر کی طرف جا رہے تھے۔ گالگا مندر بقول اُرملا کے اُس سٹیشن کا نام تھا جہاں ہمیں اُتر کر جنگل میں سے پیدل سفر کرتے ہوئے کوشل دیوی کے مندر میں پہنچنا تھا جہاں اُرملا نے پرارتھنا کی رسم ادا کرنی تھی۔ گالگا کا ریلوے سٹیشن بھی دن کے تیسرے پہر جب سورج غروب ہو رہا تھا تو آیا۔ ہم وہاں اُتر گئے۔ سٹیشن ویران اُجاڑ جنگل میں واقع تھا۔ ہمارے سوا دوسرا کوئی مسافر وہاں نہیں اُترا تھا۔ میں نے اُرملا سے پوچھا۔

''تمہیں آگے راستہ معلوم ہے نا؟''

''تم فکر کیوں کرتے ہو؟'' اُس نے میری طرف نظریں اُٹھا کر کہا۔''میں دو بار

یہاں آ چکی ہوں۔ گھبراؤ نہیں، میں تمہیں اور کہیں نہیں لے جاؤں گی۔''

اور پھر وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔ یہ بھی اُرملا کے سابقہ کردار کے بالکل خلاف تھا۔ میں نے اس سے پہلے اُسے کبھی اتنی چھوٹی سی بات پر اتنا بلند قہقہہ لگاتے نہیں دیکھا تھا۔ اُرملا ہر قسم کے حالات میں ہمیشہ بڑی سنجیدہ رہا کرتی تھی۔ اُس کی سنجیدگی کبھی کبھی بوریت کی حد تک پہنچ جاتی تھی۔ یوں منہ پھاڑ کر تو وہ کبھی بھی نہیں ہنسی تھی۔ اور پھر ایسی جگہ پر جو سرِعام ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ دریا میں ڈوب کر زندہ بچ جانے کے بعد اس میں بہت سی تبدیلیاں رُونما ہو چکی تھیں۔

سٹیشن سے نکل کر کوئی ایک گھنٹے تک ہم دُشوار گزار گھنے جنگل میں چلتے رہے۔ چلتے چلتے مجھ پر تھکن کے اثرات ظاہر ہونے لگے تھے مگر حیرانی کی بات تھی کہ اُرملا بالکل نہیں تھکی تھی۔ اُس پر اس دُشوار گزار ایک گھنٹے کے پیدل سفر کا بظاہر کوئی اثر نہیں پڑا تھا۔ وہ بالکل تازہ دم دکھائی دے رہی تھی۔ راستے میں ایک دریا آ گیا۔ وہاں ایک گھاٹ بنا ہوا تھا۔ وہاں سے ہم نے ایک کشتی میں بیٹھ کر دریا پار کیا۔ دریا کے دوسرے کنارے پھر گھنا جنگل شروع ہو جاتا تھا۔ یہ علاقہ میرے لئے بالکل اجنبی تھا۔ میں اس سے پہلے اس طرف کبھی نہیں آیا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس طرف جنگلی درندوں کا زیادہ گزر نہیں تھا۔ ہمیں اس طویل سفر میں ابھی تک کسی جگہ کوئی جنگلی درندہ دُور سے بھی دکھائی نہیں دیا تھا۔

ابھی دن کی روشنی کافی باقی تھی کہ ہم جنگل کے ایک کھلے علاقے میں آ گئے۔ یہاں کہیں سیاہ چھوٹی چھوٹی چٹانیں تھیں اور کہیں گہری کھائیاں اور خشک برساتی نالے تھے۔ اس علاقے سے بھی ہم گزر گئے۔ دُور سے ایک کھنڈر سا دکھائی دیا۔ اُرملا نے اُس کھنڈر کی طرف اشارہ کیا اور بولی۔

''وہ ماتا کوشل کا مندر ہے۔ اب ہم پہنچ گئے ہیں۔ تم ضرور تھک گئے ہو گے۔''

میں نے کہا۔''مجھے اپنی نہیں تمہاری فکر تھی۔ تمہیں اتنی دُور تک پیدل چلنے کی عادت نہیں ہے نا۔''

وہ بولی۔''مگر دیکھ لو...... میں تو بالکل نہیں تھکی۔''

میں نے کہا۔''اُرملا! ایک بات پوچھوں؟''

''پوچھو!''

میں نے کہا۔ ''جب سے تم پر دریا میں ڈوب کر زندہ بچ جانے کا حادثہ گزرا ہے، میں تمہارے اندر کچھ تبدیلیاں دیکھ رہا ہوں۔''

''کیسی تبدیلیاں؟'' اُرملا نے سرسری طور پر پوچھا۔

میں نے کہا۔ ''ایک تو یہ تبدیلی آئی ہے کہ تمہارا مزاج کچھ چڑچڑا ہو گیا ہے۔ دوسری تبدیلی یہ دیکھ رہا ہوں کہ پہلے تم ڈری ڈری، سہمی سہمی سی ہوا کرتی تھیں۔ مگر اب تم دلیر ہو گئی ہو۔ اس کی کیا وجہ ہے؟''

وہ ہنس پڑی۔ کہنے لگی۔ ''ایسا ہونا قدرتی ہے۔ یہ ہونا ہی تھا۔ ہمارے دھرم شاستروں میں لکھا ہے کہ جو کتی (شخص) موت کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھنے کے بعد سنسار میں واپس آ جاتا ہے اس کے اندر ایک طاقت، ایک انرجی آ جاتی ہے۔ میں بھی موت کی دہلیز پر قدم رکھنے کے بعد واپس آئی ہوں اس لئے میرے اندر ایک شکتی پیدا ہو گئی ہے جس کی وجہ سے میں ڈرپوک نہیں رہی ہوں اور مجھے غصہ بھی جلدی آ جاتا ہے۔ تم اس طرف دھیان مت دو۔ میں تمہاری وہی اُرملا ہوں جو تم سے پریم کرتی ہے۔''

میں نے فوراً کہا۔ ''یہ بھی ایک نئی تبدیلی آئی ہے کہ تم میرے ساتھ اپنے پریم کا اظہار بے باکی سے کرنے لگی ہو۔ جبکہ اس سے پہلے تم نے ایسا کبھی نہیں کیا تھا۔''

اُرملا نے مزید بے باکی سے کام لیتے ہوئے میری کمر میں بانہہ ڈال کر مجھے چلتے چلتے اپنے ساتھ لگا لیا اور محبت بھرے انداز میں بولی۔

''یہ تو بڑی اچھی بات ہوئی ہے۔ کیوں؟ تمہیں میرا محبت کرنا اچھا نہیں لگتا؟''

''ایسی بات نہیں ہے...... مجھے اچھا لگتا ہے۔''

میں یہ کہہ کر چپ ہو گیا۔ ہم کھنڈر کے پاس پہنچ گئے تھے۔ یہ شکستہ سی ایک منزلہ کھنڈر نما عمارت تھی جس کے ایک طرف کی آدھی دیوار جنگلی جھاڑیوں نے ڈھانپ رکھی تھی۔

میں نے اُرملا سے کہا۔ ''یہ تو کوئی تاریخی مندر لگتا ہے۔''

وہ بولی۔ ''یہ مندر دو ہزار سال پرانا ہے۔ کہتے ہیں ماتا کوشل کو جب اُن کے پتی نے بارہ برس کا بن باس دیا تھا تو وہ جنگل میں اسی جگہ آ کر رہنے لگی تھیں۔ بعد میں یہاں ان کی یاد میں ایک مندر بن گیا۔''

''مگر اب تو یہ بے آباد معلوم ہوتا ہے۔'' میں نے کہا۔

ہم کھنڈر کے پیچھے آ گئے تھے۔ کہنے لگی۔ ''یہاں دوسرے مندروں کی طرح صبح شام پوجا پاٹھ نہیں ہوتی۔ یہاں بڑے بڑے رشی اور سادھو لوگ تپسیا کرنے اور سمادھی لگانے کبھی کبھار آ جاتے ہیں جیسے میں آئی ہوں۔''

وہ ایک جگہ سے مجھے مندر کے اندر لے گئی۔ ہمیں ایک نیم تاریک سرنگ نما غار میں سے ہو کر جانا پڑا۔ اُس نے خلافِ معمول میرا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔ کہنے لگی۔

''میں نے تمہارا ہاتھ اس لئے پکڑا ہے کہ کہیں تم ڈر نہ جاؤ۔''

''اس میں ڈرنے کی کون سی بات ہے؟'' میں نے کہا۔

اُس نے میرا ہاتھ ذرا سا دباتے ہوئے کہا۔ ''میرے ہوتے ہوئے تمہیں ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اب تو ہمارا جنم جنم کا ساتھ رہے گا۔ میری تین راتوں کی پرارتھنا ہے۔ اس کے بعد تم جہاں کہو گے میں تمہارے ساتھ چلی جاؤں گی۔ اگر پاکستان جانے کے لئے کہو گے تو میں تمہارے ساتھ پاکستان بھی چلی جاؤں گی۔ اور وہاں جا کر ہم شادی کر لیں گے۔''

مجھے یہ سن کر بڑی خوشی ہوئی کہ جس بات کے لئے میں اُسے مجبور کرنا چاہتا تھا وہ خود ہی اس کے لئے تیار تھی اور میرے ساتھ پاکستان جانے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ میں نے اُس کا ہاتھ چوم لیا۔ میری اُس سے محبت کا اظہار اس انداز میں ہوتا تھا کہ کبھی کبھی فرطِ محبت میں اُسے اپنے ساتھ لگا لیتا تھا یا اُس کا ماتھا یا ہاتھ چوم لیتا تھا۔ میں نے کہا۔

''اُرملا! تم نے ایک بہت بڑا بوجھ میرے سر پر سے اُتار دیا ہے۔ میں یہی سوچ رہا تھا کہ یہاں سے فارغ ہو کر ہم پاکستان چلے جائیں گے۔ وہاں ہمارا کوئی دشمن نہیں ہو گا۔ سب دوست اور ہمدرد ہوں گے۔ اور ہم شادی کے بعد ہنسی خوشی زندگی بسر کریں گے۔''

اُس نے کہا۔ ''اگر تم یہی چاہتے ہو تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟ میں تم سے پریم کرتی ہوں۔ تمہارے سوا میں کسی دوسرے مرد کا خیال بھی دل میں نہیں لا سکتی۔''

مجھے محسوس ہوا جیسے ہمارے راستے کی تمام رکاوٹیں، تمام مصیبتیں اور عذاب ختم ہو گئے ہیں۔ اب کوئی مسئلہ تھا تو صرف یہی تھا کہ ہمیں انڈیا کا بارڈر کراس کرنا تھا اور یہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں تھا جسے میں حل نہ کر سکتا۔ اگر عثمان بھائی ہمیں بمبئی سے کراچی یا دبئی جانے والی جہاز پر سوار نہ کرا سکا تو ہم کشمیر کی پہاڑیوں میں سے بارڈر کراس کرنے کی

کوشش کر سکتے تھے۔

ہم مندر کے کھنڈر کے ایک دالان میں آ گئے تھے جس کی چاروں جانب اُونچی دیوار تھی۔ دیوار میں کہیں کہیں کوٹھڑیاں بنی ہوئی تھیں جن کے دروازے کھلے تھے۔ ایک جگہ نیچے زمین دوز سیڑھیاں اُترتی تھیں۔ میں نے اُرملا سے پوچھا۔

''یہاں مندر تو کہیں نظر نہیں آ رہا۔ تم کہاں بیٹھ کر پرارتھنا کرو گی؟''

وہ بولی۔''میرے ساتھ آؤ!''

ہم سیڑھیاں اُتر کر نیچے چلے گئے۔ نیچے چاروں طرف سے بند اُونچی چھت والا دالان تھا جس کے درمیان میں ایک چبوترے پر کسی دیوی کا پرانا بُت رکھا ہوا تھا۔ اُرملا نے کہا۔''یہ ماتا کوشل کی مورتی ہے۔ میں اس کے سامنے بیٹھ کر پوجا اور پرارتھنا کروں گی۔ آؤ! میں تمہیں اُوپر وہ کوٹھڑی دکھاتی ہوں جہاں تم رہو گے۔''

ہم دوبارہ اُوپر والے دالان میں آ گئے۔ وہ مجھے ایک کوٹھڑی میں لے آئی۔ کوٹھڑی باہر سے شکستہ حال تھی مگر اندر سے صاف ستھری تھی۔ ایک تخت پوش پر ہرن کی کھال بچھی ہوئی تھی اور دو تکیے پڑے تھے۔ کونے میں پانی سے بھرا ہوا مٹکا رکھا تھا جس کے اُوپر مٹی کا کٹورہ اوندھا کر کے رکھا تھا۔ کہنے لگی۔

میں نے تمہارا سب انتظام پہلے سے کر دیا ہوا ہے۔ ایک عورت روزانہ تمہیں آ کر کھانا دے جایا کرے گی۔ مندر کے پیچھے ایک چھوٹا کنڈ (تالاب) ہے۔ تم وہاں نہا دھو سکتے ہو۔ مجھے صرف تین دن اور تین راتیں لگیں گی۔ چوتھے روز ہم یہاں سے چل دیں گے۔''

یہ تین دن مجھے مصیبت کے دن لگ رہے تھے۔ لیکن اس خیال سے میں نے صبر شکر کر کے اپنے آپ کو تیار کر لیا تھا کہ یہ ہماری زندگی کی آخری مصیبت تھی۔ اس کے بعد پاکستان جا کر ہماری زندگیوں کا ایک خوبصورت پرسکون باب شروع ہونے والا تھا۔ میں نے اُرملا سے یہ بھی نہ پوچھا کہ وہ عورت اس اُجاڑ بیابان جنگل میں کہاں سے آئے گی اور کھانا کہاں سے لائے گی؟ اُرملا تخت پوش پر بیٹھ گئی تھی اور اُس نے مجھے بھی اپنے ساتھ بٹھا لیا تھا۔ اُس نے میرے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر میری اُنگلی میں پڑی ہوئی اُس انگوٹھی کو غور سے دیکھا جو اُس نے مجھے کالی کے جادو ٹونے سے محفوظ رکھنے کے لئے

دی تھی۔ کہنے لگی۔

''سیاہ پڑنے سے یہ انگوٹھی بڑی بدنما لگنے لگی ہے۔ یہ اُتار کر مجھے دے دو۔ میں پرارتھنا کرتے وقت اسے اپنے پاس رکھوں گی۔ تیسرے دن جب پرارتھنا کی رسم پوری ہو جائے گی تو انگوٹھی کا رنگ پھر سے سنہری ہو جائے گا۔''

سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ میں کوئی اعتراض کرتا یا دل میں کوئی شک کرتا۔ میں نے اُسی وقت انگوٹھی اُنگلی میں سے اُتار کر اُرملا کے حوالے کر دی۔ مجھے ایک لمحے کے لئے بھی محسوس نہ ہوا کہ انگوٹھی اُرملا کو دے کر میں اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی کر رہا ہوں۔ انگوٹھی لے کر اُرملا کے چہرے پر ایسی چمک سی آ گئی جیسے اس انگوٹھی کو حاصل کرنا اس کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد تھا جس میں وہ کامیاب ہو گئی ہے۔ ایسا کیوں ہوا تھا؟ یہ نکتہ اس وقت میری سمجھ میں نہیں آ سکا تھا۔ اُرملا نے انگوٹھی اپنی اُنگلی میں پہن لی اور بولی۔

''جنگل میں زیادہ نہ چلنا پھرنا۔ یہاں دن کے وقت بھی شیر، چیتے، ریچھ اور دوسرے درندے شکار کی تلاش میں پھرتے رہتے ہیں۔ تالاب پر بھی جاؤ تو چاروں طرف سے چوکنے ہو کر جانا۔ اچھا اب میں چلتی ہوں۔''

اُرملا کے جانے کے بعد میں تخت پوش پر لیٹ گیا۔ یہ فروری کے مہینے کی آخری تاریخیں تھیں۔ موسم بڑا خوشگوار تھا۔ باہر کشادہ دالان میں سے تازہ ہوا کوٹھڑی میں آ رہی تھی۔ ہم گالگا کے سٹیشن سے کھانا کھا کر چلے تھے۔ اُس وقت سورج غروب ہوتے وقت دن کی روشنی سمیٹ رہا تھا۔ جنگل کے دُشوار گزار راستوں پر چل چل کر میں کافی تھک گیا تھا۔ اب جو تخت پوش پر لیٹا تو نیند آ گئی۔ اُس وقت اُٹھا جب کسی نے میرے کاندھے کو ہلایا۔ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا، ایک عورت میرے سرہانے کھڑی تھی۔ کوٹھڑی میں لیمپ روشن ہو گیا تھا۔ اُس نے جوگنوں والا لباس پہنا تھا۔ بال شانوں پر کھلے تھے۔ میں جلدی سے اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ عورت بولی۔

''میں نے کھانا رکھ دیا ہے۔''

یہ کہہ کر وہ واپس مُڑی اور کوٹھڑی سے نکل گئی۔ میں نے دیکھا ایک طرف چھوٹے سے چبوترے پر کانسی کا ایک تھال رکھا ہوا تھا اُس میں کھچڑی اور چٹنی تھی۔ مجھے سخت

بھوک لگ رہی تھی۔ کھانا کھا کر پانی پیا اور کوٹھڑی سے باہر آ گیا۔ دالان اندھیرے میں ویران پڑا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ جنگل میں جا کر تھوڑی دیر ٹہل لوں۔ مگر جنگل میں جانے کے لئے سرنگ میں سے گزرنا پڑتا تھا جس کے لئے میرا ذہن آمادہ نہیں تھا۔ میں دالان میں ہی ٹہلنے لگا۔ ٹہلتے ٹہلتے میں اُن سیڑھیوں کے پاس گیا جو نیچے تہہ خانے میں اُترتی تھیں۔ سیڑھیوں میں سے اُرملا کے اشلوک پڑھنے کی دھیمی دھیمی آواز آ رہی تھی۔ نیچے سے لوبان کی ناگوار بو بھی آ رہی تھی۔ اُرملا پرارتھنا میں مشغول تھی۔ کچھ دیر ٹہلنے کے بعد میں تخت پوش پر آ کر لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر کے سوچنے لگا کہ یہاں سے بمبئی جا کر جب میں عثمان بھائی سے ملوں گا تو اُرملا کو کملا کے ہاں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔ وہاں سے اگر سیٹھ کیشو راؤ کو اُرملا کی موجودگی کی خبر ہو گئی تو ہمارا پاکستان جا کر شادی کرنے کا سارا منصوبہ خاک میں مل جائے گا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہم سیٹھ کے خونی غنڈوں کے ہاتھوں قتل ہو جائیں۔ میں نے یہی فیصلہ کیا کہ اُرملا کو بھی میں اپنے ساتھ ہی عثمان بھائی کی کھولی میں لے چلوں گا۔ وہ میرا خیر خواہ ہے اور مسلمان ہے۔ وہاں ہم محفوظ ہوں گے۔ یہی سوچتے سوچتے میں ایک بار پھر نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

صبح جب آنکھ کھلی تو کوٹھڑی کا لیمپ کسی نے بجھا دیا ہوا تھا اور باہر دالان میں دن کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ میں دالان میں نکل آیا۔ جو راستہ سرنگ میں سے ہو کر باہر جنگل میں جاتا تھا اُس طرف سے وہی کل والی جوگن چلی آ رہی تھی۔ اُس کے ہاتھوں میں کانسی کا تھال تھا جس میں ایک گلاس اور کیتلی رکھی ہوئی تھی۔ میرے پاس آ کر بولی۔

''تمہارے لئے چائے لائی ہوں۔''

اتنا کہہ کر وہ کوٹھڑی میں گئی، تھال اندر رکھ کر باہر آ گئی اور سرنگ والے دروازے کی طرف چل پڑی۔ میں نے پوچھا۔ ''اُرملا جی کہاں ہیں؟''

اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔ مُڑ کر بھی نہ دیکھا اور سرنگ کے دروازے میں داخل ہونے کے بعد میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ عجیب پراسرار قسم کی عورت تھی۔ خدا جانے جنگل میں وہ کہاں سے میرے لئے کھانا اور ناشتہ لے کر آ جاتی تھی۔ بہرحال میں کوٹھڑی میں بیٹھ کر ناشتہ کرنے لگا۔ کیتلی میں چائے تھی۔ ایک تھالی میں کھچڑی تھی۔ ناشتہ کرنے کے بعد میرا نہانے کو دل چاہا۔ کئی روز سے نہایا نہیں تھا۔ اُرملا نے کہا تھا مندر

کے پیچھے ایک تالاب ہے وہاں جا کر نہا دھو لینا۔ میں سرنگ میں سے گزر کر باہر جنگل میں آ گیا۔ آسمان پر بادل ہی بادل تھے مگر دن کی روشنی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ یہاں آس پاس جنگل اتنا گھنا نہیں تھا۔ مندر کے پیچھے اِدھر اُدھر درختوں کے جھنڈ نظر آ رہے تھے۔ تالاب کو تلاش کرتے ہوئے میں درختوں کے ایک جھنڈ میں آ گیا۔ یہاں مجھے درختوں کے تنوں میں سے کچھ فاصلے پر ایک چھوٹا سا چبوترہ نظر پڑا۔ میں سمجھ گیا کہ تالاب اسی جگہ پر ہے۔ مندروں کے پیچھے جو تالاب ہوتے تھے اُن کے قریب ہی زمین سے چار فٹ اُونچا ایک چبوترہ ضرور بنا ہوا ہوتا تھا جہاں بیٹھ کر سادھو لوگ اشنان کر کے فارغ ہونے والی عورتوں اور مردوں کے ماتھوں پر تلک لگاتے تھے اور تُلسی کے پتوں کا پرشاد دیتے تھے۔ مگر چونکہ یہ مندر اُجاڑ اور ویران ہو چکا تھا اس لئے چبوترہ صبح کے وقت بھی خالی تھا۔

میں درختوں کے نیچے جھاڑیوں میں بے فکری سے چلتا چبوترے کے پاس آیا تو مجھے کسی عورت کے اشلوک پڑھنے کی آواز آئی۔ میں وہی رُک گیا۔ شاید کوئی عورت تالاب میں اشنان کر رہی تھی۔ میں نے چبوترے کی دیوار کی اوٹ سے گردن نکال کر تالاب پر نگاہ ڈالی۔ میں نے اُرملا کو پہچان لیا۔ وہ تالاب کی سیڑھیوں میں بیٹھی دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں میں پانی لے کر اپنے سر کے اُوپر آہستہ آہستہ ڈال رہی تھی اور ساتھ ساتھ کچھ بولتی بھی جا رہی تھی۔ اُس کا نچلا دھڑ پانی میں ڈوبا ہوا تھا۔ اُس کے جسم پر کوئی ساڑھی وغیرہ نہیں تھی۔ اُس کی پیٹھ میری طرف تھی اور مجھ سے اُس کا فاصلہ زیادہ سے زیادہ بیس پچیس فٹ ہو گا۔ دن کی روشنی میں اُس کی کمر شانوں سے لے کر نیچے تک صاف نظر آ رہی تھی۔ میں نگاہیں دوسری طرف کرنے لگا تو اچانک مجھے محسوس ہوا کہ اُرملا کی پیٹھ اُوپر سے لے کر نیچے تک بالکل صاف ہے اور وہاں کوئی داغ دھبہ نہیں ہے۔

میرا خیال اپنے آپ اُرملا کے جسم کے گرہن کے نشان کی طرف چلا گیا۔ میں نے ذرا آگے کو ہو کر بڑے غور سے اُرملا کی پیٹھ کو دیکھا، مجھے وہاں گرہن کا کوئی نشان نظر نہ آیا۔ مگر یہ کیسے ہو سکتا تھا؟ اُرملا کی پیٹھ پر شانے کے پاس گرہن کا گول سیاہ نشان تھا جسے سرسوتی بھی دیکھ چکی تھی اور جس کے بارے میں اُرملا نے مجھے خود بھی بتایا ہوا تھا اور اس داغ کا میں خود بھی مشاہدہ کر چکا تھا۔ مجھے حیرانی ہوئی اور تجسّس بھی ہوا کہ اچانک یہ داغ

کیسے غائب ہوگیا؟ تالاب کی سیڑھیاں چبوترے کے آگے نیچے تھوڑی سی ڈھلان سے شروع ہوتی تھیں اور اُرملا تیسری سیڑھی پر بیٹھی تھی۔ وہ اسی طرح اشلوک کے منتر پڑھتے ہوئے پانی ہتھیلیوں میں اُٹھا اُٹھا کر اپنے سر پر ڈال رہی تھی۔ میں جھک کر چلتا دو تین قدم اور آگے ہو کر ایک جھاڑی کی اوٹ میں آ گیا۔ آگے تالاب کی ڈھلان تھی۔ یہاں سے میں اُرملا کو اچھی طرح دیکھ سکتا تھا۔ میں نے آنکھیں پوری طرح کھول کر ایک بار پھر اُرملا کی برہنہ پیٹھ کو اُوپر سے لے کر نیچے تک دیکھا اور بار بار دیکھا۔ مجھے وہاں کسی بھی جگہ گرہن کا کالا نشان دکھائی نہ دیا۔

منتروں کا جاپ کرتے کرتے اُرملا اُٹھ کھڑی ہوئی۔ تالاب کی پہلی سیڑھی پر اُس کی ساڑھی پڑی تھی۔ جیسے ہی وہ تالاب سے نکل کر ساڑھی کی طرف بڑھی میں چوروں کی طرح دبے پاؤں جھک کر چلتا تالاب والے درختوں کے جھنڈ سے باہر نکل گیا اور تیز تیز قدموں سے مندر کی طرف مُڑ گیا۔ نیم تاریک سرنگ میں سے ہو کر میں اپنی کوٹھڑی میں آ کر تخت پوش پر ڈھیر ہو گیا۔ میرا ذہن چکرا گیا تھا۔ مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ معمہ کیا ہے؟ مجھے دھوکہ ہوا ہے یا حقیقت میں اُرملا کی کمر کا نشان غائب ہو چکا ہے؟ میں نے اس گورکھ دھندے میں مزید سر کھپانے کی بجائے براہِ راست اُرملا سے پوچھنے کا فیصلہ کر لیا۔ دوپہر کو وہ تھوڑی دیر کے لئے میری کوٹھڑی میں آئی تو میں نے ایک آدھ منٹ اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد صاف لفظوں میں اُس سے کہا۔

''اُرملا! میرے دل میں ایک شک پیدا ہو گیا ہے۔''

''کیسا شک؟'' اُرملا نے بھنویں چڑھاتے ہوئے پوچھا۔

میں نے کہا۔ ''یہ شک سرسوتی نے میرے دل میں ڈالا ہے۔ رات وہ میرے خواب میں آئی تھی۔ اُس نے مجھے کہا ہے کہ اُرملا میں تم جو تبدیلی دیکھ رہے ہو یہ اس وجہ سے ہے کہ اُس کے جسم پر جو گرہن کا نشان تھا وہ دریا میں کودنے والے حادثے کے بعد صاف ہو گیا ہے۔ اور یہ بڑی منحوس بات ہوئی ہے۔''

جتنی دیر تک میں بولتا رہا، اُرملا مسلسل مجھے گھور کر دیکھتی رہی۔ جب میں نے بات ختم کی تو وہ بولی۔ ''صاف صاف کیوں نہیں کہتے کہ اس بہانے تم میرے برہنہ جسم کا نظارہ کرنا چاہتے ہو۔ ٹھیک ہے، میں تمہاری خواہش ابھی پوری کئے دیتی ہوں۔''

یہ کہہ کر اُرملا نے میری طرف پیٹھ کر کے کمر پر سے اُوپر تک ساڑھی اُوپر اُٹھا دی اور لی۔ ''بے شک ہاتھ پھیر کر بھی دیکھ لو۔ گرہن کا نشان اگر نہ ہو تو مجھے بھی بتا دو۔ کیونکہ ی تک تو میں یہی سمجھ رہی ہوں کہ یہ نشان ابھی تک میرے ساتھ ہی ہے۔''

یہ دیکھ کر میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں کہ اُرملا کی پیٹھ پر شانے کے قریب گرہن کا اہ نشان اپنی جگہ پر موجود تھا۔ اُرملا نے ساڑھی ابھی تک اُوپر اُٹھا رکھی تھی۔ کہنے لگی۔

''تمہیں کیا دکھائی دے رہا ہے؟''

میں نے اپنی حیرت پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ''نشان تو موجود ہے اُرملا!''

اُس نے ساڑھی نیچے کر لی اور میری طرف منہ کر لیا۔ کہنے لگی۔ ''یہ تم نے مجھ پر ک کب سے کرنا شروع کر دیا ہے؟ اور وہ بھی سرسوتی کے کہنے پر؟ مجھے اس سے بڑا ھ ہوا ہے۔''

میں نے اُس کی دلجوئی کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے معاف کر دو اُرملا! ں نے صرف اپنے دل کی تسلی کے لئے تمہیں نشان دکھانے کے لئے کہا تھا۔ کیونکہ رسوتی نے میرے دل میں یہ شک ڈال دیا تھا کہ گرہن کے نشان کے غائب ہو جانے ے تمہاری زندگی خطروں اور مصیبتوں کی زد میں آ جائے گی اور تم کسی بھی وقت موت کا ار ہو سکتی ہے۔ بس مجھے یہ ڈر پیدا ہو گیا تھا اور میں نے اپنے دل کے اس ڈر کو دُور رنے کے واسطے یہ سب کچھ کیا ہے۔''

اُس نے بڑی محبت سے میرا ہاتھ تھام لیا اور بولی۔ ''اب تو یہ ڈر دُور ہو گیا ہے نا؟''

''ہاں۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

وہ کہنے لگی۔ ''سرسوتی کو میں اسی لئے پسند نہیں کرتی تھی اور اُس کی حویلی میں نہیں نا چاہتی تھی۔ کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ وہ میری اور تمہاری محبت سے جلتی ہے۔ اب اب میں آ کر بھی وہ تمہیں طرح طرح کی باتوں سے میرے خلاف ورغلا رہی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''نہیں نہیں اُرملا! مجھے غلط نہ سمجھو۔ سرسوتی کی باتیں میرے دل پر ہارے خلاف ذرا سا بھی اثر نہیں ڈال سکتیں۔ میں نے جو کچھ کیا ہے صرف اپنی تسلی ے لئے کیا ہے۔ میں تمہیں کسی حالت میں بھی پریشان حال نہیں دیکھ سکتا۔''

اُرملا نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ''ان باتوں کو چھوڑو اور غور سے میری بات سنو!

میری پرارتھنا کو صرف آج کی رات اور کل کا آدھا دن اور رات باقی رہ گئی ہے۔ اس کے بعد ہم اس ملک کو ہی چھوڑ کر پاکستان چلے جائیں گے۔ تاکہ یہاں جو ہمارے دشمن ہیں اُن سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تمہیں نجات مل جائے۔''

''میں بھی یہی چاہتا ہوں اُرملا۔'' میں نے اُس کی فوراً تائید کی۔

وہ بولی۔ ''تو پھر جیسا میں کہوں اس پر عمل کرنا۔ اور یہ دو دن مندر کی چار دیواری سے ہرگز ہرگز باہر مت جانا۔ اگر تمہیں تمہارے دشمنوں میں سے کسی نے دیکھ لیا تو یاد رکھو! پھر ہم یہ زندگی تو کیا، اگلے جنم میں بھی ایک دوسرے سے نہ مل سکیں گے۔''

میں نے کہا۔ ''تم فکر نہ کرو۔ میں یہاں سے باہر نہیں جاؤں گا۔''

کچھ دیر میرے پاس بیٹھنے کے بعد وہ چلی گئی۔ میں اس نتیجے پر اسی دوران پہنچ چکا تھا کہ تالاب پر مجھے اُرملا کے جسم پر گرہن کا جو داغ نظر نہیں آیا تھا تو یہ میری نظر کا دھوکہ تھا۔ حقیقت میں گرہن کا نشان اس وقت بھی اُرملا کی پیٹھ پر موجود تھا۔ چونکہ میں اندھیری کوٹھڑی میں سے نکل آیا تھا اور باہر تیز روشنی تھی دن کی۔ اور تالاب کے پانی کی چمک بھی پڑ رہی تھی اس وجہ سے یہ نشان مجھے نظر نہیں آیا۔ اگر تھوڑی دیر بعد غور سے دیکھتا تو نشان ضرور نظر آ جاتا۔ اب چونکہ میں نے گرہن کا نشان اُرملا کی پیٹھ پر دیکھ لیا تھا اس لئے میرا دل اُس کی طرف سے صاف ہو گیا تھا اور میری پوری تسلی بھی ہو گئی تھی۔

اُرملا نے جاتی دفعہ کہا تھا کہ وہ دوسرے دن میری کوٹھڑی میں نہیں آئے گی، اس سے اگلے روز شام کو آئے گی۔ چنانچہ میں نے وہ سارا دن، ساری رات اور دوسرا آدھا دن کوٹھڑی میں بیٹھ کر، لیٹ کر اور دالان میں ٹہل کر گزار دیا۔ دوپہر کو جوگن عورت حسب معمول میرے لئے کھانا لے کر آ گئی۔ میں نے کھانا کھایا اور لیٹ گیا۔ لیٹ لیٹ کر جسم تختے کی طرح ہو گیا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ باہر نکل کر جنگل کی تھوڑی سیر کر لوں۔ مگر اُرملا نے منع کیا تھا کہ کوئی مجھے دیکھ لے گا اور ہم پر آفت آ جائے گی۔ کچھ دیر صبر کیا، پھر صبر نہ ہو سکا اور یہ سوچ کر میں کوٹھڑی سے نکل کر سرنگ میں سے ہوتا ہوا جنگل میں آ گیا کہ میں اپنے آپ کو چھپا کر اور بڑی احتیاط کے ساتھ جنگل کی تازہ ہوا میں تھوڑا بہت چل پھر لوں گا۔ جنگل کی فضا واقعی بڑی تر و تازہ اور شاداب تھی۔ بڑی خوشگوار ہوا چل رہی تھی۔ وہاں کون تھا جو مجھے دیکھ لیتا؟ ہر طرف ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ نہ بندہ نہ

ے کی ذات والا معاملہ تھا۔ کچھ دیر تو میں اپنے آپ کو چھپانے کی کوشش کرتا رہا، پھر ں احتیاط کا دامن بھی ہاتھ سے نکل گیا اور میں ٹہلتے ٹہلتے ایک اور کھنڈر کے پاس جا لا۔ درختوں میں گھری ہوئی یہ ایک ٹوٹی پھوٹی چار دیواری تھی جہاں ایک جگہ آدھی یوار ڈھے چکی تھی اور اندر جانے کو راستہ بنا ہوا تھا۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ اندر کیا ہے ں چار دیواری کے اندر چلا گیا۔

اندر مٹی کی ایک قبر بنی ہوئی تھی۔ قبر کی شکستہ حالت کو دیکھ کر صاف لگ رہا تھا کہ ہاں کبھی کوئی فاتحہ پڑھنے نہیں آیا۔ قبر کے سرہانے کی جانب دو چار اینٹیں کھڑی کی ئی تھیں۔ قبر پر سوکھی گھاس اُگ رہی تھی۔ میرا دل چاہا کہ میں فاتحہ پڑھ کر مرحوم کی وح کو ثواب پہنچاؤں۔ چنانچہ میں نے ہاتھ آگے کر کے آنکھیں بند کیں اور فاتحہ ھنے لگا۔ فاتحہ پڑھ کر ہاتھ چہرے پر پھیر کر آنکھیں کھولیں تو میں ڈر گیا...... میرے امنے ایک لحیم و شحیم آدمی سفید چولا پہنے، ہاتھ میں بھاری عصا لئے کھڑا مجھے اپنی لال ل آنکھوں سے گھور رہا تھا۔ میری زبان سے بے اختیار السلام علیکم نکل گیا۔ اُس آدمی نے سر پر صافہ باندھا ہوا تھا۔ اُس نے بھاری بارعب آواز میں وعلیکم السلام کہا اور اپنا صا اُٹھا کر میرے کندھے کے ساتھ لگا کر کہا۔

''میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔ اُس درخت کے نیچے آ جاؤ!''

وہ آگے آگے اور میں اُس کے پیچھے پیچھے چل پڑا قبر کے سرہانے کچھ فاصلے پر ایک ہت ہی گنجان درخت کھڑا تھا۔ اس درخت کے پیچھے ایک گھاس پھونس کی جھونپڑی بنی وئی تھی۔ وہ جھونپڑی کے اندر چلا گیا اور بولا۔

''اندر آ جاؤ!''

میں ذرا سا جھجکا پھر جھونپڑی میں داخل ہو گیا۔ فرش پر گھاس کا فرش بچھا تھا۔ اُس زرگ نے مجھے اپنے سامنے بٹھا لیا۔ میں بڑا حیران ہو رہا تھا کہ اس بزرگ نے مجھے یہ کیوں کہا کہ میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا؟ میں اُس کے سامنے بڑے ادب سے بیٹھا تھا۔ اُس بزرگ نے عصا ایک طرف رکھ دیا اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔

''تمہاری موت تمہارے سر پر منڈلا رہی ہے۔ لیکن قدرت تمہیں ایک کافر کے ہاتھوں رنے سے بچانا چاہتی ہے اس لئے تمہیں اس طرف میرے پاس بھیج دیا گیا ہے۔''

میں اُس بزرگ کا منہ تک رہا تھا کہ یہ کیا کہہ رہا ہے۔ میں نے آگے سے کچھ نہ کہا۔
وہ بولا۔ ''جو تم نہیں جانتے میں وہ تمہیں بتانے والا ہوں اور صرف اس لئے بتا رہا ہوں
کہ مجھے اس کی اجازت دی گئی ہے۔ ورنہ قدرت کے راز افشا کرنے کی کسی کو اجازت
نہیں ہوتی۔ میری بات دھیان سے سنو...... جس عورت کو تم اپنی زندگی سمجھ بیٹھے ہو وہ
حقیقت میں تمہاری موت ہے۔''

اب میں اور زیادہ پریشان ہو گیا کہ یہ شخص کس کے بارے میں کہہ رہا ہے؟ میرے
دل کو یقین ہو گیا کہ یہ کوئی مجذوب آدمی ہے اور اس کے دل میں جو آ رہا ہے، کہے جا رہا
ہے۔ اس کی باتوں کا کوئی مطلب نہیں ہے۔ چنانچہ میں نے اُن سے یہ پوچھنے کی
ضرورت ہی محسوس نہ کی کہ وہ کس کے بارے میں کیا فرما رہے ہیں۔ چپ چاپ بیٹھا
اُن کی باتیں سنتا رہا۔ اُس بزرگ نے فرمایا۔

''غور سے سنو! جس عورت کو تم اُرملا سمجھ رہے ہو وہ اُرملا نہیں ہے۔''

میرے اندر ایک دھماکہ سا ہوا۔ میرے اعصاب جھنجھنا اُٹھے۔ میں اُس بزرگ کی
باتوں کو ضرور مجذوب کی بڑ سمجھ کر ٹال دیتا۔ لیکن اُس نے صاف طور پر اُرملا کا نام لیا
تھا۔ مجھے کچھ پوچھنے کی جسارت نہیں ہو رہی تھی۔ بزرگ نے کہا۔

''جانتے ہو وہ عورت کون ہے؟''

میں حیرت زدہ آنکھوں سے بزرگ کے جلالی چہرے کو تک رہا تھا۔ اُنہوں نے خود
ہی اپنے سوال کا جواب دے دیا اور کہا۔ ''یہ عورت تمہاری جان کی دشمن کانچی ہے!''

مجھے ایک جھٹکا سا لگا اور محسوس ہوا جیسے میں زمین کے اندر دھنستا چلا جا رہا ہوں۔
اُس بزرگ نے اپنا عصا ایک بار پھر میرے کندھے سے لگایا اور مجھے سکون کی ایک لہر
اپنے جسم میں سرایت کرتی محسوس ہوئی۔ اُس بزرگ نے کانچی کا نام لیا تھا جو میرے
لئے حیرت کا مقام تھا اور اس بزرگ کے بیان کی سچائی کی تصدیق کرتا تھا۔ اس انکشاف
پر کہ اُرملا، اُرملا نہیں ہے بلکہ کانچی ہے، میں ابھی تک حیرت زدہ تھا۔ میرے جذبات
میں ایک ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ اگر واقعی یہ عورت جو مجھے مندر میں لائی ہے اُرملا نہیں
کانچی ہے تو پھر اصل اُرملا کہاں ہے؟ مجھے یہ سوچتے ہوئے خوف محسوس ہو رہا تھا کہ اصلی
اُرملا دریا میں ڈوب کر ہلاک ہو چکی ہے اور کانچی اُس کا رُوپ دھار کر مجھ سے بدلہ لینے

ئی ہے۔ میرے لئے یہ تصور بھی ناقابل برداشت تھا کہ اُرملا اب اس دنیا میں واپس
ہیں آئے گی۔ بزرگ کہنے لگے۔

''جتنا بتانے کی مجھے اجازت تھی میں نے تمہیں بتا دیا ہے۔ اب تم جانو اور تمہارا کام۔''

''محترم! اگر واقعی یہ عورت کانچی ہے تو وہ تو مجھے زندہ نہیں چھوڑے گی۔''

''ہاں......'' بزرگ نے کہا۔ ''وہ اپنے دیوتا کے آگے تمہاری قربانی دے کر بہت
ی شکتی حاصل کرنا چاہتی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''پھر تو میں یہیں سے پاکستان بھاگ جاتا ہوں۔''

بزرگ نے فرمایا۔ ''بھاگ کر کہاں جاؤ گے؟ تم جہاں بھی جاؤ گے یہ شیطانی عورت
اں پہنچ جائے گی۔ پہلے تمہارے پاس انگوٹھی تھی جو تمہیں اس کے قاتلانہ حملے سے بچا
لتی تھی۔ لیکن اس عورت نے عیاری سے کام لے کر انگوٹھی بھی تم سے چھین لی ہے۔ اب
اُس کے آگے بالکل بے بس ہو۔ وہ جہاں اور جب چاہے تمہیں موت کے منہ میں
یل سکتی ہے۔''

میں نے پوچھا۔ ''تو اب تک اُس نے ایسا کیوں نہیں کیا؟ وہ کس بات کا انتظار کر
ی ہے؟''

بزرگ نے کہا۔ ''تمہاری قربانی سے پہلے اس عورت نے تپسیا اور پرارتھنا کی ایک
اص رسم ادا کرنی ہے۔ کل رات یہ رسم پوری ہو جائے گی اور پھر وہ تمہیں اسی مندر کے
ہ خانے میں دیوتا کی مورتی کے آگے ذبح کر دے گی اور تمہارے خون سے خود بھی
شان کرے گی اور منحوس دیوتا کی مورتی کو بھی خون میں نہلائے گی۔''

میں کانپ اُٹھا۔ میں کانچی کی اس قسم کی خونی وارداتوں سے اچھی طرح واقف تھا۔
ایک خونخوار قسم کی درندہ صفت جادوگرنی تھی جو برائی کی سفلی طاقتیں حاصل کرنے کے
ئے کچھ بھی کر سکتی تھی۔ اُن بزرگ نے اُرملا کے مجھ سے بہانے بہانے انگوٹھی واپس
نے کا ذکر کر کے میرے واسطے شک وشبے کی ہلکی سی گنجائش بھی نہیں چھوڑی تھی۔ تمام
ال ان بزرگ کی صداقت پر مُہر تصدیق ثبت کر رہے تھے۔ میں نے بڑی دردمندی
ے کہا۔

''محترم! آپ دلوں کا حال جانتے ہیں۔ اللہ نے آپ کو بڑی توفیق عطا کی ہے۔

مجھے اس مصیبت سے نجات حاصل کرنے میں میری مدد فرمائیے۔ میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔''

بزرگ نے کہا۔ ''دلوں کے بھید صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں۔ میں تمہارے پاس تمہیں بچانے کے لئے ہی آیا ہوں۔ اور یہ بھی سن لو! میں خود نہیں آیا۔ بلکہ مجھے بھیجا گیا ہے۔ ہم دنیا والوں کے معاملات میں دخل نہیں دیتے۔ لیکن مجھے خاص طور سے اس کا حکم ملا ہے۔''

اس کے بعد اُن جلالی بزرگ نے قریب ہی پڑی ہوئی گدڑی میں ہاتھ ڈال کر ایک پوٹلی باہر نکالی۔ پوٹلی کو کھولا تو اُس میں کپڑے کی بنی ہوئی ایک بالشت بھر کی گڑیا تھی۔ کہنے لگے۔ ''یوں سمجھ لو! کہ یہ اُس منحوس جادوگرنی کانچی کا پتلا ہے۔ کل رات جب تم اپنی کوٹھڑی میں سو رہے ہو گے تو کانچی تم پر حملہ کرے گی۔ اگر تم سچ مچ سو گئے تو پھر تمہارا اللہ ہی حافظ ہے۔ پھر کوئی بھی تمہیں آنے والی اذیت ناک موت سے نہیں بچا سکے گا۔ تمہیں کوٹھڑی میں لیٹ کر جاگتے رہنا ہوگا۔ یہ پتلا تم لیٹتے وقت بھی اپنے پاس رکھنا......''

اس کے بعد اُن بزرگ نے مجھے کانچی سے جان بچانے کے بارے میں خاص ہدایات دیں اور کہا۔ ''اگر تم نے ان ہدایات کے مطابق عمل کیا تو کانچی تمہارا بال بھی بیکا نہیں کر سکے گی اور تم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اُس منحوس عورت کی خونی سازشوں سے نجات حاصل کر لو گے۔ لیکن اس کے لئے شرط ہے کہ میری ہر ہدایت پر پوری توجہ اور ہوش و حواس میں رہتے ہوئے عمل کرنا۔ اگر تم سے ذرا سی بھی کوتاہی یا غفلت ہوئی تو یہ سب کچھ اُلٹا بھی پڑ سکتا ہے۔ اب جاؤ اور کل رات کا انتظار کرو۔ جاؤ......!''

جانے کا حکم اُنہوں نے ایسے جلالی لہجے میں دیا کہ میں فوراً اپنی جگہ سے اُٹھا اور جھونپڑی سے باہر نکل گیا۔

جھونپڑی سے باہر نکلا تو میری ذہنی کیفیت بالکل ہی بدلی ہوئی تھی اور میرے خیالات میں ایک تلاطم مچا ہوا تھا۔ ایک لہر یقین کی آتی اور میرے ذہن سے ٹکرا کر واپس چلی جاتی۔ پھر دوسری لہریں اپنی آغوش میں شک اور شبہوں کو لے کر آتیں اور پہلی یقین کی لہر کے اثرات کو مٹاتی ہوئی آگے نکل جاتیں۔ میں شک اور یقین کے درمیان معلق ہو گیا تھا۔ کسی وقت خیال آتا کہ یہ بزرگ بھی کوئی نقلی پیر ہیں اور ان کی

باتوں پر اعتبار نہیں کرنا چاہئے۔ لیکن جب میں یہ دیکھتا کہ انہوں نے وہ باتیں بتا دی ہیں جن کا تعلق صرف میری ذات سے ہے اور میرے سوائے دوسرے کسی شخص کو ان کا علم نہیں تو مجھے بزرگ کے ایک ایک لفظ کی صداقت پر یقین کرنا پڑتا تھا۔

وہ ساری رات میں نے بے چینی سے پہلو بدلتے گزار دی۔ دوسرا دن بھی اسی اُلجھن میں گزر گیا۔ بزرگ کا دیا ہوا پتلا میں نے تخت پوش کے نیچے چھپا کر رکھ دیا تھا۔ تیسرے دن دوپہر کے وقت اُرملا میری کوٹھڑی میں آئی۔ میں اپنے منتشر خیالات میں کھویا ہوا تخت پوش پر آنکھیں بند کئے پڑا تھا۔ میں نے ذرا سی آنکھیں کھول کر اُسے کوٹھڑی میں آتے دیکھ لیا تھا۔ وہ میرے پاس آ کر کھڑی ہو گئی پھر اُس نے میرے کندھے کو آہستہ سے ہلایا۔

''شیرازی سو رہے ہو کیا؟''

میں نے آنکھیں کھول کر اُرملا کو دیکھا۔ وہ مجھے اُس وقت کانچی دکھائی دی۔ میں اپنی ذہنی کیفیات اُس پر ظاہر نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔ میں آنکھیں کھولے اسی طرح لیٹا اُرملا کی صورت کو تک رہا تھا۔ وہی بھولی بھالی معصوم شکل تھی۔ آنکھوں میں محبت کی دھیمی چمک تھی۔ بالکل اپنے خاص انداز میں گردن ایک طرف ذرا سی جھکائے مجھے محبت بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ کہنے لگی۔

''کیا دیکھ رہے ہو؟''

میں کبھی یقین نہیں کر سکتا تھا کہ یہ اُرملا نہیں ہے بلکہ خونخوار کانچی ہے۔ میری انگوٹھی اُس کی اُنگلی میں پڑی تھی۔ وہ تخت پوش پر میرے پہلو میں بیٹھ گئی۔ اُس کا جسم میرے ساتھ لگا تھا۔ یہ وہ حرکت تھی جو اُرملا نے پہلے کبھی نہیں کی تھی۔ وہ کبھی اتنی بے باکی سے میرے ساتھ لگ کر نہیں بیٹھا کرتی تھی۔ میں جلدی سے اُٹھا اور ذرا سا پیچھے ہٹ کر بیٹھ گیا۔ اُس نے بڑے شیریں اور محبت بھرے لہجے میں کہا۔

''شیراز! تم ضرور سوچ رہے ہو گے کہ میں تمہاری محبت میں اتنی جذباتی کیوں ہو گئی ہوں کہ میں نے شرم و حجاب کا دامن بھی ہاتھ سے چھوڑ دیا ہے۔ میں جو کبھی آنکھ اُٹھا کر تمہاری طرف دیکھتی تھی یا تم آنکھیں اُٹھا کر مجھے دیکھتے تھے تو میں شرم سے سر جھکا لیا کرتی تھی، آج اتنی بے باک کیوں ہو گئی ہوں کہ بے تاب ہو کر خود تمہیں اپنے ساتھ لگا

لیتی ہوں؟ اس کی ایک وجہ ہے...... میں مر کر زندہ ہوئی ہوں۔ موت نے مجھ پر زندگی کے سارے راز کھول دیئے ہیں۔ مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ اگر میں مر گئی تو تم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جدا ہو جاؤں گی۔ اس خیال سے کہ کسی وقت بھی موت آسکتی ہے، کسی بھی لمحے میں تم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو سکتی ہوں میں زیادہ سے زیادہ تمہارے قریب رہنا چاہتی ہوں۔ بس اور کوئی وجہ نہیں ہے۔''

اُرملا نے میرے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور اپنا سر میرے سینے سے لگا دیا۔ اُرملا کی زبان سے محبت کی سحر انگیز باتیں سن کر اور اُس کا خوبصورت سر اپنے سینے سے لگا ہوا محسوس کر کے اور اُس کی بانہیں اپنے گلے میں دیکھ کر کوئی کافر ہی اُس کی محبت پر ایمان نہیں لا سکتا تھا۔ اس لمحے میرے دل نے کہا کہ وہ آدمی جو تمہیں شکستہ چار دیواری میں ملا تھا وہ اور اُس کی ساری باتیں جھوٹ کا پلندہ ہیں۔ وہ کوئی شعبدہ باز تھا جس نے اپنے کسی خاص عمل میں مہارت حاصل کر لی تھی اور اس کی وجہ سے اُس نے میرے دل کا حال معلوم کر لیا تھا اور مجھے اُرملا کی محبت سے دُور لے جانے اور اُس سے بدظن کرنے کے لئے ایسی باتیں کی تھیں کیونکہ محبت کرنے والوں کے سب دشمن ہوتے ہیں۔ سب اُن سے حسد کرنے لگتے ہیں۔ اور دنیا واقعی دو دلوں کو ملتے دیکھ کر کبھی خوش نہیں ہوتی۔ مجھے پورا یقین ہو گیا کہ اُس شعبدہ باز شخص کی ساری باتیں جادو ٹونے کی باتیں تھیں اور یہ اُرملا ہی ہے۔ اُرملا جو مجھ سے بے پناہ محبت کرتی ہے اور جس کو میں دل و جان سے پیار کرتا ہوں۔ میں نے اُس شخص کی ساری باتیں ایک ہی جھٹکے سے اپنے ذہن سے نکال کر پھینک دیں۔ اب میں تھا اور میری اُرملا تھی جس کی بانہیں میرے گلے میں تھیں اور جس نے اپنا سر میرے سینے سے لگا رکھا تھا۔ میں نے اُس کا چہرہ اُوپر اُٹھایا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ میں نے بے اختیار ہو کر اُرملا کی آنکھوں میں آئے ہوئے موتی چوم لئے اور کہا۔

''اُرملا! یقین کرو...... میں نے تم سے محبت کا آغاز کیا تھا اور تم پر ہی اسے ختم کر دیا ہے۔ نہ تم سے پہلے کسی سے محبت کی تھی اور نہ اس کے بعد کسی سے محبت ہو سکے گی۔''

اُرملا نے وفورِ محبت سے اپنا سر میرے سینے پر رکھ دیا۔ وقت اس لمحے تھم گیا تھا۔ وہ ایک لمحہ جیسے صدیوں پر پھیل گیا تھا۔ جب میں نے آنکھیں کھولیں تو اُرملا میری طرف

محبت میں شرابور نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں محبت کی سرمدی لذتوں میں ڈوبا ہوا رنگ و روشنیوں کا ہزار سالہ خواب دیکھ رہا تھا کہ کسی نے مجھے جگا دیا۔

اُرملا آہستہ سے مجھ سے الگ ہو گئی۔ کہنے لگی۔ ''آج میری پرارتھنا کی آخری رات ہے۔ کل ہم یہاں سے چل دیں گے۔ میں جے پور نہیں جاؤں گی۔ میں تمہارے ساتھ پاکستان چلی جاؤں گی اور وہاں جاتے ہی ہم شادی کر لیں گے۔ اب مجھ سے تمہاری ایک لمحے کی جدائی بھی برداشت نہیں ہو سکے گی۔''

وہ بڑے دلکش انداز میں مسکرائی۔ اُس نے میرا چہرہ بڑی محبت سے اپنے دونوں ہاتھوں میں تھاما اور بولی۔ ''میری پرارتھنا کا وقت ہو گیا ہے۔ جاتی ہوں۔ صبح سورج نکلنے کے بعد تمہارے پاس آجاؤں گی...... ہمیشہ ہمیشہ کے لئے......''

اور وہ میرے پہلو سے اُٹھ کر کوٹھڑی کے دروازے کی طرف بڑھی۔ دروازے پر جا کر ایک لمحے کے لئے رُکی اور میری طرف دیکھ کر بولی۔

''ہاں...... یاد آ گیا۔ آدھی رات کے بعد تمہیں تھوڑی دیر کے لئے میرے پاس آنا ہو گا۔ میں نے تمہیں جو انگوٹھی دی تھی اور جو اس منحوس کانچی کے حملہ کرنے سے سیاہ پڑ گئی تھی اُس کو مجھے اپنی شکتی کے زور سے دوبارہ اپنی اصلی حالت میں واپس لانا ہے اور اس کے لئے تمہارا تھوڑی دیر کے لئے میرے سامنے بیٹھنا ضروری ہے۔ آؤ گے ناں؟''

اُس نے مسکرا کر محبت بھرے لہجے میں مجھ سے پوچھا۔

میں اُرملا کی محبت کے سرور میں چور ہو چکا تھا۔ میں نے جیسے خواب آمیز لہجے میں کہا۔ ''ضرور آؤں گا اُرملا۔''

اور وہ مسکراتی ہوئی بولی۔ ''میں انتظار کروں گی۔''

اور وہ کوٹھڑی سے نکل گئی۔ اُس کے جانے کے بعد میری حالت اُس مے خوار کی سی تھی جس کی بلانوشی رات بھر جاری رہی ہو اور صبح کے وقت اُس کا خمار ٹوٹ رہا ہو اور وہ مئے گل فام کی جستجو میں بے قرار ہو رہا ہو۔ وہ رات کا پہلا پہر تھا۔ میں نے رات کے پہلے پہر میں ہی آدھی رات کا بے چینی سے انتظار شروع کر دیا کیونکہ اُرملا نے مجھے آدھی رات کے وقت اپنے پاس آنے کو کہا تھا۔ شکستہ قبر کے کھنڈر والے بزرگ کی باتیں میرے ذہن سے بالکل محو ہو چکی تھیں۔

ٹائم بتانے والی رِسٹ واچ میرے پاس تھی نہیں کہ آدھی رات کا پتہ چلتا۔ ہر لحہ یہی محسوس ہوتا تھا کہ بس آدھی رات ہوگئی ہے اور اُرملا سے ملنے چلے جانا چاہئے۔ مگر اُس نے خاص طور پر آدھی رات کا ذکر کیا تھا۔ میرے لئے لیٹنا مشکل ہورہا تھا۔ ذرا کی ذرا لیٹتا اور پھر اُٹھ کر بیٹھ جاتا۔ بار بار کوٹھڑی کا دروازہ کھول کر باہر کھنڈر کے ویران دالان میں اُوپر آسمان پر نگاہ ڈالتا۔ بادلوں نے آسمان کو ڈھانپ رکھا تھا۔ کوئی ستارہ بھی نظر نہیں آرہا تھا کہ آدھی رات کا کچھ اندازہ ہوتا۔

لیلیٰ کے فراق میں مجنوں کی بھی شاید ایسی حالت نہیں ہوئی ہوگی جو میری حالت ہو رہی تھی۔ اُرملا کی محبت پہلی بار اپنی تمام رعنائیوں، ستم رانیوں، لذتوں اور والہانہ پن کے ساتھ مجھ پر طاری ہو رہی تھی۔ معلوم نہیں کب تک میں نیم روشن ویران کوٹھڑی میں اسی طرح ماہی بے آب کی طرح تڑپتا رہا کہ ایک بار باہر دالان میں جھانکنے کے بعد تخت پوش پر آکر سر جھکا کر بیٹھا ہی تھا کہ کوٹھڑی کے باہر کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ میری نگاہیں بے اختیار ہو کر دروازے کی طرف اُٹھ گئیں۔

دوسرے ہی لمحے دروازے میں اُرملا کا نازک بدن ہیولا نمودار ہوا۔ میں اُٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ ''اُرملا......!''

اپنے آپ میری زبان پر یہ نام آگیا۔

''ہاں!'' اُرملا نے ذہن پر جادو کر دینے والی سرگوشی میں کہا اور دوڑ کر مجھ سے لپٹ گئی۔ میں نے تیز تیز سانسوں میں کہا۔

''تم نے بڑا انتظار کرایا اُرملا! مجھے یقین نہیں تھا کہ اب تم خود آؤ گی۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟'' اُرملا نے سر اُٹھا کر کہا۔ ''دیکھ لو! میں خود تمہیں لینے آگئی ہوں۔ آؤ میرے ساتھ۔''

اُس نے میری کمر میں اپنا بازو حمائل کر دیا اور مجھے اپنے ساتھ لے کر باہر دالان میں آگئی۔ میں اُس کے ساتھ یوں چل رہا تھا جیسے مے خوار نشے کی حالت میں چلتا ہے۔ میں اُرملا کے جسم کی گرمی اپنے جسم میں شامل ہوتے محسوس کر رہا تھا۔ محبت کا ایک شعلہ تھا جس کی تپش میں ہم دونوں شعلہ بدن تھے۔

سرنگ والے دروازے کی سیڑھیاں اُتر کر ہم سرنگ میں سے گزرنے لگے۔ اُرملا بھی محبت میں بے خود ہو رہی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ موت کے تجربے نے اُس کے جذبہ محبت میں ایک نئی طاقت، ایک نئی وارفتگی اور لذت اندوزی پیدا کر دی تھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ لگے جھومتے ہوئے نیم تاریک سرنگ میں سے گزر کر مورتی والے دالان میں آگئے۔ وہاں دیوار پر دو لالٹینیں جل رہی تھیں جن کی روشنی میں کالے رنگ کی ایک مورتی نظر آرہی تھی۔ اُس کی لال آنکھیں اور باہر کو نکلی ہوئی سرخ زبان والی شکل بڑی ڈراؤنی لگ رہی تھی۔ مگر اس وقت مجھے ذرا بھی ڈر محسوس نہ ہوا۔ بلکہ اُرملا کی محبت کی گرم جوشی میں اس وقت وہ بدشکل مورتی بھی بڑی اچھی لگ رہی تھی۔

مورتی کے آگے کانسی کی تھالی میں دیا روشن تھا اور لوبان سلگ رہا تھا۔ اُرملا پوجا کرنے والی چوکی پر بیٹھ گئی۔ پوجا کی سامگری والی تھالی اور چوکی کے درمیان ایک طرف ذرا سا ہٹ کر ایک اور چوکی پڑی تھی۔ اُرملا نے کہا۔

''میری جان شیراز! اُس چوکی پر بیٹھ جاؤ۔''

میں چوکی پر بیٹھ گیا۔ سیاہ رنگ کی انگوٹھی اُس نے اپنی اُنگلی میں پہنی ہوئی تھی۔ کہنے لگی۔ ''اس انگوٹھی کی کھوئی ہوئی طاقت اور اصلی رنگ رُوپ کو واپس لانے کے لئے مجھے خاص منتروں کا جاپ کرنا پڑے گا۔ تم بور تو نہیں ہو گے نا؟''

میں نے عالم سرمستی میں کہا۔ ''بالکل نہیں......کبھی نہیں۔''

اُرملا مسکرائی۔ لالٹین کی روشنی میں اُس کے دانت موتیوں کی طرح چمکتے نظر آئے۔ اُس نے انگوٹھی والا ہاتھ اپنی آنکھوں کے سامنے کیا اور منتروں کا جاپ شروع کر دیا۔ میں اپنی جگہ پر بے حس و حرکت خاموش بیٹھا اُرملا کو منتر پڑھتے دیکھتا رہا۔ اُس نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں اور چہرے پر ایک عجیب روغنی چمک سی آگئی تھی۔ کچھ دیر تک وہ منتروں کا جاپ کرتی رہی، پھر اُس نے آنکھیں کھول دیں۔ میری طرف مسکراتے ہوئے دیکھا اور بولی۔

''میرے پیارے شیراز! آدھا عمل ختم ہو گیا ہے۔ آدھا باقی ہے۔ اس کے لئے تمہیں مان سرور جھیل کے پوتر پانی میں اُنگلی ڈبو کر اپنے ہونٹوں کے اُوپر لگانی ہو گی۔ یہ

شکتی دیوتا کی شرط ہے جو پوری کرنی ضروری ہے۔"

میں نے کہا۔ "لاؤ! میں ابھی رسم پوری کر دیتا ہوں۔"

اُرملا نے پہلی بار مجھے میرے پیارے شیرازی! کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ میں انکار کیسے کر سکتا تھا؟ وہ ایک قیامت خیز مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

"چلو...... تم تکلیف نہ کرو۔ میں خود تمہارے ہونٹوں پر پوتر جل لگا دیتی ہوں۔"

پوجا کی سامگری والی کانسی کی تھالی میں ایک چھوٹی سی گڑوی پڑی تھی۔ اُرملا نے گڑوی میں اپنی اُنگلی ڈالی اور مجھ سے کہا۔

"ذرا آگے آ جاؤ!"

میں چوکی پر بیٹھے بیٹھے اپنا منہ اُرملا کے قریب لے گیا۔ وہ پوتر پانی میں بھگوئی ہوئی اُنگلی میرے اُوپر والے ہونٹ اور ناک کے نیچے آہستہ آہستہ پھیرنے لگی۔ ساتھ ساتھ وہ کوئی منتر بھی پڑھتی جا رہی تھی۔ اُس پانی کی بڑی تیز بو تھی۔ میں نے سانس بند کر لی۔ اُرملا منتر پڑھتی اور اُنگلی میرے ہونٹ کے اُوپر والے حصے پر پھیرتی رہی۔ پھر وہ پیچھے ہٹ گئی اور بولی۔

"پیچھے ہٹ کر بیٹھ جاؤ! بس یہی ایک رسم تھی۔ اب تمہیں صرف کچھ دیر ہلے جلے بغیر بیٹھے رہنا ہو گا۔ بیٹھے رہو گے نا شیراز؟"

"تم کہو تو میں ساری زندگی اسی طرح بیٹھا رہوں۔"

وہ ہنس پڑی اور منتروں کا جاپ کرنے لگی۔ انگوٹھی والا ہاتھ اُس نے اپنے چہرے کے آگے کر رکھا تھا اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد اُس پر پھونک مار دیتی تھی۔ میں اُسے پُرشوق نظروں سے دیکھے جا رہا تھا۔ اس دوران مجھے اپنے ناک اور ہونٹ کے درمیان لگائے ہوئے پانی میں سے عجیب سی بو اُٹھتی محسوس ہو رہی تھی۔ میں اُرملا کی محبت میں اس قدر ڈوبا ہوا تھا کہ شروع شروع میں مجھے اس کا زیادہ احساس نہ ہوا۔ لیکن یہ بو لمحہ بہ لمحہ تیز ہو رہی تھی اور اس کی وجہ سے میرا سر دو تین بار اچانک چکرا سا گیا۔ میں نے آنکھیں جھپک کر اپنے آپ کو سنبھال لیا اور اُرملا کو منتروں کا جاپ کرتے دیکھنے میں محو ہو گیا۔ میں اُس کی محبت کے ایک شعلہ صفت پہلو سے پہلی بار روشناس ہوا تھا اور میں دل ہی دل میں اُس وقت کا انتظار کرنے لگا تھا جب ہم بہت جلد بارڈر کراس کر کے پاکستان

پہنچ جائیں گے۔ اور پھر شادی کے بندھن میں بندھ جائیں گے۔

مجھے ایک بار پھر ہونٹوں کے اُوپر لگے ہوئے پانی کی تیز بو کی وجہ سے چکر آ گیا۔ ایک لمحے کے لئے مجھے ایسے لگا جیسے میں بیٹھے بیٹھے گرنے لگا ہوں۔ میں نے جلدی سے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ اُرملا کو بھی شاید میری حالت کا کچھ اندازہ ہو گیا تھا۔ اُس نے منتروں کا جاپ روک کر پوچھا۔

"پیارے شیراز! کیا بات ہے؟ چکر تو آتا محسوس نہیں ہوا؟"

میں نے کہا۔ "ہاں...... کچھ ایسا ہی محسوس ہوا ہے۔"

اُس نے ہنس کر کہا۔ "گھبراؤ نہیں۔ اس پوتر جل میں بڑی طاقت، بڑی شکتی ہے۔ یہی شکتی اب تمہاری انگوٹھی میں واپس آ رہی ہے۔ فکر نہ کرو، دو ایک چکر اور آئیں گے۔ پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

وہ دوبارہ منتر پڑھنے لگی اور میں اپنی جگہ پر ایک بار پھر ساکت ہو گیا۔ لیکن ہلکے ہلکے چکر برابر آ رہے تھے۔ چند لمحوں کے بعد میرے کانوں میں تیز آندھی جیسا شور سا اُٹھنا شروع ہو گیا۔ اس کے باوجود میں اپنے اُوپر ضبط کر کے بیٹھا رہا یہ سوچ کر کہ تھوڑی دیر بعد یہ سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ اس دوران اُرملا نے اپنی نظریں مجھ پر جما دی تھیں اور مسلسل مجھے گھورتے ہوئے منتر پڑھ رہی تھی۔ اُس نے پہلے جو انگوٹھی والا ہاتھ اپنے چہرے کے آگے کر رکھا تھا وہ پیچھے ہٹا لیا تھا۔ جب کانوں میں آندھیوں کا شور زیادہ تیز ہو گیا تو مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں نے اُرملا سے کہا۔

"اُرملا! میرے کانوں میں بڑا شور ہو رہا ہے۔"

مگر مجھے اپنی آواز سنائی نہ دی۔ اس کے ساتھ ہی کانوں میں آندھیوں کا شور ختم ہو گیا اور مجھ پر نیم بے ہوشی سی طاری ہونے لگی۔ میں نے ایک بار پھر اُرملا کو آواز دے کر کہا۔ "اُرملا! لگتا ہے میں بے ہوش ہونے لگا ہوں۔"

لیکن اب میرے لئے بیٹھنا مشکل ہو رہا تھا۔ میں دائیں بائیں ہولے ہولے جھولنے لگا تھا۔ اپنے جسم پر میرا کنٹرول آہستہ آہستہ ختم ہو رہا تھا۔ میں نے اُرملا کو دیکھ کر کچھ کہنا چاہا مگر میرا حلق بالکل سوکھ چکا تھا۔ میری آواز حلق کے اندر ہی خشک ہو کر رہ گئی تھی۔ میں نے دیکھا کہ اُرملا کے چہرے کے تاثرات اب پہلے جیسے نہیں رہے تھے۔ اُس کے

چہرے کی دلفریبی، کرختگی میں بدل گئی تھی۔ چہرے پر خشونت اور غصے کے اثرات نمایاں ہونے لگے تھے۔ کیا واقعی ایسا ہو رہا تھا یا یہ میری نظر کا دھوکہ تھا؟ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ میری سوچنے کی طاقت بھی جیسے آہستہ آہستہ زائل ہونے لگی تھی...... میری آنکھیں اپنے آپ بند ہو رہی تھیں۔ میں اپنی قوتِ ارادی سے خود کو سنبھالے ہوئے تھا اور آنکھیں کھلی رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

میں نے دیکھا کہ اُرملا اپنی چوکی پر سے اُٹھی اور میرے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ پھر اُس نے مجھے آہستہ سے سیاہ فام مورتی کے آگے بالکل سیدھا لٹا دیا۔ میری ٹانگیں سیدھی کر دیں۔ دونوں ہاتھ میرے سینے پر رکھ دیا۔ میں نے اُس سے پوچھنا چاہا کہ وہ ایسا کیوں کر رہی ہے؟ مگر میں اپنی زبان تک نہ ہلا سکا۔ میں نے اُٹھنا چاہا لیکن اپنے جسم کو ذرا سی بھی حرکت نہ دے سکا۔ جس طرح خواب میں کبھی کبھی آدمی کی حالت ایسی ہو جاتی ہے کہ وہ چلنا چاہے تو چل نہیں سکتا۔ لیٹا ہوا ہو تو اُٹھ نہیں سکتا۔ دوڑنے کی کوشش کرے تو دوڑ نہیں سکتا۔ میری حالت بالکل ویسی ہی تھی۔

میری آنکھیں تھوڑی کھلی تھیں۔ میں اُرملا کو دیکھ رہا تھا۔ ابھی تک میں اس وہم میں مبتلا تھا کہ وہ جو کچھ بھی کر رہی ہے یہ اس کی پرارتھنا کی رسم کا ہی ایک حصہ ہے۔ لیکن جب اُس نے اپنی چوکی کے نیچے سے چھری نکال کر اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام کر سیاہ فام مورتی کے آگے دو زانو ہو کر سر جھکایا تو میرے بدن میں بجلی کے کرنٹ کی طرح خوف کی لہر دوڑ گئی۔ میری چھٹی حس نے مجھے آنے والے کسی بھیانک خطرے سے آگاہ کر دیا۔ میں نے جسم کی رہی سہی طاقت کو یکجا کر کے ایک ہی ہلے میں اُٹھنے کی کوشش کی مگر جسم اسی طرح پتھر بنا رہا۔ اُرملا کوئی منتر پڑھ رہی تھی۔ اُس کی آواز مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرح میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔ اُس نے سر اُٹھا کر چھری کو منحوس مورتی کی باہر نکلی ہوئی سرخ زبان کے ساتھ لگائی اور اُٹھ کر مورتی کے گرد منتر پڑھتے ہوئے چکر لگانے لگی۔ میں بے بسی کے عالم میں اُسے دیکھ رہا تھا۔ چکر لگاتے لگاتے وہ دوبارہ مورتی کے سامنے آ کر دو زانو ہو کر بیٹھ گئی۔ چھری اُس کے سیدھے ہاتھ میں تھی۔ لالٹین کی روشنی میں چھری کا پھل چمک رہا تھا۔ میرے کان میں شکستہ قبر والے بزرگ کے الفاظ گونج اُٹھے۔

''جسے تم اُرملا سمجھ رہے ہو، وہ اُرملا نہیں ہے......!''

مجھے اپنا جسم دہشت کے مارے برف کی طرح ٹھنڈا ہوتا محسوس ہوا۔ تو کیا یہ اُرملا نہیں ہے؟ مگر یہ کیسے ہو سکتا تھا؟ نہیں نہیں...... یہ اُرملا ہی ہے اور وہ میری انگوٹھی کی شکتی بحال کرنے کے لئے یہ سب کچھ کر رہی ہے۔ میں اپنے آپ کو یقین دلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میری نظریں اُرملا پر جمی ہوئی تھیں۔ دہشت اور خوف کی وجہ سے میرے اعصاب بیدار ہو گئے تھے مگر جسم میں ہلنے جلنے کی طاقت بحال نہیں ہوئی تھی۔ میں نے پوری طاقت سے اُرملا کو آواز دی۔ مگر آواز میرے حلق سے نہ نکل سکی۔

اُرملا نے چھری اپنے دانتوں میں دبائی اور مورتی کے آگے ماتھا ٹیک دیا۔ پھر سر اٹھایا اور ایک جھٹکے سے اپنے سینے پر سے ساڑھی ہٹا دی اور دانتوں میں سے چھری نکال کر اُس کو اپنے سینے پر گول دائرے کی شکل میں تین چار مرتبہ گھمایا۔ پھر اُس نے گردن موڑ کر میری طرف دیکھا۔ اُس وقت اُس کی آنکھیں کسی خونی کی آنکھوں کی طرح سرخ ہو رہی تھیں۔ چہرہ کرخت ہو کر مسخ سا ہو گیا تھا۔ مجھے پہلی بار اُس سے خوف محسوس ہوا۔ وہ اُٹھ کر میرے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ چھری اُس کے دائیں ہاتھ میں تھی۔ بائیں ہاتھ سے اُس نے میری قمیض کے بٹن کھول کر میرے سینے کو ننگا کر دیا۔ پھر آہستہ آہستہ میرے سینے پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ ساتھ ساتھ وہ کچھ بولتی جا رہی تھی۔ اُس کی آواز مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرح میرے کانوں سے ٹکرا رہی تھی۔ میں صرف اُس کے ہونٹ ہلتے دیکھ رہا تھا۔ جب اُس نے چھری کی نوک میرے دل کے عین اُوپر لگائی تو میرے دماغ میں جیسے بجلی کی کڑک کے ساتھ بادلوں کی گرج کا دھماکہ سا ہوا اور میرا خون جیسے آگ بن کر میری رگوں میں گردش کرنے لگا۔ میں ایک جھٹکے سے اُٹھ بیٹھا۔ اُرملا نے مجھے اس حالت میں دیکھ کر اپنا چھری والا ہاتھ اُوپر اُٹھایا اور پھر پوری طاقت سے میرے سینے پر دل کے اُوپر وار کرنا چاہا لیکن میرے جسم کی طاقت کسی حد تک واپس آ چکی تھی۔ میں نے دھکا دے کر اُرملا کو پرے گرا دیا اور اُٹھ کر تہہ خانے سے اُوپر جانے والی سیڑھیوں کی طرف بھاگا۔

میں زیادہ تیز نہیں دوڑ سکتا تھا۔ جس طرح فلموں میں کسی کو سلو موشن میں دوڑتے دکھایا جاتا ہے میں اس سے زیادہ تیز دوڑ رہا تھا مگر اسے دوڑنا کسی طرح سے بھی نہیں کہا

جا سکتا تھا۔ مجھے اپنے پیچھے اُرملا کی چیخوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں نے دوڑتے دوڑتے گردن موڑ کر پیچھے دیکھا۔ وہ ہاتھ میں چھری لئے میرے پیچھے آ رہی تھی۔ میں نے دل میں کلمہ پاک پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ کسی نہ کسی طرح میں سیڑھیاں چڑھ گیا۔ اُرملا کی بھیانک ڈراؤنی چیخیں میرا پیچھا کر رہی تھیں۔ میں اُوپر والے دالان میں آ گیا اور سیدھا اپنی کوٹھڑی کی جانب دوڑنے لگا۔

میرے ذہن سے اب سارے شکوک وشبہات ختم ہو چکے تھے۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ شکستہ قبر کے پاس ملنے والے بزرگ سچے تھے۔ کوٹھڑی کے پاس جا کر میں نے گردن موڑ کر پیچھے دیکھا۔ اُرملا چھری والا ہاتھ اُوپر اُٹھائے وحشی عورت کی طرح میرے بالکل قریب پہنچ چکی تھی۔ میں چھلانگ لگا کر کوٹھڑی میں گھس گیا اور اندر آتے ہی دروازہ بند کر کے کنڈی لگا دی۔ میرا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ دل اس طرح اُچھل رہا تھا جیسے ابھی سینے سے باہر آ جائے گا۔ میں دوڑ کر تخت پوش کے پاس گیا۔ میں نے بزرگ کا دیا ہوا کپڑے کا پتلا تخت کے نیچے رکھ دیا ہوا تھا اس خیال سے کہ اب اس کی کوئی ضرورت نہیں رہی۔ لیکن اب اسی پتلے نے خدا کے حکم سے میری جان بچائی تھی۔ میں نے پتلا اپنے ہاتھوں میں تھام لیا اور وہیں زمین پر دوزانو ہو کر بیٹھ گیا۔

اُرملا کی چیخوں کی آواز زیادہ ڈراؤنی ہو گئی تھی۔ وہ دروازے کو توڑنے کی کوشش میں لگی تھی۔ خدا جانے اُس میں اتنی طاقت کہاں سے آ گئی تھی؟ کوٹھڑی میں لیمپ روشن تھا۔ میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے کوٹھڑی کے بند دروازے کو تک رہا تھا۔ دروازہ اس طرح دھڑ دھڑا رہا تھا جیسے باہر سے کوئی بڑا طاقتور آدمی اسے توڑنے کی کوشش کر رہا ہو۔ میرے دیکھتے دیکھتے بند دروازے کی کنڈی ٹوٹ کر دُور جا گری۔ پھر دھڑاک سے دروازے کے دونوں پٹ کھل گئے اور اُرملا چھری ہاتھ میں لئے کوٹھڑی میں داخل ہو گئی۔ لیمپ کی روشنی اُس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ اُس کے چہرے پر دہشت برس رہی تھی۔ آنکھیں سرخ انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔ لیکن اُس کی شکل نہیں بدلی تھی۔ اُس کی شکل اُرملا کی ہی تھی۔ اتنی بھیانک شکل میں اُرملا کو میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ دروازے کے پاس ہی رُک گئی تھی اور مجھے خونی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی میری قوتِ گویائی بحال ہو گئی تھی۔ میں نے کہا۔

''میں جانتا ہوں تم اُرملا نہیں ہو۔ اُرملا کبھی میری جان کی دشمن نہیں ہو سکتی۔''

اُرملا کے گلے سے غراہٹ نما آواز نکلی۔ اُس نے چھری والا ہاتھ نیچے کر لیا اور بڑی نرم آواز میں مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

''میں اُرملا ہی ہوں شیراز! تمہاری اُرملا۔ تم مجھے غلط سمجھ رہے ہو۔ میں تمہیں نقصان نہیں پہنچانا چاہتی ہوں۔ میں تو اپنی پرارتھنا کی رسم ادا کر رہی ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''تم جھوٹ بول رہی ہو۔ اگر تم واقعی اُرملا ہی ہو تو وہ انگوٹھی جو تم نے مجھ سے لے لی تھی مجھے واپس کر دو۔ پھر میں یقین کر لوں گا کہ تم میری اُرملا ہی ہو۔''

میں نے اپنی انگوٹھی اُس کی اُنگلی میں دیکھ لی تھی۔ اُس نے اپنی اُنگلی میں پڑی ہوئی انگوٹھی پر ایک نظر ڈالی اور کہنے لگی۔

''شیراز! مجھ پر بھروسہ کرو۔ ابھی اس انگوٹھی کی شکتی واپس نہیں آئی۔ اس کے لئے مجھے تمہارے جسم پر کسی جگہ ہلکا سا زخم لگا کر تمہارے خون میں اس انگوٹھی کو بھگونا ہو گا۔ پھر انگوٹھی کی شکتی واپس آ جائے گی۔ اور میں یہ انگوٹھی تمہیں دے دُوں گی۔''

میں نے کہا۔ ''اگر یہ بات تھی تو تم بھیانک چیخوں کی آوازیں نکالتی میرے پیچھے کیوں دوڑی تھیں؟ یہ بات تم مجھے پہلے بھی سمجھا سکتی تھیں۔''

اُرملا نے بڑے محبت بھرے انداز میں کہا۔ ''تمہارے اُٹھ کر بھاگنے سے میری پرارتھنا ادھوری رہ گئی تھی اور دیوتاؤں نے مجھے وحشی بنا دیا تھا۔ میں کیا کرتی؟ ابھی میری پرارتھنا کی رسم کا اثر ختم نہیں ہوا۔ مجھے اپنے جسم میں سے تھوڑا سا خون نکال کر انگوٹھی کو اُس میں تر کر لینے دو۔ اس کے بعد بے شک انگوٹھی لے لینا۔ یہ تمہاری ہی انگوٹھی ہے، میری نہیں ہے۔''

مگر میرا دل کہہ رہا تھا کہ یہ عورت اُرملا نہیں ہے بلکہ اس کے رُوپ میں وہی میری دشمن جان کانچی ہے جو مجھے اپنی محبت بھری باتوں سے ورغلا کر بلکہ بے وقوف بنا کر اس مندر میں لے آئی ہے اور یہاں مجھے ہلاک کر کے سیاہ فام مورتی کو میرا بلیدان دینا چاہتی ہے تاکہ اس کی کھوئی ہوئی شکتی دیوتا اسے واپس کر دیں اور وہ بے لگام اور بے خوف ہو کر بنی نوعِ انسان کو اور خاص طور پر مسلمان نو جوانوں کو اپنے بہیمانہ ظلم و ستم کا نشانہ بناتی رہے۔ کیونکہ میں ایک مسلمان تھا اور میرے ہاتھوں اُس کی دو جادوگرنی

سہیلیاں ہلاک ہوئی تھیں اور خود اس کی طاقت کو میں نے شکست دی تھی۔ اس کا پتلا میں نے اپنے ہاتھوں میں اس طرح پکڑا ہوا تھا کہ اُسے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے جان بوجھ کر اُسے اُس کی نظروں سے چھپا رکھا تھا۔ میں نے بے دھڑک ہو کر کہا۔

''پہلے میری انگوٹھی واپس کرو۔ پھر مجھے یقین آئے گا کہ تم اُرملا ہی ہو۔''

مجھے معلوم تھا کہ اگر وہ اُرملا ہی ہے تو انگوٹھی واپس کر دے گی۔ لیکن اگر اُرملا نہیں ہے اور کانچی ہے تو انگوٹھی مجھے کبھی واپس نہیں دے گی۔ کیونکہ انگوٹھی مجھے دینے سے وہ مجھ پر قاتلانہ حملہ نہیں کر سکے گی۔ جب میں نے اُسے صاف لفظوں میں بتا دیا کہ جب تک وہ مجھے انگوٹھی واپس نہیں کرے گی میں اُسے اُرملا تسلیم نہیں کروں گا تو وہ غضبناک ہو گئی۔ اُس نے بھیانک آواز حلق سے نکالی اور چھری والا ہاتھ بلند کر کے میری طرف جھپٹی۔ میں اُس کے حملے کے انتظار میں تھا۔ جیسے ہی وہ چھری لہراتی مجھ پر حملہ آور ہوئی، میں نے پتلے کی ایک ٹانگ ایک جھٹکے سے الگ کر دی۔

پتلے کی ٹانگ کے الگ ہوتے ہی اُرملا یعنی کانچی کی ایک ٹانگ بھی اُس کے جسم سے الگ ہو گئی اور وہ الم انگیز چیخ مار کر گر پڑی۔ وہ منہ کے بل گری تھی۔ اُس نے زمین پر سے اپنا چہرہ اُٹھا کر مجھے دیکھا۔ اب وہ اُرملا نہیں تھی۔ اُس کی شکل بدل چکی تھی اور اُس نے کانچی کی اصل شکل اختیار کر لی تھی۔ میرے خدا! اُس کی سیاہ فام ڈراؤنی شکل دیکھ کر میری رُوح کانپ اُٹھی۔ وہ ایک دم سے اُٹھی اور ایک ٹانگ کو گھسیٹتی ہوئی میری طرف بڑھی۔ میں اُچھل کر تخت پوش پر آ گیا اور دوسرے جھٹکے سے پتلے کی دوسری ٹانگ بھی الگ کر دی۔ اس کے ساتھ ہی کانچی کی دوسری ٹانگ بھی اُس کے جسم سے الگ ہو گئی۔ وہ درد کی شدت سے بلبلا رہی تھی مگر میری طرف گھسٹتی ہوئی چلی آ رہی تھی۔ اُس نے لیٹے لیٹے چھری والا ہاتھ بلند کر کے چیخ جیسی آواز کے ساتھ کوئی منتر پڑھا اور چھری میری طرف اُچھالنا چاہتی تھی کہ میں نے تیسرے جھٹکے کے ساتھ پتلے کی گردن اُس کے دھڑ سے الگ کر دی۔ کانچی کی گردن بھی اُس کے جسم سے الگ ہو کر گر پڑی...... اُس کا سر فرش پر لڑھکتا ہوا میرے تخت پوش کے قریب آ گیا۔ مجھ پر دہشت کے مارے کپکپی سی طاری تھی۔ کانچی کی بدشکل سیاہ فام سرخ انگارہ آنکھوں والا سر نیچے فرش پر ایک قدم کے فاصلے پر پڑا تھا۔ اُس کی بے جان مگر ہیبت ناک سرخ آنکھیں مجھے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی

تھیں...... میرے دیکھتے دیکھتے اچانک کانچی کا سر گھومنے لگا۔ گھومتے گھومتے اُس کے بالوں میں آگ لگ گئی۔ پھر اُس آگ کے شعلوں نے اُس کے چہرے کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا اور گھومتے گھومتے اُس کا سر جل کر راکھ ہو گیا اور راکھ فرش پر بکھر گئی۔ میں تخت پر سے چھلانگ لگا کر اُس کے جسم کے باقی ماندہ ٹکڑوں کے پاس آ کر غور سے دیکھنے لگا۔ میں نے دیکھا کہ اُس کے ہاتھ میں اُرملا کی انگوٹھی موجود تھی۔ میں نے جلدی سے اُس کے ہاتھ سے وہ انگوٹھی اُتاری اور اپنی اُنگلی میں پہن لی۔ اُس کا باقی ماندہ دھڑ اور کٹی ہوئی دونوں ٹانگیں سیاہ پڑ چکی تھیں۔ لیمپ کی روشنی میں اُس کی ٹانگوں پر کچھ رینگتا ہوا دکھائی دیا۔ میں نے غور سے دیکھا تو خوف سے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ کانچی کی کٹی ہوئی ٹانگوں پر کیڑے کلبلا رہے تھے۔ میں جلدی سے کوٹھڑی سے باہر نکل گیا اور دالان میں سے دوڑتا ہوا سرنگ کے دہانے پر پہنچ کر پیچھے مُڑ کر دیکھا۔ کوٹھڑی میں سے پہلے دُھویں کے بادل بلند ہوئے، پھر ایک دھماکہ ہوا اور کوٹھڑی میں آگ لگ گئی۔ میں بھاگ کر سرنگ میں داخل ہو گیا۔ سرنگ میں دیوانہ وار دوڑتے ہوئے جنگل میں نکل آیا۔ کچھ دُور تک رات کی تاریکی میں درختوں کی جھاڑیوں میں دوڑتا چلا گیا۔ پھر میری ہمت جواب دے گئی اور میں ایک جگہ گر پڑا......!

OOO

جب میرے ہوش وحواس کچھ بحال ہوئے تو میں اُٹھ کر چل پڑا۔

جنگل میں ڈرا دینے والا سناٹا تھا۔ میرا رُخ اُس شکستہ قبر کی جانب تھا جہاں مجھے وہ بزرگ ملے تھے جنہوں نے مجھے کانچی کے ہاتھوں بلا آئی موت مرنے سے بچا لیا تھا۔ جب میں اُس مقام پر پہنچا جہاں درختوں کے جھنڈ کے اندر قبر والی کھنڈر نما چار دیواری تھی تو مجھے وہاں کوئی ایسی چار دیواری دکھائی نہ دی۔ میں سمجھا کہ میں غلط جگہ پر نکل آیا ہوں۔ مگر جنگل میں خواہ دن ہو یا رات، ایک بار دیکھی ہوئی جگہ مجھے یاد رہتی تھی۔ ایک مدت سے میں جنگلوں کی خاک چھانتا پھر رہا تھا۔ یہ وہی جھنڈ تھا۔ وہی درخت تھے۔ سب کچھ وہی تھا۔ مگر نہ وہ چار دیواری تھی اور نہ اس کے اندر والی قبر تھی۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ سب کچھ کہاں اور کیسے غائب ہو گیا تھا؟ اس سے پہلے بھی میرے ساتھ اس قسم کے دو ایک واقعے ہو چکے تھے اور میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ قدرت کبھی کبھی اپنے بندوں کو کسی نہ کسی ذریعے سے آنے والے حادثوں کے کچھ غیبی اشارے دے دیا کرتی ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اس راز کو میرے جیسا دنیا دار آدمی نہ سمجھ سکتا ہے اور نہ اسے سمجھنے کی کوشش ہی کرنی چاہئے۔

مجھ پر اللہ کا یہی بہت بڑا کرم ہوا تھا کہ مجھے ہمیشہ کے لئے ایک بدرُوح عورت سے نجات مل گئی تھی۔ ہر طرح کے اندیشوں اور خدشات سے میرا ذہن صاف ہو چکا تھا۔ جہاں تک اُرملا کا تعلق تھا اُس کے بارے میں اب میرا یقین پختہ ہو گیا تھا کہ وہ زندہ نہیں ہے اور دریا میں ڈوب کر مر چکی ہے۔ اُس کی المناک موت کا مجھے غم ضرور تھا۔ لیکن میں چاہے کتنا غم کھاتا، کتنا سوگ مناتا، اُرملا واپس نہیں آ سکتی تھی۔

اب میری منزل پاکستان تھی۔ ہندوستان کے جنگلوں میں ایک عرصے تک دُکھ اور مصیبتیں اُٹھانے کے بعد میرا جی اس سرزمین سے بیزار ہو چکا تھا۔ جو رہی سہی کسر تھی وہ

کستان بن جانے کے بعد انڈیا کے ہندوؤں کی مسلم دشمنی نے پوری کر دی تھی۔ ہندو لے بھی مسلمان کا دل سے کبھی دوست اور خیر خواہ نہیں تھا۔ اور اب تو ہندو نے اپنی ومت بنالی تھی اور انڈیا کے مسلمانوں کے ساتھ وہ غلاموں اور اچھوتوں سے بھی بدتر لوک کرنے لگا تھا۔ اور مسلمانوں کے خلاف اُس کی دلی نفرت کھل کر سامنے آ گئی تھی۔ ڈیا کو آزاد ہوئے تین سال تو ہو گئے تھے اور اس دوران ہندو حکومت نے کشمیر اور حیدر باد دکن کی مسلم اکثریت والی ریاستوں پر فوجوں کی چڑھائی کر کے زبردستی قبضہ کر لیا تھا ر وہاں نہتے مسلمانوں کے ساتھ ظلم وستم کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ بارڈر پر اُس کی سکیورٹی رس اور فوج بیٹھی تھی۔ کوئی مسلمان بغیر پاسپورٹ ویزے کے بارڈر کراس کر کے امن سلامتی والی سرزمین پاکستان میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ انڈیا میں صدیوں سے آباد سلمانوں پر بھی عرصہ حیات تنگ کر دیا گیا تھا۔ اُن پر پاکستان کے جاسوس ہونیکا الزام اکر اُنہیں پکڑ کر جیلوں میں ٹھونس دیا جاتا تھا اور پھر اُنہیں جیل کے اندر ہی موت کے ھاٹ اُتار دیا جاتا تھا۔ ہندو حکمرانوں کو کوئی پوچھنے والا نہیں تھا۔

ہندی قومی زبان بن گئی تھی۔ سکولوں میں اُردو کی جگہ ہندی زبان رائج ہو گئی تھی۔ ام دفتری کام ہندی میں ہونے لگا تھا۔ مسلمانوں کے دینی مدرسوں کو تمام شہری اور انونی سہولتوں سے محروم کیا جا رہا تھا۔ اگر مسلمان اس پر احتجاج کرتے تو ہندو لیڈر ہیں برملا کہتے کہ تمہارا پاکستان بن گیا ہے۔ یہاں تمہارے لئے کوئی جگہ نہیں۔ جاؤ! کستان جاؤ۔ یہاں رہنا ہے تو تمہیں ہندو بن کر رہنا ہوگا۔ ان حالات میں مجھے انڈیا کا رڈر کراس کر کے پاکستان پہنچنا تھا۔ یہ اتنا آسان کام نہیں تھا۔ انڈیا کے بارڈر پر کیورٹی فورس اور انڈین فوج دن رات گشت لگاتی تھی۔ چوری چھپے بارڈر کراس کرنے الے پر بے دریغ فائر کھول کر اُسے ہلاک کر دیا جاتا تھا۔ بارڈر کے نزدیک جو شہر تھے ن شہروں میں بھی انڈیا کی سی آئی ڈی کے آدمی سفید کپڑوں میں جگہ جگہ موجود تھے۔ وا کسی پر شک ہوتا تھا تو اُسے پکڑ کر ایسے غائب کر دیا جاتا تھا کہ پھر اُس کا کوئی نام و شان بھی نہیں ملتا تھا۔

میری پوزیشن یہ تھی کہ ایک تو میرے پاس نہ پاسپورٹ تھا، نہ ویزا تھا۔ دوسرے وائے عثمان بھائی کے میرا سارے انڈیا میں کوئی جاننے والا بھی نہیں تھا۔ ایک فادر

فرانسس تھے وہ اس معاملے میں میری کوئی مدد نہیں کر سکتے تھے۔ اس کے علاوہ میرے پاس اتنے پیسے بھی نہیں تھے کہ میں کسی جگہ سے کچھ خرید کر بھوک مٹا سکتا۔ ٹرین میں بغیر ٹکٹ سفر کرنا اب بے حد خطرناک ہو گیا تھا۔ پہلے تو بغیر ٹکٹ کے پکڑا جاتا تھا تو مجھے ٹرین سے اُتار دیا جاتا تھا۔ اب حالات وہ نہیں رہے تھے۔ اب اگر پکڑا جاتا ہوں تو مجھے پاکستانی جاسوس سمجھ کر پولیس کے حوالے کیا جا سکتا تھا اور اس کے بعد میرا نام و نشان تک مٹ سکتا تھا۔ اس عالم بے بسی و مجبوری میں صرف فادر فرانسس ہی ایک ایسے شخص تھے جن سے میں کوئی مشورہ بھی کر سکتا تھا اور جو میری اتنی مدد ضرور کر سکتے تھے کہ میں بمبئی عثمان بھائی تک پہنچ سکوں۔ چنانچہ میں نے فادر فرانسس کی خانقاہ میں جانے کا فیصلہ کرلیا۔

میں اس وقت فادر فرانسس کی خانقاہ سے کالے کوسوں دُور تھا۔ اُن تک پہنچنے کے لئے بھی ٹرین میں ایک دن تک سفر کرنا پڑتا تھا اور میرے پاس پھوٹی کوڑی تک نہیں تھی۔ میں نے اللہ کا نام لے کر گالگا ریلوے سٹیشن کی طرف رُخ کرلیا۔ باقی کی ساری رات اندھیرے جنگل میں سفر کرنے کے بعد آخر گالگا کے ریلوے سٹیشن پر پہنچ گیا۔ آگے کالی گھاٹ تک مجھے بغیر ٹکٹ کے ٹرین میں سفر کرنا تھا۔ یہ بڑا خطرناک مرحلہ تھا مگر اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ ٹرین آئی تو میں اس میں سوار ہو گیا۔ سارا راستہ چوکس رہا۔ جہاں ٹرین تھوڑی دیر کے لئے بھی رُکتی، میں ڈبے میں سے پلیٹ فارم کی بجائے ٹرین کی دوسری جانب اُتر کر کسی جگہ چھپ جاتا۔ ٹرین چلتی تو دوڑ کر ڈبے میں چڑھ جاتا۔ خدا کا شکر ہے کہ مجھ سے کسی نے ٹکٹ کا نہ پوچھا اور میں کالی گھاٹ پہنچ گیا۔

کالی گھاٹ سے میں سیدھا فادر فرانسس کی خانقاہ کی طرف چل پڑا۔ کافی دن گزر چکا تھا جب میں فادر فرانسس کی خانقاہ کے قرب و جوار میں آ گیا۔ یہاں مجھے بڑے احتیاط کی ضرورت تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میرے آنے کی سرسوتی کو خبر ہو۔ چنانچہ میں سیدھے راستے کو چھوڑ کر دوسری طرف ہو گیا اور ایک چکر لگا کر فادر فرانسس کی خانقاہ میں پہنچ گیا۔

فادر فرانسس کو جب میں نے پوری رام کہانی سنائی تو اُنہوں نے سینے پر صلیب کا نشان بناتے ہوئے کہا۔

''میرے بیٹے! خداوند کا تم پر بڑا فضل ہوا ہے کہ تمہیں ہمیشہ کے لئے کانچی جیسی بدرُوح عورت سے نجات مل گئی ہے۔ مجھے تو پہلے ہی شک پڑ گیا تھا کہ یہ اُرملا نہیں ہے بلکہ اُرملا کے رُوپ میں کوئی اور ہی عورت ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ اُرملا بے چاری دریا میں ڈوب کر مرچکی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''اب تو میں بھی اسی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اُرملا اس دنیا میں نہیں ہے۔''

فادر فرانسس بولے۔ ''تم نے پاکستان جانے کا ٹھیک فیصلہ کیا ہے۔ بھارت میں ہندو برہمن کی حکومت قائم ہو گئی ہے۔ انگریز چلا گیا ہے اور ہندو یہاں کے مسلمانوں پر اُن کا جینا حرام کر رہا ہے۔ کیونکہ ہندو، مسلمان کا ازلی دشمن ہے۔ جب تک یہاں انگریز کی حکومت تھی وہ مسلمانوں سے دب کر رہتا تھا۔ انگریز کے چلے جانے کے بعد اب اسے کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔ فوج میں ننانوے فیصد ہندو، سکھ اور ہندو گورکھے اور ڈوگرے اور ہندو مرہٹے ہیں۔ بھارت کی حکومت مسلمانوں کے خلاف من مانی کر رہی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''ان سب حالات نے مجھے مجبور کر دیا ہے کہ میں پاکستان اپنے گھر والوں کے پاس چلا جاؤں۔ لیکن میں یہ سب کچھ سرسوتی سے پوشیدہ رکھنا چاہتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ اُسے میرے پاکستان جانے کے فیصلے کا علم ہو۔ اگر اُسے پتہ چل گیا تو وہ پولیس کو اطلاع دے کر مجھے اذیت ناک موت کے منہ میں دھکیل سکتی ہے۔''

فادر فرانسس نے کہا۔ ''میں جانتا ہوں سرسوتی ایسا ہی کرے گی۔ لیکن تم اطمینان رکھو۔ سرسوتی کو تمہارے جانے کی کانوں کان خبر نہیں ہو گی۔''

وہ رات میں نے فادر فرانسس کی خانقاہ میں چھپ کر بسر کی۔ صبح سورج نکلنے سے پہلے فادر نے میری کوٹھڑی میں آ کر مجھے جگا کر ناشتہ کرایا اور مجھے کچھ روپے دے کر کہا۔

''یہ روپے رکھ لو! میری دُعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔''

میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ یہ شخص کس قدر نیک اور دردمند دل رکھنے والا تھا۔ فادر نے مجھے گلے لگا لیا۔ میں نے اُن کا ہاتھ چوم کر آنکھوں سے لگایا۔ فادر فرانسس نے مجھے دُعا دی اور تاکید کی کہ میں سورج نکلنے سے پہلے پہلے سٹیشن پر پہنچ جاؤں۔ میں خدا حافظ کہہ کر اُن سے رُخصت ہوا اور جنگل میں نصف دائرے کا چکر لگا کر سرسوتی کی حویلی سے گریز کرتا ہوا، کالی گھاٹ کی طرف چل پڑا۔ کالی گھاٹ سے مجھے بمبئی کی سمت

جانے والی ٹرین مل گئی۔ راستے میں گاڑی بدلنی پڑی۔ مگر اب میں بے خوف ہو کر سفر کر رہا تھا کیونکہ میری جیب میں ٹرین کا ٹکٹ تھا۔

بمبئی پہنچ کر مجھے مزید احتیاط سے کام لینا پڑا۔ مجھے اپنے آپ کو سیٹھ کیشو راؤ کے خونخوار جاسوسوں سے بچانا تھا۔ بہر حال میں چھپ چھپا کر عثمان بھائی کی بلڈنگ میں پہنچ گیا۔ عثمان بھائی اپنی کھولی میں ہی تھا۔ مجھے دیکھ کر بڑا حیران ہوا۔ بولا۔

''تم کہاں سے آ گئے؟ کہاں تھے؟ میں تو یہی سمجھ بیٹھا تھا کہ تم زندہ نہیں ہو۔''

مجھے عثمان بھائی کو بھی اپنی داستانِ الم سنانی پڑی۔ وہ بڑی خاموشی سے میری داستان سنتا رہا۔ اس دوران اُس نے کریون اے کی ڈبی میں سے تین سگریٹ پھونک ڈالے۔ چوتھا سگریٹ سلگا رہا تھا کہ میں نے اپنی کہانی ختم کی۔

وہ کہنے لگا۔ ''ٹھہرو...... پہلے میں چائے کا آرڈر دے دُوں۔''

اُس نے کھولی کے باہر گیلری میں کھڑے ہو کر نیچے چائے والے کو بلند آواز میں چائے کا آرڈر دیا اور میرے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ کہنے لگا۔

''تم نے مجھے جو کہانی سنائی ہے مجھے تو یہ الف لیلیٰ کی کہانی لگتی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''عثمان بھائی! یہ سارے واقعات مجھ پر گزر چکے ہیں۔''

وہ حیرت سے بولا۔ ''کمال ہے بھئی۔''

چائے آ گئی۔ ہم چائے پینے لگے۔ عثمان بھائی بولا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ اب تم پاکستان جانا چاہتے ہو۔''

''بالکل۔ ویسے بھی اب میرے لئے اس ملک میں کیا رہ گیا ہے؟ پاکستان میں میرے بہن بھائی ہیں۔ اُن سے جدا ہوئے ایک عرصہ گزر چکا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ میں پاکستان کیسے پہنچوں گا؟ اس سلسلے میں مجھے تمہاری مدد چاہیے۔''

''میری مدد؟'' عثمان بھائی نے بھنویں اُوپر چڑھاتے ہوئے پوچھا۔

میں نے کہا۔ ''تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ میرے پاس کوئی ویزا یا پاسپورٹ نہیں ہے۔ جبکہ دونوں ملکوں کے لوگ بغیر ویزے پاسپورٹ کے ایک دوسرے کے ملک میں آ جا نہیں سکتے۔ میرا پاکستان پہنچنا بھی ضروری ہے۔ تم بمبئی میں بڑا اثر و رسوخ رکھتے ہو۔ سبھی تمہیں جانتے ہیں۔ مل ملا کر کوئی ایسی سبیل نکالو کہ بمبئی کی بندرگاہ سے جو سمندری

جہاز پاکستان نہ سہی شارجہ دُبئی جاتا ہو، اس میں ہی مجھے چھپ چھپا کر کوئی جگہ مل جائے۔''

عثمان بھائی سوچ میں پڑ گیا۔ میں نے کہا۔ ''عثمان بھائی! مجھے یقین ہے کہ اگر تم تھوڑی سی ہمت کرو تو میرا کام بن سکتا ہے۔ خشکی کے راستے بارڈر کراس کرنے میں پکڑے جانے کا خطرہ ہے۔''

عثمان بھائی نے چائے کا آخری گھونٹ پی کر پیالی رکھ دی اور سگریٹ کا کش لگا کر بولا۔ ''میں کوشش کروں گا۔''

دو دن تک عثمان بھائی اسی تگ و دو میں لگا رہا۔ لیکن اُسے کوئی کامیابی نہ ہوئی۔ مایوس ہو کر کہنے لگا۔ ''شیراز بھائی! گودی پر سکیورٹی کا انتظام بڑا سخت ہو گیا ہے۔ مسافروں کے جہاز میں تو جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ ہر مسافر کے کاغذات کو تین چار جگہوں پر چیک کیا جاتا ہے۔ میں نے مال بردار جہاز میں بھی ایک جگہ کوشش کی تھی مگر وہاں بھی کوئی چانس نہیں ہے۔ تمہیں خشکی کے راستے ہی انڈیا کا بارڈر کراس کرنا پڑے گا۔''

میں نے کہا۔ ''خشکی کے راستے امرتسر اور جموں کشمیر سے ہی بارڈر کراس کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ان دونوں جگہوں پر میرا کوئی جاننے والا نہیں ہے۔ میں اکیلا اتنا بڑا خطرہ کیسے مول لے سکتا ہوں؟''

''یہ تو ہے۔'' عثمان بھائی نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

میں نا اُمید ہو گیا۔ عثمان بھائی نے آنکھیں بند کر کے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا لی اور کافی دیر سوچتا رہا۔ پھر آنکھیں کھول دیں اور نیا سگریٹ سلگا کر بولا۔ ''ایک آدمی میرے ذہن میں آیا ہے۔ وہ تمہیں کوشش کر کے بارڈر کراس کرا سکتا ہے۔''

میرے ذہن میں اُمید کی کرن چمک اُٹھی۔ میں نے کہا۔ ''عثمان بھائی! میرا یہ کام کر دو۔ میں تمہارا احسان ساری زندگی یاد رکھوں گا۔''

اُس نے اُنگلی اُوپر اُٹھاتے ہوئے کہا۔ ''ایسی بات پھر نہ کہنا۔ میں تم پر کوئی احسان نہیں کر رہا۔ یہ احسان کی بات بھی نہیں ہے۔ تم مسلمان ہو۔ میں بھی مسلمان ہوں۔ تم پاکستان جا رہے ہو۔ پاکستان ہم انڈیا کے مسلمانوں کی جان ہے۔ میرا فرض ہے کہ میں تمہاری جو بھی مدد کر سکتا ہوں کروں۔ بس...... اب میری بات سنو!''

میں پوری طرح متوجہ ہو گیا۔ عثمان بھائی بولا۔ ''تم کبھی مشرقی پنجاب کے شہر فیروز پور گئے ہو؟''

میں نے کہا۔ ''نہیں بھائی! مجھے فیروز پور جانے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا۔''

وہ کہنے لگا۔ ''کوئی بات نہیں یہاں سے تم ٹکٹ لے کر دِلّی جاؤ گے۔ دِلّی سے تمہیں فیروز پور جانے والی گاڑی مل جائے گی۔ تم فیروز پور چھاؤنی کے سٹیشن پر اُتر جانا۔ فیروز پور چھاؤنی سے تم فاضلکا جانے والی گاڑی پکڑو گے۔ گاڑی چھاؤنی سے چلے گی تو پہلے فیروز پور شہر آئے گا۔ اس کے آگے ایک سٹیشن آتا ہے جس کا نام کھائی ہے۔ یہ معمولی سا سٹیشن ہے۔ یہاں ٹرین سے اُتر جانا۔ سٹیشن کے قریب ہی کھائی گاؤں ہے۔ گاؤں کے باہر ایک پرانا تالاب ہے جس کے پاس ہی ایک تکیہ ہے۔ تکیئے میں کسی سے پوچھ لینا کہ مجھے گڑھ شنکر والے جمال سے ملنا ہے اور مجھے بمبئی والے عثمان بھائی نے بھیجا ہے۔ وہ آدمی تمہیں جمالے کے پاس پہنچا دے گا۔ جمالا اس علاقے کا سب سے بڑا اور بڑا با اثر سمگلر ہے۔ وہ سمگلنگ کا دھندا کرتا ہے اور بارڈر کے دونوں طرف مال لاتا، لے جاتا ہے۔ یہ کام وہ بارڈر پولیس کے ساتھ مل کر کرتا ہے اس لئے اُسے کوئی نہیں پکڑتا۔ میں تمہیں اُس کے نام ایک رقعہ لکھ کر دیتا ہوں۔ یہ رقعہ اُسے دے دینا۔ وہ تمہیں انڈیا کا بارڈر کراس کروا کر پاکستان پہنچا دے گا۔ لیکن ایک بات کا خیال رکھنا! وہ بارڈر ایریا ہے اور وہاں انڈین انٹیلی جنس بہت ہوتی ہے۔ اگر خدا نہ کرے جمالے تک پہنچنے سے پہلے پکڑے گئے تو میرا رقعہ ضائع کر دینا اور پولیس کے آگے میرا نام نہ لینا۔ یہ تمہیں مجھ سے خدا کو حاضر ناظر جان کر وعدہ کرنا ہو گا۔ کیا تم وعدہ کرتے ہو؟''

میں نے فوراً کہا۔ ''میں خدا کو حاضر ناظر جان کر وعدہ کرتا ہوں کہ اگر میں پکڑا گیا تو تمہارا نام زبان پر نہیں آئے گا۔''

''ٹھیک ہے۔ مجھے تمہاری زبان پر اعتبار ہے۔'' اتنا کہہ کر عثمان بھائی نے ایک کاغذ پر چار پانچ سطریں لکھ کر میرے حوالے کیا۔ اس کے اُوپر جمالے کا پورا نام لکھا ہوا تھا مگر نیچے عثمان بھائی نے اپنا نام نہیں لکھا تھا۔ رقعہ میرے حوالے کر کے عثمان بھائی بولا۔

''میں نے جان بوجھ کر نیچے اپنا نام نہیں لکھا۔ کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ تمہاری کسی غلطی یا غفلت کی وجہ سے ہی یہ رقعہ پنجاب پولیس کے ہاتھ لگ جائے۔ اگر ایسا ہو گیا تو

میرے لئے بمبئی میں رہنا ناممکن ہو جائے گا۔ مجھ پر پہلے ہی سے قتل اور ڈکیتی کے چار مقدمے چل رہے ہیں۔''

میں نے رقعہ تہہ کر کے جیب میں رکھ لیا۔ وہ بولا۔ ''دِلّی ایکسپریس بمبئی سے رات نو بجے چلتی ہے۔ تم اس میں سوار ہو کر آج ہی نکل جاؤ!''

جانے سے پہلے عثمان بھائی نے مجھے پچاس روپے دیئے۔ پچاس روپے اُس زمانے میں اچھی خاصی رقم ہوتی تھی۔ رات کو میں دِلّی ایکسپریس میں سوار ہو کر دِلّی کی طرف چل پڑا۔ ایک رات اور ایک دن کے سفر کے بعد میں دِلّی پہنچ گیا۔ وہاں سے فیروز پور جانے والی گاڑی کا پوچھا۔ معلوم ہوا کہ رات کے دس بجے ایک پسنجر ٹرین جاتی ہے۔ میں نے ٹکٹ خریدا اور پلیٹ فارم پر بیٹھ کر دس بجنے کا انتظار کرنے لگا۔ اس وقت رات کے سوا آٹھ بجے تھے۔ کھانا میں نے ٹرین سے اُترنے کے بعد ہی ایک سٹال پر کھڑے ہو کر کھا لیا تھا۔ پونے دس بجے فیروز پور جانے والی ٹرین پلیٹ فارم پر آ کر لگ گئی۔ دوسرے مسافروں کے ساتھ میں بھی اُس میں سوار ہو گیا۔ اُس ٹرین نے مجھے صبح آٹھ بجے فیروز پور چھاؤنی پہنچا دیا۔ ٹرین سے اُتر کر میں نے سٹیشن پر ہی تھوڑا بہت ناشتہ کیا اور فاضلکا جانے والی گاڑی کا انتظار کرنے لگا۔ ٹکٹ میں نے دِلّی ہی سے کھائی کے سٹیشن تک کا خرید لیا تھا۔ عثمان بھائی کا رقعہ میں نے پتلون کی ایک خفیہ جیب میں رکھا ہوا تھا۔ یہ جیب پتلون کے بائیں پائینچے کے اندر ایک جگہ بنی ہوئی تھی۔

فاضلکا جانے والی گاڑی آئی تو میں اُس میں سوار ہو گیا۔ فیروز پور چھاؤنی سے چل کر گاڑی فیروز پور شہر کے سٹیشن پر رُکی۔ وہاں ٹرین میں سے کافی مسافر اُتر گئے۔ اُن میں زیادہ تعداد سکھوں کی تھی۔ میں ڈبے میں ہی بیٹھا رہا۔ اس کے آگے کھائی کا سٹیشن آتا تھا۔ جب گاڑی کھائی کے سٹیشن پر رُکی تو میں ٹرین سے اُتر گیا۔ گاڑی آگے چل دی۔ وہاں میرے علاوہ تین چار سکھ مسافر ہی اُترے تھے جو کسان لگتے تھے۔ ان کے ساتھ ہی میں بھی ٹکٹ چیک کروا کر سٹیشن سے باہر آ گیا۔ ان سے میں نے کھائی گاؤں کے بارے میں پوچھ لیا تھا۔ وہ کسی دوسرے گاؤں جا رہے تھے۔ سٹیشن کے باہر ویرانی سی برس رہی تھی۔ کھائی گاؤں کے دُور کچھ فاصلے پر کچے مکان اور دو چار درخت دکھائی دے رہے تھے۔ میں کھیتوں میں سے گزر کر کھائی گاؤں پہنچ گیا۔ پنجاب کے دوسرے

دیہات کی طرح یہ بھی ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ گاؤں کے باہر ایک پرانا تالاب تھا جس میں بھینسیں نہا رہی تھیں۔ سردیوں کا موسم نکل چکا تھا۔ بہار کا موسم پنجاب میں شروع ہو چکا تھا اور کھیتوں میں سرسوں لہلہا رہی تھی۔

پرانے تالاب کے قریب ہی ایک تکیہ تھا۔ میں وہاں چلا گیا۔ ایک آدمی درخت کے نیچے صف پر بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ سر پر سفید پگڑی بندھی تھی۔ شکل سے وہ مسلمان لگتا تھا۔ وہاں اور کوئی آدمی نہیں تھا۔ میں نے اُس کے مسلمان ہونے کی تصدیق کی خاطر جاتے ہی اُسے السلام علیکم کہا۔ اُس نے حقے کی نے منہ سے ہٹاتے ہوئے وعلیکم السلام کہا۔

میں اُس کے پاس بیٹھ گیا۔ وہ بولا۔ ''کس سے ملنا ہے باؤ جی؟''

میں نے کہا۔ ''مجھے گڑھ شنکر والے جمالے سے ملنا ہے۔''

اُس آدمی نے قدرے رازداری کے انداز میں آہستہ سے پوچھا۔ ''گاؤں میں کسی اور آدمی سے تو جمالے کے بارے میں نہیں پوچھا؟''

میں نے جواب دیا۔ ''میں سٹیشن سے سیدھا یہاں آ رہا ہوں۔ اور صرف آپ ہی سے پوچھا ہے۔''

وہ آدمی بولا۔ ''بات یہ ہے کہ جمالے کو آج دو دن ہوئے پولیس پکڑ کر لے گئی ہے۔ وہ فیروز پور جیل میں ہے۔ کیا کام تھا اُس سے؟''

میں اُسے کیا بتاتا کہ مجھے جمالے سے کیا کام تھا۔ میں نے مزید تصدیق کرنے کی کوشش میں کہا۔ ''کیا واقعی جمالے کو پولیس نے پکڑ لیا ہے؟''

اُس نے کہا۔ ''تو کیا میں جھوٹ بول رہا ہوں؟ مجھے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے؟ گاؤں میں سب کو معلوم ہے۔ کسی سے بھی جا کر پوچھ لو۔''

میں نے کہا۔ ''نہیں نہیں...... میں نے ویسے ہی سوال کر دیا تھا۔ مجھے آپ کی بات پر پورا یقین ہے۔''

''کام کیا تھا؟'' اُس آدمی نے دوبارہ پوچھا۔

میں نے کہا۔ ''بس اُسی سے کام تھا۔ اچھا...... اب میں چلتا ہوں۔''

یہ کہہ کر میں سلام کر کے وہاں سے اُٹھ آیا۔ اس لمحے مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میں انڈیا میں۔ ایک دشمن ملک میں بالکل اکیلا رہ گیا ہوں۔ اُمید کی جو آخری کرن تھی وہ بھی

بجھ گئی تھی۔ کسی اور طرف جانا بیکار تھا۔ اکیلا بارڈر کراس کرنا موت کو دعوت دینے کے برابر تھا۔ اور پھر مجھے بارڈر کے بارے میں کچھ بھی علم نہیں تھا کہ کہاں سے شروع ہو جاتا ہے؟ میں نے اسی لمحے بمبئی واپس جانے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ سوچ کر کہ میں کملا سے ملوں گا۔ اُس کے تعلقات انڈر گراؤنڈ بمبئی کے جرائم پیشہ لوگوں سے بھی تھے۔ وہ ویسے بھی بڑی دلیر قسم کی عورت تھی۔ وہ اپنے اثر و رسوخ سے کام لے کر مجھے دُبئی جانے والے کسی نہ کسی جہاز میں ضرور بٹھا دے گی۔ چنانچہ میں واپس سٹیشن کی طرف چل پڑا۔ دُور دُور تک کھیت ہی کھیت تھے۔ کہیں فصل اُگی ہوئی تھی، کچھ کھیت ویران پڑے تھے۔ عثمان بھائی نے مجھے بتایا تھا کہ انڈیا کا بارڈر، کھائی گاؤں سے زیادہ دُور نہیں ہے۔ چلتے چلتے مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ دُور سے بارڈر کا جائزہ لیا جائے؟

اتنا مجھے اندازہ تھا کہ پاکستان میری دائیں جانب ہے۔ ظاہر ہے بارڈر بھی اسی طرف ہوگا۔ میں کھیتوں میں دائیں جانب ہو گیا۔ یہ میری حماقت تھی۔ مجھے بارڈر ایریا کے حساس عاقہ ہونے اور اس کی سنگینی کا علم نہیں تھا۔ بظاہر دُور دُور تک کوئی آدمی نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں کافی دُور تک چلتا گیا۔ ایک جگہ مجھے ایک سکھ کسان کھیت میں فصل کاٹتا دکھائی دیا۔ میں اُس کے قریب سے گزرا تو اُس نے نظریں اُٹھا کر میری طرف دیکھا اور دوبارہ فصل کاٹنے میں مصروف ہو گیا۔ ایک فوجی جیپ بارڈر کی طرف جا رہی تھی۔ اچانک مجھے محسوس ہوا کہ میں نے اس طرف آ کر سخت غلطی کی ہے۔ میں وہیں سے واپس مُڑا اور سٹیشن پر آ گیا۔

ایک آدمی سے دِلّی جانے والی گاڑی کا پوچھا تو اُس نے کہا۔ ''دِلّی جانے والی گاڑی آ کر چلی گئی ہے۔ اب دوسری گاڑی دوپہر کے بعد آئے گی۔ تم بس میں سوار ہو کر فیروز پور چلے جاؤ۔ وہاں سے تمہیں دِلّی جانے والی گاڑی مل جائے گی۔''

مجھے بھوک لگ رہی تھی۔ صبح سے کچھ نہیں کھایا پیا تھا۔ میں بسوں کے اڈے پر آ گیا۔ وہاں ایک چائے کی دُکان پر ناشتہ کرنے لگا۔ میں دُکان کے باہر بنچ پر بیٹھا ناشتہ کر رہا تھا کہ ایک سکھ نے قریب سے گزرتے ہوئے مجھے نظر بھر کر دیکھا۔ میں نے بھی اُسے دیکھا۔ دیکھتے ہی میں نے اُسے پہچان لیا۔ یہ وہی سکھ تھا جسے تھوڑی دیر پہلے میں نے کھیت میں فصل کاٹتے دیکھا تھا۔ وہ آگے نکل گیا تھا۔ مجھے کہیں نظر نہ آیا۔

اتنے میں فیروز پور جانے والی بس تیار ہوگئی۔ میں ٹکٹ لے کر اُس میں سوار ہو گیا۔
بس فیروز پور کی طرف چلی تو اچانک میری نظر اُسی سکھ پر پڑ گئی۔ وہ بھی اُسی بس میں سوار تھا۔ اس لمحے مجھے احساس ہوا کہ میں نظروں میں آ گیا ہوں اور میرا پیچھا کیا جا رہا ہے۔ تب مجھے یہ احساس بھی ہوا کہ مجھ سے بارڈر کی طرف جا کر بہت بڑی حماقت ہوگئی ہے۔

مگر تیر، کمان سے نکل چکا تھا۔ اب مجھے اس تیر کا نشانہ بننے سے اپنے آپ کو بچانا تھا۔ بس فیروز پور کی طرف بھاگی جا رہی تھی۔ وہ سکھ سی آئی ڈی کا آدمی ہی ہو سکتا تھا۔ وہ مجھ سے آگے کھڑکی کے پاس بیٹھا تھا۔ میں کافی پیچھے بس کے دروازے کے قریب ہی بیٹھا تھا۔ میرا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا۔ فیروز پور شہر قریب آتا جا رہا تھا۔ مجھے فیروز پور پہنچنے سے پہلے پہلے فرار کی کوئی تدبیر سوچ لینی چاہئے تھی۔ دونوں جانب سرسوں کے کھیت تھے۔ کھیتوں میں کہیں کہیں کوئی آدمی دکھائی دیتا تھا۔ ابھی شہروں اور دیہات کی آبادی اتنی زیادہ نہیں ہوئی تھی جتنی آج کل بڑھ چکی ہے۔ بس فیروز پور شہر میں داخل ہوگئی تھی۔ بازاروں میں کوئی رش نہیں تھا۔ بس ایک بازار کا موڑ گھومی تو اُس کی رفتار دھیمی ہوگئی۔ میں اسی لمحے کا انتظار کر رہا تھا۔ اور اس سے پہلے ہی اپنی سیٹ چھوڑ کر بس کے دروازے کے بالکل ساتھ والی سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا تھا۔ جیسے ہی بس کی رفتار دھیمی ہوئی، میں بس کے دروازے میں سے باہر کود گیا۔ میں اس طرف منہ کر کے کودا تھا جس طرف بس جا رہی تھی۔ اس کی وجہ سے میں گرنے سے بچ گیا اور چھ سات قدم بس کے ساتھ ہی دوڑتا چلا گیا۔ بس آگے نکل گئی۔ میں نے دیکھا کہ بس اچانک رُک گئی اور اس کے اگلے دروازے میں سے سی آئی ڈی والا سکھ جو میرا پیچھا کر رہا تھا جلدی سے نیچے اُتر پڑا۔ اُس نے مجھے بس کے دروازے سے باہر چھلانگ لگاتے شاید دیکھ لیا تھا۔ میں ایک گلی میں گھس گیا اور تیز تیز قدم اُٹھاتا گلی میں آگے چلا گیا۔ آگے جا کر گلی بائیں طرف مڑ جاتی تھی۔ میں بھی بائیں طرف مُڑ گیا۔ گلی میں مکان اس طرح کے تھے کہ اُن کے نیچے دُکانیں نہیں تھیں۔ گلی خالی پڑی تھی۔ میرا خیال تھا کہ گلی آگے کسی دوسرے بازار میں نکل جائے گی اور میں اس طرف سے نکل کر کسی اور جانب جا کر چھپ جاؤں گا۔

لیکن یہ دیکھ کر میرا دل دھک سے رہ گیا کہ گلی آگے جا کر بند ہوگئی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ سی آئی ڈی والے نے مجھے اس گلی میں گھستے دیکھ لیا ہے اور وہ بھی میرے پیچھے پیچھے

اسی گلی میں آ رہا ہوگا۔ میں پھنس گیا تھا۔ آگے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ کونے والے مکان کی ڈیوڑھی کا دروازہ تھوڑا سا کھلا تھا۔ مجھے اور کچھ نہ سوجھا اور جلدی سے مکان کی ڈیوڑھی میں داخل ہو کر دروازہ بند کر کے کنڈی لگا دی۔ میری سانس پھول رہی تھی۔ اُوپر مکان کے کسی کمرے سے کسی کے کچھ اُونچی آواز میں پڑھنے کی آواز آ رہی تھی۔ میں نے غور سے سنا۔ کوئی آدمی گربانی کا پاٹھ کر رہا تھا۔ یہ کوئی سکھ ہی ہو سکتا تھا۔ مجھے باہر گلی میں تیز تیز چلنے کی آواز سنائی دی۔ انٹیلی جنس والا گلی میں آ گیا تھا۔ اور اب میرا گرفتار ہو جانا یقینی تھا۔

ان لوگوں کے پاس پستول ضرور ہوتا ہے جسے انہوں نے لباس کے اندر کسی جگہ چھپایا ہوتا ہے۔ میں نہتا تھا۔ وہ بڑی آسانی سے مجھے قابو کر سکتا تھا۔ میں بے دھڑک ہو کر سیڑھیاں چڑھ گیا۔ اُوپر والے کمرے کا دروازہ بند تھا اور دوسری طرف سے گربانی پڑھنے کی آواز اب صاف سنائی دے رہی تھی۔ دروازے کو اندر سے کنڈی نہیں لگی تھی۔ میں نے اسے ذرا سا دھکیلا تو وہ کھل گیا۔ معمولی سامان والا چھوٹا سا کمرہ تھا۔ ایک سردار جی جن کی عمر پچاس پچپن کے قریب ہوگی، پلنگ پر بیٹھے گربانی کی چھوٹی سی کتاب ہاتھ میں تھامے جسے گٹکا کہتے ہیں، آہستہ آہستہ جھوم کر شبد کیرتن کر رہے تھے۔ جیسے ہی میں اندر داخل ہوا، سردار جی نے گردن موڑ کر میری طرف دیکھا۔ ایک اجنبی کو اپنے مکان میں اچانک اپنے سامنے دیکھ کر اُن کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ میں نے ایک سیکنڈ بھی انتظار نہ کیا اور کہا۔

''سردار جی! میں مسلمان ہوں۔ میرے پیچھے پولیس لگی ہے۔ میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ اس وقت مجھے بچا لیں۔ بعد میں، میں آپ کو سب کچھ بتا دُوں گا۔''

سردار جی کی آنکھوں میں، میں نے انسانی ہمدردی اور شفقت کی ایک چمک سی دیکھ لی تھی۔ شاید یہ گربانی کے پوتر شبدوں کا اثر تھا یا سردار جی کا مزاج ہی ایسا تھا۔ وہ گربانی کا گٹکا ایک طرف رکھ کر پلنگ پر سے اُٹھے۔ سردار جی نے پگڑی نہیں باندھی ہوئی تھی۔ اُنہوں نے سر کو تولئے سے ڈھانپا ہوا تھا۔ پلنگ سے اُتر کر اُنہوں نے مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور مجھے مکان کی تیسری منزل پر لے گئے۔ یہاں بھی ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ اس کمرے کے اندر ایک چھوٹی کوٹھڑی تھی جہاں ایک پرانے ٹائپ کا بڑا پلنگ

بچھا ہوا تھا۔ سردار جی نے مجھے پلنگ کے نیچے چھپ جانے کو کہا اور بولے۔

''خاموش رہنا!''

وہ باہر نکل گئے اور کوٹھڑی کا دروازہ بند کر دیا۔ میں گھپ اندھیرے میں پلنگ کے نیچے بالکل سیدھا لیٹا تھا۔ پہلے تو مجھے کچھ بھی دکھائی نہ دیا، پھر دروازے کی درزوں میں سے جو دن کی ہلکی ہلکی روشنی اندر آ رہی تھی، اس میں مجھے کوٹھڑی کا بند دروازہ نظر آنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی گلی میں کسی نے دروازے کی کنڈی زور سے کھٹکھٹائی۔ مجھے نچلی منزل سے آتی سردار جی کی آواز سنائی دی۔

''کون ہے؟'' اُنہوں نے بڑے نرم لہجے میں آواز دے کر پوچھا۔ نیچے سے کسی مرد کی آواز آئی۔

''ذرا نیچے آئیں۔''

کچھ دیر خاموشی چھائی رہی، پھر ڈیوڑھی کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور میرے محسن سردار صاحب نے پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟''

دروازہ کھٹکھٹانے والا آدمی انٹیلی جنس والا ہی ہو سکتا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد اُس کی باتوں سے یہ ثابت بھی ہو گیا۔ اُس نے کہا۔

''ایک بڑا خطرناک پاکستانی جاسوس حوالات سے بھاگ نکلا ہے۔ وہ اس گلی میں داخل ہوا تھا۔ آپ کے مکان میں تو نہیں آیا؟''

سردار جی نے جواب میں کہا۔ ''یہاں تو گرمکھو! کوئی نہیں آیا۔''

سی آئی ڈی والے کی آواز آئی۔ ''ہو سکتا ہے آپ کو پتہ ہی نہ ہو اور وہ مکان میں کسی جگہ چھپ گیا ہو۔''

سردار جی بولے۔ ''بادشاہو! اگر کوئی مکان میں داخل ہوا ہوتا تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ مجھے خبر ہی نہ ہوتی۔ میں نے کوئی بھنگ تو نہیں پی ہوئی۔''

انٹیلی جنس والے نے کہا۔ ''سردار صاحب! یہ نیشنل سکیورٹی کا معاملہ ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں مکان کے اندر ایک نظر ڈالنا چاہتا ہوں۔''

نیشنل سکیورٹی کا نام آیا تو سردار جی بھی مجبور ہو گئے۔ کہنے لگے۔

''دیکھ لو بھائی! اگر تمہیں کوئی شک ہے تو اپنا شک دُور کر لو۔ آ جاؤ!''

میں نے اپنے دل کی دھڑکن تیز ہوتی محسوس کی۔ سردار جی ایک بہت بڑے خطرے کو اُوپر لے آئے تھے۔ مگر وہ بھی مجبور تھے۔ انٹیلی جنس والے نے ضرور اُنہیں اپنا سرکاری شناختی کارڈ دکھایا ہوگا۔ سردار جی انکار نہیں کر سکتے تھے۔

میں پلنگ کے نیچے دم بخود سا ہو کر سیدھا لیٹا رہا۔ مجھے نچلی منزل سے چیزوں کو اِدھر اُدھر کرنے کی آوازیں آئیں، پھر سیڑھیوں پر دو آدمیوں کے اُوپر چڑھنے کی آواز آئی۔ دونوں اس کمرے میں آ گئے جس کی اندھیری کوٹھڑی میں، میں پلنگ کے نیچے لیٹا ہوا تھا۔ میں نے اپنا سانس روک لیا۔ سردار جی بولے۔

''اُوپر کوئی آتا تو مجھے پتہ نہ چلتا؟ میں تو نیچے بیٹھا گربانی کا جاپ کر رہا تھا۔''

دوسرے آدمی کی آواز آئی۔ ''سردار جی! ہمیں بھی تو اپنی کارروائی پوری کرنی ہوتی ہے نا۔ وہ میرے سامنے اس گلی میں داخل ہوا تھا۔ اور گلی آگے سے بند ہے۔''

سردار جی نے کہا۔ ''ہو سکتا ہے وہ کسی دوسرے گھر میں گھس گیا ہو۔''

انٹیلی جنس والے نے پوچھا۔ ''اس کوٹھڑی میں کیا ہے؟''

''کچھ نہیں۔ پرانے کپڑے لتے پڑے ہیں۔''

پھر کوٹھڑی کا دروازہ کھل گیا۔ اندر دن کی روشنی پھیل گئی۔ میں اپنی جگہ پر ساکت ہو گیا۔ سردار جی نے کہا۔ ''گرمکھو! یہاں کوئی نہیں آیا۔ وہ ضرور کسی دوسرے مکان میں بڑھ گیا ہے۔''

اس کے ساتھ ہی دروازہ بند ہو گیا اور کوٹھڑی میں اندھیرا چھا گیا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ مجھے انٹیلی جنس والے کی آواز سنائی دی۔

''وہ نوجوان سا لڑکا ہے۔ اتنی زیادہ عمر نہیں ہے۔ پتلون بش شرٹ میں ہے۔ اگر اِدھر آ جائے تو اُسے باتوں میں لگا کر مکان پر ہی رکھنا اور پولیس سٹیشن خبر کر دینا۔''

سردار جی بولے۔ ''آپ فکر نہ کریں۔''

اُن کے سیڑھیاں اُترنے کی آواز آئی۔ پھر کچھ ہی دیر بعد نیچے ڈیوڑھی کا دروازہ بند کرنے اور اندر سے دروازے کی کنڈی لگانے کی آواز آئی۔ میرے اُوپر سے جیسے کسی نے بہت بڑا بوجھ اُٹھا لیا تھا۔ مگر میں پلنگ کے نیچے اسی طرح سیدھا لیٹا رہا۔ چند لمحوں کے بعد کوٹھڑی کا دروازہ کھلا اور سردار جی کی آواز آئی۔

''باہر نکل آؤ......مصیبت ٹل گئی ہے۔''

سردار جی نے محض میری بات پر یقین کر کے اپنے لئے بھی ایک بہت بڑی مصیبت مول لے لی تھی جو قدرت نے ٹال دی تھی۔ میں پلنگ کے نیچے سے نکل آیا۔ سردار جی نے مجھے اپنے ساتھ پلنگ پر بٹھا لیا اور مجھے غور سے دیکھنے لگے۔ اُن کی آنکھوں میں مجھے وہی مشفقانہ نرمی نظر آ رہی تھی۔ اُن کی آنکھوں میں انسانی ہمدردی اور رحم دلی کی روشنی تھی۔ میں سردار جی کی اس انسان دوستی سے بے حد متاثر ہوا۔ سردار جی نے پوچھا۔

''مجھے صاف صاف بتا دو۔ کیا تم سچ مچ پاکستانی جاسوس ہو؟ دیکھو! یہ میرا ملک ہے۔ مجھے اپنے ملک سے محبت ہے۔ میں اپنے ملک کو نقصان پہنچتے نہیں دیکھ سکتا۔ تم نے آتے ہی کہا تھا کہ میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ میں نے تمہارے چہرے سے بھی پڑھ لیا تھا کہ تم سچ کہہ رہے ہو۔ اب مجھے بتاؤ کہ اصل قصہ کیا ہے؟ تم کون ہو اور پولیس کی سی آئی ڈی تمہارے پیچھے کیوں لگی ہوئی ہے؟''

میں نے مختصر لفظوں میں سردار جی کو اپنی ساری کہانی بیان کر دی۔ وہ بڑے غور سے سنتے رہے۔ جب میں اپنی رُوداد بیان کر چکا تو سردار جی چپ ہو گئے۔ اُنہوں نے سر جھکا لیا اور جیسے میرے بیان کردہ واقعات پر غور کرنے لگے۔ پھر سر اُٹھا کر بولے۔

''اگر جو کچھ تم نے بیان کیا ہے وہ سچ ہے تو پھر میں نے تمہاری مدد کر کے کوئی غلطی نہیں کی۔''

میں نے سردار جی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔ ''میں آپ کی یہ بھلائی اور احسان زندگی بھر یاد رکھوں گا۔ اگر میں پکڑا جاتا تو نہ جانے میرا کیا حشر ہوتا۔''

سردار جی بولے۔ ''واہگورو جو کرتے ہیں ٹھیک ہی کرتے ہیں۔ اب تم کیا چاہتے ہو؟''

میں نے کہا۔ ''بس، میں کسی طرح پاکستان پہنچنا چاہتا ہوں۔''

سردار جی کہنے لگے۔ ''اس کام میں، میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ تمہیں اپنے مکان میں چھپائے رکھنے کا خطرہ بھی مول نہیں لے سکتا۔ کیونکہ میرا مکان انٹیلی جنس والوں کی نظر میں آ گیا ہے۔ میں تمہارے لئے اتنا کر سکتا ہوں کہ تمہیں فیروز پور سے دِلّی کی طرف جانے والی گاڑی میں سوار کرا دوں اور تم اس شہر کی انٹیلی جنس اور پولیس والوں کے جال سے نکل جاؤ۔''

میرے لئے یہ بھی بہت تھا۔ میں اس وقت یہی چاہتا تھا کہ جس طرح بھی ہو سکے، میں پولیس اور سی آئی ڈی کی نظروں سے چھپ کر فیروز پور شہر کی طرف نکل جاؤں۔ میں نے کہا۔ ''اگر آپ مجھے یہاں سے نکال دیں تو یہ بھی آپ کی بہت مہربانی ہو گی۔''

سردار جی پلنگ سے اُٹھے اور کہنے لگے۔

''تو پھر ایسا کرو کہ اسی کوٹھڑی میں آرام کرو۔ میرے بچے گورداسپور گئے ہوئے ہیں۔ میں گھر میں اکیلا ہوں۔ اپنے لئے جو تھوڑا بہت پکا لیتا ہوں، تمہارے لئے بھی ساتھ ہی پکا لوں گا۔ غسل خانہ کوٹھڑی کے باہر کمرے کے کونے میں ہے۔ لیکن اس کوٹھڑی سے اور ساتھ والے کمرے سے باہر قدم نہ رکھنا۔''

میں نے کہا۔ ''میں آپ کی ہدایت پر پورا عمل کروں گا۔''

سردار جی کوٹھڑی کا دروازہ بند کر کے چلے گئے۔ میں پلنگ پر لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ ذہن میں گزرے ہوئے واقعات کی فلم چلنے لگی۔ بار بار اُرملا کی یاد آتی تھی۔ اُس کی موت نے میرے دل سے کسی دوسری عورت سے محبت کرنے کی خواہش کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نکال دیا تھا۔ پھر سوچنے لگا کہ پاکستان کیسے پہنچوں گا؟ سردار جی نے تو بڑی مہربانی کی ہے کہ مجھے ایک بہت بڑی آفت سے بچا لیا ہے۔ لیکن اب میں کہاں جاؤں گا؟ کس سے مدد طلب کروں گا؟ ذہن مختلف خیالات میں اُلجھا ہوا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کوئی واضح نتیجہ سامنے نہیں آ رہا تھا۔

دوپہر کو سردار جی خود میرے لئے کھانا لے کر آئے۔ تنوری روٹیاں تھیں۔ ساتھ بینگن کی بھاجی تھی۔ کہنے لگے۔ ''میں بینگن کی بھاجی بہت اچھی پکا لیتا ہوں۔ تمہیں پسند آئے گی۔ روٹیاں میں نے مائی کے تنور سے منگوائی تھیں۔''

بینگن کی بھاجی بڑی اچھی تھی۔ میں نے بے دِلی سے کھائی۔ مگر سردار جی کے آگے اُس کی تعریف ضرور کی۔ یہ اُن کا حق تھا۔ کہنے لگے۔

''فیروز پور سے رات کے وقت ایک گاڑی دِلّی جاتی ہے۔ میں تمہیں اس میں بٹھا دوں گا۔ آگے اپنا بندوبست تمہیں خود کرنا ہو گا۔''

میں نے کہا۔ ''بڑی مہربانی ہے۔''

سردار جی جیسے کچھ سوچنے لگے۔ پھر بولے۔ ''دِلّی جا کر تم کیا کرو گے؟ پاکستان کیسے

پہنچو گے؟ تمہیں سٹیشن پر اُتر کر بڑا چوکس رہنا پڑے گا۔ فیروز پور کی پولیس اور انٹیلی جنس نے امرتسر، انبالہ، میرٹھ اور دِلّی کی پولیس کو ضرور تمہارے بارے میں خبردار کر دیا ہو گا۔ ہر سٹیشن پر سی آئی ڈی موجود ہو گی اور تمہیں تلاش کرے گی۔ تمہارا حلیہ بھی اُنہیں بتا دیا گیا ہو گا۔''

سردار جی غلط نہیں کہہ رہے تھے۔ اب میرے لئے آگے خطرہ ہی خطرہ تھا۔ بارڈر کی طرف جانے کی حماقت نے مجھے بہت بڑی مصیبت میں پھنسا دیا تھا۔ میں نے کہا۔

''بس دِلّی سے آگے بمبئی نکل جانے کی کوشش کروں گا۔ وہاں میرا ایک مسلمان دوست ہے جس کے بارے میں، میں نے آپ کو بھی بتایا تھا۔ اُس کے پاس مجھے پناہ مل جائے گی۔ جب ذرا خطرہ کم ہو جائے گا تو سمندری جہاز کے ذریعے پاکستان پہنچنے کی کوشش کروں گا۔''

سردار جی خاموش رہے۔ میں نے خدشے کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''فیروز پور سٹیشن پر بھی تو انٹیلی جنس کا خطرہ ہو گا۔''

سردار جی بولے۔ ''یہ خطرہ تو مول لینا ہی پڑے گا۔'' پھر جیسے اُنہیں کوئی خیال آ گیا۔ میری طرف دیکھ کر کہا۔ ''دِلّی میں میرا ایک دوست رگھبیر سنگھ ہے۔ وہ مجھ سے تین سال چھوٹا ہے۔ وہ دِلّی میں ہمارے ایک بڑے گردوارے گورو تیغ بہادر میں کڑاہ پرشاد تقسیم کرتا ہے۔ میں تمہیں رگھبیر سنگھ کے نام ایک خط لکھ دوں گا۔ تم اُس سے جا کر ملو۔ وہ تمہاری مشکل کا کوئی نہ کوئی حل ضرور نکال لے گا۔ گردوارہ گورو تیغ بہادر، دِلّی ریلوے سٹیشن کے قریب ہی چوک فوارہ میں ہے۔''

مجھے یاد آ گیا۔ میں نے کہا۔ ''میں نے وہ گوردوارہ دیکھا ہوا ہے۔''

سردار جی بولے۔ ''بس وہاں جا کر کسی سے سیوادار رگھبیر سنگھ کا پوچھ لینا۔ اُس کو میرا خط دے دینا۔ مگر خبردار یہ خط کسی دوسرے کو مت دکھانا۔''

پھر وہ مجھے دوسری منزل والے اپنے کمرے میں لے گئے۔ وہاں پلنگ پر بیٹھ کر اُنہوں نے گورمکھی میں ایک رقعہ لکھ کر اُسے لفافے میں ڈالا، لفافے کو گوند لگا کر اچھی طرح سے بند کیا اور مجھے دے کر کہا۔

''یہ خط صرف سیوادار رگھبیر سنگھ ہی کو جا کر دینا۔ اور اُسے میرا ست سری اکال بھی

بولنا۔ میرا دل کہتا ہے کہ وہ تمہاری مدد کر سکتا ہے۔ اُس کا اثر و رسوخ بڑی دُور تک ہے۔''

میں نے لفافہ لے کر اُسے دُہرا کر کے اپنی پتلون کی جیب میں رکھ لیا۔ اس وقت مجھے خیال آیا کہ میرے پاس ایک اور رقعہ بھی ہے جسے بمبئی والے عثمان بھائی نے مجھے گڑھ شنکر والے جمال کے نام لکھ کر دیا تھا اور جو میں نے اپنی پتلون کی پائینچے کی خفیہ جیب میں تہہ کر کے چھپا لیا تھا۔ اُس وقت میں نے سردار جی کے سامنے خط کھول کر ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا۔ جب وہ تھوڑی دیر کے لئے نیچے گئے تو میں نے پتلون کے پائینچے میں سے وہ رُقعہ نکال کر پرزے پرزے کر کے کونے میں رکھے ہوئے کوڑا دان میں پھینک دیا۔ اگر میں پکڑا جاتا اور میری جامہ تلاشی کے بعد یہ خط پولیس کے ہاتھ آ جاتا تو میرا پاکستانی جاسوس ہونا ثابت ہو جاتا۔ کیونکہ وہ یہی سمجھتے میرے تعلقات بارڈر ایریا کے سمگلروں کے ساتھ تھے جن کی مدد سے میں سرحد کے پار آتا جاتا تھا۔

فیروز پور سے جو گاڑی دِلّی جاتی تھی وہ رات کے ڈیڑھ بجے چلتی تھی اور فیروز پور شہر سے تیار ہوتی تھی۔ سردار جی نے بتایا۔

''یہ ٹرین پاکستان بننے سے پہلے لاہور سے آیا کرتی تھی۔ پاکستان بن جانے کے بعد اب یہ گاڑی فیروز پور ہی سے تیار ہوتی ہے۔ ہمیں رات کو ٹھیک ایک بجے سٹیشن پر پہنچ جانا ہو گا۔ کیونکہ یہ ٹرین ٹھیک وقت پر چلتی ہے۔''

میں نے ایک بار پھر اپنے خدشات کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کے مکان کے باہر یا گلی کے باہر سی آئی ڈی کا آدمی نگرانی کے لئے بیٹھا ہو اور جب ہم گلی سے باہر نکلیں تو وہ ہمارا پیچھا شروع کر دے۔''

سردار جی کہنے لگے۔ ''ضرور نگرانی ہو رہی ہو گی۔ اور گلی کے باہر سی آئی ڈی کا بھی کوئی نہ کوئی آدمی رات کو چھپ کر بیٹھا ہو گا۔ مگر میں نے اس کا حل سوچ لیا ہے۔ میرے مکان کی داہنی دیوار کے ساتھ دو مکان خالی پڑے ہیں۔ دوسرے مکان کا دروازہ جس گلی میں کھلتا ہے اُس کا اس گلی اور اس بازار سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ دوسرا محلّہ ہے۔ ہم رات کی تاریکی میں دونوں مکانوں کی چھتوں پر سے ہوتے ہوئے دوسرے محلے والی گلی کی طرف سے نکل جائیں گے۔ ریلوے سٹیشن یہاں سے زیادہ دُور نہیں ہے۔ ہم کھیتوں میں سے گزر کر جائیں گے۔ رات کی تاریکی میں کسی کی نظر ہم پر نہیں پڑے گی۔''

رات دس بجے میں نے اور سردار جی نے کھانا کھایا۔ اُنہوں نے پوچھا۔

''تمہارے پاس پیسے ہیں؟ ٹکٹ تو میں نے دوپہر کو ہی منگوا لیا تھا۔''

میں نے اُنہیں بتایا کہ بمبئی والے عثمان بھائی نے مجھے کافی پیسے دیئے تھے جن میں سے ابھی میرے پاس کافی پیسے ہیں۔ سردار جی نے سرہانے کے نیچے سے اپنا پرانا بٹوہ نکال کر کھولا۔ اُس میں سے دس دس روپے کے چار نوٹ نکال کر مجھے دیئے اور بولے۔

''انکار نہ کرنا۔ یہ پیسے اپنے پاس رکھ لو۔ تمہیں ان کی ضرورت ہے۔''

میں نے احسان مند نظروں سے سردار جی کے مُشفق چہرے کو دیکھا اور روپے جیب میں رکھ لئے۔ جب کمرے میں دیوار پر لگے ہوئے کلاک نے رات کا پونا ایک بجایا تو سردار جی جو پہلے سے تیار بیٹھے تھے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ کہنے لگے۔

''واہگورو کا نام لے کر ہمیں اب چل پڑنا چاہئے۔''

ہم مکان کی چھت پر آ گئے۔ رات کا اندھیرا چاروں طرف پھیلا ہوا تھا۔ کہیں کہیں فیروزپور شہر کی جھلملاتی ہوئی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ سٹیشن کی جانب سے رات کے سناٹے میں کسی انجن کے شنٹ کرنے کی آواز آ جاتی تھی۔ چونکہ ابھی اُس زمانے تک شہروں میں آٹو رکشہ، سکوٹر، موٹر سائیکلوں، ٹرکوں اور ویگنوں کا اتنا زیادہ استعمال شروع نہیں ہوا تھا اور موٹر رکشہ اور مسافر ویگنیں تو ابھی رائج بھی نہیں ہوئی تھیں اس لئے انجن کے شنٹ کرنے کی آواز کے ساتھ انجن کے سٹیم کی آواز بھی صاف سنائی دے رہی تھی۔

ہم سردار جی کے مکان کی چھت سے دوسرے مکان کی چھت پر اُتر گئے۔ وہاں سے دوسرے مکان کی چھت کی سیڑھیاں اُتر کر دوسرے محلے کی گلی میں آ گئے۔ گلی خالی اور سنسان تھی۔ سردار جی آگے آگے جا رہے تھے۔ میں اُن کی راہ نمائی میں چل رہا تھا۔ اندھیری رات تھی۔ بازار میں کہیں کہیں سٹریٹ لائٹ جل رہی تھی۔ بازار بھی سنسان پڑا تھا۔ ایک جگہ پیچھے سے ہو کر ہم کھیتوں میں اُتر گئے۔ کھیتوں میں بھی اندھیرا تھا۔ یہاں ایک پل کے لئے رُک کر سردار جی نے پیچھے دیکھا۔ میں بھی رُک گیا۔ وہ کچھ دیر تک اُس طرف دیکھتے رہے جہاں سے ہم مکان کا موڑ مڑ کر کھیتوں میں اُترے تھے۔

پھر بولے۔

''کوئی نہیں ہے..... آ جاؤ!''

وہ یہی دیکھنے کے لئے رُکے تھے کہ کوئی ہمارا پیچھا تو نہیں کر رہا۔ مگر مجھے سب سے زیادہ خطرہ ریلوے سٹیشن کا تھا۔ وہاں سی آئی ڈی والوں میں سے کسی کی موجودگی کا خدشہ تھا۔ ہم کھیتوں میں سے گزرتے چلے گئے۔ ایک جوہڑ آیا۔ اُس کے قریب سے بھی گزر گئے۔ دُور سے سٹیشن کی روشنیاں نظر آنے لگیں۔ جب سٹیشن کی روشنیاں بہت قریب آ گئیں تو سردار جی ٹھہر گئے۔ جیب سے ریلوے کا ٹکٹ نکال کر مجھے دیا اور بولے۔

''میں یہاں سے آگے نہیں جانا چاہتا۔ آگے تم اکیلے ہی جاؤ گے۔ مگر سوچ سمجھ کر جانا۔ گاڑی پلیٹ فارم پر لگ جائے تو فوراً کسی ڈبے میں بیٹھ جانا۔ ایسی جگہ بیٹھنا جہاں سے تم پر پلیٹ فارم پر چلنے والوں کی نظر نہ پڑ سکے۔ جاؤ! اب تمہیں واہگورو کے حوالے کیا۔'' سردار جی نے میری پیٹھ پر آہستہ سے تھپکی دی اور کہا۔ ''دل گردہ مضبوط رکھنا۔''

میری آنکھیں بھیگ گئیں۔ سردار جی جیسے نیک دل انسان کی یاد آج بھی میرے دل میں نقش ہے۔ اُس وقت اگر وہ میری مدد نہ کرتے تو میرے لئے پولیس سے بچ کر نکلنا ناممکن تھا۔ سردار جی چلے گئے اور میں ریلوے سٹیشن کی روشنیوں کی طرف چل پڑا۔ میں چاروں طرف سے چوکنا ہو کر چل رہا تھا۔ سٹیشن کے باہر چھ سات تانگے کھڑے تھے۔ کچھ خالی تھے، کچھ میں سے سواریاں اُتر رہی تھیں۔ گیٹ پر ٹکٹ چیکر کھڑا مسافروں کے ٹکٹ چیک کر رہا تھا۔ میں بھی اُن مسافروں کے ساتھ ہی پلیٹ فارم پر آ گیا۔

دِلّی جانے والی ٹرین پلیٹ فارم پر لگ چکی تھی۔ میں ایک ڈبے میں گھس کر کونے میں ڈبے کی دوسری طرف والی کھڑکی کے پاس پیچھے ہو کر بیٹھ گیا۔ میں اندھیرے میں تھا۔ میری نظریں مسلسل پلیٹ فارم پر آنے جانے والوں کا جائزہ لے رہی تھیں۔ میں انٹیلی جنس والے سکھ کو پہچان سکتا تھا۔ پلیٹ فارم پر سب مسافر ہی لگتے تھے۔ وہ سکھ ابھی تک نظر نہیں آیا تھا۔ مجھے یقین ہونے لگا تھا کہ میں بچ گیا ہوں۔ مگر جب تک گاڑی کھڑی رہی، میرا دل دھڑکتا ہی رہا۔ خدا خدا کر کے گارڈ کی سیٹی کی آواز آئی۔ انجن نے ایک دو بار وِسل دی اور ٹرین پلیٹ فارم پر کھسکنے لگی۔ ٹرین سٹیشن سے نکل گئی تو میں نے کچھ سکون کا سانس لیا۔ آگے فیروزپور کینٹ کا سٹیشن تھا۔ یہاں بھی میرے لئے خطرہ تھا۔ میں اُوپر برتھ پر چڑھ کر لیٹ گیا۔ جب ٹرین وہاں سے بھی چل پڑی اور اُس کی رفتار بھی تیز ہو گئی تو میں نے برتھ پر لیٹے لیٹے آنکھیں بند کر لیں اور سونے کی کوشش

کرنے لگا۔ مگر نیند غائب تھی۔ ٹرین ساری رات چلتی رہی۔ میں کسی وقت سو جاتا اور پھر ذرا سے شور پر جب ٹرین کوئی ٹریک بدلتی تو چونک کر جاگ پڑتا۔ راستے میں سرسہ، حصار اور روہتک بڑے شہر آئے۔ ٹرین نے مجھے دوسرے دن دس بجے کے قریب دِلّی پہنچا دیا۔ اب دِلّی سٹیشن سے اپنے آپ کو بچا کر باہر نکلنے کا مرحلہ آ گیا۔ لیکن مجھے تھوڑا اطمینان تھا کہ فیروز پور کی سی آئی ڈی اتنی دُور کہاں میرا پیچھا کرتی پھرے گی۔ پھر بھی میں بے حد محتاط تھا۔ مسافروں کے درمیان رہ کر میں سٹیشن سے باہر نکل آیا۔

مجھے چوک فوارہ میں واقع گورو تیغ بہادر کے گردوارے جانا تھا جو میں نے دیکھا ہوا تھا اور وہ سٹیشن سے زیادہ دُور نہیں تھا۔ میں سٹیشن کے سامنے والی گراؤنڈ میں سے گزر کر چوک فوارہ کی طرف چلنے لگا۔ بازاروں میں کافی رش تھا۔ پاکستان سے آنے والے شرنارتھیوں کی وجہ سے دِلّی کی آبادی میں اضافہ ہو گیا تھا اور سٹیشن کے آس پاس ٹریفک کا رش بھی رہنے لگا تھا۔ گورو تیغ بہادر کا گردوارہ سکھوں کا بہت بڑا گردوارہ ہے اور یہاں صبح شام اور پھر ساری رات شبد کیرتن ہوتا رہتا ہے۔ گوردوارے کے باہر کافی سکھ نظر آ رہے تھے۔ میں نے جیب سے رُومال نکال کر سر کو ڈھانپا اور ڈیوڑھی میں سے ہو کر گردوارے میں داخل ہو گیا۔ ایک سکھ سیوا دار پر نظر پڑی جو لوگوں کو پانی پلا رہا تھا۔ میں نے اُس سے رگھبیر سنگھ سیوا دار کا پوچھا تو بولا۔

''اُدھر لنگر کے پاس جاؤ! وہاں ملے گا۔''

سامنے ہی لنگر لگا تھا۔ رگھبیر سنگھ مجھے وہیں مل گیا۔ میں نے اُسے سردار جی کا خط دیا تو پڑھ کر بولا۔ ''اُوپر آ جاؤ!''

گردوارے کی دوسری منزل میں ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ اُس نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ میں اُس پر بیٹھ گیا۔ وہ چارپائی پر بیٹھ گیا۔ خط کھول کر اُس نے دوبارہ پڑھا۔ معلوم ہوتا تھا فیروز پور والے سردار جی نے اسے میرے بارے میں بہت کچھ بتا دیا تھا۔ خط پڑھ کر اُس نے تہہ کر کے لفافے میں ڈالا۔ لفافہ اپنی صدری کی جیب میں ڈالا اور میری طرف متوجہ ہو کر پوچھا۔

''تم نے کھانا کھایا؟''

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، وہ اُٹھا اور بولا۔ ''پہلے کھانا کھا لو، پھر بات کریں گے۔''

کھانا کھانے کے دوران رگھبیر سنگھ میرے پاس ہی بیٹھا انگریزی کی کوئی کتاب پڑھتا رہا۔ یہ پڑھا لکھا سکھ تھا۔ شکل وصورت سے بھی سنجیدہ مزاج تھا۔ آنکھوں میں ذہانت کی چمک تھی۔ جب میں کھانے سے فارغ ہوا تو ایک سیوا دار دو گلاسوں میں چائے لے کر آ گیا۔ ہم چائے پینے لگے۔

رگھبیر سنگھ بولا۔ ''سردار جی میرے بڑے بھائیوں کی طرح بھی ہیں اور میرے گورو بھی ہیں۔ اُن کا کہا میں نہیں ٹال سکتا۔ اُنہوں نے خط میں تمہارے بارے میں کافی کچھ لکھا ہے۔ مگر میں تمہاری زبانی بھی سننا چاہتا ہوں۔ مجھے کھول کر بتاؤ کہ اصل قصہ کیا ہے؟''

رگھبیر سنگھ کو ساری داستان تفصیل سے سنانی بہت ضروری تھی۔ کیونکہ اب یہی ایک میرے لئے اُمید کی کرن تھی۔ میں نے پورے واقعات بیان کر دیئے۔ یہ بھی بتا دیا کہ مجھے اُرملا سے محبت تھی اور ہم پاکستان جا کر ایک دوسرے سے شادی کرنا چاہتے تھے۔ رگھبیر سنگھ خاموشی سے سنتا رہا۔ میری کتھا کہانی ختم ہوئی تو کہنے لگا۔

''کام مشکل ہے۔ سکھوں پر انڈیا حکومت کی کڑی نگاہ ہے۔ گردواروں کے باہر ہندو انٹیلی جنس ہماری نگرانی کرتی ہے۔ جب سے پاکستان نے آدھے کشمیر کو آزاد کرایا ہے بارڈر پر بھی سکیورٹی فورس کے ساتھ بھارتی فوج ڈیپلائے کر دی گئی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ غیر قانونی طور پر بارڈر کراس کرنا تقریباً ناممکن ہو گیا ہے۔ لیکن پھر بھی مجھ سے جو کچھ ہو سکا تمہارے لئے کروں گا۔ اس کے لئے تمہیں کچھ دن انتظار کرنا پڑے گا۔ یہ بتاؤ! کہ تم دِلّی میں کہاں ٹھہرے ہوئے ہو؟''

میں نے کہا۔ ''دِلّی میں میرا کوئی جاننے والا نہیں ہے۔ میں سٹیشن سے سیدھا آپ کے پاس ہی آیا ہوں۔ میں کسی ہوٹل میں ٹھہر جاؤں گا۔''

''نہیں نہیں...... '' رگھبیر سنگھ بولا۔ ''یہ غلطی نہ کرنا۔ شہر کے ہوٹلوں کے باہر بھی سی آئی ڈی بیٹھی ہے۔ وہاں ہر آنے جانے والے کی نگرانی کی جاتی ہے۔''

''میں تو ہوٹل میں ہی ٹھہر سکتا تھا۔''

رگھبیر سنگھ چائے پیتے ہوئے کچھ سوچتا رہا، پھر بولا۔

''ایک جگہ ہے۔ یہ جگہ دِلّی کے ایک مسلمان محلے میں ہے۔ تم بھی مسلمان ہو۔

وہاں تم پر کوئی شک بھی نہیں کرے گا۔ میرا ایک مسلمان دوست وہاں رہتا ہے۔ وہ شادی شدہ نہیں ہے۔ سیکرٹریٹ میں کام کرتا ہے۔ تم اُس کے ہاں ٹھہر سکتے ہو۔"

اُسی روز رگھبیر سنگھ مجھے اپنے مسلمان دوست کے ہاں لے گیا۔ دِلّی کے جس مسلمان محلے میں اُس کا مکان تھا، میں اُس محلے کا نام ظاہر نہیں کروں گا اور اُس مسلمان دوست کا نام بھی فرضی لکھوں گا۔ یوں سمجھ لیں کہ اُس کا نام فیروز تھا۔ قصہ مختصر یہ کہ رگھبیر سنگھ نے فیروز کے پاس میرے رہنے کا انتظام کر دیا۔ رگھبیر نے فیروز کو میرے سامنے بتا دیا کہ میں بارڈر کراس کر کے پاکستان جانا چاہتا ہوں اور وہ اس کی کوشش کر رہا ہے۔ فیروز اُس کا رازدار بھی تھا۔ فیروز صبح دفتر چلا جاتا۔ پیچھے میں اکیلا اُس کے مکان میں کتابیں اور رسالے وغیرہ پڑھتے دن گزار دیتا۔ کھانا نیچے ایک مسلمان ریسٹورنٹ میں جا کر کھا لیتا۔ فیروز نے مجھے مسلمان محلے کے اندر ہی رہنے کی ہدایت کی ہوئی تھی۔ چنانچہ میں اُس کی ہدایت پر پورا عمل کر رہا تھا۔ ایک دن چھوڑ کر رگھبیر سنگھ معاملے کی پیش رفت کے بارے میں معلومات حاصل کرنے گوردوارے چلا جاتا۔ ابھی تک رگھبیر سنگھ سے کوئی انتظام نہیں ہو سکا تھا لیکن وہ نا اُمید نہیں تھا۔ یہی کہتا۔

"میں تمہارے ہی کام کے پیچھے لگا ہوں۔ بہت جلد کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔ میں کچا کام نہیں کرنا چاہتا۔ پکا ہاتھ ڈالنا چاہتا ہوں۔"

اِدھر میرے انڈین بارڈر کراس کرنے کی تدبیریں ہو رہی تھیں، اُدھر گردشِ دوراں میرے ساتھ ایک اور ہی ڈرامہ کھیلنے کا پروگرام بنا رہی تھی......

ایک دن جب فیروز دِلّی سیکرٹریٹ اپنی نوکری پر گیا ہوا تھا، میں حسبِ معمول کھانا کھانے کے واسطے دوپہر کو محلے کے مسلمان ہوٹل میں آ گیا۔ خاموشی سے کھانا کھانے لگا۔ اس دوران مجھے احساس ہوا کہ کونے والی میز پر بیٹھا ہوا ایک آدمی مجھے مشتبہ نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ پہلے تو میں نے زیادہ خیال نہ کیا لیکن جب تین چار بار میری اور اُس کی نگاہیں ایک دوسرے سے ٹکرائیں تو میں سمجھ گیا کہ یہ انٹیلی جنس کا آدمی ہے۔ اب سے پہلے میں نے اس آدمی کو ہوٹل میں نہیں دیکھا تھا۔ اچھی عمر کا بھارے بدن والا آدمی تھا۔ خشخشی بالوں میں ہلکی ہلکی سفیدی جھلک رہی تھی۔ کرتہ پاجامہ اور صدری پہن رکھی تھی۔ خاموشی سے چائے پی رہا تھا۔ ایک چمڑے کا پرانا سا تھیلا پاس ہی میز پر پڑا تھا۔ اگر یہ

واقعی انٹیلی جنس کا آدمی تھا تو مجھے اب ایک ایک قدم بڑا سوچ سمجھ کر اُٹھانے کی ضرورت تھی۔

ہوٹل میں کھانا کھا کر میں واپس فیروز کے مکان پر چلا جاتا تھا اور وہاں لیٹ کر کچھ دیر کے لئے سو جاتا تھا۔ لیکن آج میں ایسا نہیں کر سکتا تھا اور مجھے کرنا بھی نہیں چاہئے تھا۔ چنانچہ کھانا کھانے کے بعد میں ہوٹل سے نکل کر چاندنی چوک کی طرف چل پڑا۔ دن کا وقت تھا۔ سڑک پر کافی ٹریفک چل رہی تھی۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ آدمی میرا پیچھا کر رہا ہے یا نہیں؟ میں نے پیچھے مُڑ کر ابھی تک نہیں دیکھا تھا۔ جب میں چاندنی چوک کے قریب پہنچا تو ایک دُکان پر کھڑے ہو کر شوکیس میں لگے ہوئے جوتوں کو دیکھنے لگا۔ پھر بہانے سے میں نے پیچھے نگاہ ڈالی تو وہ آدمی مجھے کہیں دکھائی نہ دیا۔ میں نے دل میں کہا کہ میں نے خواہ مخواہ یہاں تک پیدل مارچ کیا۔ وہ انٹیلی جنس والا نہیں تھا۔ پھر بھی میں نے وہاں سے ایک دم واپس مُڑنا مناسب خیال نہ کیا اور سامنے چوک میں جگت سینما تھا۔ وہاں آ گیا اور لابی میں لگا ہوا فوٹو سیٹ دیکھنے لگا۔ نظریں بچا کر میں اردگرد کا جائزہ بھی لے لیتا تھا۔ وہ آدمی کہیں نظر نہ آیا۔ مجھے اطمینان ہو گیا کہ وہ انٹیلی جنس کا آدمی نہیں تھا۔ ویسے ہی اُس نے مجھے دو تین بار دیکھا تھا۔ میرا دل آرام کرنے کو چاہ رہا تھا۔ بڑی دیر بعد دوپہر کو آرام کرنے کا موقع ملا تھا۔ میں اسے ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔

میں سینما کی لابی سے باہر آیا تو میرا دل دھک سے رہ گیا......

وہی آدمی ایک طرف ستون کے پاس کھڑا میری طرف گھور رہا تھا۔ جیسے ہی ہماری آنکھیں چار ہوئیں، تو وہ دوسری طرف دیکھنے لگا۔ اب کسی شک کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ یہ انٹیلی جنس ہی کا آدمی تھا۔ اُسے مجھ پر شک ہو گیا تھا اور وہ میرا برابر پیچھا کر رہا تھا۔ میں نے وہیں سے ایک سائیکل رکشہ لیا اور اُسے چوک فوارہ چلنے کو کہا۔ دانشمندی کا تقاضہ تھا کہ میں واپس فیروز کے گھر نہ جاؤں۔ وہ سرکاری ملازم تھا اور میں اپنی وجہ سے اُسے کسی مشکل میں نہیں پھنسانا چاہتا تھا۔ رکشہ جامع مسجد سے آگے نکل گیا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ کہاں جاؤں؟ اگر گردوارے جاتا ہوں تو یہ آدمی وہاں تک میرے پیچھے آئے گا اور اسے پتہ چل جائے گا یا یہ معلوم کر لے گا کہ میں گردوارے میں رگھبیر سنگھ سیوادار کے پاس آیا تھا۔ اور اگر اسی طرح سائیکل رکشے پر پھرتا رہتا ہوں تو یہ بھی

ناممکن تھا۔ آخر میں کب تک رکشے پر سڑکوں کی خاک چھان سکتا تھا؟ یہ بھی ڈر تھا کہ وہ کہیں بھی رکشہ ٹھہرا کر مجھ سے پوچھ گچھ کر سکتا تھا کہ میں کون ہوں؟ دِلّی میں کہاں ٹھہرا ہوا ہوں؟ کہاں سے آیا ہوں؟ آخر میں نے گردوارے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ سوچ کر کہ گردوارہ بہت بڑا ہے۔ وہاں لوگوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ میں ہجوم میں گم ہو جاؤں گا۔ پھر رگھبیر سنگھ کے پاس پہنچ جاؤں گا اور اسے پتہ بھی نہیں چل سکے گا۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔

چوک فوارے میں آ کر میں رکشہ سے اُتر گیا اور سیدھا گردوارہ تیغ بہادر کی طرف چل پڑا۔ گردوارے کے باہر بھی کافی لوگ تھے۔ میں اُن میں شامل ہو گیا۔ ایک لمحے کے لئے بھی پیچھے مُڑ کر نہ دیکھا اور لوگوں کے درمیان ہی تیز تیز چلتا رگھبیر سنگھ کے کمرے کے باہر آ گیا۔ رگھبیر سنگھ کمرے میں آرام کر رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر بولا۔

''اس وقت کیسے آنا ہوا؟''

میں نے اُسے ساری بات بتا دی اور کہا۔

''سردار جی! مجھے خطرہ ہے کہ سی آئی ڈی میرے پیچھے لگ گئی ہے۔ اور ہو سکتا ہے وہ یہاں بھی پہنچ جائے۔ میں نہیں چاہتا میری وجہ سے آپ پر کوئی مصیبت آئے۔ اس لئے آپ جہاں کہیں میں چلا جاتا ہوں۔''

رگھبیر سنگھ بھی فیروز پور والے سردار جی کی طرح بڑا دلیر آدمی تھا۔ کہنے لگا۔

''پولیس اور اس کی انٹیلی جنس کی جرأت نہیں ہے کہ گردوارہ تیغ بہادر کے احاطے میں داخل ہو۔ تم بے فکر ہو کر یہاں رہو۔ اب فیروز کے ہاں جانے کی ضرورت نہیں۔ میں نے یہاں بڑے سیوادار کو تمہارے بارے میں بتا دیا ہے کہ تمہارا نام کندن لال ہے۔ تم میرے دوست ہو اور امرتسر سے گردوارہ صاحب کی یاترا کرنے آئے ہو۔ کوئی تم سے پوچھے تو تم بھی اُسے یہی کہنا۔''

مجھے بڑا حوصلہ ہو گیا۔ اب میں رگھبیر سنگھ کے کمرے میں ہی زیادہ وقت گزارتا تھا۔ شام کے وقت کمرے سے نکل کر گردوارے کے احاطے میں چل پھر لیتا۔ اس دوران رگھبیر سنگھ مجھے پاکستان پہنچانے کے سلسلے میں لگا ہوا تھا۔ ایک دن مجھے اچانک خیال آ گیا کہ پاکستان آزاد ملک بن چکا ہے۔ انڈیا اور پاکستان کے درمیان سفیروں کا بھی

تعین ہو گیا ہو گا اور دِلّی انڈیا کی راجدھانی ہے۔ یہاں پاکستان کا سفارت خانہ ضرور ہو گا۔ میں نے رگھبیر سنگھ سے اس کا ذکر کیا اور کہا۔

''سردار جی! اگر دِلّی میں پاکستان کا سفارت خانہ قائم ہو چکا ہے تو میں کیوں نہ اپنے ملک کے سفارت خانے چلا جاؤں؟ وہاں تو مجھے کسی کا بھی ڈر نہیں ہو گا۔ اور وہ لوگ میرے عارضی کاغذات تیار کر کے مجھے بڑی آسانی سے پاکستان پہنچا دیں گے۔''

رگھبیر سنگھ مسکرایا۔ کہنے لگا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے مجھے اس کا پتہ نہیں تھا؟ میں بڑے آرام سے تمہیں پاکستانی سفارت خانے پہنچا سکتا تھا۔ لیکن انڈیا کی حکومت پاکستان کو اپنا دشمن سمجھتی ہے۔ کیونکہ پاکستان کی وجہ سے بھارت ماتا کے ٹکڑے ہوئے ہیں۔ انڈیا کی برہمن حکومت کو اس کا گہرا صدمہ پہنچا ہے۔ اُوپر سے تو وہ پاکستان کے ساتھ دوستی کا دم بھر رہی ہے۔ مگر اندر ہی اندر پاکستان کو اُس کی بنیادوں سے ہلانے کی کوشش کر رہی ہے۔ نئی دِلّی میں پاکستان کے سفارت خانے کی ایک عمارت ضرور ہے مگر اس عمارت کے باہر خفیہ جگہوں پر بھارتی پولیس کے آدمی ہر وقت موجود رہتے ہیں۔ جو کوئی پاکستانی سفارت خانے میں داخل ہوتا ہے، سفارت خانے کی عمارت سے دُور ہی سے اُسے پولیس دبوچ لیتی ہے اور اُس سے پوچھ گچھ شروع ہو جاتی ہے۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ پاکستانی سفارت خانے کی عمارت کے گیٹ کے اندر تو پاکستانی فوجی جوان پہرہ دیتے ہیں۔ لیکن گیٹ کے باہر انڈین فوجی پہرہ دیتے ہیں۔ ایسا ہر ملک میں ہوتا ہے کہ سفارت خانے کی عمارت کے اندر تو جس ملک کا سفارت خانہ ہوتا ہے اُسی ملک کے فوجی پہرہ دیتے ہیں۔ لیکن سفارت خانے کے باہر اس ملک کے فوجی پہرہ دیتے ہیں جس ملک میں وہ سفارت خانہ موجود ہوتا ہے۔ بظاہر تو پاکستانی سفارت خانے کے باہر انڈین فوجی اس لئے پہرہ دیتے ہیں کہ اگر پاکستان کے خلاف ہندوؤں کا کوئی احتجاجی جلوس اس طرف آئے تو سفارت خانے کی عمارت کو جلوس کی توڑ پھوڑ سے بچایا جا سکے اور سفارت خانے کی حفاظت کی جائے۔ لیکن یہاں ہندوستانی فوجی، پولیس کے ساتھ ملے ہوئے ہیں اور جب کوئی شخص پاکستانی ایمبیسی کی طرف آتا ہے تو سب سے پہلے باہر پہرہ دیتے انڈین فوج کے سپاہی اُسے وہیں روک لیتے ہیں اور زبردستی پیچھے دھکیل دیتے ہیں۔ اور اتنی دیر میں خفیہ جگہوں پر چھپی ہوئی انڈیا کی پولیس کے آدمی آ کر اُسے

دبوچ لیتے ہیں اور زبردستی گھسیٹتے ہوئے دوسری طرف کھڑے ٹرک میں لے جاتے ہیں۔ اور اُس سے پوچھ گچھ ہونے لگتی ہے کہ وہ کون ہے؟ اور کس غرض کے لئے پاکستانی سفارت خانے جارہا ہے۔''

میں نے کہا۔''لیکن پاکستانی سفارت خانے کے آدمی کیسے آتے جاتے ہیں؟''

رگھبیر سنگھ نے کہا۔''وہ پاکستانی سفارت خانے کی گاڑی میں آتے جاتے ہیں۔ ویسے اُنہیں بھی ہدایت کی گئی ہے کہ بہت ضروری کام ہو تو باہر جائیں۔ ورنہ سفارتخانے کے اندر ہی رہیں۔''

''یہ تو بین الاقوامی سفارتی آداب کے خلاف ہے۔ کیا ہمارا سفارت خانہ اس پر احتجاج نہیں کرتا؟''

میرے سوال پر رگھبیر سنگھ کہنے لگا۔''انڈیا اور پاکستان یہ دونوں ملک آزاد ہوتے ہی ایک دوسرے کے دشمن ملک بن گئے ہیں۔ یہاں کے حالات ہی کچھ ایسے ہو چکے ہیں۔ لیکن اس دشمنی میں انڈیا سب سے آگے ہیں۔ کیونکہ انڈیا کی کانگریسی حکومت اس صدمے کو ابھی تک برداشت نہیں کر سکی کہ مسلمانوں نے اپنا الگ ملک بنا کر اس کی بھارت ماتا کے دو ٹکڑے کر دیئے ہیں۔ پاکستان کی طرف سے انڈیا کے اس سفارتی آداب کے خلاف رویئے پر احتجاج بھی کیا جاتا ہے۔ مگر اس کے جواب میں انڈیا کی حکومت یہی پراپیگنڈہ کرتی ہے کہ ہماری طرف سے سفارتی آداب کی کسی قسم کی خلاف ورزی نہیں کی جارہی۔ یہ وجہ تھی جس کی خاطر میں نے تمہیں مشورہ نہیں دیا کہ تم سیدھے پاکستانی سفارتخانے پہنچ جاؤ۔

میں خاموش رہا۔ کوئی سوال پوچھنے کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ رگھبیر سنگھ کہنے لگا۔

''ہو سکتا ہے کچھ عرصے کے بعد حالات نارمل ہو جائیں۔ مگر اس وقت تمہارا اپنے سفارت خانے میں جانا مناسب نہیں ہے۔ جبکہ تم پہلے ہی پولیس کی نگاہ میں ہو اور انٹیلی جنس تمہارے پیچھے لگی ہوئی ہے۔''

میں نے کہا۔''پھر آپ مجھے کیا مشورہ دیتے ہیں؟''

رگھبیر سنگھ بولا۔''میں نہ تو تمہیں خواہ مخواہ کسی مصیبت میں پھنسانا چاہتا ہوں اور نہ خود کسی مشکل کا شکار ہونا چاہتا ہوں۔ میرے گورو نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تمہیں

پاکستان پہنچا دوں۔ چاہے مجھے کچھ کرنا پڑے۔ میں تمہیں پاکستان ضرور پہنچاؤں گا۔ لیکن ابھی تمہیں کچھ دن صبر کرنا ہو گا۔ میرے ذہن میں ایک پلان ہے اور میں نے اس پر کام شروع کر دیا ہے۔ ابھی اس کے بارے میں کچھ بتانا بیکار ہے۔ آرام سے گوردوارے میں بیٹھے رہو اور وقت کا انتظار کرو۔ تمہاری تسلی کے لئے اتنا ضرور بتا دینا چاہوں گا کہ تمہیں زیادہ دن انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔''

گورو تیغ بہادر گوردوارے کے اس باہمت سیوادار نے اتنے وثوق سے یہ بات کہی تھی کہ مجھے اس پر یقین کرنا ہی پڑا۔ میں نے گردوارے کے اندر ہی رہنا شروع کر دیا۔ لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ ہونی ہو کر رہتی ہے اور مقدر میں جو لکھا ہوتا ہے اسے کوئی نہیں ٹال سکتا، میرے ساتھ بھی وہی ہوا۔

رگھبیر سنگھ کے ساتھ ہوئی اس گفتگو کو تین چار دن ہی گزرے ہوں گے کہ ایک دن میں گردوارے کی چاردیواری کے اندر پھرتے پھراتے بڑے دروازے والی ڈیوڑھی کے پاس آ گیا۔ اس روز سکھوں کا کوئی مذہبی تہوار تھا اور سکھ مرد اور خواتین بھاری تعداد میں گردوارے میں ماتھا ٹیکنے آ رہی تھیں۔ میلے کا سا سماں تھا۔ میں ایک طرف ہو کر دیوار کے پاس کھڑا تھا کہ اچانک میری نظر اُس سکھ پر پڑی جس کو میں نے فیروز پور کے بارڈر ایریا میں ایک کھیت میں فصل کاٹتے اور پھر میری طرف غور سے دیکھتے دیکھا تھا اور پھر اُسی سکھ کو کھائی نام کے گاؤں سے فیروز پور آتے اپنے ساتھ بس میں سوار ہوتے دیکھا تھا اور جو یقیناً سی آئی ڈی کا آدمی تھا۔ اُسے دیکھتے ہی میرے جسم میں ایک سنسناہٹ سی دوڑ گئی۔ وہ سکھ بھی دوسرے سکھ سنگتوں کے ساتھ ماتھا ٹیکنے جا رہا تھا۔ اُس نے بھی نظر بھر کر مجھے دیکھا اور میرے دیکھتے دیکھتے عورتوں اور مردوں کے ہجوم میں میری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ میں گھبرا کر واپس رگھبیر سنگھ کے کمرے کی طرف تیز قدموں سے چل پڑا۔ لوگوں کا ہجوم بڑھ گیا تھا اور تیز قدموں سے چلنے میں دُشواری ہو رہی تھی۔ پھر بھی میں مسلسل چلا جا رہا تھا۔ میں پندرہ بیس قدم ہی چلا ہوں گا کہ اچانک پیچھے سے میری کمر میں ایک سوئی تیزی سے گھس گئی...... درد کی ایک ٹیس اُٹھی۔ میں نے تڑپ کر پیچھے دیکھا اور پھر میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا......!

OOO

اور میں لڑکھڑا کر وہیں گر پڑا۔

مجھے اتنا یاد ہے کہ کسی نے مجھے اپنی بانہوں میں لے لیا تھا اور پھر مجھے کسی کی آواز سنائی دی جو لوگوں سے کہہ رہا تھا۔

''اسے مرگی کا دورہ پڑ گیا ہے۔ پیچھے ہٹ جاؤ! راستہ دو۔ اسے ہسپتال لے جانا ضروری ہے۔ نہیں تو یہ مر جائے گا.....''

اس کے بعد مجھے کچھ سنائی نہ دیا اور میں بے ہوش ہو گیا۔

ہوش آیا تو میری سب سے پہلے جس شے پر نظر پڑی وہ چھت کے ساتھ لٹکا ہوا بجلی کا ایک بلب تھا جو روشن تھا۔ میں ایک ٹھنڈے چھوٹے سے خالی کمرے میں لوہے کے سٹریچر پر پڑا تھا۔ میرے دونوں بازو اور دونوں ٹانگیں سٹریچر کے ساتھ بندھی ہوئی تھیں اور وہاں میرے سوا دوسرا کوئی نہیں تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ جس بات کا ڈر تھا وہ ہو گئی ہے۔ اور میں پولیس کے پھندے میں پھنس چکا ہوں۔ اور اب خدا کے سوا کوئی دوسرا میری مدد نہیں کر سکتا۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور میں دل میں گڑگڑا کر خدا سے دُعائیں مانگنے لگا۔ میری آنکھیں بند تھیں اور میرا دل خدا کے حضور سجدہ ریز ہو کر اپنی نجات کی دُعائیں مانگ رہا تھا۔

دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ دو آدمی دروازے میں سے اندر آ گئے۔ جب وہ میرے سٹریچر کے قریب آئے تو میں نے بلب کی روشنی میں انہیں دیکھا۔ اُن میں سے ایک وہی سی آئی ڈی والا سکھ تھا اور دوسرا آدمی پولیس کی وردی میں تھا۔ پولیس کی وردی والے آدمی کی عمر پچاس سے ایک دو سال کم ہو گی۔ رنگ گہرا سانولا تھا۔ چہرے ہی سے وہ انتہائی سنگ دل اور سفاک پولیس والا لگتا تھا۔ اُس کی ایک آنکھ تھوڑی سی بیٹھی ہوئی تھی۔ جب اُس نے جھک کر مجھ سے بات کی تو اُس

کی بیٹھی ہوئی آنکھ ہولے ہولے پھڑپھڑا رہی تھی۔ اُس نے کہا۔

''میں دِلّی کی خفیہ پولیس کا ایس پی ہوں۔ ویسے تو میرا نام دولت رام ہے۔ مگر لوگ جھٹکا رام بھی کہتے ہیں۔ کیونکہ میں پاکستانی جاسوسوں کا جھٹکا کرنے میں بڑا مشہور ہوں۔ اب تم سمجھ گئے ہو گے کہ میں تمہارے ساتھ بھی کیا سلوک کرنے والا ہوں۔ ہم نے تمہارا معائنہ کر کے دیکھ لیا ہے کہ تم مسلمان ہو۔ مسلمان جانوروں کو ذبح کرتے ہیں۔ مگر ہم ہندو اُن کا جھٹکا کر کے انہیں مارتے ہیں۔ ذبح کرتے وقت تم لوگ جانور کے گلے پر بار بار چھری پھیرتے ہو۔ مگر ہم چھرے کی ایک ہی ضرب سے اُس کا جھٹکا کر دیتے ہیں۔ اس طرح جانور کو پتہ بھی نہیں چلتا کہ اُس کے ساتھ کیا ہوا ہے اور اُس کی گردن دھڑ سے الگ ہو جاتی ہے۔ کیوں سندر سنگھیا! میں ٹھیک کہہ رہا ہوں ناں؟''

اُس نے اپنے پاس کھڑے سی آئی ڈی کے سکھ سے پوچھا۔ اُس سکھ نے سر ہلا کر کہا۔

''بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ۔''

ایس پی دولت رام نے اپنا سر اُوپر اُٹھا لیا۔ اُس کی نظریں مسلسل مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ چہرے پر بڑی سنگدلانہ مسکراہٹ تھی۔ کہنے لگا۔

''تمہارا بھی ہم جھٹکا کر کے تمہاری گردن اُتار دیں گے۔ تمہیں پتہ بھی نہیں چلے گا کہ تمہارا سر تمہارے دھڑ سے الگ ہو گیا ہے۔''

پھر اُس نے سی آئی ڈی کے سکھ سندر سنگھ سے کہا۔ ''سندر سنگھ! اسے پولیس کے سپیشل ریسٹ ہاؤس میں لے چلو۔ ذرا اس کی ٹہل سیوا کی جائے۔ بڑا تھکا ہوا ہے بیچارہ۔''

سندر سنگھ نے اسی لمحے دروازے کی طرف منہ کر کے کسی کو آواز دی۔ دو آدمی اندر اخل ہوئے اور میرے سٹریچر کو چلاتے ہوئے کمرے سے باہر لے گئے۔ باہر احاطے بں پولیس کی ایک بند گاڑی کھڑی تھی۔ دو کانسٹیبل جو مسلح تھے میرے ساتھ گاڑی میں یٹھ گئے۔ میرے دونوں ہاتھ اور پاؤں رسّی سے جکڑ دیئے گئے اور گاڑی کسی نا معلوم قام کی طرف چل پڑی۔ گاڑی کی چھت کے پاس تین روشندان تھے جن میں سے دن لی روشنی اندر آ رہی تھی۔ ڈرائیور والی کھڑکی پر پردہ گرا ہوا تھا۔ جب گاڑی چلی تو رائیور نے جو کانسٹیبل کی وردی میں تھا، پردہ ہٹا دیا اور وہاں سے تازہ ہوا اور دن کی وشنی اندر آنے لگی۔ ڈرائیور کی کھڑکی میں سے مجھے باہر کا کچھ منظر نظر آ رہا تھا۔ گاڑی

دِلّی شہر کی ایک کشادہ سڑک پر سے گزر رہی تھی۔ سڑک پر دوسری گاڑیاں بھی آ جا رہی تھیں۔ دو تین سڑکوں پر سے گزر کر گاڑی ایک کھلی جگہ پر آ گئی جہاں شہر کی عمارتیں فاصلے پر دکھائی دے رہی تھیں۔

خدا ہی بہتر جانتا تھا کہ پولیس مجھے کہاں لئے جا رہی تھی۔ اتنا مجھے معلوم تھا کہ اب پوچھ گچھ کا سلسلہ شروع ہو جائے گا اور مجھے وحشیانہ تشدد کا نشانہ بنایا جائے گا۔ ایک پل میں کچھ کا کچھ ہو گیا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو بد سے بدتر حالات کے مقابلے کے لئے ذہنی طور پر تیار کرنا شروع کر دیا۔ ساتھ ہی ساتھ میں فرار ہونے کے طریقوں پر بھی غور کر رہا تھا۔ گاڑی دِلّی شہر کو بہت پیچھے چھوڑ آئی تھی۔ اس کا رُخ مغرب کی طرف تھا جس سے میں نے اندازہ لگایا کہ یہ لوگ مجھے شاید راجستھان کے کسی شہر کی طرف لے جا رہے ہیں۔ اُس زمانے میں راجستھان کے شہر جے پور کا ٹارچر سینٹر بڑا بدنام تھا۔

راستے میں ایک جگہ گاڑی تھوڑی دیر کے لئے رُکی۔ وہاں دونوں کانسٹیبل اُتر گئے۔ باہر سے اُنہوں نے گاڑی کا دروازہ لاک کر دیا۔ ڈرائیور بھی اُتر گیا۔ شاید وہ لوگ چائے وغیرہ پینے گئے تھے۔ میں نے کھڑے ہو کر چھت کے قریب روشندان میں سے باہر دیکھا۔ ویران غیر آباد علاقہ تھا۔ سڑک کے کنارے ایک چائے کا کھوکھا تھا جہاں یہ تینوں کانسٹیبل چائے پی رہے تھے اور باتیں کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس آ گئے اور گاڑی آگے چل پڑی۔ شام ہو گئی۔ پھر باہر رات کا اندھیرا چھا گیا۔ بھوک اور پیاس سے میرا برا حال ہو رہا تھا۔ کوئی شہر آ گیا۔ گاڑی تھوڑی دیر کے لئے روک دی گئی۔ وہاں مجھے تھوڑے سے چاول کھانے کو دیئے گئے۔ پانی بھی پلایا گیا۔ اور گاڑی آگے روانہ ہو گئی۔ کافی دیر بعد ایک اور شہر آ گیا۔ یہاں گاڑی شہر کے ریلوے سٹیشن کے باہر آ کر ٹھہر گئی۔ وہاں پولیس کی ایک مسلح گارڈ میرے استقبال کے لئے پہلے سے موجود تھی۔ مجھے ایک ٹرین کے ڈبے میں سوار کرایا گیا۔ مسلح پولیس کی پوری گارڈ بھی میرے ساتھ بیٹھ گئی۔ ساری رات ٹرین سفر کرتی رہی۔ دوسرے دن کسی بڑے شہر کے سٹیشن پر آ کر رُکی۔ میری طرف والی ڈبے کی کھڑکیاں بند کر دی گئی تھیں۔ میں باہر کا منظر نہیں دیکھ سکتا تھا۔ خدا جانے کون سا سٹیشن تھا۔ دوسرا دن بھی ٹرین کے سفر میں گزر گیا۔ رات کا اندھیرا چھا رہا تھا کہ ٹرین ایک جگہ رُک گئی۔ وہاں مجھے ڈبے سے اُتارا گیا۔ میں نے تازہ ہوا

میں گہرا سانس لیا۔ آس پاس کسی عمارت کی روشنی نہیں تھی۔ یہ کوئی غیر آباد اور ویران جگہ تھی جہاں شاید پولیس کے کہنے پر گاڑی روکی گئی تھی۔ رات کے بڑھتے ہوئے اندھیرے میں ایک جانب سے ایک ٹرک ہمارے قریب آ گیا۔ مجھے اُس میں دھکیل دیا گیا۔ پولیس کی گارڈ بھی میرے ساتھ ہی بیٹھ گئی۔

ان پولیس والوں کی نقل و حرکت سے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ لوگ مجھے ملک کے کسی دُور دراز علاقے میں لے جا رہے ہیں جہاں دُور دُور تک میری چیخیں سننے والا کوئی نہیں ہو گا اور جہاں سے میری لاش بھی واپس نہیں آئے گی۔ ظالمانہ تشدد کے بعد مجھے وہیں کسی گڑھے میں دبا دیا جائے گا۔ میرا دل و دماغ اس عبرت ناک انجام کو قبول کرنے کو تیار نہیں تھا۔ میں نے اسی لمحے دل میں فیصلہ کر لیا کہ چاہے کچھ ہو جائے، میں فرار ہونے کی کوشش کروں گا۔ جنگل کی زندگی اور مصائب و آلام نے مجھے سخت جان بنا دیا ہوا تھا۔ میں ہر قسم کا خطرہ مول لے سکتا تھا۔ اس کے علاوہ میری سب سے بڑی طاقت میرا خدا تھا اور اس کے بعد میرا یہ عزم تھا کہ میں ہندو کے ہاتھوں نہیں مروں گا۔ اور یہ کہ مجھے ہر حال میں پاکستان پہنچنا ہے۔ اب میری نگاہیں ہر لمحے آس پاس کے ماحول کا جائزہ لے رہی تھیں۔ پولیس کا ٹرک مجھے لے کر چلا جا رہا تھا۔ ٹرک اُوپر سے کھلا تھا اور پیچھے آدھا ڈھکا ہوا تھا جہاں سے باہر کا منظر اندھیرے میں تھوڑا تھوڑا نظر آ رہا تھا۔ پولیس کی پوری مسلح گارڈ میرے اردگرد بیٹھی تھی اور ہم شہروں کی آبادی سے بھی بہت دُور نکل آئے تھے۔

پولیس کو یقین ہو گیا تھا کہ میں اب بھاگ کر کہیں نہیں جا سکوں گا۔ چنانچہ میرے ہاتھ پاؤں کھول دیئے گئے تھے۔ ٹرک سنسان جنگل میں سے گزر رہا تھا۔ کبھی درختوں کے جھنڈ آ جاتے اور کبھی کھلا علاقہ آ جاتا۔ ٹرک ایک گھنٹے چلتا رہا۔ پھر کسی دریا کا پُل آ گیا۔ دریا کا پُل کافی لمبا تھا۔ پُل کی دوسری طرف جا کر ٹرک سڑک سے اُتر کر ایک جگہ درختوں کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ باہر سے فلمی گانوں کی آواز آ رہی تھی۔ یہ کوئی چائے وغیرہ کی دُکان تھی جہاں ریڈیو پر اُونچی آواز میں فلمی گانے لگے ہوئے تھے۔

میرے پاؤں میں رسّی باندھ کر اس کا دوسرا سرا ٹرک کی سیٹ کے ساتھ باندھ دیا گیا اور پولیس کے آدمی نیچے اُتر گئے۔ وہ وہاں چائے وغیرہ پینے کے لئے رُکے تھے۔ میرے

لئے قدرت نے فرار کا ایک موقع فراہم کر دیا تھا۔ اب مجھے اس موقع سے فائدہ اُٹھانا تھا۔ میں نے پاؤں کے ساتھ بندھی ہوئی رسّی کے دوسرے سرے کو غور سے دیکھا جو سیٹ کے ساتھ بندھا ہوا تھا۔ یہ نائیلون کی رسّی نہیں تھی۔ ابھی نائیلون کا اتنا رواج نہیں ہوا تھا۔ یہ عام پتلی رسّی تھی مگر بڑی مضبوط تھی اور سیٹ کے ساتھ اُسے بڑی مضبوطی سے باندھا گیا تھا۔ میں نے سیٹ کے نیچے لوہے کے فریم پر ہاتھ پھیرا۔ میرا ہاتھ ایک لوہے کی پتری سے ٹکرایا جو تھوڑی سی باہر نکلی ہوئی تھی۔ میں رسّی کو لوہے کی باہر نکلی ہوئی پتری کے ساتھ رگڑنے لگا۔ یہ دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ رسّی کٹنے لگی تھی۔ میں اور زیادہ تیزی سے رسّی کو رگڑنے لگا۔ قدرت میرا ساتھ دے رہی تھی۔ میرا اُلٹا پانسہ بھی سیدھا پڑ رہا تھا۔ چھ سات منٹ کی کوشش کے بعد رسّی کٹ گئی۔

مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ رسّی کٹ گئی ہے اور میں آزاد ہو گیا ہوں۔ میں نے گز ڈیڑھ گز لمبی رسّی کو اپنی پنڈلی کے ساتھ اچھی طرح سے لپیٹا اور اُٹھ کر باہر جھانک کر دیکھا۔ پولیس والے سڑک کی دوسری جانب چائے کی ایک دُکان کے باہر بنچوں پر بیٹھے چائے وغیرہ پی رہے تھے اور ایک دوسرے سے ہنسی مذاق کی باتیں کر رہے تھے۔

ایک ایک سیکنڈ میرے لئے بے حد قیمتی تھا۔ میں اللہ کا نام لے کر ٹرک کے پیچھے سے نیچے اُتر گیا۔ ایک تو جہاں ٹرک کھڑا تھا، وہاں اندھیرا تھا۔ دوسرے ٹرک کا رُخ ایسا تھا کہ میں اُنہیں دکھائی نہیں دے سکتا تھا۔ میں جھک کر چلتا ٹرک کی دوسری جانب آ گیا۔ سامنے کچھ فاصلے پر دریا کا پُل شروع ہو جاتا تھا۔ میں سڑک چھوڑ کر جھاڑیوں میں اُتر گیا اور جتنی تیز دوڑ سکتا تھا دریا کے پُل کی طرف دوڑنے لگا۔ دریا کا پُل وہاں سے زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ دو سو گز کی دُوری پر ہو گا۔ میں لمحہ بہ لمحہ دریا کے قریب ہو رہا تھا۔ پھر دریا کا پُل آ گیا۔ میں پُل کی ریلنگ کے ساتھ ساتھ دوڑنے لگا۔ ابھی تک پیچھے سے مجھ پر کوئی فائر نہیں ہوا تھا جس کا مطلب تھا کہ پولیس کو میرے فرار کا ابھی پتہ نہیں چلا۔ لیکن اُنہیں کسی بھی وقت پتہ چل سکتا تھا اس لئے مجھے جو کچھ کرنا تھا، بڑی جلدی کرنا تھا۔ جب میں دریا کے پُل پر پچاس ساٹھ گز آگے نکل گیا تو میں نے دریا میں چھلانگ لگا دی۔ یہ میں نے پہلے سے ہی طے کر رکھا تھا کہ راستے میں اگر کوئی دریا آیا تو میں اُس میں کود کر فرار ہونے کی کوشش کروں گا۔ اب میں پولیس سے بے نیاز ہو گیا تھا۔ وہ مجھے

پکڑ نہیں سکتے تھے۔ زیادہ سے زیادہ مجھ پر فائرنگ ہی کر سکتے تھے۔ لیکن ایک تو رات کی تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ دوسرے دریا میں نشانہ لگانا ویسے بھی بڑا مشکل ہوتا ہے۔ دریا کا تیز بہاؤ اور موجیں مجھے آن کی آن میں پُل سے کافی دُور لے گئیں۔

تب مجھے پیچھے سے فائرنگ کی آوازیں سنائی دیں۔ مگر میں پولیس کی رائفلوں کی زد سے محفوظ ہو چکا تھا۔ یہ خطرہ ضرور تھا کہ وہ دریا کے ساتھ ساتھ میری تلاش میں نہ نکل پڑیں۔ اس وجہ سے میں بڑی تیزی سے ہاتھ پاؤں چلا رہا تھا۔ ایک تو دریا کا بہاؤ بڑا تیز تھا، دوسرے میں پوری طاقت سے ہاتھ پاؤں چلا رہا تھا۔ میں چند منٹوں میں کہیں کا کہیں پہنچ گیا۔ اس کے بعد میں آہستہ آہستہ تیرنے لگا۔ فائرنگ کے دھماکے خاموش ہو گئے تھے۔ میں دریا کے ایک کنارے سے دو سو گز دُور رہ کر دریا میں بہا جا رہا تھا۔ دریا کا دوسرا کنارہ کافی دُور تھا۔ پانی کا تیز بہاؤ مجھے آگے ہی آگے لئے جا رہا تھا۔ میں یہی چاہتا تھا کہ جتنی دُور نکل سکتا ہوں نکل جاؤں۔ لیکن مجھے کسی نہ کسی جگہ دریا سے باہر نکلنا تھا۔ اس وقت میں دریا کے مغربی کنارے کے قریب رہ کر تیر رہا تھا۔ اندھیرے میں دریا کنارے اُگے ہوئے سرکنڈے اور درخت سایوں کی مانند نظر آ رہے تھے۔ میں نے اپنا رُخ کنارے کی طرف کر لیا۔ تیرتے ہوئے میں دریا سے باہر نکل آیا اور سرکنڈوں کی اوٹ میں سانس لینے کو بیٹھ گیا۔ میری بش شرٹ اور پتلون پانی میں شرابور تھی۔ میں نے بش شرٹ اُتار کر نچوڑی اور اُسے دوبارہ پہن لیا کہ جسم کی گرمی سے خشک ہو جائے گی۔

مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ جہاں میں دریا سے نکلا ہوں وہ انڈیا کا کون سا علاقہ ہے؟ تنا مجھے پتہ تھا کہ میں دِلّی سے بہت دُور بلکہ پارہ پتن دُور نکل آیا ہوں۔ اور یہ انڈیا کے ملک کا جنوب مغربی علاقہ ہی ہو سکتا ہے۔ اس طرف کون سا بڑا شہر ہے؟ اس سے میں بے خبر تھا۔ لیکن مجھے کسی بڑے شہر کی طرف ہی جانا تھا۔ اب میرا پروگرام یہ تھا کہ کسی طرح بمبئی عثمان بھائی کے پاس پہنچ جاؤں۔ وہاں کم از کم میں پولیس کی نگاہوں سے محفوظ ضرور رہ سکتا تھا۔ دِلّی سردار رگھبیر سنگھ کے پاس جانے کا خیال میں نے دل سے نکال دیا تھا۔ دِلّی کی طرف میرے پکڑے جانے کا امکان بہت زیادہ تھا۔ دریا کنارے یں انہی سوچوں میں گم کچھ دیر بیٹھا رہا۔ آسمان پر تارے نکلے ہوئے تھے۔ تاروں کو دیکھ کر مجھے یہ اندازہ ہو جاتا تھا کہ رات کتنی گزر چکی ہے اور کتنی باقی ہے۔ میں نے آسمان

کے مشرقی اُفق کی طرف نگاہ ڈالی تو مجھے سات ستاروں کی ٹولی مشرقی اُفق کی طرف جھکی ہوئی دکھائی دی۔ اس کا مطلب تھا کہ رات کا آخری پہر گزر رہا ہے۔ دن نکلنے سے پہلے پہلے مجھے اپنے لئے کوئی محفوظ ٹھکانہ تلاش کرنا بہت ضروری تھا۔ چنانچہ میں اُٹھا اور دریا کے کنارے اپنی دائیں جانب چھوڑ کر درختوں کی طرف چل پڑا۔

علاقہ میدانی جنگلوں کا تھا جس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ میں جھانسی اور گوالیار سے ابھی بہت پیچھے دِلّی اور آگرہ کے درمیان کسی جگہ پر ہوں۔

پو پھٹ رہی تھی۔ آسمان پر منہ اندھیرے کی سفیدی جھلکنے لگی تھی۔ رات کی تاریکی چھٹ رہی تھی۔ درختوں کے جھنڈ اور جھاڑیاں نظر آنے لگی تھیں۔ غیر آباد ویران علاقہ تھا۔ کھیت کہیں نہیں تھے۔ جہاں تک نگاہ کام کرتی تھی، کوئی گاؤں بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔

چلتے چلتے میں ایک ایسی جگہ پہنچا جہاں بہت سے درخت جھنڈ کی شکل میں ساتھ ساتھ کھڑے تھے۔ میں اُن کے درمیان پہنچا ہی تھا کہ اچانک دس بارہ آدمی جے دُرگا مائی کا نعرہ لگا کر درختوں میں سے نکلے اور نکلتے ہی اُنہوں نے مجھے دبوچ لیا۔ ان میں سے کچھ آدمیوں کے ہاتھوں میں بلمیں تھیں۔ دو تین نے چھرے پکڑے ہوئے تھے۔ اُنہوں نے مجھے ریوڑ سے بھاگے ہوئے بکرے کی طرح زمین پر گرا لیا اور میری گردن میں کپڑا ڈال کر اتنی زور سے بل دیئے کہ میرا سانس رُکنے لگا۔ آنکھیں باہر کو نکل آئیں۔ میں بوکھلا گیا تھا۔ گڑبڑا گیا تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ بلائیں کہاں سے نازل ہو گئی ہیں۔ چار پانچ ہٹے کٹے آدمیوں نے میرے بازو اور ٹانگیں دبوچ رکھی تھیں۔ ایک آدمی میری گردن میں ڈالے ہوئے کپڑے کو رسے کی طرح بل دے رہا تھا۔ جب میرے حلق سے غرغراہٹ کی آوازیں نکلنے لگیں تو ایک آدمی نے میرے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا۔ ایک آدمی درختوں میں بانس کی جھلنگا سی چارپائی نکال لایا۔ مجھے چارپائی پر ڈال کر رسی سے جکڑ دیا گیا اور چار آدمی چارپائی اُٹھا کر ایک طرف چل پڑے۔ باقی آدمی چارپائی کے آگے اور پیچھے جے دُرگا مائی کے نعرے لگاتے اور بھجن گاتے جا رہے تھے۔ پہلے تو میں یہی سمجھا کہ یہ لٹیرے ہیں اور راہ چلتے مسافروں کو اکیلا پا کر لوٹ لیتے ہیں۔ لیکن جب وہ مجھے چارپائی پر جکڑ کر میرے منہ میں کپڑا ٹھونس کر اُٹھا کر چل پڑے تو میں خوف زدہ ہو گیا کہ یہ لوگ مجھے کہاں اور کس لئے لے جا رہے ہیں۔

وہ بڑی تیز تیز چل رہے تھے۔ بلکہ دوڑ رہے تھے۔ میرے منہ میں کپڑے کا گولا بنا کر ٹھونس دیا گیا تھا جس کی وجہ سے میں بول نہیں سکتا تھا۔ اُنہوں نے میری تلاشی بھی نہیں لی تھی جس سے یہ بات ثابت ہوتی تھی کہ یہ راہ زن یا ڈاکو نہیں ہیں۔ یہ کسی اور نیت سے مجھے پکڑ کر لئے جا رہے ہیں۔ دِلّی سے جنوب مغرب کی جانب آگے متھرا اور بندرا بن کا علاقہ کٹر اور متعصب ہندوؤں کا علاقہ تھا۔ یہاں ہندو جاتی کے ہر قسم کے فرقے کے بے شمار مندر تھے۔ ان میں ایسے ہندو فرقے بھی تھے جو بڑے بھیانک قسم کے عقیدوں کے مالک تھے اور دیوی دیوتاؤں کی پوجا اور اُن کی خوشنودی حاصل کرنے کے واسطے نیچی ذات مثلاً شودروں کی عورتوں، بچوں اور آدمیوں کو پکڑ کر لے جاتے تھے اور اُنہیں دیوی کی مورتی کے آگے قتل کر کے اُن کا بلیدان دیتے تھے۔ دیوی کے بلیدان کیلئے وہ اجنبی راہ گیروں کو بھی اُٹھا کر لے جاتے تھے۔ انگریز کے زمانے میں یہ وارداتیں اِکا دُکا ہی ہوتی تھیں۔ مگر اب انڈیا پر ہندو کی حکومت تھی اور انہیں کوئی پوچھنے والا نہیں تھا۔ مجھے اس لئے بھی خوف اور دہشت ہوئی کہ وہ جس دُرگا دیوی کے جے کارے لگا رہے تھے وہ کالی دیوی کا ہی ایک دوسرا نام اور رُوپ تھا۔ اور وہ انسانوں کی قربانی پسند کرتی تھی۔ میں چارپائی پر بندھا ہوا تھا۔ منہ میں کپڑا ٹھنسا ہوا تھا۔ شور مچا کر کسی کو اپنی مدد کے لئے بھی نہیں بلا سکتا تھا۔ یہ بھی نہیں دیکھ سکتا تھا کہ یہ لوگ مجھے کہاں لے جا رہے ہیں۔ مجھے صرف اُوپر آسمان یا درختوں کی شاخیں ہی نظر آ رہی تھیں۔

وہ جے دُرگا مائی، جے دُرگا میّا کے نعرے لگاتے مجھے چارپائی پر اُٹھائے دوڑتے چلے جا رہے تھے۔ اُن کی رفتار آہستہ ہوگئی۔ پھر اُنہوں نے چارپائی زمین پر رکھ دی۔ میں نے درختوں کے نیچے ایک پکی کوٹھڑی دیکھی جس کے دروازے کے آگے تین آدمی درمیان میں آگ جلائے بیٹھے عجیب وغریب زبان میں منتروں کا جاپ کر رہے تھے اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد آگ میں کچھ ڈال دیتے تھے جس سے آگ میں سے ایک دم شعلے بلند ہوتے تھے۔ فضا میں وہاں ناگوار بو پھیلی ہوئی تھی۔ ایسی بو عام طور پر بوچڑ خانوں کے پاس اُس جگہ پھیلی ہوتی ہے جہاں بکروں کی سریاں اور پائے آگ میں جلائے جاتے ہیں۔ مجھے اپنا انجام نظر آ گیا تھا۔ اور دہشت کے مارے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ اُنہوں نے دبوچ کر مجھے چارپائی سے اُٹھایا اور گھسیٹتے ہوئے کوٹھڑی کے اندر

لے گئے۔ کوٹھڑی میں ایک لالٹین جل رہی تھی جس کی دُھویں سے بھری ہوئی چمنی میں سے منحوس قسم کی روشنی نکل رہی تھی۔ کوٹھڑی کے اندر بھی بانس کی ایک چارپائی بچھی ہوئی تھی۔ اُنہوں نے مجھے چارپائی پر گرادیا اور گراتے ہی چھ سات آدمیوں نے میرے بازو اور ٹانگیں اپنی گرفت میں جکڑ لیں۔ دیکھتے دیکھتے رسّی سے مجھے اُس چارپائی پر اس طرح سے جکڑ دیا گیا کہ میں بڑی مشکل سے اپنی ٹانگیں اور بازو ہلا سکتا تھا۔

سارے آدمی کوٹھڑی سے باہر نکل گئے۔ میرے حلق میں ٹھنسا ہوا کپڑا اب نکال دیا گیا تھا۔ میرا حلق، زبان اور ہونٹ خشک ہو رہے تھے۔ آواز نہیں نکل رہی تھی۔ آواز نکالتا بھی تو وہاں میری فریاد سننے والا کوئی نہیں تھا۔ میں خدا کے حضور اپنی زندگی کی دُعائیں مانگنے لگا۔ اور اسی لمحے میں نے دل میں عہد کرلیا کہ اگر یہاں سے زندہ بچ کر پاکستان پہنچ گیا تو پھر کبھی اس وحشی اور درندہ صفت ہندوؤں سے بھرے ہوئے ملک میں قدم نہیں رکھوں گا۔ لیکن ابھی تو مجھے اپنی جان کی فکر پڑی تھی۔ باہر تینوں مہنت آگ کے اِردگرد بیٹھے منتر پڑھ رہے تھے اور اُن میں وہ وحشی بھی شامل ہو گئے تھے جو مجھے اغوا کر کے وہاں لائے تھے۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد باہر سے جے دُرگا مائی، جے دُرگا میّا کے جے کاروں کی آواز آ جاتی تھی۔ کچھ دیر بعد باہر خاموشی چھا گئی۔ ایک دو منٹ خاموشی چھائی رہی، پھر کالے کلوٹے آگ کے پاس بیٹھے مہنتوں کے منتروں کی آوازیں آنے لگیں۔ کوٹھڑی کا دروازہ بند تھا۔ کوٹھڑی کی فضا میں حبس اور ناگوار بو پھیلی ہوئی تھی۔

پھر کوٹھڑی کا دروازہ کھلا۔ دن کی روشنی اندر آ گئی۔ دو آدمی اندر داخل ہوئے۔ اُن کے ہاتھوں میں مٹی کے کٹورے تھے۔ وہ جے دُرگا مائی کے الفاظ بلند آواز سے بول رہے تھے۔ وہ میری چارپائی کے پاس آئے۔ کٹورے میں اُنگلی ڈال کر باری باری پہلے میرے دونوں پاؤں پر، پھر میری بش شرٹ اُونچی کر کے میرے پیٹ پر ناف کے اُوپر اور میرے ماتھے پر تیل میں بھگوئے ہوئے سیندور کے ٹیکے لگانے لگے۔ وہ جے دُرگا مائی بھی بولتے جاتے تھے اور باری باری میرے پاؤں، میرے پیٹ اور میرے ماتھے پر سیندوری تیل کی اُنگلیاں لگاتے جاتے تھے۔ میری چارپائی کے گرد چار پانچ پھیرے لگانے کے بعد وہ کوٹھڑی سے چلے گئے۔ کوٹھڑی کا دروازہ بند کر دیا گیا۔ میں بے بسی کی حالت میں چارپائی پر بندھا ہوا پڑا تھا۔

باہر سے منتروں کی آوازیں اسی طرح بلند ہو رہی تھیں۔ اب دُرگا مائی کے جے کارے نہیں لگ رہے تھے۔ لیکن آدمیوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اسی طرح شاید دو تین گھنٹے گزر گئے ہوں گے کہ کوٹھڑی کا دروازہ کھلا، چار آدمی اندر آ گئے۔ اُن میں سے ایک کے ہاتھ میں کانسی کی تھالی تھی جس میں کھانے پینے کی چیزیں تھیں۔ باقی تین آدمیوں نے ہاتھوں میں چھرے اور ٹکوے پکڑ رکھے تھے۔ میری رسیاں کھول کر مجھے چارپائی پر بٹھا دیا گیا۔ اور جس آدمی کے ہاتھ میں تھال تھا وہ میرے پاس بیٹھ گیا اور مجھے اُبلے ہوئے چاول اور دال کھلانے لگا۔ میں نے گزشتہ دن سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ لہٰذا خاموشی سے کھاتا رہا۔ مجھے مٹی کے کٹورے میں پانی پلایا گیا۔ یہ کالے رنگ کے ہٹے کٹے آدمی تھے۔ میلی کچیلی دھوتیاں اُنہوں نے پہنی ہوئی تھیں۔ بدن پر اُوپر میلی بنیانیں ہی تھیں۔ آنکھوں سے خونخواری ٹپک رہی تھی۔ لگتا تھا سبھی کے سبھی خونی اور قاتل ٹائپ کے آدمی ہیں۔ میں نے اُن سے ہمت کر کے پوچھا۔

''تم لوگوں نے مجھے کس لئے قید کر رکھا ہے؟''

وہ پوربی زبان بول رہے تھے۔ اُن میں سے ایک نے کہا۔ ''تم دُرگا مائی کے بیٹے ہو۔ ہم تمہیں تمہاری ماتا کے پاس لے جا رہے ہیں۔''

میں نے کچھ اور پوچھنے کے لئے زبان کھولی تو جس آدمی کے ہاتھ میں ٹکوا تھا، اُس نے ٹکوے کا پھل میری گردن پر رکھ دیا اور بولا۔

''اب جو بولا تو گردن اُتار دُوں گا۔''

اس کے بعد مجھے زبان کھولنے کی جراُت نہ ہوئی۔ رات کے وقت میرے دونوں پاؤں میں اور گردن میں رسّی ڈال کر مجھے کوٹھڑی سے باہر لا کر قریب ہی ایک تالاب تھا وہاں لے جایا گیا۔ چار آدمی چھرے اور ٹکوے لئے اِردگرد کھڑے رہے۔ ایک کے ہاتھ میں لالٹین تھی۔ دو آدمیوں نے میرے کپڑے اُتار دیئے۔ اُن میں سے ایک نے نعرہ لگا کر کہا۔

''دُرگا میّا کی جے ہو۔ ارے یہ مُسلا ہے۔ مسلمان ہے۔''

دوسرے نے بھی دُرگا مائی کا نعرہ لگایا اور بولا۔ ''دُرگا میّا کی لیلا نیاری ہے۔ دیکھ لو! اس بار دُرگا ماں نے خود ایک مُسلے کو یہاں بھجوا دیا ہے۔''

وہ خوشی سے جھوم رہے تھے اور منتر بھی بولتے جا رہے تھے۔ دو آدمیوں نے مجھے تالاب کی سیڑھی پر بٹھا کر اچھی طرح سے نہلایا۔ پھر مجھے پتلون بش شرٹ پہنائی اور ایک آدمی نے میری گردن میں پکڑی ہوئی رسّی کو تھام کر اور ایک آدمی نے میرے پاؤں میں بندھی ہوئی رسّی کو پکڑ کر مجھے کوٹھڑی میں پہنچا کر چارپائی پر لٹا دیا۔ رسیوں سے میرے بازو اور ٹانگیں بری طرح سے جکڑ دی گئیں اور وہ لوگ چلے گئے۔

جنگل اور ہندو مندر کے ایڈونچر میں، میں نے بڑی بڑی مصیبتیں دیکھی تھیں۔ مشکل سے مشکل اور جان لیوا حالات میں پھنسا تھا۔ مگر اب جو مصیبت مجھ پر نازل ہوئی تھی لگتا تھا کہ اس میں سے میرا زندہ بچ کر نکلنا ناممکن ہے۔ اُرملا کی دی ہوئی انگوٹھی میری اُنگلی میں پڑی تھی۔ مگر اب یہ میرے لئے بیکار تھی۔ کیونکہ جس دشمن جاں کانچی کے حملے سے محفوظ رکھنے کے لئے یہ انگوٹھی مجھے دی گئی تھی، وہ کانچی جہنم میں پہنچ چکی تھی۔ اب تو صرف ایک خدا کی ذات تھی جو میری مدد کر سکتی تھی اور جس پر میں اُمید لگائے ہوئے تھا۔ اس کے باوجود میں دل میں فرار کی تدبیریں برابر سوچ رہا تھا۔ مشکل یہ تھی کہ ایک تو ان لوگوں نے مجھے رسیوں میں جکڑ رکھا تھا۔ دوسری بات یہ تھی کہ یہ دس بارہ ہٹے کٹے آدمی تھے۔ شکل صورت ہی سے قاتل لگتے تھے اور سب کے سب ہر وقت چھرے اور ٹکوے لئے میرے اِرد گرد منڈلاتے رہتے تھے۔

مجھے تین دن ان لوگوں نے کوٹھڑی میں بند رکھا۔ مجھے کھلاتے پلاتے رہے۔ صبح، شام، رات ہر وقت میری نگرانی ہوتی رہی۔ مجھے تالاب پر نہلانے کے لئے لے جاتے تھے تو میری گردن کے علاوہ میرے دونوں پاؤں میں بھی رسّی بندھی ہوتی تھی۔ اور چھ آدمی بلمیں، چھرے اور ٹکوے لئے میرے اِرد گرد چل رہے ہوتے تھے۔

چوتھا دن بھی گزر گیا۔ شام ہو رہی تھی کہ یہ لوگ جلوس کی شکل میں جے دُرگا مائی کے نعرے لگاتے میری چارپائی کندھوں پر اُٹھائے وہاں سے کچھ فاصلے پر ایک اور جنگلی علاقے میں لے آئے۔ یہاں ایک اُونچی خستہ سی پرانی چار دیواری تھی۔ اُس کی ڈیوڑھی میں ایک نیم تاریک کوٹھڑی تھی۔ میری چارپائی کوٹھڑی مین رکھ دی گئی۔ دو آدمی چھرے لئے دروازے پر کھڑے پہرہ دیتے رہے۔ باقی کسی طرف کو چلے گئے۔ کچھ دیر خاموشی چھائی رہی۔ اس کے بعد بھجن کیرتن کی آوازیں آنے لگیں۔ یہ آوازیں مدھم تھیں اور کسی

بند کمرے سے آ رہی تھیں۔ میں کوئی ایک گھنٹہ وہیں پڑا رہا۔ پھر چار آدمی آئے۔ اُن میں سے ایک نے پہرہ دیتے آدمیوں سے کہا۔

"دُرگا میا نے اپنی بلی کو بلیدان سے پہلے اپنے اشیرواد کے لئے بلایا ہے۔"

چھ کے چھ آدمیوں نے اُونچی آواز میں نعرہ لگایا۔ "جے ہو دُرگا مائی کی۔"

میں سمجھ گیا کہ میرا آخری وقت آ گیا ہے۔ یہ لوگ مجھے دُرگا دیوی کے قدموں کے آگے ذبح کرنے کے لئے لے جا رہے ہیں۔ دُرگا دیوی، کالی دیوی کا ہی ایک رُوپ ہے۔ یہ دیوی بہت خوبصورت بھی ہے اور محبت کرنے والی بھی ہے۔ مگر ساتھ ہی ساتھ بڑی خونخوار بھی ہے۔ اور ہندی دیو مالا کے مطابق اس کے کئی ہاتھ ہیں۔ کسی ہاتھ میں پھولوں کا ہار ہے تو کسی ہاتھ میں انسان کی خون ٹپکاتی گردن ہے۔ اور کسی ہاتھ میں خون آلود چھرا ہوتا ہے۔

مجھے چار دیواری کے پیچھے ایک ندی پر لے جا کر نہلایا گیا۔ پانچ آدمی چھرے اور بلمیں لئے میرے سر پر موجود رہے۔ ایک آدمی مجھے نہلاتا رہا۔ نہلانے کے بعد مجھے میرے کپڑے پہنا دیئے گئے اور چار دیواری کی ڈیوڑھی میں لا کر چارپائی پر جکڑ دیا گیا۔ پھر میرے ہاتھوں، پاؤں، بازوؤں اور ماتھے اور سینے پر تیل میں بھگویا ہوا سیندور لگایا گیا۔ میں انتہائی بے بسی کی حالت میں ایک ایک کو تک رہا تھا۔ اُن سے رحم کی اپیل کرنا بیکار تھا۔ وہ اشلوک پڑھتے جا رہے تھے اور میرے گرد چکر لگاتے جا رہے تھے۔

میری حالت اُس بکرے کی سی تھی جس کو چھ سات آدمیوں نے دبوچ رکھا ہو اور ایک آدمی اُس کی گردن پر چھری پھیرنے کے لئے تیار بیٹھا ہو۔ بھاگنے کی ذرا سی بھی گنجائش نہیں تھی۔ زندگی کے سارے راستے بند ہو گئے تھے۔ صرف ایک راستہ کھلا تھا جو موت کی طرف جاتا تھا۔ جب اُن کی پوجا پاٹھ ختم ہو گئی تو مجھے چارپائی سمیت اُٹھا کر چل پڑے۔ مجھے قتل گاہ کی طرف لے جایا جا رہا تھا...... میں نے آنکھیں بند کر لیں اور خدا سے اپنے گناہوں کی معافیاں مانگنے لگا۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ چند لمحوں کی زندگی باقی رہ گئی ہے اور اس کے بعد میں ابدی نیند سو جاؤں گا۔ اب میری ایک ہی خواہش تھی کہ یہ لوگ ایک دم سے میری گردن الگ کر دیں۔ مجھے اذیتیں دے دے کر ہلاک نہ کریں۔

وہ لوگ مجھے ایک بڑے کمرے میں لے آئے جہاں کانسی کے چراغ چھت سے

لٹکے ہوئے تھے۔ فضا میں لوبان کا دُھواں پھیلا ہوا تھا۔ میری چارپائی ایک طرف رکھ دی گئی۔ میں نے دیکھا کہ سامنے والی دیوار میں ایک بہت بڑی سیاہ فام مورتی بنی ہوئی ہے۔ مورتی کے آگے فرش سے دو فٹ اُونچا پتھر کا چبوترا ہے چبوترے کے سامنے کوئی شخص بال کھولے جسم پر سیندوری رنگ کی بہت بڑی چادر لپیٹے، سادھو جوگیوں کی طرح بیٹھا ہے۔ اُس کی پیٹھ میری طرف تھی۔ اُس کے آگے ایک برتن میں آگ جل رہی تھی۔ وہ پراسرار شخص تھوڑی تھوڑی دیر بعد آگ میں کچھ ڈال دیتا تھا۔ اُس کے دائیں بائیں چھ ہٹے کٹے آدمی چھرے ہاتھوں میں لئے سر جھکائے خاموش کھڑے تھے۔ موت کے خوف نے میرے اعصاب کو شل کر دیا تھا۔ میرا جسم برف کی طرح سرد ہو چکا تھا۔ میں مرنے سے پہلے ہی آدھے سے زیادہ مر چکا تھا۔

میں نے آنکھیں بند کر لی تھیں اور خدا کو یاد کر رہا تھا۔ اُس وقت صرف خدا کی یاد ہی مجھے سکون عطا کر رہی تھی۔ میں نے اپنے آپ کو اللہ کی رضا پر چھوڑ دیا تھا۔ اگر میری موت اسی طرح لکھی تھی تو اسے ٹالنا میرے بس میں نہیں تھا۔ مورتی کے پاس کھڑے آدمیوں نے بھجن کیرتن شروع کر دیا۔ میں نے ان آوازوں کی طرف سے کان بند کر لئے تھے اور دل میں صرف کلمہ پاک کا ورد کر رہا تھا۔ پھر بھجن کیرتن کی آوازیں ایک دم خاموش ہو گئیں۔ میں نے آنکھیں کھول کر چارپائی پر لیٹے لیٹے بلکہ چارپائی پر جکڑے ہوئے سیاہ فام منحوس مورتی کی طرف نگاہیں پھیر کر دیکھا۔ جو پراسرار شخص میری طرف پیٹھ کر کے مورتی کے سامنے بیٹھا تھا، اُس نے کوئی اشارہ کیا۔ اشارہ پاتے ہی ایک آدمی نے جے دُرگا میّا کی بلّی کی جے کا نعرہ لگایا اور چار آدمی میری چارپائی اُٹھا کر اُس چبوترے کی طرف لے چلے جہاں لٹا کر مجھے ذبح کیا جانا تھا۔ میری چارپائی قتل گاہ یعنی مورتی کے سامنے چبوترے پر رکھی گئی تو میں نے آنکھیں کھول کر اُس پراسرار پجاری کو دیکھا جو چبوترے کے پاس مٹی کے برتن میں آگ جلائے بیٹھا اُس میں کچھ ڈالتا جا رہا تھا۔ پہلے تو اُس کی میری طرف پشت تھی، اب اُس کا چہرہ میرے سامنے تھا۔ جیسے ہی میری نظر اُس پراسرار شخص پر پڑی میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں...... میرا دل اُچھل کر میرے حلق کے پاس آ گیا۔

اُس پراسرار شخص کی بھی یہی حالت تھی۔ میرے سامنے سیندوری چادر جسم پر لپیٹے

اُرملا بیٹھی تھی...... مجھے اپنے سامنے دیکھ کر اُرملا کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا تھا۔ جس ہاتھ سے وہ آگ میں کوئی سفوف ڈال رہی تھی وہ ہاتھ اُٹھے کا اُٹھا رہ گیا تھا۔ میری آنکھوں کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ اُرملا ہے۔ نہ ہی اُرملا کو یقین آ رہا تھا کہ اُس کے سامنے جس شخص کو تھوڑی دیر بعد ذبح کیا جانا ہے وہ اُس کا محبوب شیراز ہے۔ یہ ایک سیکنڈ سے کم وقفے کا لمحہ تھا جو حیرت کی انتہا کا لمحہ تھا۔

اُرملا نے آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھے اشارہ کیا کہ میں اسی طرح خاموش پڑا رہوں۔ پھر اُس نے ایک ہاتھ بلند کیا اور اپنے آس پاس کھڑے پجاریوں یا خونی قاتلوں سے کہا۔

''دُرگا میّا نے حکم دیا ہے کہ بلیدان سے پہلے ہوَن یگیہ کی رسم پوری کی جائے گی۔''

سب نے یک زبان ہو کر کہا۔ ''دُرگا میّا کے ہوَن یگیہ کی پوجا پوری کی جائے گی۔ اوِش پوری کی جائے گی۔''

اُرملا اُٹھ کھڑی ہوئی اور اُس نے حکم دیا۔ ''بلّی کو پوجا پاٹھ والے استھان پر لے چلو۔ آج رات اور کل کا دن مجھے دُرگا میّا کے ہوَن یگیہ کے منتروں کا جاپ کرنا ہو گا۔''

اتنا کہہ کر اُرملا ایک طرف کو بڑے وقار کے ساتھ چل پڑی۔ چار آدمیوں نے میری چارپائی اُٹھائی اور اُس کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ میں ابھی تک حیرت زدہ تھا۔ اس سے زیادہ حیرت کا مقام میری زندگی میں کبھی نہیں آیا تھا۔ یہ کیسے ہو گیا؟ اس کا تو مجھے وہم و گمان تک نہیں تھا۔ لیکن قدرت کے احوال نرالے ہوتے ہیں۔ عین وقت پر عالم غیب سے کوئی ایسی بات وقوع پذیر ہو جاتی ہے کہ آدمی ششدر ہو کر رہ جاتا ہے۔ آپ خود اندازہ کریں کیا کبھی میں سوچ سکتا تھا کہ اس قتل گاہ میں جب میری موت مجھ سے ایک قدم کے فاصلے پر ہو گی اچانک اُرملا میرے سامنے آ کر مجھے موت کے منہ سے بچا لے گی؟ اور پھر وہ اُرملا جو میرے لئے مر چکی تھی۔ جس کے واپس آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اُرملا کو اچانک اپنے سامنے دیکھ کر مجھے اپنی زندگی کی سب سے بڑی حیرت بھی ہوئی تھی۔ یہ حیرت ایسی تھی کہ ایک لمحے کے لئے مجھے اپنے دل کی دھڑکن بند ہوتی محسوس ہوئی تھی۔ اور خوشی کی ایک بیکراں لہر نے مجھے سر سے پاؤں تک اپنی آغوش میں لے لیا تھا۔ خوشی اس بات کی ہوئی تھی کہ اُرملا مُردہ نہیں تھی، زندہ تھی۔

وہ استھان جہاں اُرملا نے میرے بلیدان سے پہلے ایک خاص پوجا کی رسم ادا کرنے کا اعلان کیا تھا، اُس کھنڈر کے ایک دوسرے کمرے میں تھا۔ وہاں بھی دیوار میں ایک سیاہ فام مورتی باہر کو نکلی ہوئی تھی۔ اُس کے آگے پتھروں کو جوڑ کر دو اینٹ اُونچا ایک چبوترہ بنا ہوا تھا۔ میری چارپائی اُس چبوترے پر رکھ دی گئی۔ اُرملا چبوترے کے سامنے ایک بڑی چوکی پر بیٹھ گئی۔ دو آدمی دوسرے کمرے سے آگ والا کانسی کا برتن اُٹھا کر لے آئے اور اُسے اُرملا کے آگے رکھ دیا اور اُس کے سامنے ہاتھ باندھ کر سر جھکا کر کھڑے ہو گئے۔ اُرملا نے جلالی آواز میں حکم دیا۔

''پوجا شروع ہونے والی ہے۔تم لوگ چلے جاؤ۔ جب تک میں نہ بلاؤں، کوئی اندر نہ آئے۔''

وہ لوگ جے دُرگا میّا کا ہلکا سا نعرہ لگا کر اُرملا کے آگے تین بار سر جھکا کر خاموشی سے باہر نکل گئے۔ اُرملا نے اُٹھ کر دروازے کی اندر سے کنڈی لگا دی۔ سب سے پہلا کام اُس نے یہ کیا کہ میرے ہاتھ پاؤں جس رسّی سے بندھے ہوئے تھے اُن کی گرہیں کھول دیں۔ مگر رسیاں اسی طرح میرے پاؤں اور بازوؤں کے ساتھ لپٹی رہنے دیں۔ میں ابھی تک اُرملا کو حیرت سے تک رہا تھا۔

''اُرملا! کیا واقعی تم زندہ ہو......؟''

وہ مسکرائی۔ کہنے لگی۔'' خدا نے میری زندگی لکھی ہوئی تھی۔ مجھے کیسے موت آ سکتی تھی؟'' پھر اُس نے میرا ہاتھ بڑی محبت سے چوم لیا اور بولی۔'' مجھے یقین تھا کہ تم ضرور ایک نہ ایک دن آؤ گے۔ یہ اُسی دریا کا علاقہ ہے جہاں میں دریا کی لہروں میں بہہ گئی تھی۔ یہ بڑی لمبی کہانی ہے۔ لیکن میں کچھ واقعات تمہیں ضرور سناؤں گی۔ جب وہ غنڈہ مجھے دبوچنے کے لئے آگے بڑھا تو میں دریا میں کود گئی تھی۔''

میں نے کہا۔'' اور تمہیں بچانے کے لئے تمہارے پیچھے میں نے بھی دریا میں چھلانگ لگا دی تھی۔''

''ہاں۔'' اُرملا بولی۔'' میں نے دریا کی لہروں میں اُبھر کر تمہیں اپنے پیچھے آتے دیکھا تھا۔ میں کچھ دُور تک تیرتی رہی تھی۔ لیکن پھر میرا سانس اُکھڑنے لگا تھا۔ دریا کی موجوں کا بڑا زور تھا۔ اور منہ زور موجیں مجھے بہا کر لے گئیں۔ مجھے اتنا پتہ ہے کہ میں

بے ہوش ہو گئی تھی۔ جب مجھے ہوش آیا تو رات کا وقت تھا۔ میں دریا کے کنارے لیٹی ہوئی تھی اور یہ لوگ جو تمہیں خدا جانے کہاں سے پکڑ کر دُرگا دیوی پر قربان کرنے کے لئے لے آئے ہیں میرے اِرد گرد بیٹھے دُرگا میّا کے منتروں کا جاپ کر رہے تھے۔ ایک عورت بھی میرے پاس بیٹھی اشلوک پڑھ رہی تھی۔ جب میں نے آنکھیں کھولیں تو ان لوگوں نے خوش ہو کر دُرگا مائی کا جے کارہ لگایا۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ دُرگا میّا کی راتری یعنی خاص رات تھی۔ اُس رات دُرگا کے پجاری کسی دریا کے کنارے بیٹھ کر اس کی پوجا کرتے ہیں۔ اور اگر اس وقت دریا میں سے کوئی کچھوا یا کوئی مچھلی یا کسی انسان کی لاش دریا کی لہروں پر نمودار ہو جائے تو یہ توہم پرست ہندو یہ سمجھتے ہیں کہ دُرگا میّا اُن کی پوجا سے خوش ہو کر کچھوے یا مچھلی یا انسانی لاش کی شکل میں ان کے سامنے آ گئی ہے۔ اتفاق سے دریا کی لہروں پر نیم بے ہوشی کی حالت میں تیرتے تیرتے میں کنارے پر آ کر لگ گئی تھی۔ اُنہوں نے اسی وقت مجھے دریا سے نکال کر وہیں لٹا دیا۔ اُن کی خوشی کی کوئی انتہا نہیں رہی تھی۔ کیونکہ دُرگا میّا خود ایک جوان عورت کی شکل میں ان کے پاس آ گئی تھی۔ یہ لوگ مجھے اُٹھا کر دُرگا میّا کے اس پرانے اور خفیہ مندر میں لے آئے جہاں اس وقت ہم بیٹھے ہیں۔ انہوں نے بڑی عقیدت سے میری تیمارداری کی اور میں اچھی بھلی ہو گئی۔ اب میں تمہاری تلاش میں فادر فرانسس کی خانقاہ میں واپس جانا چاہتی تھی۔ جب میں نے وہاں سے جانے کا ارادہ ظاہر کیا تو ان لوگوں نے چھرے نکال لئے اور کہا، تم دُرگا میّا کی اوتار ہو۔ دُرگا میّا نے تمہارا رُوپ لے کر ہمیں درشن دیئے ہیں۔ اگر تم چلی گئیں تو ہمارے کھیت سوکھ جائیں گے۔ ہماری عورتیں بے اولاد ہو جائیں گی۔ ہمیں دُرگا میّا کی بدُدعا لگے گی۔ ہم تمہیں نہیں جانے دیں گے۔ میں نے سوچا کہ کچھ دن یہاں رہ کر فرار کی کوئی راہ تلاش کر لوں گی۔ اور چونکہ یہ علاقہ دریا کے کنارے پر تھا اس وجہ سے مجھے یہ خیال بھی آیا کہ شاید میری تلاش میں تم اس طرف آ جاؤ اور ہماری ملاقات ہو جائے۔ کتنے ہی دن گزر گئے۔ میں نے ایک دو بار رات کو فرار ہونے کی کوشش بھی کی لیکن مجھے معلوم ہوا کہ میری چوبیس گھنٹے نگرانی کی جا رہی ہے۔ میں ان لوگوں کی قید سے نہیں نکل سکوں گی۔ بس میں اس اُمید پر یہاں بیٹھی رہی کہ شاید تم اس طرف آ جاؤ اور ہم دونوں یہاں سے فرار کی کوئی تدبیر سوچیں۔ تم اندازہ نہیں لگا سکتے کہ اچانک تمہیں

اپنے سامنے دیکھ کر مجھے کتنی حیرانی اور کتنی خوشی ہوئی ہے۔ یہ بتاؤ! تم میری تلاش میں کیوں نہیں آئے؟ کیا تم نے یہ سمجھ لیا تھا کہ میں دریا میں ڈوب کر مر چکی ہوں؟''

میں نے کہا۔''اُرملا! میرے ساتھ جو کچھ ہوا ہے تم اسے سنو گی تو اس سے بھی زیادہ حیران ہو جاؤ گی۔''

اور پھر میں نے اُرملا کو بتایا کہ کس طرح کانچی اس کا رُوپ دھار کر میرے پاس آ گئی تھی اور اس نے بتایا تھا کہ میں دریا میں ڈوب جاتی اگر کچھ مچھیرے مجھے دریا میں ڈوبنے سے بچا نہ لیتے۔ اس کے بعد میں نے اُرملا کو کانچی کی ساری کہانی بیان کر دی اور یہ بھی بتا دیا کہ اگر ایک بزرگ عین موقع پر آ کر یہ انکشاف نہ کرتے کہ جسے میں اُرملا سمجھ رہا ہوں وہ حقیقت میں میری دشمن کانچی ہے تو آج میں زندہ حالت میں تمہارے سامنے نہ بیٹھا ہوتا۔

''پھر تم نے کیا، کیا؟'' اُرملا نے پوچھا۔

میں نے کہا۔''اُس بزرگ نے مجھے کپڑے کا بنا ہوا ایک پتلا دیا جس کی میں نے ٹانگیں، بازو اور گردن الگ کی تو کانچی کی ٹانگیں، بازو اور گردن بھی اُس کے جسم سے الگ ہو گئی اور کانچی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مجھے نجات مل گئی۔ اُس عیار عورت نے تمہاری انگوٹھی بھی بہانے بہانے سے مجھ سے لے لی تھی۔ خیر پوری داستان میں تمہیں پھر کسی وقت سناؤں گا کہ اس کے بعد سرسوتی نے میرے ساتھ کیا، کیا۔''

''کیا، کیا اُس نے؟'' اُرملا نے تجسّس سے پوچھا۔

میں نے جواب دیا۔''اُس نے مجھ سے بیاہ رچانے کے لئے پورا ایک ڈرامہ کھیلا۔ یہ بھی اپنی جگہ پر ایک دلچسپ کہانی ہے جو میں تمہیں بعد میں سناؤں گا۔ ابھی میں اپنا ایک شک دُور کرنا چاہتا ہوں۔''

''کون سا شک؟'' اُرملا نے حیرانی سے پوچھا۔

میں نے کہا۔''جب کانچی تمہارا رُوپ دھار کر میرے سامنے آ گئی تو سرسوتی نے مجھے تم سے دُور کرنے کے واسطے رازداری سے کہا کہ اُرملا کی پیٹھ پر چاند یا سورج گرہن کا ایک نشان ہے۔ مجھے شک ہے کہ یہ اُرملا نہیں، کانچی ہے۔ تم اس کی پیٹھ پر یہ نشان دیکھ کر اس کی تصدیق کرو۔ یہ میں تمہیں بتانا بھول گیا ہوں کہ جب کانچی تمہارا رُوپ

بدل کر میرے پاس آ گئی تھی اور اُس نے مجھے جھوٹی کہانی گھڑ کر سنائی تھی کہ کس طرح چند ماہی گیروں نے اُسے دریا سے نکال لیا تھا اور وہ زندہ بچ گئی تھی، تو مجھے تمہارے زندہ بچ جانے اور میرے پاس واپس آ جانے کی بے انتہا خوشی ہوئی تھی۔ سرسوتی کو اس کی جلن تھی اور وہ مجھے تم سے دُور کرنا چاہتی تھی۔ چنانچہ جب اُس نے تمہارے چاند گرہن کا ذکر کیا تو ایک رات میں نے کانچی سے کہا کہ میں تمہاری پیٹھ پر گرہن کا نشان دیکھنا چاہتا ہوں۔ کانچی نے مجھے اپنی پیٹھ دکھائی تو وہاں گرہن کا نشان موجود تھا۔ لیکن ایسا کانچی نے اُس لمحے اپنے ایک جادو ٹونے کے منتر کی مدد سے کیا تھا۔ پھر مجھے بالکل یقین ہو گیا کہ وہ کانچی نہیں، اُرملا ہے۔ لیکن کانچی جب تمہارے رُوپ میں مجھے ورغلا کر اپنے خاص مندر میں مجھے ہلاک کرنے کے لئے لے گئی تا کہ اُس کو اُس کی خاص شکتی واپس مل جائے تو اتفاق سے اُس رات اُس مسلمان بزرگ سے میری ملاقات ہو گئی۔ بلکہ وہ بزرگ خاص طور پر غیب کی دُنیا سے اللہ کے حکم پر مجھے کانچی کے ہاتھوں بے موت مرنے سے بچانے کے لئے آ گئے تھے۔ اُنہوں نے مجھے بتایا کہ جس عورت کو تم اُرملا سمجھ رہے ہو، وہ تمہاری دشمن کانچی ہے اور وہ تمہیں ذبح کرنے کے لئے یہاں لائی ہے۔ اگر تمہیں میری بات پر یقین نہیں آ رہا تو بے شک اُس کی پیٹھ ننگی کر کے دیکھ لو۔ مگر اُسے نہ بتانا کہ تم اُس کی پیٹھ پر چاند گرہن کا نشان دیکھنا چاہتے ہو۔ اگر تم نے بتا دیا تو وہ اپنے جادو کے زور سے وہ نشان اپنی پیٹھ پر پیدا کر لے گی۔ چنانچہ ایک روز جب کانچی تالاب پر نہا رہی تھی تو میں نے اُس کی پیٹھ دیکھی۔ وہاں چاند گرہن کا نشان نہیں تھا۔ تب مجھے یقین ہو گیا کہ یہ عورت کانچی ہے۔ اُرملا نہیں ہے۔ اس کے بعد کی کہانی بھی میں پھر تمہیں کسی وقت سناؤں گا۔ ابھی میں تمہاری پیٹھ پر چاند گرہن کا نشان دیکھنا چاہتا ہوں۔ صرف یہ یقین کرنے کی خاطر کہ تم میری پیاری اُرملا ہی ہو اور کانچی کی بدرُوح تمہارا رُوپ بدل کر تو نہیں آ گئی؟''

اُرملا مسکرائی۔ پھر اُس نے میری طرف پشت کی اور اپنی پیٹھ پر سے چادر ہٹا دی۔ اُس کی پیٹھ پر چاند گرہن کا نشان موجود تھا۔ میں نے کہا۔

''خدا کا شکر ہے کہ مجھے میری اصلی اُرملا واپس مل گئی۔''

اس کے بعد میں نے اُرملا سے کہا۔''اب یہ بتاؤ! کہ ہم اس قتل گاہ سے کیسے فرار ہو

سکتے ہیں؟ کیونکہ یہاں صرف میں ہی نہیں بلکہ تم بھی میرے ساتھ ہی قید ہو۔''

اُرملا کچھ سوچ کر بولی۔ ''ہمارے پاس صرف آج کی رات اور کل کا دن ہے۔ ہمیں اس دوران ہی جو کچھ کرنا ہے، کر گزرنا ہو گا۔ کیونکہ کل کا دن گزر جانے کے بعد تمہارا بلیدان دینا ضروری ہو جائے گا۔ اور پھر یہ لوگ تمہیں مورتی کے آگے ہلاک کر دیں گے جو میں ہرگز برداشت نہیں کر سکتی۔''

میں نے کہا۔ ''کیا یہاں سے فرار کا کوئی خفیہ راستہ نہیں ہے؟''

اُرملا کہنے لگی۔ ''ایک راستہ ہے۔''

''کون سا؟'' میں نے پوچھا۔

اُرملا نے کہا۔ ''یہ لوگ مجھے دُرگا دیوی کا اوتار اور اُس کا ہی ایک رُوپ سمجھتے ہیں۔ میرے ہر حکم کو دُرگا میّا کا حکم سمجھ کر مانتے ہیں۔ لیکن وہ مجھے یہاں سے جانے کی اجازت کبھی نہیں دیں گے۔ کیونکہ یہ بات بھی اُن کے عقیدے میں شامل ہے کہ اگر میں چلی گئی تو ان پر دُرگا مائی کا عذاب نازل ہو گا۔ ان کی کھیتیاں سوکھ جائیں گی۔ ان کی عورتیں بانجھ ہو جائیں گی۔ ان کی ندیاں اور کنویں خشک ہو جائیں گے۔ اس لئے وہ ہر وقت میری نگرانی کرتے ہیں۔ لیکن اس وقت جبکہ میں دُرگا دیوی کے بلیدان کی پوجا کی خاص رسم ادا کر رہی ہوں وہ یہاں سے دُور رہیں گے۔ اس کے باوجود جو پجاری میری نگرانی پر مقرر ہیں وہ ضرور کہیں نہ کہیں آس پاس چھرے لئے گشت لگا رہے ہوں گے۔ یہ بھی یاد رکھنا کہ اگر میں نے زبردستی بھاگنے کی کوشش کی اور اُنہوں نے دیکھا کہ میں ان کے ہاتھوں سے نکلی جا رہی ہوں تو وہ مجھے قتل کرنے سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔ کیونکہ میرے قتل سے دُرگا میّا خوش ہو گی کہ انہوں نے اس کی ایک باغی اوتار کو موت کے گھاٹ اُتار دیا ہے۔ اس لئے اگر ہم یہاں سے فرار بھی ہو گئے تو ہمیں ان گشت لگانے والے پجاریوں سے چوکنا رہنے کی ضرورت ہو گی۔''

میں نے پوچھا۔ ''لیکن ہم یہاں سے نکلیں گے کیسے؟''

اُرملا بولی۔ ''اس پرانے تاریخی مندر کے کھنڈر میں ایک خفیہ سرنگ ہے۔ یہ سرنگ یہاں سے دُور ندی کے دوسرے کنارے پر نکلتی ہے۔ فرار ہونے کا صرف یہی ایک راستہ ہے۔ دوسرا کوئی راستہ نہیں ہے۔''

''تو پھر ہمیں وقت ضائع نہیں کرنا چاہئے۔'' میں نے مشورہ دیا۔

اُرملا بولی۔ ''میں خود بھی سوچ رہی ہوں۔ میرے ساتھ آؤ!''

وہ اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ میں بھی چارپائی پر سے نیچے اُتر آیا۔ میری رسیاں پہلے ہی اُرملا نے کھول دی ہوئی تھیں۔ وہ مجھے ساتھ والی ایک کوٹھڑی میں لے گئی۔ اس کوٹھڑی میں سرنگ کا خفیہ دروازہ تھا جس کے آگے لکڑی کا تختہ رکھ کر اسے ڈھانپ دیا گیا تھا۔ اُس نے تختہ الگ کر دیا۔ سرنگ کا تاریک دہانہ منہ کھولے ہوئے تھا۔

اُرملا نے مجھے کہا۔ ''سرنگ میں اندھیرا ہے۔ میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر میرے پیچھے پیچھے چلنا۔''

وہ سرنگ میں داخل ہو گئی۔ میں نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ میں اُس کے پیچھے چل پڑا۔ یہ قدیم زمانے کی سرنگ تھی۔ کہیں زمین بھربھری تھی، کہیں پتھر اور روڑے راستے میں آجاتے تھے۔ کافی آگے جا کر سرنگ دائیں طرف مُڑ گئی اور ڈھلان آ گئی۔ اُرملا نے کہا۔

''یہاں سرنگ ندی کے نیچے سے گزرتی ہے۔''

کچھ دُور چلنے کے بعد سرنگ پھر زمین کے برابر ہو گئی۔ آخر سرنگ میں تازہ ہوا آنے لگی۔ اور کچھ دیر بعد ہم سرنگ سے باہر نکل آئے۔ وہاں گھنا جنگل تو نہیں تھا لیکن جنگلی جھاڑیاں اور اُونچے اُونچے سرکنڈوں کے جھنڈ بہت تھے جو رات کے اندھیرے میں ٹیلوں کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔ اُرملا نے سرنگ میں سے نکلنے سے پہلے مجھے ہدایت کر دی تھی کہ سرنگ سے باہر نکلنے کے بعد ہم اشاروں میں بات کریں گے۔ اگر کوئی بات ضروری ہوئی تو سرگوشی میں بولیں گے۔ کیونکہ سرنگ کے باہر چھروں اور نکوں والے خونی پجاری ضرور گشت لگا رہے ہوں گے۔

اُرملا نے مجھے بتا دیا تھا کہ یہ علاقہ کون سا ہے اور ہمیں سرنگ سے باہر نکلنے کے بعد کس طرف کو رُخ کرنا ہو گا۔ اُرملا کو راستوں سے بھی تھوڑی بہت واقفیت تھی۔ وہ انہی راستوں سے مجھے لے جا رہی تھی۔ ہم کافی دیر تک ڈھلتی رات کے نیم اندھیرے میں چلتے رہے اور جنگلی جھاڑیوں اور ٹیلہ نما سرکنڈوں سے نکل آئے۔ سامنے اندھیرے میں کھیت دکھائی دیئے۔ ان کھیتوں کے پیچھے کوئی گاؤں تھا جہاں دو ایک جگہوں پر روشنیاں

ٹمٹما رہی تھیں۔ اُرملا نے کہا۔

’’اس گاؤں سے تین میل کے فاصلے پر کھیتاونی کا چھوٹا سٹیشن ہے۔ وہاں سے رات کے وقت کوئی گاڑی نہیں ملے گی۔ لیکن ہم کسی یکے میں بیٹھ کر متھرا شہر میں جا سکتے ہیں۔‘‘

میں نے کہا۔ ’’میرے پاس تو کوئی پیسہ نہیں ہے۔ یکے والے کو کرایہ کہاں سے دیں گے؟‘‘

اُرملا نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ’’یہ میرا جوگیوں والا لباس کب کام آئے گا؟ تم دیکھتے چلو۔‘‘

ہم پیدل چلتے کھیتاونی پہنچ گئے۔ گاؤں کے باہر ایک چھوٹا سا مندر تھا جس کے اُوپر بجلی کا بلب روشن تھا۔ مندر کے اندر بھی روشنی ہو رہی تھی۔ ہمیں دیکھ کر مندر کا پروہت جاگ پڑا۔ اُس نے اُرملا کو اور مجھے دیکھ کر کہا۔

’’پوجا تو صبح کو شروع ہوتی ہے بابا!‘‘

اُرملا نے جوگنوں والی سیندوری چادر جسم پر لپیٹ رکھی تھی۔ ماتھے پر تلک لگا تھا۔ بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ اُس کے چہرے پر بڑا جلال تھا۔ ان خونی پجاریوں کے پاس رہ کر اچھی خوراک ملنے سے اُرملا کی صحت بڑی اچھی ہو گئی تھی اور چہرے پر بڑا رُوپ آ گیا تھا۔ وہ بالکل کسی دیوی کا اوتار لگتی تھی۔ مندر کا پروہت اُس کے جلالی رُوپ سے متاثر ہوا تھا۔ اُرملا نے کہا۔

’’شری کرشن کی پجارنیں جس وقت چاہیں کرشن کنہیا کی پوجا کر لیتی ہیں۔ ہمیں متھرا شری کرشن کے بڑے مندر میں جانا ہے۔ ہمیں یکہ لا دو۔‘‘

پروہت ہاتھ باندھ کر بولا۔ ’’جو آ گیا دیوی جی! آپ یہاں ٹھہریں۔ میں یکے والے کو اُٹھا کر لاتا ہوں۔‘‘

پروہت نے اسی وقت کوچوان کو جگایا۔ اُس نے یکہ تیار کیا اور آ گیا۔ ہم یکے میں سوار ہو کر متھرا شہر کی طرف روانہ ہو گئے۔ دُرگا میا کے خونی پجاریوں کے خطرے سے ہم بہت دُور نکل آئے تھے۔ یکہ کھیتوں کے درمیان بنے ہوئے کچے راستے پر ہچکولے کھاتا چلا جا رہا تھا۔ آسمان پر دن کی روشنی نمودار ہونے لگی تھی کہ دُور سے متھرا شہر کے مندروں کے کلس اور آبادی کے مکان نظر آنا شروع ہو گئے۔ ہم متھرا کے ریلوے سٹیشن پر آ کر

لوگوں کی نگاہوں سے دُور ہو کر بیٹھ گئے۔ اُرملا نے مجھ سے پوچھا۔

’’اب بتاؤ! ہمیں کس طرف جانا چاہیے؟‘‘

میں نے اُسے رگھبیر سنگھ کے بارے میں بتا دیا کہ وہ ہمیں انڈیا کا بارڈر کراس کرا سکتا ہے اور ہم اُس کی مدد سے پاکستان پہنچ جائیں گے۔ اُرملا پہلے ہی میرے ساتھ پاکستان جانے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ کہنے لگی۔

’’تمہیں یقین ہے کہ وہ ہمیں بارڈر کے پار پہنچا دے گا؟‘‘

میں نے کہا۔ ’’رگھبیر سنگھ بڑا اثر و رسوخ والا آدمی ہے۔ اور قابل اعتبار شخص ہے۔ ہمیں اُس کے پاس دِلّی چلنا چاہیے۔‘‘

متھرا شہر سے دِلّی زیادہ فاصلے پر نہیں ہے۔ متھرا بہت اہم ریلوے جنکشن ہے اور وہاں سے گاڑیاں دِلّی کی طرف آتی جاتی رہتی تھیں۔ ہم بھی ایک پسنجر ٹرین میں سوار ہو گئے۔ ٹکٹ کلکٹر نے اُرملا کو جوگن اور مجھے اُس کا چیلا سمجھ کر ہم سے ٹکٹ کا نہ پوچھا اور ہم دِلّی پہنچ گئے۔ میری شیو کافی بڑھ آئی تھی۔ شکل سے میں اتنی جلدی پہچانا نہیں جاتا تھا اس لئے میں دِلّی کی انٹیلی جنس سے کسی حد تک بے فکر تھا۔ ویسے بھی دِلّی سٹیشن سے گوردوارہ تیغ بہادر قریب ہی تھا۔ ہم سٹیشن سے پیدل چل کر ہی گوردوارے پہنچ گئے۔ رگھبیر سنگھ وہاں پر موجود تھا۔ مجھے دیکھ کر حیران ہو کر بولا۔

’’تم کہاں اچانک غائب ہو گئے تھے؟‘‘

میں نے کہا۔ ’’یہ ایک الگ کہانی ہے سردار جی! آرام سے بیٹھ کر سناؤں گا۔‘‘

رگھبیر سنگھ نے اُرملا پر ایک گہری نگاہ ڈالی اور مجھ سے پوچھا۔ ’’یہ دیوی جی کون ہیں؟‘‘

میں نے کہا۔ ’’یہ اُرملا ہے۔‘‘

رگھبیر سنگھ حیران ہو کر بولا۔ ’’مگر تم نے تو بتایا تھا کہ اُرملا دریا میں ڈوب کر مر چکی ہے۔ پھر یہ کیسے زندہ ہو گئی؟‘‘

میں نے کہا۔ ’’یہ بھی ایک عجیب کہانی ہے۔ سب کچھ بتا دُوں گا۔ پہلے ہمیں کچھ کھانے کو دیں۔ صبح سے ہم نے کچھ نہیں کھایا۔‘‘

رگھبیر سنگھ نے ہمیں اپنے کمرے میں بٹھایا اور لنگر سے ہمارے لئے کھانا وغیرہ لے کر آ گیا۔ ہم نے کھانا کھایا۔ اس کے بعد میں نے اُرملا سے کہا۔

"تم بہت تھک گئی ہو۔ رات سوئی بھی نہیں۔ تھوڑی دیر آرام کرلو۔ اتنی دیر میں سردار جی سے باتیں کرتا ہوں۔"

رگھبیر سنگھ بولا۔ "ساتھ والے کمرے میں چارپائی بچھی ہے۔ تم وہاں آرام کرو۔"

اُرملا دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ اُس کے جانے کے بعد میں نے رگھبیر سنگھ کو اُرملا کے دوبارہ زندہ ہونے کی ساری کہانی سنا ڈالی۔ وہ سن کر بولا۔

"یہ تو بالکل فلموں والی کہانی ہے۔ چلو اچھا ہوا کہ تم پولیس کی قید سے بھی نکل گئے اور تمہیں تمہاری اُرملا بھی مل گئی۔"

میں نے کہا۔ "اب صرف تمہاری ایک اُمید ہے رگھبیر سنگھ جی! بس کوئی ایسی تدبیر کرو کہ ہم پاکستان پہنچ جائیں۔"

رگھبیر سنگھ بولا۔ "واہگورو کوئی نہ کوئی سبیل پیدا کر دے گا۔ مگر اب تم دونوں اس کمرے سے باہر نہیں نکلو گے۔ سی آئی ڈی والے سفید کپڑوں میں گردوارے میں موجود رہتے ہیں۔ کسی نے تمہیں پہچان لیا تو تمہارے ساتھ مجھ پر بھی مصیبت آ سکتی ہے۔"

مجھے اور اُرملا کو گردوارے میں رہتے ہوئے تین چار دن ہو گئے تھے کہ ایک دن شام کو رگھبیر سنگھ نے آ کر بتایا کہ ہمارے پاکستان جانے کی ایک سبیل پیدا ہو گئی ہے۔ اُرملا اس وقت میرے پاس ہی بیٹھی تھی۔ یہ تو میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ رگھبیر سنگھ نے مجھے وہاں اپنا دوست کندن لال ظاہر کیا ہوا تھا جو امرتسر سے گردوارہ صاحب کے درشنوں کو آیا ہوا تھا۔ اب اُرملا کو اُس نے میری بیوی کے طور پر متعارف کرا دیا تھا۔ میں بڑا خوش ہوا۔ میں نے پوچھا۔

"کیا کسی آدمی سے بات ہو گئی ہے؟"

رگھبیر سنگھ ہمارے سامنے والی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ کہنے لگا۔ "بات یہ ہے کہ اگلے ہفتے دِلّی سے سکھ یاتریوں کا ایک جتھہ پاکستان میں گوردواروں کی یاترا کو جا رہا ہے۔ اس جتھے میں ہندو بھی شامل ہیں جو پاکستان میں اپنے مندروں کی یاترا کریں گے۔ میں کوشش کر رہا ہوں کہ تم دونوں کو ہندو پتی پتنی ظاہر کر کے تمہیں بھی اس جتھے میں شامل کروا دوں۔ جتھے کا لیڈر گیانی گوربخش سنگھ میرا جاننے والا ہے۔ وہ تم دونوں کا پاسپورٹ بنوا کر اُن پر پاکستان کا ویزا بھی لگوا دے گا۔"

"یہ تو بڑی خوشخبری تم نے سنائی ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن کیا وہ ایسا کر سکے گا؟"

"گیانی گوربخش سنگھ جی کی پہنچ اُوپر تک ہے۔ اس کے لئے یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔"

اُرملا کہنے لگی۔ "لیکن اس کے لئے تو پولیس کو پنی کارروائی پوری کرنی ہو گی۔ وہ ہمیں بلا کر ہم سے پوچھ گچھ کر سکتی ہے۔"

رگھبیر سنگھ بولا۔ "تمہارا کیا خیال ہے مجھے ان باتوں کا علم نہیں ہے؟ کیا مجھے نہیں معلوم کہ اگر تم دونوں پولیس سٹیشن گئے تو شیراز کو پولیس پہچان سکتی ہے۔ میں ان ساری باتوں کو دھیان میں رکھتے ہوئے تمہارا بندوبست کر رہا ہوں۔ بس تم آرام سے یہاں بیٹھے رہو۔ واہگورو سب کام ٹھیک کر دے گا۔"

دوسرے دن رگھبیر سنگھ پاسپورٹ کے فارم لے کر آ گیا۔ ہم سے اپنے اپنے فارم بھروائے، نیچے میں نے اور اُرملا نے دستخط کر دیئے۔ میں نے کندن لال کے دستخط کئے۔ رگھبیر سنگھ بولا۔ "ان دستخطوں کو ذہن میں رکھنا۔ آگے جا کر بھی ہو سکتا ہے کہیں تمہیں دستخط کرنے پڑیں۔"

اُسی روز رگھبیر سنگھ ایک فوٹو گرافر کو لے آیا جو سکھ تھا۔ اُس نے میری اور اُرملا کی پاسپورٹ سائز کی فوٹو بنانے کے لئے ہماری تصویریں اُتاریں۔ دو دن کے بعد رگھبیر سنگھ میرا اور اُرملا کا پاسپورٹ لے آیا۔ اس پر پاکستان کے شہروں لاہور، پنجہ صاحب، حیدر آباد اور ننکانہ صاحب کے ویزے لگے ہوئے تھے۔ میں اُس کی اس کارروائی پر حیران ہو کر رہ گیا۔ وہ کہنے لگا۔

"پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ دونوں پاسپورٹ انڈیا کی حکومت کی طرف سے جاری کئے گئے اصلی پاسپورٹ ہیں۔ ان پر کوئی شک نہیں کر سکتا۔"

رگھبیر سنگھ نے پاکستان جانے والے جتھے میں ہم دونوں کے نام بھی لکھوا دیئے تھے۔ جتھے نے دِلّی کے گردوارہ سری تیغ بہادر ہی سے روانہ ہونا تھا۔ میں بڑا خوش تھا کہ اُرملا کے ساتھ اب پاکستان پہنچ جاؤں گا۔ ایک بار پاکستان پہنچ گیا تو پھر ہم ہر خطرے اور خوف سے نجات حاصل کر لیں گے۔ جتھے کی روانگی سے ایک دن پہلے رگھبیر سنگھ نے ہمیں نئے کپڑے لا کر دیئے۔ میرے لئے نئی بش شرٹ اور اُرملا کے لئے سادہ سی نئی

ساڑھی۔ ہمیں پاکستانی کرنسی میں کچھ رقم بھی مل گئی تھی۔ یاتریوں کے جتھے نے دِلّی سے رات کی ٹرین میں روانہ ہونا تھا جو دوسری صبح امرتسر پہنچنی تھی۔ امرتسر سے ہمیں لاری کے ذریعے انڈین بارڈر تک جانا تھا۔ اور پھر پاکستان کی سرحد پار کر کے بس کے ذریعے لاہور پہنچنا تھا۔

یاتریوں کا جتھہ صبح ہی سے گردوارے میں تیاریوں میں مصروف تھا۔ میں اور اُرملا رگھبیر سنگھ کے کمرے میں ہی بیٹھے رہے۔ رگھبیر سنگھ مجھے سمجھا رہا تھا کہ راستے میں کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہونی چاہئے کہ تم مسلمان ہو۔ تمہاری کسی حرکت سے بھی بے خیالی میں تمہارا مسلمان ہونا ظاہر نہیں ہونا چاہئے۔

''یاتریوں میں کسی کے ساتھ زیادہ گھل مل کر بات کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ کوئی پوچھے تو یہی بتانا کہ تمہارا نام کندن لال ہے۔ تم ہندو ہو۔ امرتسر میں تمہاری ہوزری کی دُکان ہے اور رگھبیر سنگھ کے یعنی میرے پرانے دوست ہو۔ ان لوگوں کو بھی میں نے تمہارے بارے میں یہی بتایا ہے۔ صرف انڈیا کی سرحد کراس کرنے تک اس احتیاط کی ضرورت ہے۔ ایک بار بارڈر کراس کر کے پاکستان پہنچ جاؤ تو اُرملا کو لے کر غائب ہو جانا۔ باقی یہاں میں سنبھال لوں گا۔''

میں نے کہا۔ ''لیکن یاتری جب واپس آنے لگے تو پاکستان کی کسٹم چوکی پر بھی یہ راز کھل جائے گا کہ کندن لال نام کا ایک یاتری غائب ہے۔ وہ کہاں ہے؟ پاکستانی کسٹم والے یہی سمجھیں گے کہ کندن لال بھارت کا بھیجا ہوا کوئی جاسوس ہے۔ بہتر یہی ہوگا کہ میں پاکستان کے کسٹم حکام کو اصلی حقیقت کھول کر بیان کر دُوں۔''

رگھبیر سنگھ کہنے لگا۔ ''تم ان باریکیوں میں نہ ہی پڑو تو اچھا ہے۔ آگے تمہاری مرضی ہے جو چاہے کرو۔ میں تو تمہیں یہی مشورہ دُوں گا کہ پاکستان کی سرحد پر قدم رکھنے کے بعد دونوں غائب ہو جاؤ اور پاسپورٹ جلا ڈالو۔''

جتھے کی روانگی کا وقت قریب آ گیا۔ رگھبیر سنگھ مجھ سے گلے لگ کر ملا۔ کہنے لگا۔

''مجھ سے کوئی غلطی، قصور ہو گیا ہو تو مجھے معاف کر دینا۔''

میں رگھبیر سنگھ کی انسانی ہمدردی اور کشادہ ظرفی سے بڑا متاثر ہوا۔ ہم لوگ جتھے کی شکل میں پیدل چل کر دِلّی سٹیشن پر آ گئے۔ یہاں ایک ٹرین میں دو بوگیاں یاتریوں کے

لئے ریزرو تھیں۔ ہم ایک بوگی میں سوار ہو گئے۔ صبح امرتسر پہنچے۔ یہاں سے ہمیں لاری میں بیٹھ کر انڈیا کے بارڈر تک جانا تھا۔ میں نے سارا راستہ کسی یاتری سے زیادہ بات چیت نہیں کی۔ کسی نے پوچھا بھی تو یہی بتایا کہ میرا نام کندن لال ہے اور ہوزری کا بزنس کرتا ہوں۔ واہگہ بارڈر پر ہماری لاری رُک گئی۔ یہاں ہمارے پاسپورٹ وغیرہ اور کسٹم کی چیکنگ ہونی تھی۔ انڈین کسٹم چوکی سامنے تھی۔ اس سے ذرا آگے انڈیا کے بارڈر والا گیٹ تھا جس پر انڈیا کا جھنڈا لگا ہوا تھا۔ دوسری جانب پاکستان کے بارڈر والا گیٹ تھا۔ اُس گیٹ کے اُوپر پاکستان کا ہلالی پرچم لہرا رہا تھا۔ اپنے آزاد ملک کا پرچم پہلی بار دیکھ کر میرا دل جوش اور محبت سے لبریز ہو گیا۔ درمیان میں دس بارہ قدم کی خالی زمین تھی۔ یاتری بھارت کی کسٹم چوکی میں قطار باندھے اپنے اپنے کاغذات چیک کروا رہے تھے۔ میں اور اُرملا بھی قطار میں ایک ساتھ کھڑے ہو گئے۔ ایک ایک یاتری کے پاسپورٹ وغیرہ کی پوری تفصیل کے ساتھ چیکنگ ہو رہی تھی۔ وہاں کافی وقت لگ گیا۔ ہماری باری آتے آتے ڈیڑھ گھنٹہ گزر چکا تھا۔

کسٹم آفیسر ایک ہندو تھا۔ اُس نے پہلے اُرملا کا پاسپورٹ دیکھا۔ پاسپورٹ پر اُرملا کی فوٹو دیکھ کر اُرملا کے چہرے کو تکنے لگا اور پوچھا۔ ''تمہارا نام؟''

اُرملا نے اپنا نام بتایا۔

کسٹم آفیسر نے پوچھا۔ ''دِلّی میں کوئی نوکری کرتی ہو؟''

اُرملا نے پہلے سے سوچا ہوا جواب دیا۔ ''گھر گرہستی چلاتی ہوں۔ پتی کی سیوا کرتی ہوں۔'' میں پاس ہی کھڑا تھا۔ اُرملا میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔ میں بھی تھوڑا سا مسکرا دیا۔ کسٹم آفیسر نے بڑے سے رجسٹر پر پاسپورٹ اور ساتھ لگے علیحدہ ویزے کے کاغذ کا اندراج کیا، پھر پاسپورٹ اُرملا کے حوالے کر کے مجھ سے کہا۔

''لاؤ جی تم اپنا پاسپورٹ۔''

میں نے اپنا پاسپورٹ کسٹم آفیسر کو دے دیا۔ کسٹم آفیسر ہندو لالے نے میرا پاسپورٹ کھول کر میری فوٹو دیکھی، پھر میری طرف دیکھا اور پوچھا۔

''نام؟''

''کندن لال۔''

''کیا کام کرتے ہو؟''

''ہوزری کا بزنس کرتا ہوں امرتسر میں۔''

کسٹم افسر بولا۔ ''تمہارا پاسپورٹ تو دِلّی میں بنایا گیا ہے۔ امرتسر میں تم نے پاسپورٹ کیوں نہیں بنوایا؟''

میں نے کہا۔ ''دِلّی میں اپنے دوست رگھبیر سنگھ جی کے ہاں گیا ہوا تھا۔ وہاں معلوم ہوا کہ یاتریوں کا جتھہ پاکستان کے گردواروں اور مندروں کی یاترا کو جانے والا ہے۔ میرا بھی جتھے کے ساتھ جانے کو من چاہا۔ اتنا وقت نہیں تھا کہ امرتسر جا کر پاسپورٹ بنواتا۔ بس دِلّی میں ہی پاسپورٹ بنوالیا۔''

میں نے دیکھا کہ اس دوران ہندو کسٹم افسر نے ایک دوسرا رجسٹر کھول کر سامنے رکھ لیا تھا۔ اس رجسٹر کے آمنے سامنے والے دونوں صفحوں پر آدمیوں کی پاسپورٹ سائز کی تصویریں لگی ہوئی تھیں اور نیچے اُن کے بارے میں کوائف درج تھے۔ میں نے پہلے بھی دیکھا تھا کہ جب کوئی ہندو یاتری اپنا پاسپورٹ چیک کروانے آتا تھا تو ہندو کسٹم افسر یہ رجسٹر کھول کر تصویریں دیکھنے لگ جاتا تھا۔ ساتھ ساتھ وہ ہندو یاتری کے پاسپورٹ پر لگی ہوئی فوٹو پر بھی نگاہ ڈال لیتا تھا۔ میرا کھلا ہوا پاسپورٹ ہندو کسٹم افسر کے ہاتھ میں تھا۔ وہ ایک نظر پاسپورٹ پر لگی ہوئی میری فوٹو پر ڈالتا تھا اور پھر رجسٹر میں لگی ہوئی تصویروں کو دیکھنے لگتا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ رجسٹر پر ان آدمیوں کی تصویریں لگی ہیں جو مفرور ہیں اور انڈیا کی پولیس کو مطلوب ہیں۔ میرے جسم میں ایک سنسناہٹ سی دوڑ گئی۔ اگر رجسٹر پر میری تصویر بھی لگی ہوئی نکل آئی تو مجھے فوراً بھارتی پولیس کے حوالے کر دیا جائے گا اور سارا بنا بنایا کھیل ایک لمحے میں بڑی عبرت ناک ٹریجڈی پر ختم ہو جائے گا۔

ہندو کسٹم افسر رجسٹر کا ورق اُلٹ کر تیسرے صفحے پر لگی ہوئی تصویروں کو دیکھنے لگا۔ میرے بچنے کی ایک موہوم سی اُمید یہ تھی کہ جب میں اُرملا کو لے کر دِلّی رگھبیر سنگھ کے پاس آیا تھا تو میری داڑھی کافی بڑھی ہوئی تھی۔ وہاں مجھے شیو کروانے کا وقت نہ ملا اور رگھبیر سنگھ نے بھی کہا کہ اب داڑھی بڑھ گئی ہے تو اسے رہنے دو اور داڑھی رکھ لو۔ چنانچہ میں نے داڑھی اسی طرح رہنے دی تھی اور اسی داڑھی کے ساتھ پاسپورٹ کے لئے تصویر اُتروائی تھی۔ یہی داڑھی والی فوٹو میرے پاسپورٹ پر لگی ہوئی تھی۔ مگر کسٹم والوں

کی نگاہیں بڑی تیز ہوتی ہیں۔ ہر لمحے یہ خطرہ تھا کہ اگر رجسٹر پر میری تصویر لگی ہوئی نکل آئی جو اگرچہ داڑھی کے بغیر ہوگی مگر یہ کسٹم افسر مجھے فوراً پہچان لے گا۔

اسی لمحے ایسا ہوا کہ میرے پیچھے جو سکھ یاتری قطار میں کھڑے تھے، اُن کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ اُن میں سے چند ایک نے اُونچی آواز میں کہا۔

''مہاراج! اتنی دیر نہ لگائیں۔ جلدی کام نمٹائیں۔''

کسٹم افسر نے خشمگیں نظروں سے اُن کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''میں یہاں بیٹھا طبلہ نہیں بجا رہا ہوں۔ تم لوگوں کا ہی کام نمٹا رہا ہوں۔''

مگر غیر شعوری طور پر اُس کے کام کی رفتار ذرا تیز ہو گئی۔ رجسٹر پر لگی ایک تصویر کو اُس نے غور سے دیکھا، پھر میری پاسپورٹ والی تصویر پر نگاہ ڈالی۔ پیچھے سے قطار میں کھڑے کچھ لوگوں نے زور ڈالا۔ میں آگے کو ہو گیا۔ کسٹم افسر نے غصے میں آ کر میرا پاسپورٹ مجھے تھما دیا اور ترش لہجے میں بولا۔

''چلو...... دوسرا آگے آئے۔''

میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور اُرملا کو لے کر پاکستان کے بارڈر کی طرف چلنے لگا۔ میں نے ساری بات اُرملا کو دبی زبان میں بتا دی اور یہ بھی کہا کہ اگر کوئی گڑبڑ ہو جائے تو میرے ساتھ ایک دم اُٹھ بھاگنا۔ کیونکہ پاکستان کا گیٹ یہاں سے دُور نہیں ہے۔

آخر وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا...... یقینی طور پر ہندو کسٹم افسر نے رجسٹر میں لگی میری تصویر سے جو پولیس کی طرف سے انہیں دی گئی تھی، مجھے پہچان لیا اور اُسے پتہ چل چکا تھا کہ میں پاکستان کے لئے جاسوسی کرنے کے الزام میں انڈیا میں پکڑا گیا تھا اور پھر جیل سے فرار ہو گیا تھا۔ مجھ پر یہ خوفناک راز اُس وقت کھلا جب میں اور اُرملا بارڈر پر انڈیا کے گیٹ سے صرف ایک قدم دُور تھے کہ کسی نے پیچھے سے آواز دی۔

''اُن دونوں کو پکڑ لو...... جانے نہ دینا۔''

میں نے آواز سنتے ہی اُرملا سے کہا۔ ''بھاگو......!''

انڈیا کا گیٹ دو قدموں کے فاصلے پر تھا۔ گیٹ کی دونوں جانب انڈین بارڈر فورس کے سپاہی اٹین شین کھڑے تھے۔ آواز سنتے ہی وہ ہماری طرف لپکے مگر اس دوران میں اور اُرملا انڈیا کی سرحد کا گیٹ دوڑ کر پار کر گئے تھے اور اب دونوں ملکوں کی سرحدوں

کے درمیان جو چند قدموں کی جگہ تھی جسے نو مین لینڈ بھی کہا جاتا ہے وہاں دیوانہ وار دوڑ رہے تھے۔ پیچھے سے انڈین سکیورٹی فورس کے دو سپاہی ہمارے پیچھے بھاگتے ہوئے آئے لیکن ہم پاکستانی سرحد کے گیٹ پر پہنچ گئے تھے۔ گیٹ پر کھڑے پاکستانی بارڈر فورس کے کڑیل مسلح جوانوں نے ہمیں دوڑ کر آتے دیکھا تو رائفلیں تان کر ہالٹ کہا۔ میں نے چلا کر کہا۔

''ہم پاکستانی ہیں۔''

مسلح جوانوں نے رائفلوں کا رُخ اُوپر کرلیا۔ ہم پاکستان کی سرزمین میں داخل ہو چکے تھے۔ پاکستان کی سرزمین پر پہنچتے ہی میں سجدے میں گر پڑا۔ اُرملا بھی میرے ساتھ ہی سجدے میں گر پڑی تھی۔ ہم نے سجدے سے سر اُٹھائے تو پاکستانی بارڈر پولیس کے جوان ہمیں گھیرے ہوئے تھے۔ ہمیں پاکستانی کسٹم چوکی پر لے جایا گیا۔ پاکستانی کسٹم آفیسر نے ہمارے پاسپورٹ چیک کئے، پھر اُس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

''تم ہندو ہو اور یاتریوں کے ساتھ آئے ہو۔ پھر تمہیں دوڑ کر بارڈر کراس کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اور تم نے یہ کیوں کہا کہ میں پاکستانی ہوں؟''

میں نے کہا۔ ''سر! میری بیوی اُرملا ضرور ہندو ہے مگر میں ہندو نہیں ہوں۔ میں مسلمان ہوں۔ لاہور کا رہنے والا ہوں۔ میرا نام شیراز ہے۔ میں اپنے آزاد ملک پاکستان آنا چاہتا تھا۔ لیکن میرے حالات کچھ ایسی شکل اختیار کر چکے تھے کہ اگر میں ہندو بن کر پاسپورٹ بنوا کر یاتریوں کے ساتھ نہ آتا تو شاید ساری زندگی پاکستان نہیں آسکتا تھا۔ اور اگر زندہ بچ جاتا تو کافروں کی قید میں رہ کر ساری زندگی پاکستان کی سرزمین پر سجدہ ریز ہونے کے لئے ترستا رہتا۔''

میں مزید پوچھ گچھ کے لئے پولیس کے حوالے کر دیا گیا۔ دو دن تک مجھ سے پوچھ گچھ ہوتی رہی۔ میں نے سی آئی ڈی کے انسپکٹر جنرل کو شروع سے لے کر آخر تک اپنی کہانی تفصیل سے سنائی اور میرے مسلمان اہل خانہ نے آکر میرے لاہور کے باشندہ اور پاکستانی ہونے کی تصدیق بھی کر دی تو پولیس نے مجھے جانے کی اجازت دے دی۔

ایک مدت کے بعد اپنے عزیز و اقارب سے مل کر بے انتہا مسرت ہوئی۔ گھر پہنچنے کے بعد میں نے اور اُرملا نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے اپنے انڈین پاسپورٹ

پھاڑ کر جلا ڈالے۔ اُرملا حلقہ بگوشِ اسلام ہوگئی اور ہم نے گھر والوں کی رضامندی کے ساتھ شادی کر لی۔ اسلام قبول کر لینے کے بعد اُرملا نے اپنا نام نور جہاں رکھ لیا۔ یہ نام اُس نے اپنی مرضی سے رکھا تھا۔ وہ غیر مردوں سے پردہ کرنے لگی۔ پانچوں وقت نماز پڑھتی۔ ایک قاری صاحب سے قرآن پاک پڑھنا شروع کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی میری زندگی کے شب و روز بھی بدل گئے۔ میں بھی پنج وقتہ نمازی بن گیا۔ قاری صاحب سے قرآن پاک کا درس لینے لگا۔ نماز پڑھنے اور اللہ کے پاک کلام کا درس لینے سے میرے دل اور میری رُوح کو ایسا سکون ملا کہ جو آج تک کبھی نصیب نہیں ہوا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے ہمیں اولاد کی نعمت سے بھی سرفراز فرمایا۔ ایک بیٹی اور ایک بیٹا ہوا۔

اُرملا یعنی میری بیوی نور جہاں نے تین چار سال کی عمروں میں ہی دونوں کو قرآن پاک حفظ کرا دیا۔ دولت حاصل کرنے کی مجھے کبھی خواہش نہیں ہوئی تھی۔ میرا چھوٹا سا کاروبار تھا۔ اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے راستے پر چل کر رزق حلال کماتا اور بچوں کو بھی رزق حلال سے پرورش کرتا۔ ایک روز میری بیوی مجھ سے پوچھنے لگی۔

''اپنے کفر کے زمانے میں، میں نے تمہیں جو انگوٹھی دی تھی وہ تم نے کہاں رکھی؟''

میں نے کہا۔ ''کپڑوں والی الماری کے نچلے خانے میں پڑی ہے۔''

اُس نے انگوٹھی نکلوا کر لے لی اور چادر سے منہ، سر اور جسم ڈھانپ کر بولی۔

''میرے ساتھ آؤ!''

محلے کے باہر ایک گندا نالہ بہتا تھا۔ میری بیوی نے وہاں جا کر وہ انگوٹھی گندے نالے میں پھینک دی اور بولی۔

''اس انگوٹھی کی جگہ ہمارے گھر کی الماری نہیں ہے، یہ گندہ نالہ ہے۔''

اس وقت مجھے محسوس ہوا کہ ہم دونوں کی زندگیوں میں غیر شعوری طور پر جو تھوڑا سا کفر، تھوڑا سا شرک باقی رہ گیا تھا، اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس سے بھی ہمیشہ کے لئے نجات دلا دی ہے۔